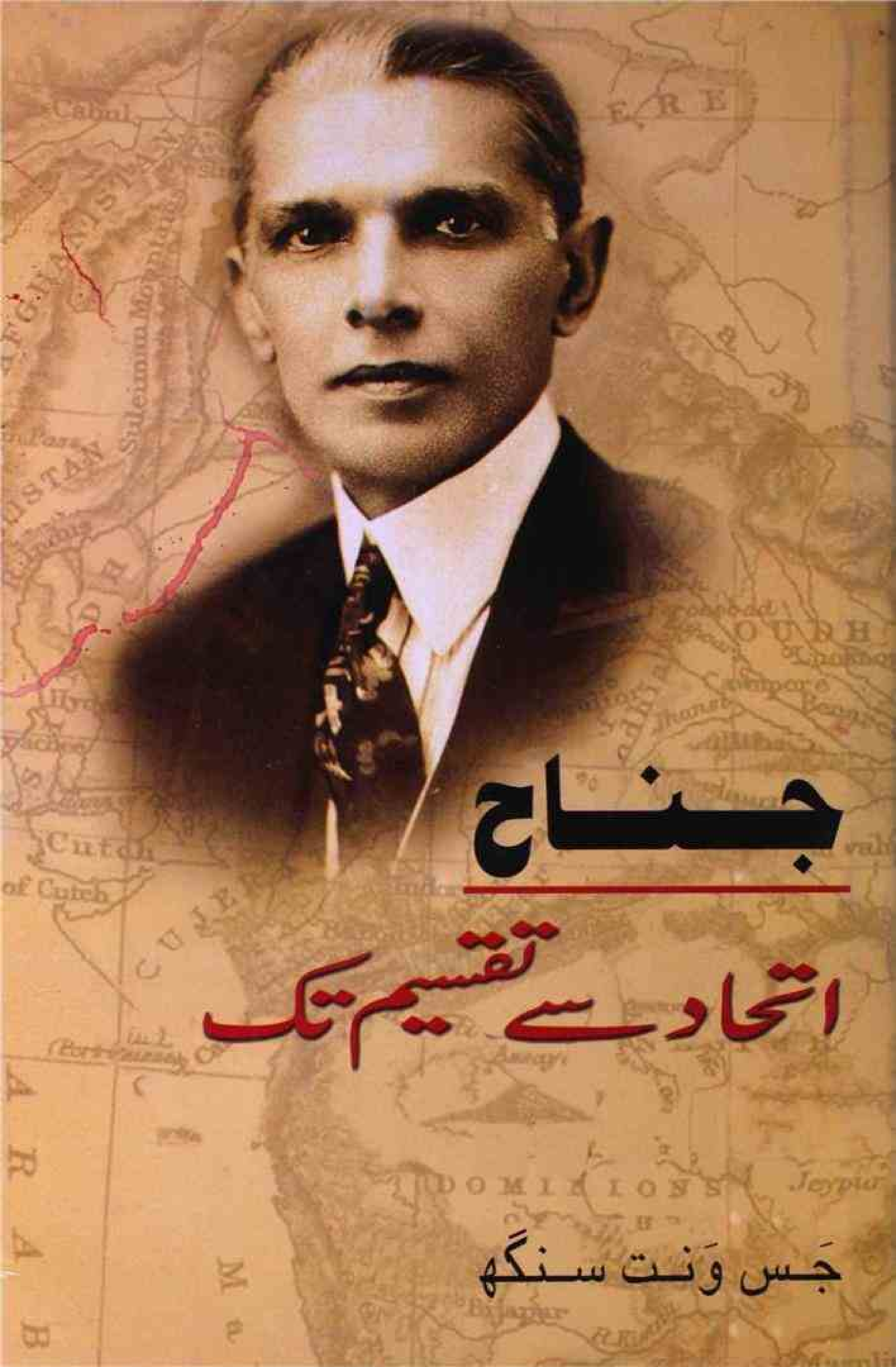


جناح
اتحاد سے تقسیم تک
جس وَنت سنگھ
Cabul
Cutch
of Cutch
Jeypur

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شاندار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض : 03447227224

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

1947 میں ہندوستان کی تقسیم، جسے بعض لوگوں مثلاً گاندھی، نے زندہ جسم کی چیر پھاڑ سے تعبیر کیا ہے، بلاشبہ بیسویں صدی کا سب سے جراحت انگیز سانحہ تھی۔ اس نے برصغیر کی چار پیڑھیوں کو سخت آزار اور صدمہ پہنچایا ہے۔ تقسیم کیوں ہوئی؟ اس کے لئے کون ذمے دار تھا/ ہے، جناح؟ کانگریس پارٹی؟ یا انگریز؟ جسونت سنگھ نے اس کا جواب، اپنا جواب، تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے یہ تلاش اس کے باوجود کی ہے کہ اس سوال کا کوئی حتمی جواب شاید ہے ہی نہیں۔ جناح کا سیاسی سفر 'ہندو۔ مسلم اتحاد کا سفیر' کی طرح (گوپال کرشن گوکھلے) شروع ہوا مگر اس کا اختتام ان کے، ہندوستانی مسلمانوں کے 'واحد ترجمان'، بانیٔ پاکستان اور قائد اعظم بن جانے پر ہوا۔ یہ کایا پلٹ کیسے اور کیوں ہوئی؟

اب تک کسی بھی ہندوستانی یا پاکستانی سیاست کار/ ممبر پارلیمنٹ نے قائد اعظم محمد علی جناح کی تجزیاتی، سیاسی سوانح لکھنے کا جوکھم نہیں اٹھایا کہ ان کے بارے میں ہونے والی ہر گفتگو لازماً عقیدت مندی یا مذمت کی انتہاؤں پر رہتی ہے۔ اس کتاب میں ایک معروضی محاکمہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان کے وزیر خارجہ اور وزیر دفاع کی حیثیت سے جسونت سنگھ کا تجربہ خاصا جرأت آزما رہا ہے (لاہور امن اقدام، جسے کرگل میں دغا دی گئی، قندہار، جموں و کشمیر اسمبلی اور ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ، 2002 کے مشکل سفارتی امور، اپریل 2003 میں امن کوششوں کی طرف واپسی)

وہ سوال کرتے ہیں کہ 'مسلمان ایک علاحدہ قوم ہیں' کا بحث طلب اور قابل اعتراض نظریہ کب اور کہاں پیدا ہوا اور برصغیر ہند کو کہاں لے گیا؟ اور اس نے خود پاکستان کو کھینچ کر کہاں پہنچا دیا؟ آخر بنگلہ دیش کیوں پیدا ہوا؟ اور اب پاکستان کا کیا حشر ہو رہا ہے؟ اور اب اس کی منزل کیا ہے؟ یہ وہ

جناح

اتحاد سے تقسیم تک

جناح

اتحاد سے تقسیم تک

جس ونت سنگھ

HaSnain Sialvi

روپا اینڈ کو

اشاعت 2009 از

Rupa . Co

7/16، انصاری روڈ، دریا گنج
نئی دہلی 110002

فروخت مراکز
الہ آباد بنگلورو چنڈی گڑھ چینئی
حیدرآباد جے پور کٹھمنڈو
کولکاتا ممبئی

ترجمہ : فرحت احساس
بہ اشتراک : مسعود ہاشمی، سہیل انجم، اسماء سلیم
نظرثانی : پروفیسر اختر الواسع

ٹائپ سیٹنگ
ذہین اختر

ہندوستان میں طباعت
ریکھا پرنٹرز پرائیوٹ لمیٹڈ
اے 102/1، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II
نئی دہلی 110020

ان کے نام

جنہوں نے 'تقسیم' میں
اپنا سب، کچھ کھودیا

'... طلوع سحر ان کی تھی
اور غروب آفتاب،
اور زمین کے رنگ بھی'

روپرٹ بروک: 'دی ڈیڈ'

ترتیب

		اظہار تشکر	
		تعارف	
باب1	:	ہندوستان اور اسلام	1
باب2	:	شناخت کا سفر: جینا بھائی سے جناح تک	38
باب3	:	1920 کی تلاطم خیز دہائی	76
باب4	:	مرکوز تر مقاصد، کم ہوتے متبادل	105
باب5	:	چھوٹی دہائی، طویل بازی	149
باب6	:	برطانوی راج کا غروب-'ایک ڈوبتے بینک کے لئے مؤخر چیک'	201
باب7	:	جانشینی کی جنگ، الگ ہوتی راہیں	247
باب8	:	بے نتیجہ مذاکرات	296
باب9	:	آخری وائسرائے ماؤنٹ بیٹن، راج کا خاتمہ	324
باب10	:	پاکستان کا جنم، قائداعظم کا آخری سفر	354
باب11	:	بازدید	363
		حوالہ جات	395

ضمیمہ جات

باب 1 کا ضمیمہ

ضمیمہ 1 : شملہ وفد اور مسلم لیگ کی تشکیل

باب 2 کے ضمیمے

ضمیمہ 1 : منٹو-مورلے اصلاحات (1909)

ضمیمہ 2 : مونٹیگ-چیمس فورڈ اصلاحات سے متعلق بااختیار برطانوی رائے

ضمیمہ 3 : لکھنؤ معاہدہ

باب 5 کے ضمیمہ

ضمیمہ 1 : 1937 کے انتخابات

باب 6 کے ضمیمے

ضمیمہ 1 : کرپس مشن منصوبہ، 1942

ضمیمہ 2 : سی آر فارمولا، 1943

ضمیمہ 3 : جناح کے نام گاندھی کے مکتوب مؤرخہ 24 ستمبر 1944 میں گاندھی کی پیش کش

ضمیمہ 4 : ڈیسائی فارمولا

ضمیمہ 5 : 30 ستمبر 1944 کی گاندھی-جناح بات چیت پر ویول کی رائے

باب 8 کے ضمیمے

ضمیمہ 1 : ویول منصوبہ، 1945

ضمیمہ 2 : مسلم قانون سازوں کا کنونشن، 1946

ضمیمہ 3 : کیبنٹ مشن کو مسلم لیگ کا میمورنڈم

ضمیمہ 4 : کیبنٹ مشن کو کانگریس کی تجاویز

ضمیمہ 5 : کیبنٹ مشن منصوبہ، 1946

ضمیمہ 6 : 3 جون 1947 کا بیان

ضمیمہ 7 : ویول-گاندھی-نہرو، 27 ستمبر 1947 کلکتہ فسادات کے بعد

ضمیمہ 8 : ویول-وائسرائے جرنل، زیرادارت پینڈل مون

ضمیمہ 9 : فیلڈ مارشل سر سی آچن لیک کا نوٹ

ضمیمہ 10: طویل مدتی منصوبہ

ضمیمہ 11: مجوزہ ایگزیکٹیو کونسل کے لئے کانگریس کی پیش کردہ 15 افراد کی فہرست

ضمیمہ 12 :

باب 10 کے ضمیمے

ضمیمہ 1 : ہندوستان کو قائداعظم کا پیغام، 7 اگست 1947

باب 11 کے ضمیمے

ضمیمہ 1 : پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں جناب جناح کا صدارتی خطبہ

ضمیمہ 2 : جامع مسجد، دہلی میں مولانا آزاد کی تقریر، 23 اکتوبر 1947

ضمیمہ 3 : یونیورسٹی آف شکاگو میں سیاسیات کے پروفیسر لائڈ اور سوزان

روڈولف کے ساتھ مصنف کی بات چیت

اظہار تشکر

میں ایک طویل عرصے سے محمد علی جناح کی سیاسی سوانح لکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ خواہش محض ایک خیال بنی رہی، جس کا بیج کئی سال ذہن کی مٹی میں دبا پڑا رہا، یہاں تک کہ 1999 میں، حالات کی ایک کروٹ نے، اسے برگ و بار لانے کا موقع دے دیا۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے 1999 میں لاہور تک بس کا تاریخی سفر کیا تھا۔ میں وزیر اعظم کے ہمراہ مینار پاکستان (60 میٹر اونچا مینار جو اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں 23 مارچ 1940 کو قیام پاکستان سے متعلق قرارداد منظور کی گئی تھی) گیا جہاں سے واپسی کے دوران، مجھے اس خیال نے ضرب لگائی کہ اب تک جناح کی ایسی کوئی سیاسی سوانح نہیں ہے جو ہندوستان کی کسی سیاسی شخصیت نے لکھی ہو۔ میں نے اسی وقت اس کمی کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا، مگر خیال اور عمل کے درمیان پھر ایک طویل عرصہ حائل ہو گیا۔

اس خیال پر عمل آخر کار 2004 میں شروع ہوا، جب مجھے منصبی ذمے داریوں سے فرصت تھی اور میرے پاس سوچنے، تحقیق کرنے اور لکھنے کا کافی وقت تھا۔

اس کے بعد میں نے اس سلسلے میں صلاح مشورہ شروع کیا۔ بہت سے لوگوں نے، جن سے میں نے مشورہ کیا، اس بات پر حیرت ظاہر کی کہ میں نے اس وادی پُر خار میں قدم ہی کیوں رکھے۔ بیشتر بہی خواہوں نے آگاہ کیا کہ یہ کام نہ کروں۔ مگر میں ثابت قدم رہا کہ یہ میرا اپنا سفر تھا، 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے اسباب کی میری دریافت نو اور واضح تفہیم کا سفر۔

خاصے صلاح مشورے اور دماغ سوزی کے بعد، میں اس سفر پر چل پڑا، اور اب، آخر کار، یہ 'کتاب' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اسے لکھنے اور پھر لکھنے، تصدیق اور دوبارہ تصدیق کے بظاہر لامختتم عمل میں پانچ سال لگ گئے۔

ان افراد کی فہرست بہت طویل ہے جن کا میں نہایت شکر گزار ہوں، مگر سب سے پہلے میرا ہدیۂ تشکر ڈاکٹر زیڈ ایچ زیدی، ایڈیٹر انچیف۔ قائد اعظم پیپرز پراجکٹ، نیشنل آرکائیوز آف پاکستان کے لئے ہے۔ ان سے بات ہوئی تو فوراً مدد

HaSnain Sialvi

کے لئے تیار ہو گئے، اور ان کی عنایات کا سلسلہ برابر جاری رہا، اپنے حسن رفتہ والے پرانے دستی ٹائپ رائٹر کے ذریعے مراسلت کرتے ہوئے، جو کمپیوٹروں اور دیگر پرنٹروں کی روز افزوں ترقی کے اس زمانے میں سخت باعث حیرت ہے۔ ڈاکٹر زیدی نے جب بھی ضرورت ہوئی ہر ممکن مدد کی، بغیر رکے، بغیر تھکے ہوئے، ڈاکٹر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ۔

اس کتاب سے متعلق تحقیق کے دوران، کتابوں کی ایک ڈرانے والی بڑی تعداد سے گزرنا پڑا، ایسی کتابیں جن میں اُس زمانے کی روداد رقم کی گئی ہے اور جو تمام کی تمام زبردست علم، تجربے، جذبے اور امتیازی معیار کی حامل ہیں۔ حوالوں کے باب میں ان کی فہرست پیش کی گئی ہے، میرا اظہار تشکر محض ادائگی فرض ہے۔

راگھویندر سنگھ میری کوششوں میں تعاون کا ایک عجوبہ ثابت ہوئے۔ انہوں نے ان تھک محنت اور دلیرانہ صلاحیت کے ساتھ نئی نئی کتابیں، ذرائع اور حوالے تلاش کئے۔ انہوں نے تحریر کی اولین کاوشوں کے دوران، خام کاغذ کو الفاظ کے ذریعے کتاب میں تبدیل کرنے کے مشکل عمل میں بھی بڑی مدد کی۔ راگھویندر، آپ کا شکریہ۔

یہ تصنیفی کوشش، جیسا کہ اس نوعیت کی دیگر کتابوں کی عادت ہے، بار بار طویل سے طویل تر ہونے کی دھمکیاں دیتی رہی، کہ اس موضوع کے مطالبات اور تقاضے بے پناہ ہیں۔ اس کے علاوہ، کتابیں آپ اپنی زندگی اور دائرہ اختیار قائم کرنے پر بھی مائل رہتی ہیں۔ پھر بھی اس کتاب کی 'سرحدوں' کو قابو میں رکھنا تھا کہ آخر سرحدیں، علاقے، حدود اور پابندیاں، یہ تمام حدیں کھینچنے والے الفاظ، یہی تو اس کتاب کا محور اور بنیاد ہیں، اس تقسیم سے متعلق جسے 1947 میں اس برصغیر پر برپا کر دیا گیا۔ دنیا اب ہمیں 'جنوبی ایشیا' کہتی ہے۔

اس کتاب کی تصنیف ایک گہری ذمے داری بھی تھی کہ اس موضوع کے ساتھ شدید جذبے اور احساسات وابستہ ہیں جو ذرا دیر میں بھڑک اٹھتے ہیں۔ آخر کار ہندوستان کی تقسیم، ہم سب کے لئے بیسویں صدی کا ایک شناخت ساز واقعہ تھا، اور اس کے دیے ہوئے زخم ابھی تک نہیں بھر سکے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان بہت سے دوستوں، رفیقوں اور مشیروں نے، جن پر میں نے انحصار کیا اور مشورہ لیا، اس قدر

☆ هیروئک هندو ریزسٹینس ٹو مسلم انویڈرز (636اے ڈی ٹو 1206اے ڈی)، سیتارام گویل، وائس آف انڈیا، نئی دہلی

☆ هیروئک هندو ریزسٹینس ٹو مسلم انویڈرز (636اے ڈی ٹو 1206اے ڈی)، سیتارام گویل، وائس آف انڈیا، نئی دہلی

☆ ابوالقاسم عبیداللہ ابن عبداللہ ابن خورداببہ (اصطخری، ایرانی) عہد وسطیٰ کے فارس کا جغرافیہ داں تھا۔ ان کی تصنیفات میں المسالک الممالک اور صور الاقالیم شامل ہیں۔

اظہار تشکر

معلومات فراہم کی کہ اگر انہیں پوری تفصیل سے بیان کروں تو صفحے کے صفحے بھر جائیں گے۔

ہندوستان اور بیرون ملک کے یہ تمام لوگ، بلا استثنا بے غرض امداد کی مثالیں ہیں، جنہوں نے پوری خندہ پیشانی کے ساتھ، جگہ جگہ سے اوبڑ کھابڑ اور ناقابل فہم مسودے کو 'جبراً پڑھنے' کی اذیت برداشت کی۔ بعض حقائق اور آراء کے بارے میں میری تصحیح کی گئی، کبھی نرمی وشائستگی سے اور کبھی بصورت دیگر۔ اور کبھی مضبوط ترغیبی انداز سے۔ کئی جگہ مجھ سے اختلاف کیا گیا مگر آخر کار یہ ساری چیزیں اس موضوع میں مضمر ہیں۔

یہ تصنیف خاصی جذبات انگیز ہے۔ اسے ایسا ہونا بھی تھا، کیوں کہ اس چیز کو جسے گاندھی نے 'چیر پھاڑ' قرار دیا تھا تکلیف کے احساس اور جذبات سے کس طرح بچایا جاسکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تاریخ نگار بلاشبہ اس طریق کار پر تیوریاں چڑھائیں گے، مگر بات یہ ہے کہ میں واقعات کو ٹھنڈے، بے حس اور یک سُرے انداز سے بیان نہیں کرسکتا، ایسے انداز بیان سے ہم عاجز آچکے ہیں۔

یہ نہایت مسرت اور اعزاز کی بات ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں نے مسودے کو اس قدر جاں فشانی کے ساتھ پڑھا۔ اس کتاب کے موضوع نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا، جو محمد علی جناح کی اجتماعی زندگی اور 'ہندو۔مسلم اتحاد کا سفیر' ہونے سے پاکستان کا قائداعظم ہونے تک ان کے سیاسی سفر کی روداد ہے۔

آپ تمام لوگوں کا نہایت خلوص دل سے شکریہ: ایم جے اکبر، میجر جنرل (سبک دوش) بھاٹیا، ولیم ڈیلرمپل، ڈیوڈ گوڈآل، وجاہت حبیب اللہ، پالی اوہین لان، منی شنکر ایر، وویک کاٹجو، سنیل کھلنانی، پرتاپ بھانو مہتا، اے جی نورانی، ٹی سی اے راگھون، انتھنی ریمزے، سوزین روڈولف، لائڈ روڈولف، کے سی سنگھ، مانویندر سنگھ، اسٹروب ٹالبرٹ، بی جی ورگھیز اور انجان بھومک، ابھیشیک ڈیکشت اور نٹراجن سوامی ناتھن پر مشتمل تحقیق کی ٹیم۔

خصوصی شکریہ ریسرچ ٹیم، خصوصاً اشوبتی چن فن کا، جنہوں نے ایک خیال کی کچی مٹی کو ایک کتاب میں ڈھالنے میں مدد دی۔ مجھے شبہ ہے کہ ان کی رہنمائی کے بغیر یہ کتاب ناشرین تک پہنچ پاتی۔

بہت بہت شکریہ 'روپا اینڈ کو' اور اس پیشہ وارانہ صلاحیت کا جس کے ساتھ انہوں نے اس کتاب کو اپنے ہاتھوں میں لیا، کہ ان کے بغیر یہ آج آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتی۔ انہوں نے قابل قدر مستعدی، محنت اور مہارت کے ساتھ اس کتاب کی طباعت کے تمام پہلوؤں پر توجہ دی۔

☆ گدروسیا بحر ہند کے شمال مغربی ساحلوں پر پھیلا ہوا ایک خشک پہاڑی علاقہ ہے۔ کانسے کے عہد میں، یہاں علاقے کے چند نخلستانوں کو آباد کرنے والے لوگوں کا قبضہ تھا۔ گدروسیا کو یورپ میں اس وقت شہرت ملی جب سکندر نے صحرائے گدروسیا کو پار کیا جس میں اس کے کئی لوگ مارے گئے۔

سنجنا رائے چودھری نے، غیر معمولی پیشہ وارانہ مہارت اور گہری لگن کے ساتھ، نہایت دیدہ ریزی سے میرے اغلاط سے پُر مسودے (مسودوں) کو بار بار پورے صبر و سکون کے ساتھ پڑھا، یہاں تک اس نے اس کتاب کی شکل اختیار کر لی۔

تمام غلطیاں، کوتاہیاں، فرو گزاشتیں، بھولیں، ظاہر ہے، تمام کی تمام میری ہیں اور میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اس کے لئے ذمے دار صرف میں ہوں۔

یہ کتاب 1947 میں ہونے والی ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں ہے، اس کتاب کا عنوان

جناح

اتحاد سے تقسیم تک

بھی اسی سے برآمد ہوا ہے۔

میں اخبار ڈان کے مالک جناب حمید ہارون اور ان کے صحافیٔ کبیر جناب اردشیر کوواجی کی خدمات کے لئے بھی شکر گزار ہوں کہ دونوں حضرات نے نہایت مہربانی کے ساتھ اپنے اپنے ذاتی ذخیرے میں سے جناح کے فوٹو گرافوں کو استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ان البموں میں سے ہی میں نے چند تصاویر کا انتخاب کیا جو میری نگاہ میں، جناح کے داستانی سفر کی ترجمانی کرتی ہیں۔

سر دوراب جی ٹاٹا ٹرسٹ کا حد درجہ زیر احسان ہوں جس نے نہایت فراخ دلانہ اور از خود تعاون پیش کیا۔

جسونت سنگھ

تعارف
پیچیدہ آغاز

ہند اسلامی تاریخ کے ابتدائی صفحات

حضرت محمد کا وصال 632 میں ہوا اور اس کے چند سال بعد ہی عربوں کے حملے شروع ہو گئے۔ 'اسلام کے لشکر' حجاز سے اٹھے اور تیزی سے فارس، عراق، 'مغرب'، مشرق وسطا اور بازنطینی سلطنت کے علاقوں میں پھیلتے چلے گئے۔ آٹھویں صدی عیسوی تک، کیتھولک اسپین اسلام کی تلوار کا مطیع ہو چکا تھا اور اسلام اب موجودہ فرانس کے قرب و جوار میں دستک دے رہا تھا۔ اس وقت تک 'خلیج بسکے سے دریائے سندھ کے ساحلوں تک اور بحیرہ ارل سے دریائے نیل کے علاقوں تک دنیا کی سب سے بڑی اور طاقت ور ترین سلطنت، عربوں کے زیر نگیں آ چکی تھی' 662 تک، خلیفہ کے روز افزوں اثرات ہندوستان کی زمینی سرحدوں کو چھونے لگے مگر اموی یا عباسی خلفاء میں سے کوئی بھی ہندوستان کے اندر دور تک پیش قدمی نہ کر سکا۔ عام خیال کے برعکس، عربوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کے لئے کوئی چار صدیوں کے دوران کئی کوششیں کرنی پڑیں اور وہ بھی بھاری قیمت چکاتے ہوئے۔ لیکن کابل، زابل اور سندھ کی مملکتیں گیارہویں صدی تک ہی عربوں کے زیر تسلط آ سکیں۔

بحری راستے سے ہندوستان پر اولین حملہ 636 میں ہوا جب تھانا، گجرات اور سندھ کے ساحلی علاقوں پر عربوں کی تین بحری مہمات پسپا کر دی گئیں۔ خشکی کے راستے پہلا حملہ 662 میں، سندھ کے دیبل علاقے میں کیا گیا، جس میں عربوں کو منہ کی کھانی پڑی اور یہی حال بعد کے خلفاء کی کوششوں کا بھی ہوا۔ خلیفہ ولید نے، سندھ پر دوبارہ حملے کی اجازت طلب کئے جانے پر، عراق کے گورنر کی سرزنش کرتے ہوئے کہا، 'یہ قدم حد درجہ پریشانی کا باعث ہوگا، اس لئے اسے ملتوی ہی رکھنا چاہئے، کیوں کہ جب بھی کوئی لشکر ایسی کسی بھی مہم پر جاتا ہے، بے شمار مسلمان قتل ہوتے ہیں۔ ایسی مزید کسی مہم جوئی کا

خیال ترک کردو۔'☆

مگر عراق کے گورنر یوسف بن حجاج کو آخر کار سندھ کے راجہ داہر کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کا انتقام لینے کے لئے اپنے داماد اور بھتیجے محمد بن قاسم کی سربراہی میں ایک لشکر تیار کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ محمد بن قاسم کو رخصت کرتے وقت اس کے الفاظ تھے: 'خدا کی قسم میں عراق کی تمام تر دولت، جو میرے تصرف میں ہے، اس مہم پر صرف کرنے کو تیار ہوں اور یہ کہ میرے دل کی آگ کے شعلے ٹھنڈے نہیں ہوں گے جب تک میں انتقام نہیں لے لیتا۔'☆

دیبل کو 712 میں فتح کیا گیا جب راجہ داہر محمد بن قاسم کے ساتھ ایک کھلی لڑائی میں ہلاک ہوا۔ اس کی رانی نے 'جوہر' کیا مگر ان کے بیٹے عربوں کے خلاف مزاحمت جاری رکھنے کے لئے زندہ بچ رہ گئے۔ اس کے بعد جلد ہی نئے خلیفہ سلیمان نے محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا، اور راجہ داہر کے بیٹے نے اپنی مملکت کا بیشتر حصہ دوبارہ حاصل کر لیا۔

نویں اور دسویں صدیوں میں، عباسی خلفاء کی طاقت بہت کم رہ گئی تھی جس کی وجہ سے ان کے لئے دور دراز علاقوں میں اپنے نمائندے تعینات کرنا مشکل ہو گیا۔ دسویں صدی میں ہندوستان کا سفر کرنے والے بیشتر عرب سیاحوں نے اس وقت کی عرب امراء کی دو آزاد ریاستوں، ملتان اور منصورہ، کا ذکر کیا ہے۔ الاستخری نے ☆951 میں، ملتان کے بارے میں لکھا ہے، 'یہاں ایک بت ہے جسے ہندو بہت مقدس تصور کرتے ہیں اور ہر سال دور دراز علاقوں کے لوگ اس کی زیارت کے لئے سفر اختیار کرتے ہیں.......... جب ہندوستانی ان پر دھاوا بولتے ہیں اور اس بت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو مقامی لوگ اسے باہر لے آتے ہیں یہ دکھانے کے لئے کہ اسے توڑنے اور جلانے جا رہے ہیں۔ ہندوستانی یہ دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں نہیں تو وہ ملتان کو تباہ و برباد کر ڈالیں۔' وولزلے ہیگ نے بجا طور پر سندھ پر عربوں کی فتح کو 'ہندوستان کی تاریخ کا ایک واحد معمولی واقعہ قرار دیا ہے جس سے اس وسیع و عریض ملک کے ایک ذرا سے حصے کو ہی متاثر کیا.......... اسلام کی تیز و تند لہر' سندھ اور زیریں پنجاب پر سیلاب ہونے کے بعد کمزور پڑ گئی اور ساحل پر کچھ سامان چھوڑ کر اتر گئی۔'

انڈین ریزسٹینس ٹو ارلی مسلم انویڈرز اپ ٹو 1206 اے ڈی کے مصنف ڈاکٹر رام گوپال مشرا کے مطابق کابل اور زابل کی مملکتوں نے بھی کوئی دو صدیوں تک عربوں کے خلاف بہادری سے مزاحمت کی۔ اس کے

☆ ہیروئک ہندو ریزسٹینس ٹو مسلم انویڈرز (636 اے ڈی ٹو 1206 اے ڈی)، سیتارام گوئیل، وائس آف انڈیا، نئی دہلی

☆ ہیروئک ہندو ریزسٹینس ٹو مسلم انویڈرز (636 اے ڈی ٹو 1206 اے ڈی)، سیتارام گوئیل، وائس آف انڈیا، نئی دہلی

☆ ابوالقاسم عبیداللہ ابن عبداللہ ابن خوردابہ (استخری، ایرانی) عہد وسطٰی کے فارس کا جغرافیہ داں تھا۔ ان کی تصنیفات میں المسالک الممالک اور صور الاقالیم شامل ہیں۔

بعد تقریباً 175 سال تک ان مملکتوں کے حکمرانوں نے، جو شاہی کہلاتے تھے، کابل پر اپنا اقتدار قائم رکھا۔ کابل ان دنوں دریائے کابل کی وادی سے ہندوکش تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں لمگھن، جلال آباد، پشاور اور چرسدا جنوب میں، شمال میں کشمیر کی سرحدوں تک کے علاقے اور مغرب میں فارس تک اس میں شامل تھے۔ زابل مملکت کابل کے جنوب اور بلوچستان (گدروسیا☆) کے شمال میں واقع تھی جس میں دریائے ہلمند کی بالائی وادی اور سیستان کا علاقہ شامل تھا۔

643 میں فارس کی فتح کے بعد، عربوں نے 650 میں وادئ کابل پر حملہ کیا۔ بصرہ کے گورنر عبداللہ ابن عامر نے سیستان پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ مہم ناکام رہی پھر بھی سیستان کو آخرکار 653 میں فتح کرلیا گیا مگر یہ جلد ہی ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس کے بعد سیستان کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے پیش قدمیاں کی جاتی رہیں جن کی زبردست مزاحمت ہوئی۔ اس مزاحمت نے کابل اور زابل کے حکمرانوں کو اس وقت کی عرب لوک کہانیوں کا اہم کردار بنادیا، اور وہ 'ہند کی سرحدوں پر جہاد' سے متعلق قصوں کے ہیرو بن گئے۔

رزمیہ نظم راج ترنگنی کے شاعر کلہن نے بہت سے اشعار اس 'ہندوشاہی' کی مدح میں لکھے ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ، یہ حکمراں پسپا ہوکر پیچھے ہٹتے ہٹتے پنجاب کی طرف جا پہنچے جہاں 1026 میں ان کی طویل مزاحمت بلند اقبال اسلام کی تاب نہ لاکر ختم ہوگئی۔ ان مملکتوں کے زوال کے کوئی 130 سال بعد، کلہن نے اس سلسلے میں نوحہ زن ہوتے ہوئے کہا تھا کہ 'شاہی حکمرانوں کا نام اس علاقے سے ایسا اٹھ گیا کہ لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ راجہ، وزیر اور دربار کبھی تھے بھی یا نہیں۔'

وقت گزرتا گیا اور ہندوستان پر حملے بار بار ہونے لگے جن کا بنیادی مقصد یہاں کی بے پناہ دولت کو لوٹنا تھا۔ اس زمانے میں، بعض ایسے اسلامی بت شکن بھی آئے جنہوں نے اپنی راہ میں پڑنے والی ہر غیر اسلامی علامت، عمارت یا بت کو 'شیطان کی علامات' سمجھ کر مسمار کرڈالا۔ فتوحات، سلطنتیں اور آخر میں 'حملہ آوروں کا ہندوستانی بن جانا'، اسلام ہندوستان میں ان تینوں مراحل سے گزرا لیکن لازمی طور پر اسی زمانی ترتیب میں نہیں۔ حملوں کے دوران، ہندوستان کافروں کو مسلمانوں میں تبدیل کرنے کے تجربے سے دوچار ہوا، یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب ہندوستان نے خود اسلام کی ہی کایا پلٹ کر کے رکھ دی کہ اسلام نے پہلے ہندوستان سے میل جول بڑھایا اور پھر اس میں جذب ہوکر اس کا حصہ بن گیا۔ مگر یہ سب کچھ، جس کے بیان میں ہم نے یہاں صرف چند جملے صرف کئے ہیں، ہوتے ہوتے کوئی ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ لگ گیا۔

☆ گدروسیا بحر ہند کے شمال مغربی ساحلوں پر پھیلا ہوا ایک خشک پہاڑی علاقہ ہے۔ کانسے کے عہد میں، یہاں علاقے کے چند نخلستانوں کو آباد کرنے والے لوگوں کا قبضہ تھا۔ گدروسیا کو یورپ میں اس وقت شہرت ملی جب سکندر نے صحرائے گدروسیا کو پار کیا جس میں اس کے کئی لوگ مارے گئے۔

اسلام کی ان متنوع صورتوں میں ہندوستان کی شرکت اور شمولیت، انسانی تجربات کے ایک وسیع منظرنامے کا احاطہ کرتی ہے، جس نے اس برصغیر کے تمام طول وعرض پر پھیلے ہوئے اپنے سفر کے دوران ایک فاتح عقیدے کی حیثیت سے داخل ہونے، اس ملک کو اپنا گھر بنانے اور پھر اسی وطن کو تقسیم کرکے اسے چھوڑ جانے تک کی مسافت طے کی۔ اسلام بنیادی طور پر حملہ آور اسلامی لشکروں کے ساتھ ہندوستان آیا تھا، اور غرض اس متمول اور زرخیز ملک پر حکمرانی تھی۔ نتیجتاً، اسلام حملہ آور فاتحوں کا عقیدہ بن گیا اور اس پر بیرونی اور اجنبی ہونے کی چھاپ لگ گئی۔

سوال یہ ہے کہ اسلام پہلے اتنی آسانی سے ہندوستانی کس طرح بنا اور پھر، اس ملک میں جو اس کا 'گھر' بن گیا تھا، جغرافیائی لحاظ سے ایک فالتو وجود کیوں بن گیا۔ ہندوستان کے بادشاہوں، شہنشاہوں اور حکمرانوں کا عقیدہ ہونے کے بعد، اسلام ان لوگوں کا عقیدہ بن گیا جنہوں نے اس ملک کے حصے بخرے کرائے، اپنے آپ کو اسی ملک سے بے دخل (تصوراتی طور پر) کیا اور اس کے مشرقی اور مغربی علاقوں کو بطور وطن اختیار کرلیا؛ اور اس طرح اس عقیدے کو، جو اسی ملک کا ہو چکا تھا، اس کی اصل شناخت سے متعلق مستقل شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والوں سے تذلیل کن انداز سے پوچھا جانے لگا: 'تم دراصل ہو کہاں کے؟' اور یہ چھوڑ دیئے گئے، جو اس باختہ مسلمان پُر ملال خود کلامی میں کہتے ہیں: 'کیا ہم لوگ بھی امت کا حصہ نہیں ہیں؟' پھر یہ کہ مسلم لیگ کی 'تمام مسلمانوں کا واحد نمائندہ ہونے' کی ڈینگ کا کیا ہوا؟ لیگ نے دعوا کیا تھا کہ وہ اسلام کی خالص نظریاتی شناخت کی علم بردار ہے اور یہ کہ مسلم رائے عامہ کے ایک غالب حصے کی نمائندگی کرتی ہے، اور اس لئے اس نے مسلمانوں کو ایک علاحدہ 'قوم' قرار دیتے ہوئے ایک علاحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔ مگر یہ تکلیف دہ سوال آج بھی ہمارے فکر واحساس پر ضرب لگاتا ہے کہ 'علاحدگی کس سے؟' اور ان لوگوں کے بارے میں کیا جو 'جغرافیائی' لحاظ سے الگ نہیں ہوئے؟ کسی جغرافیائی (ارضی-سیاسیاتی) وحدت کو تقسیم کیسے کیا جاتا ہے؟ نقشے پر صرف ایک لکیر کھینچ کر؟ ایک عمل جراحی کے ذریعے؟ ماؤنٹ بیٹن نے کہا، اور افسوس کہ نہرو، پٹیل اور کانگریس پارٹی نے اسے قبول کرلیا۔ جناح نے تو خیر اس کا مطالبہ ہی کیا تھا۔'

مسلم لیگ جناح کی قیادت میں اس لحاظ سے فتح یاب ہوئی کہ اس نے جو مقصد اپنے سامنے رکھا تھا اسے حاصل کرلیا۔ لیگ جناح کا سیاسی آلۂ کار تھی، اور ان کی ذہانت اور تیزی طبع نے انہیں اس قابل کیا کہ کانگریس پارٹی کی، بنیادی طور پر تیسری دہائی کے بعد سے کی جانے والی غلطیوں سے پیدا شدہ کمزوریوں کا خوب خوب فائدہ اٹھائیں۔ پھر انہوں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد سلطنت برطانیہ کی ناتوانی کا استعمال کیا، اور اس طرح اپنے لئے پاکستان حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی، وہ پیدائش سے ہی 'کانا کترا' کیوں نہ رہا ہو۔

بہت سے مبصرین نے اس معاملے پر سوچا ہے مثلاً سی ایچ فلپس اور ڈورین رائٹ نے اپنی کتاب دی پارٹیشن آف انڈیا-پالیسیز اینڈ پرس پیکٹیوز 1945-1935 میں لکھا ہے کہ لیگ کی یہ فتح یابی تو مشہور

زمانہ ہے مگر اس پر ماہ وسال کی کچھ گرد جم گئی ہے۔ اب اس راستے پر ہم دوبارہ سفر کریں گے۔

یہ بنیادی طور پر محمد علی جناح کا سیاسی سفر تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ شخص جسے بیسویں صدی کے پہلے 47 سال تک ہندوستان کے صف اول کے رہنماؤں میں مرکزی اہمیت حاصل رہی ہو، آخر کس طرح اس کے حاشیے پر ڈال دیا گیا؟ اس طرح یہ 'ہندو۔ مسلم اتحاد' کے ماورائی خیال کا سفر بھی ٹھہرتا ہے۔ وہ کیا تلاش تھی، کیسا محرک تھا، جس کے سبب جناح اس خیال کی یکسر مخالف انتہا تک جا پہنچے۔ وہ جو پہلے گوکھلے اور پھر سروجنی نائڈو کے الفاظ میں 'ہندو۔ مسلم اتحاد کی علامت یا سفیر' تھے آخر کیوں دونوں فرقوں کی علاحدگی کے بنیادی ترجمان اور آواز اور پاکستان کے معمار، بلکہ عائشہ جلال کے لفظوں میں اس کے 'واحد ترجمان' بن گئے؟ لائڈ اور سوزان روڈولف 1 نے اپنے ایک مقالے میں یہی سوال پر وقار سلاست کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے: 'جناح کو 'وجود کی گہرائیوں تک لبرل، سب کو قبول کرنے والا اور سیکولر' سمجھا جاتا رہا؛ وہ ہندوستان کی وحدت کے اتنے قائل تھے کہ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے انہیں ''کانگریس سے زیادہ کانگریسی'' قرار دیا: 2۔ تو پھر یہ کیا ہوا؟ تقسیم جیسا قیامت خیز سانحہ کیسے پیش آیا جب 1940 کی دہائی کے اواخر تک یہ کسی کے سان وگمان تک میں نہیں تھا؟ اور اس کی کوئی قابل فہم توجیہہ 1946 تک بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ 'ہندو۔ مسلم اتحاد کا یہ سفیر'، نرم خیال ماہر آئین اور ہندوستانی قوم پرست، محمد علی جناح، وائسرائے لارڈ ویول کے لفظوں میں ایک 'فرنیکنسٹین کا مانسٹر' (وہ جو اپنے خالق کو ہی کھا جائے) کیسے بن گیا، اسی سرزمین کو پارہ پارہ کرنے والا جس نے اسے اس قدر فیاضی کے ساتھ وجود دیا تھا؟

تقسیم کے اس المناک سانحے کے بعض اور اتنے ہی اہم پہلو بھی ہیں جن پر غور کیا جانا چاہئے۔ کیا اس تقسیم، زمین اور لوگوں کی چیر پھاڑ کے اس سانحے نے خود ہندوستان کی بنیادی شناخت پر ہی سوالیہ نشانات نہیں لگائے؟ اگر، جناح کے بقول 'ہندوستان کے مسلمان ایک علاحدہ قوم تھے' تو پھر اصولی طور پر خود ہندوستان کیا تھا اور ہے؟ جناح نے بعد کے برسوں میں کہا کہ 'ہندوستان کوئی متحدہ ملک نہیں ہے۔' اگر یہ ایک 'متحدہ ملک' نہیں ہے تو پھر ہم کیا ہیں جو یہاں بچ رہے ہیں؟ کیا ہم مختلف فرقوں کا مجموعہ ہیں؟ یا کئی قوموں کا مجموعہ؟ مگر ہندوستان یقینی طور پر ایسا نہیں کہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اس لئے کہ ہم تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے اور دعوا کر سکتے ہیں کہ ہم (جائز احساس فخر کے ساتھ) نے بحیثیت قوم اپنے تمام شہریوں کو مساوی حقوق اور مشترکہ شہریت دی ہے۔ تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ ہم نے علاحدہ کرنے والی، مذہبی، ذات برادری کی اور فرقہ وارانہ شناختیں کیوں مقرر کیں اور کر رہے ہیں اور اس طرح ہندوستان کی اس وحدت اور اتحاد کو موثر اور عملی طور پر پارہ پارہ کر دیا اور کر رہے ہیں جس کا ہم جگہ جگہ دعوا کرتے ہیں؟ اگر ضرورت مندوں کے لئے یہ ایجابی اقدام، 'ریزرویشن' کا یہ دست امداد، تاریخی اور سماجی نابرابریوں کی تلافی کے لئے ہے تو پھر ہم ایک غلط سیاسی تصور پر مبنی سماجی تالیف کے عمل کو جاری رکھ کر ایک سنگین غلطی کر رہے ہیں۔ آخر 'مسلمانوں کے واحد ترجمان' کی حیثیت سے جناح کا بنیادی اور مسلسل مطالبہ یہی تو تھا؟ وہ بھی تو منتخب نمائندہ اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ایک خاص حصہ محفوظ کئے جانے کے طالب تھے۔ اس پر گاندھی اور دیگر لوگوں نے، کم از کم شروع میں، پس وپیش کا رویہ اختیار کیا مگر بعد میں،

حیرت انگیز طور پر، ریزرویشن کی پھسلن بھری، تقسیم کرنے والی، بلند تر ہوتی جانے والی اس سیڑھی پر چڑھنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں لگ گئے۔ لیکن یہ بحث جناح کے 'سفر' سے متعلق ہمارے بیان سے الگ ہے۔

آیئے ایک بار ذرا الٹ پلٹ کر دیکھیں۔ یہ ایک عجیب ستم ظریفی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں موجود بہت سے زبردست ماہرین قانون جناح اور نہرو 'مسلمانوں کی خصوصی حیثیت' کے بنیادی حامی تھے۔ جناح براہ راست، نہرو بالواسطہ طور پر۔ اگر تمام ہندوستانی شہری آئین کی رو سے مساوی تھے اور ہیں، تو جناح مسلمانوں کے لیے ایک 'خصوصی' حیثیت کا مطالبہ کر کے، اور نہرو جناح کے مسلمانوں کا 'واحد ترجمان' ہونے کے دعوے کی مخالفت کرتے ہوئے، ہندوستانی شہریوں کے مختلف زمرے قائم کرنے کے وکیل نظر آتے ہیں۔ یہ ستم ظریفی بھی نہایت تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے جب ہم افسوس کے ساتھ (مگر پلٹ کر) دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں ہی، جو اپنے وقت کے دو عظیم ہندوستانی تھے، فی الواقع یا بظاہر ہندوستان کے 'مسلمانوں کا ترجمان' بننے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ اس طرز فکر و عمل کا بنیادی سبب یہ تھا کہ دونوں ہی عملاً یورپی فکر و خیال اور سماجی معیاروں کے ماحول میں اس قدر رچے بسے ہوئے تھے کہ وہ افسوس ناک طور پر ہندوستان کے بنیادی تہذیبی شعور و احساس سے بہت دور جا پڑے۔ تو پھر ایسے میں متحدہ ہندوستان کا ترجمان کون بچا؟ افسوس کہ صرف مہاتما گاندھی۔

یہ بھی ایک سفاک سچ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا نتیجہ اس کے اصل مقصد کا بالکل الٹا نکلا۔ تقسیم نے، فرقوں کے درمیان تنازعات کو حل کرنے کے بجائے، ہمیں ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر فرقہ وارانہ شناختوں کے شدید تر تصادم کی ایک وراثت سونپ دی۔ مثبت اقدامات یعنی مسلمانوں اور دیگر ذات برادریوں اور فرقوں کے لئے ریزرویشن، بدقسمتی سے، ان شناختوں کو ختم نہیں کرتا بلکہ انہیں نمایاں تر کر دیتا ہے، ان کی جڑوں کو سینچتا ہے اور علاحدگی کی زمین میں مفاد پرستی کی کھاد ڈال کر اختلافات کو پروان چڑھاتا ہے۔ ریزرویشن، معاشرے کو خانوں میں بانٹتا ہے، یہاں تک قومی شناخت کو پارہ پارہ کر ڈالتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے 'خصوصی تحفظات' نے یہی کیا۔

مگر یہ سب اس زمیں کا محض ایک خاکہ تھا جہاں یہ سفر کیا گیا۔ مگر تاریخی زمانہ کیا تھا جس کے بارے میں ہم بات کر رہے ہیں؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ یہ 1857 اور 1947 کا درمیانی زمانہ تھا۔ اول الذکر کا الم ناک تجربہ، ہندوستان کے اقتدار اعلا کی علامتوں کے ایک غیر ملک کے... تاجروں کی شکل میں بحری لٹیروں کے بھاری پیروں تلے بے دردی سے روندے جانے سے عبارت ہے۔ مغل ہندوستان (موٹے طور پر شمالی ہندوستان) کے اقتدار کا زوال بلاشبہ اٹھارہویں صدی میں شروع ہوا تھا مگر 1857 ایک پُرتشدد گرفتگی کی علامت تھی۔ بیسویں صدی کی فیصلہ کن چار دہائیوں کا مطالعہ ہم اس پس منظر میں کریں گے جو 1906 میں شملہ وفد سے لے کر 1946 کے آزادیٔ ہند ایکٹ تک کے واقعات کو محیط ہیں۔ ان چار دہائیوں نے ہی پورے برصغیر ہند کی کایا پلٹ کر کے رکھ دی اور نہایت اہم انداز سے عالمی سطح کے

واقعات ومعاملات کو بھی متاثر کیا۔ یہ سفر 'خصوصی تحفظات'، جن کی منطق جمہوری نمائندگی کے عددی حساب میں مضمر تھی، سے لے کر ملک کی تقسیم تک جاری رہا۔ اس سے اس الم ناک سفر کے تصوراتی، علاقائی اور تاریخی حدود اربعہ طے ہوتے ہیں۔ میں اس جوکھم بھرے راستے پر قدم رکھ رہا ہوں کہ مجھے معلوم کرنا ہے کہ یہ سب ہوا کیا اور کیوں؟ 1947 کی یہ قیامت صغرا آخر برپا کیسے ہوئی؟ اور ظاہر ہے ایسے تہس نہس کر دینے والے نتائج کے حامل سانحے کے بارے میں سب کی رائے یکساں ہو ہی نہیں سکتی۔

ہندوستان میں یہ خیال بہت عام ہے کہ تقسیم ایک المیہ، ایک بھیانک چیر پھاڑ تھی، لہٰذا اس سلسلے میں ہونے والے مباحث لامحالہ اس کے اسباب معلوم کرنے اور برصغیر کی وحدت کو برقرار رکھنے اور ساتھ ہی تقسیم کے بھیانک نتائج کے زخم بھرنے میں ناکامی کے ملزم تلاش کرنے پر مرکوز رہتے ہیں۔ اور پھر قابل قدر غیر جانب داری کے ساتھ اس سب کے لئے اکثر کانگریس کو الزام دیا جاتا ہے: اگر انہوں نے یہ کیا ہوتا یا وہ نہ کیا ہوتا تو تقسیم کو ٹالا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف پاکستان میں، جہاں یہ بات فطری طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ تقسیم کو ٹالا جا سکتا تھا، یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ 'مسلم قوم پرستی' کے ابھار کو تاریخ کی گہرائیوں... اور اسے 'ایک مسلم ریاست/قوم کے قیام کے بظاہر ناگزیر ہونے' سے جوڑ دیا جائے۔

ان تمام امور کا ایک تصوراتی نقشہ مرتب کرنا ہی، بنیادی طور پر اس ساری تلاش و جستجو اور خود اس کتاب کی پیدائش کا سبب ہے۔ مگر کتاب کا مواد اس سے بھی صاف وسادہ ہے۔ ان تمام عہد ساز دہائیوں کے دوران پیش آنے والے چیلنجوں اور راہ کی عظیم بلندیوں اور خوف ناک پستیوں کے تجربات کا بیان کرنے کے لئے ایسا ہونا ضروری تھا۔

یہاں آپ کو ایک مشکل میں شریک کرنا ضروری ہے۔ کیا یہ بیان ہندوستان کی تقسیم کے المیے کے دیگر بیانات میں سے ایک ہے، کیا یہ روداد محض ان واقعات کی کھتونی ہے، واقعات کی ایک سیدھی لکیر پر چلنے والی سادہ ماجرا نویسی۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے بارے میں کچھ عرصہ قبل اسکاٹ لینڈ سے میرے ایک دوست نے مجھے بتایا، یہ کہتے ہوئے کہ 'بابائے تاریخ' ہیروڈوٹس کا یہی طریقہ تھا۔ جس کے نزدیک 'تاریخ'، دست یاب مواد کی ایک منظم اور مصدقہ تالیف 'تھی، یا پھر اسے تاریخ کے اس تصور کے مطابق ہونا چاہیے جو عظیم عرب تاریخ نویس ابن خلدون نے اپنی عہد ساز تحریر مقدمہ 4 میں پیش کیا تھا؟

ابن خلدون کے مطابق: تاریخ نویسی متعدد ذرائع اور مختلف النوع علم کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے لئے ایک اچھا مفکرانہ ذہن اور فکری جامعیت درکار ہے جس سے تاریخ نویس کو سچائی تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور وہ کوتاہیوں اور غلطیوں سے بچا رہتا ہے۔ اگر وہ تاریخی معلومات کی اس شکل پر بھروسا کرتا ہے جو اس تک پہنچی ہے اور اسے رسوم وروایات سے پیدا شدہ اصولوں، سیاست کے بنیادی حقائق، تہذیب کی نوعیت یا انسانی سماجی تشکیلات کا تعین کرنے والے حالات کا واضح علم نہیں ہے، اور مزید یہ کہ اگر اس میں بعید العہد یا قدیم مواد اور قریب العہد یا عصری مواد کے درمیان تقابل کے ذریعے ان کی

قدر متعین کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ اکثر و بیشتر ٹھوکریں کھانے، پھسلنے اور حقیقت کی راہ سے بھٹکنے سے نہیں بچ سکے گا۔ تاریخ نویسوں، مفسرین قرآن اور حدیث کے ممتاز راویوں نے بار بار واقعات اور حقائق کے بیان میں غلطیاں کی ہیں۔ انہوں نے انہیں ان کی قدر و قیمت کا تعین کئے بغیر اسی طرح قبول کر لیا جس طرح وہ ان تک پہنچی تھیں۔ انہوں نے ان تاریخی معاملات کو ان میں مضمر اصولوں کی بنیاد پر جانچ کر نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے ان کا تقابل دیگر یکساں مواد سے کیا۔ مزید یہ کہ، انہوں نے فلسفے کے پیمانے پر، اشیاء کی ماہیت کے علم یا تفکر اور تاریخی بصیرتوں کی مدد سے کوئی تحقیق نہیں کی۔ لہٰذا وہ راہ حقیقت سے بھٹک گئے اور اپنے آپ کو بے بنیاد قیاسات اور اغلاط کے صحرا میں گم گردہ راہ پایا۔ 5

میں تاریخ نویسی کے اصولوں کے ان نہایت تابناک مگر اتنی ہی جامع بنیادوں میں ایک بھی لفظ کی جمع یا تفریق نہیں کر سکتا کہ اب انہیں بنیادوں کے دائرے میں رہ کر اور اس کے پیمانے پر پورا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے 'پاکستان کا قائداعظم' ہونے تک جناح کے سفر کی تعبیری جدوجہد کرنی ہے۔

میں مانتا ہوں کہ تمام بیانات ذاتی اور تاثراتی ہوتے ہیں، وہ اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے۔ اس جاں گداز زمانے سے متعلق کسی بھی بیان یا تعبیر کو، جس نے ایک قدیم تہذیبی وحدت، ہندوستان، پر تقسیم کی اذیت برپا کی ہو، پہلے سے موجود مسلمات، نظریات یا معروضیت کے دعووں کے دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا، نہ بیان کی سطح پر اور نہ تجزیہ و تعبیر کی سطح پر۔ یہ قدیم وحدت ٹوٹی کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ سوال ہم پر ایک آسیب کی طرح طاری ہے اور ہر شخص وہی بیان کرتا ہے جو اسے نظر آتا ہے اور جس طرح وہ واقعات کی تعبیر کرتا ہے۔

کیا اس حد درجہ کرب انگیز سوال کا جواب مغربی فلسفیانہ تصورات میں تلاش کیا جا سکتا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ نہیں۔ تو پھر کیا اسے واقعات کے سیدھے سپاٹ بیان کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ جواب پھر وہی واضح طور پر نفی میں ہے۔ جب تک ہم اس زمانے کو خود جئیں گے نہیں، ان تنازعات کے ماحول میں سانس نہیں لیں گے، ان ماہ و سال کے دوران جاری زبردست مباحث میں ہر ممکن قربت اور گہرائی سے شریک نہیں ہوں گے اور وہ بھی محض واقعات پیش آنے کے بعد ان کا بیان کرنے والوں یا ماضی کے حالات پر تبصرہ کرنے والوں کی طرح نہیں، اور یہ سب وہ کم سے کم کوشش ہے جو ہم کر سکتے ہیں، تب تک ان زمانے کے فکر و خیال اور جذبات و احساسات کی تمام صورتوں اور رنگوں کو گرفت میں نہیں لا سکیں گے۔ اور ان جذبوں کو جئے بغیر، اپنے نقطہ ہائے نظر کیتنگ یرقان زدہ شیشوں کے ذریعے اس زبردست تاریخی اتھل پتھل پر ہمارا ہر تبصرہ، رزمیہ کے پیمانے کے اس المیے کی محض ایک افسوس ناک مزاحیہ تضمین ہو کر رہ جائے گا۔

1

ہندوستان اور اسلام

ہندوستان-اسلام-قومیت

محمد علی جناح نے، ہندو-مسلم اتحاد کا سفیر ہونے سے پاکستان کا قائداعظم ہونے تک، جو مسافت طے کی تھی اس کے بارے میں ہماری تفتیش کا سلسلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ 'مسلمان ایک علاحدہ قوم ہیں' کے حد درجہ سوال طلب تصور نے پاکستان کے وجود میں آنے کی راہ ہموار کی تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ اسی عین 'مسلم قوم' کے ایک اٹوٹ حصے نے اس تصور کو پوری طرح مسترد کر دیا، اور تشدد، ناقابل بیان انسانی کرب و ابتلا اور ہلاکت خیزی کا ایک اور منظر نامہ تشکیل دے کر اسے داغ مفارقت دے گیا؟ بنگلہ دیش نے آخر اپنی مرضی سے علاحدگی اختیار کیوں کی؟ ہمیں اس سوال پر قدرے تفصیل سے غور کرنا ہوگا۔ مگر اس سے پہلے، ہندوستان میں اسلام کے سفر کو زیر غور لانا ضروری ہے اور اس بات کو بھی کہ وہ جو ہندوستان میں پلا بڑھا تھا، اس نے اس سے الگ ہونے کے 'جھوٹے پن' کا انتخاب آخر کس طرح اور کیوں کیا؟

ہندوستان میں لشکر کشی سے لنگر انداز ہونے تک کا اسلام کا تجربہ، جس کے نتیجے میں وہ یہاں کی مٹی میں رچ بس گیا اور پھر اسی اتحاد و یکجائی کے خلاف پرشور برہمی کا اظہار کر کے ہندوستان کو مسترد کرنے اور ایک علاحدہ اسلامی ملک حاصل کرنے کی جستجو، اور آخر میں ایک 'عمل جراحی' کے ذریعے حد درجہ جلد بازی اور ہڑبڑی میں ایک 'کرم خوردہ پاکستان' پر اکتفا کر لینے کا سلسلہ ایک ہیجان انگیز منظر نامہ تشکیل دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا کہ ماقبل تقسیم برصغیر ہند، جہاں مسلمانوں کی آبادی سارے مشرق وسطیٰ سے بھی زیادہ تھی، اس عظیم مذہب کا عالمی علم بردار نہ بن سکا اور اس کے بجائے اس نے تقسیم کو ترجیح دی؟

کیا اس وجہ سے کہ اسلام یہاں ہمیشہ ایک بیرونی درانداز کی طرح رہا، کچھ اس طرح جیسے وہ پوری طرح سے اپنے گھر میں نہ ہو، اور اسے ایک دن یہاں سے رخصت ہونا ہو، کہ تقسیم کا مطلب یہی ہے۔ یا پھر یہ کہ تقریباً ڈیڑھ الفیے کے دوران، 'اسلام، اسلامی روایات اور مسلمان' پوری طرح دیسی ہو گئے، اسی مٹی کے اور اسی سے آئے ہوئے؛ 'برصغیر ہند کے تہہ در تہہ تہذیبی خطہ خاک' کا ایک ناقابل تردید حصہ؟ اور اگر یہ بات درست ہے تو پھر محمد علی جناح نے کیوں اور کیسے یہ دعوا کیا کہ 'مسلمان (اور صرف ہندوستان ہی میں کیوں؟) ایک علاحدہ قوم ہیں' اور ہم (جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور کانگریس رہنماؤں کی ایک پوری کیمپ) نے اس باطل تصور کو کیوں قبول کر لیا اور اپنے ملک کو کیوں تقسیم ہو جانے دیا؟ یہ سب بھی ہماری تفتیش کا موضوع ہے۔6

یہ بات تو از خود ظاہر ہے کہ اسلام، عیسائیت اور زردشتیت کی طرح، ہندوستان کا مقامی نہیں ہے۔ کہیں اور پیدا ہونے والا اسلام حملہ آور کے ہاتھوں سے تبلیغی تلوار چلاتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا، اور اس طرح وہ ایک غیر ملکی کی طرح یہاں آیا اور کم از کم شروع میں بالکل ایسا ہی بن کر رہا (ایک اجنبی عقیدہ)۔ مگر ہندوستان ایک تہذیبی سمندر ہے۔ جس میں بہت سے عقیدوں کی دریاؤں نے اپنے آپ کو انڈیل دیا۔ اس لحاظ سے اسلام بھی یہاں کی تہذیبی تہوں کا ایک حصہ ہے، جو یہاں کی مٹی اور پانی میں جذب ہو کر، اور پھر باقی سب کے ساتھ مل کر اس عجوبے کا، جسے ہندوستان کہتے ہیں، ایک ناقابل تقسیم حصہ بن گیا۔ مسئلہ دراصل اس خاص حصے کو ہندوستان کی بنیادی زمین سے الگ کرنے اور ایک ممتاز حیثیت دینے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ یہ بنیادی زمین ویدک ہے، اگرچہ بعض تاریخ داں اس بات پر معترض ہیں۔ اس کے بعد ہندی (انڈک) یا دیسی سطح ہے۔ زیادہ حالیہ ہند اسلامی یا ہند۔ انگریزی سطحیں بہت بعد میں شمار میں آئیں۔ مرحوم گری لال جین نے خاصے لائق اعتبار دلائل کے ساتھ کہا کہ 'اسلام ایک کلیت' ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: 'جدید ذہن اسلام کو سمجھ ہی نہیں سکتا، خصوصیت کے ساتھ اس لیے کہ یہ ایک کلیت ہے۔ اسلامی معاشرے کی جڑیں اسلامی عقیدے میں پیوست ہیں، اسے کسی اور طرح سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس نکتے کو حد درجہ نشان زد کیا جانا چاہیے کہ اسلامی معاشرہ دین مرکوز ہے، دینی، سیاسی نہیں۔'

☆ ہیروئنگ ہندو ریزسٹینس ٹو مسلم انویڈرز (636اے ڈی ٹو 1206اے ڈی)، سیتارام گوئل، وائس آف انڈیا، نئی دہلی

☆ ہیروئنگ ہندو ریزسٹینس ٹو مسلم انویڈرز (636اے ڈی ٹو 1206اے ڈی)، سیتارام گوئل، وائس آف انڈیا، نئی دہلی

☆ ابوالقاسم عبیداللہ ابن عبداللہ ابن خورداذبہ (اصطخری، ایرانی) عہد وسطیٰ کے فارس کا جغرافیہ داں تھا۔ ان کی تصنیفات میں المسالک الممالک اور صور الاقالیم شامل ہیں۔

ہندوستان میں اسلام (مسلمانوں) کا داخلہ تین بڑی لہروں میں ہوا جو تقریباً آٹھ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ پہلی لہر، ساتویں اور آٹھویں صدیوں کے دوران، عربوں کی تھی۔ وہ سندھ میں داخل ہوئے، چند چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑیں اور چل دیے۔ کراچی سے تقریباً چالیس کلومیٹر جنوب میں بن بھور نام کی ایک بستی ہے جو اب بڑی حد تک اجاڑ ہو چکی ہے۔ اسے اکثر محمد بن قاسم کی اولین جائے قیام کہا جاتا ہے (اگر یہ اس بات پر سوال اٹھائے جاتے ہیں)۔ مانا جاتا ہے کہ ہندوستان میں پہلی مسجد بھی اس بن بھور میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ اب کھنڈر بن چکی ہے۔ (دوسری طرف مالابار ساحل بھی اولین مسجد کے اعزاز کا دعوے دار ہے، لیکن ہندوستان میں مسجدوں کا شجرہ نسب بیان کرنا ہمارے مطالعے کا حصہ نہیں ہے)۔ دوسری لہر، دسویں اور گیارہویں صدیوں کے دوران، افغانوں اور اہل فارس کی جنگی مہمات کی صورت میں آئی، جس کے بعد بارہویں اور سولہویں صدیوں کے درمیان ترک۔ منگول حملے ہوتے رہے۔ محمد بن قاسم کے سب سے پہلے حملے کے بعد کسی عرب نے بہ مشکل ہی ہند میں قیام کیا۔ اسی طرح نادر شاہ جیسے بعد کے پرشیائی حملہ آوروں میں سے بہت کم یہاں ٹھہر سکے۔ مگر افغانوں اور مغلوں (ترک منگول) کے بارے میں یہ بھی نہیں کہی جا سکتی۔ بہت سے افغان ہندوستان میں رہ گئے انہوں نے اسے ہی اپنا گھر بنا لیا۔ یہی مغلوں نے کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ یہاں رچ بس گئے اور ہر لحاظ سے 'ہندوستانی' ہو گئے۔ مگر پھر یہی کہ ہمارا بنیادی مقصد اسلامی فوجوں کے حملوں کی ان پے بہ پے سہروں کا شمار کرنا نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف اس زمانے کی بعض تاریخی گتھیوں کا اجمالی تجزیہ کرنے کے لئے ہی ذرا دیر ٹھہریں گے۔

مورخین ہندوستان میں فارسی۔ ترکوں کی آمد کو عموماً 'مسلمانوں کی فتح' سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ بات خلاف واقعہ معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ تیرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے درمیان کے سارے عرصے کو 'مسلم دور' قرار دینا غلط بھی ہے اور سہل پسندانہ بھی۔ بنیادی طور پر اس لئے کہ اس میں ایک تصوراتی اور اصطلاحی غلطی راہ پا گئی ہے جو گزشتہ صدیوں کے دوران جڑ پکڑتی چلی گئی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی حملے کو حملہ آور کے عقیدے سے مخصوص کرنا چاہئے؛ یعنی کیا کسی حملہ آور کو اسلامی چنگیز (جو کسی بھی منظم مذہب کو نہ مانتا ہو) آباء و اجداد کی پرستش کرنے والا اشمن پرست وغیرہ کہا جا سکتا ہے؛ یا یہ کہ کسی حملہ آور کی پہچان اس کی نسل اور جائے پیدائش سے وابستہ کی جا سکتی ہے؟ جب ہم ہندوستان پر ہونے والے ان حملوں کا موازنہ دنیا کے دیگر حصوں میں اسی قسم کے تاریخی تصادمات سے کرتے ہیں تو اس بات کا خلاف واقعہ ہونا اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم امریکہ پر 'عیسائی فتح' کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟ یا ایسا کیوں ہے کہ کولمبس کے تعلق سے 1492 کے بعد کے زمانے کو امریکہ کا 'عیسائی دور' کیوں نہیں کہا جاتا؟ اگر چہ اسپین نے وسطی اور جنوبی امریکہ کی اپنی فتوحات کو پورے غیر مبہم انداز سے عیسائیت سے مخصوص کیا ہے مگر ان کے ہاتھوں اسی براعظم کے ایک پورے طرز حیات اور

☆ گدروسیا بحر ہند کے شمال مغربی ساحلوں پر پھیلا ہوا ایک خشک پہاڑی علاقہ ہے۔ کانسے کے عہد میں، یہاں علاقے کے چند نخلستانوں کو آباد کرنے والے لوگوں کا قبضہ تھا۔ گدروسیا کو یورپ میں اس وقت شہرت ملی جب سکندر نے صحرائے گدروسیا کو پار کیا جس میں اس کے کئی لوگ مارے گئے۔

پھلتی پھولتی تہذیبوں کو تباہ و برباد کئے جانے کو محض ہسپانوی فتوحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں؟ قدیم علاقوں کی اس زبردست تاراجی کو کبھی بھی 'عیسائی غارت گری' نہیں کہا جاتا۔ آخر کیوں؟ یہاں میں ایک سامنے کی بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا: ایسا کیوں ہے کہ ہندوستان کی برطانوی فتح (اگر چہ مرحلہ وار) کو 'برطانوی' کہا جاتا ہے 'عیسائی' نہیں۔ تاریخ نگاری کی یہی روش ہے جس کے سبب ہم ابھی تک ان گمراہ کن اصطلاحات اور فقروں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ چبھنے والا سوال اب بھی برقرار ہے کہ صرف اسلام کے ساتھ ہی اس معاملے میں استثنائی سلوک کیوں کیا جائے؟ ہندوستان کی اسلامی فتح کے تصور نے ہندوستان کے مورخوں کو آخر اس طرح اپنی گرفت میں کیسے لے لیا؟ 7 یہ تصور اس اکیسویں صدی میں بھی چلا آرہا ہے۔ اس کے بہت سے ضرر رساں نتائج مرتب ہوئے ہیں، اور ان میں سے ایک نتیجہ جناح کا یہ دعوا تھا کہ وہ ہندوستان کے اندر ایک علاوہ 'قوم' کی موجودگی کے علم بردار ہیں اور اس کے لئے ایک الگ جغرافیائی خطہ چاہتے ہیں، اور اسے اس وقت کے ہندوستان میں سے کاٹ کر ہی فراہم کیا جاسکتا تھا۔

حملہ آوروں (انگریز) نے 1947 میں آخر یہی کیا لیکن ہماری رفتار ایک بار بہت تیز ہوگئی ہے۔

چوں کہ عہد وسطا کے ہندوستان کے بیشتر ہند۔ فارسی وقائع نگار اسلام کو اپنے آقاؤں کے جاہ وحشم سے وابستہ کرتے تھے، اس لئے انہوں نے خوشامدانہ غلط بیانیوں سے کام لیتے ہوئے ان کی حکومتوں سے متعلق اپنے بیانات میں اس قسم کی لغویتیں بھی داخل کردیں کہ: 'ہندوستانی تاریخ' اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب مسلمانوں نے دہلی/ آگرہ/ مانوا کے اطراف کے علاقوں پر راج کرنا شروع کیا۔ اس رویے کی جڑیں ترکوں کے اقتدار کے ابتدائی کے زمانے میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بھی ایک ستم ظریفانہ تضاد ہے کہ جب دہلی سلطنت یہاں قدم جمانے کی کوششیں کررہی تھی، 8 ٹھیک اس زمانے میں اسلام کا خطۂ پیدائش منگولی حملوں سے تہس نہس ہو رہا تھا۔ منگولوں کی .... توانائی اور ان کے حملوں کی وحشت ناک شدت نے ایران اور وسط ایشیا کے بہت سے فارسی۔ ترکوں کو ان کی زمینوں سے اکھاڑ پھینکا ان میں سے بہت لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں انہوں نے پناہ مانگی جو انہیں حاصل ہوئی۔ دہلی کی نئی نئی سلطنتوں میں انہیں ملازمتیں بھی مل گئیں۔ 1258 تک، بغداد، جو عباسی خلافت کی راجدھانی تھا، پوری طرح تباہ کیا چکا تھا اور خلیفہ کے منصب پر ترک قابض ہوچکے تھے۔ اس سے اسلامی اقتدار کی بنیادی علامت ہی نہیں اس کے دینی اور دنیوی دونوں طرح کے اداروں پر بھی سوالیہ نشان قائم ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں پناہ حاصل کرنے والوں میں اپنی بگاڑ اور تحفظ کی نفسیات جاگزیں ہوگئی۔ ان مصیبت زدہ مفرور لوگوں میں کتنے ہی تھے جو ترک۔ منگول غارت گری کی حد درجہ بہیمانہ وحشت کی واضح یادیں بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ اسی لیے اپنی اختیار کردہ نئی سرزمین، ہندوستان، میں پناہ حاصل کرلینے کے بعد، یہ پناہ گاہ بھی ان کے لیے باقی اسلامی دنیا کی آئینہ دار بن گئی۔ اس کے بعد سے ان سربرآوردہ اہل نظم ونسق، اہل سیف اور اہل علم وادب نے، ہندوستان میں مسلم موجودگی کو اقتدار اور اسلام سے ہم رشتہ (عادتاً) کرنے لگے۔ 9 اور ہند نے 10 جیسا وہ ہمیشہ کرتا آیا تھا، پناہ تو ضرور دی مگر اپنا سب کچھ انہیں نہیں دیا۔ اس دوران وہ خوابیدہ قوم پرستی، جسے ہندوستانی یا بھارتیہ یا ہندو، کوئی بھی نام دیں، سر ابھارنے لگی۔

تقریباً یہی زمانہ تھا جب البیرونی یہاں آیا تھوڑے سے طالب علم اور تھوڑے سے پناہ گزیں کی حیثیت سے، اور اس نے تبصرہ کیا کہ 'ہندو سمجھتے ہیں کہ ان کے ملک جیسا کوئی نہیں ہے، ان کی قوم جیسی کوئی نہیں، ان کے راجاؤں جیسا کوئی راجہ نہیں، ان کے مذہب جیسا کوئی مذہب نہیں، ان کے علم جیسا کوئی علم نہیں۔ وہ مغرور، احمقانہ حد تک........، بر خود غلط اور........ ہیں۔ وہ طبیعتاً اپنے علم کو دوسروں تک پہنچانے کے معاملے میں کنجوس ہیں، اور وہ اسے خود اپنے لوگوں میں سے کسی دوسری ذات کے لوگوں سے اور اس سے زیادہ کسی غیر ملکی سے دور رکھنے میں حد درجہ کوشش کرتے ہیں'۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کے بعد سے حملہ آور اور حملے کے شکار اور مسلمان اور ہندو کے درمیان علاعدگی کا احساس ہمارے سماجی شعور اور سماجی تار پود میں سرایت کرنے لگا۔

یہاں اس بات پر ہی توجہ دی جانی چاہیے کہ ان تارکین وطن، حملہ آوروں یا پناہ گزینوں، کی طرف ہندوستان کا رویہ کیا تھا، اور عموماً ان کا ذکر کس طرح کیا جاتا تھا؛ کیوں کہ اس ذکر کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ ہمیشہ، تب بھی اور آج بھی، قبولیت، مسترد کرنے یا ایک طرح کی روادارانہ بے اعتنائی کا رویہ ظاہر کرتے ہیں۔ آٹھویں صدی سے لے کر چودہویں صدی تک، ان غیر اور اجنبی لوگوں کا ذکر ان کے مذہب کے حوالے سے اتنا نہیں کیا جاتا تھا جتنا کہ ان کی لسانی یا قومی پہچان سے، مثلاً، ان کا ذکر عام طور پر ترک (تروسکا)، خراسانی یا ایرانی یا عرب وغیرہ الفاظ سے کیا جاتا تھا۔ اور پھر لفظ ملیچھ، یعنی غیر، اجنبی، بیرونی کا استعمال کیا جانے لگا (ابتداء یہ لفظ کسی کو دور رکھنے کے منفی معنیمیں مستعمل نہیں تھا۔ اسے یہ مفہوم بعد میں دیا گیا)۔ تاہم، مسلمانوں کے لئے جو وہ حملہ آور ہوں، پناہ گزیں ہوں یا مقامی باشندے، ہندو ہمیشہ 'کافر' رہا، کیوں کہ وہ ان کے عقیدے کا نہیں تھا۔ اس کے اور ان باتوں کے باوجود جو عہد وسطا کے ہند-فارسی وقائع نگاروں نے رقم کی ہیں، اس وقت کے ہندوؤں نے نئے لوگوں کے مذہبی عقیدے یا روایات کو اس قدر اہم نہیں سمجھا کہ ان لوگوں کو ان کے عقیدے سے مخصوص کرتے یا انہیں صرف 'مسلمان' کہتے۔ اس کے بجائے ان لوگوں کو بھی انہی لوگوں میں شامل ایک بیرونی گروہ سمجھا گیا جو وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے تھے، حملہ آور کی حیثیت سے یا پناہ گزینوں کی طرح۔ میں خود اپنے آپ سے متعلق ایک سوانحی ذکر کروں تو مجھے یاد آتا ہے کہ میرے بچپن میں، جب کسی دور دراز جگہ سے کوئی مسلمان ہمارے گھر آتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ 'کوئی ترک آیا ہے۔' اسی لئے، اس سوال کو مرکزی اہمیت حاصل ہے کہ اگر خود ہندوؤں نے ان حملوں کو خالص، اسلامی یا مسلم فتوحات سے تعبیر نہیں کیا تو پھر نو آبادیاتی اور پس نو آبادیاتی دور کے تاریخ دانوں نے اس تمام سلسلے کو صرف عقیدے سے وابستہ کر کے اسے 'مسلم' کی اصطلاح میں محدود کیوں اور کس طرح کر دیا؟ میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے اور نہ اس اگلے سوال کا کوئی حتمی جواب ہے کہ کیا ہندوستانی تاریخ نگاری (کم از کم جزوی طور پر) علاحدگی کا ذہنی ماحول پیدا کرنے کی ذمے دار ہے، اور وہ بھی صرف اسلام کے تعلق سے؟ سوال یہ ہے کہ اس نے یورپی سامراجیوں (برطانوی، فرانسیسی، پرتگالی) کو کبھی بھی عیسائی حملہ آور کیوں نہیں کہا؟ مسلم ہندوستان کی اصطلاح کے مقابلے میں برطانوی ہندوستان کے لئے آج بھی محض برطانوی کا سابقہ استعمال کیا جاتا ہے، عیسائی کا نہیں۔ کیوں؟

مجھے لگتا ہے کہ استشراقی اسکالروں، نوآبادیاتی اہل نظم ونسق، مذہبی مصلحین، یہاں تک 'قوم پرست' مورخین نے بھی، بیرونی اور مقامی کے درمیان محض عقیدے کی بنیاد پر اور وہ بھی تقریباً پوری طرح مسلم اور ہندو کے خصوصی حوالوں کے ساتھ امتیاز قائم کیا اور پھر حد درجہ مشقت اٹھاتے ہوئے اس امتیاز کو مستحکم اور رائج کیا۔ لیکن انہوں نے یہی روش عیسائی مذہب کے حوالے سے اختیار نہیں کی۔ پھر انہوں نے موجودہ شناخت کو تاریخ کے تمام سلسلے میں جاری اور حاوی کر دیا۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے پروفیسر ایمریٹس لائیڈ رولڈ ولف نے کہا ہے کہ 'کسی عصری تصور یا ادارے مثلاً 'قوم' کی موجودگی کو فرض کرنا اور اسے گزشتہ زمانوں میں دریافت کرنا مثلاً ''انیسویں صدی کے اواخر بیسویں صدی سے پہلے ہندوستانی یا ہندو یا مسلم قوم'' کی موجودگی دریافت کر لینا مناسب نہیں ہوگا' انہوں نے بینے ڈکٹ اینڈرسن کے فقرے 11 'متصورہ فرقوں' کے حوالے سے یہ دلیل پیش کی ہے کہ سرسید احمد خاں اور جناح جیسی شخصیات نے بھی، درحقیقت، پہلے ہندوستان ایک مسلم فرقے اور پھر مسلمانوں اور قوم کی موجودگی کو 'فرض کر لیا'۔ ہندوستانی قوم پرستوں مثلاً نہرو یا ہندو قوم پرستوں مثلاً مدن موہن مالویہ نے بھی یہی کیا۔ بینے ڈکٹ اینڈرسن ہی نے 'اس خیال کو کھولا کہ قوم پرستی ایک فرضی تشکیل، متنازعہ زدہ اور تغیر پذیر تصور ہے۔ انہوں نے اس تصور کو دفن کرنے کے لئے بڑی کوششیں کیں کہ کہیں کسی لازمی یا فطری یا قدیم فرقے، شناخت یا قوم، کا کوئی وجود ہے، اور اس لحاظ سے 'موسیقی سے لے کر غذاؤں اور ملبوسات تک جسے بھی 'قومی' یا 'نسلی' یا 'مسلم' کہا جاتا ہے... وہ ہمیشہ ایک فرضی تشکیل ہوتا ہے' 12۔

مثلاً اسلام کے معاملے پر غور کریں تو اسکالر اسلام کی بنیادی خصوصیات، نظام اقدار اور مزاج کو بیان کرنے کے لئے ساتویں صدی کے عرب کو بنیادی حوالہ بناتے ہیں۔ یہ ایک قابل فہم بات ہے مگر صرف ایک حد تک۔ لیکن جب میکس ویبر 13 اسلام کو ایک 'قومی، عربی جنگ جویانہ مذہب، 14 قرار دینے کی حد تک جا پہنچتا ہے تو اسے اس خصوصیت کی عجیب و غریب انداز سے تعمیم کرنے کی روش ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات گمراہ کن تو ہے ہی۔ ایک عرصے تک مسلمانوں سے متعلق اس قسم کے بیانات نے ایک اصولی نقش قائم کر دیا۔ اس طرح اسلام پر مسلمانوں کے عقیدے کو اولیت دے کر، پھر اسے جغرافیائی طور پر عرب دنیا سے وابستہ کر کے اور اس کے بعد، اصولی طور پر، یہ کہہ کر تمام عرب میں ہمیشہ 'جنگ جوئی' کی خصوصیت حد درجہ پائی جاتی تھی، مسلمانوں کو ایک خاص چوکھٹے میں جکڑنے میں کوشش کی گئی۔ اور یہ سب اتنی کامیابی کے ساتھ کیا گیا کہ یہ سارے تصورات آج تک ...... کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ دوسری طرف، مسلمانوں کی جانب سے علاحدگی پسندی کا اظہار شروع کئے جانے سے پہلے، مسلمانوں کے لئے بحیثیت مسلمان ہندوستان اور 'ہندویوں' کے لاتعلقی اور بے اعتنائی کے رویے سے متعلق شواہد بتاتے ہیں کہ 'مسلمان ایک علاحدہ، قوم ہیں'، سے متعلق سیاسی سوال بنیادی طور پر غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اس قدر مفارقت پیدا کی اور آج بھی پیدا کر رہا ہے۔ میں ایک حد تک، اس خیال پر جناح کے اصرار کو تو سمجھ سکتا ہوں، مگر کانگریس پارٹی کی طرف سے اسے قبول کیا جانا بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ اگرچہ میں یہ ضرور مانتا ہوں کہ علاحدگی اور مغائرت کی اور بہت سی اور اہم بنیاد بھی موجود تھیں مثلاً ایک مختلف عقیدہ اور مختلف نوعیت کا طریقہ

پرستش۔ مختلف سماجی طرزِ عمل، بعض مخصوص اور باہم ناقابل قبول رسوم یا غذائی ترجیحات، اور ان کے علاوہ ہندوؤں کی لوح حافظہ پر نقش بہت سی تاریخی خراشیں، جو حملوں، قتل وغارت گری، لوٹ پاٹ یا کسی اور وجہ سے پیدا ہوئیں۔ یہ سب چیزیں تکلیف پہنچاتی رہی ہیں اور آج بھی ایسا ہی ہے۔

ہندوستان میں اسلامی روایات 15

اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ اسلام (تمام قتل وغارت گری اور عصمت دری کے باوجود) ہندوستان کے تہذیبی منظرنامے کا حصہ کس طرح اور کیوں بنا، اس ملک اور اس کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت اور پھر ہندوستان میں اسلامی روایات کے زبردست ذخیرے کی گہری سمجھ ضروری ہے۔ لیکن یہاں ہم اس سلسلے میں کوئی علمی تفتیش سرانجام نہیں دے سکتے کیوں کہ یہ ہمارے بنیادی موضوع کا مرکز توجہ نہیں ہے۔ پھر بھی، یہ ضرور کہا جانا چاہیے کہ ہندوستان کی اسلامی روایات میں بہت سے مسلکوں، لسانی برادریوں اور سماجی طبقوں کا انعکاس ہوتا ہے اور ان سب کو 'مسلمان' کی اصطلاح سے بیان کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں، مسلمان کبھی بھی، اور آج بھی، ایک متجانس، ہم رنگ اور یک جسم فرقہ نہیں رہے۔ پاکستان میں بھی ایسا نہیں ہے، دونوں ملکوں کے سیاسی لوگ انہیں ایسا بنانے کی خواہ کتنی بھی کوششیں کیوں نہ کریں، بنیادی طور پر انتخابی فائدے اٹھانے کے لیے۔ یہ بہت الم ناک ہے، کیوں کہ یہی رویے ہیں جو علاحدگی کے احساس کو مستحکم کرتے ہیں، ایسے عمل اور ردعمل پیدا کرتے ہیں جس سے یہ مغائرت اور بڑھتی ہے اور اس کے سبب باہمی اختلاط میں کمی آتی ہے جو مزید رنجشوں کو ہوا دیتا ہے اور اس سے سیاسی استحصال کو جاری رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہاں ایک اور پہلو کو بھی نشان زد کیا جانا چاہیے۔ قرآن شریف جو رسول اللہ پر ان کی اپنی زبان عربی میں نازل کیا گیا تھا ایک غیر عربی داں علاقے اور لوگوں تک کس طرح پہنچا؟ اور پھر ہندوستان دنیا کی تقریباً ایک تہائی مسلم آبادی کا گھر کس طرح بنا؟ ظاہر ہے کہ اس کے لیے اسلام کو ترجمہ اور ترجمانی کے ذریعہ کوئی نہ کوئی ہندوستانی صورت دی گئی۔ یہاں ترجمہ سے مراد محض ایک محدود لسانی سرگرمی نہیں ہے بلکہ یہ سماجی اور تہذیبی اتحاد و اتصال کے ذریعے ایک وسیع تر انجذابی عمل کا نام ہے جس میں زبان اور سماجی تعاملات نے حصہ لیا، اور پھر قرآن کو بھی ہندوستان کی مختلف ادبی اصناف اور اظہاری وسائل کے ذریعے اختیار کیا گیا۔ بلاشبہ فارسی-عربی رسم الخط کے استعمال سے دھیرے دھیرے اسلامی اصطلاحات اور ان میں ملفوف خیالات کی ترسیل میں بہت مدد ملی اور اسی سے آخرکار ایک مقامی، ہندوستانی اسلامی روایت کو قیام و استحکام حاصل ہوا۔ اس کے بعد عربی میں اظہار پانے والے خیالات رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمان کی زبان کے محاوروں، رسم الخطوں اور ترسیلی وسائل کا حصہ بن کر ان کے ذہنی اور فکری عمل کا لازمہ بن گئے۔

اس طرح ہندوستان کی اسلامی روایات (ہند اسلامی روایات) نے اسلام کو ہندوستان میں موجود ثقافتوں کے مطابق ڈھالنے اور ساتھ ہی ہماری (ہندوستانی) ثقافتوں سے وابستہ مسلمانوں کو وسیع تر عالمی اسلامی برادری سے مربوط

کرنے کی خدمت انجام دی۔ ان اسلامی روایات کے دو ممتاز طرز تھے۔ ایک وہ جو لاہور سے دہلی اور وہاں سے جنوب میں حیدرآباد تک پھیلا ہوا اور دہلی سے پھوٹنے والی اس کی شاخیں مشرق میں پٹنہ، اور مغرب میں احمد آباد تک جاتی ہوئی۔ اس طرز پر عجمی رنگ حاوی تھا۔ اس کے آگے، سندھ، تھارپرکار، نگرپرکار، راجپوتانہ، تمل ناڈو، مالابار، کشمیر اور بنگال میں، اسلام مقامی طرزوں اور محاوروں سے رنگا ہوا تھا۔16

ان دائروں میں جہاں عجمی اسلامی روایات حاوی تھیں، یہ خاص ثقافت (عجمی اسلامی) حکمرانوں کی ثقافت بن گئی۔ اس ثقافت کے نمائندے میں اشراف تھے اور ہیں،17 جن کے آباء واجداد دیگر ثقافتوں کے تھے یا یہ لوگ محض ایسا دعوا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض تو یقیناً ایسے تھے مگر بیشتر لوگ محض اس کے دعوے دار تھے۔ اشراف اپنے بارے میں ایک پوری طرح واضح تصور رکھتے تھے، اور آج بھی رکھتے ہیں۔ ان کا دعوا تھا کہ وہ چوں کہ باہر کے ہیں اس لیے انہیں مقتدر ہونے کا فطری حق ہے۔ انہوں نے عجمی اسلامی طرز حیات اور آداب و اطوار پیدا کئے اور انہیں پروان چڑھایا۔ انہوں نے ایسے ہندوؤں کو، مثلاً کایستھ اور کشمیری برہمن، اپنی دنیا میں جگہ دی جو حکومت چلانے میں ان کے مددگار ہو سکتے تھے۔ اور جنہوں نے بہ رضا و رغبت مسلم ثقافت کے بعض ظاہری عناصر کو اختیار کر لیا۔ مگر انہیں تبدیلی مذہب کرنے والے مقامی لوگوں کو قبول کرنے میں عموماً ہمیشہ پس و پیش رہا کہ یہ لوگ بیشتر غریب تھے۔ اشراف کی نگاہ میں مذہب تبدیل کرنے والے یہ لوگ انکی اپنی دنیا سے کسی طرح کا کوئی جوڑ نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ لکڑ ہارے، بتے اور Atrap 18 وغیرہ تھے۔ اٹھارہویں صدی تک آتے آتے، ہندوستان میں عجمی اسلامی ثقافت کی بنیادیں کمزور ہونے لگیں اور وہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ۔ انیسویں صدی کے اوائل میں مسلم 'اقتدار' اودھ، حیدرآباد اور شمال مغربی سرحدی علاقوں تک سمٹ گیا۔ لیکن شاید اس زمانے میں شجر اسلام پر نئے برگ و بار بھی آئے۔ اس طرح اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل کے دوران ہندوستان میں عجمی ثقافت اپنی نفاست اور لطافت کے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ مگر ثمر مندی کی یہ بہار، موسم خزاں کی تمہید بھی ثابت ہوئی۔ یہ عرب کہاوت عارفانہ انداز سے اس انجام سے خبردار کرتی معلوم ہوتی ہے: 'مکان بنتے ہی وہ ڈھہنے بھی لگتا ہے'۔

کبھی کے عظیم تیموریوں کے اس زوال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلفشار کی سب سے زیادہ دل چھو لینے والی روداددوں میں سے ایک روداد سی بی سانڈرس کی ہے جو کارگزار کمشنر اور لفٹنٹ گورنر کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے خلاف عدالتی کارروائی کے دوران، جو محض ایک دکھاوا تھی، 12 فروری 1958 بروز جمعہ جج ایڈوکیٹ کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا:

سوال: کیا آپ اس عدالت کو ان حالات کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں جن کے تحت دہلی کے بادشاہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے محکوم اور وظیفہ خوار بن گئے؟

جواب: شہنشاہ دہلی شاہ عالم غلام قادر کے ہاتھوں آنکھیں نکالے جانے اور ہر طرح کی ذلتیں برداشت کرنے کے بعد

1788 میں مہرتوں (مراٹھوں) کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ شہنشاہ کو جسے شہر دہلی پر نام کا اقتدار حاصل تھا 1803 تک قید میں رکھا گیا، جو کم و بیش بامشقت تھی، جب تک کہ جنرل لیک نے علی گڑھ پر قبضہ کرنے کے بعد برطانوی فوج کے ساتھ دہلی پر چڑھائی نہیں کر دی۔ مہرٹا فوج دہلی سے چھ میل دور پٹ پڑ گنج میں جمع ہوئی جس پر جنرل لیک نے حملہ کیا اور وہ بری طرح پسپا ہوئی۔ شہر اور قلعہ مہرٹوں سے خالی ہو گیا تو شہنشاہ شاہ عالم نے جنرل لیک کو پیغام بھیجا اور برطانوی حکام سے تحفظ دینے کی درخواست کی۔ 14 ستمبر 1803 کو انگریز فوج دہلی میں داخل ہوئی۔ یہ تاریخ 1857 میں کئے گئے کامیاب حملے کے بعد حافظے میں محفوظ ہو گئی ہے۔ اس کے بعد سے دہلی کے بادشاہ برطانوی حکومت کے وظیفہ خوار رعایا ہو گئے اور انہوں نے مہرٹوں کی قید بامشقت کی حالت کے بدلے میں برطانوی اقتدار کے تحت نسبتاً نرم پابندیوں کو قبول کر لیا۔ اس 'قیدی' کو 1837 میں دہلی کا برائے نام حکمراں بنا دیا گیا۔ اسے اپنے محل کے احاطے سے آگے کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ اسے اپنے خاص مصاحبوں کو خطابات اور خلعت عطا کرنے کا اختیار تو تھا مگر وہ ان اختیارات کا استعمال کسی اور کے لئے نہیں کر سکتا تھا۔ صرف وہ اور اس کا ولی عہد کمپنی کی مقامی عدالتوں کے دائرہ اختیار سے بری تھے، مگر سپریم گورنمنٹ کے احکام کے ماتحت تھے۔

سوال: کیا قیدی کے مسلح ملازمین کی تعداد کی کوئی حد مقرر کی گئی تھی؟

جواب: قیدی نے لارڈ آکلینڈ سے گزارش کی کہ اسے اتنی تعداد میں خدمت گار رکھنے کی اجازت دی جائے جتنی کہ اسے مناسب معلوم ہو۔ گورنر جنرل نے اس کے جواب میں اجازت دی کہ وہ اتنے ہی خدمت گار رکھ سکتا ہے جن کی تنخواہ وہ اپنی مقررہ آمدنی میں سے ادا کر سکے۔

سوال: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بغاوت پھوٹ پڑنے کے وقت قیدی کو حکومت کی جانب سے منظور کردہ وظیفے کی رقم کیا تھی؟

جواب: اسے ماہانہ ایک لاکھ روپے کا وظیفہ ملتا تھا، جس میں سے 99000 روپے دہلی میں۔ اور 1000 روپے لکھنؤ میں وہاں موجود اس کے اہل خانہ کو ادا کئے جاتے تھے۔ اسے دہلی کے اطراف میں موجود تاج برطانیہ کی آراضیوں سے سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم بھی ملتی تھی۔ اسے شہر دہلی میں موجود مکانات اور دیگر عمارتوں کے کرائے کی شکل میں ایک اچھی خاصی رقم بھی حاصل ہوتی تھی۔

اور اس طرح عظیم مغل سلطنت اپنے انجام کو پہنچی۔ یہی وجہ ہے کہ 1857 محض اس کی وفات پر ایک تعزیتی تقریب کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ جنرل لیک کی فتح کے بعد ختم ہونے کے لئے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

آقا وظیفہ دار کیسے بن گئے

تقریباً 1830 کے بعد سے یہ عجمی اسلامی ثقافت مرجھانے لگی اور پھر رزق خاک ہوگئی، اور وہ بھی ایک وحشت ناک تیز رفتاری کے ساتھ۔ اس کا بنیادی سبب، یقینی طور پر، ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت کا پورے اعتماد کے ساتھ مسلسل نمایاں ہونا تھا۔ یہ طاقت تھی برطانیہ کی اقبال مندی سے سرشار ثقافت، وہ (انگریز) پہلے سے ہی ہندستان کے ایک بڑے حصے پر حکمرا ں تھے۔ تجارت اور اس کے تحفظ اور فروغ میں ان کے دخل نے، جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے، انہیں ہندوستان کے کئی حصوں میں زمینوں کی ملکیت اور علاقوں پر قبضہ دلا دیا۔ مغل سلطنت کا زوال صرف انگریزوں کے بڑھتے ہوئے غلبے کا ہی نتیجہ نہیں تھا، کیوں کہ انگریز تو ملک کے ثقافتی پیرہن کو باہر سے کمزور کر رہے تھے مگر اس زمانے کے ہندو اور مسلمان دونوں ہی اسے اندر سے تباہ کر رہے تھے۔ پھر 1857 کی عظیم بغاوت نے عجمی اسلامی اقتدار بچے کھچے فریب نظر کو بھی مسمار کر ڈالا؛ 1857 نے عجمی جمالیات کا پنجہ گرفت بھی توڑ ڈالا۔[19] اس زوال کا ایک اور، ان چاہا نتیجہ بھی سامنے آیا۔ انگریزوں کو بنیادی طور پر 1857 کی وجہ سے ہی مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان جاننے کا موقع ملا۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے مسلمانوں کو (ہندوؤں سے) الگ سیاسی کردار بخشنا شروع کیا۔ یہ سب فوری طور پر اور اتنے فیصلہ کن انداز سے نہیں ہوا جتنا کہ اس سے متعلق بیان سے ظاہر ہوتا ہے، مگر یہ بات یقینی ہے کہ 1857 کے بعد تقریباً ایک دہائی کے اندر اندر انگریز مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت کے طور پر دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان ہندوستان کے سیاسی ترازوؤں کے دو پلڑوں میں سے ایک پلڑا تھے۔

تھامس مٹکاف نے 1857 کی بغاوت کی طرف انگریزوں کے مخصوص رویے کا بیان کچھ یوں کیا ہے: 'عام طور پر مانا جاتا ہے کہ بے اطمینانی کی چنگاریاں سب سے پہلے ہندو سپاہیوں نے بھڑکائیں... مگر بے چینی کے شعلوں کو ہوا مسلمانوں نے دی اور اس تحریک کا ہراول دستہ بن گئے کیوں کہ وہ ان مذہبی شکایات کو سیاسی طاقت (کی بحالی) کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔۔ انگریزوں کی نگاہ میں، مسلمانوں کی خفیہ سازباز اور مسلم قیادت نے سپاہیوں کی بغاوت کو ایک سیاسی سازش میں تبدیل کر دیا جس کا مقصد برطانوی راج کو اکھاڑ پھینکنا تھا[20]۔ جنرل جارج کیمپ بیل نے بھی مسلمانوں کے لیے انگریزوں کے سخت جذبات اور شدید تلخی کا بیان کیا ہے جس کا اندازہ انہیں ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں میں ہوا:[21] 'میں نے پہلی بار میرٹھ میں پہلی بار مسلمانوں کے خلاف سخت جذبات کو محسوس کیا (کیوں کہ) ان کے پاس ذات برادری سے متعلق وہ بہانہ بھی نہیں تھا جو بغاوت کا قوی سبب بنا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی جب باضابطہ رجمنٹوں کے مسلم سپاہی بھی دوسروں سے جا ملے۔ ہمیں تب بھی رنج ہوا جب غیر باضابطہ گھوڑ سوار فوج بھی، جس میں زیادہ تر مسلمان تھے، اور جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ ہمارا ساتھ بھی دے گی، چلی گئی۔'

تاہم جو کچھ نظر آرہا تھا وہ فریب محض تھا۔ اس بات کو اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ اور دیگر اعلا مقتدر لوگوں نے تسلیم کیا۔ کیننگ کے اندازے کے مطابق اصل 'فوجی بغاوتیں' ہندو سپاہیوں نے 'بھڑکائی تھیں' جو اپنی ذات

برادری، وقار اور عزت نفس کے لئے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اودھ، بہار اور وسطی ہندوستان میں ہونے والی شہریوں کی سرکشی بیشتر ہندوؤں کے زیرِ قیادت ہوئی؛ جھانسی کی رانی، تاتیا ٹوپے اور نانا صاحب، سب کے سب ہندو تھے۔ گورکھ پور علاقے میں، کمشنر کے مطابق، راجپوتوں کی بعض اعلا ذاتوں سے متعلق بعض قبائل تھے جنہوں نے سب سے زیادہ مخالفانہ جذبات کا مظاہرہ کیا22۔ اس کے برعکس، مسلمان بھی ویسی ہی ذاتی، طبقاتی اور علاقائی وفاداریوں میں بٹے ہوئے تھے جیسے کہ ہندو، اور اسی لئے وہ بھی بالکل اسی طرح کے دباؤ میں تھے۔ 1857 میں، مسلم صاحبان اقتدار میں نظام حیدرآباد، اور رام پور، کرنال، مرادآباد اور ڈھاکہ کے نواب انگریزوں کے وفادار رہے جب کہ فرخ آباد اور ڈانڈا کے نواب نے ان سے منہ موڑ لیا۔ 'بعض مسلم حکام ایک طرف رہے' اور (انسانی فطرت) 'بعض دوسری طرف۔ علی گڑھ اور روہیل کھنڈ میں وہ بیشتر بغاوت کے ساتھ رہے، مگر بنگال کے مسلمانوں کو، جنہوں نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصالی حربوں کا سب سے زیادہ اقتصادی نقصان اٹھایا تھا، بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یا کم از کم احتجاجی آواز اٹھانے کے لئے پوری طرح آمادہ، نہیں کیا جاسکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا پایہ تخت غیر متاثر رہا۔ پنجاب میں، مسلمان سکھوں کے ساتھ مل کر دہلی کے باہر جنگلات میں تعینات برطانوی فوجوں کے لئے بھیجی جانے والی کمک کا حصہ بن گئے۔ تاہم پٹھان، راجپوت اور بندیل، جن کی زمینوں اور جائدادوں پر گزشتہ پچاس برسوں کے دوران قبضہ کر لیا گیا تھا اس جدوجہد میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہوئے۔ مگر 'بہار اور بنارس کے بعض علاقوں کے مسلمانوں اور زمین داروں نے، جو نسبتاً حال ہی میں انگریزوں کے ماتحت آئے تھے، عموماً اس بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔' یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ 'فرائضیوں' اور جنوبی ہند کے موپلاؤں جیسے مسلم گروہ، جو مذہبی کٹر پن میں سب سے آگے تھے، پوری طرح لاتعلق رہے۔23

کیننگ نے، 1857 کے اسباب اور اسی میں مسلمانوں کے عمل دخل کا ایک باضابطہ جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے: یہ سچ ہے کہ ہندوستان کے کئی حصوں میں مسلمان برطانوی حکومت کے مخالف ہیں اور کئی بار ہنگامے بھڑکا چکے ہیں... یہ بھی سچ ہے کہ ہر مسلمان خوشی خوشی وہ دن دیکھنا چاہتا ہے جب اس کا مذہب پھر سے غالب آ جائے اور وہ برطانوی اقتدار پر مسلم اقتدار کو حد درجہ ترجیح دیتا ہے۔ لیکن اسے ان کے خفیہ عزائم کا ایک درست بیان تسلیم کیا جائے تب بھی یہ ان حقائق کے خلاف نہیں جاسکتی جو بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے بغاوت میں محض جزوی حصہ لیا اور وہ بھی تب جب وہ بھڑک چکی تھی'24

ستمبر 1857 میں دہلی پر قبضے کے بعد شہر کے بے بس مسلمانوں کے خلاف زبردست انتقامی کارروائی شروع کر دی گئی۔ بہادر شاہ ظفر کو ایک فرضی عدالتی کارروائی کی تذلیل سے گزرنا پڑا اور پھر جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا؛ سرسری قانونی کارروائی کر کے مغل شہزادوں کے سر قلم کئے گئے اور اس طرح کہ ہاڈسن25 نے جام شراب ہاتھ میں لئے ہوئے اس بارے میں ڈینگیں ماریں۔ اس کے بعد دہلی کی مسلم اشرافیہ اور اہل ودانش پر ایک زبردست مصیبت آ پڑی۔ بغاوت کو نہایت سفاکی کے ساتھ فرو کئے جانے کے بعد، ان میں سے بہت سے لوگ جو اپنے شہر اور گھروں کو، واپس آنے کے خواہش مند

تھے انہیں جرمانہ ادا کرنے کو کہا گیا۔ وزیراعظم پامرسٹن نے کیننگ کے نام مکتوب میں لکھا کہ 'مسلم روایت سے وابستہ شہر کی ہر عمارت (جامع مسجد کی طرف اشارہ جو ایسا ڈھکا چھپا بھی نہیں) کو اس کی قدامت کے احترام یا فن حسن کا ذرا بھی خیال کیے بغیر خاک میں ملادی جائے'26 سخت، انتقامی سزاؤں کا سلسلہ جاری رہا، جس کے دوران عدالتی عمل کا دکھاوا کرنے کی کوشش شاید ہی کبھی کی گئی۔ مگر اس انتقامی کارروائی نے متاثرہ صوبوں میں جائدادوں کی بڑے پیمانے پر ضبطی کے ذریعے شمالی ہند کی دیہی آبادی کی اقتصادی طور پر کمر توڑ کر رکھ دی گئی۔ اس میں انگریز غاصبوں پر محض 1857 کی بغاوت کا بدلہ لینے کے جذبات حاوی تھے۔ انتقامی جذبوں کی شدت میں انہوں نے لوگوں کی حالت زار کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔

1857 کے اس زبردست اذیت ناک تجربے پر مسلمانوں کی سیاسی برتری کے ایک طویل عہد کا باضابطہ خاتمہ ہوگیا۔ مسلمانوں کے ایک اہم سماجی فریق کی حیثیت سے بچے رہ جانے کے باوجود، 1857 ان کے 'حکمراں' ہونے کے خیال کو یقینی طور پر ختم کر دیا۔ اپنی شبیہہ اور وقار کے اس طرح ریزہ ریزہ ہونے کے باوجود جب بھی موقع ملا مسلمانوں نے ہندوستان کے دو طاقت ور ترین سیاسی فرقوں میں شامل ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ 1857 نے 'برطانوی ہندوستان میں مذہبی، سماجی اور سیاسی توازن میں ایک قوت'27 ہونے کی مسلمانوں کی حیثیت کو تو ختم نہیں کیا، مگر انہیں اپنے آپ کو مجبوراً ہی سہی حالات کے مطابق ڈھالنا پڑا، جیسا کہ دوسروں نے بھی کیا۔ اب انہیں اپنے معاملات اور طرز عمل کو بالکل ویسا ہی رکھنا تھا جیسا کہ انگریز چاہتے تھے۔ 'وہ زندگی کی دوڑ کے مقابلے میں شریک ہو سکتے تھے، مگر ہتھیاروں اور حکمرانی کے پرانے طریقوں کا استعمال کر کے نہیں۔ ان کے سامنے اب نمونہ کمال کی حیثیت سے اکبر اور اورنگ زیب کی مثالیں نہیں ہوں گی، بلکہ اب انگریز انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے۔'28 یہاں مسلمانوں کی وہ تعداد پر تعجب ہے جو اس تبدیلی پر آمادہ تھی، اس روایتی تاریخی تصور کے قدرے برخلاف کہ مسلمانوں نے 1857 کے بعد سخت نقصان اٹھایا۔ انہوں نے نقصان نہیں اٹھایا بلکہ اس کے برخلاف بہت سے مسلمانوں کو اس سے سیاسی اور اقتصادی فائدہ پہنچا۔

اسلام اور ہندوستان

لیکن 1857 نے مسلمانوں کی زمین دارانہ روایات اور طرز عمل میں ایک ناگزیر تبدیلی ضرور پیدا کی: 'اب مغل ماضی کے حامل لوگ برطانوی مستقبل کے حامل لوگوں سے مات کھا رہے تھے' (29)۔ 1857 سے پہلے بھی، مسلم زمین داروں کا ایک ایسا نیا طبقہ ہو چکا تھا، بڑی حد تک ایسے لوگوں پر مشتمل جو ڈپٹی کلکٹر اور صدر امین (30) یا ایسے ہی دیگر عہدوں پر فائز ہو کر انگریزوں کی خدمت کے بہت فائدے اٹھائے تھے۔ 1857 کے بعد ایسے وفادار لوگ، خاص طور پر وہ لوگ جنہوں نے برطانوی اقتدار کو اپنے حق میں استوار کر لیا تھا، سرسید احمد خان کے حامی اور مددگار بنے، اور جنہوں نے اپنے فرقے کے لیے مغربی تعلیم کو فروغ دیا اور سیاسی اور انتظامی طور پر انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا۔ 31

بلاشبہ قدیم مسلم خاندانوں کو 1857 کی قیمت چکاتے ہوئے مصائب سے گزرنا پڑا۔ ان کا وقار پامال کیا چکا

تھا، اقتصادی محرومیوں نے ان کی عزت نفس اور غیرت مندی کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور ان کا طرز حیات ہمیشہ سے تبدیل ہو چکا تھا۔ 1857 کے بعد مغل شہزادوں اور شہزادیاں ایک پراگندہ اور پامال زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ انگریزوں نے اس تذلیل کے احساس کو شدید تر کرتے ہوئے سرپرستی کے انداز میں، شاہی گھرانے کے وابستگان کے لیے وظائف عطا کرنے شروع کیے۔ داد و دہش کا یہ عمل اپنے آپ میں اور اس لحاظ سے بھی کہ وظائف کی چھوٹی سی رقم نہایت بے ہودہ انداز سے دی جاتی تھی توہین آمیز تھی۔ 1857 کے بعد تقریباً ایک دہائی تک مسلمانوں کی طرف انگریزوں کے رویے میں دوغلاپن ظاہر ہوتا رہا: انہوں نے مسلمانوں کو ایک اہم سماجی فریق مظاہرے کو سختی سے روک دیا،32۔ 1857 کے بعد، گویہ اندیشہ ستانے لگا کہ وہ ہندوستان سے کھدیڑ نہ دیے جائیں۔ اس اندیشے نے انہیں کبھی نہیں چھوڑا اور کبھی بھی ناممکن سمجھتے ہوئے مسترد نہیں کیا گیا۔ اس اندیشے کا ساتھ ہمیشہ یہ خیال بھی رہا کہ یہ بنگالی صورت حال کبھی بھی اچانک پیش آسکتی ہے، مگر تبھی جب ہندوستان کی، دوسخت راسخ العقیدگیاں، جو ذات برادری اور امکان اور سامان بھی موجود تھا یعنی سماج میں موجود بٹواروں کا استحصال۔ انگریز سمجھتے تھے، اور اس میں وہ غلطی پر نہیں تھے، کہ ہندوستانی معاشرے کی داخلی رقابتیں اور رنجشیں، بنیادی طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان (اگرچہ انہوں نے دونوں میں سے کسی بھی مذہب کو کبھی بھی پوری طرح نہیں سمجھا، انہوں نے صرف ان کے بعض خاص پہلوؤں کا استعمال کیا) ہمیشہ ایک غیر جانب دار ثالث یعنی خود ان کی موجودگی کی متقاضی رہیں گی۔ اس کے باوجود الزام انگریزوں کے سر مڈھنا اور یہ کہنا مشکل ہے کہ صرف وہی تھے جنہوں نے اپنے اقتدار کی راہ میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے دونوں فرقوں کو تقسیم کیا۔ معاملہ دراصل یہ ہے کہ تقسیم تو پہلے سے ہی موجود تھی، انگریزوں نے تو جب بھی موقع ملا پورے استحصالی انداز سے انہیں بری طرح استعمال کیا۔

1857 کی تہہ در تہہ تکلیفوں اور صدموں کا ایک غیر متوقع، شاید ناگزیر مگر بہر حال حال افسوس ناک نتیجہ ہندوستان میں فارسی زبان کی حیثیت کا ختم ہونا تھا۔ اس کے زیر اثر سب سے زیادہ نقصان طبقہ اشراف کو اٹھانا پڑا۔ بعض عقلی علوم، جو ہندوستانی اسلام کو ایران اور وسط ایشیا کی خصوصی عطا تھے، دھیرے دھیرے اپنی معنویت اور اہمیت کو تے چلے گئے اور ان کی باڑھ ماری گئی۔ ان کے بجائے اب ایسی روایتیں جو قرآن و حدیث (33) کے مطالعے پر زور دیتی تھیں اور جو نقش بندیوں (34) کے اصلاحی جوش و خروش سے ہم آہنگ تھیں اسلامی فکر پر حاوی ہو گئیں۔ شیخ احمد سرہندی (35) نے بہت پہلے فکری تصوف کے جو بیج بوئے تھے وہ برگ و بار لانے لگے۔ مزید یہ کہ ہندوستانی اسلام زیادہ سے زیادہ راسخ العقیدگی کی جانب مائل ہونے لگا جس میں اساس پسندی کا رنگ تیز تر ہونے لگے۔ طبقہ اشراف نے اسباب کے علاوہ) اس قدر سہل طلب اور عافیت کوش تھے کہ اسلام کی تبدیل کرانے والی تلوار چلانے والے پرجوش لوگوں کی اگلی صفوں میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔

انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں نے یقینی طور پر مسلمانوں کو متوجہ کیا مگر یہ مسلمان بنیادی طور پر سابق حکمراں طبقے سے باہر کے تھے جن پر سید احمد بریلوی (36) نے تھکی نکتہ چینی کی ہے۔ ان تحریکوں کا مقصد مغل سلطنت یا مغل اشرافیہ کا

جاہ وجلال بحال کرنا اتنا نہیں تھا جتنا کہ قرون اولا کے مسلمانوں کو ایک شبیہ تیار کرنا اور اس کھوئی ہوئی اسلامی روح کو بے دار کرنا تھا۔ سید احمد تک یہ مانتے تھے کہ مسلمان ایک ایک دن 'ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنے کی توفیق حاصل کریں گے، مگر اس بار اپنے خدا کے لیے۔ اور یہ باتیں مسلم معاشرے کے تمام طبقوں کے لیے حد درجہ پرکشش تھیں، ان کی شدت جیسی کل تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔

یہاں اس زمانے کی دو اہم شخصیات پر توجہ مرکوز کرنا ہے جو اپنی اصل میں ایک دوسرے مختلف تھیں اور جن کے سیاسی نظریات ایک دوسرے کی ضد تھے، اور ہندوستانی مسلمانوں پر ان کے اثرات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے پہلی شخصیت میں سر سید احمد خان۔

سید احمد خان، 1838 میں (ان کے والد کا سال وفات) کوئی بتیس سال کے رہے ہوں گے۔ اگرچہ ان کے والد دہلی کے لال قلعے میں موجود بچے کھچے مغل اقتدار کے ملازم رہ چکے تھے مگر سید احمد خان نے قلعے سے رخصت لے کر کمپنی بہادر کی خدمت کو ترجیح دی۔ ان کے اتنی سوج بوجھ تھی کہ اپنے وقت کے تیوروں کو بھانج کر انہیں اپنے حق میں استعمال کر سکیں۔ سید احمد خان اس وقت انگریزوں کی قائم کردہ عدالتوں یا قانونی ضابطوں کے بارے میں کچھ نہیں مانتے تھے۔ لہٰذا ان کے چچا، مولوی خلیل اللہ خان نے، جو دہلی میں صدر امین 37 تھے، انہیں سرپرستی میں لے لیا اور اس طرح برطانوی راج کے ملازم کی حیثیت سے سید احمد کی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہیں سے ان کی قالیات انگریز دوستی کی بنیادیں بھی استوار ہو گئیں۔

1875 کے پر خطر دنوں میں، سید احمد اپنی ملازمت کے سلسلے میں دہلی، پھر آگرہ، وہاں سے فتح پور سیکری اور آخر میں بجنور میں برسر کار رہے۔ الطاف حسین حالی کو تحریر کردہ ان کی سوانح حیات جاوید میں انگریزوں کو بچانے کے لیے ان کی کوششوں اور بجنور کا نظم ونسق سنبھالنے کے معاملات خاصی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ 1859 میں جب 1857 کے بعد ہندوستانیوں کی جائدادوں کی ضبطی سے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے ایک خصوصی کمیشن تشکیل دیا گیا تو اس میں دو اہل یورپ، روہیل کھنڈ کے کمشنر اور مراد آباد کے جج کے علاوہ صرف ایک ہندوستانی، سید احمد خان شامل تھے۔

سید احمد خان علی گڑھ تحریک سے وابستہ نمایاں ترین ناموں میں شامل ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ دیگر شخصیات تھیں سید مہدی علی خاں (1837-1907)، مولوی نذیر احمد (1830-1912) اور مولوی سمیع اللہ خان (1834-1908)۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ سید احمد، جو ایک طویل عرصے تک دہلی میں رہے اور قلعے کے ساتھ جن کے گہرے خاندانی مراسم تھے، اس تباہی و بربادی سے ناواقف ہوں جو اس شہر میں برپا ہوئی تھی۔ مگر وہ اس طبقہ اشراف سے تعلق رکھتے تھے جو اقتدار سے وابستگی اور منصب و اقتدار کے ساتھ رہنے سے حاصل ہونے والی مراعات سے وابستگی اور اقتدار مراکز سے چپٹے رہنے کی صلاحیت کے معروف ہے۔ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ انگریزوں کے ساتھ جلد از جلد وفاداری کا مظاہرہ کیا جائے اور اپنے آپ کو برطانوی اقتدار کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ علی گڑھ تحریک کے وابستگان

کے لیے اس کے حصوں کا والد داستہ یہ تھا کہ ہر وہ چیز اختیار کی جائے جو 'یورپی' ہو اور وہ بھی قدرے عجلت کے ساتھ، خواہ اس کے لیے قابل لحاظ ثقافتی منتقلی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ یہ علی گڑھ تحریک والوں کے نزدیک اپنی اور انگریزوں کی استعماری دنیا کے درمیان پل بنانے کا ایک آسان راستہ تھا۔

سید احمد خان، سید امیر علی اور نواب عبداللطیف جیسے مسلمانوں نے، جو اس وقت کے جدت پسندوں میں سے تھے' نے اس بات کی وکالت کی کہ ان کے ہم مذہب کانگریس سے لاتعلق رہیں۔ دوسری طرف کانگریس، اس وقت بھی، اپنا مفروضہ قومی کردار برقرار رکھنے کے لیے مسلمانوں کی حمایت کو اہمیت کو محسوس کرتی تھی۔ کانگریس کے پہلے اجلاس کے 72 مندوبین میں سے مسلمان صرف دو تھے اور یہ دونوں بھی خاصے غیر اہم لوگ تھے۔ لیکن دوسرے کانگریس اجلاس کی مجلس استقبالیہ نے مسلم نمائندگی کو بہتر کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ اس کے ردعمل میں، سید احمد خان نے علی گڑھ انسٹی گزٹ کے 23 نومبر 1886 کے شمار میں شائع ایک مضمون میں کانگریس تحریک کو با□نہ، قرار دے کر اس کی مذمت کی، 1886 میں کلکتہ میں ہونے والے دوسرے کانگریس اجلاس میں شریک 431 مندوبین میں سے مسلمان صرف 33 تھے اور اس بار بھی یہ کوئی ممتاز لوگ نہیں تھے۔

سید احمد 1887 سے کھل کر کانگرس کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ کانگرس کے تیسرے اجلاس میں بدرالدین طیب جی کو صدارت کے لئے مدعو کیا گیا محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج، علی گڑھ کے کئی طلبہ بھی اس میں شرکت کرنے والے تھے۔ اس کی وجہ سے اس اجلاس میں مسلمانوں کی موجودگی کا تناسب نمایاں طور پر بہتر ہو گیا۔ اس سے سید احمد خاں کو خطرہ محسوس ہوا جنہوں نے 28 دسمبر 1887 کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے کے دوران اپنی مسلم پالیسی کا پہلا خاکہ پیش کیا۔ انہوں نے واضح لفظوں میں خبردار کیا کہ مسلمان کانگرس کی حمایت کر کے ایک تباہی کو گلے لگائیں گے۔

دریں اثناء کانگرس ان دنوں مطالبہ کر رہی تھی کہ ہندوستانی اراکین کو شاہی اور صوبائی کونسلوں میں ان کا جائز مقام ملنا چاہتے، مگر انتخابات کے ذریعے۔ سید احمد نے اسے کونسلوں میں صرف اکثریت (ہندوؤں) کی نمائندگی سمجھا، اور وہ بھی مستقلاً۔ اس تناظر میں انہوں نے، پہلی بار، دعوا کیا کہ مسلمان ایک علاحدہ 'لوگ' 'ایک' علاحدہ قوم' ہیں۔ لالہ لاجپت رائے نے انہی خیالات، بیانات اور سرگرمیوں کے سبب سید احمد خاں کو شرومہ کے ساتھ آڑے ہاتھوں لیا۔ 1888 کے اواخر میں، انہوں نے سید احمد پر اپنے سابقہ موقف سے پھر جانے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ کانگرس نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا جس کی وکالت خود سید احمد اپنی کتاب اسباب بغاوت ہند، میں کر چکے ہیں، اور یہ بھی کہ سید احمد کانگرس کی مخالفت محض انگریز حکام کی خوشامد کی غرض سے کر رہے ہیں۔

سید احمد نے 1893 میں 'مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ کی غرض سے' محمڈن اینگلو۔ اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ 1896، سید محمد (سید احمد کے بیٹے) اور تھیوڈور بیک (علی گڑھ کالج کے پرنسپل) نے اس ایسوسی ایشن

کی جانب سے ایک اسکیم وضع کی، جس کا تعلق امپیریل اور صوبائی کونسلوں میں مسلم نمائندگی کے سوال سے تھا۔ اس اسکیم میں ان اعلاسطح کی کونسلوں ہی میں نہیں بلکہ میونسپلٹیوں اور اضلاع میں اور ہر اس برابری، دینے کی بات کہی گئی تھی۔ اس اسکیم کا ایک اہم پہلو یہ تجویز تھی کہ ان کونسلوں اور مقامی اداروں کے مسلم اراکین کا انتخاب صرف مسلمانوں کے ذریعے کیا جائے۔ لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ مسلم پریس نے اس اسکیم کا خیر مقدم کیا۔ سید محمود، بیک اسکیم ایک ایسا بیج تھی جو آخر کار ایک علاحدہ مسلم ریاست، جو ہندوستان کا حصہ ہو یا اسی کے باہر ہو، سے متعلق مسلم سیاسی تحریک کا تناور درخت بن گئی۔

اس وقت کی ایک اور اہم شخصیت، جو سید احمد کی تقریباً ہم عصر تھی، سید جمال الدین افغانی (97-1839) کی تھی۔ افغانی 56-1855 کے آس پاس ہندوستان آئے تھے اور جہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس سے بڑی گہرائی سے متاثر ہوئے۔ شاید ان کا یہی دورۂ ہند ہے جس نے انہیں بالآخر برطانوی اقتدار کا سخت نکتہ چینی بنا دیا۔ اس تبدیلی کا سبب بلاشبہ انہیں آگے چل کر حاصل ہونے والی 1857 سے متعلق معلومات تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ افغانی کے نزدیک، سید احمد خاں، ان کے بہت بڑے دشمن یعنی انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور اسی لئے، سید احمد خاں کے خیالات اور مقاصد انہیں کسی طرح بھی قبول نہیں تھیں۔

افغانی کے خیالات حیرت انگیز طور پر اپنے زمانے کے لحاظ سے درست تھے۔ وہ لسانی اور علاقائی نوعیت کی قوم پرستی کے حامی تھے جس کا بالواسطہ مطلب تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد، اور جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے اندرونی اتحاد یا دیگر ملکوں کے مسلمانوں سے ان کے اتحاد کا کوئی ذکر شامل نہیں تھا۔ 38 وہ پین اسلامی (pan-Islammist) یا مسلمانوں کے وسیع تر اتحاد کے حامی، نہیں تھے یا کم از کم اس وقت تک نہیں تھے، اور وہ اپنی تحریروں میں اس نوع کے تمام تصورات کی مخالفت کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا 'قوم پرستی کی سوا اور کوئی چیز باعث مسرت نہیں ہے اور زبان کے بغیر قوم پرستی کا وجود ممکن نہیں۔ اور کوئی زبان تب تک زبان نہیں کہی جا سکتی جب تک پیداوار اور تجارت سے وابستہ لوگ اپنے کام میں اس کا استعمال نہ کریں' 39۔

شاید یہی وجہ ہے کہ افغانی نے ایک ایسی مشترک زبان کی وکالت کی جو افراد، قبیلوں اور گروہوں تو ایک متحدہ قومی اکائی بنا دے۔ یہ سانی قوم پرستی کو مذہبی قوم پرستی پر خصوصی ترجیح دینے کا خیال تھا اور افغانی کے نزدیک آخرانہ کر زیادہ جوڑنے والی اور پائیدار طاقت تھی۔ ان کے الفاظ میں، 'انسانی دنیا میں گہرا اثر و نفوذ رکھنے والے رشتے...... دو ہیں۔ ایک ہے...... زبان کی وحدت جس سے قومیت اور قومی اتحاد تشکیل پاتا ہے، اور دوسرا مذہب ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زبان کی وحدت، اس دنیا میں بقاء اور استقلال کے لئے مذہب کی وحدت کے مقابلے زیادہ پائیدار ہوتی ہے، کیوں کہ یہ آخرانہ کر کے برخلاف، کچھ عرصہ بعد تبدیلی ہو جاتی' 40۔

انہوں نے قومی زبان کی تعلیم اور آموزش کی وکالت کی جس سے قوم کے ماضی کے ساتھ تعلق کو فروغ ملے گا اور

قوم زبان کے ذریعے دی گئی تعلیم کسی بیرونی زبان کے ذریعے دی گئی تعلیم کے مقابلے زیادہ لوگوں تک پہنچے گی۔ انہوں نے کہا 'قومی زبان کا فروغ قدم اتحاد اور حب الوطنی کی لازمی شرط ہے؛ لہٰذا ہندوستانیوں کو چاہیے کہ جدید علوم کو اپنی زبان، یعنی اردو میں ترجمہ کریں۔' 41 یہ خیالات حیرت انگیز طور پر آج کے معلوم ہوتے ہیں، حالاں کہ انیسویں صدی کے وسط میں ظاہر کیے گئے تھے۔

افغانی ان مذہبی قدامت پسندوں کے بھی خلاف تھے جو مغربی علوم کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان کے مطابق شریف کے اصول سائنس اور دیگر علوم کے اصول میں مزاحم نہیں ہیں بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، کیوں کہ علم مذہب کو تقویت پہنچاتا ہے کہ اس کے ذریعے اس پیروؤں کو دولت، حیثیت اور اقبال مندی حاصل ہوتی ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں، 'انگریزوں فنون اور صنعتیں ضروری ہیں، مگر انہیں اپنی زبان میں ترجمے کے ذریعے فروغ دیا جانا چاہیے۔' 42 افغانی اپنے زمانے کے خراج سے بخوبی واقف تھے وار اس لیے انہوں نے مذہبی اتحاد کے بجائے سانی اتحاد پر زور دیا۔ ان کا استعمار مخالف اور انگریز مخالف مقصد سب سے زیادہ اس طرز فکر کے ذریعے پورا ہوتا تھا، اور یہ طرز فکر ہر لحاظ سے سر سید احمد خاں کے طرز فکر کے برعکس تھا۔

مسلم اصلاحی تحریکات

کوئی بھی مذہب زوال سے دوچار ہونے کی صورت میں اکثر خود احتسابی کا سہارا لیتا ہے۔ 1857 کے بعد، ہندوستان میں اسلام بھی اس عالم میں تھا۔ سید احمد بریلوی کے زمانے میں ہی، بنگال میں ایک ایسی مذہبی تحریک ابھری جو زمین سے اور مسلم کاشت کاروں کی روز کی زندگی اور جینے کی جدوجہد سے گہرا تعلق رکھتی تھی۔ یہ تھی فرائضی تحریک 43۔ دادو میاں اور ٹیٹو میر 44۔ سید احمد بریلوی جیسے ہی خیالات رکھتے تھے کہ یہ تمام مسلم مصلحین خالص اسلام کی بحالی کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان اصلاح تحریکوں نے مسلم فرقے کو اہل ایمان کی ایک جمعیت سے مشترک جدوجہد کے عزائم کی حامل ایک سیاسی وحدت میں تبدیل کر دیا۔' 45۔ بنیادی طور پر، ان تحریکوں نے ہندوستان کے عہد وسطا والے، عجمی اور نرم اسلام کو مسترد کر کے قرون اولا کے خالص تر اور سخت اسلام کی طرف پلٹنے کی صدا لگائی۔ اس کے علاوہ، یہ تحریکیں شہری ایوانوں اور اشراف کی سجی دھجی بیٹھکوں میں گونجنے والی آوازیں نہیں تھیں، بلکہ انہوں نے عوام میں جا کر ان ہندو رسوم و رواج کے خلاف آواز اٹھائی جنہیں سب سے مسلمانوں نے اختیار کر لیا تھا: مصلحین نے مسلمانوں پر زور دیا کہ انہیں ان ہندو طور طریقوں کو اختیار نہیں کرنا چاہتے، کیوں کہ ہندوستان 'ان کا گھر نہیں محض ایک ڈیرہ ہے۔' 46 بنگال میں دادو میاں اور ٹیٹو میر، سید احمد بریلوی کی مذہبی اور سماجی سرگرمیوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تیز دھار والا اور جنگ جویانہ فرقہ وارانہ لہجہ اختیار کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی، ان تحریکوں نے متوسط طبقے کی مسلم ثقافت پر بھی سخت حملہ کیا جو پہلے ہی سے آخری سانسیں لے رہی تھی۔ شاعری، مصوری، حواس کی لذتوں کے تمام تر سامان، شہری نفاستوں کے حامل طبقہ اشراف، ہندو اور مسلم دنوں، کی یاد ماضی

کی روشنیاں یہ سب کا سب مذہبی طہارت پسندی کے سخت طبقاضوں کی ٹھوکروں سے زمیں بوس ہو گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے انہیں 1857 کے بعد سنگین اقتصادی حالات کے سخت گیر (اور تزلیل کن) حقائق کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے تھے، وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے مذہبی جوش وخروش کو شدید تر اس کے ساتھ ہی آلودگیوں سے پاک پر جوش عقیدے کا اظہار بھی۔ ابتلاو مصائب کے حالات، اسلام ہی کیا، ہر مذہب کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اسلامی اصلاحی تحریک کا ایک ممتاز مرکز دارالعلوم دیو بند تھا جسے شاہ ولی اللہ 47 کی روایت سے وابستہ علما نے 1867 میں قائم کیا۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کا مقصد اب مسلمانوں کو سامراج کی خدمت کے لئے تیار کرنا نہیں بلکہ ایک ایسی دنیا میں جہاں وہ اقتدار میں نہیں ہیں باقی اور برقرار رہنے کا 'فن' سکھایا جانا پائے۔ لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے، بہت سے اشراف بیسویں صدی کے اوائل تک اپنی نفسیاتی اور تہذیبی بقاء کے لئے اپنے عجمی اسلامی ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے تھے، دلیل یہ تھی کہ ان کے آباء واجداد حکومت کرنے کے لئے ہندوستان آئے تھے، اور اقتدار اور اس کا استعمال ان کے خون میں شامل ہے، یہ ان کا پیدائشی حق ہے، اور یہ حق انہیں جائز اور ناگزیر طور پر حاصل ہونا چاہئے۔ وہ کم از کم آپس میں تو یہ اس قسم کی باتیں ضرور کرتے تھے کہ 'یہ صرف چند دنوں کی بات ہے کہ ان کا کھویا ہوا اقتدار انہیں واپس مل جائے گا'

یہ رویہ، کم از کم بیس ویں کے نصف اول کے دوران، بیشتر مسلم سیاست کا محوری نقطہ تھا۔ شاید آج بھی ہے۔ پاکستان میں تو یہ رویہ موجود ہی ہے، ہندوستان میں بھی کچھ ہلکے رنگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ خیال علی گڑھ تحریک سے متعلق تحریروں میں جاری وساری بھی ہے اور اس کا محرک بھی، آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے مسلمانوں کی سیاسی اہمیت پر اصرار بھی اسی کا مظہر ہے، اسے اقتدار کی پرستش کے اس رویے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو اقبال کی بیشتر شاعری میں سرایت کئے ہوئے ہے اور جس نے صرف پاکستان کے مطالبے کی راہ ہموار کی بلکہ آج بھی اس نے ہندوستان کی سیاسی فکر وعمل کے ایک بڑے حصے کو خاصا بھر مار کھا ہے۔ پاکستان کو جنم دینے والے بہت سے اور اسباب کی اہمیت گھٹانے کی کسی کوشش کے بغیر، یہ شاید عملی اسلام اقتدار کا آخری قابل لحاظ مظاہرہ تھا۔ یہ اقتدار، بیسویں صدی کے اوائل میں سرگرم دیگر اقتدار کی طرح، پیچیدہ تضادات، معمے جیسی صورت حال اور ایک خود شکن داخلیت کی حامل تھیں۔

دارالعلوم دیو بند، جو دہلی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک بڑا اسلامی مرکز ہے، اب ایک بین الاقوامی اہمیت کا حامل اسلامی تعلیمی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے اپنے ابتدائی دنوں میں اس کی کفالت پوری طرح رضا کارانہ عطیات کی مدد سے کی جاتی تھی۔ طلبہ صرف مسلمان ہوتے تھے اور ان کا تعلق صرف شمالی ہند یا یوپی سے بلکہ پنجاب، بنگال اور یہاں تک کہ افغانستان سے بھی ہوتا ہے۔ بعض طلبہ ایران کے بھی تھے۔ نصاب تعلیم پوری طرح روایتی تھا۔ انگریزی، اور ظاہر ہے کہ سائنس بھی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ سرکاری روزگار اور روایتی طور پر چھپائی اور جلد سازی کے علاوہ کسی اور دست کاری سے لا تعلق ہونے کے سبب، دیو بند کے فارغ التحصیل طلبہ مسلم ہندوستان کے مدارس کا رخ کرتے تھے۔ اس طرح پہلے تعلیم دینے اور پھر ان تعلیم یافتہ مسلمانوں کو دوسروں سے الگ کرنے کا نظام قائم رہتا تھا۔ دیو بند کی بیشتر ممتاز شخصیات، شاہ ولی اللہ کے

قائم کردہ دہلی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر چکی تھیں جسے 1857 میں انگریزوں نے تباہ کر دیا تھا، اور ان میں سے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اس بغاوت میں زندہ بچ گئے تھے۔

ایک اور اصلاحی حلقہ، جسے اکثر دیوبندیوں کی ضد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، بریلویوں کا تھا جس نے 1880 کی دہائی کے دوران شکل حاصل کرنی شروع کی۔ اس حلقے کے خیالات کی نمائندگی کے طور پر، احمد رضا خاں 48 کا یہ کہنا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات لازمی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس حلقے کی بنیادی فکر کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق عیسائی تو کم از کم اہل کتاب ہیں مگر ہندو کے لئے نجات کی کوئی راہ نہیں کہ وہ کافر ہیں۔ ایسے سخت خیالات کے باوجود، بریلویوں اور دیوبندیوں کے درمیان اصولی اختلافات موجود ہیں۔ مگر میں یہاں مذہبی بارود کے اس ڈھیر پر قدم دھرنے کی ہمت نہیں کر سکتا کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے دوران ان دونوں کے درمیان فتوے بازی کی زبردست جنگ لڑی جا چکی ہے۔ ان اختلافات کو، آگے چل کر، انگریزوں نے، دیوبندیوں کو بے اثر کرنے اور بریلویوں کو اپنی وفاداری کے جال میں پھانسنے کی غرض سے استعمال کیا۔

اسلام۔عکس اور اصل

نومبر 1888 میں، اس وقت کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ڈفرن نے ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ 'تقریباً 5 کروڑ کی ایک قوم ہیں، اپنے عقیدۂ توحید، اپنے بت شکن کٹرپن، جانوروں کی قربانیوں کی اپنی رسم، اپنے سماجی مساوات اور اپنے ان دنوں کی یادوں کے ساتھ جب وہ دہلی میں اپنے بل بوتے پر کلی طور پر حکمران تھے۔۔۔' 49۔ یہاں 'کلی طور پر حکمراں' کا فقرہ اس تصور ذات کا بالکل درست بیان ہے جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے زمانے میں جدید تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمانوں نے خود اپنے بارے میں قائم کر رکھا تھا۔ یہ تصور ذات، بہت پہلے کھوئے ماضی آرزومندانہ یادوں، اس گزرے ہوئے زمانے کی اضطراب انگیز جستجو اور ان عظمتوں کی کچھ روشنیاں دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ کا نتیجہ تھا۔ آئندہ ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ اس غیر عقلی یاد ماضی کے کچھ بہت تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ اس نے مسلمانوں کو پہلے تو برطانوی ہندوستان میں ایک خصوصی سیاسی حیثیت دئے جانے کا مطالبہ کرنے پر اکسایا، اور پھر 1940 کی دہائی کے دوران، وہ ہندو اکثریت کے ساتھ برابری کی تلاش کرتے کرتے اپنے لئے ایک علاحدہ، خودمختار ریاست اور اپنا خاص خطہ ارض یعنی پاکستان مانگنے تک جا پہنچے، کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ وہ ایک علاحدہ قوم ہیں، اس لئے نہیں ڈفرن نے ان کے بارے میں ایسا کہا تھا۔

یہاں ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنے ایک خاص خطہ ارض کی جستجو میں وہ چیز جسے انہوں نے سب سے بڑا کھویا ان کا یہی تصور ذات تھا۔ یہ تصور ذات تقسیم کے بعد نہایت ناقابل فہم طور پر طاق نسیاں کی زینت بن گیا؛ کہ اب ایک خطہ ارض تو موجود تھا مگر عظمت رفتہ جا چکی تھی، اور وہ مسلمان، جنہوں نے اپنے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا محسوس کیا، اپنی عظمت

رفتہ خوابوں سے پوری طرح محروم ہوگئے۔ اس بات پر کہ اس نوعیت کا تصور ذات محض ایک فریب منظر ہوتا ہے، روشنی ڈالتے ہوئے، بہت سے لوگوں نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ برطانوی دور کے پہلے کے زمانے میں، جب مسلمان ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر غالب سیاسی حیثیت رکھتے تھے، واقعی اس نوع کے تصورات نے ہی انسانی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔ عہد وسطا کے مسلمانوں نے، جو مغربی یوروپ جتنے رقبے والے برصغیر میں کہیں زیادہ اور کہیں کم تعداد میں لکھے ہوئے تھے اور جن میں مسلکی معتقدات، کھانے پینے کے تجارات و اطوار، سماجی آداب، لباسوں، پیشوں اور اکثر زبان کے اختلافات پائے جاتے تھے، کبھی بھی اپنے آپ کو ایک وحدت نہیں سمجھا اور ان کا طرز عمل بھی یقینی طور پر ایسا نہیں رہا۔ وہ ایسا کہہ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ ہندوستان میں ہونے، ہندوستانی ہونے اور ہندوستانی مسلمانوں ہونے کی بنیادی سرشت کے منافی تھا۔

آیئے اب ذرا دیر کو اس دور میں واپس چلیں جب اسلام پہلے پہل ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ عجمی اور عرب تاجر ماقبل اسلام زمانے سے ہی ہندوستان کے مغربی ساحلوں پر تجارت کے سلسلے میں آتے جاتے رہے تھے۔ اسلام کے طلوع کے بعد، ان تاجروں نے بھی یہی عقیدہ اختیار کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اولین مسلم بحری بیڑہ، پیغمبر اسلام کی وفات کے صرف چار سال بعد عمر کی خلافت کے زمانے کے دوران، 636 میں بمبئی کے نزدیک تھانے کے ساحل پر نمودار ہوا تھا۔ ہندوستان میں داخلے کے لئے ہمیشہ سے ہی زمین کے راستے کو ترجیح دی جاتی رہی ہے اور ساتویں و آٹھویں صدیوں میں سندھ پر ہونے والے تمام حملے زمین کے راستے سے ہی کئے گئے۔ گیارہویں اور بارہویں صدیوں تک مسلمانوں نے ہندوستان تک پہنچنے والے خشکی اور تری کے تمام راستوں پر تقریباً مکمل غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اب تک مسلمان مالابار، کونکن کے علاقوں اور ہندوستان کے مغربی ساحلوں پر اپنی تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ سکونت اختیار کر چکے تھے۔

شمالی ہند میں بسنے والے اولین مسلمان حملہ آوروں کی طرح یا حملہ آوروں کے ہمراہ، تارکین وطن کی پے در پے لہروں کے ساتھ آئے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی جان چکے ہیں، عربوں نے سندھ پر پہلا حملہ ساتویں/آٹھویں صدی میں کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہاں ایک چھوٹی سی مسلم برادری وجود میں آگئی۔ اسی طرح، گیارہویں صدی میں محمود غزنوی کے حملے کے بعد مغربی پنجاب میں بھی مسلمانوں کی ایک مقامی برادری نمودار ہوئی۔ اس کے اور محمود غوری کے حملے کے درمیان، گیارہویں اور بارہویں صدی کے اواخر کے دوران، شمالی ہند میں مسلمانوں کی آبادیاں ابھر آئیں، پنجاب میں غزنویوں کا قدم جمانا توسیعی کوششوں کا وسیلہ بنا جس سے مسلمانوں کو مشرق کی جانب پیش قدمی کا موقع ملا۔ غوری کی فتح سے کوئی آدھی صدی پہلے، شمالی ہند میں مسلم تارکین وطن کے چھوٹے چھوٹے چھٹ پٹ دائرے قائم ہو چکے تھے۔ قنوج کے راٹھور حکمرانوں کے عہد ساز زمانے میں بھی، وارانسی میں بعض مسلم گورنر موجود تھے۔

جب تک مسلمانوں کی تجارتی سرگرمیاں ہندو حکمرانوں کو مالی فوائد پہنچاتی رہیں تب تک ان کے لئے آغوش استقبال عموماً کھلا رہا۔ انہیں ہندو حکمرانوں کی فوجوں میں بھاڑے کے فوجیوں کی حیثیت سے رضا کارانہ طور پر بھرتی بھی کیا

جاتا رہا۔ان کی آؤ بھگت کی گئی ہو یا نہیں، وہ مسلسل، خشکی اور تری پر، فوجی مہمات کے ذریعے ہندوستان کے قلب کی جانب پیش قدمی کرتے رہے اور اس طرح تارکین وطن کے طور پر ان کی حیثیت مضبوط ہوتی گئی۔اولیان مسلم بحری بیڑے سے قاسم اور غزنوی کے حملوں تک کئی موقعوں پر، خصوصاً 1080 سے 1116 اور پھر 1133 سے 1169 کے درمیان اور بھی حملے ہوتے رہے۔ان میں سے بعض حملے ناکام رہے لیکن یہ ناکامی اس لحاظ سے اہم تھی کہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد اور اثرات مسلسل بڑھ رہے تھے۔اور ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے جذبہ 'رواداری' اور دوسروں کے مذہبی معالات اور اعمال کی جانب لاتعلقی کے رویے نے بھی اس میں مدد کی۔تاہم اس زمانے میں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی طرف سے تبدیلی مذہب کی کسی بھی نمایاں سرگرمی کو پسند نہیں کیا اور نہ اس کا خیر مقدم کیا۔لیکن چوں کہ اسے فوری طور پر روک پانا ممکن نہیں تھا، اس لئے اس معاملے میں بھی انہوں نے عمومی طور پر بے اعتنائی کا رویہ اختیار کرلیا۔غزنوی حکومت اور جنگ ترائین 51 کے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو سال کا وقفہ ہے، مگر ان دونوں میں اہم واقعات ایک دوسرے سے 'جڑے ہوئے ہیں' کیوں کہ اس تمام عرصے میں، پنجاب میں، مسلم اقتدار ایک نہ ایک شکل میں اور اپنی وسعت، گہرائی اور اثر کے لحاظ سے مختلف سطحوں پر جاری رہا۔یہی وجہ ہے کہ غوری نے پنجاب اور دہلی میں آخر کار ایک قابل تسلیم اقتدار کے کسی نہ کسی شکل میں جاری رہنے کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تعداد لگاتار بڑھتی رہی۔مسلم حکمرانوں نے تبدیلی مذہب کی سرگرم حوصلہ افزائی کی۔انہوں نے مسلم علماء اور تعلیمی اداروں کے لئے بڑی بڑی جاگیریں اور وظائف مقرر کئے، مگر صرف مسلم اہل علم کے لئے۔کبھی کبھی حملہ آور فوجیں، کسی فوجی مہم کے جوش و خروش میں بعض قیدیوں کو اذیت ناک موت کا خوف دلا کر اسلام قبول کرنے پر بھی مجبور کررہی تھیں۔مسلم حکمراں کبھی کبھی مذہب تبدیلی کرنے کے لئے باج گزار سرداری کے منصب یا جاگیروں کی پیش کش بھی کرتے تھے۔وہ اکثر ایسے حالات پیدا کرتے تھے جس سے مذہب تبدیلی کرنا آسان ہوجائے۔ہندوؤں کے لئے اپنے عقیدے پر قائم رہنا فوری سزا یا جرمانے کو دعوت دیتا تھا، جن میں بدنام زمانہ 'جزیہ'52 بھی شامل تھا۔

جیسے جیسے مسلم اقتدار کا دائرہ پھیلا، مسلمانوں کی تعداد بھی فطری طور پر بڑھتی گئی۔اس وقت کے ماحول میں، مذہب کی تبدیلی ساتھی بدل جانے سے زیادہ اہمیت نہیں تھی، اس کا مطلب طرز عمل یا باطنی زندگی میں تبدیلی کم بہت ہوتا ہے' حالاں کہ بعض معاملات میں باطنی تبدیلی بھی واقع ہوجاتی تھی۔نو مسلم شخص ایک سماجی حلقے کا حصہ بنتا تھا جسے شادی بیاہ کے ساتھ کھانے پینے، اور رسوم و رواج جیسے گہرے سماجی رشتوں کے معاملے میں دیگر مسلمانوں کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔اس کے علاوہ یہ بھی پرانے رشتوں کو چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ پرانے تمام طور طریقے پوری طرح پیچھے چھوٹ گئے ہیں۔نو مسلم کو اس کے ہم مذہب فوری طور پر اپنے برابر کا نہیں سمجھنے لگے تھے اس میں کم ایک یا دو پیڑھیاں گزر جاتی تھیں اور اسی دوران اسے پیدائشی مسلمانوں سے ایک درجہ کم یا مختلف سمجھا جاتا تھا۔

مولوی، قاضی، پیر فقیر لوگ بھی نو مسلموں پر اپنے عقیدے، عادات اور سماجی رشتوں کو فوراً اور پوری طرح چھوڑنے کا مطالبہ نہیں کرتے تھے۔وہ بعض معاملات مثلاً وراثت کے ضابطوں میں شریعت سے تھوڑا انحراف کو بھی برداشت

کر لیتے تھے۔ جب کسی طاقت ور زمین دار گھرانے کے لوگ اسلام قبول کرتے تھے تو 'جھانی' رشتے کے لوگ بھی خون ایک ہونے کی وجہ سے، اسلام لے آتے تھے۔ اور یہ سب عقیدے کی تبدیلی مسلمانہ جوش کے سبب نہیں بلکہ محض سہولت کے لیے کیا جاتا تھا۔ مسلم حکمرانوں کے حاصلات تو بہت سے ہیں مگر مجموعی طور پر، انگریزوں کی طرح، انہوں نے بھی ابتدائی فوجی کامیابیوں کے بعد فوجی انداز سے زیادہ سیاسی حکمت عملی اختیار کرنے پر اکتفا کی، انہوں نے اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے کارآمد معاہدے کیے، اور اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ طاقت کے واقعی استعمال سے زیادہ طاقت کے محض علامتی اظہار کو ترجیح دی۔ ہندوستان میں مسلم اقتدار، برطانوی راج یا یہاں کی بیشتر حکومتوں کی طرح، بیشتر رعایا کی جانب سے روادارانہ طور پر قبول کیے جانے کی وجہ سے ہی برقرار رہا، جو ایک طرح کی لاتعلقی پر مبنی سپردگی کا رویہ تھا، لیکن اسے ہر حال میں جابرانہ تسلط کے آگے گھٹنے ٹیکنے کا نتیجہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں اقتدار کے ایک واحد مرکز سے حکومت کرنا ہمیشہ حقیقی سے زیادہ محض تصوراتی معاملہ رہا ہے۔ اس وسیع و عریض اور متنوع ملک میں اس کے برعکس کوئی بھی صورت بہ مشکل ہی ممکن ہے۔

بنگال کے سول سرونٹ ولیم ہنٹر 54 نے 1871 میں لکھا تھا کہ 'مسلمان ہر لحاظ سے...... برطانوی اقتدار کے ہاتھوں تباہ و برباد کی گئی قوم ہیں۔' اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ اس رائے کا تعلق زیادہ تر جنوبی بنگال سے تھا، بیشتر تاریخ دانوں نے اسے حتمی مان لیا اور پھر اسے اتنا بڑھایا جیسے یہ برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی تقدیر کا حقیقی بیان ہو، برطانوی اقتدار نے بہت سے مسلمانوں کو، مثلاً پنجاب میں، تحفظ بھی فراہم کیا؛ بمبئی میں جہاز رانی اور تجارت میں لگے مسلمانوں کو اس نے دولت اور خوش حالی دی، شمال مغربی صوبوں میں برطانوی راج کی خدمات سے وابستہ بہت مسلمانوں کو بطور انعام زمینیں دی گئیں۔ ایک ممکنہ تعمیم صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ انگریزوں نے دھیرے دھیرے ہندوستانی معاشرے میں کامیابی کا پیمانہ تبدیل کر کے اسے فوجی کے بجائے تجارتی کر دیا: یہ ایک جال تھا جس کے ذریعے کہا جا رہا تھا کہ 'انگریزوں کو قبول کرو اور فائدے اٹھاؤ'، اور بہت سے لوگ اس میں پھنس گئے، بہ رضا و رغبت اور پوری طرح۔

انگریز انیسویں صدی کے اوائل تک، ہندوستان کے تجارتی استحصال کے نتیجے میں بالواسطہ طور پر حاصل ہونے والی کامیابیوں پر بلاشبہ خود بھی قدرے حیرت میں تھے۔ اس کی وجہ سے انہوں نے شمالی ہند کی مغل ثقافت کے سلسلے میں احتیاط آمیز احترام کا رویہ اختیار کیا۔ دہلی پر ایک طرح سے مکمل اختیار پا لینے کے باوجود، انہوں نے، شروع میں عملی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ عالم کی برائے نام برتری کو برقرار رہنے دیا، مگر اسے بالآخر ختم ہونا تھا۔ شہنشاہ کے حقوق کو تسلیم نہ کرنے کے معاملے میں انگریزوں کا رویہ سخت ہوتا اور اسی طرح دھیرے دھیرے مغل سلطنت کی آخری نشانی □ کے گھاٹ اتر گئی۔ 1857 تک، انگریز اپنے آپ کو یقین دلا چکے تھے کہ دہلی کے مغل اب بے معنی ہو چکے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقوں کی مسلم آبادی بھی اب ان کی طرف سے لاتعلق ہو چکی تھی۔ اس پر کسی کو کوئی رنج بھی نہیں ہوا، کیوں کہ کسی بھی بے طاقت سلطنت یا حکمراں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ یہ بات صرف آخری مغلوں کے ہی نہیں، ہندوستان اور دنیا میں کسی بھی جگہ،

یہاں تک کہ اکیسویں صدی کے لیے بھی درست ہے۔

ہندوستان کے مسلم فرقے نے اپنے ایک نئے کردار، نئی معنویت، کچھ ذمے داری اور حیثیت جس کے وہ عادی تھے، کی مسلسل تلاش میں اپنے خول سے باہر نکلنا شروع کیا۔ اس جذبے نے ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی اقدامیت پر اکسایا۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اگر نہ کیا گیا تو وہ اور بھی بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ ہندو، جو زیادہ تعلیم یافتہ اور نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے زیادہ اہل تھے، پہلے ہی متحرک ہو چکے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس (آئی این سی) 1885 میں اس وقت سے فعال تھی جب لارڈ ڈفرن وائسرائے تھے، اور وہ اس اعلا منصب پر رہتے ہوئے، کانگریس کے اراکین کو پابندی کے ساتھ اپنی سالانہ 'گارڈن پارٹی' میں مدعو کرتے رہے۔

یہ تلاش اقتدار میں شرکت کے مطالبے پر ختم ہوئی، جس کے نتیجے میں 1906 کا شملہ وفد وجود میں آیا۔ اس مطالبے نے ہی ہندوستانی کونسل ایکٹ 1909 میں فراہم کردہ علاحدہ حلقہ انتخاب کا جنم ہوا، جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو، اس وقت رائج جمہوری ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے، ایک علاحدہ آئینی شناخت حاصل ہوئی یہ سب جزوی طور پر وائسرائے کرزن (1898-1905) کے اقدامات کا بھی نتیجہ تھا۔ لیکن یہاں ہم کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں، ان تمام معاملات اور کرزن کے ہاتھوں بنگال کی تقسیم وغیرہ کے بیان میں۔ یہ ایک ایسا انتظامی لحاظ سے درست مگر سیاسی لحاظ سے تباہ کن اقدام تھا جو ہمارے ان چاہے نتائج کے اس نظریے کا ثبوت فراہم کرتا ہے، جس کا اب ہم اجمالی ذکر کریں گے۔

لسانی تقسیم

دونوں مذاہب کی خصوصیات اور مذہبی رسوم کے علاوہ، اسکولوں کا ذریعہ تعلیم، استعمال کی جانے والی زبان اور نصاب بھی دونوں کو الگ کرتا تھا۔ اسکول بیشتر مندروں، مسجدوں اور ایسی ہی دیگر اجتماعی مراکز سے وابستہ ہوا کرتے تھے۔ ذریعہ تعلیم، ہندو اسکولوں میں سنسکرت، ہندی یا کوئی علاقائی زبان، اور مسلم اسکولوں میں فارسی، عربی یا اردو ہوتا تھا۔ اگرچہ ہندو طلبہ مسلم اسکولوں میں داخلہ لے سکتے تھے اور لیتے تھے مسلمان مشکل سے ہی ہندو اداروں کا رخ کرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اردو یا فارسی پڑھتی تھی، مگر ایسا شاذ ہی ہوتا تھا کہ کوئی مسلمان سنسکرت میں رواں ہو، حالاں کہ ہندی آج کی طرح اس وقت بھی عام طور پر ذریعہ تعلیم تھی۔

یہ ملک کا روایتی نظام تعلیم تھا جو انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران جاری رہا، جب دوسری طرح زیادہ سے زیادہ جدید تعلیمی ادارے (نصاب کے لحاظ سے) بھی قائم ہوتے جا رہے تھے۔ اگرچہ مسلمان بھی، آبادی میں اپنے تناسب کے لحاظ سے، حکومت کے ان اداروں میں آزادانہ داخل ہو رہے تھے، مگر پھر بھی شمالی ہند کے ممتاز مسلمانوں میں یہ تصور عام ہو گیا کہ ان کے فرقے کے لوگ انگریزی تعلیم سے بہرہ یاب نہیں ہو رہے ہیں۔

بنگال میں صورت حال بالکل مختلف تھی، یہی معاملہ جنوبی ہند کا تھا۔ مگر یہاں ہم صرف بنگال کا ذکر کریں گے جہاں مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے۔ اس کے کئی اسباب میں ایک نمایاں سبب 'وہابی اثرات' ☆ بھی تھے۔ شمالی ہند میں تو ایک پر جوش مصلح کی حیثیت سے سرسید موجود تھے مگر بنگال، جہاں شاید اس کی کہیں زیادہ ضرورت تھی، ایسے کسی بھی بہی خواہ سے محروم تھا۔ سید امیر علی، نواب عبداللطیف اور بنگال کے ایسے ہی دیگر مسلم رہنماؤں نے اس بات پر یقیناً زور دیا کہ بنگال میں اردو کو مسلمانوں کے لیے وہی حیثیت حاصل ہونی چاہیے جو ہندوؤں کے لیے بنگالی کو حاصل ہے۔ مگر اسے یہ حیثیت کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت ایک عام بنگالی اسکول میں ہندو اثرات بہت نمایاں ہوا کرتے تھے۔

1870 کی دہائی میں ہندی اور اردو کے علم برداروں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی۔

اگرچہ ہندوؤں نے اردو کو کبھی بھی ترک نہیں کیا، مگر اس زبان کی برتری، حسن استعمال اور دیگر پرکشش خصوصیات نے، بہار میں، جو اس وقت بنگال میں شامل تھا، ہندی کے حامیوں کو احتجاج پر اکسایا۔ نتیجتاً، حکومت بنگال نے بہار کی عدالتوں میں ہندی استعمال کیے جانے سے متعلق احکامات جاری کیے جس کے بعد دیوناگری ☆ تو بہار میں سرکاری دستاویزات میں استعمال کیے جانے والے واحد رسم الخط قرار دے دیا گیا۔ اس حکم کی تعمیل جس شدومد کے ساتھ کی گئی اس سے مسلمان بھڑک اٹھے اور اس تنازع کی لہریں شمال مغربی سرحدی صوبے (این ڈبلیو ایف پی) تک جا پہنچیں۔ اس صوبے میں اس کا الٹا عمل کیا گیا۔ اس طرح پنجاب یا این ڈبلیو ایف پی جیسے صوبوں میں دیوناگری کو رائج نہ کیے جانے سے ہندوؤں میں برہمی پیدا ہوئی۔

زبان اور رسم الخط کا سوال دونوں فرقوں کے لیے عموی سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ ہندوؤں کے لیے،

☆ وہابیت سنی اسلام کا وہ مسلک ہے جسے سعودی عرب میں سرکاری مسلک کی حیثیت حاصل ہے اسے عبدالوہاب نے خاتم کیا تھا جو اٹھارویں صدی میں اسلام کے ظاہری پہلوؤں پر زور دینے والے مصلح تھے۔ بعض لوگ انہیں طہارت پسند یا احیار پرست بھی قرار دیتے ہیں۔ یہ مسلک شیعہ مسلک اور تصوف کے حامیوں کو بطور خاص برداشت نہیں کرتا ہے۔

☆ ناگری یا دیوناگری ابجد گیارہویں صدی میں پیدا ہوئی۔ شروع میں اسے سنسکرت لکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا مگر بعد میں کئی اور زبانوں کا رسم الخط بن گئی۔ لفظ دیوناگری دو سنسکرت لفظوں کا مرکب ہے: ایک دیو، یعنی خدا، برہمن یا کوئی آسمانی طاقت اور دوسری ناگری، بہ معنی شہری۔ اس لفظ کو کبھی، 'شہری رسم الخط' کبھی، شہر کا آسمان/ مقدس رسم الخط، تو کبھی، خداؤں یا پجاریوں کے شہر (کا رسم الخط) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہندی کو عربی اور فارسی اثرات سے پاک کرنا ضروری تھا تو مسلمانوں کے لیے، اردو طاقت اور با اثر ہونے کی علامت تھی۔ ایسے میں عربی رسم الخط کو ایک بالکل غیر ضروری مذہبی اہمیت حاصل ہوگئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک، اردو، حکومت کی زبان کے طور پر فارسی کی جگہ لے چکی تھی۔ شمالی اور مغربی صوبوں کے ادبی حلقوں میں، فارسی اور اردو کے خلاف سرگرمی میں پنڈت پرتاپ نارائن مشرا☆ اور بھارتیندو ہرش چندر☆ جیسے لوگ پیش پیش تھے۔ یہ وہ نامور ادیب تھے جو اب اردو کے بجائے ہندی کے وفادار ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا رسم الخط بھی تبدیل کر لیا تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں اردو داں خواص کو حاصل سرپرستی کے خاتمے کی، خواہش کرتے ہوئے، بھارتیندو ہرش چندر کے ہند یحامی اخبار 'کوی و چن سُدھا' میں، سول سروس میں داخلے کے خواہاں لوگوں کے حوالے سے بار بار یہ لکھا جاتا تھا: 'یہ درست ہے کہ رسم الخط فارسی کی جگہ ہندی ہو جانے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے مگر وہ آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں اور ضروری ہے کہ چند لوگوں کے مفادات زیادہ لوگوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں 55۔ ہندی حامی تحریک کا خاص مرکز بنارس تھا۔ یہاں راجہ شیو پرساد☆ نے، بنیادی طور پر بھارتیندو ہرش چندر کی کوششوں سے، ہندی کو ایک زبان کی حیثیت سے فروغ دینے اور ہندی ادب تخلیق کیے جانے کے لیے بہت کام کیا۔ اس سرگرمی کا ایک بڑا حصہ بنگالی ادب کے ہندی ترجموں پر مشتمل تھا۔ آریہ سماجیوں نے بھی محسوس کیا کہ وہ ہندی اور دیوناگری رسم الخط کو عوام سے رابطے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

ہندی اور دیوناگری رسم الخط کی تحریک ہندو مفادات کے تحفظ اور فروغ کے بارے میں بڑھتی ہوئی بیداری کا شاید صرف ایک نمایاں پہلو تھی۔ گائے کے تحفظ اور مذہبی مواقع پر جلوس نکالنے جیسی تحریکیں زیادہ خصوصیت کے ساتھ ہندوؤں کے مذہبی مفادات سے وابستہ تھیں۔

☆ مشہور ہندی شاعر پرتاپ نارائن مشرا 1856 میں ضلع اناؤ کے بیچ گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سنسکرت، اردو، بنگالی اور انگریزی پر عبور رکھتے تھے۔ وہ ایک ماہانہ رسالے برہمن کے مدیر اور پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ پریم پشپاولی، من کی لہر، کلی کوتک اور بھارت دُردشا ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ ان کی وفات 1894 میں ہوئی۔

☆ بھارتیندو ہرش چندر کو جدید ہندی کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اپنی زبردست صلاحیتوں اور ادبی تحریروں نے ایسا گہرا نقش قائم کیا کہ ان کے زمانے کو بھارتیندو عہد کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ہندی صحافت کی بھی بڑی خدمت کی تھی۔

☆ راجہ رام موہن رائے (1833-1772) نے 1828 میں 'برہمو سماج' قائم کیا جو ایک اصلاحی تحریک تھی، رائے کو 'بابائے جدید ہند' کہا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے، میونسپل سطح پر ان مذہبی مفادات پر زور دیے جانے کے سبب سیاسی جماعتیں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مذہبی جماعتوں کی شکل دینے پر مائل ہونے لگیں۔ اس رجحان نے پہلے سے ہی کشیدہ فرقہ وارانہ رشتوں کو کمزور تر کرایا۔ اس کے سبب اردو داں خواص نے کئی جگہ علاحدگی اختیار کرلی۔ یہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا کیوں کہ اس سے پہلے ہندو اور مسلمان ایک عرصے سے اس سلسلے میں متحد رہے تھے۔

ہندو سماج میں، برطانوی اقتدار کے پیدا کردہ سماجی اثرات کے ردعمل میں کئی اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں، مثلاً کلکتہ میں برہمو سماج (1829) ☆، ممبئی میں پرارتھنا سماج ☆ اور آریہ سماج (1875) ☆۔ ان اصلاحی کوششوں کا رخ راسخ العقیدہ ہندو مذہب کی طرف ہوا تو اس کے خلاف ردعمل بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ برہمو سماج کا جواب فوراً ہی دھرم سبھا ☆ قائم کر کے دیا گیا۔ آریہ سماج کو مقبولیت حاصل ہوئی تو اس کے خلاف بھی راسخ العقیدہ ہندوؤں میں ردعمل پیدا ہوا جس کے نتیجے میں بھارت دھرم مہامنڈل ☆ وجود میں آیا۔ 1910 کی دہائی کے وسط میں سناتنی لوگوں ☆ نے متحدہ صوبہ جات میں ہندو سبھا ☆ قائم کی جو میونسپل سطح پر مسلمانوں کے لیے علاحدہ حلقہ انتخاب قائم کیے جانے کے خلاف ردعمل تھا۔ ہندو سبھا کا سلسلہ دھیرے دھیرے پنجاب اور متحدہ صوبہ جات سے آگے بڑھ کر بہار، بنگال اور وسطی صوبوں اور بمبئی پریزی ڈنسی تک پھیل گیا۔

آخری تجزیے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مسلم رائے عامہ بنگال کی تقسیم کے امکانات سے زیادہ اس کے واقع ہونے کے سبب ہی ہندوؤں کی طرف سے جاری ہونے والی تقسیم مخالف تحریک کے خلاف متحد ہوئی۔ یہ بڑی حد تک دیہی بنگال کے ہندوؤں میں جاری اس تحریک کا نتیجہ تھا جو بنگال کی تقسیم کے پہلے ہی سے اس کی مخالفت کر رہی تھی۔ یہ تحریک بڑی حد تک ہندو مذہبی جذبات پر مبنی تھی۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو بنگال کی تقسیم اور پھر علاحدہ کیے گئے مشرقی

☆ 'پرارتھنا سماج' 1864 میں کیشب چندر سین نے قائم کیا تھا جس کا مقصد خدا پرستی حالت بہتر کرنا اور سماجی اصلاح کو فروغ دینا، عورتوں اور دبے کچلے طبقوں کی حالت بہتر کرنا اور بیواؤں کی دوبارہ شادی پر زور دینا تھا۔

☆ آریہ سماج مہرشی دیانند سرسوتی نے 7 اپریل 1875 کو بمبئی میں قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد ہندو دھرم کو چھوٹے معتقدات سے پاک کرنا و ویدوں کی تعلیمات کی طرف پلٹنا تھا۔ آریہ سماج کا نصب العین 'دنیا کو عظیم بنانا' ہے۔

☆ دھرم سبھا راسخ العقیدہ ہندوؤں کی جماعت تھی جو جنوری 1830 میں کلکتہ میں قائم کی گئی۔ اس کا مقصد روایتی ہندو مذہبی اور سماجی نظام کا تحفظ کرنا تھا۔

☆ بھارت دھرم مہامنڈل 1902 میں سناتن دھرم کی راسخ العقیدہ روایات کو فروغ دینے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

☆ ویدک مذہب کی پابندی کرنے والوں کو سناتنی کہا جاتا ہے۔

☆ ہندو سبھا ایک غیر سیاسی تنظیم کی شکل میں جنوب مشرقی پنجاب میں 1910 میں سماجی تعمیر نو کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔

بنگال کے آسام میں شامل کیے جانے کے ذریعے ایک اور ایسا زہریلا بیج بودیا گیا جس نے آج بھی اس پورے خطے کی فضا کو مسموم کر رکھا ہے۔ آسام میں بے قابو غیر قانونی دراندازی کا سلسلہ، اور پورے خطے میں جاری مسلم انتخابی سیاست اس کے ساختشانے ہیں۔ بنگال کے مسلمان، آسام کے ملحقہ علاقوں اور اس کی زرخیز زمینوں پر ہمیشہ سے (آج بھی) لالچ بھری نگاہیں ڈالتے رہے ہیں۔ یہ علاقے ان کی عددی توسیع کا مرکز بھی رہے ہیں جہاں انہوں نے پہلے زمینوں پر غاصبانہ قبضے کیے، اسے اپنا حق سمجھتے ہوئے اور پھر انہیں ہڑپ لیا۔ 1857 کے بعد صرف آدھی صدی کے عرصے میں، پر جوش سیاسی سرگرمیاں، علاحدہ شناخت، ہندوؤں کی سیاسی برابری کے پرشور دعوے (مسلمانوں کی طرف سے) جیسی تمام علتیں یہاں بھی پیدا ہو چکی تھیں۔ مسلم ہندو سیاسی سرگرمیوں نے از سرنو بیدار ہونے کے بعد پچاس برسوں سے بھی کم عرصے میں، یعنی بیسویں صدی کے آغاز سے اس کے وسط تک، کسی اور کی دی ہوئی اور غیر حقیقی ہندو۔ مسلم سیاسی برابری کی منطق نے ناگزیر طور پر دونوں فرقوں کو الگ کر دیا۔ 'جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے' ایک پامال کہاوت ہے جیسے دوہرانا مناسب نہیں لگتا مگر یہاں اس کی ایک خاص معنویت کی حامل نظر آتی ہے، کیوں کہ علاحدگی کے بیج بوئے جانے کے بعد، علاحدہ حلقہ انتخاب۔ کی صورت میں محدود پیمانے پر شروع ہونے والی بات بڑھتے بڑھتے آخر کار ایک علاحدہ ملک کے مطالبے تک جا پہنچی۔

ہمیں 1905 کے پر از واقعات سال پر ذرا دیر ٹھہرنا چاہیے۔ نیا مسلم بنگال ایک والے صوبے کی حیثیت سے قائم ہو گیا تو ممتاز مسلمانوں کو اس میں بہت سے فائدے نظر آنے لگے، جس سے کئی اور مفادات نے جنم لیا، یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کی ہر تقسیم مخالف تحریک، مسلمانوں کو اس چیز میں ایک بیجا دخل اندازی محسوس ہونے لگی جواب ان کی 'اپنی' ہو چکی تھی، ان کا جائز حق، ان کا اپنا مسلم صوبہ۔ اس مسلم اکثریتی صوبے کے مسلمان جب حکومت کی عنایات کے نامانوس کی دھوپ سینک رہے تھے تو دوسری طرف اگست 1906 میں منٹو کا 'فلر کے استعفے 56 کو منظور کرنا اور سراج گنج 57 میں اسکول کے احتجاجیوں کے خلاف کاروائی سے حکومت ہند کا انکار ایسے معمولی واقعات تھے جسے ہندو احتجاجی اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ اس کی وجہ ہے مشرقی بنگال کے مسلمان سیاسی طور پر شمالی ہند کے اپنے ہم مذہبوں کے نزدیک تر آگئے۔ یہ ایک اور پھر بالکل غیر متوقع واقعہ تھا۔

لیکن ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیوں کہ نئے مشرقی بنگال میں حالات اب بدتر ہو رہے تھے جیسا کہ لوویٹ نے ہسٹری آف دی انڈین نیشنل موومنٹ 58 میں کہا ہے: چوں کہ خالص جذباتی اپیلیں لوگوں کی مطلوبہ ہمدردیاں حاصل کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں، اس لئے تقسیم مخالف تحریک کے (ہندو) لیڈروں نے، ایک قومی ہیرو کی تلاش میں، بمبئی سے شیواجی کی روایت درآمد کرنے کی کوشش کی اور عوام کے مذہبی جذبات کو متحرک کرنے کے لئے موت اور تباہی کی دیوی کالی کی سرپرستی حاصل کی، 59 جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں، تقسیم کے مختلف پانسے پھینکے جا چکے تھے اور وہ کسی کے روکے نہیں رک رہے تھے۔

تقریباً نا گزیر طور پر، کانگریس نے اپنے آپ اس احتجاج سے جوڑ لیا، دوسری طرف مسلمانوں نے جوان واقعات کے سبب بہت پر جوش ہو چکے تھے، اپنے رہنماؤں یہ محسوس کرنے پر آمادہ کیا کہ وقت اقوامی سرگرمیوں کا تقاضہ کر رہا ہے اور ایسا کرنا اپنے تحفظ کے لئے لازمی ہے۔ انھی تمام احتجاجی سرگرمیوں کے نتیجے میں 1906 میں لارڈ منٹو سے ملاقات کیلئے مشہور شملہ وفد تشکیل دیا گیا۔ مگر اس کے بارے میں بھی ذرا تفصیل سے باتیں ذرا آگے چل کر۔

شناخت کی سیاست

تبدیلیوں اور کایا پلٹ کے اس زمانے میں، مسلم سیاست میں ایک اہم واقعہ اس میں ایک نوجوان عنصر کے داخل ہونے کی صورت پیش آیا۔ یہ بیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے۔ یہ نوجوان عنصر بیشتر وکیلوں اور پیشہ ور ماہرین پر مشتمل تھا۔ ان میں بہت سے لوگ زمین دار گھرانوں کے تھے جو تعلیم اور ذہنی بیداری سے بہرہ ور ہونے کے بعد سیاسی طور پر پُر گو ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے موجودہ قدامت پسند قیادت کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ ان نوجوانوں کا تعلق زیادہ تر متحدہ صوبہ جات سے تھا جن میں محمد علی 60، ان کے بھائی شوکت علی اور حکیم اجمل خاں 61 نمایاں طور پر شامل تھے۔ نواب صاحب، ڈھاکہ جیسے لوگوں کو ان نوجوان عناصر کی شدید احتجاجی آوازوں سے خطرہ محسوس ہوا، خاص طور پر اس وقت جب محسن الملک نے اردو کے معاملے میں حکومت کے آگے گھٹنے ٹیک دئے تھے۔ 62۔ شاید خطرے کا یہی احساس تھا جس کے پیش نظر وقار الملک 63 نے 1901 اور 1903 کے درمیان، متحدہ صوبہ جات میں قدامت پسند قیادت کے تحت ایک مسلم سیاسی جماعت قائم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن مسلمانوں کی الگ الگ کی جانے والی یہ تمام کوششیں یکجائی کا تقاضا کر رہی تھیں، ایک نصب العین کے تحت ایک منزل کی طرف سفر کے لئے۔

انگریزوں نے مورلے اور منٹو 64 کے توسط سے یہی کیا، جو ہندوستان میں اپنی حکومت با آسانی چلانے کے لئے ہندوستانی رائے عامہ کو متاثر کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ، 1857 کی پر ن کن بازگشتیں اب بھی شاہی اقتدار کے گلیاروں میں رہی تھیں، شاہی مشیر یہ خوف زدہ صلاحیں دے رہے تھے کہ 'ہندو اور مسلمان متحد ہو گئے تو ہم سنگین مشکلوں سے دوچار ہو جائیں گے'۔ 1880 کی دہائی کے وسط میں قوم پرست تحریک کے ابھار سے ان اندیشوں کو اور ہوا ملی۔ اس تحریک میں ہندو تعلیم یافتہ طبقہ، زیادہ ترقی یافتہ ہونے کے سبب، فطری طور پر پیش پیش تھا۔ آئی این سی کا پہلا اجلاس 1885 میں بمبئی میں ہوا۔ اس میں صرف دو مسلمانوں نے شرکت کی۔ دوسرا اجلاس اگلے سال کلکتہ میں ہوا جس میں مسلمانوں کی تعداد 33 ہو گئی۔ 1890 میں ہونے والے چھٹے اجلاس میں مسلم مندوبین کی تعداد 702 میں سے 156 یعنی 22 فی صد تھی۔ اس تحریک میں مسلمانوں کی شرکت بڑھنے سے برطانوی حکومت بے چین ہو گئی لہٰذا مسلمانوں کو وفاداروں کی صفوں میں واپس لانا اس وقت انگریزوں کی تسلیم شدہ سرکاری حکمت عملی کی بنیاد بن گئی۔

وزیر خارجہ برائے ہند نے 11 مئی 1906 کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ مورلے کے نام ایک مکتوب

میں، پرنس آف ویلز کے دورۂ ہند کے دوران، ان کے ساتھ اپنی بات چیت کے حوالے سے لکھا تھا: 'انہوں (وزیر اعظم) نے نیشنل کانگرس کے تیزی سے ایک بڑی طاقت بنتے جانے کا ذکر کیا... وہ (کانگرس) تو اب ہے، ہم چاہیں یا نہ چاہیں'۔ لیکن اس بیان کا ایک روپوشی پہلو بھی تھا۔ ایک 'وفادار' اخبار الحق کے مدیر سید محمد فاروقی پرنس آف ویلز کے دورۂ ہند کے دوران ایک مقامی پریس نمائندے کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہے تھے، ذوقی نے مسلم رہنماؤں، بطور خاص سید حسین بلگرامی (عماد الملک) 65 کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، جناح کے نام ایک مکتوب میں، جو بہت بعد یعنی 1943 میں لکھا گیا تھا۔ ذوقی نے ان واقعات اور ملاقاتوں کی یادیں تازہ کی تھیں جو مسلم پارٹی کے قیام اور شملہ وجہ کی تشکیل کا سبب بنی تھیں۔ یہ مکتوب ضمیمے میں دیا گیا ہے، مگر اس کے مصدقہ ہونے کی ذمے داری نہیں لی جا سکتی۔

ذوقی کے اس بیان سے قطع نظر، محسن الملک نے جو اس وقت علی گڑھ کے سکریٹری تھے، 4 اگست 1906 کو کالج کے پرنسپل کو آرچی بولڈ کے بارے میں لکھا جو شملہ آنے والے تھے: 'آپ نے ہندستانی بجٹ کے بارے میں جناب جان مورلے کی تقریر ضرور پڑھی ہوگی اور اس پر غور بھی کیا ہوگا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اس کے بڑے چرچے ہیں اور عام خیال ہے کہ یہ نیشنل کانگرس کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان پہلے ہی کچھ کچھ مایوسی کے شکار ہیں۔ اور لگتا ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان کانگرس سے ہمدردی رکھتے ہیں اور یہ تقریر ان میں کانگرس میں شامل ہونے کے لئے اور بھی آمادگی پیدا کرے گی۔ مجھے کئی مکتوبات موصول ہوئے ہیں جن میں بطور خاص قانون ساز کونسلوں کے منتخب نمائندوں سے متعلق نئی تجاویز کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے ان میں کہا گیا ہے کہ موجودہ ضابطے مسلمانوں کو کوئی اختیار نہیں دیتے؟ انتخابات کے ذریعے کوئی بھی مسلمان کونسلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر نئے ضابطوں کے تحت، جو وضع کئے جانے والے ہیں، 'انتخابات' کو زیادہ بڑے پیمانے پر متعارف کرایا گیا تو مسلمانوں کو مشکل سے ہی کوئی سیٹ مل پائے گی اور کوئی بھی مسلمان انتخابات کے ذریعے کونسلوں میں داخل نہ ہو سکے گا' 66

منٹو نے محسن الملک کے خط کا مکتوب 8 اگست 1906 کو دیکھا اور دے مورلے کو ارسال کر دیا۔ 10 اگست کو، وائسرائے کے سکریٹری آرچی بولڈ نے محسن الملک کو مطلع کیا کہ منٹو ایک 'مسلم وفد' سے ملاقات کر کے ان کی شکایات سنیں گے، یکم اکتوبر 1906 کو، منٹو نے 35 مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات کی جس میں این ڈبلیو ایف پی کو چھوڑ کر باقی تمام صوبوں کے نمائندے شامل تھے۔ اس موقعہ پر وائسرائے کو ایک محضر پیش کیا گیا جس میں مطالبہ شامل تھا کہ 'اس وسیع تر نمائندگی کے نظام میں جسے ہندوستان میں رائج کرنے پر غور کیا جا رہا ہے 67 مسلمانوں کو 'مناسب حصہ' دیا جائے مگر اس مناسب حصہ کا تعین ہندوستان میں مسلمانوں کی عددی طاقت ہی نہیں بلکہ ان کی سیاسی اہمیت، اور ان خدمات کی بنیاد پر بھی کیا جائے جو وہ حکومت کے دفاع کے سلسلے میں انجام دیتے ہیں' 68۔ یہ رائے دیتے ہوئے کہ 'یورپی طرز' کے 'نمائندہ ادارے' ہندوستان کے لوگوں کے لئے اجنبی ہیں، اس محضر میں مزید کہا گیا کہ 'مسلمانوں کو اب تک قانون ساز کونسلوں میں جو نمائندگی دی گئی وہ ناکافی اور ان لوگوں کی منظوری کے بغیر تھی جن کی نمائندگی کے لئے ان نامزد اراکین کو منتخب کیا گیا تھا'۔

مزید یہ کہ ان انتخابی اکائیوں کے ذریعے، جو اب تشکیل دی جارہی ہیں، کسی مسلمان کا منتخب ہو پانا قرین قیاس نہیں ہے جب تک اسے 'اکثریت کی ہمدردی' حاصل نہ ہو۔ یہاں اکثریت سے مراد لازمی طور پر ہندو تھا۔ ایسی صورت 'وہ مسلمانوں کا سچا نمائندہ نہیں ہوگا، کیوں کہ وہ 'ایک الگ شناخت والے لوگ ہیں جن کے مفادات کچھ اور ہیں۔۔۔ جن میں دیگر فرقوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔۔۔ اور جواب تک نقصان میں رہے ہیں کیوں کہ انہیں مناسب نمائندگی حاصل نہیں ہوسکی'۔ اس محضر نے تجویز پیش کی کہ 'میونسپل اور ضلع بورڈوں میں، مسلمانوں کے ایک مقررہ حصے کو علاحدہ حلقہ انتخاب کے تحت منتخب کیا جائے۔۔۔، صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کے حصے کا تعین مسلم فرقے کی سیاسی اہمیت کے لحاظ سے کیا جائے اور اس کا انتخاب صرف مسلمانوں پر مشتمل الکٹورل کالج کے ذریعے کیا جائے، اور امپریل (وائسرائے کی) قانون ساز اسمبلی میں بھی اسی نوع کا انتظام کیا جائے جہاں نامزدگی کے ذریعے تقرر پر انتخاب کے ذریعے تقرر کو ترجیح دی جائے۔69

منٹو کا رویہ خاصا حوصلہ افزا تھا۔ انہوں نے 'ہندوستان کے روشن خیال مسلم فرقے کے خیالات اور امنگوں و آرزوؤں کا اظہار کرنے والے وفد کی نمائندہ کردار، کا خیر مقدم کیا70، اور اعلام کیا' کہ نمائندگی کے کسی بھی نظام میں، خواہ میونسپلٹی سے متعلق ہو یا ضلع بورڈ یا قانون ساز کونسل سے متعلق، جس میں ایک انتخابی تنظیم کو متعارف کرانے یا اس کی توسیع کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے، مسلم فرقے کو بحیثیت فرقہ نمائندگی ملنی چاہئے۔۔۔ میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں؛ برائے مہربانی مجھے غلط نہ سمجھئے اگر میں ابھی یہ نہ بتا سکوں کہ مختلف فرقوں کو کس طریقے سے نمائندگی دی جائے گی، مگر مجھے پورا یقین ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی ہوگا، کہ ہندوستان میں ایسی ہر انتخابی نمائندگی کے لئے شرانگیزانہ ناکامی کا منہ دیکھنا لکھا ہے جس کے تحت اس براعظم کی آبادی کو تشکیل دینے والے تمام فرقوں کے عقائد اور روایات کا خیال کئے بغیر محض ذاتی حق رائے دہندگی کا نظام قائم کیا جائے'71۔

یہ ایک اہم قدم ہے، جسے منٹو کی تائید اور حوصلہ افزائی حاصل ہوئی، اور جس نے دیگر کئی عوامل کے ساتھ، 'علاحدگی' کو ذہنیت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس پر ہم آئندہ ابواب میں بات کریں گے۔ ذاتی حق رائے دہندگی کا اس طرح مسترد کیا جانا اور مذہب پر مبنی ریزرویشن کے طریقے کو حاصل ہونے والی قبولیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی شخصیت آخر کار اس علاحدگی کی جانب رواں دواں ہوگئی جس کے لئے جذباتی زمین اس وقت سے تیار ہو رہی تھی جب سرسید احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ کوئی بھی راہ و رسم رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔72۔ مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے: کیا انگریزوں نے پہلے سے موجود ایک چیز کو محض تسلیم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا؟ یا کیا علاحدگی پسندی کے رجحانات کو اکسانے، پیدا کرنے یا ہوا دینے والے خود وہی تھے؟ جیسا کہ کئی تاریخ دانوں کا کہنا ہے۔ پھر یہ بھی کہ کیا یہ شملہ وفد، مولانا محمد علی73 کے لفظوں میں، ایک 'حکم کی تعمیل' تھا؟ یا یہ علاحدگی کا ایک سبب ہونے سے کہیں زیادہ اس وقت کے حالات کا نتیجہ تھا؟ اس کے بارے میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن یہاں ایک اس سے زیادہ پر [illegible]ان کن سوال بھی ہمیں درپیش ہے۔ انتخابات، جو جمہوری نمائندگی کی طرف پہلا قدم ہوتے ہیں، کا کام عوامی نمائندوں کو مشترکہ طور پر منتخب

کر کے اتحاد پیدا کرنا ہے یعنی تمام بالغ رائے دہندوں کو ووٹ کے ذریعے ایک پلیٹ فارم اور ایک آواز فراہم کرنا، لیکن کیسا ہوگا اگر جمہوری انتخاب کا یہ عمل ہی باعث تقسیم بن جائے، جیسا کہ اس معاملے میں ہوا؟

جناح اس وقت کانگریس کے فیروز شاہ مہتا حلقہ (کانگریس کا اعتدال پسند حلقہ جس میں منجملہ دادا بھائی نوروجی، گوپال کرشن گھوکھلے شامل تھے اور ان کا گروپ تلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے پر مشتمل تھا) میں تھے اور اس کے ساتھ ہی دادا بھائی نوروجی کے سکریٹری کی خدمات بھی انجام دے رہے تھے۔ دادا بھائی نوروجی اس وقت کانگریس کے کلکتہ اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ جناح شملہ وفد سے ذرا بھی خوش نہیں ہوئے۔ بمبئی کے ایک اخبار گجراتی نے اس وفد اور اس کی جانب سے وائسرائے کو پیش کردہ محضر کے بارے میں جناح کا ایک مراسلہ شائع کیا۔ یہ مراسلہ پہلے دی ٹائمز آف انڈیا کو بھیجا گیا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کالموں میں جگہ نہیں پاسکا۔ اس میں، وفد کے اراکین کی حیثیت پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے کہا گیا تھا:

جناب! اخباروں بشمول آپ کے اخبار میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد یکم اکتوبر کو وائسرائے سے ملاقات کرنے جارہا ہے کیا میں جان سکتا ہوں کہ ان حضرات کا انتخاب کس نے کیا جو بمبئی کی نمائندگی کرنے والے ہیں؟ افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ ہمیشہ اپنے آپ کو نمائندہ فرض کر لیتے ہیں جب اس کے لئے کسی بنیاد کا کوئی شائبہ تک موجود نہیں ہوتا۔ مجھے مسلم فرقے کے کسی ایسے اجلاس کی کوء اطلاع نہیں جس نے ان لائق وفائق حضرات کو بمبئی کی نمائندگی کے لئے مقرر کیا ہو۔ اب ایک اور بات: کیا میں جان سکتا ہوں کہ اس وفد کا مقصد کیا ہے؟ اب تک کوئی نہیں جانتا کہ یہ وفد کرنے کیا جارہا ہے۔ کیا لاکھوں لوگوں کی جانب سے بولنے کا یہی طریقہ ہے کہ انہیں بتایا تک نہ جائے کہ ان کے لئے کیا کیا جانے والا ہے۔ یہاں یہ کہنا تو فضول ہی ہے کہ اس معاملے میں اس بشر کے مسلمانوں کے حقیقی خیالات معلوم کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔

لیڈی منٹو کی ڈائیری میں 3 اکتوبر 1909 کے اندراج سے ہنر ہائینس آغا خان کی سرگرمیوں کی نوعیت پر بڑی دلچسپی روشنی پڑتی ہے۔ نواب محسن الملک کی موت کی وفات کے ذکر کے بعد یہ اندراج نظر آتا ہے: 'یہی شخص ہے جس نے خالیہ مسلم وفد کی طرح ڈالی تھی' اس کے علاوہ یکم اکتوبر 1906 کا یہ اندراج 'ایک بہت پر از واقعات دن، ہندوستانی تاریخ کا ایک عہد' خاصا آنکھیں کھولنے والا ہے۔ اس شام لیڈی منٹو کو کس افسر (نام ظاہر نہی کیا گیا) کا خط موصول ہوا جس کے مطابق: 'مجھے پر لازم ہے کہ عزت مآب محترمہ کی خدمت میں یہ سطر ارسال کردہ کہ آج ایک بڑا واقعہ پیش آیا ہے، ایک مدبرانہ اقدام جو کئی برس تک ہندوستان اور ہندوستانی تاریخ پر اپنا سایہ ڈالتا رہے گا۔ یہ 62 ملین لوگوں کو باغیانہ مخالفت کی صفوں میں شامل ہونے سے باز رکھنے سے کم رہم بات نہیں ہے۔' فرقہ وارانہ حلقہ انتخاب کا یہ اپنے مطلوبہ مقصد میں اس قدر کامیاب رہا کہ اس کے ایک رہائی بعد آنے والے وزیر خارجہ برائے ہند مانٹیگو اور وائسرائے لارڈ چمیس فورڈ نے اس سلسلے

میں یہ خیال ظاہر کیا: 'عقیدوں اور طبقوں کی بنیاد پر کی جانے والی تقسیم کا مطلب ایک دوسرے کے مخالف سیاسی خیموں کا وجود میں آنا، جو لوگوں کو شہریوں کی طرح نہیں حریفوں کی طرح سوچنے پر آمادہ کرتی ہے... لہٰذا ہم فرقہ وارانہ حلقۂ انتخاب کو خود حکومتی کے اصول کے فروغ میں ایک بڑی رکاوٹ مانتے ہیں۔' مونٹ فورڈ اصلاحات کے مصنفین اس کے بعد کہتے ہیں: 'یہ اصول اتنی اچھی طرح کام کرتا ہے کہ ایک بار اس کے پوری طرح جڑ پکڑ لینے کے بعد، فرقہ پرستی اتنی راسخ ہو جاتی ہے کہ کوئی چاہے بھی تو اسے بمشکل ہی چھوڑ سکتا ہے اس طرح فرقہ وارانہ رائے دہندگی کے نظام نے مونٹ فور، اصلاحات کے ذریعے جڑ پکڑی۔ ریمز لے میک نالڈ کی سربراہی والی لیبر حکومت کے وزیر خارجہ برائے ہند کارڈ اور لیویر نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے: 'ہندوستانی معاملات سے گہری واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص اس بات سے انکار کرنے کو تیار نہیں ہوگا کہ مجموعی اعتبار سے ہندوستان کے برطانوی حکام میں مسلم فرقے فرقے کی طرف بہت زیادہ جھکاؤ پایا جاتا ہے، کچھ تو گہری ہمدردی کی بنا پر مگر اس سے کہیں زیادہ ہندو قوم پرستی پر روک لگانے کی غرض سے'75۔

تو پھر ان زبردست اہمیت کے حامل واقعات کے ایک صدی بعد ان کے بارے میں با اختیار طور پر کوئی رائے کس طرح دی جائے؟ بعض پہلو تو واضح ہیں، تمام انگریز حکام میں سے اس وقت لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر بارکورٹ بٹلر ہی ایک ایسے تھے جنہوں نے لکھنؤ میں مسلمانوں کے اجتماع کے پورے تصور پر نقطہ چینی کی، اور پھر وائسرائے کو ایک مکتوب ارسال کیا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان کے مشورے پر عمل نا کیا جائے بٹلر نے علاحدہ حلقہ انتخاب اور سول سرویز میں مسلمانوں کے لئے ایک خاص حصہ مقرر کرنے کے خیال کی سخت مخالفت کی انہوں نے اپنے خیالات کو پورے غیر مبہم انداز سے ریکارڈ کیا ہے: 'فلر کی سبکدوشی کے بعد سے آج تک یہ سارا کا سارا سلسلہ محسن الملک اور بلگرام کے عماد الملک نے عجلت میں انجام دیا ہے'76۔

ڈنلپ اسمتھ (وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری) کے محسن الملک کے نام مکتوب میں بھی، جس میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ شملہ محضر کس طرح تحریر کیا جائے، یہ اشارہ تھا کہ 'مسلمانوں کو اپنی نمائندگی 'انتخاب' کے بجائے 'نامزدگی' کے ذریعے حاصل کرنی چاہئے'۔ شملہ وفد کے اراکین کو یقین دلایا گیا تھا کہ انگریز ان کی بات ہمدردی سے سنیں گے اور یہ بھی کہ ان کی کامیابی کے امکانات خاصے روشن ہیں، کیوں کہ آخر منٹو مورلے کے نام 8 اگست 1906 کے مکتوب میں کہہ ہی چکے تھے کہ 'ضروری ہے کہ ان لوگوں کے سوا جنہیں کانگریس نے بڑی پیمانے پر نمائندگی دی ہے دیگر مفادات کی اہمیت پر بھی پوری توجہ دی جائے'77۔ سر ڈینزل ایبٹ سن نے، جو اس وقت پنجاب کے لفٹنٹ گورنر تھے، 15 اگست 1906 کو ڈنلپ اسمتھ کے نام مکتوب میں کہا تھا: 'میں نے بعض دیگر حلقوں سے بھی وہی سنا ہے جو محسن الملک مسلمانوں کی نئی نسل کی آرزوؤں کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ ان کی آرزوئیں بالکل فطری ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے ان لوگوں کو کھینچ کر کانگریس پارٹی کے آغوش میں ڈال دیا تو یہ بہت تباہ کن ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت تعلیم یافتہ مسلمان ہندوستان کا سب سے قدامت پرست عنصر ہے' 78۔ شملہ وفد کے بیشتر اراکین بھی مسلم معاشرے کے قدامت پرست عناصر تھے جنہوں نے اپنے آپ کو اس منصب پر خود

ساختہ طور پر فائز کر رکھا تھا۔ نوجوان مسلمانوں کو اس وفد میں عملاً کوئی نمائندگی نہیں دی گئی تھی۔

انگریز حکام منٹو کو یقین دلاتے رہے کہ شملہ وفد 'واقعی مسلمانوں کا نمائندہ' تھا اور یہ انتباہ بھی دیتے رہے کہ مسلمانوں میں ذرا بھی بے چینی پیدا ہوئی تو یہ برطانوی راج کے استحکام کے لیے ایک بڑا خطرہ ہوگی (1857 کی پرچھائیاں) صرف ایک ہارکوٹ بٹلر تھے جو احتیاط برتنے کی بات کرتے رہے کہ وہ جانتے تھے کہ 'مسلم سیاسی تنظیم کے بیج تو ایک کل ہند درخت بننے کے لیے انگریزوں کی عنایتوں کی دھوپ درکار ہے'79۔ وائسرائے کی سرپرستی یہی چیز تھی۔ بٹلر نے 16 ستمبر 1906 کو حکومت ہند کے لا ممبر کے نام ایک مکتوب لکھا کہ 'ہندو مخالف جذبات شاید وہ واحد قدر مشترک 80 ہے جس کی بنیاد پر مسلمانوں نے لکھنؤ میں جمع ہو کر شملہ محضر تحریر کیا۔ تو پھر کیا یہ وفد انگریزوں کی سیاسی ضرورت (مسلمانوں کی ناز برداری کرتے انہیں کانگریس سے دور رکھنا) اور بنیادی طور پر یوپی کے مسلم مفادات کے درمیان باہمی فائدے کے سودے کا نتیجہ تھا۔ اس سارے معاملے کی تہہ میں یہ قیاس بھی کارفرما تھا کہ 'ہندوستان میں برطانوی اقتدار باقی رہنے والا ہے'، لہٰذا انہیں ہی آخری حکم رہنا چاہئے اور رہیں گے بھی۔ انڈین کونسل ایکٹ، 1909 کی منظوری انہی تمام باتوں کا نتیجہ تھی۔ اس کے ذریعے 'حکومت ہند نے قدامت پرست مسلمانوں کی مدد کی پکار کو خطرے کے سائرن میں تبدیلی کر دیا۔'81

یہاں میری، کاؤنٹیس آف منٹو، کی ڈائری کا ایک ایک دلچسپ اقتباس، جو علاحدہ حلقہ انتخاب کے بارے میں ہے، ملاحظہ فرمایئے:

جب جناب گاندھی لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے تو مہاراجہ بیکانیر نے (مرحوم مہاراجہ سر گنگا سنگھ جی) انہیں ایک پارٹی کے دوران مجھ سے متعارف کرانے کے لئے میرے پاس لے کر آئے۔

میں نے (میری) پوچھا 'آپ کو میرا نام یاد ہے؟' 'آپ کا نام یاد ہے!' جناب گاندھی نے زور دے کر کہا 'منٹو-مورلے اصلاحات نے ہماری ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ علاحدہ حلقہ انتخاب کا سلسلہ نہ ہوتا تو ہم اب تک اپنے اختلافات طے کر چکے ہوتے۔'

'آپ بھول رہے ہیں، جناب گاندھی، 'میں نے جواب دیا، 'کہ علاحدہ حلقہ انتخاب کی تجویز آپ کے قائد اور پیش رو جناب گوکھلے نے پیش کی تھی۔'

'اوہ'، جناب گاندھی نے مسکراتے ہوئے کہا، 'گوکھلے ایک اچھے آدمی تھے، مگر اچھے لوگ بھی غلطیاں کر سکتے ہیں'۔

'ٹھیک'، پنجاب کے ایک زمین دار نے جو ہندوستانی کونسل کے رکن تھے، اور پاس ہی کھڑے تھے، کہا، 'اور اگر لارڈ منٹو نے علاحدہ حلقہ انتخاب پر اسرار نہ کیا ہوتا تو ہم مسلمانوں کا وجود ہی باقی نہ رہتا۔'

اس بات پر کہ مسلمانوں کے لئے علاحدہ نمائندگی کا اصول فرقہ وارانہ اختلافات پیدا نہ بھی کرے تو انہیں بدتر ضرور کردے گا، سرکاری طور پر ہمیشہ یہ جواب دیا گیا کہ 'یہ اختلافات پہلے سے موجود ہیں'۔ لاہور کی ہندو سبھا کی جانب سے علاحدہ حلقہ انتخاب کے خلاف پیش کئے گئے ایک محضر کے جواب میں ڈنلپ اسمتھ نے نے مشورہ دیا کہ وائسرائے کو ہندو سبھا کو مطلع کرنا چاہئے کہ 'ملک میں ایک دن بھی برسر اقتدار رہنے کی اہل کسی بھی حکومت کے لئے یہاں موجود مذاہب کے اختلافات کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے' 82، اور یہ بھی کہ اس دعوے کا کہ 'ہندوؤں اور مسلمانوں اور دیگر فرقوں کے سیاسی مفادات یکساں ہیں، جواب یہ ہے کہ 'مسلمان اور دیگر لوگ ایسا نہیں سوچتے 83۔

علاحدہ مسلم حلقہ انتخاب کے بارے میں منٹو (اور ان کے افسروں) کا موقف بڑی حد تک، یہ امتیاز قائم کئے جانے کی خود مسلمانوں کی خواہش کا مرہون منت تھا۔ اس کے علاوہ، منٹو کو مسلمانوں کی بے چینی سے ڈر لگتا تھا (پھر وہی 1857)۔ انہوں نے ہارکورٹ بٹلر کے اس خیالات سے مورلے کو بھی مطلع کر دیا کہ 'بہت سے مسلمان دل سے ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف ہیں، اور یہ کہ مسلم زمیں دار طبقہ اور مسلم وکیل اور پیشہ ور طبقے دور ہوتے جا رہے ہیں' 84؛ اور یہ کہ باہم متصادم خیالات کے الجھاوے سے دھیرے دھیرے ہندوستانی سیاست دو مستقل فریق برآمد یا از سر نو برآمد ہو رہے ہیں بعض حکومت کا فریق اور اس کا مخالف فریق' 85 اس سے پہلے منٹو، مورلے کو بتا چکے تھے کہ 'اگرچہ مسلمان خاموش ہے مگر وہ بہت طاقت ور ہے'۔ تاہم، علاحدہ حلقہ انتخاب کے سلسلے میں مورلے کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد مسلمانوں نے کونسلوں میں اپنے تناسب سے کہیں زیادہ نشستوں کا مطالبہ شروع کر دیا، اس تعداد سے کہیں زیادہ جسے منٹو نے مناسب جانا تھا۔ انہوں نے اس تجویز کی مخالفت بھی شروع کر دی کہ مسلمانوں کے ووٹ عام حلقوں میں ہونے چاہئیں۔ اس پر منٹو اور مورلے نے فوراً انہیں ان کی حیثیت یاد دلائی، یہ بھی کہ ایک وہی نہیں ہیں جو برطانوی مفادات کے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتے ہوں جیسا کہ قدامت پرست مسلمان سمجھتے تھے، اور یہ کہ سر ڈینس لاٹ ہیئر کچھ بھی کہیں، ہندو، ہندوستان سب سے منظم عناصر ہیں۔ 86۔ مورلے نے اس معاملے کو ان گہرے مفہوم والے لفظوں میں اور کیا کہ انگریزوں کو دھیان رکھنا ہوگا کہ اپنے مسلم پارسل اٹھانے میں وہ اپنے ہندو پارسل کو گرا نہ دیں' 87۔

پس نگاہی اور وضاحت خیال اب ہمیں بتاتی ہے کہ ملک کے سیاسی اقتدار میں مناسب حصے کو یقینی بنانے کے لئے انتخابی علاحدگی کے مطالبات کی بھوک بڑھتی ہی جاتی تھی، اور اس ناہمواری کو ٹھیک کرنے کا کوئی حتمی انتظام نہ ہونے کی صورت میں اور زیادہ نابرابری پیدا ہوتی تھی۔ اس بارے میں تمام حجت کرنے والی رائے مورلے نے یکم دسمبر 1908 کو ہاؤس آف لارڈس میں اپنے اس معروف اعلان میں ظاہر کی: 'اگر میں ہندوستان میں ایک پارلیمانی نظام قائم کرنے کے لئے کوشاں تھا یا اگر یہ کہا جائے کہ اصلاحات کے اس سلسلے نے ہندوستان میں راست انداز سے یا لازمی طور پر پارلیمانی نظام کے قیام کی راہ ہموار کی، تو میرا اس سے کوئی لینا دینا نہیں'۔ اس کے بعد یہ بات پوری طرح عیاں ہو جانی چاہئے تھی کہ برطانوی راج کی اصل نیت کیا ہے۔ لیکن اسی کے باوجود اس زمانے کو لوح حافظہ ایک اور قدم کا نقش ثبت ہو گیا۔ تقدیر ہمیں

سیاسی علاحدگی کی راہ پر کھینچے لئے جا رہی تھی اور ہم اس راہ پر بے سوچے سمجھے اس راہ پر بڑھتے چلے گئے، ان خبردار کرنے والے پیغامات پر نظر ڈالے بغیر جواب وقت کی دیوار پر چمکنے لگے تھے۔ یہی حالات تھے جب مسلمانوں نے، جو اب ایک علاحدہ سیاسی فرقہ ہونے کی شناخت حاصل کر چکے تھے، اپنے آپ کو سیاسی طور منظم کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان بھر کے خود ساختہ 'مسلم رہنما' شملہ وفد کے سلسلے میں جمع ہوئے۔ اب یہ بات ناگزیر معلوم ہو رہی تھی کہ اس شملہ وفد کے عمل ـ ـ ـ ـ سے ایک باضابطہ مسلم سیاسی تنظیم برآمد ہوگی۔ 30 دسمبر 1906 کو، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اراکین ڈھاکہ میں جمع ہوئے اور اپنے آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ (اے آئی ایم ایل) کی شکل دے دی۔ اگر چہ لیگ کی عبوری کمیٹی میں شملہ وفد کے بیشتر اراکین کو نمائندگی حاصل تھی مگر اس جماعت کی بنیادیں ابھی پوری طرح قائم نہیں ہو سکی تھیں۔ ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ جو شملہ وفد میں شامل نہیں تھے اب اس عمل کے محرک تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک مسلم آل انڈیا کنفیڈریسی کی اسکیم پیش کی تھی۔ اسے آنے والے واقعات کی تمہید ہی کہا جائے گا کہ متحدہ صوبہ جات کے مسلمان اس وقت بھی بنگال کے مسلمانوں کی برتری قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ یو پی کے نوجوان وکیلوں کا یہ حلقہ، جسے ڈھاکہ میں خاصہ نمائندگی دی گئی تھی، مزاجاً بہت بے صبر اور مضطرب تھا۔ اور اس نے اپنی موجودگی کا اعلان کیا۔ پچپن رکنی عبوری کمیٹی کے پچیس اراکین نے زمین داروں اور حکومت کے وظیفہ خواروں کے وفادارانہ موقف کی حمایت سے انکار کر دیا۔ اس جھگڑے کو نمٹانے کے لئے ایک غیر جانب دارانہ قرارداد منظور کی گئی۔ اس مرحلے پر، ان مسلم سیاسی مفادات کی نوعیت واضح کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جنہیں تحفظ یا فروغ درکار تھا۔ یہ واضح طور پر اس قسم کے اقدام کا وقت نہیں تھا۔ لیگ اس موڑ پر آخر کار محض ایک وفادار تنظیم تھی۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، مسلم لیگ پیدائش کے بعد کئی دہائیوں تک ایک لاغر بچے کی طرح رہی۔ مالی لحاظ سے یہ مسلم نوابوں اور راجاؤں کے رحم و کرم پر تھی۔ 1909 میں الیکٹورل کالج کی اسکیم کے خلاف احتجاج کے دوران حکومت سے علاحدہ حلقہ انتخاب کے نظام پر مضبوطی سے قائم رہنے کا مطالبہ کرنے کے لئے بہت سے ٹیلی گرام مسلم لیگ سے زیادہ مقامی انجمنوں کی طرف سے بھیجے گئے۔ 1910 میں، مورلے۔ منٹو اصلاحات کے تحت ہونے والے اولین انتخابات کے دوران، مسلم لیگ ایک تنظیم کی حیثیت سے سامنے نہیں آسکی۔ اس نے اپنے آپ نئے مسلم رائے دہندگان کے درمیان سیاسی جماعت کے طور پر پیش نہیں کیا اس کے پاس کوئی نظر آنے والا سیاسی پلیٹ فارم بھی نہیں تھا۔

اس کے وہ لوگ جو توسیع شدہ قانون ساز کونسلوں کے لئے منتخب ہوئے انہوں نے ان تمام کمزوریوں کے باوجود، یہ انتخابی کامیابی، مسلم لیگ کے رکن کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی مقامی اور ذاتی حیثیت کی وجہ سے حاصل کی تھی۔ لیگ کی سیاسی تنگ دامنی کا سب سے ڈرامائی اظہار اس بات سے ہوا کہ وہ 1911 میں، انگریزوں کے اس فیصلے کے خلاف کوئی موثر احتجاج نہ کر سکی جسے مسلم مفادات پر ایک بڑا وار سمجھا گیا۔ یہ فیصلہ تھا بنگال کی تقسیم کو ختم کیا جانا۔ درحقیقت مسلم لیگ کو سیاسی تنظیم کی حیثیت سے اتنی اہمیت بھی نہیں دی گئی کہ اسے اس اہم فیصلے سے متعلق بات چیت میں شریک کیا جاتا۔ منٹو نے فروری 1910 میں، اس وقت کے لفٹنٹ گورنر، متحدہ صوبہ جات کے نام مکتوب میں لیگ کو ایک نمائندہ مسلم تنظیم

تسلیم کرنے سے انکار کیا، کسی اہم سوال پر جس کی رائے لینا ضروری ہو۔ جیسا کہ ہم آئندہ ابواب میں دیکھیں گے، لیگ کے اس رائے سے آگے بڑھ کر واقعی 'مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم' اور محمد علی جناح کے مسلمانوں کا 'واحد ترجمان' بننے تک ایک طویل مسافت طے کی۔

مسلم لیگ کے اراکین کی تعداد ہمیشہ بہت محدود رہی۔ اس کی سالانہ رپورٹ بتاتی ہے کہ 1920 کی دہائی کے اوائل میں اس کے اراکین کی تعداد 1200 سے زیادہ نہیں تھی۔ چودھری خلیق الزمان کے مطابق خلافت تحریک کے دوران لیگ کا وجود محض کاغذ پر تھا، اور اس کے بعد بعض نئے نوابوں، نے اس پر قبضہ گانٹھ لیا۔ مسلم لیگ کے اراکین صرف سالانہ اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے جہاں وہ اپنے ہی جیسے عزت مآب میزبانوں سے اس بات کے لئے حکمات ستائش وصول کرتے تھے کہ انہوں نے وہاں تک کا سنت سفر اختیار کر کے 'زبردست زحمت اٹھائی، اور پھر ناموس جگہوں پر بے آرامی کے ساتھ مہمانوں کی طرح قیام کیا، اس کے بعد ناموس (اگرچہ لذیز) کھانے کھانے کی تکلیف گوارا کی، اگرچہ پان اور سگریٹوں کی افراط نے ان کی تکلیف کو کچھ کم ضرور کیا ہوگا،۔ یہ طبقہ اشراف کی عجیب وغریب دنیا تھی۔ ذاتی اہمیت کے احساس کے ساتھ قوم سیاست کا کھیل کھیلنا کیسا پر لطف رہا ہوگا۔ اجلاس کی کاروائی کی روداد باضابطہ طور پر اخباروں کو بھیجی جاتی تھی، حالاں کہ انگریز حکام اجلاس میں بولے گئے ایک ایک لفظ کا مکمل متن اپنے وفادار ذرائع سے پہلے ہی حاصل کر چکے ہوتے تھے۔' اجلاس کا انتقام اس سال کے لئے تنظیم کے خاتمے کا مترادف ہوتا تھا۔ اجلاس میں کیا کچھ کہا سنا گیا اس کی پروا کسی کو نہیں تھی۔ ایک ماہ بعد بہت کم لوگوں کو یاد رہ جاتا تھا کہ اجلاس میں کیا ہوا تھا۔ یہ باتیں (صرف) حکومت ہند کے ریکارڈ میں ہی محفوظ رہ جاتی تھیں'88۔

مسلم لیگ، اپنے ابتدائی دنوں میں، ایک ایسے شوقیہ کار کی طرح تھی جو اپنے فن کا مظاہرہ خود اپنے طور پر نہیں بلکہ مدعو سامعین کے سامنے کر رہا ہو۔89۔ انگریز اور قدامت پرست مسلمان، دونوں نے، مندرجہ محدود اور جائداد پر مبنی رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابی حلقوں کو علاحدہ کر کے نوجوان مسلمانوں کو کانگریس کے احتجاج پسند سیاست کاروں اور دربار میں بار پانے والے حلقوں کے باہر کے مسلمانوں سے الگ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر انہیں نوجوان مسلمانوں کے مزاج اور جذبات کا انداز کرنے میں بھول ہوئی۔ یہ نوجوان گریجویٹوں کی حیثیت سے ووٹ دینے کے حق دار تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان مسلمانوں علماء کے ساتھ مل کر وسیع تر عبوری حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح مسلم لیگ کی قیادت کے اہم دعوے دار بن گئے۔ انگریزوں نے علاحدہ حلقہ انتخاب کو منظوری دے کر مسلمانوں کو برطانوی ہندوستان میں ایک علاحدہ سیاسی کردار بخش دیا تھا۔ لیکن یہ بالکل الگ بات ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ خود انگریزوں کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ اس کردار سے متعلق اسکرپٹ اب ان کے ہاتھوں سے چھینی جا چکی ہے، اور یہ کہ اب وہ مسلمانوں کو اپنا تابع فرمان رکھنے کی حالت میں نہیں رہے۔ ان چاہے نتائج کا نظریہ ایک بار پھر پایہ ثبوت کو پہنچا۔

وہ مسلمان جنہوں نے شملہ وفد کا سلسلہ چلایا تھا اور جنہوں نے انگریزوں کی مدد سے علاحدہ حلقہ انتخاب کی مراعات حاصل کی تھی، اب دراصل ہندوؤں پر انتخابی برتری حاصل کرنے سے کہیں زیادہ اس بات کے لئے فکرمند تھے کہ خود اپنے نچلے طبقوں کے مقابلے خود اپنا معیار زندگی اور اپنی حیثیت کس طرح برقرار رکھیں۔ شملہ وفد میں شامل مسلمان اپنے ماہ و اقبال اور برطانوی راج میں اپنی حیثیت کو یقینی بنانے کے لئے ہی زیادہ کوشاں رہے۔ انہوں نے اپنی مسلمانیت پر تمام تر زور کے باوجود انگریزوں سے کسی قسم کی سیاسی، نظریاتی آزادی حاصل کرنے کے امکان پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں محمد علی جناح، وقت لوح پر اپنا اور ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا نقش قائم کرنے کے لئے نمودار ہوئے۔ آئندہ ابواب میں ہم پاکستان کا بانی ہونے تک کے جناح کے سفر کا مطالعہ کریں گے کہ واقعات نے پیچیدہ سلسلے نے پاکستان کے قیام کی بنیادیں پہلے ہی تیار کر رکھی تھیں۔ واقعات کا یہ سلسلہ 1947 کے المیہ پر تمام ہوا۔ یہ قدیم سرزمین انتقامی جذبات کا مقتل بن گئی۔ اور لاکھوں لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ اس بے رحمانہ تقسیم پر غور کرتے ہوئے ایک تلخ اور ستم ظریفانہ خیال ذہن پر چوٹ کرتا ہے۔ کیا جناح واقعی اپنی عظمت رفتہ کی کچھ روشنیوں کو بحال کرنا چاہتے تھے یا ان کی تمام تر جدو جہد ہندوستان میں تیزی سے سر ابھارنے والے جمہوری نظام میں اپنے لئے صرف ایک موزوں سیاسی جگہ حاصل کرنے کے لئے تھی، اکثریت پسندی کے بے چشم و ہوش سمندر میں غرق ہونے سے بچنے کی غرض سے؟ کیا یہی آخری بات ہی ان کی جستجو کا محور تھی؟ اور کیا یہ اس کی اہمیت محسوس نہ کر پانے کی ہماری ناکامی تھی جس نے ہمیں 1947 سے دوچار کیا؟ آئندہ ابواب میں ہم ان سوالوں کا جواب پانے کی بھی کوشش کریں گے۔

2

شناخت کا سفر: جینا بھائی سے جناح تک

کاٹھیاواڑ تا سندھ

ابھی پچھلے باب میں ہم نے ہندوستان میں اسلام کے فروغ پر نظر ڈالی یا یوں کہہ لیں کہ سمجھنے کی کوشش کی کیوں کہ یہ تو قطعی ممکن نہیں ہے کہ ملک میں اسلام کے آنے اور یہاں اس کے پھیلنے کی کئی صدیوں کی روداد کو ہم ایک ہی باب میں سمیٹ دیں۔ جو طرح طرح کے انسانی تجربات شامل کا احاطہ کرتی ہے۔ بہر حال گزرتے وقت کے ساتھ حالات بدلے، ہندوستان کے وہ مسلمان جنہیں اب تک شاہی حکومت چلانے کی حیثیت حاصل تھی انہیں اب غیر ملکی تاجروں کی اکڑ اور ان کے ہاتھوں ہونے والی ہو رہی ذلت کی وجہ سے فرنگی دربار میں سر خم کرنا پڑا۔ ان کی ایسی حالت ہوگئی کہ ان سے کچھ کرتے نہیں بنا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ انگریز تاجر لوٹ کھسوٹ کی اسی لالچ اور ارادے کو لے کر آئے تھے جس سے ابتدائی مسلمان حملہ آور بھی لیس تھے۔ مسلمانوں کی طرح انگریز تاجر بھی 'فتح' یا 'خاتمہ' کے جذبے سے آئے تھے۔ ویسے بھی اگر وہ برطانیہ واپس لوٹنے کی سوچتے تو بھی انہیں اتنے ہی دشوار کن مراحل کا سامنا کرنا پڑتا جتنے انہیں ہندوستان میں قدم جمانے کے لیے تگ ودو اور کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔ اس لیے اس کے خیال میں یہی ممکن تھا اور اسی میں بہتری تھی کہ یہیں ٹکے رہیں اور کوشش کرتے رہیں۔

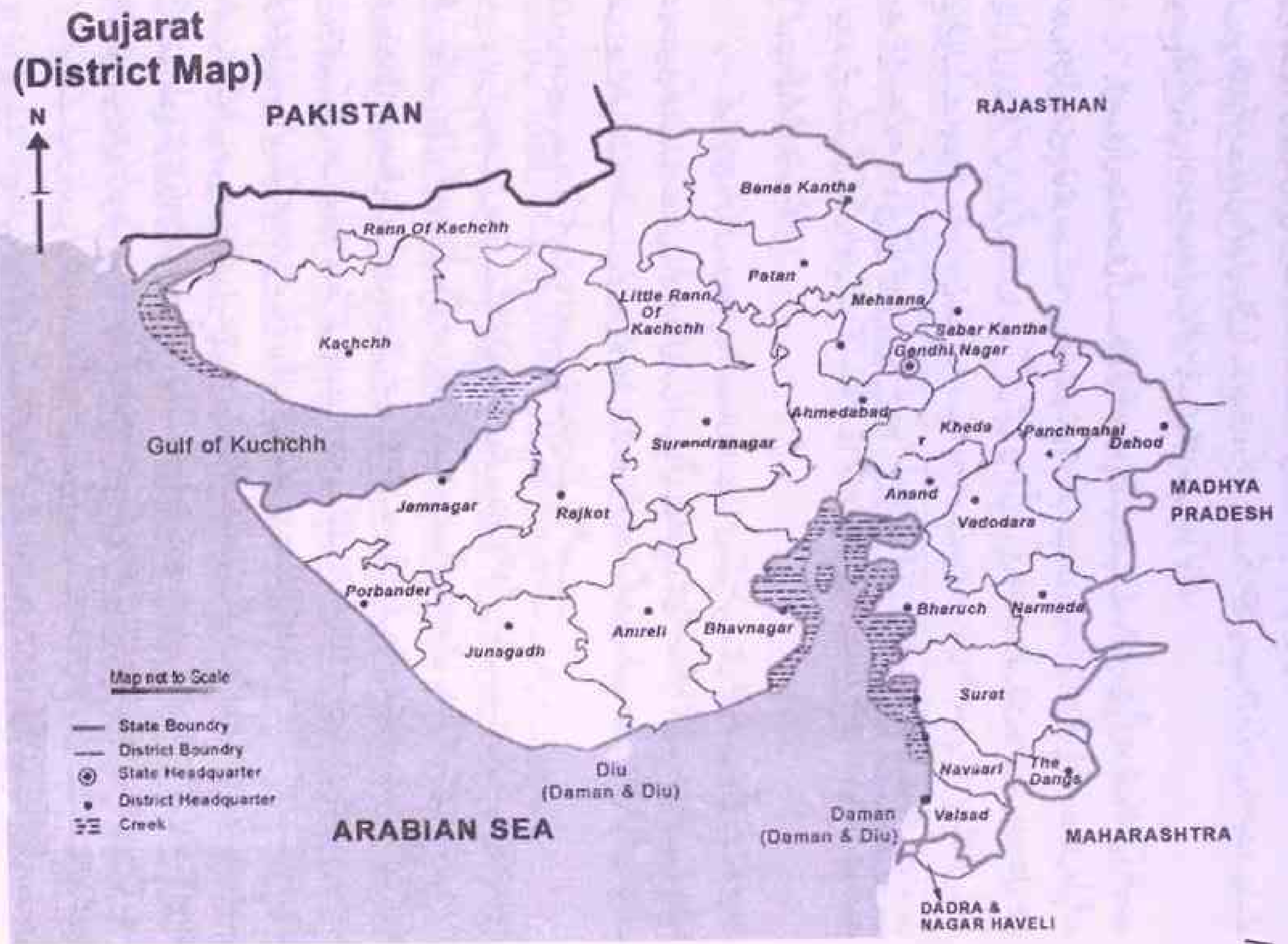
جب محمد علی جناح نے ہندوستان کے سیاسی منظرنامے میں قدم رکھا تو اس وقت تک مسلم لیگ کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا لیکن پھر بھی مسلمانوں کے اندر ایک تحریک پیدا ہو رہی تھی اور ہندوستانیوں کو مزید حقوق دیے جانے کے مطالبے نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اور برسر اقتدار انگریز حکومت سے گزارش کی جانے لگی تھی کہ وہ مقامی لوگوں کے لیے بھی سیاسی جگہ

متعین کر لے تا کہ انہیں بھی اپنی حیثیت کا اندازہ ہو سکے۔ لیکن ظاہر ہے یہ سب پوری سختی اور حد کے اندر رہ کر ہی ممکن تھا تا کہ برسر اقتدار حکومت کو کوئی دشواری نہ پیش آئے، نہ ہی وہ کمزور پڑے، مگر حقیقتاً یہ سب اقتدار کو مزید وسعت دینے کے لیے ہو رہا تھا جس میں باضابطہ حصہ داری کے بغیر صرف اس کا احساس کرایا گیا تھا۔

نئی صدی کی ابتداء ہو رہی تھی۔ برطانوی حکومت اپنی آب وتاب کے ساتھ عروج پر تھی اور ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کا ستارہ انتہائی بلندی پر تھا نیز ان کے نام پر ہندوستان میں راج کر رہے لارڈوں اور میم میموں کو اپنی حکومت میں کوئی فکر و پریشانی کی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ انہیں اپنے مستقبل میں کسی متوقع تاریکی کا خدشہ نہ تھا۔ ایسی حالت میں ہندوستانی سماج کے 'اشراف' سے، بہت الگ، 'خوجہ' سماج کے ایک فرد نے ہندوستان کے سیاسی اور سماجی منظر نامہ پر اپنا نام اتنے گہرے اور انمٹ انداز سے ثبت کر دیا کہ آج تک پاکستان کے لیے صرف جناح کا نام ہی کافی ہے۔ جناح کے پاس کوئی موروثی جائیداد اور شہرت نہیں تھی پھر بھی انہوں نے بمبئی کے کاتنوع آشنا ماحول میں اپنی قابلیت اور کوششوں سے اپنا مقام بنایا، شہرت حاصل کی، یہی محمد علی جناح تھے۔

کچھ کا وسیع و عریض رن کاٹھیاواڑ سے ملا ہوا ہے۔ اس کے مغرب میں بحیرہ عرب واقع ہے۔ کاٹھیاواڑ ہندوستان کی گجرات ریاست میں زرخیز اور اچھی طرح آب پاشی سے بھرپور زمین ''سوراشٹرا'' یعنی یہ سوریاستوں کے علاقہ کا حصہ ہے۔ کاٹھیاواڑ کا مطلب ہے کاٹھیوں کا علاقہ جو شاندار کاٹھیاواڑی گھوڑوں، خوب صورت کاٹھی خواتین، چالاک تاجروں اور بہت سے ہندو، مسلم، امیر تاجروں کے خاندانوں کے لیے مشہور ہے۔

آیئے اب اس علاقہ کے نقشے پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ علاقہ کا نقشہ بھی منسلک ہے۔ اس میں آپ کو پور بندر، جام نگر، راجکوٹ، گونڈل، گڑوو اور پنچیلی واضح طور پر نظر آئیں گے۔ یہ سب تقریباً دو سو میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہم اس وقت 19 ویں صدی کے آخری برسوں میں ہیں۔ گنگا جمنا کے میدانوں میں، یا اودھ میں ہونے والی اُتھل پتھل کا ہندوستان کے اس حصہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ اسلام بے شک یہاں 1024 عیسوی سے بھی پہلے سے ہے جب غزنوی نے سومناتھ کے عظیم الشان مندر کو توڑا تھا۔ اس کے بعد گجرات کے کئی مسلمان حاکم ہوئے جنہوں نے تباہی مچائی جسے یہاں کے لوگ اب بھی بھلا نہیں پائے ہیں اور یہاں کی لوک کہانیوں میں بھی اس کا عکس نظر آتا ہے۔ لوگ اب تک یہ بھی نہیں بھول پائے ہیں کہ پڑوس میں واقع ملاڑی، کے راٹھور فوج کے سپہ سالاروں نے بیگرا کو کیسے چیلنج کیا تھا۔ کاٹھیاواڑ وہی زمین ہے جہاں کرشن نے اپنی لیلا رچائی تھی اور ہندوستان کے چار مقدس مقامات میں سے ایک یہیں پر واقع ہے۔ مسلمانوں کے لیے ان دنوں پاٹن میں وہ بندرگاہ تھی جہاں سے حج پر جانے کے لیے سمندری سفر شروع کرتے تھے۔ اسی زمین پر پور بندر بھی ہے جو موہن داس کرم چند گاندھی کے خاندان کا مسکن تھا۔ موہن داس 1857 کی تحریک کے تقریباً بارہ برسوں بعد 2 اکتوبر 1869 کو کرم چند کے چوتھی اولاد کے روپ میں پیدا ہوئے جہاں کرم چند جی گاندھی، ریاست کے دیوان 1


Gujarat
(District Map)
N
PAKISTAN
RAJASTHAN
MADHYA PRADESH
MAHARASHTRA
DADRA & NAGAR HAVELI
ARABIAN SEA
Gulf of Kuchchh
Kachchh
Rann Of Kachchh
Little Rann Of Kachchh
Banas Kantha
Patan
Mehsana
Sabar Kantha
Gandhi Nagar
Panchmahal
Dahod
Kheda
Anand
Vadodara
Ahmedabad
Surendranagar
Rajkot
Jamnagar
Porbander
Junagadh
Amreli
Bhavnagar
Bharuch
Narmada
Surat
Navsari
Valsad
The Dangs
Daman (Daman & Diu)
Diu (Daman & Diu)
Map not to Scale
State Boundry
District Boundry
State Headquarter
District Headquarter
Creek

کے عہدے پر برسر کار تھے۔

راجکوٹ کے جنوب مغرب میں تقریباً 50 میل کی دوری پر پنیلی نامی ایک گاؤں ہے کہ ان دنوں یہ گاؤں گونڈل نام کے کاٹھیاواڑی رجواڑے کا حصہ تھا۔ پنیلی میں مسلمانوں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ خوجہ مسلمان، 2 بوہرہ سماج 3 کی طرح امن پسند، حالات کے مطابق رہنے اور ٹکراؤ سے دور رہنے والے تاجر تھے اور آج بھی ہیں۔ پہلے جن اسلامی رسموں رواجوں کا ذکر کیا گیا تھا ان میں سے ایک بھی رسم خوجہ خاندان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی ہے۔

پونجا بھائی اپنے تین بیٹوں وجلی بھائی، ناتھو بھائی، جینا بھائی اور بیٹی مان بھائی کے ساتھ پڑولی میں رہتے تھے۔ اپنے خاندان کے بقیہ لوگوں کی طرح وہ بھی اپنی زندگی ہتھ کرگھے کے کام سے چلاتے تھے۔ پونجا بھائی کے لڑکوں میں سب سے چھوٹے جینا بھائی نے پڑولی چھوڑنے کی ہمت کی اور نزدیک کے ایک مقام گونڈل آگئے۔ ان کا یہ پہلا قدم تھا لیکن ان کا دوسرا قدم وقت، مقام اور حالات کے حساب بہت بڑا اور اہم تھا کیوں کہ جینا بھائی 1857 عیسوی کے قریب کراچی آگئے تھے جہاں انہوں نے تجارت شروع کر دی تھی اور اپنے خاندان کی صفات کے سبب تجارت میں کامیاب رہے۔ کراچی ان دنوں بمبئی اور ہندوستان کی دیگر بندرگاہوں کے مانند ہی تھی جہاں انگریز کاروباریوں نے اپنے تاجرانہ مراکز بنا لئے تھے اور اتفاق سے جینا بھائی انہیں کاروباری سلسلہ میں فیڈرک لی۔ کرافٹ کے رابطے میں آئے۔ فیڈرک اور جینا بھائی کے تعلقات نے جینا بھائی اور ان کے پورے خاندان کو حقیقتاً بہت مستفید کیا۔

کراچی میں اکتوبر یا 25 دسمبر 1876 (جناح کی یوم پیدائش کو لے کر یہ بحث کئی برس تک چلی کو مٹھی بائی اور جینا بھائی کا ایک بیٹا ہوا اور رسم و رواج کے مطابق والد جینا بھائی نے جو نام طے کیا ان کے والدین اس پر متفق ہو گئے، قاضی نے رسمیں مکمل کرائیں۔ کاٹھیاواڑ کے پونجا بھائی خاندان کے زیادہ تر مردوں کے نام ہندو ناموں سے بہت مماثلت رکھتے تھے لیکن کراچی کی بات دوسری تھی کیوں کہ یہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی اور اڑوس پڑوس کے بچوں کے نام بھی مسلم ناموں پر تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک غیر مانوس نام رکھنا اچھا نہیں سمجھا اور اپنے پہلے بچے کا نام محمد علی جینا بھائی رکھ دیا۔ چلے آرہے رواج کے مطابق بچے کے نام کے آخیر میں والد کا نام جڑا ہوا تھا۔

محمد علی جینا بھائی کو ان کے والد 'عقیقے' 4 کے لئے گڑود میں واقع حسن پیر کی درگاہ پر لے گئے۔ یہ درگاہ ان کے موروثی گاؤں پنیلی سے کچھ ہی دوری پر واقع ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ حسن پیر کی برکت سے محمد علی کا مستقبل تابناک و روشن ہوگا ان کا سر منڈایا گیا۔ آج بھی یہاں کے لوگوں کا یقین ہے کہ پیر سے عقیدت رکھنے والوں کا مستقبل درخشاں رہتا ہے۔ مذہبی رنگ اور ممتا سے بھری محبت میں ماں اپنے بچے کے لئے دعا گو ہوئی۔

محمد علی کی ابتدائی تعلیم باقاعدہ نہیں ہوئی۔ ان دنوں کے معمولات کے مطابق ایک مدرس انہیں مادری زبان یعنی گجراتی پڑھانے کے لئے گھر آتے تھے، پھر ایک سال بعد انہیں سندھ مدرسۃ الاسلام 5 بھیج دیا گیا۔ یہاں انہوں نے کئی

London 25th April 1893.

To.

The Masters of the Bench of
The Honorable Society of Lincoln's Inn

Sir

I most humbly & respectfully beg to inform you that I intend to appear for the preliminary exam.

Having learnt that I shall be examined in the Latin language I request you in this position to grant me dispensation for the following reasons.

1. Being a native of India I have never been taught this language.

2. I know a number of Indian languages which we are required to learn as our Classics & second language.

3. Thus having spent my time in learning other languages which are required there I have not been able to learn the Latin language & which if I be compelled to learn, will take some years to pass the required exam.

I hope you will kindly comply with my request considering the reasons to be satisfactory.

I remain Sir
yours most humble & obedient
servant
Mahomedalli Jinnahbhai
40 Glazbury Road
West Kensington
W.

35 Russell Rd
Kensington
W.
30th March 96.

To the Steward
Lincoln's Inn

Sir, I beg to inform you that I am desirous of dropping the ending of my name namely bhai — meaning Mr as I explained to you. It being customary in India at the time of my admission I happen to give the name after that fashion. I shall feel much obliged if you can and will alter it without it causing you any great inconvenience. The name should be M. A. Jinnah or in full Mahomed Alli Jinnah.

Hoping you will see that it is altered at any rate before my call.

Yours faithfully
M. A. Jinnah

سال گزارے۔ سندھ مدرسے کے بعد محمد علی جناح کراچی کے چرچ مشن اسکول میں داخل کرائے گئے۔ پھر فیڈرک لی کرافٹ کے مشورے پر انہیں لندن بھیج دیا گیا۔ وہاں پر انہیں جہاز رانی یعنی شپنگ کی تعلیم دی گئی کیوں کہ ان کے والد جینا بھائی اسی پیشے سے وابستہ تھے۔ کرافٹ نے نوجوان محمد علی کے لئے لندن میں اپرنٹس شپ کی یقین دہانی کرائی تھی۔ جناح کے والدین کے لئے یہ ایسا موقع تھا جسے وہ گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ ان دنوں کے رواج کے مطابق لندن جانے سے پہلے ان کا نکاح ایمی بائی سے کر دیا گیا۔ یہ 1892 کا سال تھا۔ اس وقت محمد علی کی عمر سولہ سال اور ان کی اہلیہ ایمی بائی کی عمر گیارہ سال تھی۔ محمد علی 1892 کے پہلے ہفتہ میں لندن کے لئے روانہ ہوئے لیکن اس سے پہلے ہی ان کے خاندان پر ایک مصیبت آ گر پڑی کیوں کہ ان دنوں جینا بھائی پر کئی مقدمے چل رہے تھے جن میں سے ایک کا فیصلہ مئی 1892 میں ان کے خلاف گیا اور عدالت نے ان کی جائداد ضبط کر لی۔ خاندان کی عزت و وقار داؤ پر لگ گیا۔ فیصلہ کے مطابق انہیں جو رقم ادا کرنی تھی اس کی فوری طور پر ادائیگی ممکن نہیں تھی۔ ایسی حالت میں جینا بھائی نے مناسب یہی سمجھا کہ لڑکے کو لندن بھیج دیا جائے۔ بیٹے کے لندن چلے جانے کے بعد انہوں نے اپنے کو دیوالیہ مشہور کر دیا۔ جنوری 1893 میں ان کی جائداد کو ضبط کر کے قرض کی ادائگی کا کام شروع ہو گیا۔ اس طرح جینا بھائی ایک بار پھر نقل وطن کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس بار بمبئی آ گئے۔ یہاں انہوں نے فورٹ کے ٹھیک باہری علاقہ میں واقع درگا محلہ 6 میں مکان لیا اور رہائش اختیار کر لی۔

دوسری طرف انگلینڈ میں نوجوان محمد علی جناح کے ابتدائی دنوں کے بارے میں بہت کم معلومات مہیا ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ کراچی میں پیدا ہوئے کاٹھیاواڑی نوجوان کے روپ میں انہوں نے اس اجنبی مقام پر خود کو اکیلا ہی پایا۔ یہاں کے سرد موسم نے بھی انہیں متاثر کیا۔ دیگر ممالک کے لوگوں کے درمیان انہوں نے اجنبیت محسوس کی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تک وہ روانی سے انگریزی بھی نہیں بول پاتے تھے۔ لی کرافٹ کے ذریعہ انہیں لندن میں گراہمس کے ہیڈ آفس میں ''بزنس اپرنٹس'' کا مقام حاصل تھا۔ اس سے حاصل تنخواہ سے ان کا خرچ چلتا تھا۔ اس کام میں انہیں قانونی داؤ پیچ سے واقفیت ہوئی۔ قانون سے دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ بار کے لئے داخلہ ٹسٹ میں بیٹھ گئے۔ دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات سے بھی ہمت ملی تھی کہ اس وقت داخلہ کی شرائط کافی نرم تھیں۔ اس طرح انہیں داخلہ مل گیا۔ ایک غیر مصدقہ بیان کے مطابق انہوں نے اس مقام کا انتخاب اس لئے کیا تھا کیوں کہ انہوں نے اس کے نیوہال کے مین گیٹ پر قانون سازوں کی تصویروں میں رسول اللہ کی تصویر بھی دیکھی تھی۔

جینا بھائی - جناح انگلینڈ میں

تب لندن میں دادا بھائی نوروجی نے جناح کی زندگی میں قدم رکھا۔ ان دنوں گاندھی جی بھی تعلیم کے حصول کے لئے لندن میں تھے۔ انہوں نے اپنے لندن کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میں نے دیکھا کہ ہندوستانی طلباء کسی بھی وقت بغیر تردد کے نوروجی کے پاس آجاتے ہیں اور وہ سب کے لئے والد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی یہ حیثیت سبھی مذاہب

سبھی علاقوں سے متعلق طلباء کے لئے تھی۔ نوروجی انہیں صلاح دیتے اور پریشانیوں میں اس کا حل بتاتے۔ میں ہمیشہ سے ہیروشپ کا قدر دان رہا ہوں اس لئے دادا بھائی میرے لئے حقیقتاً ''دادا'' بن گئے7 جولائی 1892 میں دادا بھائی ''ہاؤس آف کامنس'' کے لئے منتخب ہوئے۔ اس میں ہندوستانی طلباء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کے لئے مہم چلائی۔ جناح جولائی 1892 میں کراچی میں تھے اس لئے وہ اس میں شرکت نہیں کر سکے لیکن 23 جولائی 1893 میں استقبالیہ تقریب میں شامل ہوئے۔

اس کے بعد جناح ایک وزیٹر کی حیثیت سے پابندی سے ''ہاؤس آف کامنس'' کی کارروائیوں کو دیکھا کرتے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ ایک بار انہوں نے کہا تھا ''میں لندن میں رہنا اور برٹش پارلیمنٹ ہاؤس آف کامنس کا رکن بننا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں وہاں اپنا اثر چھوڑ سکوں گا اور مساوی حقوق حاصل کروں گا۔'' ان کا اس طرح کہنا غالباً دادا بھائی کے ذریعہ پارلیمنٹ میں کئے گئے کاموں سے متاثر ہونے پر تھا۔ ان کی بہن فاطمہ جناح ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ ''میرے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب مجھے یہ علم ہوا کہ لارڈ سیلسبری نے اپنی ایک تقریر میں ''دادا بھائی'' کو کالا آدمی کہہ کر ان کا مذاق اڑایا تھا اور نس بری کے علاقہ کے لوگوں سے انہیں منتخب نہ کرنے کے لئے کہا تب میں غصے سے کھول گیا کیوں کہ اگر دادا بھائی کالے تھے تو میں ان سے بھی زیادہ کالا تھا اور اگر ہمارے سیاسی آقاؤں کی یہی ذہنیت ہے تو ہم کبھی بھی اپنے لئے ان سے بہتری کی امید نہیں کر سکتے ہیں۔ اس دن کے بعد سے میں ہر طرح کے امتیازات کا کٹر دشمن ہو گیا ہوں۔ میں نے بدلے کے جذبات کے ساتھ دادا بھائی کے لئے کام کیا اور خوش قسمتی سے وہ تین ووٹ سے جیت گئے۔ اگر چہ فتح کے ووٹوں کا تناسب بہت کم تھا پھر بھی لندن کے ہندوستانی طلباء نے اس فتح کو شاندار ڈھنگ سے منایا۔ جب کامنس میں گیلری میں بیٹھ کر دادا بھائی کی پہلی تقریر سن رہا تھا تو مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی اور گرماہٹ کا احساس ہوا''۔ جناح کے دل و دماغ میں دادا بھائی نوروجی کے لئے عزت و احترام پیدا ہو گیا اور مستقبل میں نوروجی نے جناح کی سیاسی شناخت پر اثر ڈالا۔ حالاں کہ جناح 'اولڈ مین' کے لئے خود کو وقف کر دینے والے دوست تھے لیکن ان سے عمر میں بہت کم تھے پھر دونوں نے یکجا ہو کر انڈین نیشنل کانگرس کو استحکام بخشنے میں اہم کردار نبھایا۔8

جناح کی یہ خوش قسمتی تھی کہ یہ آخری سال (1893) تھا اور قانون کو اپنا پیشہ بنانے کے خواہشمندوں کو تب ایک امتحان میں کامیابی حاصل کرنے پر داخلہ مل جاتا تھا۔ اس امتحان کا عجیب سا ''لٹل گو'' (Little Go) نام تھا۔ اس کے بعد شرائط وضوابط میں تبدیلی ہونے لگی۔ اگر جناح 1893 کے بعد داخلہ لینا چاہتے تو انہیں بار تک پہنچنے کے لیے دو سال کا عرصہ مزید درکار ہوتا۔ انہوں نے عقلمندی سے کام لیا اور گراہمس کی اپرنٹس شپ چھوڑ کر ''لٹل گو'' امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس میں انہیں انگریزی زبان، انگریزی تاریخ اور لاطینی زبان یعنی تین پرچوں کا امتحان دینا تھا۔ تیسرا پرچہ زیادہ تر ہندوستانیوں کے لئے بڑا مشکل تھا اور آج بھی مشکل ہوگا۔ لاطینی کی ابتدائی تعلیم میں بھی کم از کم دو سال لگ ہی جاتے ہیں اور تب تک داخلہ امتحان میں رعایت حاصل ہو جاتی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا ضابطہ بھی تھا جس کے تحت ہندوستانی کو

لاطینی کے پرچے سے چھوٹ مل جاتی تھی بشرطیکہ متعلقہ مضمون کے استاد طلباء کی بقیہ صلاحیت سے مطمئن ہوتے۔ جناح نے اسی رعایت کے لئے گزارش کی تھی۔

لنکنس (Lincolnsinn) ان کی خصوصی کونسل وی ماسٹرز نے ان کی گزارش منظور کرلی اور انہیں "لیٹن پرچے" سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ان کا امتحان 25 مئی 1893 کو ہوا جس میں جناح کامیاب ہوئے اور انہیں دنوں اپنے نام کے ساتھ وابستہ "بھائی" لفظ کو ہمیشہ کے لئے ہٹا دینے کا فیصلہ کرلیا نیز اپنا نام محمد علی جناح کرلیا جو آخر تک ان کے ساتھ رہا۔

ایک اور بھی تبدیلی ہوئی۔ وہ یہ کہ جناح نے اپنے نام کے ہجوں (Spelling) میں بھی تبدیلی کردی وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ کئی بار کی جیسے "جینا بھائی" کی جگہ پر "جناح" اور کچھ اسی قسم کی تبدیلی انہوں نے "محمد" اور "علی" کے ہجوں میں بھی کی تھی۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ سماجی نفسیات ماہرین ان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ کیا ان کا نام شخصیت کے فروغ کے ساتھ ہی بدلتا رہا؟ ممکن ہے کہ ان کے دماغ میں یہ بات رہی ہو کہ انہیں ایسا نام چاہئے جو آنے والے برسوں میں ان کی شخصیت سے میل کھائے۔

انگلینڈ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد جناح 1876 میں ہندوستان لوٹ آئے لیکن وہ کراچی نہیں بلکہ بمبئی پہنچے۔ جب وہ ہندوستان سے دور تھے، اسی دوران ان کی اہلیہ اور والدہ دونوں گزر گئی تھیں۔ اس وجہ سے آئندہ 51 برسوں تک بمبئی ہی ان کا مرکز رہا، وہیں انہوں نے گھر بنایا۔ ابتدا میں وہ ہائی کورٹ کے نزدیک ریلوے ہوٹل میں ٹھہرے اور وہیں موکلوں کے منتظر رہتے۔ ان دنوں ان کی زندگی اتنی آسان نہ تھی جیسا کہ سید پیرزادہ نے جناح پر مبنی ایک فلم میں بتایا ہے۔ ان دونوں جناح کہا کرتے "جب میں نے شروعات کی تو میرے پاس اتنے بھی پیسے نہیں تھے کہ ٹرام یا بس سے جا سکوں۔ میں زیادہ تر پیدل ہی چلا کرتا تھا بلندی پر ہمیشہ جگہ ہوتی ہے لیکن سیڑھیاں پیدل چڑھنی پڑتی ہیں۔" اور انہوں نے سخت محنت کی۔ جناح خود کہتے ہیں "پہلے دو تین سال جب میں مجسٹریٹ نہیں بنا تھا تب میرا وقت بہت خراب تھا۔ میں ہر دوسرے دن سڑک پار کر کے واٹ سنس ہوٹل جاتا تھا۔ ان دنوں یہ بڑا مشہور ہوٹل تھا۔ میں وہاں بازی کے لئے 'بلیرڈز' کھیلتا تھا اور اس طرح اپنے اخراجات پورے کرتا تھا کیوں کہ باقی کمائی، بہت کم تھی۔ واٹ سنس ہوٹل اب تقریباً کھنڈر بن چکا ہے۔ ہاں اس کے وجود کا ایک نشان "W" ہوٹل کی ریلنگ پر باقی بچا ہوا ہے۔

جناح کو 24 اگست 1896 کو بمبئی میں ہائی کورٹ آف جیوڈی کیٹر میں نامزد کیا گیا اور جلد ہی انہیں ایک ایڈوکیٹ کے روپ میں حلف دلایا گیا۔ بمبئی ہائی کورٹ بار میں ان کی نامزدگی 24 اگست 1896ء کو ہوئی جب کہ گاندھی ہندوستان لوٹنے کے بعد 1891 میں اس کے ممبر بنے۔ ہائی کورٹ بار کا ممبر بننے کے وقت محمد علی جناح صرف

20 سال کے تھے۔ ایک طویل قانونی اور سیاسی زندگی ان کے سامنے تھی۔ وہ اب تک صرف تیار ہی ہو رہے تھے اور یہ ان کا پہلا قدم ہی تھا۔

ابتدائی دور میں انہوں نے جو بھی مشکلات جھیلی ہوں لیکن ان کے ہندوستان واپس لوٹنے کا وقت ان کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا کیوں کہ ان کے والد عدالت میں مقدمے میں پھنسے ہوئے تھے۔ جناح نے اس میں خود جرح کرنے کی ذمہ داری لیتے ہوئے دفاع کا کام سنبھالا اور مقدمے میں اپنے والد کو جیت دلائی 10۔ جناح کے پیشہ ور قانونی کیریر کی ابتدا ہوگئی تھی اور جلد ہی وہ بمبئی بار کے سب سے اچھے وکیلوں میں شمار کئے جانے لگے۔ اس کے بعد انہیں جان مولیس ورتھ میکفرسن جو، بمبئی کے اس وقت کے کارگزار ایڈوکیٹ جنرل تھے کے چیمبر میں شامل کرلیا گیا۔ سروجنی نائڈو کے الفاظ میں ''یہ بڑی ہی شریفانہ رعایت تھی جو کسی ہندوستانی کو پہلی بار ملی تھی اور اسے پانے والے نے اسے اپنی ابتدائی جدوجہد کے دور کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن سے تعبیر کیا۔'' 11 سر چمن لال سیتل واڑ نے تبصرہ کیا۔ ''میکفیرسن کی وکالت کافی اچھی چلتی تھی۔ ان کی زبان جامع اور مکمل تھی۔ ان کے معاون کی حیثیت سے جناح کو متعلقہ شعبہ میں بنیادی جانکاری حاصل ہوئی لیکن چند معاملوں کو چھوڑ کر انہیں اپنے پیشے کی سیڑھیاں طے کرنے میں بہت کامیابی نہیں ملی۔'' 12 جناح کو پہلا موقع 1900 میں ملا جب انہیں پریسیڈینسی مجسٹریٹ بنایا گیا۔ اس وقت ایک نوجوان وکیل کے لیے ایسی تقرری بہت عزت کی بات تھی۔

جناح کے پریسیڈینسی مجسٹریٹ بننے کے بعد 10 مئی 1900 کو کراچی کے ایک روزنامہ سندھ گزٹ نے ان کی تقرری کی تعریف کرتے ہوئے خبر شائع کی تھی کہ ''مسٹر جناح کے بمبئی کا تیسرا پریسیڈینسی مجسٹریٹ بننے پر خوجہ سماج مبارکباد کا مستحق ہے۔ وہ کراچی کے سب سے پرانے اور مشہور و معروف تاجروں میں سے ایک مسٹر جینا بھائی کے صاحب زادے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح بہت کم عمر میں ہی بار کے امتحان میں کامیاب رہے ہیں اور ان کی واپسی پر بمبئی ہائی کورٹ نے انہیں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے نامزد کیا ہے۔'' اس وقت جناح صرف 24 سال کے تھے لیکن قانون سے دلی لگاؤ تھا اور ایمانداری کو فوقیت دیتے تھے۔ وہ کچھ عرصے تک سر جارج لاؤنڈیز کے چیمبر میں رہے جو بعد میں وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کے لاء ممبر بنے۔ لاؤنڈیز بہت ہی کھلے دل و دماغ کے تھے اور دلائل پیش کرنے کا ان کا انداز منفرد اور پُر اثر تھا۔ ایک بار جب جناح ان کے چیمبر میں مطالعے میں مصروف تھے تب تلک کی کسی تقریر سے متعلق لاؤنڈیز کی رائے مانگی گئی کیوں کہ اس سے متعلق کوئی کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس وقت لاؤنڈیز نے جناح سے پوچھا کہ ''کیا آپ نے اس سلسلہ میں کچھ پڑھا ہے اور اس پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟'' میں نے ان کی فائل نہیں دیکھی ہے اور دیکھنا بھی نہیں چاہتا کیوں کہ تلک جیسے عظیم وطن پرست پر مقدمہ چلانے کے بارے میں حکومت کی تنقید سے خود کو الگ رکھنا چاہتا ہوں۔'' 13

بمبئی میں ایک وکیل کی حیثیت سے اس وقت تک محمد علی جناح کافی مقبول ہو گئے تھے۔ ایک مقدمے کی

شنوائی کے دوران جج نے تین بار جناح کو' بکواس' کہہ کر ٹوکا۔ تب جناح نے جواب میں کہا" یور لارڈ شپ! آج پورے دن آپ کی زبان سے' بکواس' کے علاوہ کچھ اور نہیں ادا ہوا" 14 جناح نے جب وکالت شروع کی تھی۔ اس وقت ہندوستانیوں کے خلاف نسل و رنگ کو لے کر کافی امتیاز برتا جاتا تھا لیکن انہوں نے اپنی قابلیت مشہور وکلاء کے درمیان رہ کر اتنے کم عرصے اور کم عمر میں کامیابی حاصل کی جو ان کے کردار اور ان کی قابلیت کا مظہر ہے۔

خوجہ برادری کے بارے میں یہ عام خیال رہا ہے کہ وہ ہندوؤں کی لوہنا ذات 15 سے مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے ہیں۔ جناح کا تعلق شیعہ خوجہ برادری 16 سے تھا۔ ویسے خوجہ برادری کو ان کے یقین اور مذہبی عادتوں کی وجہ سے آسانی سے کسی اور خانے میں رکھا نہیں جا سکتا۔ برنارڈ لوئیس نے تو" ایک باریک غلاف میں ڈھکے ہندو" سے ان کی تشبیہ دی ہے" 17۔ ویسے خوجہ قبلہ اپنے آپ میں اسلام کی چھتری تلے ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کی عادتوں کی ایک منفرد تصویر ہے۔ غالباً اسی لئے 1917 میں سروجنی نائڈو نے جناح کی شخصیت کی کھلے ذہن کی خصوصیت کو ان کے خوجہ ہونے کے ساتھ جوڑا ہوگا۔ جب انہوں کہا کہ جناح" ذات سے ہندو ہیں اور مذہب سے مسلمان"۔ اس لئے یہ کہنا محض خیالی نہیں ہوگا کہ خوجہ ہونے کی وجہ سے ہی انہیں چل کر' ہندو۔ مسلم اتحاد کا سفیر' ہونا تھا۔" 18

بوہروں اور میمنوں کی طرح، خوجہ بھی اپنی دولت، تجارت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے لئے مشہور ہیں۔ وہ قدرتی طور پر امن پسند ہیں۔ وہ بنیادی طور پر سورت، بھڑوچ، احمد آباد، کراچی کے سمندری کنارے یا ہندوستان کے مغربی حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے خاندان نے بمبئی پریسیڈینسی کی اندرونی تجارت کے ایک خصوصی حصہ پر بھی اپنا تسلط قائم کیا، ساتھ ہی ساتھ ہی مشرقی افریقہ اور ماریشس سے ہونے والی تجارت اور بمبئی شہر کے اندرونی حصہ کی تجارت پر بھی ایک طرح سے انہیں کی گرفت تھیں۔ جہاں تک انگریزی تعلیم کی بات ہے وہ اس میں کبھی آگے نہیں رہے۔ ان دنوں انگریزی سے ناواقفیت پسماندہ ہونے جیسا نہیں تھا لیکن وہ اپنی زبان گجراتی میں کسی سے کم نہیں بلکہ ہندوؤں جیسی ہی مہارت کے حامل تھے۔ ویسے بھی انگریزی تعلیم کا استعمال ان کے لئے بہت ہی کم تھا اور اسی لئے انہوں نے ایک فرقے کی شکل میں اس سے دور ہی رہنا مناسب سمجھا۔ خصوصاً تجارتی فرقہ ہونے کے ناطے وہ اپنی زبان گجراتی میں کام چلاتے اور اسے انہوں نے برقرار رکھا۔ سرکاری نوکری یا عہدہ حاصل کر لینا ان کے لئے خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور آج بھی وہ اپنی سابقہ روش پر قائم ہیں۔ آغا خان ان کے روحانی پیشوا ہیں جب کہ جناح نے ان کو یہ حیثیت کبھی نہیں دی۔

بنیادی طور پر تجارت اور صنعت میں لگے رہنے کی وجہ سے ان کے سیاسی خیالات پر بھی اثر پڑا، وہ بھی ایسے وقت میں جب سرکاری ملازمتوں کے لئے مقابلے فرقہ وارانہ طاقت آزمانے کا ایک طریقہ بن گئے تھے لیکن خود انحصاری، خوشحالی ہونے کی وجہ سے خوجہ اس سے کم ہی متاثر ہوئے۔ اپنے زیادہ تر ہم مذہبوں کے خیالات کے برعکس خوجہ بنیاد پرست مسلمان کبھی نہیں رہے۔ اس کے علاوہ بمبئی کی تجارتی دنیا کے ایک رکن ہونے کے سبب پیشہ ورانہ وجوہات سے، وہ دیگر فرقوں کے

ارکان کے ساتھ وابستہ تھے یا یوں کہہ لیں کہ ان کا تجارتی انداز انہیں آج بھی دوسروں سے مربوط کئے ہوئے ہے تو غلط نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کے بغیر وہ تجارتی اور مالی منفعت کیسے حاصل کرتے۔

جناح ان سب باتوں سے ہمیشہ دور رہے کیوں کہ ان میں تاجروں کی طرح سودے بازی، سمجھوتہ یا صرف منافع کمانے کی آرزو بالکل نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ عادتاً ضدی، اپنے فیصلہ پر قائم رہنے والے اور جدوجہد کرنے والے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی وطن پرستی کسی مفاد سے نہیں ابھری تھی، یہ تو ان کی آزاد خیال، ان کے انگلینڈ میں قیام اور ان کی صلاحیت کی وجہ سے چلنے والی وکالت کا نتیجہ تھی۔ وہ خود منحصر، اپنے آپ تعلیم حاصل کرنے والے اور اپنی محنت سے کچھ حاصل کرنے والوں میں سے تھے۔ وہ ایک نوجوان کی طرح بے تاب تھے کہ ان کی صلاحیت، ان کی قابلیت کی پوری طرح شناخت ہو اور انہیں نوازا جائے۔ ان کے پاس خاندانی یا سماجی عزت و وقار کی وراثت نہیں تھی جس سے اس دور کے زیادہ تر بیرسٹ سرفراز تھے۔ وہ انگریزوں کے ذریعہ اس وقت اختیار کئے جانے والے دوہرے معیاروں کو بھی اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ پہلا اصول تو صرف انگریزوں کے لئے اور ان کے اپنے ملک میں ہی چلتا تھا جب کہ دوسرا ہندوستان کے لئے ہندوستان میں رائج تھا جو پہلے سے بالکل الگ تھا۔ ''انز آف کورٹ'' (Inns of Court) سے نکلے دوسرے لوگوں کی طرح ہی جناح بھی ہندوستان لوٹنے کے بعد ''اس بات کے لئے مکمل طور پر تیار تھے کہ ایک طرف انگریزوں کا اکھڑپن اور دوسری طرف ہندوستانیوں کی احساس کمتری اور مجروح ہو رہے احساس و جذبات کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہے''۔ بہتری لانے کے لئے ان میں جو جوش تھا اس میں آئینی انداز رہتا تھا اور ان میں یہ خصوصیت ان کی اپنی وکالت کی وجہ سے آئی تھی اور اس سے استفادہ بھی کیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے اپنی کوششوں، اپنی صلاحیت کی بدولت اصولوں پر سختی سے قائم رہ کر سماج، پیشے اور سیاست میں ایک منفرد مقام بنایا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی سہارا بھی نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی انہیں صلاحیتوں اور اصولوں پر قائم رہ کر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک وکیل کی حیثیت سے ان کی ابتدائی تربیت نے مسلم فرقے اور حکومت کے رشتوں کے بارے میں ان کے تصور کو متاثر کیا تھا۔ ذاتی اور خاندانی پریشانیوں کے باوجود کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے ان کا یہ خیال تھا کہ دوسرے لوگوں کو بھی تعلیمی میدان یا دوسرے شعبہ میں خصوصی حیثیت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔ جب 11 مارچ 1913 کو وہ ان دنوں کے پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تو لارڈ اِسلنگٹن 19 نے ان سے پوچھا کہ ''کیا ایک ساتھ امتحان کرانے کے انتظام سے پس ماندہ طبقے کو نقصان ہونے کے بارے میں وہ فکر مند نہیں ہیں''؟ اپنے خیال پر سختی سے قائم جناح نے تب جواب دیا تھا کہ '' مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ ایک فرقے کے لوگ ہی زیادہ آ جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ اس طرح سے موزوں اور قابل لوگ دستیاب ہوں۔ حالاں کہ مجھے اس میں شک ہے کہ ایک ہی فرقے کے زیادہ لوگ آ جائیں گے''۔ تب لارڈ اِسلنگٹن نے مزید سوال کیا کہ '''میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ کسی ہندو کو مسلم آبادی کا ذمے دار بنا دیا جائے تو کئی پریشانیاں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ کیا آپ سوچتے ہیں کہ ایک ہندو جس نے ایک تعلیم یافتہ

اور بااثر مسلمان سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہیں وہ کسی گھنی مسلم آبادی کا ذمے دار بنائے جانے پر کامیاب اور زیادہ اچھا ایڈمنسٹریٹر ثابت ہوگا؟ جناح نے جواب دیا میں کہا کہ ایسی حالت میں آپ اس ہندو کے ساتھ بہت زیادتی کریں گے کہ ''میں نہیں سمجھ پارہا ہوں کہ ایک مسلم آبادی کے ضلع کا ایک ہندو کو انچارج کیوں نہیں بننا چاہیے؟'' ایسے ہی خیالات کی وجہ سے جناح مسلم لیگ کے بجائے انڈین نیشنل کانگرس کے رکن نے۔20

جناح: سیاسی زندگی میں قوم

جناح کی سیاسی زندگی کی ابتدا ان کی وکالت کے ساتھ ہی ہوئی اور برطانیہ سے لوٹنے کے فوراً بعد وہ انجمن اسلام کے ممبر بن گئے۔ جو 1897 میں ایک ممتاز مسلم تنظیم تھی۔22 بدرالدین طیب جی جو 1895 میں بمبئی ہائی کورٹ میں جج تھے اس وقت انجمن کے سربراہ تھے۔ اس لئے یہ بات قدرتی تھی کہ وہ جناح کے مسلم رہنما بن جائیں۔ یہ بات جناح کے لئے یہ ان کی عوامی زندگی اور وکالت دونوں میں خصوصی طور پر مددگار ثابت ہوئی۔ طیب جی نے 1887 میں کانگرس کی صدارت کا بار سنبھالا۔ وہ کانگرس میں مسلمانوں کے رول کے بارے میں جلد ہی سید احمد خاں کے دباؤ میں آگئے جنہوں نے طیب جی کو کانگرس سے دور رہنے کی صلاح دی کیوں کہ ان کے خیال میں کانگرس مسلمانوں کے حق میں کام کرنے والی تنظیم نہیں تھی۔ تب طیب جی نے ''مسلم جذبات'' کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کم از کم پانچ سال کے لئے کانگرس کو ملتوی کا مطالبہ کیا اور اس کے بعد انہوں نے دوبارہ کانگرس کے سیشن میں حصہ نہیں لیا۔ 'انجمن اسلام' سے اپنی وابستگی کے ابتدائی برسوں کے دوران جناح، طیب جی کے قریب آئے جب کہ وہ پہلے سے ہی دادا بھائی نوروجی کے نزدیک تھے جو ایک پارسی اور کانگریسی تھے۔ ان برسوں میں بمبئی میں کانگریسی سیاست پر پارسی لوگ ہی چھائے ہوئے تھے۔ فیروز شاہ مہتہ، دنشا واچا، جیسے لوگ کانگریس کے اہم لوگوں کی حیثیت سے شہر میں مشہور تھے۔ جناح کی خوش قسمتی تھی کہ بمبئی میں انجمن اسلام کے نمائندے کانگریس سے جھجکتے نہیں تھے کیوں کہ ان دنوں بمبئی میں کانگریس پر سیکولر خیالات کے پارسیوں کا اثر تھا۔ تلک جیسے لیڈروں کی قوم پرستی 'ہندو' مائل سمجھی جاتی تھی لیکن ان کے اثر کا توازن برقرار رکھنے کے لئے بمبئی کانگریس اس وقت پارسی گروپ کے علاوہ گوکھلے اور جناح کی حمایت پر بھی منحصر تھی۔ اس وقت بمبئی کے وکلاء پر بھی پارسی لوگوں کا اثر تھا کیوں کہ ایک فرقے کی شکل میں انہوں نے دوسروں کی بہ نسبت انگریزی تعلیم سے استفادہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ان کے مزاج نے بھی انہیں انگریزی راج اور اس کے منتظمین کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے قابل بنایا۔

انہی وجوہات کی بنا پر جناح جلد ہی طیب جی کے ساتھ اس کمیٹی میں شامل ہوگئے جسے کنگ ایڈورڈ ششم کے استقبالیہ جلسے کا نظم دیکھنا تھا۔ انہوں نے 28 جولائی 1904 کو فیروز شاہ مہتا کی صدارت میں کانگریس استقبالیہ کمیٹی کی ایک بیٹھک میں حصہ لیا لیکن اس بیٹھک میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ سیاسی تنظیم کی تشکیل کے تنازعے میں پڑنے سے صاف منع کر دیا۔23 اس برس 1904 میں کانگریس نے بمبئی میں خود حکومتی کے مسئلہ پر برطانوی سیاسی

نظریے پر اثر انداز ہونے کے لیے ایک وفد کو انگلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ بامبے پریسیڈینسی ایسوایشن نے گوکھلے اور جناح کے نام منظوری کے لئے دیئے۔ علاقائی کانگریس کمیٹی نے جناح کے نام کو آگے بڑھایا لیکن مرکزی سطح پر تلک نے اس کی مخالفت کی کیوں کہ اس کی سیاسی وجہ یہ تھی کہ جناح پر ان دنوں فیروز شاہ مہتا کے گروپ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ 24ے

اب ہم آگے چلتے ہیں اور ناگپور کو چھوڑ کر سورت کے کانگریس اجلاس میں پہنچتے ہیں۔ سورت اجلاس میں کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی اور پارٹی دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ اگر چہ یہ تلک کا گڑھ نہیں تھا لیکن سورت اجلاس شور شرابے کی نذر ہو گیا اور مخالفین واک آوٹ کر گئے نیز ایک دہائی بعد جا کر 1916 میں وہ بنیادی تنظیم میں واپس آتے۔ لیکن اس وقت تک کانگریس کے دو مضبوط لیڈر گوکھلے اور مہتا گزر چکے تھے۔ اس لئے جناح نے تلک سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے اور ان کے ساتھ نئے سرے سے کام کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ کانگریس کی اس پھوٹ سے انگریز خوش تھے۔ انہوں نے تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے تلک پر ملک میں بدامنی پھیلانے کا الزام لگا کر 1908 میں انہیں گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر جناح نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بمبئی ہائی کورٹ میں ایک ہندوستانی جج جسٹس ڈی - ڈی ڈاور کی عدالت میں تلک کی ضمانت کے لئے عرضی داخل کی لیکن اس جج نے کسی نہ کسی بہانے شنوائی میں تاخیر اور پھر کوئی وجہ بتاتے بغیر عرض خارج کر دی۔ بعد ازاں بدقسمتی سے ساری کوششوں کے باوجود جناح کو تلک کا وکیل بننے کی اجازت نہیں ملی کیوں کہ تلک خود بھی لاء گریجویٹ تھے اور انہوں نے اپنا مقدمہ خود لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اگست 1920 میں تلک کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جناح نے کہا تھا" تلک ایک ہوشیار عملی سیاست داں تھے۔ 1907 میں مجھے پہلی بار پارٹی کی پھوٹ کے بعد انہیں جاننے کا موقع ملا۔ انڈین نیشنل کانگریس میں تلک کے گروپ کی آواز کمزور ہوگئی اور گروپ اقلیت میں آ گیا۔ ملک میں بدامنی پھیلانے کے ایک معاملے میں تلک کو سزا ہوگئی اور جسٹس ڈاور نے انہیں سرگرم سیاست سے تقریباً 6 برسوں کے لئے باہر کر دیا۔ یہ ایک عجیب سزا تھی۔ میں ان کے ڈیفنس وکیل کی حیثیت سے سامنے آیا۔ مجھ سے تلک کی ضمانت کی عرضی داخل کرنے کو کہا گیا جسے ڈاور نے نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد وکیل کی حیثیت سے ہمارے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے کیوں کہ میں نے ان کے بچاؤ کے لیے سب سے صحیح راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ چننا مناسب نہیں سمجھا تھا۔" 25ے یہ شنوائی آٹھ دنوں تک چلی اور 13 جولائی 1908 کو 6 سال قید سخت کی سزا سنائی گئی۔ اس" انصاف" کے لئے جسٹس ڈاور کو نائٹ (Knight) کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ جسٹس ڈاور کی طرف سے اس موقع پر 'جشن' اور عشائیے میں شرکت سے صاف انکار اور اس پر تیکھی تنقید جناح کی طرف سے کی گئی۔ 26ے

ان دنوں ان کے جو بھی خیالات تھے، چاہے تجربے کی بات ہو یا ایک شہری کی حیثیت سے ان کا تجربہ ہو، وہ ایک کھلے ذہن کے ہندوستانی کی شکل میں سامنے آئے۔ انہوں نے وہاں سے ایک لمبا راستہ طے کیا۔ جدوجہد کے ابتدائی برسوں کے بعد کی کامیابی کے ساتھ جناح کے لئے، جن پر اسلام کا کوئی خاص اثر نہیں تھا، اس طریقہ کے علاوہ کسی اور قسم کی سیاست

کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ برطانوی حکمرانوں کے اڑیل اقتدار سے آزادی کے بارے میں سوچتے تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت حقیقتاً صرف قومی تھی۔ ان کا ذہن کسی علاقائیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں وہ ایسے سیاسی مسئلہ سے الجھ رہے تھے جو انہیں سیاسی حیثیت سے کافی الگ کرتی تھی۔ بغیر کسی مخصوص علاقے کی حمایت حاصل کیۓ قومی سطح پر اپنی حالت کیسے مضبوط کی جائے؟ آگے چل کر انہوں نے اس مسئلہ کا سامنا کیا کہ کانگریس وابستہ ہوتے ہوئے بھی کس طرح سے نو تشکیل شدہ مسلم لیگ سے خود کو وابستہ کیا جائے؟ وہ لیگ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے مگر جہاں تک اسے اپنے سیاسی وسیلے کے طور پر کی اپنانے کی بات تھی زندگی کے اس موڑ پر (اپنی عمر کے تیسویں برس میں) وہ اپنے آپ کو فرقہ واریت کے مقصد کے ساتھ وابستہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایسے حالات میں کانگریس پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے مسلم لیگ کی میٹنگوں میں حصہ لینا ہی ایک بہتر راستہ تھا 27۔ جناح نے اپنے اس فیصلے کے بارے میں 1913 میں موسم خزاں میں اس طرح سے اظہار کیا "مسلم لیگ اور مسلم مفاد کے لئے کسی بھی طرح سے اور کسی بھی وقت قوم پرستی متاثر نہیں ہوگی جس کے لئے ان کی (جناح) کی زندگی وقف ہے۔" یہ اصولوں کے پل سے اس دراڑ کو پار کرنے کی کوشش ضرور تھی لیکن کیا یہ کوئی اصول تھا؟ یا پھر دو کشتیوں میں ایک ساتھ پیر رکھنے کی چال تھی؟ ان دونوں نظریات کی وکالت کرنے والے لوگ موجود ہیں اور رہیں گے۔

جناح کے سیاسی ذہن کا ایک خاص پہلو تھا جسے پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں جناح ایک بار پھر کمزور حالت میں تھے، اس لئے کہ وہ ایک سخت مشکل کا سامنا کر رہے تھے۔ وہ ڈرامائی تقریر کرنے میں ماہر نہیں تھے اور نہ ہی حکومت کی دھجیاں بکھیر کر ہجوم کو بھڑکانے کا آرٹ ان کے پاس تھا۔ ان کی مکمل شخصیت اپنے آپ میں سمٹی ہوئی خوددار شخص کی تھی جو صاف گوئی، خیالات کی وضاحت پر منحصر تھی۔ 'جب تک سیاست، صلاح مشورے پر ٹکی تھی تب تک ان کی حالت مضبوط تھی لیکن سیاسی اور جمہوری سرگرمیوں میں عوام کی شرکت کے بڑھتے ہوئے رجحان 28 کے درمیان یہ ضروری ہو گیا کہ "ایک قومی سطح کا لیڈر علاقائی اور مقامی سیاسی رجحانوں سے بھی جڑا ہوا ہو۔" 29 اس لئے جناح نے سب کو جوڑ کر چلنے اور پورے ہندوستان کے بارے میں سوچنے کی پالیسی ترک کر دی کیوں کہ انہیں اپنی بہت سی بندشوں سے خود کو آزاد کرنا تھا اور انہیں میں سے ایک چیلنج تھا ہندوستان کے عوام پر گاندھی جی کے اثرات کا۔ آیئے ہندوستان کی تحریک آزادی کے ان دو عظیم لیڈروں کے تعلقات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

گاندھی اور جناح کا موازنہ کرنا ایک انتہائی مشکل لیکن اہم کوشش ہے کیوں کہ وہ دونوں تحریک آزادی کے دو مرکزی نشان تھے یا یوں کہہ لیں مرکزی نشان بن گئے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ بلاشبہ گاندھی بالکل ایک الگ سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے لیکن جناح کی طرح ہی انہوں نے بھی امتیاز اثر حاصل کیا تھا اور یہ وراثت میں حاصل نہیں ہوا تھا۔ کاٹھیاواڑ کے گاندھی بھی جناح کی طرح ہی سیاسی شخصیت کے حصول سے پہلے کامیابی سے لندن کے بیرسٹر بنے۔ یہاں ایک بہت واضح اور خاص فرق سامنے آتا ہے کہ گاندھی کی پیدائش ایک معروف خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے والد ایک ہندوستانی ریاست کے دیوان (وزیر اعظم) تھے اور اس وجہ سے انہیں بہت مدد بھی ملی۔ جناح کو پیدائش سے ایسا کوئی فائدہ حاصل

نہیں ہوا، انہوں نے کامیابی اپنی ہی کوششوں سے حاصل کی تھی۔ گاندھی کی سیاست احتجاج کی سیاست تھی اور وہ اس کے بہت ہی ماہر بن گئے تھے لیکن انہوں نے یہ اپنے مزاج کو بدل کر نہیں کیا اور نہ ہی اپنی زبان کو بدل کر کیا بلکہ انہوں نے یہ سب ہندوستانی سیاست میں ہی تبدیلی لا کر کیا۔ انہوں نے ہندوستان پر لمبے عرصے سے چلی آرہی غیر ملکی حکومت کی وجہ سے غلامی کا جو خیال گھر کر چکا تھا اسے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی اور ملک کی ذہنیت کو ایک طویل غلامی سے باہر نکالا۔ گاندھی نے سیاست کو بحث و مباحثہ کے دائرے سے نکال کر ہندوستان کی زمین کے ساتھ جوڑا کیوں کہ وہ خود بھی تو اس زمین سے وابستہ تھے۔ یہاں کی بول چال کو وہ جانتے تھے۔ اس زمین کی بولی کو سمجھتے تھے، وہ ملک کے پسینے، اس کی بے مثال خوبصورتی اور اس کی خوشبو کو بھی جانتے تھے۔

دوسری طرف جناح اپنے بچپن میں کئی بار اپنی جڑوں سے اکھڑے اور بار بار انہیں جگہ بدلنی پڑی۔ شاید اسی لئے وہ آسانی سے خود کو اس سے جوڑ نہیں پاتے تھے۔ اس کے علاوہ قانون کا ماہر ہونے کی وجہ سے انہیں ایک الگ راہ پر چلنا زیادہ پسند تھا۔ ان کے لیے وقت کی تبدیلی کے ساتھ دیہاتوں کی دھول بھری راہوں کے لئے خود کو ڈھالنا آسان نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی کے لوٹنے پر وہ ان کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے 1920 کے قریب آتے آتے قومی سطح پر اپنی حیثیت کو برقرار رکھنا ان کے لئے بہت مشکل ہونے لگا۔ ساتھ ہی ایسا کوئی علاقہ بھی نہیں تھا، نہ اس وقت اور نہ بعد میں، جس پر وہ مکمل طور پر انحصار کر پاتے، جو صرف ان کا اپنا مرکز ہوتا۔ عام لوگوں سے جوڑنے والی سیاست اختیار نہ کر پانے کی ان کی کمزوری ان کے لئے ہمیشہ مسئلہ بنی رہی۔ اس کے ساتھ یہ بھی قبول کرنا ہوگا کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے قومی سطح پر ان کی حالت کمزور ہو جاتی تھی، کیوں کہ قوم پرستانہ سیاست کی بھیڑ میں ان دنوں پہلے سے ہی بہت لوگ شامل تھے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کے لئے جگہ ضرور تھی لیکن دوسری صف میں تھی۔ جناح کے لئے دوسری صف میں سیاست کرنا بے حد مشکل تھا۔ انہوں نے ہمیشہ مرکزی کردار ادا کرنے کی خواہش کی تھی۔ عموماً انہیں یہ حاصل بھی ہوا لیکن اب وہ ایسا کس طرح کر پاتے کیوں کہ کئی وجوہات انہیں مسلسل باہر کی طرف ڈھکیلتی جا رہی تھیں۔

سروجنی نائڈو، جناح سے ہوئی اس ملاقات کا ذکر کرتی ہیں جب وہ ہندوستانی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ملاقات 1906 میں کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں ہوئی تھی۔ یہ وہی سال تھا جب ڈھاکا میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس وقت جناح پہلے سے ہی دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ جناح کو 1906 میں ایک ابھرتے نوجوان وکیل اور ایک ہونہار سیاست داں کے روپ میں دیکھا گیا۔ وہ اپنے بل بوتے پر تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ بعد ازاں جناح نے کئی برسوں تک مسلسل کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں حصہ لیا۔ مسلم مفاد سے جڑے دو معاملات پر جناح نے کلکتہ کے کانگریس سیشن میں مداخلت بھی کی کیوں کہ وہ ایک مسلم نمائندے تو تھے ہی اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ ان کی پہلی مداخلت وقف علی الاولاد 30 کے بارے میں اور دوسری ریزولیشن کے بارے میں تھی۔ بلاشبہ انہوں نے مسلمانوں کے حق کے لئے دلیلیں پیش کیں لیکن ساتھ ہی کانگریس پلیٹ

فارم کے استعمال اور وہ بھی ہندوؤں پر زور دیا۔ 31 ان کے ذریعہ پیش یہ ترامیم کانگریس کے اجلاس میں قبول کر لی گئی۔

انہوں نے اکتوبر 1906 میں ایک اور مستحکم سیاسی قدم اٹھایا۔ آغا خاں کی قیادت میں وائسرائے سے ملنے والے پارٹی کے وفد پر انہوں نے سوال کھڑا کر دیا 32 ان کا خیال تھا کہ کانگریس مسلمانوں کی کم نمائندگی نہیں کرتی بلکہ حقیقتاً کانگریس ہی ان دنوں ملک میں کی سیاسی آواز تھی 33۔ انہوں نے بمبئی پریسڈینسی ایسوسی ایشن کی طرف سے لارڈ منٹو کو بھیجے گئے میمورنڈم (گجراتی میں جناح کا خط، 7 اکتوبر 1906) میں مسلمانوں کے لئے علاحدہ حلقہ انتخاب بنائے جانے کی مانگ کی بھی مخالفت کی تھی 34۔

جناح نے آغا خاں کی زندگی بھر مخالفت کی۔ آغا خاں نے علاحدہ حلقہ انتخاب نظام پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ "1906 میں ہمارا سب سے کٹر مخالف کون تھا؟ بمبئی کا ایک معروف بیرسٹر جناح جن سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رہے لیکن اس مسئلہ پر جو کچھ میں نے اور میرے دوستوں نے کیا ہے اور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس پر انہوں نے سخت ردعمل ظاہر کیا ہے۔ اس طرح کا اظہار کرنے والے وہ ایک تنہا معروف مسلمان تھے لیکن ان کی مخالفت میں کوئی کینہ پروری چھپی نہیں تھی۔ ان کا راست یہ کہنا تھا کہ ہمارے علاحدہ حلقہ انتخاب نظم کا اصول ملک کو اپنے ہی خلاف تقسیم کر رہا ہے اور تقریباً 25 سال تک وہ ہمارے اوپر سخت تنقید کرنے والے اور مخالف بنے رہے۔" 35

جناح نے 20 فروری 1909 کو ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں واضح طور پر الگ رخ اپنا لیا۔ انہوں نے (پہلی بار) یہ قبول کیا کہ "مسلمانوں کو نئے نئی اصلاحات میں ایک حقیقی اور اہم نمائندگی پانے کا حق ہے 36 لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کس طرح کیا جانا چاہئے؟ کیا دیہی بورڈوں سے لے کر وائسرائے کونسل تک بھی سطح پر علاحدہ حلقہ انتخاب ہونے چاہئیں؟ یا اس سے کچھ اور کم اور اگر کم تو کس سطح تک؟ آبادی کے حساب سے مسلمان تقریباً 25 فیصد نمائندگی کے حقدار ہوں گے؛ لیکن اگر حصہ بڑھا کر ایک تہائی کے برابر کر دیا جائے تو فرقہ کی نمائندگی کا یہ پورا مسئلہ ہی نپٹ سکتا ہے۔ 37 جناح کا یہ کہنا تھا کہ 'ورنہ ریزرویشن کو برقرار رکھنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے'۔ اس کے ساتھ 13 اگست 1909 کو بمبئی میں مسلمانوں کی ایک میٹنگ میں جناح نے کامیابی سے تجویز رکھی کہ اگر بمبئی قانون ساز اسمبلی میں مسلمان نمائندگی کے لئے علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعہ انتخاب یا نامزدگی جیسی دو صورتیں ہوں تو پہلے کو ترجیح دی جانی چاہئے۔

اس حساس موضوع پر وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہی سہی ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ الہ آباد میں 26 سے 29 دسمبر 1910 تک ہوئے کانگرس کے 25 ویں اجلاس میں جناح کے رویہ کی اس تبدیلی اور کانگرس کے ساتھ ان کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو صاف ظاہر کر دیا۔ اس وقت تک علاحدہ حلقہ انتخاب کے موضوع پر ان کے اپنے خیالات اپنے ہم مذہبوں کی اکثریت کے خیالات سے پوری طرح الگ نہیں رہ گئے تھے اگرچہ کبھی کچھ کانگرس لیڈروں کے دباؤ میں آ کر

انہوں نے ایک تجویز ضرور پیش کی تھی جسے اتفاق رائے سے پاس بھی کر دیا گیا تھا کہ '' کانگرس علاحدہ حلقہ انتخاب کی توسیع میونسپلٹیز۔ ڈسٹرکٹ بورڈ یا دیگر مقامی اداروں تک بڑھانے یا ان میں اسے لاگو کرنے کی سخت مذمت کرتی ہے''۔ لیکن یہ تجویز رکھتے ہوئے وہ یقینی طور پر اپنے مزاج کے خلاف ایک جھجک لئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا'' میں اس پر کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن کانگرس کے کسی سینئر لیڈروں کی خواہش پر میں آپ کے سامنے یہ تجویز رکھنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں''۔ لیکن علاحدہ حلقہ انتخاب کے مخالف تو بنے ہی رہے۔ یہ بات 1913 میں مسلم لیگ کے آگرہ اجلاس میں ان کی تنقیدوں سے اور واضح ہو جاتی ہے جس میں جناح نے کہا کہ '' خصوصی نمائندگی'' یا علاحدہ حلقہ انتخاب'' لوگوں کو'' دو ایک دم علاحدہ خانوں'' میں تقسیم کر دے گا۔ 39 ان کے سامنے بھی ایک حقیقی مسئلہ تھا جسے سلجھانا حقیقتاً بہت دقت طلب تھا۔ وہ ایک اقلیتی گروپ کے روپ میں، مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے، آئینی تحفظ کے خلاف نہیں تھے وہ کبھی بھی اس بات کی وکالت نہیں کرتے تھے کہ مسلم لیگ کا مقصد'' ہندوستان کی حقیقت کے مطابق'' خود حکومتی کا حصول ہونا چاہئے۔ ان کی پریشانی یہی تھی کہ کس طرح اپنے یقین اور اپنے مزاج کے وفادار رہیں اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے مفاد اور اپنے حامی حلقہ کے لئے بھی سچے رہیں جو لازمی طور پر مسلمان تھا۔

جناح 1910 کے موسم بہار میں بمبئی پریسیڈینسی کے مسلمانوں کے ذریعہ وائسرائے کی قانون ساز کونسل میں مسلمان نمائندے کے طور پر منتخب ہوئے۔ انہوں نے اس کے لئے بمبئی مسلم لیگ کے صدر مولانا رفیع الدین کو شکست دی تھی۔ انتخاب کے ایک ماہ بعد ہی اس کونسل میں جناح کا وائسرائے لارڈ منٹو سے ٹکراؤ ہو گیا۔ زبانی تنازعہ عیتال کے ٹھیکہ مزدوروں پر ایک تجویز کو لے کر ہوا۔ جناح نے کہا کہ'' ساؤتھ افریقہ میں قیام پذیر ہندوستانیوں کے ساتھ کئے جا رہے سخت، ظالمانہ اور بے رحمانہ رویہ نے ملک کے سبھی فرقوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے اور ان میں غم و غصہ اور دہشت انتہا تک پہنچ گئی ہے''40۔ لارڈ منٹو نے اعتراض کیا کہ'' بے رحمی تو ایک بہت سخت لفظ ہے''۔ اس پر جناح اٹھے اور جواب دیا'' عزت مآب، میں سمجھتا ہوں مجھے اور سخت الفاظ کا استعمال کرنا چاہئے تھا لیکن میں اس کونسل کے آئین سے بخوبی واقف ہوں، اس لئے میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کی حدود سے باہر نہیں جانا چاہتا لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ کیا گیا سلوک اتنا سخت ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا'' ملک میں اس کے خلاف یکساں جذبات ہیں''41۔ یہ غیر معمولی بات تھی کیوں کہ غالباً پہلی بار وائسرائے کے سامنے حکومت پر تنقید اتنے واضح الفاظ میں کی گئی تھی۔

جناح کے اوپر وہ دباؤ نہیں تھا جو فرقہ وارانہ بنیادوں پر منتخب ہونے والے ان کے شمالی ہندوستان کے ساتھیوں کے اوپر تھا۔ بمبئی میں ووٹ دینے کا حق رکھنے والے دولت مند مسلمان ہر بات کو اسلام کے تناظر میں دیکھنے کے عادی نہیں تھے۔ اسی لئے جناح بمبئی میں اپنے حلقہ انتخاب سے بار بار منتخب ہوتے رہے۔ چند رکاوٹوں کو چھوڑ دیں تو اپنے حلقہ انتخاب کے ساتھ ان کی طویل وابستگی ملک کی تقسیم تک چلی اور ان رائے دہندگی کے پیچھے صرف مسلمان ووٹوں کی طاقت ہی نہیں تھی،

خاصی تعداد میں پارسی اور ہندو بھی انہیں ووٹ دیتے تھے۔ وائسرائے کی کونسل میں جناح خود کو اس دور کی کچھ مشہور ہستیوں اور کانگریسی ساتھیوں جیسے بھوپیندر ناتھ باسو، ڈنشا واچہ، شری نواس شاستری، مظہر الحق، تیج بہادر سپرو اور مدن موہن مالویہ کے درمیان پاتے تھے۔ علاوہ ازیں راجہ محمود آباد یا سر علی امام، کے ساتھ بھی جناح نے قریبی تعلقات بنا لئے تھے جب کہ ان کے سیاسی نظریات الگ تھے۔

کونسل میں ہر لبرل اور قومی مفاد کے معاملے میں وہ مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے جیسے گوکھلے ابتدائی تعلیم بل (1912) یا بعد میں پرائمری ایجوکیشن بل (1917) اور خصوصاً 'اسپیشل میرج بل'42 کی بھی انہوں نے حمایت کی جس کی اس وقت کے پس ماندہ ذہن کے ہندوستان نے سخت مخالفت کی تھی۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو نئے نئے مواقع حاصل ہوتے رہیں جیسے انڈین سول سروسیز امتحان کو ہندوستان اور انگلینڈ میں ایک ساتھ کرانے کا مطالبہ (1917) جو ان میں سے صرف ایک مثال ہے۔

جناح نے 1911 اور 1912 کے کانگرس اجلاسوں میں حصہ نہیں لیا جب کہ وہیں مسلم لیگ کے 1910 اور 1912 کے اجلاس میں وہ موجود تھے، حالاں کہ تب تک وہ اس کے باضابطہ ممبر نہیں تھے۔ یہ وہی وقت تھا جب ان کا دھیان مسلم وقف کے معاملات پر لگا ہوا تھا اور انہوں نے لیگ پر ایسا خاص اثر ڈالا کہ وہ رکن بنے بغیر بھی اس کے آئین کو تبدیل کرانے میں کامیاب رہے اور اس بات نے آخر کار 1913 میں ان کے مسلم لیگ میں شامل ہونے کی راہ ہموار کر دی۔43

انہیں بانکی پور میں 31 دسمبر 1912 کو ہونے والی مسلم لیگ کونسل کے جلسے میں رسمی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس وقت تک وہ کانگریس پارٹی کے ممبر تھے۔ آغا خاں کی صدارت میں ہوئی اس میٹنگ میں مسلم لیگ کے مقاصد کو طے کرتے ہوئے ایک تجویز منظور کی گئی۔ اس تجویز کی دفعہ چار میں "ہندوستان کے لیے موزوں خود حکومتی کے نظم کو حاصل کرنا شامل تھا" جو مسلم لیگ کے مقاصد میں سے ایک ہوگا۔ مظہر الحق گروپ کے ایک رکن نے "ہندوستان کے لیے موزوں خود حکومتی" جیسے الفاظ کے استعمال پر اعتراض کیا تھا لیکن جناح نے تجویز کے بنیادی ڈھانچے کا مستحکم انداز میں دفاع کیا۔ جناح نے اس بات کے لئے لیگ کی تعریف کی کہ اس نے فرقے کے سامنے درست مثال پیش کی ہے۔ وہ بھلے ہی کانگریس کے ممبر تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ کانگریس اس معاملے میں غلطی پر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس معاملے میں کانگریس سے ایک قدم آگے ہونے کے لئے لیگ مبارکباد کی مستحق ہے۔ لیگ کے آئین اور حکومت کی طرف جھکاؤ میں تبدیلی اور اس کی طرف سے خود حکومتی کا مطالبہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ جناح کو مسلم لیگ کے پرانے جید لیڈروں جیسے نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین اور نواب عبداللہ خاں44 کے خلاف سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ لیکن جناح کے راجہ محمود آباد اور سید وزیر حسن جیسے حمایتی تھے۔ آغا خاں کا الگ رہنا بھی ان کے لئے فائدے مند ثابت ہوا۔ حکومت واضح طور پر ان واقعات سے ناخوش تھی اور اس نے لیگ کے لیڈروں کو اس تبدیلی کی مخالفت کرنے کے لئے تیار کرنے کی بہت کوشش کی۔ جناح اور ان کے گروپ نے جو حاصل کیا

تھا اسے برباد کرنے کی کوشش اس وقت کے متحدہ صوبہ جات کے لیفٹننٹ گورنر سر جیمس میسٹن اور وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر سر ہرکورٹ بٹلر نے کی تھی لیکن تب تک کل ہند سطح پر ابھرنا جناح کی تقدیر بن چکی تھی۔ 45

اپریل 1913 میں جناح، گوکھلے کے ساتھ برطانیہ چلے گئے۔ وہاں کے قیام نے 6 ماہ کے لئے انہیں ہندوستان سے باہر رکھا۔ ان کے اسی قیام کے دوران مشہور کانپور مسجد سانحہ ہوگیا۔ شہر میں فساد ہوا اور اس کی آگ کانپور کے باہر بھی پھیل گئی۔ تحریک کے لیڈروں نے محمد علی اور وزیر حسن کو انگلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ سکریٹری آف اسٹیٹ اور حکومت برطانیہ کے سامنے مسلمانوں کا معاملہ رکھا جاسکے۔ 46 محمد علی جوہر نے اپنی روانگی سے قبل انگلینڈ میں جناح کی حمایت حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ 47 جناح نے 'ہندوستانی اتحاد' کے ایک وسیع مقصد کے حق میں حامی بھر لی۔ انہوں نے سیکریٹری آف اسٹیٹ کے ہندوستانی وفد سے ملاقات سے منع کردینے پر ان کی (سکریٹری آف اسٹیٹ) مذمت بھی کی۔ واپس آنے پر جناح نے انجمن اسلام کے ساتھ مذاکرات بھی کئے جس نے وفد کی واپسی پر اس کے استقبال کے لئے ایک جلسے کا انعقاد کیا تھا۔ 48 جناح اب تک مکمل طور پر اپنی رو میں آگئے تھے۔ وہ ایک آزاد راستے پر چل رہے تھے۔ ایک کانگریسی لیڈر اور مسلم لیگ کے لیڈر، دونوں ہی روپ میں وہ کافی مشہور بھی ہو چکے تھے۔ اس وقت وہ نہ صرف لیگ اور کانگریس کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کے لئے کام کر رہے تھے بلکہ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔ سیاست کے اس دور میں سبھی گروپ اعتدال پسندوں، مسلمان، انتہا پسند، ہندو اور پارسی اور دیگر بھی ان کو تسلیم کرنے لگے تھے۔

کانگریس اور مسلم لیگ-دونوں کے ساتھ

لندن سے واپسی سے کچھ ہی دنوں پہلے، 1913 کے اواخر میں، لیگ کے کئی دوستوں کے اصرار پر جناح، آل انڈیا مسلم لیگ میں رسمی طور پر شامل ہونے پر تیار ہوگئے۔ یہ ایک عجیب سی دوہری نمائندگی تھی جس پر سوال اٹھاتے ہوئے سروجنی نائیڈو نے تبصرہ بھی کیا تھا۔ اس پر جناح کے احترام و عزت کے دفاع میں ان کے حامیوں نے ان کے حق میں آواز اٹھائی اور ایک وعدہ بھی کیا کہ "مسلم لیگ اور مسلم مفاد کے تئیں وفاداری سے کسی بھی طرح اور کسی بھی وقت اس وسیع تر قومی مفاد سے بے وفائی کا کوئی سایہ نہیں پڑے گا جس کے لئے ان کی (جناح کی) زندگی وقف ہے۔" 49

اس لئے ہندوستان لوٹنے پر جناح نے سب سے پہلا کام کانگریس کے 28 ویں اجلاس میں حصہ لینے کا کیا۔ اسکے لئے وہ (13 دسمبر 1913) کراچی پہنچے اور وہاں سے سیدھے آگرہ گئے، جہاں انہیں مسلم لیگ کے ساتویں اجلاس (28-26 دسمبر) میں شرکت کرنی تھی۔ غالباً وہ پہلے لیڈر رہے تھے جنھوں نے کونسل اصلاحات کے لیے ایک ہی تجویز کانگریس کے کراچی اجلاس اور آگرہ میں لیگ کے اجلاس میں پیش کی اور ان کے کہنے پر ہی کانگریس نے ایک تجویز منظور کی جس میں لندن میں سیکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کے امور اور ڈھانچے میں تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیگ کے اجلاس

میں فرقہ وارانہ نمائندگی کی طرف دھیان دلانے والی ایک تجویز غصہ کی شدت سے بھری بحث میں تبدیل ہوگئی۔ یہ تجویز مولوی رفیع الدین نے پیش کی تھی اور انہوں نے گزارش کی تھی کہ اس تجویز کو بغیر لمبی بحث مباحثہ کے منظور کرلیا جائے کیوں کہ گذشتہ چھ برسوں میں ہر برس یعنی لیگ کی تقریباً ہر اجلاس میں اسے اتفاق رائے سے قبول کیا جاتا رہا ہے۔ تجویز میں کہا گیا تھا کہ ''مسلمان فرقہ کے حق میں یہ بہت ضروری ہے کہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے اصول کو بھی مقامی اداروں تک پھیلادیا جانا چاہئے۔ لیگ بہ احترام گزارش کرتی ہے کہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کی ضروری اور موثر نمائندگی کا انتظام مرکزی اور صوبائی قانون ساز کونسل میں اس اصول پر عمل کا ہی نتیجہ ہے اور ساتھ ہی ان اداروں کی کامیاب کارکردگی کے لئے بھی لازمی ہے۔''

اس اندیشے سے کہ اس طرح کی تجویز ہندو مسلم اتحاد کے مستقبل کو نقصان پہنچا سکتی ہے، محمد علی 50 نے تجویز رکھی کہ مقامی اداروں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے سوال پر غور و خوص ایک سال کے لئے ملتوی کردیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں اتحاد ہندوستان کے حق میں اچھا ہوگا۔ انہوں نے زور دیا کہ اس سے پہلے ''ہندوؤں نے ہمیشہ الگ نمائندگی کی مخالفت کی ہے لیکن اس برس کانگرس نے مسلمانوں کا خیال کرتے ہوئے اس کی مخالفت نہیں کی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو ضرور دکھانا چاہئے کہ وہ بھی ہندوؤں سے ملاپ کے لئے آگے بڑھنے کو تیار ہیں۔'' 51 اس تجویز پر محمد علی کو جناح کی مکمل حمایت حاصل ہوئی۔ جناح نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ''اس سوال پر برہمی کو چھوڑ کر غور کریں اور اسے حال کے فائدے کے بجائے مستقبل کے فائدے کی نظر سے دیکھیں۔'' انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو خبردار کیا کہ ''خصوصی نمائندگی کا مطالبہ کرکے وہ صرف دو، ایک الگ الگ خانے ہی حاصل کریں گے اور کچھ نہیں۔'' آغا خاں نے بھی محمد علی اور جناح کے اس اقدام کی حمایت کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیوں کہ ان کی تجویز خارج ہوگئی اور بنیادی طور پر مولوی رفیع الدین کی قرارداد کو ہی قبول کیا گیا۔

وائسرائے کونسل میں اپنے تین سال مکمل کرلینے پر جناح وہاں بھی کام کے طریقہ کی سست رفتاری سے غیر مطمئن تھے۔ حکومت کے ممبران جذباتی تقاریر کو پُرسکون انداز میں سنتے لیکن اس کے علاوہ وہ کچھ اور کرنے کی خواہش نہیں ظاہر کرتے کیوں کہ اس کی ضرورت تو تھی ہی نہیں۔ ساتھ ہی کونسل کے پاس اتنے حقوق نہیں تھے اور یہ بھی کہ کونسل کی ساخت ایسی تھی کہ غیر سرکاری ممبر ہمیشہ اقلیت میں ہوتے تھے۔ ان کے حقوق، بجٹ پر بحث کے دوران حکومت کی اجازت کے بعد بولنے، سوالات پوچھنے اور پرائیویٹ ممبر بل پیش کرنے تک ہی محدود تھے۔ تب تک مایوسی کے شکار جناح نے طے کیا کہ وہ آنے والے انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے، حالاں کہ وائسرائے نے انہیں 1913 کے اجلاس کے لیے نامزد کردیا تھا تاکہ وہ ''مسلم وقف ویلیڈیٹنگ ایکٹ'' پیش کرسکیں۔ لیکن اس کے بعد 1915 تک وہ منتخب ممبر کے روپ میں اس کونسل میں نہیں بیٹھے۔ آگے چل کر ان کا دل اس طرف سے پھر گیا اور وہ کونسل کے باہر اصلاح کے لئے کام کرنے میں لگ گئے۔ وہ یہ کام نہ صرف کانگریس کے پلیٹ فارم سے بلکہ لیگ کے پلیٹ فارم سے بھی کررہے تھے۔ ویسے جب لیگ کا کام آگے

بڑھا تو جناح نے اس تنظیم کے دائرے کو بہت تنگ وار غیرواضح قرار دیا تب تک لیگ کے ہیڈ کوارٹر لکھنؤ میں راجہ محمود آباد جیسے ہم خیال لوگوں کا گروپ ابھر چکا تھا اور اس گروپ نے جناح کو اپنی اس پالیسی پر عمل درآمد کرنے میں کافی مدد کی تھی۔ راجہ صاحب وکے ساتھ تو وہ وائسرائے کی کونسل میں کام کر چکے تھے۔ اس گروپ میں لیگ کے سیکریٹری وزیر حسن، سید نبی اللہ اور سمیع اللہ بیگ شامل تھے۔ اس میں راجہ محمود آباد کو چھوڑ کر باقی افراد وکیل تھے اور اپنے اپنے پیشہ میں کامیاب تھے۔ اس لئے ان کے سیاسی خیالات جناح سے ملتے جلتے تھے لیکن جناح سے الگ یہ لوگ صوبائی سطح پر ہی اصلاح کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس وقت انہیں احساس ہوا کہ انہیں صوبائی مطالبات کو ہی منوانے میں کامیابی مل سکتی تھی اور وہ بھی تب جب ان مطالبات کو ایک ''قومی چھتری'' کے تلے پیش کیا جائے۔ لیگ کے سیکریٹری وزیر حسن نے 1912 میں لیگ کے اصولوں کو نئی شکل دی۔ انہوں نے ہی راجہ محمود آباد کی مدد سے آنے والے برسوں میں لیگ کو ایک مشکل راستے پر، بڑی ہوشیاری اور کامیابی سے آگے بڑھایا اور اس طرح لیگ کو قومی سیاست کے مرکز میں بنائے رکھا۔ یوپی میں لیگ کی لکھنؤ قیادت کو بہت عزت نہیں تھی اور کانگریس کے ساتھ تعاون کی وکالت کو بہت سے لوگوں نے لیگ کی کمزوری، خودسپردگی اور یہاں تک کہ خودکشی کی شکل میں بھی دیکھا۔

1909 کے کونسل اصلاحات میں حقوق رائے دہندگی کا دائرہ بڑھایا گیا تھا جس کے نتیجہ میں منتخب ممبران کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ اس وجہ سے بڑی تعداد میں مقامی شکایتیں سامنے آنے لگیں، وہ بھی اتنی زیادہ تعداد میں جتنی پہلے کبھی نہیں آئی تھیں اور نہ ہی اس کا تصور کیا گیا تھا۔ اب تعلیم یافتہ، پیشہ ور اور بیباک لوگ اپنی حالت سدھارنے کے لیے سیاست میں زیادہ منصوبہ بند طریقہ سے آنے لگے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ صوبائی کونسل کے انتخابات، میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبروں کے ووٹوں پر زیادہ منحصر ہو گئے تھے جس کی وجہ سے مقامی اداروں کے عہدوں کے لئے مقابلہ بڑھ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گروپ بندی زیادہ بڑھ گئی اور بڑھ کر فرقہ وارانہ شکل اختیار کر گئی۔ جس کے بعد فرقہ واریت کا جنم ہوا اور ہندو مسلم تقسیم پیدا ہوئی۔ یہ سب عام حلقہ انتخاب کے باوجود ہوا۔ اپنے گروپ کے اندر اصلاحات کے لیے جناح کی کوششوں نے انہیں صوبائی بنام کل ہند مفاد اور سیاست کے مشکل جال میں الجھا دیا۔ یہ گتھی تقسیم تک بھی نہیں سلجھ سکی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بعد بھی برقرار رہی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ جناح کا دائرہ قومی تھا، وہ ایک کل ہند سطح کے لیڈر تھے اور اسی طرح اپنی آواز رکھنا اور اقتدار کو حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن بغیر صوبائی سطح کی سیاسی پیچیدگی میں پڑے، اور یہ ممکن نہیں تھا۔

914ا تک ایک کل ہند پیمانے کے مشہور لیڈر کے طور پر جناح کی حیثیت پوری طرح قائم ہو چکی تھی۔ تلک قید کی سزا پوری کر کے مانڈلے سے ہندوستان لوٹ آئے تھے۔ گاندھی جی بھی اسی وقت ہندوستان لوٹ رہے تھے۔ اس مقام پر جناح کے سامنے نہ صرف اعتدال پسندوں، انتہا پسندوں کے درمیان بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ بھی اتحاد قائم کرنے کا چیلنج تھا۔ اس لئے انہوں نے گوکھلے اور تلک کے تعلقات استوار کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ جناح نے گوکھلے کے ساتھ مل کر ایسا مشترکہ آئینی فارمولا بنانے کی کوشش کی جس کے لئے ہندوستان کی سبھی سیاسی طاقتیں متحد

ہو جائیں۔ گو کھلے نے بھی اس کے لیے ایسی ہی تجویز رکھی لیکن یہ سب صرف مسودے کی ہی شکل میں تھا اور اس کے بعد فروری 1915 میں بدقسمتی سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس 'فارمولے' کو اگست 1917 میں آغا خاں نے لندن میں عام کیا۔ 'گو کھلے منصوبہ' کے نام سے پیش کئے گئے اس فارمولے میں ہر صوبے کے لئے ایک گورنر اور کابینہ میں تین ہندوستانی اور تین تین یوروپی یعنی کل 6 ممبروں کی تجویز تھی اور منتظمہ کو قانون سازیہ کو جواب دہ بنایا گیا تھا۔ ساتھ ہی ایڈمنسٹریٹو سروسز کو صوبوں میں مرکوز کرنے کی بات تھی۔ وائسرائے اور کونسل کو برائے نام کنٹرول دیا گیا تھا۔ جناح نے اس فارمولے کے حق میں بھی سیاسی طاقتوں کو راضی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹھیک انہیں دنوں اچانک گوپال کرشن گو کھلے کی موت سے انہیں ایک بڑا دھچکا لگا۔ 52 انہیں دنوں 'خلیفہ' کے عہدے کو ختم کئے جانے سے ایک نیا چیلنج سامنے آ گیا۔ ایسے وقت میں جناح کل ہند سطح کے شاید پہلے ایسے لیڈر تھے جنہوں نے انگریزوں کو خلیفہ کی حیثیت کم کرنے کے لئے سخت نتائج کے بارے میں انتباہ کیا تھا۔ ان دنوں یعنی دسمبر 1916 میں جناح مسلم لیگ کے صدر تھے اور 1919 میں انہوں نے ڈیویڈ لائڈ جارج کے سامنے اپنا یہ انتباہ دہرایا اور اس اقدام پر ہندوستانی مسلمانوں کے متوقع ردعمل کے بارے میں انہیں ہوشیار بھی کیا۔ وائسرائے لارڈ چیمس فورڈ سے جنوری 1920 میں ملنے والے خلافت وفد میں جناح بھی شامل تھے۔ جب مارچ 1920 میں خلافت کانفرنس نے انگلینڈ میں وزیر اعظم سے ملنے کے لئے ایک وفد بھیجا تو اسے بے عزت کر دیا گیا۔ اس کے بعد 15 مئی 1920 میں 'سیورس کا معاہدہ' (Treaty of Severs) ہوا جس میں سلطنت عثمانیہ میں تقسیم کرنے کی تجویز تھی۔ خوش قسمتی سے یا اسے بدقسمتی کہیں کہ اس کے 12 دنوں بعد اپریل 1919 میں پنجاب میں ہونے والے خلفشار سے متعلق ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ بھی عام کی گئی۔ ڈاکٹر کو بہت سستے میں چھوڑ دیا گیا۔ ترکی کا اقتدار بکھر ہی رہا تھا۔ ان دونوں باتوں سے عوام میں بے چینی پیدا ہوئی اور اس کے ردعمل میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ستمبر 1920 میں کلکتہ میں اپنے خصوصی اجلاس طلب کئے۔ 53

کلکتہ میں لیگ کے اس خصوصی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے 7 ستمبر 1920 کو جناح نے ہاؤس آف لارڈز میں ڈائر کی حمایت میں منظور تجویز کی سخت مذمت کی۔ چیمبر کے ممبران کا ذکر کرتے ہوئے جناح نے انہیں "انگلینڈ کا بے دماغ اشرافیہ" قرار دیا۔ انہوں نے انگریزوں کو اس کے نتائج کے لئے بھی انتباہ دیا اور کہا کہ انگریز حکومت کا ایسا رویہ انہیں عدم تعاون کے راستے کو چننے کے لئے مجبور کرے گا، حالاں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کا عدم تعاون گاندھی جیسا ہی ہو۔

کانگریس کے خصوصی اجلاس میں گاندھی کی 'عدم تعاون' تجویز پر ان کی حمایت کرنے والے واحد ممتاز لیڈر موتی لال نہرو تھے۔ لالہ لاجپت رائے، سی-آر-داس، بپن چندر پال، اینی بیسنٹ، مالویہ اور جناح بھی گاندھی کے اس قدم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن گاندھی اپنی جگہ سختی سے ڈٹے رہے اور کلکتہ میں اس خصوصی اجلاس سے کانگریس سیاست میں گاندھی دور کی ابتدا ہوئی ہے۔ 54 گاندھی کے ذریعہ عدم تعاون کی یہ تجویز 884 کے مقابلے 1986 ووٹوں سے منظور ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ گاندھی اور جناح کے درمیان ٹکراؤ اب صرف وقت کی بات ہی رہ گئی تھی اور 3 اکتوبر 1920 کو

یہ پھر ہو ہی گیا۔ مسز اینی بیسنٹ نے 'ہوم رول لیگ' کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور گاندھی اس کے نئے صدر کا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ کانگرس نے حال میں ہی جو پروگرام شروع کئے تھے، ہوم رول لیگ کے مقاصد کو بھی ان کے مطابق کرنے کے لئے گاندھی اس تنظیم کے اصولوں اور نام کو بھی تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ جناح نے اس فارمولے پر گاندھی کی مخالفت کی لیکن مخالفت بے کار گئی اور اس کی کے ردعمل میں جناح نے بھی ہوم رول لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔55

ناگپور میں 26 سے 31 دسمبر 1920 تک منعقدہ کانگرس کے 35ویں اجلاس میں کانگرس نے اپنے اصولوں میں تبدیلی کی توثیق کی صرف جناح ہی اس کی حمایت میں نہیں تھے۔ انہوں نے اسٹیج پر جاکر اصولوں میں تبدیلی کی اور عدم تعاون سے متعلق تجاویز کی مخالفت کی۔ ان کی مخالفت اس بات پر تھی کہ 'سوراج' کے کا معاملے کی وضاحت نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی اس کا مقصد صاف ہے۔ ان کے خیال میں خودحکومتی کے حصول کے ایک ایک ہتھیار کے روپ میں عدم تعاون، سیاسی شکل میں تو کمزور ہے ہی اور بے وجہ بھی ہے۔ انہیں دنوں ناگپور میں ایم-اے انصاری کی صدارت میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں منظور ایک تجویز نے بھی عدم تعاون کے لئے لیگ کی حمایت کی تصدیق کر دی۔ ساتھ ہی ایک دوسری قرارداد میں ناگپور کانگرس اجلاس میں اصولوں میں کی گئی تبدیلی کی بھی حمایت کی۔ اس طرح سبھی کی منظوری سے اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر شخص گاندھی کی حمایت کر رہا ہو۔ جناح نے محسوس کیا کہ وقت ان کے ساتھ نہیں ہے اس لئے انہوں نے اسی دن ناگپور چھوڑ دیا۔56

1921 میں کانگرس کا احمدآباد اجلاس گاندھی کی مکمل قیادت میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ اس اجلاس میں نمائندوں کے لئے کرسیوں یا میزوں کا نظم نہیں تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ سبھی نمائندے زمین پر بیٹھیں گے۔ لوگوں نے اجتماعی طور پر پہلی بار کھدر پہنا تھا اور سبھی نمائندوں کو کھدر کے خیموں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ سب کو اس دوران چرخے پر سوت کاتنا تھا۔ جناح بھی احمدآباد میں تھے مگر آخری بار کانگریس کے اجلاس میں شرکت کر رہے تھے۔ وہ وہاں کالر، ٹائی کے ساتھ غیر ملکی کپڑوں میں ملبوس واحد ممبر تھے انہوں نے چرخے پر سوت کاتنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔57

1912 سے 1918 تک چھ سالوں کے لیے جناح اور لکھنؤ کے سیاست دانوں نے کانگریس کے ساتھ تعاون کی پالیسی کے تحت کام کیا، لیکن اس دوران مقامی تنازعات کے سبب ان کی ان کوششوں کو دھکا ہی لگا۔ یوپی میں 1913 میں لیگ کے آگرہ اجلاس میں جناح اور مظہرالحق نے لیگ کو اس بات کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی کہ وہ مقامی حکومت میں ہمیشہ کی طرح علیحدہ حلقۂ انتخاب کی تجویز منظور نہ کرے لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یوپی کے میونسپل سیاست دانوں نے اسے مسترد کر دیا۔ دو سال بعد 1915 میں جب کانگریس اور مسلم لیگ دونوں پہلی بار بمبئی شہر میں اپنے اجلاس منعقد کر رہی تھیں، اس وقت بھی مقامی جھگڑوں نے اصلاحات کے موضوع پر متحدہ نقطۂ نظر کے امکانات کو تقریباً تباہ ہی کر دیا تھا۔ جناح اور ان کے حامیوں نے حاجی قاسم میٹھا58 اور ان کے پٹھوؤں سے بچتے ہوئے خود کو تاج محل ہوٹل میں بند کر کے تنہائی میں

اجلاس کا انعقاد کیا۔ 1915 اور 1916 میں جب یو پی میونسپل بل پیش ہوا تو اس وقت صوبائی مفادات اس لیے پورے ابال پر تھے کہ اس بل میں میونسپلٹیوں کو بڑے پیمانے پر اختیارات سونپے جانے کی بات کہی گئی تھی۔ اس لیے ایک نتیجہ تو فوراً یہ برآمد ہوا کہ فرقہ کی بنیاد پر مطالبات تیز ہونے لگے، کیوں کہ میونسپلٹیوں میں اقتدار پانے کے خواہش مند لوگوں کے لیے اب یہ سب کچھ اپنی دسترس کے بے حد قریب لگنے لگا۔ یہ تو ہونا ہی تھا اور پھر اس بات نے علاحدہ بنام متحدہ مشترکہ حلقہ انتخاب کے مسئلے کو گرما دیا۔ اور پھر یہ سب سے اہم سوال بن گیا۔ صوبائی لیڈروں نے صوبائی سطح پر فائدہ اٹھانے کے لیے مقامی مفادات کو تج دینے کا مشورہ دے دیا اور صوبائی سطح پر ایک فرقہ وارانہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ ان حالات میں ایک بہت مشکل سودا تھا اور جناح قطعی طور پر یو پی میں اس قسم کے فرقہ وارانہ جھگڑوں میں ملوث نہیں تھے اور نہ ہی ملوث ہونا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے 1960ء5 میں لکھنؤ میں قومی سطح پر سمجھوتے کے لیے کوشش ضرور کی۔ ان صوبائی الجھنوں نے ان کی سرگرمیوں کے دائرے کو کافی محدود کر دیا اور اس حد تک، کہ بالآخر علاحدہ حلقہ انتخاب کے بارے میں ان کے خیالات بنیادی طور پر بدل گئے۔ 1913 میں وہ مشترکہ حلقہ انتخاب کے سخت حامی تھے۔ لیکن 1916 آتے آتے انہوں نے کانگریس کے لیڈروں کے سامنے یہ بات کہنی شروع کر دی تھی کہ جب تک علاحدہ حلقہ انتخاب کا مسلمانوں کا مطالبہ نہیں مانا جاتا، وقت تک کسی بھی سمجھوتے تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ ایک یہی سے جناح 'مسلم قائد' کی شکل میں ابھرنے لگے۔ اس تبدیلی میں ملک کی اس وقت کے سیاسی حقائق، ان کے اپنے سیاسی تجربات اور عوام کے درمیان اس وقت کے سیاسی حقائق نے اہم رول ادا کیا۔ جناح کے لئے اس کے کیا معنی تھے؟ سب سے پہلے تو ایک بڑی ذاتی ناامیدی، کیوں کہ 1916 لکھنؤ سمجھوتے میں ہندو مسلم تعاون کی پالیسی کو انہوں نے ہی متعین کیا تھا۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جناح کے لئے نقطہ نظر سے کل ہند سطح پر سودے بازی کی ان کی صلاحیت اور تیز ہو گئی لیکن یہ صلاحیت ایک 'مسلمان' کی شکل میں تھی نہ کہ 'ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی شکل میں۔ پھر بھی متضاد بات یہ تھی کہ اس صورت حال کو برقرار رکھنے اور کل ہند سطح اصلاحات کے امکانات کو اور مضبوط کرنے کے لئے انہیں صوبائی عزائم رکھنے والے لیڈروں کا تعاون لے کر چلنا تھا۔ صرف اس طرح وہ صوبائی اور قومی دونوں سطحوں پر اصلاحات کی پالیسی اپنا سکتے تھے۔

ان تمام باتوں پر حکومت کا ردعمل کیا تھا؟ مختصراً یہ کہ انگریزوں کے لیے کل ہند سطح پر مضبوطی سے جمے رہنے اور صوبائی سطح صرف کچھ رعایتیں دے دینے کے سوا، مونٹیگ کے سفر ہند 60 تک کانگرس اور لیگ کو ایک ساتھ رہنے میں مدد دینے کے باوجود، جناح کو واقعتاً ذرا بھی سیاسی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اور ایسے میں ان کی مایوسی کا واضح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

7 ستمبر 1918 کو امپیریل قانون ساز کونسل میں ان کی تقریر سے یہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ 'جناب عالی کیا میں جان سکتا ہوں کہ حکومت ہند اتنی پاکباز بنے رہنا کیوں چاہتی ہے کہ اسے چھوا بھی نہ جائے۔ کیا حکومت ہند میں ایسا کوئی محکمہ نہیں ہے جسے قانون سازیہ کے تحت لایا جا سکے۔ میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ان تمام امور پر ایک ساتھ آگے نہیں بڑھا

جا سکتا۔61

ان اصلاحات کے تحت اختیارات کی منتقلی صوبائی سطح پر ہی ہوئی۔ جناح اور ان جیسے پیشہ ور لوگوں وکیلوں اور ڈاکٹروں کی اصلاحات کے لیے محنت کے باوجود انہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے سامراج پہ آنچ آئی تھی کیوں کہ مرکزی سطح پر تفویض اختیارات سے اس کا مرکزی اقتدار کمزور پڑتا تھا۔ دراصل تفویض اختیارات کی شکل اس طرح بنائی گئی تھی کہ پر اس کے نفاذ سے برطانوی حکومت کی طاقت میں اور اضافہ ہو۔ اس کی وجہ سے انگریزوں کے معاونوں، مددگاروں اور حامیوں کو ہی بالخصوص دیہی علاقوں میں فائدہ ہوا۔ اس سے پیدا شدہ مایوسیوں کی وجہ سے مسلم لیگ کے بعض شہری پیشہ وروں جیسے کہ وزیر حسن وغیرہ نے سیاسی زندگی چھوڑ دی اور 1920 کے بعد وہ اپنے قانونی پیشے میں زیادہ مصروف ہو گئے یا پھر تحریک کے راستے پر چلے گئے۔ لیکن اس وقت تک وہ 'تحریک' کے پلیٹ فارم سے بھی محروم ہو چکے گئے۔ اس کے بعد یہ احتجاج کا راستہ صرف کانگرس کے لئے مخصوص ہو گیا اور 1940 کی دہائی سے پہلے تک یہی حالات رہے۔

جناح: آئینی اصلاح پسند

تحریک آزادی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ، جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فرقہ وارانہ یگانگت بڑھی تو آئینی اصلاحات بھی آگے بڑھتے گئے۔ جب ان فرقوں کے درمیان بھائی چارہ موجود ہوتا برطانوی حکومت کی طرف سے اصلاحات خود بخود سامنے آتیں۔ اس کے پس منظر میں انگریزوں کی وہ پریشانی تھی جو ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوتی تھی۔

1919 کی مونٹ فورڈ اصلاحات (مونٹیگ۔چیمس فورڈ اصلاحات) کو جب بالآخر پیش کیا گیا تو دراصل پہلی بار برطانوی سامراج نے اپنے اختیارات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہندوستانیوں کو دے دیا تھا۔ اس میں دوسری باتوں کے علاوہ کانگریس اور لیگ کے ایک ساتھ کھڑے ہونے سے پیدا شدہ دباؤ کا بھی اہم رول تھا۔ اگر ایسا دباؤ نہیں ہوتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انگریز از خود کوئی پہل کرتے۔

مسلم لیگ اور کانگرس کا متحدہ نقطہ نظر قائم کرنے میں جناح کا اہم رول تھا۔ وہ جناح ہی تھے جنہوں نے کانگرس اور لیگ کے مابین نظریاتی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے ہی ان دونوں جماعتوں کو انڈین کونسل میں اصلاحات کی مانگ کے لیے تیار کیا تھا۔ 1913 میں لیگ اور کانگرس، دونوں کے اجلاسوں میں جناح نے ہی کونسل اصلاحات کی تجویز پیش کی۔ ان تجاویز کے پس پردہ مقصد یہ تھا کہ کونسل میں کم از کم ایک تہائی منتخب ہندوستانی نمائندے ہوں اور کونسل کے ہندوستانی ممبران ہندوستان پر حکمرانی اور اقتدار میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ کام کریں۔ تجویز میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ ان نمائندوں کا انتخاب ہندوستان کی

مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ممبران کے حلقہ انتخاب کے ذریعے ہو اور اس کے لیے ایک بل برطانوی پارلیمنٹ میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے ذریعے پیش کیا جانا تھا۔ ان ہندوستانی خواہشات کے حق میں حمایت حاصل کرنے کی غرض سے (جناح کی پہل پر) ایک نمائندہ وفد نے برطانیہ کا سفر کیا۔ بالآخر اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ کریو نے اس قسم کا ایک بل پیش کیا جسے ہاوس آف کامنس نے تو منظور، کر لیا لیکن ہاوس آف لارڈس نے مسترد کر دیا۔ اس کے کئی نتائج برآمد ہوئے اور وہ نتائج ہندوستان کے لیے مفید ہی ہوں، ایسا نہیں ہے۔ اس صورت حال میں برٹش راج نے جناح کی مایوسی کو اور بھی بڑھاتے ہوئے اور انتقامی جذبے سے، مسلم لیگ پر دباؤ ڈالا کہ وہ دسمبر 1914 میں ہونے والا اپنا اجلاس ملتوی کر دے۔ لیکن قطعی طور پر نہ تو جناح ہی اس حکم اور اس کی کمزور وضاحت کو ہضم کر سکے اور نہ ہی دوسرے لوگ۔

اب مسلم لیگ کونسل کا رکن بن جانے والے 'جناح نے' حکومت کی مخالفت کے باوجود' بمبئی مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کرانے کی اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ برٹش راج کے حمایتیوں نے ان کی اس کوشش کی پرزور مخالفت کی۔ ان مخالفین میں بمبئی کے لیگی رکن حاجی قاسم میٹھا اور مولانا رفیع الدین جیسے لوگ بھی تھے جو بمبئی کے اس وقت کے گورنر لارڈ ولنگڈن کی ہدایت پر کام کرتے تھے۔ بالآخر جناح کامیاب ہوئے اور دسمبر 1915 میں پہلی بار لیگ اور کانگرس دونوں کے اجلاس ایک ہی شہر میں ہوئے۔ ایک بار پھر یہ جناح کی ہی پہل کا نتیجہ تھا۔ ان دو سرکردہ سیاسی جماعتوں کے اجلاسوں میں ہندو اور مسلم قیادت کے مابین تال میل اور تعاون کا ایک قابل ذکر جذبہ دکھائی دیا۔ ان اجلاسوں میں علاحدہ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اور ان کمیٹیوں نے صلاح ومشورے کے بعد اصلاحات کی اگلی کڑی کے طور پر مشترکہ آئینی فارمولہ سامنے رکھا۔ ان کمیٹیوں کی میٹنگوں میں ایک بار پھر جناح نے بہت محنت سے کام کیا۔ ان کے ایسے ہی کاموں کے سبب گوکھلے کا وہ مشہور تبصرہ سامنے آیا جس میں انہوں نے جناح کو'ہندو مسلم' اتحاد کے سفیر کا خطاب دیا تھا۔ بعد میں جناح نے 1916 کے لکھنؤ سمجھوتے کے لیے اتفاق رائے قائم کرنے کی غرض سے گوکھلے کی اس تعریف کا بہت مفید اور کارآمد استعمال کیا۔ تلک جیسے لیڈروں کو علاحدہ حلقہ انتخاب کے مسئلے پر راضی کر لینے کا سہرا بھی جناح کے سر جاتا ہے۔ اس حمایت کی بنیاد پر علاحدہ حلقہ انتخاب کی پرزور مخالفت کرنے والے دوسرے لوگوں جیسے کہ ایس، این، بنرجی وغیرہ کے اثرات محدود ہو گئے۔

اکتوبر 1916 میں جناح سولہویں بمبئی صوبائی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ایم-آر- سیانی کے بعد اس عہدے کو حاصل کرنے والے وہ دوسرے مسلمان تھے۔ اس کانفرنس میں اپنے صدارتی خطاب میں جناح نے آئین کے صوبائی اور مرکزی پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ وہی خیالات جو دسمبر 1916 میں لکھنؤ میں رکھے گئے تھے جنہیں اب ہم لکھنؤ سمجھوتے کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ کانگرس اور لیگ کی مجوزہ مشترکہ اصلاحی اسکیموں میں سے پہلی اسکیم تھی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دونوں جماعتیں کم سے کم وقت میں، سوراج، یا سوشاسن (اپنی حکومت) حاصل کرنے کے لیے مل کر کام کریں گے۔ جناح ہی کی پہل پر لیگ اور کانگرس نے لکھنؤ میں ایک مشترکہ کمیٹی کی تشکیل کا فیصلہ لیا اور اس کمیٹی کو ہی ایک ایسے بل کی

تیاری کی ذمے داری دی گئی جسے برطانوی پارلیمنٹ سے منظور کرانے کے لیے لندن بھیجا جانا تھا۔ اس کے لیے ایک مشترکہ نمائندہ وفد کا منصوبہ بھی بنایا گیا۔

اس تجویز پر عمل نہیں ہو سکا، کیوں کہ برٹش حکومت جنگ کے دوران کسی بھی ہندوستانی رہنما سے ملنے کی حالت میں نہیں تھی۔ لہٰذا اس کی جگہ یہ طے کیا گیا کہ معاملات کی براہ راست واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ آف انڈیا ایڈون۔ ایس۔ مونٹیگ کو بھیجا گیا۔ وہ نومبر 1917 میں ہندوستان آئے اور چھ ماہ بعد اپریل 1918 میں پیرس لوٹ گئے۔ اس وقت تک انہوں نے اپنی آئینی رپورٹ بھی تیار کر لی تھی۔ اسے جولائی 1918 کے اوائل میں شائع کر دیا گیا۔ اس دوران جناح نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی ہوم رول لیگوں کے مشترکہ لیڈر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اور اس دوران انہیں تمام فرقوں کا اعتماد بھی حاصل رہا۔ اس وجہ سے ہی وہ مونٹیگ سے تین مشترکہ وفود کی ملاقات کا بندوبست کرا سکے۔ پہلا وفد کانگریس اور مسلم لیگ کی جانب سے تلک کی سربراہی میں گیا۔ دونوں آل انڈیا ہوم رول لیگوں کی طرف سے بھیجے گئے وفد کی سربراہی اینی بیسنٹ نے کی جب کہ تیسرے وفد کے سربراہ جناح تھے۔ وہ اس سے پہلے کے دونوں وفود میں بھی شامل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے اصلاحات پر زور دینے کے لیے کئی بار مونٹیگ سے الگ سے ملاقات کی تھی۔ بعد میں مونٹیگ نے اپنی کتاب این انڈین ڈائری میں اس کے لیے جناح کے تعاون ان کی قابلیت اور ان کی دوسری خوبیوں کی زبردست تعریف کی۔

جب مونٹ فورڈ رپورٹ حتمی طور پر شائع ہوئی تو اس کے نتیجے میں ہندوستانی لیڈروں کے مابین سنگین قسم کی نااتفاقیاں پیدا ہو گئیں جنہیں جناح کے ذریعے مذاکرات کے بعد ہی ختم کیا جا سکے، بالآخر ایک اتفاق رائے قائم ہو گیا اور طے کیا گیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کا وفد پھر انگلینڈ بھیجا جائے۔ اس وفد کا کام تھا مونٹ فورڈ رپورٹ میں کچھ اصلاحات کی توثیق کرنا تا کہ انہیں بعد میں پارلیمنٹ میں پیش کیے جانے والے بل میں شامل کیا جا سکے۔ بدقسمتی سے یہ ایک بار پھر غلط موقع تھا، کیوں کہ جنگ کے دوران انگریز ایسے کسی بھی وفد کے وہاں جانے دینے کے حق میں نہیں تھے۔ انگریزوں نے اس کے عوض ہندوستان میں قانون ساز کونسل کی سطح پر ایک محدود بحث کرانے کی بات سامنے رکھی لیکن یہ جناح کو منظور نہیں تھا۔ نتیجتاً حکومت سمجھوتے کی شکل میں اس کام کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دینے پر راضی ہو گئی۔

مونٹ فورڈ رپورٹ کو جناح کسی بھی طرح ہوم رول کی طرف ایک قدم کے طور پر نہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صوبائی خود مختاری بنیادی طور پر دو سطحی حکمرانی عملی (Diarchy) کے تحت محفوظ اور منتقل موضوعات کی تقسیم کی حیثیت اور اس کی حد پر منحصر ہے۔ جناح صحیح طور پر اس بات کو سمجھ گئے کہ آدھے ادھورے دو سطحی اقتدار سے ہندوستانی وزرا کا درجہ گھٹ کر صرف تماش بینوں کا رہ جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ صوبے تو اتنے اہل ہیں کہ وہ اپنے امور کو خود دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ایسے صوبوں میں تمام معاملات ہندوستانیوں کو منتقل کر دیے جانے چاہئیں۔ انہیں بالخصوص وہ انتظامات

منظور نہیں تھے جو صوبائی گورنروں کو محفوظ موضوعات سے متعلق بل یا تجویز قانون ساز اسمبلی میں پیش کرنے کا اختیار نہ دینے کی طاقت فراہم کرتے تھے۔ 20 اگست 1917 کے اعلانیہ میں 'ذمے دار حکومت' کی بات ضرور کہی گئی تھی، اور جناح نے اس نکتہ کی تشریح تمام طاقتیں ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کئے جانے کے طور پر کی تھی، کیوں کہ ان کے خیال میں ملک کی 'آزادی' 'ذمے دار حکومت' سے الگ نہیں ہو سکتی ہے۔

قانون ساز اسمبلی میں موجود سرکاری فریق جناح کے ایسے تبصروں سے پریشانی محسوس کرتے تھے لیکن اس سے جناح اور ان جیسے دوسرے ممبران ان کے دباؤ آنے والے کہاں تھے۔ انہوں نے جنوری 1919 میں، بمبئی میں ساوتھ بورو کمیٹی کے سامنے اپنے بیان میں مونٹیگ چیمس فورڈ رپورٹ میں اصلاحات کے بارے میں واضح طور پر خیالات رکھے لیکن اسی سال اگست میں مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے سامنے دیا جانے والا ان کا بیان کہیں زیادہ واضح اور بے باک تھا۔ پارلیمنٹ نے اس کمیٹی کا قیام ہندوستانی سیاست دانوں سے مذاکرات کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا بل (1919) پر نظر ثانی کے مقصد سے کیا تھا۔ بعد میں بیان دینے کے لیے ان لیڈروں کو لندن بھی بلایا جاتا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت جب جناح کے بہت سے ساتھی ہندوستان کی آزادی کے لیے تیار تک نہیں تھے، وہ ہندوستان کو آزادی تک لے جانے کے لیے اپنے آئینی خیالات کی واضح اور پرزور وکالت کر رہے تھے۔ جناح نے سول سروسز، عدلیہ اور انتظامیہ کے کردار کو آسان زبان میں اور تفصیل کے ساتھ رکھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا بل پر نظر ثانی کے لیے قائم مشترکہ کمیٹی کے سامنے اپنے بیان میں جناح نے کچھ اس قسم کی باتیں رکھی تھیں: 'اگر چہ ملک کی صرف دس فیصد آبادی رائے دہندہ بن سکتی ہے، پھر بھی کیا ہم آج ذمے دار حکومت کی مانگ کر رہے ہیں؟ کناڈا کے معاملے میں ہم نے کیا دیکھا۔ جب کناڈا میں لوگوں کو میونسپلٹی کے لیے بھی حق رائے دہی حاصل نہیں تھا، انہیں میونسپلٹی تک کا تجربہ نہیں تھا تو وہاں پوری طرح ایک ذمے دار حکومت کا قیام کر دیا گیا تھا۔۔۔ اس لیے میں یہی کہوں گا کہ ہمارے پاس وافر رائے دہندگان نہ ہونے کی دلیل بالکل غیر مناسب ہے۔ یہ دلیل بے بنیاد ہے۔'

جناح نے ایک ایسے وفاقی آئین کی حمایت کی' جس میں تمام بچے بقیہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ انہوں نے سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کے عہدے کی مخالفت کی اور یہ بھی کہا کہ وائسرائے اور گورنروں کے اختیارات کو قطعی طور پر کم کرنا چاہئے۔ صرف سماجی تحفظ اور امن وامان کے حوالے سے ان کے پاس مکمل اختیارات ہوں۔ پھر بھی وہ مقننہ کے تئیں جواب دہ ہوں۔ ایسا انتظام ضرور ہونا چاہئے۔ ان کی یہ بھی تجویز تھی کہ مرکزی اور صوبائی تمام قانون ساز اداروں میں نامزدگی کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور تمام نشستوں کا انتخاب آبادی کے دس بارہ فیصد رائے دہندگان کے ذریعے ہو۔ ان کی مختلف تجاویز میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ انگلینڈ کی عدالتی زندگی میں شہرت یافتہ افراد کو ہی گورنر مقرر کیا جانا چاہئے تاکہ وہ ہندوستانی سماج میں نئے خیالات لا سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام صوبائی امور ہندوستانیوں کو منتقل کئے جانے

چاہئیں اور یہ ہندستانی صوبائی مجالس قانون ساز کو جوابدہ ہوں۔ جناح نے بعد میں تقریباً یہی اصلاحات مونٹ فورڈ رپورٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا بل 1935 کے سلسلے میں بھی تجویز کیں۔☆

بعد میں ان اصلاحات پر عمل آوری کے مسئلے پر جناح اور گاندھی میں اختلاف ہو گیا۔ اور آخر گاندھی نے اپنا الگ راستہ اختیار کر لیا۔ وہ سول نافرمانی اور ستیا گرہ کے راستے پر بڑھ گئے۔ اگرچہ جناح نے 1920 تک تمام ہندوستانی سیاسی طاقتوں کو کامیابی کے ساتھ متحد رکھا، لیکن گاندھی کے ستیا گرہ کے راستے پر چلنے کی وجہ سے یہ دباؤ ختم ہو گیا اور برٹش حکومت تین اور دہائیوں تک قائم رہی۔

گاندھی اور جناح: دو غیر ہم آہنگ کاٹھیاواڑی

ہم نے پہلے بھی، اگرچہ بہت اختصار کے ساتھ ان دو عظیم لیکن غیر ہم آہنگ یا بے میل ہندوستانیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کی پیدائش کاٹھیاواڑ کے پیشہ ور تاجر طبقے میں ہوئی تھی۔ لیکن ان میں اس کے علاوہ اور کوئی مماثلت نہیں تھی۔ اول الذکر یعنی گاندھی ایک باعمل ہندو تھے جب کہ ثانی الذکر یعنی جناح اسلام کے ایک بے پروا پیروکار۔ جناح نے مذہب کو سیاسی مقاصد کی حصولیابی کا ایک ذریعہ بنایا تو گاندھی کی زندگی اور سیاست دونوں کی بنیاد مذہب اور عقیدہ ہی رہا۔ گاندھی پر تھورو اور ٹالسٹائے کا گہرا اثر پڑا تھا (ٹالسٹائے کے نام پر ہی انہوں نے جنوبی افریقہ میں اپنی بستی کا نام رکھا تھا) لیکن جہاں تک جناح کی بات ہے تو ان پر صرف دادا بھائی اور گوکھلے کا ہی اور وہ بھی صرف سیاسی اثر تھا۔ گاندھی نے اپنی ذاتی زندگی کھلی اور عوامی طور پر گزاری جب کہ جناح نے اپنی سیاسی زندگی کو بھی بے حد ذاتی بنائے رکھا۔ ان دونوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے نہ صرف واقعات سے بھرپور تحریک آزادی کی دہائیوں کو زبردست طور پر متاثر کیا بلکہ اس جنگ کو ایک خاص شکل بھی دی۔ گاندھی نے اپنی تلاش کی ناکامی تسلیم کر لی، جب کہ دوسری طرف جناح نے، غیر مصدقہ طور پر، حزنیہ انداز میں کہا تھا کہ "انہوں نے صرف ایک ٹائپ رائٹر اور کلرک کی مدد سے پاکستان جیت لیا۔" ان دو عظیم ہندوستانیوں کا مطالعہ دلچسپی کا موضوع ہے۔ اس باب میں ہم نے ان دونوں کے حوالے سے صرف موٹے انداز میں کچھ باتیں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع بہت وسیع ہے اور ان دونوں ہندوستانیوں کی شخصیت کے مطالعے کا معاملہ اس سے بھی وسیع تر ہے۔ اگرچہ جناح اور گاندھی کے خاندان کسی وقت گجرات کے کاٹھیاواڑ میں چالیس میل کے فاصلے پر رہے ہوں گے، لیکن دونوں کی جائے پیدائش کی قربت ان کی سیاست کو یقیناً ایک دوسرے کے قریب نہیں لاسکی۔

☆ مونٹ فورٹ تجاویز کی کچھ باتیں برسہابرس موٹے طور پر بغیر کسی ترجیح کے، ہندوستان کی مختلف آئینی اصلاحات میں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر 1950 میں آزاد ہندوستان میں منظور کیے گئے آئین میں بھی انہیں جگہ مل گئی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے اور ایک طرح سے علامتی بھی ہے کہ کس طرح پہلے سے تیار شدہ ڈھانچے کو ہٹا کر نیا ڈھانچہ لانا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جنوری 1915 میں گاندھی کے جنوبی افریقہ سے واپس لوٹنے کے موقع پر ان کا استقبال کرنے کے لئے گرجر سبھا منعقد کی گئی تھی۔ جناح اس کی صدارت کر رہے تھے۔ ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ خیر مقدمی کلمات کے جواب میں گاندھی نے ستائشی لہجے میں کہا تھا کہ ''وہ یہ دیکھ کر خوش ہیں کہ ایک مسلمان نہ صرف ان کے علاقے کی ایک سبھا سے مخاطب ہے بلکہ اس کی صدارت بھی کر رہا ہے''62 اس موقع پر گاندھی نے جناح کو ایک مسلمان کے طور پر مخاطب کیا، حالاں کہ حلیے بشرے اور برتاؤ سے جناح اس مذہبی شناخت کے آس پاس بھی نہیں تھے جس کا گاندھی نے ذکر کیا تھا۔ دوسری طرف جناح نے وسیع القلبی کے ساتھ گاندھی کی ستائش کی۔

جنوری 1915 میں جب گاندھی جہاز سے ہندوستان پہنچے تو جناح اور گوکھلے سمیت کئی لیڈران کا شایان شان استقبال کرنے کے لئے بمبئی آئے تھے۔ اس وقت تک جناح ایک کل ہند سطح کے لیڈر بن چکے تھے۔ اور نہ صرف مسلمانوں اور ہندوؤں اور اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے مابین بلکہ ملک کے مختلف فرقوں کے مابین اتحاد کی مخلصانہ کوشش کر رہے تھے۔ جناح نے بھی بمبئی میں گاندھی کا پر جوش خیر مقدم کیا تھا۔ جناح ان ایام میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی پوری خدمات دینے کو تیار تھے۔ جناح کی مقبولیت اور ان کے سیاسی قد کی وجہ سے ہی گوجر طبقہ کی ایک تنظیم گرجر سبھا نے ''مسٹر اینڈ مسز گاندھی'' کے استقبال کے لئے منعقدہ گارڈن پارٹی کی صدارت کرنے کا موقع جناح کو دیا تھا۔

23 جنوری 1915 کو اپنے صدارتی خطاب میں جناح نے نہ صرف بمبئی کی جانب سے بلکہ پورے ہندوستان کی جانب سے ''مسٹر اینڈ مسز گاندھی'' کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے گاندھی کے سامنے واضح طور پر کہا تھا ''مکمل اتفاق رائے سے ہندوستان کے مطالبات (برطانوی حکومت کے سامنے) رکھے جا سکیں، اس کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتفاق رائے اور تعاون کا جذبہ پیدا کرنا ہی سب سے بڑا چیلنج ہے۔'' انہوں نے یہاں تک کہا کہ ''بلاشبہ وہ (گاندھی) نہ صرف ایک قیمتی زیور بلکہ ایک حقیقی کارکن بھی بنیں گے، جس کے برابر بہت بہت کم لوگ پہنچ سکیں گے۔'' اس سبھا کی تفصیلات کی رپورٹوں کے مطابق ''بیشتر ہندو سامعین نے اس فقرے کا پر زور استقبال کیا تھا'' حالاں کہ اس پر گاندھی نے کسی حد تک گول مول ردعمل ہی ظاہر کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ 'اپنے نقطۂ نظر' سے ''تمام ہندوستانی سوالوں کا مطالعہ کریں گے۔'' یہ اپنے آپ میں ایک منطقی جملہ ضرور تھا لیکن استقبال کی گرم جوشی کے مطابق نہیں تھا۔ گوکھلے نے بھی گاندھی کو سیاست میں داخل ہونے سے قبل کم از کم ایک سال تک صورت حال کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ تو ٹھیک تھا لیکن انہوں نے ہندو سبھا کی صدارت کرنے پر غیر ضروری طور پر جناح کا شکریہ ادا کیا۔ جناح کے پر جوش استقبال پر یہ ایک طرح سے ناشائستہ اور حوصلہ شکن ردعمل تھا۔ آگے چل کر اس کا اچھا اثر نہیں پڑا۔

شروع میں کچھ جھجکتے ہوئے گاندھی کوئی اور راستہ اختیار نہ کر کے گوکھلے جناح اور دیگر نرم خیال لیڈروں کے راستے پر ہی چلے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اس وقت تک تلک بھی نرم خیالات کے قریب آ گئے تھے۔ گاندھی نے ان تمام

لیڈروں کے ساتھ تعاون کیا۔ لیکن یہ معاملہ صرف 1920 تک رہا، کیوں کہ اس کے بعد تو وہ واضح طور پر ہندوستان کی آواز بن گئے۔ اس کے علاوہ 1920 تک برٹش سرکار گاندھی کو تسلیم بھی کر چکی تھی۔ اگر چہ یہ بات گوکھلے کی سفارش کے نتیجے میں ہوئی۔ انہوں نے ''حکومت ہند کو پوری طرح گاندھی کے پیچھے لانے کے لئے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر اپنے وقار اور اثرات کا پورا استعمال کیا۔'' 63 یہ وہی زمانہ تھا جب برٹش حکومت جناح اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں پوری طرح سے فکر مند تھی۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کو انڈین نیشنل کانگریس سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ 64

جناح کی حیثیت ایک طرح سے مئی 1914 کے واقعات کے تناظر میں سامنے آتی ہے، جب انہوں نے انگلینڈ جانے والے کانگریس کے ایک وفد کی قیادت کی تھی۔ اس وفد کا مقصد کونسل آف انڈیا میں کم از کم تین غیر سرکاری ممبران کے لیے جگہ کے تعین کی غرض سے سکریٹری آف اسٹیٹ اور دیگر ممبران پارلیمنٹ کو ہموار کرنا تھا۔ ان ممبران کا انتخاب امپیریل اور صوبائی قانون ساز کونسلوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ ان ایام میں جناح بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کے عظیم تکون روجی-مہتہ-گوکھلے 65 کے مضبوط سیاسی وارث کے طور پر ابھر چکے تھے۔ اور کانگریس کی قیادت حاصل کرنے کے راستے پر کم از کم مغربی ہند میں تو قطعی طور پر بخوبی آگے بڑھ رہے تھے۔ اگر چہ انڈیا آفس نے ان مطالبات کو براہ راست نامنظور، کر دیا، لیکن یہ بھی اپنے آپ میں غلط موقع پر کی گئی پہل تھی، کیوں کہ پہلی عالمی جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جب کہ جناح ان کوششوں میں لگے تھے، گاندھی نے جنگ کا آغاز پر اہل وطن سے 'سامراج کے حق میں سوچنے' کی اپیل کی، 66 انہوں نے اتحادی ملکوں کی مدد کرنے کے لیے لندن میں ایک فیلڈ ایمبولینس ٹریننگ دستے کے قیام کی ذمے داری بھی نبھائی۔ انہوں نے اسی نوعیت کے کام جنوبی افریقہ میں اور بوئر (Boer) جنگ کے دوران بھی کئے تھے۔ لیکن دوسری عالمی جنگ آتے آتے گاندھی کے نقطہ نظر اور ان کی پالیسی میں پوری طرح تبدیلی آچکی تھی۔ ان دنوں گاندھی کی قیادت تقریباً پوری طرح 'ایک مذہبی اور صوبائی کردار' کا کی حامل تھی۔ جب کہ دوسری طرف جناح بلاشبہ ایک اصول پسند 'سیکولر اور قومیت کے جذبے سے بھرپور سیاستداں نظر آرہے تھے۔

لکھنؤ سمجھوتہ-1916

یہ سمجھوتہ بہت اہم تھا، اسے سمجھنے کے لئے ہمیں ان واقعات پر نظر ڈالنی ہوگی جن سے گزرتے ہوئے 1916 میں، اصلاحات کے منصوبے کے بارے میں کانگریس اور مسلم لیگ کی یہ مشترکہ کوشش سامنے آئی۔ یہی بعد میں 1916 کے لکھنؤ سمجھوتے کے نام سے مشہور ہوا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ کی قیادت والی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپریل 1916 میں کانگریس کی صوبائی کمیٹیوں میں غور کے لیے اس سے متعلق قراردادیں تیار کی تھیں۔ جو اس وقت مسودے ہی کی شکل میں تھی۔ اگست 1916 میں آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی بالکل ایسا ہی ایک قدم اٹھایا اور یہاں جناح نے غور و فکر کی رہنمائی کی۔ لیگ نے اپنی ان تجاویز کو نومبر 1916 تک حتمی شکل دے دی جس کے بعد 17 نومبر 1916 کو کلکتہ میں

کانگرس اور لیگ کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس کی صدارت ایک بہت ہی معزز شخصیت اور بنگال کے لیڈر سریندر ناتھ بنرجی نے کی۔ جناح کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے بالآخر اتفاق رائے قائم ہوا اور ان کے خدمات کو اس وقت تسلیم کیا گیا جب لیگ کی کونسل نے ایک میٹنگ کر کے انہیں دسمبر 1916 میں ہونے والے لیگ کے آئندہ اجلاس کا صدر نامزد کر دیا۔ اس تقرری کا کانگرس کے حلقوں میں بھی خوب استقبال ہوا۔ ایسے مشکل سمجھوتے تک خوش اسلوبی کے ساتھ پہنچنے اور کانگرس اور تلک کی قیمتی حمایت کی وجہ سے ان دونوں جماعتوں نے اصلاحات کا ایک مشترکہ منصوبہ بنایا جس کا عنوان تھا 'بغرض اصلاح کانگرس لیگ مشترکہ منصوبہ' رکھا گیا لیکن عموماً اور عملی طور پر اسے 'لکھنؤ سمجھوتہ' ہی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یکم جنوری 1916 کے بامبے کرانیکل کے شمارے میں تبصرہ کیا گیا تھا کہ یہ 'ہندو مسلم اتحاد کے لیے وقف جناح کی خدمات' کے سبب ہی نہ ممکن ہو سکا تھا۔ 67

یہ لکھنؤ سمجھوتہ، اصولوں کے بارے میں قومی سطح پر ہوا سمجھوتہ تھا۔ اس میں یہ کم کہا گیا تھا کہ انتظامیہ اور مقننہ میں کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کی شراکت داری ہوگی۔ یہ سمجھوتہ اپنے مقاصد کے دائرے کے لحاظ سے 'گو کھلے منصوبہ' 68 کے مقابلے میں زیادہ واضح تھا۔ اس سمجھوتے میں کانگرس کو مرکزی انتظامیہ اور مقننہ میں دو تہائی کی نمائندگی اور مسلم لیگ کو ایک تہائی نشستیں دینے کی بات تھی۔ مذہبی معاملات کے سلسلے میں کچھ خاص تحفظات پر اتفاق ہوا تھا اور ایسے معاملات میں کسی تجویز کو منظور کرنے کے لیے، متعلقہ فرقے کے تین چوتھائی ممبران کی حمایت ضروری ہونے کا انتظام رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں کے لیے علاحدہ حلقہ انتخاب کو خصوصی اہمیت کا موضوع مانتے ہوئے اسے اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ تلک کی حمایت اور جناح کی ضروری یقین دہانیوں کے نتیجے میں ہوا۔ اتحاد کی اس کوشش میں جناح خود کو مزاحیہ انداز میں 'اصل مجرم' مانتے تھے، اور بعد میں خود اپنا مذاق اڑانے کے لیے ایسا ہی کہا بھی کرتے تھے۔ 69

کانگرس کی قیادت میں جناح اور گاندھی نے جو بھی رول ادا کیا تھا، وہ گاندھی کی واپسی کی صرف چھ برسوں کے اندر ہی پوری طرح پلٹ گیا۔ گاندھی 1920 تک پوری طرح سرگرم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد تو جناح کانگریس میں مسلسل حاشیے پر پہنچا دیے۔

ان میں سے کسی کے اپنی سیاسی شخصیت کو بدل دیا ہو، ایسا نہیں تھا۔ بلکہ ہوا یہ کہ ان چھ برسوں میں ہندوستان کا پورا سیاسی منظر نامہ ہی تبدیل ہو گیا۔ اس تبدیلی کے تعلق سے دونوں کا ردعمل بالکل ویسا تھا، جیسا کہ ان کو مناسب لگا۔ اس کے علاوہ 1920 تک گاندھی نے بھی اپنے لیے اچھی خاصی مسلم حمایت اور مالیاتی بنیاد بھی حاصل کر لی تھی۔ اس وقت تک گاندھی ہندوستانی تحریک آزادی کو آگے لے جانے والے اصل رہنما بن گئے۔ ان کی قیادت لوگوں کے لیے حوصلہ بخش بن گئی۔ جناح یہ مقام کبھی حاصل نہیں کر سکے۔ امرتسر اجلاس سے کلکتہ اور پھر ناگپور تک گاندھی کی سیاسی طاقت مسلسل بڑھتی چلی گئی۔

1920 میں ناگپور میں ہوئے کانگریسی اجلاس تک تو پوری کانگریس غیر متنازعہ طور پر گاندھی کی پشت پر کھڑی رہی۔

اگر اس وقت تک پہلی عالمی جنگ نہ چھڑ گئی ہوتی تو شروع میں اکثر 'مسلم گوکھلے' کہے جانے والے جناح ان تمام باتوں کے باوجود شاید کانگریس میں مرکزی کردار ادا کرتے رہتے اور مسلم لیگ کو بھی حوصلہ دیتے رہتے۔ وہ اپنے آئینی طور طریقوں کی مدد سے دونوں جماعتوں اور سیاسی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتحاد قائم کرنے والے شخص کا رول نبھاتے رہتے، مگر پہلی عالمی جنگ نے سب کچھ بدل دیا۔ یا تو قدرت کو کچھ اور منظور تھا یا جناح چالاکی میں پچھڑ گئے۔ یا ممکن ہے کہ ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے لیے شروع سے ہی نقصان دہ بنا رہا ہو؟ ہندوستان میں سیاسی اثر ورسوخ کی اس بے رحم دوڑ میں جناح کے ساتھ تو ہمیشہ ایک معذوری برقرار رہی جو بعد میں بھی جاری رہی۔

جنگ سے چند ماہ قبل جناح کے سیاسی مطالبات کو انگلینڈ میں ٹھکرا دیا گیا تھا، مگر تکلیف دہ المیہ یہ رہا ہے کہ وہی مطالبات بعد میں مونٹیگیو نے 'ہندوستان میں ذمے دار حکومت' کے لیے رکھے اور صرف تین سال کے اندر وہ تمام اعلانات ایک قانون کی شکل اختیار کر گئے۔ اس پورے عمل میں جناح سے ایک اہم سیاسی محاذ چھین لیا گیا۔ کانگریس سے جناح کے الگ ہونے کی ایک اور اہم وجہ 'خلافت عثمانیہ' کا خاتمہ تھا۔ اس کے بعد خلیفہ کا منصب ختم کر دیا گیا اور پھر ہندوستانی سیاسی منظرنامہ پر کرشمائی (خواہ عارضی طور پر ہی سہی) علی برادران محمد علی جوہر اور شوکت علی کا ظہور ہوا۔ انہوں نے عارضی طور پر ہی سہی جناح مسلم قیادت سے محروم کر دیا۔ اس پر جناح نے، چڑچڑے پن کے انداز میں، بمبئی کے اس وقت کے گورنر سر جارج لائڈ کو وہائٹ ہال کو یہ پیغام پہنچا دینے کے لیے کہا کہ 'آپ کی اصلاحات کی وجہ سے جس خیر سگالی کی امید بندھ رہی تھی، وہ سب دو یا تین لوگوں (گاندھی اور علی برادران) کی سرگرمیوں کی وجہ سے ختم ہو رہی ہے۔ 1857 کی فوجی بغاوت کے بعد سے حالات کبھی اتنے خراب نہیں ہوئے تھے۔'70

مگر بعد میں عالمی جنگ کے کچھ اور نتائج بھی سامنے آنے لگے / جن میں ایک ہندوستان اور ہندوستانیوں پر یہ انکشاف تھا کہ 'ایشیا کی لوگ 'سفید فاموں' کو آسانی سے ہرا سکتے ہیں۔' انہوں نے پہلے اس بات سے ترغیب ضرور حاصل کی کہ روس-جاپان جنگ کے دوران 1905 میں جاپان نے روس کو شکست دی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے علاوہ اب یوروپ اور عرب کے واقعات نے بھی عام ہندوستانیوں کے سامنے سیاسی امنگوں کا ایک نیا منظرنامہ رکھ دیا تھا۔ ہندوستانی فوجیوں نے پہلی بار یوروپ اور ولایت 71 دیکھا اور بالکل ایک الگ سرزمین پر گورے فوجیوں کو بھی دیکھا۔ اور پھر اس وقت جیسے تبصرے ہو رہے تھے اس نے صبر و برداشت کی ان کی قوت کو بہت گھٹا دیا۔ عوامی حمایت حاصل کرنے کا یہ ایک خداداد موقع تھا اور پھر پہلے سے ہی جنوبی افریقہ میں اپنے طریقے آزما چکے گاندھی نے اس موقع کو فوراً اُچک لیا۔ اس جنگ نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر جھنجھلاہٹ اور مایوسی کی کیفیت پیدا کر دی۔ جہاں جناح اسلامی سرگرمیوں کے تئیں بے پروا رہے تو وہیں ہندو شبیہ والے گاندھی نے تحریک خلافت جیسی شیر کی سواری کرنے کا فیصلہ کیا۔ جن برسوں میں گاندھی کی طاقت بڑھ رہی تھی،

ان میں انہوں نے اور جنگ کے دوران کسی بھی سیاسی تنظیم کی قیادت کرنے سے خود کو روکے رکھا۔ تاہم وہ آریہ سماجیوں (سوامی شردھانند)، کانگریس اور اس ساتھ ہی ہوم رول لیگ کے لیڈروں سے میل جول بڑھاتے رہے۔ جناح نے گاندھی کی روز افزوں مقبولیت کا احساس کرلیا تھا۔ لیکن وہ اس کا کوئی توڑ نہیں ڈھونڈ سکے۔ 1917 میں جناح نے میسٹن[72] (Meston) کے ساتھ ایک گفتگو میں اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'انتہا پسندوں کے پاس شاید غیر عملی لیکن ایک قطعی پروگرام ہے' اور وہ لوگوں کو اپیل کرتا ہے۔ اعتدال پسندوں کے پاس حکومت پر اعتماد کو چھوڑ کر اور کوئی قطعی نظریہ نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ عوام کے پاس جا کر ان سے حکومت پر بھروسہ رکھنے کی بات کہتے ہیں تو لوگ فوراً چیلنج کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ 'حکومت ان کے لیے کیا کر رہی ہے؟' اعتدال پسندوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ دوسری طرف انتہا پسند قطعی قابل اعتماد لگتے ہیں اور جب تک وہ قانون شکنی نہیں کرتے، اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حکومت ان کے پرچار کو تسلیم نہ کرتی۔'[75] جیسا کہ بار بار نظر آیا ہے اور اس قسم کے دوسرے حالات میں بھی دکھائی دیا ہے: انتہا پسند اور اعتدال پسند نظریے کے مابین تنازعہ میں تقریباً ہمیشہ انتہا پسندوں ہی کی جیت ہوئی ہے، اگرچہ یہ عارضی کیوں نہ ہو۔

جن دنوں جناح آئینی اور قانونی اصلاحات اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کی کوششوں میں مصروف تھے۔ گاندھی چمپارن، احمد آباد اور کھیڑا[74] کے دوروں پر تھے۔ وہ مسلسل کامیابی حاصل کرتے جا رہے تھے اور اس وقت تک تو وہ واضح طور پر بہت وسیع عوامی حمایت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی مقبولیت اور ان کی پوزیشن پر کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ دوسری طرف جناح کو ایسی کوئی عوامی حمایت حاصل نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اکثریتی صوبے بھی ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اور المیہ یہ ہے کہ انہی ایام میں جناح کی مسلسل ابھرتی قوم پرستی نے انگریزوں کو ناراض کر دیا تھا۔ 1918 کے اوائل تک بمبئی کے اس وقت کے گورنر ولنگڈن نے انہیں پنڈت مدن موہن مالویہ، بال گنگا دھر تلک اور اینی بیسنٹ کے ساتھ ایسے لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا جو مقبول ان کے 'ایسے انتہا پسند تھے جنہیں بحرانی دور سے گزر رہے سامراج کے تئیں اپنے فرائض کا ذرا بھی احساس نہیں تھا؟'[75] چیمس فورڈ بھی کونسل میں جناح کی سخت تنقیدوں کی وجہ سے ان سے اتنے ہی ناراض تھے۔ ولنگڈن کے جانشین سر جارج لائڈ نے بعد میں مونٹگیو کو انتباہ دیا تھا کہ 'جناح اور مسز نائیڈو دونوں ہی بات کے صاف مگر دل میں ہماری سخت مخالفت کرنے والوں میں سے ہیں جنہیں کبھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔'[76] رولٹ ایکٹ منظور کیے جانے کے خلاف اپریل 1919 میں جناح نے وائسرائے کونسل سے استعفا دے دیا۔ اس وقت تک وہ بمبئی کے ہوم رول لیگ کے صدر منتخب ہو چکے تھے، کیوں کہ 1917 میں اینی بیسنٹ نظر بند کر دی گئی تھیں۔ وائسرائے کو بھیجا گیا ان کا استعفا نامہ انتہائی جذباتی تھا: 'بل کو منظور کر کے یور ایکسلنسی کی حکومت نے انہی اصولوں کو بیدردی سے کچل دیا جن کے لیے گریٹ برٹین نے جنگ لڑی تھی۔ انصاف کے بنیادی اصولوں کو تباہ کر دیا گیا اور لوگوں کے آئینی حقوق کو پامال کیا گیا ہے۔ ... وہ بھی ایسی صورت حال میں جب ریاست کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی حد سے زیادہ گھبرائی

ہوئی اور نااہل نوکر شاہی کے ذریعہ اٹھایا گیا قدم ہے جو نہ تو لوگوں کے تئیں جواب دہ ہے اور نہ ہی حقیقی عوامی رائے سے اس کا کوئی تعلق ہے۔'77

جناح نے شملہ میں کونسل کی اپنی نشست سے استعفا عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے نہیں دیا تھا بلکہ وہ اپنی سیاست کا دائرہ عمل وائسرائے کی کونسل سے ہٹا کر وہائٹ ہال تک لے جانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ شاید وہاں اچھا ردعمل ظاہر ہو۔ انہوں نے یہ کہہ کر استعفا دیا کہ میں ان حالات میں اس کونسل میں اپنے لوگوں کے لیے کسی کام کا نہیں ہوں۔ میرے خیال سے ایسی حکومت جو حالت امن میں ایسے قانون بناتی ہے، مہذب حکومت کہلانے کا دعوا نہیں کر سکتی... میں اب بھی امید کرتا ہوں کہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا وائسرائے کو یہ سیاہ قانون قبول نہ کرنے کا مشورہ دیں گے۔'78

1919 کے موسم گرما میں جناح مسلم لیگ کے ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے لندن گئے۔ یہ وفد مونٹیگیو سے اپیل کرنے اور لارڈ میل بورن کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے اصلاحات سے متعلق اپنا موقف رکھنے گیا تھا۔ انہیں محدود کامیابی ملی، مگر وہ اس اعتماد کے ساتھ بمبئی لوٹے کہ اگر ہندوستان اپنے حقیقی وفد کو لندن بھیجے تو (اب بھی) کافی کچھ ہو سکتا ہے یا، اور وہ خود بھی ایک، مستقل غیر مقیم، 79 وفد کی حیثیت سے جانے کو تیار تھے۔ ان کا فارمولہ کافی حد تک ویسا ہی تھا جیسا کہ کچھ دہائیوں قبل ولیم ویڈر برن اور گوکھلے 80 نے پیش کیا تھا۔ حالانکہ ایک متحدہ ہندوستان کے لیے ڈومینین حیثیت کا ان کا راستہ سب سے تیز، سب سے مدلل اور سب سے کم تکلیف دہ ہو سکتا تھا۔ مگر پہلی عالمی جنگ کے بعد کی دہلی میں سیاسی قیادت نے اس تجویز کا خیر مقدم نہیں کیا۔

گاندھی-جناح اور تحریک خلافت

گاندھی کو پنجاب میں ہونے والے مظالم کی تحقیقات کے لئے ان کے کام، خلافت کے تعلق سے ان کے عہد و پیمان اور علی برادران، محمد علی اور شوکت علی سے ان کی قربت سے انہیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ گاندھی اکثر کہتے: 'ایک ہی ماں سے پیدا ہوئے، ایک ہی زمین کے باشندے' ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لازمی طور پر محبت کرنی چاہیے، خلافت کے مسئلے پر ان کا واضح ردعمل تھا: اگر ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں، تو یہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے غم کو ہلکا کریں۔' یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سے پہلے شاید ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ایسی یگانگت دیکھی گئی ہو۔

اس وقت کے ایک ماہانہ جریدے اٹلانٹک منتھلی میں ایڈمنڈ چنڈلر نے ان دنوں کے حالات کا نقشہ اس طرح کھینچا تھا۔ 'جو سیاست داں ایسے دو مختلف سمت کے دھاروں کو ایک متحدہ بہاؤ کی شکل دے سکے، وہ آزادی کی لڑائی تو پہلے ہی جیت لے گا۔' اس لیے یہ ہندو مسلم اتحاد اس اصول کا سب سے اہم سیاسی واقعہ ہے۔ جب اپریل 1919 میں سوامی شردھانند دہلی میں جامع مسجد کے اسٹیج پر چڑھے اور وہاں سے لوگوں کو خطاب کیا، تو اس واقعہ کو ہندوستانی مسلم پریس نے حالیہ اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ قرار دیا۔ اس کے بعد دسمبر میں گاندھی کو دہلی میں، خلافت کانفرنس کا صدر بنا دیا گیا۔ انھی

ایام کے آس پاس یہ سیاسی نعرہ ہر جگہ گونجنے لگا: 'اللہ اکبر اور اوم ایک ہی نام ہے۔' اور مسلمانوں نے ہندو جذبات کے احترام میں گائے کا ذبیحہ ترک کر دیا۔ یہ تو مسلم انتہا پسندوں کے ساتھ گاندھی کی وابستگی کا محض آغاز ہی تھا۔ اس کے بعد تو وہ اس حد تک اسلام کے چیمپئن بن گئے کہ انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک کو فرانس میں ہوئے 'سیورلیس معاہدہ' میں ترمیم پر منحصر کر دیا۔

اسلامی تحریک میں اپنی پوری طاقت لگا دینے کا ایک اخلاقی جواز گاندھی کے پاس تھا، جب تک وہ یہ تسلیم کرتے رہے کہ ترکی کا موقف صحیح ہے، لیکن ان کے نکتہ چینیوں کے مطابق اس وقت تک سیاسی جواز سے الگ، وہ ایک ایسے مقصد کی حمایت کرنے لگے تھے، جس کے بارے میں انہیں قطعی طور پر یہ علم ہونا چاہیے تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ رحم دلی کے اس سفیر (گاندھی) اور اپنے اہالیان وطن کی آزادی کے تئیں وقف اس سپاہی کا ترکی کے جابر عثمان علی کی حکومت کو قائم رکھنے کی تحریک میں شامل ہونا کیسے مناسب سمجھا جا سکتا تھا؟ تاہم گاندھی اپنی پوزیشن کے بارے میں بہت صاف تھے۔ انہوں نے ترکی کے تئیں ہمدردی ظاہر کرنے کی کوئی بات نہیں کی۔ جہاں تک مختلف نسلوں کا سوال ہے، تو نسل کشی کے ترکی کے ریکارڈ کے باوجود، ان کا خیال تھا کہ عیسائی، عرب، یہودی اپنے پیدائشی حقوق حاصل کر سکتے ہیں اور تحفظ کی گارنٹی کے تحت خلافت عثمانیہ میں خود مختار رہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ 'تاریخ کے اس نازک دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی مدد کر کے میں ان کی دوستی حاصل کرنا چاہتا ہوں، اور اگر ان کی طرف سے ان کی غلط کاریوں کے اعتراف کی حد تک یہ ایک درست سمجھوتہ تھا۔ ہندو مسلم اتحاد ہندوستانی قوم پرستی کے لیے سب سے زیادہ ضروری تھا۔'

اس وقت کے واقعات کے سلسلے میں مزید تفصیلات پیش کرنے کے لیے سوامی شردھانند کی ان باتوں کو سامنے رکھنا بہتر ہوگا:

چار اپریل 1919 دہلی کے لیے ایک تاریخی دن تھا۔ اندھا دھند گولی باری کے واقعہ کے بعد یہ پہلا جمعہ تھا اور عظیم جامع مسجد میں پر نماز ادا کی جانی تھی۔ کچھ ذمے دار مسلمانوں کی جانب سے ایک اعلان کرایا گیا، جس میں لوگوں کو ہندو مسلم شہداء کے لیے دعا کرنے کی غرض سے منعقدہ ایک تعزیتی جلسے میں مدعو کیا گیا تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح شہر کی سیر پر نکلا تھا۔ مجھے بہت سے ہندو بھائیوں نے بتایا کہ ہمارے مسلمان بھائی ہندوؤں سے یہ گزارش کر رہے ہیں کہ وہ اس تعزیتی جلسے میں شرکت کریں۔ انہوں نے اس بارے میں مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ان کے سوال کی وجہ یہ تھی کہ غیر مسلموں کو مسجد انتظامیہ کمیٹی کی اجازت کے بغیر مسجد میں داخلے کا حق نہیں ہے اور خاص طور پر اس وقت جب نماز ادا کی جا رہی ہو۔ سب نے ان سے انتظار کرنے کو کہا اور میں عبدالرحمٰن ایڈووکیٹ سے مشورہ کرنے چلا گیا، جن کا دفتر نزدیک ہی تھا۔ انہوں نے مجھے حکیم صاحب سے مشورے کے بغیر وہاں نہ جانے کی صلاح دی۔ چوں کہ حکیم صاحب گھر پر نہیں تھے، میں آشرم لوٹ گیا اور میں نے یہ طے کیا کہ نماز اور تعزیتی جلسے کے اختتام تک باہر نہ نکلا جائے۔

'تقریباً ایک بجے جب میں کچھ لکھنے میں مشغول تھا، تقریباً پچاس مسلمان میری معمولی سی رہائش گاہ پر آئے۔ وہ مجھے بڑی محبت اور عاجزی کے ساتھ نیچے لے گئے۔ ایک تانگا ہمارا منتظر تھا۔ راستے میں انہوں نے تیز چلنے والی کئی سواریاں بدلیں، جب تک کہ انہیں ایک خالی کار نہیں ملی۔ پھر مجھے جلدی سے لے جایا گیا اور میں جامع مسجد کی جنوبی سیڑھیوں کی طرف پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ نیچے آنے والے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں تو وہ 'مہاتما گاندھی زندہ باد' اور 'ہندو مسلم زندہ باد' کے نعرے لگانے لگے اور سب کے سب واپس ہو گئے۔ اندر تیس ہزار سے کم لوگ نہیں رہے ہوں گے۔ میں آخری آدمی کے پیچھے بیٹھنے جا رہا تھا کہ اس وقت کچھ مسلم بھائی دوڑتے ہوئے آئے اور مجھے پہلے ہال کے اندر لے گئے اور بعد میں باہر کی طرف جہاں تقریر کرنے کے لیے لکڑی کا ایک مستقل اسٹیج بنا ہوا تھا۔ اس وقت مولوی عبدالمجید سامعین سے خطاب کر رہے تھے۔ وہ رک گئے اور میرے اوپر جانے کا انتظار کرنے لگے۔ میں جھجک گیا، اس پر سینکڑوں آوازوں نے مجھ سے اوپر چڑھنے کی درخواست کی۔ دو زینے چڑھنے کے بعد میں پھر جھجکا۔ عوام کی ایک بھاری بھیڑ اٹھ کھڑی ہوئی اور بیک آواز مجھے اوپر چڑھنے کو کہنے لگی۔ جب میں اسٹیج پر پہنچ گیا تب بھیڑ کے لوگ بیٹھ گئے۔

'میں امید کر رہا تھا کہ عبدالمجید اپنا خطاب جاری رکھیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا 'آپ نے سنا کہ شہدا کے خون کے بارے میں قرآن مجید کا کیا کہنا ہے۔ اب سوامی شردھانند آپ کو بتا دیں گے کہ ہمارے ہندو بھائیوں کے لیے خدا کا پیغام مانے جانے والے مقدس وید بھی اسی قسم کی تعلیم دیتے ہیں۔' اچانک میرا نام پکارا گیا۔ مجھے کھڑا ہونا پڑا۔ میں نے ویدوں کے ان اشلوکوں کو پڑھا جو ایشور کی پدریت اور مادریت کی تعلیم دیتے ہیں۔ سب نے اس عظیم جلسہ عام میں شہدوں کے بے گناہ ہونے کا اعلان کیا اور آخر میں اس کے قدموں میں سرنگوں ہونے کو کہا جو سب کے لیے ماں اور باپ ہے۔

'جو لوگ وہاں موجود تھے وہ اس واقعہ کو بہتر طور پر بیان کر سکتے ہیں اور جب میں نے تین بار 'اوم شانتی - آمین' کہا تو پورے مجمعے نے اسے دوہرایا۔ یہ ایک بہت ہی حوصلہ بخش منظر تھا۔ پھر میں نیچے آیا اور ان سامعین کے ساتھ باہر نکلا 'جن کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ انتہائی متاثر ہوئے ہیں۔'

'اس کے بعد ملک کے تقریباً تمام حصوں میں ہندو سادھو مسجدوں میں مسلم اسٹیج سے لوگوں سے خطاب کرنے لگے اور مسلم مذہبی رہنماؤں نے ہندو مندروں میں سامعین کو مخاطب کرنا شروع کیا۔ میں اب بھی ان عظیم مناظر اور اس کے بعد کے واقعات سے متاثر ہوں۔ اور یہ امید کرتا ہوں کہ شکوک وشبہات کے بادل چھٹ جائیں گے۔ اعتماد اور سچ کا سورج پھر اپنی روشنی پوری آب وتاب کے ساتھ بکھیرے گا۔

'اندر یہ خوبصورت مناظر تھے اور باہر بکتر بند کاروں اور فوج اور پولیس کی جانب سے لوگوں کو بھڑکایا جا رہا تھا۔ لیکن اپنے لیڈروں کی تعلیم سے متاثر عوام نے قابل تعریف انداز میں صبر وبرداشت قائم رکھا۔'

افسوس اس بات کا ہے کہ 'قربت کی یہ لہر' جلد ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد 1920 کی ہنگامہ خیز دہائی شروع ہوئی

اور حالات پھر ویسے ہی ہو گئے جیسے کہ پہلے تھے۔ فرقہ وارانہ صورت حال پھر خراب ہوگئی۔ گاندھی ہی کے ہمعصر ڈاکٹر بی۔ آر امبیڈکر نے بعد میں اپنی کتاب 'پاکستان یا ہندوستان کی تقسیم' میں لکھا ہے کہ 'یہ ایک بدنام زمانہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اپنی تحریروں اور 'شدھی تحریک' میں اپنے رول سے ٹھیس پہنچانے والے کئی اہم ہندوؤں کو جنوبی مسلمانوں نے قتل کر ڈالا۔ سب سے پہلے اس کے شکار ہوئے سوامی شردھانند، جنہیں 23 دسمبر 1926 کو عبدالرشید نے گولی ماردی۔ اس کے بعد دہلی کے ایک سرکردہ آریہ سماجی لالہ نانک چند کا قتل ہو گیا۔ رنگیلا رسول کے پبلیشر راج پال کو 6 اپریل 1929 کو جب وہ اپنی دکان میں بیٹھے تھے، علیم الدین نے چھرا گھونپ دیا۔ ستمبر 1934 میں عبدالقیوم نے ناتھورام شرما کا قتل کر دیا۔ یہ ایک بڑی حراست تھی، کیوں کہ چھرا گھونپ کر ان کا قتل اس وقت کیا گیا جب وہ سندھ کے جوڈیشل کمشنر کی عدالت میں اپنی سزا کے خلاف اپیل کی سماعت کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان پر اسلام کی تاریخ پر ایک پرچہ شائع کرنے کے سلسلے میں مقدمہ چل رہا تھا۔ احمد آباد میں ہندو مہا سبھا کے اجلاس کے بعد ہندو سبھا کے سکریٹری کھنہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ مگر ان کی جان بچ گئی۔'

30 نومبر 1927 کو ٹائمز آف انڈیا نے اپنے کالم 'تھرو انڈین آئیز' میں لکھا 'ایسی خبر ملی ہے کہ سوامی شردھانند کے قاتل عبدالرشید کی روح کے درمیان بلند کرنے کے لیے دیوبند کی معروف اسلامی درسگاہ کے اساتذہ اور علماء نے پانچ مرتبہ قرآن خوانی کی ہے۔ ان کا ارادہ یومیہ، قرآن مجید کی سوا لاکھ آیات کی تلاوت کرنے کا ہے۔ ان کی دعا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم (عبدالرشید) کی روح کو اعلا علیین میں جگہ مرحمت فرمائے۔'

3

1920 کی تلاطم خیر دہائی

ہندو۔مسلم کش مکش

1920 کی اضطراب انگیز دہائی کے دوران پائیدار فرقہ وارانہ خیر سگالی پیدا کرنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مشترکہ محاذ بنانے کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں، ان کے برعکس، فرقہ وارانہ کش مکش میں اتنی ہی شدت آتی چلی گئی۔ وقفے وقفے سے ہونے والے ہندو۔مسلم تصادمات کا تجربہ تو پہلے بھی ہوتا رہا تھا، مثلاً 14-1904 اور 18-1917 کے دوران۔(1) یہ واقعات کسی نہ کسی صورت میں ایسے دنوں میں پیش آئے جب ہندوستان میں سیاسی اقتدار کی منتقلی کے لیے قدم اٹھائے گئے۔ جہاں بھی مسلمانوں کی برتری میں کمی آئی، ہندوؤں نے بڑی آسانی سے اس خلا کو پُر کردیا۔ اس سے پیدا شدہ مخالفت کے ردعمل میں کش مکش کے شرارے تو پھوٹنے ہی تھے۔ اس کے ساتھ ہی، جیسے جیسے سیاسی اقتدار رفتہ رفتہ انگریزوں سے ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل ہوا (غالباً حالات کے دباؤ سے)، منتقلی کے اس عمل نے بھی ہندو۔مسلم تعلقات پر زبردست دباؤ ڈالا۔ پھر یہ بھی کہ سست رفتاری اور چھوٹی چھوٹی قسطوں میں ہونے والی اقتدار کی اس منتقلی نے سماج میں پہلے سے موجود تقسیموں کی دھار تیز تر کردی، اور نشستوں کے تحفظ جیسے معاملات نے فرقہ وارانہ خلیج کو وسیع تر کردیا۔ 1920 کی دہائی کے دوران، ہندو۔مسلم تعلقات ایسی کئی تحریکوں سے بھی متاثر ہوئے جو احتجاج کی صورت میں پیدا ہوئی تھیں اور احتجاج کی ان لہروں نے مزید کئی جوابی تحریکوں کو جنم دیا۔ افسوس کہ یہ تمام باتیں ہندو۔مسلم رشتوں کے تاریک پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، 1919 میں ہونے والی کونسل اصلاحات نے دونوں فرقوں کو قریب تر لانے میں مددگار ہونے کے بجائے واقعتاً انہیں اور بھی منقسم کردیا۔ اس کے علاوہ، اس دوران تحریک عدم تعاون کے عارضی طور پر ملتوی ہوجانے کے سبب ایک قومی سیاسی اتحاد تشکیل دینے کی آرزوؤں کو ایک اور صدمہ پہنچا۔ ان تمام معاملات کا شکار یقینی طور پر

'ہندو۔ مسلم اتحاد' کا نعرہ بنا جس کا ذکر اب بڑے منفی انداز میں کیا جانے لگا تھا، یا پھر یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ہی اسے اخباروں اور عوام کے درمیان یکساں طور پر طنز و تضحیک کا ہدف بنایا۔ پریس ایکٹ کے کالعدم ہوجانے اور خلافت والوں کے ساتھ کانگریس کا اتحاد ختم ہونے کے بعد پریس بھی فرقہ وارانہ تصادمات کی سنسنی خیز رپورٹنگ کی اپنے دیرینہ روش پر واپس آ گیا۔

1920-21 میں خلافت تحریک کے دوران پیدا ہونے والا ہندو۔ مسلم اتحاد دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ خلافت کے خاتمے اور گاندھی کی طرف سے تحریک عدم تعاون کی منسوخی کے بعد، انگریزوں کے خلاف بنایا گیا متحدہ محاذ جلد ہی بکھر گیا۔ 1919 کے ایکٹ کے ذریعے کی جانے والی مونٹ فورڈ اصلاحات سے، دو سطحی نظام حکمرانی جن کا خاص عنصر تھا، انتخابی سیاست میں مقابلہ آرائی کا دور شروع ہوا، خواہ اس میں رائے دہندگان کی تعداد کتنی ہی محدود اور صرف ضلع اور صوبائی سطح پر ہی کیوں نہ رہی ہو۔ ان اصلاحات کے ساتھ علاحدہ حلقہ انتخاب کا معاملہ بھی سامنے آیا، اور۔ ہندو اور مسلمان اب جمہوری مقابلہ آرائی میں آمنے سامنے آگئے، جو پہلے سے موجود سماجی کشیدگی پر ایک اور اضافہ تھا۔ دونوں جماعتوں کے کئی سیاسی رہنماؤں کی پُر اثر کوششوں کے باوجود 1920-21 کے زمانے میں پیدا شدہ ہندو مسلم تعاون کا جذبہ پھر سے زندہ نہیں کیا جا سکا۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہونے والے اختلافات مثلاً مسجدوں کے سامنے گانا بجانا، تعزیے کا جلوس یا عید کے موقعے پر گئوکشی، اکثر فرقہ وارانہ تشدد اور کشت خون کے بڑے واقعات میں تبدیل ہوجاتے تھے۔ 1923 میں ملتان اور امرتسر میں سنگین فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ مسلمانوں کی جانب سے اپنے آپ کو متحد اور منظم کرنے کے لیے 'تنظیم' اور 'تبلیغ' کی فرقہ وارانہ تحریک شروع کی گئی۔ اس کے ردعمل میں ہندو مہا سبھا نے بھی ہندوؤں کو مضبوط کرنے کی ٹھانی اور اس کے لیے 'سنگٹھن' کی تحریک شروع کی گئی، جس کا مقصد جسمانی طور پر مضبوط اور منظم ہونا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سوامی شردھانند نے 'شدھی' تحریک شروع کی جو اسلام قبول کرنے والوں مثلاً ملکانہ راجپوتوں کو ہندو مذہب میں واپس لانے کی ایک کوشش تھی۔ 'سنگٹھن' اور 'شدھی' کی تحریکیں، جن کی مسلمانوں نے سخت مذمت کی، دونوں فرقوں کے درمیان سنگین تصادم کا سبب بن گئیں۔

ہندو مہا سبھا نے بھی ہندوؤں کو طاقت دینے کی ٹھانی اور اس کے لیے دبے کچلے طبقوں کو اعلا طبقوں کے حقوق و مراعات دلانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ چھوا چھوت کے خاتمے کی اس کوشش کا مقصد دبے کچلے لوگوں کو ہندو سماج میں جذب کرنا نہیں بلکہ انہیں آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ اس سے بھی مسلمانوں کے شکوک و شبہات میں اضافہ ہوا۔ پھر مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں، مذہب تبدیل کرانے کے سلسلے میں جوش و خروش کا مقابلہ شروع ہوا۔ ان خطرناک رجحانات کے پیش نظر محمد علی جوہر نے 1923 میں مسلم لیگ کے اجلاس کا صدارتی خطبہ دیتے

ہوئے کہا، 'مجھے یقین ہے کہ دونوں فریقوں کی نگاہ بہشت کی بجائے آنے والی دس سالہ مردم شماری پر ہے... اور میں کھل کر اعتراف کرتا ہوں کہ میں ایسے ہی مواقع پر اس بات پر آہ بھرتا ہوں کہ میرے آباء واجداد نے سارے فیصلے سروں کو گننے کے بجائے انہیں کاٹنے کے ذریعے کیوں کیے۔'

اگست 1921 میں، جنوبی ہند کے مغربی ساحلوں سے موپلاؤں 2 کی بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ اس قسم کی بے چینی کی ایک پوری تاریخ موجود تھی۔ شاید اسی لیے شروع میں اس پر کوئی تعجب آمیز ردعمل بھی ظاہر نہیں ہوا۔ لیکن جب اس نے ایک بڑی بغاوت کی شکل اختیار کرلی، جس میں تقریباً 50000 لوگوں نے براہ راست حصہ لیا، تو آخرکار انگریزوں کی ہندوستانی فوج نے اس کے خلاف اتنے بڑے پیمانے پر جوابی کارروائی کی کہ اسے '1857 ... کے بعد، جنگ کا معزز نام دیے جانے کے لائق واحد اندرونی کارروائی' سے تعبیر کیا گیا۔ 3 حکومت نے اس 'بغاوت' کو حکومت کے خلاف کانگریس۔ خلافت کی مہم قرار دیا۔ برطانوی راج 4 کے مطابق خلافت کے نظریے نے اس بغاوت کو مذہبی شدت جذبات فراہم کردی تھی۔

اس کے فوراً بعد، پنجاب میں، جہاں رولٹ ایکٹ کے بعد قائم ہونے والے مارشل لا کی یادیں ابھی تازہ تھیں، یہ تشویش ظاہر کی گئی کہ 1919 کی زیادتیاں مالابار میں بھی دہرائی جاسکتی ہیں۔ اس وقت کی ایک محترم اجتماعی شخصیت، لالہ لاجپت رائے، کے زیر ادارت لاہور سے شائع ہونے والے اخبار 'وندے ماترم' نے اس کی نہایت بے باک اور تلخ وتند مذمت کی۔ برطانوی راج نے موپلا بغاوت کے لئے خلافت تحریک ذمے دار ہے' قسم کے جو دلائل پیش کیے تھے، لالہ جی نے انہیں محض 'ایک خیالی سبب' قرار دیا اور دلائل کے ساتھ اس بات پر زور دیا کہ 'اگر یہ بغاوت خلافت تحریک والوں یا خلافت سے متعلق تجاویز کے سبب برپا ہوئی ہے تو اسے سب سے پہلے کراچی یا سندھ میں ہونا چاہیے تھا۔' 5 ایسے اخبار جو جنوبی ہند میں ہندوؤں پر ہونے والے نئے مظالم کی روزانہ سامنے آنے والی روداووں کے باوجود حکومت کی مخالفت اور ہندو۔مسلم اتحاد کی حمایت کے موقف میں برقرار رہنا چاہتے تھے، انہیں بھی اپنے اس موقف پر قائم رہ پانا بہت مشکل محسوس ہونے لگا۔ مالابار کے فسادات کے نتائج بڑی تیزی سے شمالی ہند کو متاثر کرنے لگے اور انہوں نے یہاں بھی ہندو۔مسلم تعلقات کو سخت نقصان پہنچایا۔

فرقہ پرستی کی ان باہم متصادم لہروں کے پیش نظر کانگریس اپنے آپ کو باہم برسرپیکار خود غرضانہ مفادات کے درمیان پھنسا پایا۔ عملی سطح پر دیکھیں تو ان تصادمات کے ظاہر ہونے کا اس سے بدتر وقت ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اول تو یہ کہ کانگریس کے بیشتر اہم رہنما اس وقت قید میں تھے، پھر آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں پارٹی ایک گومگو کی کیفیت سے دوچار تھی اور اس کا خزانہ بھی خالی ہوتا جارہا تھا۔ نظریاتی لحاظ سے ہندو۔مسلم اتحاد کے لیے عہد بستہ کانگریس محسوس کررہی تھی کہ یہ کشمکش اس کے اس آدرش کی بنیادوں کو ہی پوری طرح کھوکھلا کررہی تھی۔ بلاشبہ یہ توقعات بھی تھیں کہ کانگریس ان تنازعات

میں ثالثی کا کردار ادا کر سکتی ہے اور اس نے اس سلسلے میں بعض عبوری کوششیں بھی کیں مگر وہ ناکام رہیں۔ رہنی بھی تھیں، کیوں کہ ایسی سبھی ہوئی کوششوں میں نہ کوئی یقین واعتماد تھا نہ کوئی عزم۔

ان دونوں ہندو مفادات پر زور دینے کے معاملے میں صوبہ پنجاب متحدہ صوبہ جات سے خاصا آگے تھا، جہاں 1911 تک ہندو سبھا قائم نہیں ہوئی تھی اور جہاں اس تحریک کی کوئی ٹھوس بنیاد 1915 تک پیدا نہیں ہو پائی تھی۔ درحقیقت 1922 ہندو مہاسبھا کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن سال ثابت ہوا اور موٹے طور پر یہ ان واقعات کے سبب ہوا جنھوں نے ہندو فرقے کو درپیش 'مسلم خطرے' کو ایک ڈرامائی مگر ٹھوس شکل دے دی۔ مالابار کی موپلا بغاوت کی خبریں مسلسل اخباروں میں جگہ پا رہی تھیں اور 1922 کے موسم خزاں کے دوران، پنجاب میں ہندوؤں پر ہونے والے مظالم کی خبریں بھی ان پر مستزاد ہو گئیں۔

ستمبر 1922 میں، ماہ محرم کے دوران، ملتان میں ایک بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہو گیا جس کا قہر ہندوؤں پر ٹوٹا۔ اس وقت 'گرو کا باغ' 6 میں اکالی سکھوں سے متعلق ہنگاموں کی تفتیش کے لیے پہنچنے والے پنڈت مدن موہن مالویہ نے امرتسر اور لاہور میں بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے ملتان کے فساد کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ لاہور میں انہوں نے ملتان کے دل دہلا دینے والے واقعات کی تفصیلات پیش کیں اور اپنی حفاظت آپ نہ کر پانے کے لیے ہندوؤں کی شدید نکتہ چینی بھی کی۔

موپلا بغاوت اور ملتان میں محرم کے فسادات کے ملے جلے اثرات کافی دنوں تک برقرار رہے۔ بعد کے چھے برسوں میں 'مالابار اور ملتان' کی صدائیں، ایک دوسرے سے مل کر، اپنے احیاء کے لیے ہندوؤں کے اٹھ کھڑے ہونے اور متحدہ ہو جانے کے نعرۂ جنگ کی طرح گونجتی رہیں۔ دسمبر 1922 میں، گیا میں، دیگر کل ہند تنظیموں کے سالانہ اجلاسوں کے فوراً بعد، اسی جگہ ہندو مہاسبھا کا بھی سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کا بنیادی مزاج پنڈت مالویہ نے متعین کیا۔ انہوں نے ہر گاؤں میں ہندو سبھائیں قائم کرنے کی تجویز رکھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ اس اجلاس میں پیش کردہ تجاویز میں پنڈت مالویہ کی تقریر کی بازگشت کے طور پر اب پہلے سے کہیں زیادہ شدت پسندانہ رخ نظر آنے لگا۔ 7

دریں اثنا، 1920 کی دہائی کے وسط کے دوران، ہندو تحریکوں کا توڑ کرنے کے لئے کی گئی مسلمانوں کی کوششوں میں کوئی باہمی ربط و نظم نہیں تھا، اور اسی لئے وہ اتنی موثر نہیں رہیں۔ ہندو مہاسبھا کے 'مہابیر دل' کے جواب میں 'علی غول' 8 کے نام سے جسمانی ورزش کی غرض سے مسلمانوں کی کچھ ٹکڑیاں تشکیل دینے کی کوشش ضرور کی گئی مگر اس کے نتائج بھی بس یوں ہی رہے۔ سنگھٹن 9 کا ایک مکمل متبادل قائم کرنے کی صرف ایک کوشش کی گئی اور وہ بھی کم و بیش صرف ایک واحد شخص کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے، جو شوکت علی کے ہم نوا اور رفیق کار تھے، 1924 میں تنظیم تحریک شروع کی۔ اس کے لئے انہیں مرکزی خلافت کمیٹی سے بھی کچھ حمایت حاصل ہوئی۔ انہوں نے امرتسر سے تنظیم

نام کا ایک اردو روزنامہ جاری کیا اور ساتھ ہی سرمایہ اور عوامی تائید حاصل کرنے کے لئے جگہ جگہ تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ سنگٹھن کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل کچھ بکھرا بکھرا سا رہا اور اس کے نتیجے میں کوئی نیا ادارہ وجود میں نہیں آیا، مگر دوسری طرف اس سے ہندوؤں کو کوئی خاص راحت محسوس نہیں ہوئی جو اپنے اس یقین پر قائم تھے کہ اپنی جگہ مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے مسلمانوں کا مقابلہ کیا جانا چاہیے۔

ہندو مسلم تہواروں کا ایک ساتھ پڑنا بھی دونوں فرقوں کے درمیان تصادم کو ہوا دینے کا ایک بڑا سبب تھا (اب بھی ہے)۔ مثلاً رام لیلا یا دشہرے اور محرم 10 اور بقرعید 11 کا ایک ساتھ پڑنا خاص طور پر ایک بڑی مصیبت تھا۔ گئوکشی اور مسجدوں کے سامنے باجا بجانے کے واقعات کے سبب بھی امن وامان میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہمیشہ رہتا تھا اور اب بھی رہتا ہے۔ 1920 کی دہائی کے دوران مذہبی تہواروں اور فرقہ وارانہ تصادمات کے درمیان ایسا گہرا تعلق پیدا ہوگیا تھا کہ برطانوی مشاہدین اس دوران ہونے والی ہندو مسلم جھڑپوں کو تضحیک کے انداز میں 'گائے اور موسیقی' کا مسئلہ کہنے لگے تھے۔

تقریباً 1923 کے بعد سے، ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی ایک جھڑی سی لگ گئی جس سے سیاسی ماحول بدتر ہوگیا۔ 1923 میں، کلکتہ میں ہونے والے فسادات اور 1924 میں دہلی، گلبرگہ اور کوہاٹ کے فسادات اس زمانے میں بڑے فرقہ وارانہ تصادمات کی چند مثالیں ہیں۔ ان میں سنگین ترین فساد شمال مغربی سرحدی صوبے (این ڈبلو ایف پی) کے کوہاٹ علاقے کا فساد تھا، جہاں مسلمانوں کی آبادی تقریباً 92 فی صد تھی۔ جھگڑا سناتن دھرم سبھا، کوہاٹ کے شائع کردہ ایک پمفلٹ سے شروع ہوا جس میں ایک اسلام مخالف نظم شامل تھی۔ یہ ایک اتنی ہی اشتعال انگیز ہندو مخالف نظم کا ردعمل یا جواب تھا جو ایک مسلم خبرنامے میں شائع ہوئی تھی۔ کوہاٹ کے مسلمان اس اشتعال انگیز نظم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ہندوؤں کی جانب سے اس غلطی پر اظہار افسوس کرنے والی کئی قراردادیں منظور کئے جانے کے باوجود انہیں منہ توڑ جواب دینے کی باتیں ہونے لگیں۔ کوہاٹ کے مسلمانوں نے سخت انتقامی کارروائی کرنے کی ٹھان لی۔

ضلع انتظامیہ حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں کر سکا۔ 9 ستمبر 1924 کو تشدد پھوٹ پڑا اور کئی دن تک جاری رہا جس کے دوران ہندوؤں کو بڑے پیمانے پر قتل کرنے، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات ہوتے رہے۔ ہندوؤں کو تحفظ دینے میں حکومت کی ناکامی پر سارے ملک میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ گاندھی نے کوہاٹ جانے کی کوشش کی تو وائسرائے نے انہیں اجازت نہیں دی۔ ایک آزادانہ تحقیقات کے مطالبے پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کے بجائے حکومت نے اپنے طور پر تحقیقات کرائی، اور جیسا کہ معلوم تھا، اس میں مقامی افسروں کو تمام الزامات سے بری کر دیا گیا۔

کوہاٹ المیے پر کانگریس، مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا نے جس انداز کا ردعمل ظاہر کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فرقہ وارانہ سوال کو کس طرح دیکھا جاتا تھا۔ موتی لال نہرو نے، کانگریس کے اجلاس میں، اس سلسلے میں ایک قرارداد پیش کی جس میں نہایت احتیاط پسندی کے ساتھ کسی بھی فریق پر الزام دھرنے سے گریز کیا گیا تھا۔ انہوں نے بعد

میں اعتراف کیا کہ یہ 'قرارداد غیر متنازعہ فیہ تھی اور کانگریس کو کسی چیز کا پابند نہیں کرتی تھی'[12] مسلم لیگ کا احساس تھا کہ کوہاٹ میں ہندوؤں کا قتل بلا اشتعال نہیں تھا، بلکہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو حد درجہ مشتعل کیا گیا تھا اور تشدد میں پہل ہندوؤں نے کی تھی۔ لالہ لاجپت رائے نے ہندو مہا سبھا کی جانب سے بولتے ہوئے کہا: 'یہ مان بھی لیا جائے کہ خطا ہندوؤں کی تھی تب بھی کیا یہ خطا اتنی تھی جتنی سزا انہیں دی گئی؟'

گاندھی اور شوکت علی نے بھی مشترکہ طور پر کوہاٹ فسادات کی تحقیقات کی۔ چوں کہ گاندھی کو کوہاٹ نہیں جانے دیا گیا تھا اس لئے یہ تحقیقات راول پنڈی میں کی گئی۔ لیکن اس کے نتائج میں، گاندھی اور شوکت علی کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ شوکت علی کی نظر میں فائرنگ اور آتش زنی کے واقعات اتفاقیہ تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف جہاد کیا تھا۔ دوسری جانب گاندھی کا کہنا تھا کہ 10 ستمبر کو مسلمانوں نے بربریت اور تشدد کی ساری حدیں توڑ دی تھیں۔ اگر ہندوؤں کو ان کے گھروں سے نکال کر چھاؤنی نہ پہنچایا گیا ہوتا تو ان میں سے بہت کم لوگ زندہ بچ پاتے۔

1925 اور 1926 کے دوران بھی دہلی، الہ آباد اور کلکتہ میں فسادات کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے ساتھ ہی ہندو۔مسلم تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ زبردست فرقہ وارانہ کشیدگی کے اس تمام عرصے کے دوران ایک خاص بات یہ رہی کہ گاندھی نے ایک لاتعلقی کا رویہ اختیار کر لیا، شاید انہوں نے امن و ہم آہنگی کی ساری کوششوں کو بے اثر جان کر، ان سے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے، جس میں بڑے سبق ہیں، کہ تمام تر فرقہ وارانہ تشدد انگریزوں کے زیر اقتدار علاقوں میں ہو رہا تھا، جب کہ ہندوستانی ریاستوں اور رجواڑوں کے علاقے اس سے تقریباً پوری طرح پاک تھے۔ 1924 میں گلبرگہ میں، جو نظام کا علاقہ تھا، ہونے والا فساد اس سلسلے میں شاید واحد افسوس ناک استثنائی واقعہ تھا۔

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس)

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ 1925 میں ناگپور میں قائم کی گئی جس کے بانی ڈاکٹر کے بی ہیڈگیوار تھے۔ وہ پکے کانگریسی تھے جنہوں نے 1915 میں اس سے وابستگی اختیار کی تھی۔ وہ کانگریس میں جاری دھڑے بندی اور باہمی اختلافات پر نالاں تھے اور ان کی یہ ناراضگی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ عدم تعاون کے گاندھیائی طریقے کو بھی تحریک آزادی کے تقاضوں کے لئے موزوں نہیں پاتے تھے۔ برطانوی تسلط کے علاوہ، مسلمانوں کی جانب سے لاحق خطرہ بھی ڈاکٹر ہیڈگیوار کے لیے پریشان کن تھا۔ 1923 کے ناگپور فسادات نے انہیں حد درجہ متاثر کیا تھا۔

آر ایس ایس کی خصوصیات ہی اس کا نشان امتیاز تھیں: خاکی نیکر پہنے باوردی رضا کار اور ان کا فوجی انداز کا مارچ ہندو معاشرے کو زیادہ مربوط اور مضبوط بنانے کی کوشش کی علامت تھے۔ ڈاکٹر ہیڈگیوار نے پہلا کام جو آر ایس ایس کے ذمے کیا وہ تھا 1926 میں رام نومی تہوار کے دوران تیرتھ یاتریوں کو مسلم 'فقیروں' اور برہمن سادھوؤں کی شدتوں سے بچانا۔

ان دنوں، مسلمان گنیش چترتھی کے جلوس اپنی بستیوں سے ہوکر یا مسجدوں کے سامنے سے گذرنے نہیں دیتے تھے۔ 1927 کے ناگپور فسادات کے بعد ڈاکٹر ہیڈگیوار نے بطورِ خاص محسوس کیا کہ ہندو اس تہوار میں شرکت کرنے سے گریز کررہے ہیں یا تذبذب کے شکار ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ان متنازعہ راستوں پر گنیش کے جلوس کی قیادت کرنے کی ذمے داری خود اٹھائی اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ ہوگئی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر روزالینڈ روہین لان☆ نے ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ: 'انگریزوں کے قانون پسندانہ طریق کار کا فرقہ وارانہ تصادمات کے طول پکڑنے میں خاصا دخل رہا ہے۔ ان کا طریقہ بنیادی طور پر یہ تھا کہ تمام فریقوں کو ان کے موقف اور معاملات مثلاً کسی جلوس کا گذرنا، مسجد کے سامنے باجا بجانے پر تنازعہ وغیرہ کے اچھے برے پہلوؤں کے فیصلے کے لیے عدالت میں آنے کی دعوت دی جائے۔ انگریزوں کی نگاہ میں 'نظیر' ہی سب کچھ تھی۔ اس طرح ہر فریق کے رہنماؤں کے لیے اپنے موقف کی ترجمانی عزت و ناموس کا مسئلہ بن گئی۔ اس کی وجہ سے تنازعات طول پکڑتے گئے اور ان میں اور زیادہ تلخی پیدا ہوتی چلی گئی'

گہری جڑیں رکھنے والے ہندو۔ مسلم سوال کے مذہبی اور سماجی عاملوں کا یہ مختصر خاکہ، ہمیں ایک جانب دونوں فرقوں کے سیاسی ارتقا کا پس منظر فراہم کرتا ہے اور دوسری جانب اس بنیادی سبب کو بھی نشان زد کرتا ہے کہ یہ سماج میں موجود فرقہ وارانہ تقسیم ہی تھی جو مفاہمت پیدا کرنے کی تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود، تصادم، علاحدگی اور غلبہ حاصل کرنے کے جذبوں کی آگ کو ہوا دیتی رہی۔ ایک طرف سیاسی فکر پر سوراج یا خودحکومتی، ہندو۔مسلم اتحاد اور اسی طرح کے دیگر معاملات سے حاوی رہے تو دوسری طرف سماجی سطح پر عقیدوں اور مذہبی عمل اور رسوم کے اختلافات سماجی پیرہن کو زیرِ بار اور کبھی کبھی تار تار کرنے کے درپے رہے۔

یہی سب مختصراً 1920 کی دہائی کے بعد ہونے والے اہم واقعات کا سماجی پس منظر تھا۔

بڑھتی ہوئی خلیج

پہلی عالمی جنگ شروع ہوتے ہی تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا، اور بڑی تیز رفتاری کے ساتھ۔ اب اکثر کہا جانے لگا کہ انگریز ہمیشہ تو حکومت کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ پہلی عالمی جنگ، اور یورپی سرزمین پر یورپی فوجوں کے خلاف ہندوستانی فوجیوں کی کارروائیوں سے کئی پیغامات برآمد ہوئے جن کا تجزیہ کسی پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے انہدام اور خلافت کے خاتمے 13 کے بعد 'سیورلیس کا معاہدہ' ہوا 14 جس کے کئی غیر متوقع نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان عارضی طور پر ہی سہی ایک مشترک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے۔ خلافت کے خاتمے پر ہونے

☆ پروفیسر روزالینڈ روہین لان، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہندوستانی تاریخ و تہذیب کے شعبے کے سربراہ ہیں۔

والا ردعمل، جس سے خلافت تحریک پیدا ہوئی، ہمارے اَن چاہے نتائج کے نظریے کی ایک اور مثال ہے۔

ان تمام عاملوں کے ایک ہی وقت یکجا ہو جانے کے سبب ہی، انگریزوں کے اس اقدام کو، جس کا صرف دو سال پہلے خیر مقدم کیا جاتا، اب تشکیک کی نظروں سے دیکھا گیا۔ آخر کار 1919 میں جب 'کونسل اصلاحات' پیش کی گئیں تو اس پر ہندوستانی ردعمل میں یہی رویہ کارفرما تھا۔ لیکن تب تک کئی اور الم ناک، تکلیف دہ اور تقسیم کرنے والے مسائل سامنے آ چکے تھے جن کی وجہ سے ہر طرف شکست آرزو سے پیدا شدہ مایوسی چھا گئی۔ 13 اپریل 1919 کو جلیاں والا باغ میں قتل عام ہوا۔ اس سے سارے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور برہمی کی ایسی شدید لہر اٹھی اور کل ہند پیمانے پر احتجاج کی ایسی زبردست مہم چل پڑی کہ اس کے سامنے برطانوی راج کے دیگر تمام اقدامات معدوم ہوتے چلے گئے۔ جلیاں والا باغ کے المیے نے ہی گاندھی کو، جو اب تک 'اتحادیوں' کے ساتھ تعاون کی وکالت کر رہے تھے، عوامی جدوجہد اور عدم تعاون کی تحریک چلانے کے لئے ایک محاذ فراہم کر دیا۔ یہیں سے کانگریس اعتدال پسندی کے رویے سے ہٹ کر تیزی کے ساتھ مہذب حکم عدولی (Civil disobedience) کی جانب چل پڑی۔ یہ تبدیلی سب سے زیادہ طاقت ور انداز سے ہوم رول لیگ کے طرز عمل میں ظاہر ہوئی جس نے اپنے آپ کو ایک آئینی تنظیم کے بجائے ایک سیاسی تنظیم میں تبدیل کر ڈالا۔ مگر اس کا ذکر ہم بعد کے ابواب میں کریں گے۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ہی، 1916 میں، لکھنؤ میں ہونے والے اپنے میں مسلمانوں کو تمام صوبائی قانون ساز اداروں میں علاحدہ نمائندگی دینے اور ہندو اکثریتی علاقوں میں بھی انہیں 'وزن' دینے سے اتفاق کر لیا۔ اس سے دونوں فرقوں اور ان کی سیاسی تنظیموں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اشتراک و تعاون کی ایک بنیاد فراہم ہو گئی۔ کے ایم منشی نے اپنی کتاب پلگریمیج ٹو فریڈم (آزادی کی جانب تیرتھ یاترا) میں ان واقعات کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

'جناح اس وقت ایک طرح سے کانگریس اور لیگ دونوں پر حاوی تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے آئین کا مسودہ تیار کرنے اور کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاسوں میں اسے منظور کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ تاریخی 'لکھنؤ معاہدہ' اس آئین کا ایک لازمی جزو تھا۔ اس کے تحت لیگ کے زیر قیادت مسلمانوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دینے کا عہد کیا اور اس کے جواب میں کانگریس نے مسلمانوں کو علاحدہ حلقۂ انتخاب کا تحفہ دیا جس میں انہیں ان کی عددی قوت سے کہیں زیادہ 'وزن' دیا گیا تھا۔'15

یہ وہی جناح تھے جن کو آگے چل کر ایک طرف ہندو-مسلم اتحاد کو تباہ کرنے کے لیے لتاڑا گیا تو دوسری طرف پاکستان کا بانی ہونے کی حیثیت سے زبردست احترام و عقیدت سے نوازا گیا۔ انہیں 'راست کارروائی' کی سازش کرنے والا اور ہندوستان کی تہذیبی زندگی کو تباہ کرنے والا بھی قرار دیا گیا۔ مگر یہ ساری باتیں بعد کی ہیں۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے کہ وہ 1906 میں کانگریس میں ایک قوم پرست مسلمان کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے اور ان کا واحد علامتی کارنامہ، یقینی طور پر

1916 تک، 'لکھنؤ معاہدہ' تھا جس نے ہندو-مسلم اتحاد کی ایک مثال قائم کی۔

تاہم فضا میں تبدیلی کے رنگ پہلے ہی سے ابھرنے لگے تھے۔ راستے جدا ہو رہے تھے، اور گاندھی کی جانب سے خلافت کی حمایت اور جناح کی طرف سے اس کی مخالفت ہی نہیں، ہوم رول لیگ کا سارا معاملہ بھی اس کے اسباب میں شامل تھا۔ کے۔ ایم منشی کہتے ہیں: 'گاندھی نے ہوم رول لیگ کے اغراض و مقاصد کو، مملکت برطانیہ کے اندر رہتے ہوئے خود حکومتی حاصل کرنے کے بجائے، مکمل سوراج (اور) برطانیہ کے ساتھ تمام رشتوں سے گلوخلاصی قرار دے دیا۔ پھر لیگ کے مقاصد میں، ''پرامن اور جائز طریقوں'' کے الفاظ کے بجائے ''آئینی طریقوں'' کے الفاظ رکھ دیئے گئے۔ جب جناح نے ہوم رول لیگ کے ضابطوں کا حوالہ دیتے ہوئے احتجاج کیا کہ تین چوتھائی اکثریت کی تائید اور مناسب نوٹس جاری کیے بغیر اس کے آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی اور کہا کہ '(یہ) قرارداد... معمول کی اکثریت کے ذریعے منظور کی گئی ہے، تو گاندھی نے، جو اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، اس اعتراض کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد، جناح 19 اور اراکین (بشمول منشی) کے ساتھ ہوم رول لیگ سے الگ ہو گئے۔' منشی نے اس واقعے کے ردعمل کے بارے میں لکھا ہے: 'جب گاندھی نے جناح اور ان کے حامیوں کو ہوم رول لیگ اور بعد میں کانگریس سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تو، جناح کے ساتھ، ہم سب نے محسوس کیا کہ گاندھی جی نے عوام پر اپنے زبردست اثرات کے زور پر غیر آئینی نوعیت کی جو تحریک (مہذب حکم عدولی) شروع کی ہے اس کے نتیجے میں ناگزیر طور پر بڑے پیمانے پر تشدد برپا ہوگا، اور اس طرح تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک پر مبنی خود حکومتی کے اداروں کا ارتقائی عمل رک جائے گا۔ عوام میں جابرانہ قوت پیدا کرنے سے صرف یہ ہوگا کہ دونوں فرقوں کے درمیان تصادمات بھڑک اٹھیں گے، جیسا ہوا بھی۔ حقائق کی اپنی گھری سمجھ کے تحت جناح نے اس معاملے میں گاندھی جی کے ساتھ کسی بھی بات چیت سے رخ پھیر لیا۔' منشی مزید لکھتے ہیں: 'ایک اور اہم واقعہ گاندھی کی جانب سے دو بھائیوں، محمد علی اور شوکت علی، کے زیر قیادت تحریک کی حمایت تھی جو پہلی عالمی جنگ کے بعد ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیئے جانے کے خلاف چلائی جا رہی تھی، کیوں کہ خلیفہ مسلمانوں کا مذہبی سربراہ تھا' 17۔ یہ بات کہ خلافت تحریک بنیادی طور پر مذہبی تھی ینگ انڈیا کے 20 اکتوبر 1921 کے شمارے میں شائع شدہ گاندھی کے اپنے ہی بیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا: 'میرا دعوا ہے کہ ہم دونوں کے لیے خلافت ایک بنیادی معاملہ ہے، شوکت علی کے لیے اس وجہ سے کہ یہ ان کا مذہب ہے، میرے لیے اس وجہ سے کہ میں خلافت کے لیے اپنی جان دے کر مسلمانوں کی چھری 18 سے گائے کے تحفظ کو یقینی بنا لوں گا، کہ یہ میرا مذہب ہے'۔

گاندھی نے خلافت معاملے کی حمایت فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے کی تھی کیوں کہ وہ صدق دل سے سمجھتے تھے کہ خلافت تحریک کی حمایت کر کے وہ ہندو-مسلم اتحاد کا مقصد حاصل کر لیں گے۔ منشی کے مطابق، جناح نے گاندھی کو خبردار کیا تھا 19 کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں اور ان کے حامیوں کے کٹر پن کو ہوا نہ دیں اور وہ خلافت تحریک

میں مضمر خطرات کو بھانپ لینے واحد شخص نہیں تھے۔ شری نواس شاستری نے (بھی) شری پی۔ ایس شیوسوامی ایر کو لکھا تھا '...مجھے ڈر ہے کہ خلافت تحریک ہمیں تباہی کی طرف لے جانے والی ہے'۔ اس کے علاوہ، کئی اور مصنفین نے بھی لکھا ہے کہ گاندھی جی کی جانب سے خلافت تحریک کی حمایت ایک غلطی تھی۔ برسوں بعد، رچرڈ کیسے، جو اس وقت بنگال کے گورنر تھے، کے ساتھ منجملہ ایک گفتگو کے دوران گاندھی نے کہا تھا: 'جناح نے ان سے کہا تھا کہ انہوں نے (گاندھی جی) بہت سے غیر صحت مندانہ عناصر کو کھینچ کھانچ کر ہندوستان کی زندگی میں داخل کرکے اور انہیں سیاسی اہمیت دے کر ہندوستان کی سیاست کو تباہ کر دیا، اور یہ کہ سیاست اور مذہب کی ایسی آمیزش جیسی انہوں نے کی ایک مجرمانہ فعل ہے۔ (20) (تاکید از مصنف)

1916 کا 'لکھنؤ معاہدہ' اس بات کا ایک نمایاں ثبوت ہے کہ عزم وارادے اور جذبۂ خیر سگالی کے حامل لوگ کیا کچھ حاصل کر سکتے ہیں لیکن آخر میں ناکام بھی رہ جاتے ہیں۔ جناح اور تلک اس معاہدے کو ممکن بنانے والے خاص کرداروں میں شامل تھے۔ جناح نے علاحدہ حلقۂ انتخاب کا بے لچک مخالف ہونے سے لے کر کچھ ترمیم کے ساتھ اس تصور کو قبول کرنے تک کچھ مسافت ضرور طے کی تھی، مگر یہ سب ہندو-مسلم اتحاد کے وسیع تر قومی مقصد کے لیے تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جناح نے اکثر اپنے موقف میں تبدیلی کی مگر اپنا سیاسی طریق کار نہایت استثنائی حالات میں ہی تبدیل کیا۔ ان کی اپنی افتادِ طبع ہی ایسی تھی کہ وہ اس احتجاجی طریق کار کے حامی نہیں ہو سکتے تھے جسے گاندھی نے اپنے بنیادی آلۂ کار کے طور پر اختیار کیا تھا۔ جناح کا آئینی کارطریق کی حدود میں رہنا، گاندھی کی شدید تر عوامی کشش جو تیزی سے ساتھ ان کے سیاسی اثرات میں اضافہ کر رہی تھی اور 1919 کے کونسل اصلاحات سے متعلق وسیع تر سیاسی رجحانات ایسے عوامل تھے جن کے سبب جناح کے لیے بہت سے دروازے بند ہوتے چلے گئے۔ مزید یہ کہ جیسے جیسے یہ خلیج چوڑی ہوتی گئی، آخر کار راہوں کا جدا ہونا ناگریز ہوتا چلا گیا۔ شاید یہ سب ان دونوں خاص کرداروں کی شخصیتوں میں خلقی طور پر موجود تھا یا پیش آنے والے واقعات کی چال ہی کچھ ایسی تھی یا پھر تیز رفتاری سے ظاہر ہونے والے عالمی معاملات کو یہی منظور تھا۔ جو بھی ہو، اب برطانوی راج کی شام کے سائے دھیرے دھیرے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

آیئے اب ہم اس وقت کے اہم واقعات پر دوبارہ ایک نظر ڈالتے چلیں۔ پہلا واقعہ، یقینی طور پر، 1909 کی کونسل اصلاحات کا تھا۔ ان اصلاحات کے تحت، حکومت، قانون ساز کونسلوں کو جواب دہ نہیں تھی اور نہ کونسلوں کے فیصلوں کو ماننے کی پابند تھی۔ 1919 کا ایکٹ آتے ہی یہ صورت حال بدل گئی۔ اب اقتدار پر حکومت کی اجارہ داری کم ہوگئی۔ یہ برطانوی راج کی جانب سے اپنے میں اختیارات کا کچھ حصہ، وہ خواہ کتنا ہی ذرا سا کیوں نہ ہو، رضاکارانہ طور پر تج دینے کا اقدام تھا، اور ایسا پہلی بار کیا گیا تھا۔ اس طرح تجے گئے اختیارات ہندوستانی ہاتھوں کو منتقل ہوگئے۔ اس کے نتیجے میں، برطانوی راج کے مناسب نظم ونسق کے لیے دوسروں کا تعاون حاصل کرنے کی ذمے داری اب حکومت کے سر آگئی۔

مونٹیگو۔چیمس فورڈ اصلاحات (جنہیں مونٹ فورڈ اصلاحات بھی کہا جاتا ہے) حکومت ہند ایکٹ، 1919 کے ذریعے حاصل ہونے والے قانون سازی کے اختیارات کے تحت نافذ کی گئیں۔اس ایکٹ کی رو سے صوبوں میں 'دوسطحی نظام حکمرانی' قائم کیا گیا یعنی منتظمہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا جس کے تحت پہلی بار بعض محکمے منتخب وزیروں کے زیر اختیار لائے گئے اور وہ قانون سازیہ کو جواب دہ ہو گئے۔باقی محکمے پہلے کی طرح سرکاری حکام کے ماتحت رہے اور بنیادی طور پر گورنر کی ایگزیکٹیو کونسل کے اراکین ان کے سربراہ رہے۔ان اصلاحات کو کھلے دل سے قبول نہیں کیا گیا تھا۔اس پر مستزاد یہ کہ دو سنگین غلط اقدامات ایک ساتھ روبہ عمل لائے گئے جس سے ان اصلاحات پر عمل درآمد کی دشواریاں بہت بڑھ گئیں۔ پہلی غلطی تھی رولٹ ایکٹ کی منظوری جس کی رو سے احتیاطی حراست کی اجازت دے دی گئی۔دوسرا غلط اقدام تھا جلیاں والا باغ میں جنرل ڈائر کے ذریعے بے گناہ لوگوں کا ناقابل تصور حد تک سفاکانہ اور مجنونانہ قتل عام۔اس کے علاوہ، گاندھی نے اب انگریزوں کے خلاف عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون تحریک بھی شروع کر دی۔

پھر بھی، 1919 کی ان کونسل اصلاحات نے ایسے بعض دوررس اثرات کے حامل رجحانات بھی جاری کر دیے جنہوں نے 1930 کی دہائی تک پیش آنے والے واقعات کو بڑی گہرائی سے متاثر کیا۔اول یہ کہ 1923 میں دوسرے کونسل انتخابات تک یہ بات واضح ہو چلی تھی کہ اب سے قومی سطح کی سیاست کو صوبوں کے مطالبات پر زیادہ اطمینان بخش انداز سے توجہ کرنی ہوگی، اور یہ بات اس صورت پر نمایاں اثرات مرتب کرے گی جسے کسی بہتر اصطلاح کی غیر موجودگی میں کل ہند محاذ کہا جا سکتا ہے۔ہندوستان کے نظام حکومت اور طرز حکمرانی سے متعلق مرکزی اہمیت کا حامل یہ سوال، جو 1920 کی دہائی کے دوران نہ تو تسلیم کیا گیا تھا اور نہ اسے زبان ملی تھی، اب اٹھایا جانے لگا: ہندوستان میں نظام حکومت کی نوعیت کیا ہوگی، وفاقی، غیر مرکوز یا وحدانی، مرکز رخی؟

اس طرح علاحدہ حلقہ انتخاب کے تنازعے میں اب دو سطحی نظام حکمرانی کے جھگڑے بھی شامل ہو گئے۔نو منتخب اراکین کے سامنے منصب اور اقتدار کی چمک دمک اور للک تو تھی ہی، اس میں اختیارات اور سرپرستی کے معاملات کا بھی اضافہ ہو گیا۔اس کے بعد ناگزیر طور پر ان منصبوں کے لیے مقابلہ آرائی شدید تر ہو گئی اور اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج اور بھی گہری ہونے لگی۔اقتدار کے لالچ نے لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلے پر لا کھڑا کیا، ایک دوسرے کی نفی کرتے ہوئے، اور ہندو۔مسلم، ذات برادری، فرقے اور طبقے کے مفادات پھر حاوی ہونے لگے۔اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تو ہونا ہی تھا یعنی منتقل محکموں پر صرف ایک فرقے کا مکمل غلبہ (مثلاً پنجاب میں)؛ اور سیاسی فائدے کے لیے فرقہ وارانہ جذبات کو سوچ سمجھ کر بھڑکانا (مثلاً متحدہ صوبہ جات میں) ایک عام طور پر استعمال کیا جانے والا سیاسی حربہ بن گیا (جو آج بھی ہے)۔اس کا سب سے زیادہ نقصان ہندو۔مسلم اتحاد کو پہنچا اور فرقہ وارانہ تقسیم میں اور شدت پیدا ہو گئی، کیوں کہ اب تنازعے کا ایک اور سبب بھی وجود میں آ گیا تھا۔مونٹ فورڈ اصلاحات کا مقصد اقتدار کی منتقلی تھا، اور اس طرح کہ برطانوی راج کے اختیارات میں عملاً ذرا بھی کمی نہ آنے پائے یا پھر یہ کہ کار حکمرانی میں کوئی ڈھیلا پن نہ آئے۔لیکن قومی جدوجہد میں

سرگرم سیاسی قوتوں کی کشاکش کی طرح، یہاں بھی صوبائی مفادات کل ہند مفادات سے متصادم ہو گئے۔ اُدھر انگریز، مرکز اور صوبوں دونوں میں اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے تقریباً ہمیشہ ہی صوبوں پر زیادہ بھروسا کرتے تھے، کیوں کہ بہر حال مرکز کی باگ ڈور تو پہلے ہی مضبوطی سے ان کے ہاتھوں میں تھی، مگر صوبے بھانت بھانت کے اور دور دراز تھے، اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے ان کا سر جھکانا لازمی تھا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انگریزوں نے دولت مند زمینداروں کے علاوہ زیادہ تر مسلمانوں پر تکیہ کیا، وہاں بھی جہاں ان کی اکثریت تھی اور وہاں بھی جہاں ایسا نہیں تھا۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کے لیے یہ بات چیت اہم ہو گئی کہ علاحدہ حلقۂ انتخاب برقرار رہیں۔ اور یہ کام صرف دہلی کی حکومت ہی کر سکتی تھی۔ اس معاملے میں ان (مسلم قیادت) کے لیے سب سے پریشان کن امر یہ امکان تھا کہ ہندو کسی دن مرکز کے اقتدار پر قابض ہو جائیں گے۔ لہٰذا صوبائی مسلم گروپ، اپنے مفادات کے پیش نظر تقریباً ہمیشہ ہی دہلی کی برطانوی حکومت کے حامی و حلیف رہے، کیوں کہ ان کے نزدیک ان کے لیے نرم گوشہ رکھنے والی دہلی ان کے مفادات کے تحفظ کی یقینی ضمانت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 1919 کی کونسل اصلاحات ایک طرح سے ہندو-مسلم تعلقات کے لیے وجہ انفصال ثابت ہوئیں کہ ان کے سبب یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کے قریب آنے کے بجائے اور دور ہونے لگے۔

1919 کی کونسل اصلاحات نے جناح اور مرکزی سطح پر ان کی سیاست کو کوئی خاص مدد نہیں پہنچائی جب کہ 'دو سطحی نظام حکمرانی' نے ان کے عزائم پر ضرور روک لگا دی۔ کانگریس کے عدم تعاون کے رویہ نے بھی 1920 میں قومی اسمبلی میں ان کا داخلہ نہیں ہونے دیا۔ 21 جناح کو کئی طرح کے تذبذب درپیش تھے۔ ایک تو یہ کہ گاندھی کے تعاون کی پوری طرح حمایت کرکے احتجاج کا طریقہ اختیار کرنا ان کے لیے محال تھا تو دوسری طرف کانگریس کو پوری طرح الگ تھلگ کر دینا بھی انہیں منظور نہیں تھا۔

1921 کے موسم گرما کے دوران، جناح انگلینڈ گئے اور وہاں گاندھی کی مہذب حکم عدولی کی تحریک کے جواب میں ایک آئینی عمل شروع کیے جانے کے حق میں فضا سازی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر پنجاب میں کی گئی غلطیوں کو ٹھیک کر دیا جائے 22 اور آئین میں ترمیم کرکے قابل قبول صوبائی خود مختاری کی گنجائش پیدا کرلی جائے، اور ساتھ ہی مرکزی حکومت میں کچھ حد تک 'دو سطحی نظام' جاری کر دیا جائے تو ہندوستان کے حالا کو معمول پر لایا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی گذارشات اکارت گئیں، کیوں کہ اگر جناح جس بات کی وکالت کر رہے تھے اس کی تھوڑی بہت حمایت موجود بھی تھی تب بھی وزیر خارجہ مونٹیگو کو آئین میں ترمیم کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

یہاں پنجاب اور بنگال (مسلم اکثریتی صوبے) اور متحدہ صوبہ جات، جو مسلمانوں کے لیے سیاسی اہمیت رکھتے تھے، کی صورت حال کا اجمالی تجزیہ 1920 کی دہائی میں پیش آنے والے واقعات کو سمجھنے میں مددگار ہوگی۔

بنگال کے ہندوؤں کی طرح وہاں کے مسلمان بھی کوئی یک جسمی (monolithic) اور متحدہ گروہ نہیں تھے۔ 1923 کے صوبائی انتخابات میں، کانگریس کے سوراجیوں 23 نے سی آر داس کی قیادت میں مسلم رائے عامہ کے کئی حصوں کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ ساری باتیں بڑی حد تک 'بنگال معاہدے' کا نتیجہ تھیں۔ 24 تاہم بنگال میں دو سطحی نظام حکمرانی قانون ساز کے عمل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی وجہ سے ناقابل عمل ہوگیا کیوں کہ اس اتحاد نے ہندوؤں کے ایک طبقے کو بے آرام کردیا۔

کلکتہ میں اپریل 1926 میں ہونے والے فسادات 25 نے دونوں فرقوں کے اس نازک اتحاد کو توڑنے میں بلاشبہ ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں بنگال میں 1926 کے انتخابات آنے تک دونوں فرقوں کی راہیں جدا ہوگئیں اور کانگریس کو مسلمانوں کی ذرا بھی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ 1923 کے 'بنگال معاہدے' کے باوجود، 1926 آتے آتے سوراجی بھی اپنے مسلم حامیوں کو اپنے ساتھ رکھ پانے میں ناکام ہو چکے تھے۔

ہندوستان کے مغربی حصے میں پنجاب میں سیاسی سرگرمیاں اب تک بڑی حد تک شہروں میں ہی مرکوز رہی تھیں مگر 1920 کی دہائی کے بعد ان کا رخ دیہات کی طرف ہوگیا۔ نتیجتاً مسلم سیاست کا مرکز بھی مالوا سے ہٹ کر ماجھا کی طرف منتقل ہوگیا۔ 26 بنگال کے برعکس یہاں دیہی مسلم قیادت کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ 1919 کے ایکٹ نے بھی اسے خاصا فائدہ پہنچایا تھا۔

لیکن فرقہ وارانہ لحاظ سے پنجاب کے حالات اس وقت سارے ملک میں شاید بدترین تھے۔ 1923 کے انتخابات سے کچھ پہلے (مارچ 1923) سی آر داس، نہرو، آزاد اور سروجنی نائڈو نے اس صوبے کا دورہ کیا تو انہوں نے وہاں کی صورت حال کو بالکل بے قابو پایا۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اس صوبے میں 1919 کی اصلاحات سے مستفید ہونے والی مسلم اکثریت اور ان اصلاحات کے غیر ارادی منفی نتائج کا نقصان اٹھانے والی حد درجہ تعلیم یافتہ، پیشہ وارانہ مہارت کی حامل اور سیاسی طور پر باشعور ہندو اقلیت کے درمیان مفادات کی ایک گہری کش مکش پیدا ہوگئی تھی، تبھی میونسپل ترمیمی ایکٹ 27 کے تحت میونسپل کمیٹیوں کی تشکیل نو کی گئی مگر اس کا فائدہ بھی مسلمانوں ہی کو پہنچا اور وہ بھی غیر حقیقت پسندانہ انداز سے۔ اگرچہ ہندوؤں کو نشستوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا مگر مسلمانوں کو زائد نشستیں دے دیے جانے کی وجہ سے کئی میونسپلٹیوں میں طاقت کا توازن پوری طرح تبدیل ہوگیا۔ اس سے ہندوؤں کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔

اس سب پر مستزاد یہ کہ آریہ سماج 28 پر گاندھی کے حملوں نے اس بے چینی کی آگ کو اور ہوا دے دی، کیوں کہ اس وقت پنجاب میں آریہ سماج کا زبردست اثر تھا، درحقیقت گاندھی یا کانگریس سے کہیں زیادہ، ستمبر 1924 میں کوہاٹ فسادات 29 کے بعد ہندوؤں کی بڑی تعداد نے سرحدی صوبے کو چھوڑ کر وہاں سے بہت دور راول پنڈی میں پناہ لی۔ دراصل ان لوگوں کو خود سرکاری انتظامات کے تحت وہاں سے منتقل کیا گیا تھا، اس وقت کسی نے بھی حکومت سے یہ نہیں پوچھا:

'جب نظم ونسق برقرار رکھنا، شہریوں کو تحفظ دینا نہ کہ انہیں ان کے گھروں سے نکا کر کہیں اور پہنچانا اس کی ذمے داریوں میں شامل ہے تو پھر یہ قدم کیوں اٹھایا گیا؟' ان گھر سے بے گھر، فریب خوردہ اور مضطرب شہری ہندوؤں نے جلد ہی اپنی سیاسی ترجیحات مرتب کرنی شروع کر دیں۔ اس کا پہلا مظاہرہ دسمبر 1924 میں ہوا جب گاندھی فرقہ وارانہ رشتوں میں بہتری لانے کے لیے لاہور پہنچے۔ اس موقع پر پنجاب کے شہری ہندو مہاتما جی کی کوششوں کو نامنظور کرتے ہوئے ان سے لاتعلق رہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب گاندھی ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک دیوہیکل شخصیت کی طرح موجود تھے۔

1925 آتے آتے پنجاب کے شہری ہندو نہ صرف اس بات کو نشان زد کر چکے تھے کہ ان کی پریشانیوں کی جڑ سیاسی نظام کا طرز عمل ہے بلکہ وہ مزید سیاسی رعایتیں دیے جلانے کے خلاف ایک مضبوط موقف بھی اختیار کر چکے تھے۔ ان کے نزدیک یقینی طور پر تب تک کوئی سیاسی رعایت نہیں دی جانی چاہیے جب تک ان کی پریشانیوں کا حل تلاش نہیں کیا جاتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ 1926 کے انتخابات کے نتائج کانگریس کے لیے تباہ کن تھے۔ کانگریس کو مسلم حمایت کا نقصان سوراجیوں کے مقابلے کہیں زیادہ نمایاں تھا۔ جو تھوڑی بہت مسلم حمایت اسے اب بھی حاصل تھی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کانگریس نے اب تک علاحدہ حلقہ انتخاب کے تصور کو پوری طرح مسترد نہیں کیا تھا۔ یہ بھی آخر کار 1926 میں کانگریس کے گوہاٹی اجلاس میں ہو گیا جب علاحدہ حلقۂ انتخاب کا خاتمہ کرنے سے متعلق ایک قرارداد پیش کی گئی۔ اگرچہ موتی لال نہرو اور گاندھی کی زبردست مداخلت کے نتیجے میں یہ قرارداد مسترد کر دی گئی، مگر وہ وقت اب بہت دور نہیں تھا جب موتی لال نہرو اپنے قریب ترین ہم نواؤں کی حمایت برقرار رکھنے کے لیے اس معاملے میں اس کے بالکل برعکس موقف اختیار کرنے والے تھے۔ یہ تھی 1920 کی دہائی کے نصف آخر کے دوران کانگریس کی صورت حال۔ اس پس منظر کو سمجھنا جناح کی معاملے کی تفتیش سے پہلے ضروری تھا۔

مرکزی اسمبلی میں انڈپنڈنٹ پارٹی کے قائد کی حیثیت سے جناح کا کردار اور سوراجیوں کے راستے شروع سے ہی جدا رہے کیوں کہ ان دونوں پارٹیوں کے نظریات انہیں باہم مخالف راستوں پر لے جا رہے تھے۔ پھر بھی، ابتدا میں دونوں پارٹیوں کے درمیان تعاون بلکہ خوش رشتوں کا بھی ایک دور گزر چکا تھا کیوں کہ دونوں ہی صوبائی خودمختاری اور مرکزی حکومت بعض ذمے داریاں دیے جانے کا مطالبہ کرنے پر متفق تھیں۔ 18 فروری 1925 کو، موتی لال نہرو نے یہ مطالبہ پیش کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ مطالبہ پیش کرتے، حکومت نے واضح کر دیا کہ وہ کسی قسم کی رعایتوں پر غور نہیں کرے گی۔ حکومت نے ایکٹ کے دائرے میں رہتے ہوئے جائز شکایتوں کی جانچ کرنے کے لیے محکمہ جاتی تحقیقات سے زیادہ اور کچھ نہیں دیا۔ اس کے باوجود، انگریزوں کے اس رویہ پر مایوسی کا اظہار کرنے کا موقع آیا تو سوراجی اور انڈپنڈنٹ پارٹی والے ایک دوسرے کے الگ کھڑے ہوئے تھے۔

لارڈ ریڈنگ کے لفظوں میں، جناح اس وقت قومی قیادت کے لیے بازی لگا رہے تھے اور اگلے تین ماہ کے

دوران جناح کی سرگرمیوں سے اس تاثر کی توثیق ہوتی ہے۔انہوں نے سب سے پہلے یہ کوشش راست طریقوں سے کی۔ اسمبلی کا اجلاس ختم ہوجانے کے بعد، وہ بمبئی لوٹے اور موتی لال نہرو، ایم آر جے کر، پرشوتم داس ٹنڈن اور ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ تقریباً روزانہ ملاقاتیں کیں، جس کا مقصد ایک نئی، سب کو ساتھ لے کر چلنے والی آئینی پارٹی تشکیل دینا تھا۔ گاندھی اور سی آر داس نے بھی ان میں سے بعض مذاکرتا میں حصہ لیا۔لیکن جناح کی کوششیں آخرکار کانگریس کے اندرونی اختلافات کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں۔ نہرو اور داس گاندھی کے دباؤ میں تھے اور، اگرچہ وہ ہر حال میں ان کے فرمانوں کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے، مگر ان (گاندھی) کے نظریات کو مسترد کرنے والوں کا اس طرح کھل کر ساتھ دینے میں جھجک بھی رہے تھے۔ اکتوبر 1924 31ء میں بنگال آرڈی ننس نافذ ہوجانے کے بعد، جب گاندھی عدم تعاون تحریک ملتوی کرنے اور سوراجیوں کو کانگریس کی تنظیمی ذمے داریاں دینے تک کی پیش کش پر راضی ہوگئے تب کہیں جاکر جناح کو اپنے عزائم کی تکمیل کی کچھ راہیں کھلتی نظر آئیں، مگر تب تک کچھ اور رکاوٹیں سامنے آچکی تھیں۔

جناح اس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کو پھر زندہ کرنے کی بھی کوششیں کر رہے تھے۔انہوں نے مارچ 1924 میں دہلی میں منعقد لیگ کونسل اجلاس میں اپنے ساتھیوں کو لاہور میں اک اجلاس منعقد کرنے پر راضی کرلیا تاکہ قومی مطالبے پر وائسرائے سے جواب حاصل کرنے میں ان کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں۔ بدقسمتی سے، اس کے لئے لاہور کے انتخاب کا فیصلہ غلط نکلا کیوں کہ پنجاب واحد صوبہ تھا جہاں مسلمان اپنی مرضی اور کامیابی کے ساتھ دوسطحی نظام حکمرانی پر عمل پیرا تھے جو واقعی ان کے حق میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پنجابی مسلمان ظاہری طور پر آئینی پیش رفت کی پالسی کے سب سے سرگرم ہم نوا تھے، اور اس عمل کی لگام کھینچے جانے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ پھر بھی، اگر مسلم لیگ کی جانب سے کسی بھی طرح ایسا کوئی مطالبہ کیا بھی جاتا تو وہ ان لوگوں کو ایک منہ توڑ جواب ہوتا جو یہ کہہ رہے تھے کہ فرقہ وارانہ اختلافات آئینی پیش رفت کی راہ روک رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ایسا ہوتا تو اس مقصد کے لئے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے والے شخص کی حیثیت سے جناح کا سیاسی قد اور بڑھ جاتا۔ کم از کم اس وقت تو ایسا ہی نظر آرہا تھا۔ دوسطحی نظام حکمرانی اور صوبائی خودمختاری کے درمیان کش مکش کا یہ معاملہ نہایت پیچیدہ تھا جسے تقسیم کے بعد بھی ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ برقرار رہنا تھا۔

فضل حسین 32 صوبائی خودمختاری تو پوری طرح چاہتے تھے، مگر بہ آسانی حمایت دینے کے معاملے میں بہت محتاط بھی تھے۔ اسی لئے انہوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ لاہور اجلاس میں ان کے حامی غالب تعداد میں موجود رہیں۔ اس کا فائدہ بھی ہوا کیوں کہ جب 'موضوعات کمیٹی' نے مسلمانوں کی صورت حال سے متعلق بنیادی قرارداد پیش کی تو وہ پوری طرح پنجاب کا معاملہ ہی ثابت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اُن صوبوں کے مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ لیکن یہ ناراضگی یہیں تک محدود رہی اور لیگ کی پالیسی میں کسی تبدیلی کا سبب نہیں بنی، یقینی طور پر اس وقت۔

لاہور اجلاس کے ایک ہفتے کے اندر موتی لال نہرو اور جناح کو اصلاحات، تحقیقات کمیٹی (مُڈ دی من کمیٹی) میں

غیر سرکاری اراکین کی حیثیت سے شامل ہونے کی دعوت دی گئی 23۔ یہ کمیٹی اس محکمہ جاتی تحقیقات کی توسیعی شکل تھی جس کا وعدہ پہلے 34 نے فروری میں کیا تھا۔ نہرو یہ دعوت قبول کرنا پسند کرتے مگر سوراجیوں کی مجلس عامہ کی طرف سے مخالفت کی سبب انہیں انکار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ دوسری جناح نے اسے قبول کر لیا کہ ان پر اس قسم کا کوئی بیرونی دباؤ بہت کم تھا۔ اس سے انہیں اصلاحات سے متعلق اپنے خیالات کو آگے بڑھانے، دوسروں کا نقطہ نظر معلوم کرنے اور جہاں ضروری ہو انہیں اپنا ہم نوا بنانے کا اک نادر موقع ہاتھ آ گیا۔ کمیٹی کے سامنے بیان دینے والوں سے ان کے سوالات بتاتے ہیں کہ ان کی ساری توجہ تین باتوں پر تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ دو سطحی نظام ناکام ہو چکا ہے اور یہ کہ آئین میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ دوسرے، اس دلیل کی کاٹ کرنا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی آئینی پیش رفت میں رکاوٹ بن رہی ہے اور تیسری بات ان شرائط کا اندازہ کرنا جن کی بنیاد پر ایک نیا 'لکھنؤ معاہدہ' (1916 کے طرز کا) ترتیب دیا جا سکے۔ انہیں کمیٹی کے سربراہ سر الیکزینڈر مڈی من، جو ہوم ممبر بھی تھے، اور سر محمد شفیع کی جانب سے جو لا ممبر تھے اور جنہیں صرف فرقہ وارانہ نقطہ نظر پیش کرنے کے لئے کمیٹی میں رکھا گیا تھا خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی، جناح کو پنجابی مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوئی جو اصلاحات کے لئے مضطرب تھے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے چاہتے تھے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کم سے کم رہ جائے۔ اس کے علاوہ متحدہ صوبہ جات کے مسلمانوں نے بھی ان کی حمایت کی۔

اصلاحات تحقیقات کمیٹی کا کام پورا ہو گیا تو اچانک ایک رکاوٹ آ کھڑی ہوئی۔ جناح نے سر تیج بہادر سپرو اور شیوسوامی ایر کے ساتھ اس رپورٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے اپنی طرف سے ایک 'اقلیتی رپورٹ' پیش کر دی۔ اس رپورٹ میں انہوں نے دو سطحی نظام کی بے لاگ مذمت کی تھی اور صوبائی خودمختاری اور مرکزی حکومت میں ذمے داری دیے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔ 3 دسمبر 1924 کو جب آخر کار اصلاحات تحقیقات کمیٹی کی رپورٹ پر دستخط کئے گئے تو لگ رہا تھا کہ جناح کی آرزوئیں تکمیل کی دہلیز پر آ گئی ہیں۔ حکومت نے، بنگال آرڈی ننس 35 نافذ کر کے، اتحاد کے لئے ایک واقعی ایک تحریک فراہم کی تھی۔ گاندھی نے اپنے طور پر عدم تعاون تحریک کو ملتوی کر کے کانگریس کی طاقت میں اضافے کی راہ کھول دی۔ پھر 21 نومبر کو، بمبئی میں آل پارٹی کانفرنس ہوئی جس میں حکومت کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کرنے کے لئے ایک نمائندہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔

مگر جناح اب بھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ انہیں دوسروں کی شرائط کی بنیاد پر ہونے والی اتحاد کے مذاکرات میں شرکت پسند نہیں تھی۔ اگرچہ عدم تعاون تحریک کے ملتوی کئے جانے سے ان کے کانگریس میں دوبارہ شامل ہونے کی راہ کھل گئی تھی، پھر بھی جب وہ 1924 میں بیلگام اجلاس میں شریک ہونے پر غور کر رہے تھے تو ان کا ذہن یکسو نہیں تھا۔ جناح ہمیشہ یہ چاہتے تھے کہ سوراجی خالصتاً آئینی طریقے اختیار کریں مگر وہ ان کے لئے ان کی لڑائیاں لڑنا انہیں گوارہ نہیں تھا۔ انڈی پنڈنٹوں کے رہنما اور مسلم لیگ کے صدر دونوں لحاظ سے ان کی حیثیت محفوظ تھی، اور وہ کانگریس کے فیصلوں میں پہلے سے شریک ہو کر کانگریس کے ساتھ برابری کی سطح پر رہتے ہوئے بات چیت کرنے کی حیثیت کھونا نہیں چاہتے تھے۔

یہی باتیں آل پارٹی کانفرنس میں ان کی شرکت کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گاندھی کی اتحاد کمیٹی میں شامل ہونے پر راضی ہو گئے، مگر اس شرط پر کہ اس کے فیصلے ووٹ کے ذریعے نہیں کئے جائیں گے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اکثریتی فیصلے واضح طور پر اختلاف رائے کی پیداوار ہوتے ہیں، اور وہ صرف اس فیصلے کو ماننے کے لئے تیار تھے جو رضا کارانہ طور پر اور اتفاق رائے کے تحت سب کے ذریعے کئے جائیں۔ جناح نے جو مسلمانوں کی سربرآوردہ سیاسی مشعل راہ تھے، ایسے مسلمان جو اقلیت میں تھے، اس طرح نہایت ذہانت کے ساتھ ووٹ کے ذریعے کئے جانے والے فیصلوں کے جال اور اکثریت پسندی کے خطروں سے بچنے کی راہ نکال لی۔

مئی 1924 میں لیگ کے لاہور اجلاس کے دوران، دیگر تنظیموں کے ساتھ صلاح مشورے کے ساتھ لیگ کا آئین وضع کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ یہ جناح کی تجویز تھی اور انہوں نے اس سے خاص توقعات وابستہ کی تھیں۔ اس سلسلے میں صلاح مشورے کی بات کانگریس سے بھی کی گئی جسے اس نے پسند نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بیلگام میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس کرنے کی تجویز کو بھی خاصی ترشی وتندی کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا۔ جناح ایک بار پھر کانگریس کے تعصبات کی برف پگھلانے میں ناکام رہے۔ مسلم لیگ کی کونسل کے بعض اراکین اس کھرے پن کے رویے سے اتنے بددل ہوئے کہ انہوں نے اس جگہ جہاں کانگریسی اجلاس اپنا اجلاس کر رہے تھے اپنا اجلاس کئے جانے تک کو نامنظور کر دیا۔

گاندھی اور علی برادران پنجاب میں سیاسی طریقوں سے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تلاش کرنے کی جو کوشش کر رہے تھے وہ اب بھی دیگر کوششوں سے زیادہ اہم تھیں۔ دسمبر 1924 کے اوائل میں، وہ لاہور پہنچے اور مسلمانوں کو، علاحدہ حلقہ انتخاب کے خاتمے کے بدلے میں قانون ساز اداروں اور ملازمتوں میں متناسب نمائندگی کی پیش کش کی۔ یہ پیش کش لیگ کے اس دعوے کے خلاف جاتی تھی یا کم از کم ایسا نظر آرہا تھا، کہ لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس سے لاہور میں طے شدہ امور کو قبول کرنے میں کانگریس کی بے دلی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ یہ تجویز قبول نہیں کی گئی مگر اس سے جناح پر ایک بار پھر یہ ظاہر ہو گیا کہ سیاسی طاقتیں وصال وفراق کی کن کن صورتوں سے گذر رہی ہیں۔

اگرچہ کانگریس اور مسلم لیگ کے تعلقات اب تک کشیدہ ہو چکے تھے، پھر بھی جناح اور سوراجیوں دونوں کے لئے مصالحت بے قرار تھے۔ جب موتی لال نہرو کو معلوم ہوا کہ لیگ نے اپنا اجلاس بمبئی میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو انہوں نے جناح سے اپیل کی کہ اجلاس کی جگہ بدل کر بیلگام کر دی جائے۔ جناح نے اگرچہ کہا تو یہ کہ اب ایسا کرنے کے لئے بہت تاخیر ہو چکی ہے مگر انہوں نے اجلاس کو کئی دنوں تک ملتوی کئے رکھا تاکہ کانگریس کے اجلاس میں لوگوں کی معتدبہ تعداد شریک ہو سکے۔ لیگ کے اجلاس میں اس وقت کے صدر سید رضا علی نے شرکا، کو کانگریس میں ضم ہونے کے خلاف خبردار کیا۔ پھر بھی، جناح نے علاحدہ حلقہ انتخاب کے سوال پر پیدا ہونے والے اختلافات کا اعتراف کرنے کے باوجود مصالحت کے لئے

کوشش کرنے کی اپنی دلیل کا اعادہ کیا، اور وہ اس میں پوری طرح ناکام بھی نہیں رہے۔ لاہور میں مقرر کی گئی لیگ کی آئین ساز کمیٹی میں ردوبدل کر کے اس میں کانگریسی مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد کے لئے جگہ نکالی گئی، اور قیاساً گاندھی کی مداخلت کے نتیجے میں، اس کمیٹی کو بعد میں آل پارٹی کانفرنس کی اتحاد کمیٹی نے پوری طرح اپنالیا۔

اس مرحلے پر، مصالحت میں سب سے بڑی رکاوٹ پنجاب اور متحدہ صوبہ جات کے ہندوؤں کی طرف سے پیدا کی گئی۔ پنجاب کے سوارجی رہنما لالہ لاجپت رائے دھیرے دھیرے قومی قیادت سے علاحدہ ہورہے تھے۔ اور مالویہ اور جنتامنی کی طرح، انہیں بھی 'ہندو خطرے میں ہیں' کا نعرہ ایک زیادہ پرازامکانات پیغام معلوم ہورہا تھا۔ ساتھ ہی یہ لالہ جی کا اپنا عقیدہ بھی تھا۔ اس کے بعد 26 نومبر اور 17 دسمبر 1924 کے عرصے میں، لالہ لاجپت رائے نے دی ٹریبون میں تیرہ مضامین شائع کرائے جن میں مطلق حقوق پر مسلمانوں کے اصرار پر نکتہ چینی کی گئی تھی، جناح کو ایک فرقہ پرست مسلم پارٹی کے 'رنگ روٹ' کی حیثیت سے لتاڑا گیا تھا اور علاحدہ حلقہ انتخاب کی مذمت کی گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے خاصی پیش اندیشی کے ساتھ اپنے قاریوں سے کہا تھا کہ فرقہ وارانہ حلقہ انتخاب ایک بار اختیار کر لئے گئے تو پھر کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے، کم از کم خانہ جنگی کے بغیر تو نہیں، اور یہ بھی کہ انہیں قبول کرنا ملک کو ایک ہندو ہندوستان اور ایک ہندوستان میں تقسیم کرنا ہوگا جو مسلم ہندوستان ہوگا۔ اور یہ بھی کہ چوں کہ پنجابی مسلمان اقلیتوں کو سیاسی وزن دینے کو راضی نہیں ہیں تو بہتر ہوگا کہ پنجاب، اور اگر ضروری ہو تو بنگال کو بھی، تقسیم کر دیا جائے گا کہ خودمختار اور مسلم ریاستوں کا ایک وفاق قائم کیا جاسکے۔ 36 اس کے ساتھ ہی انہوں نے تمام صوبوں کے ممتاز ہندوؤں کے نام جاری ایک سرکولر میں 'لکھنؤ معاہدے' میں ادا کردہ، کردار کے لئے کانگریس کی مذمت کی اور اپیل کی کہ وہ ہندو مہاسبھا کو اپنا سیاسی ترجمان بنالیں۔ بیلگام کا اجلاس اس اپیل پر ردعمل کے لئے تیار تھا جہاں ہندو مہاسبھا کی سرگرمیوں نے پہلی بار ایک واضح سیاسی رخ اختیار کرلیا۔ چناں چہ فرقہ وارانہ سوال پر ہندو نقطہ نظر مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں منجملہ لالہ لاجپت رائے، راجا نریندر ناتھ، چنتامنی، راجا سر رام پال سنگھ، سندھ کے جے رام داس دولت رام اور وسطی صوبوں کے موتی لال نہرو کے سوراجی حلیف بی ایس مونجے اور این سی کیلکر شامل تھے۔

23 جنوری 1925 کو دہلی میں آل پارٹی کانفرنس دوبارہ منعقد ہوئی تو ایک نئے لکھنؤ معاہدے کے امکانات، اگر وہ واقعی کبھی از سر نو سامنے آئے ہوں، اور بھی دھندلے ہو گئے۔ غلطیاں بہت تھیں اور کسی بھی پیش رفت سے پہلے تمام اہم غلط فہمیوں کو دور کیا جانا ضروری تھا۔ لہٰذا 28 جنوری 1925 کو، یہ کانفرنس ایک ماہ کے لئے ملتوی کردی گئی۔ یہ عملاً اس کوشش کا خاتمہ تھا، کیوں کہ اس جنوری اجلاس کے بعد سے جناح نے اس مہم میں مزید دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ اس میں آنے والے دنوں کا یہ اہم اشارہ ضرور موجود تھا کہ ہندو مہاسبھا کانگریس پر اپنی مرضی چلانے کی اہل تھی، یہاں تک کہ نہرو اور گاندھی بھی جو مصالحت میں دلچسپی رکھتے تھے، مہاسبھا کی جانب سے مخالفت کے پیش نظر رعایتیں دینے کو تیار نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے انہوں نے اس معاملے کو چھوڑ دینا مناسب جانا۔ موتی لال نہرو اور گاندھی نے 2 مارچ 1925 کو دہلی سے جاری

ایک اعلامیے میں مطلع کیا کہ اب کسی مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے، اور اس کے صرف تین دن بعد، بمبئی میں، گاندھی نے اخباری نامہ نگاروں سے کہا کہ وہ ہندو۔مسلم مسئلے کو 'ایک طرف' رکھنا چاہتے ہیں۔37

اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد موتی لال نہرو اور جناح کے درمیان سیاسی فاصلہ وسیع تر ہو گیا۔ ہندو مہا سبھا کی جانب سے شدید نکتہ چینی کے بعد چوں کہ موتی لال نہرو کے لئے اپنا موقف تبدیل کرنا ضروری ہو گیا تھا، اس لئے اب انہوں نے اسمبلی میں زیادہ سے زیادہ رخنہ اندازی کا رویہ اختیار کرنا شروع کیا۔ دوسری طرف، جناح نے، اپنی مایوسی کے باوجود، عدم تعاون کے حامیوں کی رخنہ اندازی کے حربوں کی حمایت کرنا منظور نہیں کیا۔ 1925 کے موسم بہار کے دوران، ان دونوں نے پہلی بار سرِ عام ایک دوسرے کی مخالفت کا طرزِ عمل اختیار کیا۔ آخر کار مرکزی حکومت کے خلاف متحد، محاذ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ یہاں الگ سے ایک بات کہنی ضروری ہے۔ موتی لال نہرو اور محمد علی جناح کے سماجی رشتے ان بڑھتے ہوئے سیاسی فاصلے کے باوجود آخر تک خوش گوار رہے۔

اگر چہ جناح کو اس بات میں دلچسپی تھی کہ مڈدی من رپورٹ پر بحث کی جائے لیکن حکومت نے اس معاملے کو لٹکا دیا۔ اس دوران وائسرائے لارڈ ریڈنگ انگلینڈ گئے، سیاسی اصلاحات پر بات چیت کے لئے بلکہ قوم پرستی کے شعلوں کو بجھانے کا طریقہ سوچنے کے لئے۔ ان کے نزدیک مڈدی من کمیٹی صورت حال کو قابو میں رکھنے کا محض ایک حربہ تھی، جناح کی توقعات کے برخلاف، وہ جناح کی 'منطقی احتجاج' کے طریق کار پوری طرح غیر متاثر تھے۔ 1924 میں، جب برطانیہ میں لیبر پارٹی برسرِ اقتدار تھی اور اسمبلی میں قوم پرستوں کا غلبہ تھا تو ریڈنگ سخت دباؤ میں تھے۔ مگر 1925 میں، جب کنزرویٹیو پارٹی دوبارہ اقتدار میں آگئی تھی اور جناح اور نہرو کے درمیان سیاسی کشمکش شروع ہو چکی تھی، انہیں تقویت ملی اور انہوں نے بے لچک موقف اختیار کرنے کی ٹھان لی۔

7 جولائی 1925 کو، ہاؤس آف لارڈس میں لارڈ برکن ہیڈ نے فوری اصلاحات کی بچی کچی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ اگر چہ انہوں نے جلد ہی ایک آئینی کمیشن کی تشکیل کے امکان سے پوری طرح انکار تو نہیں کیا، مگر انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ جب تک ہندوستانی رہنما اصلاحات پر عمل درآمد میں تعاون نہیں کرتے تب تک انہیں کسی بھی رعایت کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ ان کی یہ تقریر آخر کار ہندوستان میں کشمکش کی سیاست کے لئے ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ تب تک، موتی لال نہرو کی قیادت اور سوراجیوں کی حکمت عملی کو کسی بھی طرف سے کسی قسم کے مقابلے کا سامنا نہیں تھا اور کل ہند سطح پر ان کی کامیابی ممکن لگ رہی تھی۔ لیکن اب اس دھمکی کے بعد یہ دونوں امکانات ختم ہو گئے۔ 'نئی وصوبائی سپاہی (تب) لڑائی سے دست بردار ہو گئے اور دشمن کی طرف پینگیں بڑھانے لگے'38۔ اس کے نتیجے میں، موتی لال نہرو نے اپنی محاذی سرگرمیاں بند کر دیں اور ان کی ساری توجہ اپنی صفوں میں پیدا ہونے والی بغاوتوں کو ختم کرنے پر صرف ہونے لگیں۔ یہ کام موثر انداز سے کرنے کے لئے انہوں نے قانون سازیہ کی رکنیت چھوڑ دی اور گاندھی کی عدم تعاون کی راہ اختیار کر لی۔

جناح اس سے زیادہ مایوس تھے کیوں کہ انہوں نے کہیں زیادہ کھویا تھا۔ آخرکار، بنیادی طور پر پسپائی ان کے اصولوں کو ہوئی تھی اور جب مڈدی من رپورٹ پر بحث کی نوبت آئی تو ان کے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور ان پر بے قید ہیجان کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں حکومت سے ایک بار پھر پوچھتا ہوں، میں لارڈ برکن ہیڈ سے پوچھتا ہوں، میں لارڈ ایڈنگ سے پوچھتا ہوں، آپ کے پاس ان لوگوں کے لیے کیا جواب ہے جنہوں نے آپ کے ساتھ تعاون کیا؟ کوئی نہیں۔ میرے لئے جس نے آپ کے ساتھ عدم تعاون نہیں کیا آپ کا جواب بس یہ ہوگا؛ کیا آپ سیاسی ذہن والے لوگوں کے ایک طبقے کو، جو سب سے بڑی جماعت ہیں، ہمارے پاس لا سکتے ہیں، کیا آپ انہیں ہمارے سامنے اپنے گھٹنوں ٹیکنے پر آمادہ کر سکتے ہیں؟ کیا آپ پنڈت موتی لال نہرو کو وائس ریگل لاج میں تخت شاہی کے سامنے سر جھکانے اور یہ کہنے پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ ''حضور! میں حقیر فقیر آپ کے سامنے رینگ رہا ہوں، کیا آپ کی کرم گستری مجھے ایک رائل کمیشن عطا کرنے کی مہربانی فرمائے گی؟'' کیا آپ یہی چاہتے ہیں؟ پنڈت موتی لال نہرو اس اسمبلی میں کیا کرتے رہے ہیں؟ کیا انہوں نے آپ کے ساتھ تعاون نہیں کیا؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو اور کیا چاہئے، اور کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ کون سی شہادت ہے، کون سا ثبوت ہے۔ تحریری یا زبانی، جو آپ چاہتے ہیں کہ میں پیش کروں، یہ بتانے کے لئے کہ یہ ذمے دار رہنما آپ کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں؟ آپ کے پاس آنکھیں نہیں ہیں، کیا آپ کے پاس کان نہیں ہیں، آپ کے پاس دماغ نہیں ہے؟' 39

یہ اس شخص کی تقریر تھی جس نے جنگ کی اور ایک اور بڑی لڑائی ہار گیا، کیوں کہ نہرو کے برعکس جناح کے پاس کوئی چارہ کار نہیں بچا تھا اور نہ عدم تعاون ہی میں انہیں سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ صرف یہی کر سکتے تھے کہ برکن ہیڈ کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اصلاحات کو روبہ عمل لانے کے لئے کام کریں، ان کی قدر و قیمت چاہے جو بھی ہو۔ جولائی 1925 میں انہوں نے بمبئی کے سوراجی رہنما جیکر کی طرف پھر ہاتھ بڑھائے اور نومبر میں وسطی صوبوں کے غیر مطمئن کانگریسیوں کے ساتھ ایک پارٹی بنانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے ناراض کانگریسیوں کی طرف جس قدر پیش قدمی کی، مسلم لیگ کے طاقت ور ترین عناصر سے اسی قدر دور ہوتے گئے۔ اس معمے کو حل کرنا آسان نہیں ہے۔ موتی لال نہرو کی حمایت کرنا عدم تعاون کے اصول کی حمایت کرنا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ایک ممکنہ ہندو۔ مسلم اتحاد کی طرف بڑھنا بھی تھا۔ دوسری طرف لیگ میں موجود اپنے مخالفین کی حمایت کرنا راج کے ساتھ تعاون کی پالیسی کی حمایت کے ساتھ ساتھ ہندو۔ مسلم مغائرت کی بھی حمایت کرنا تھا۔ جناح کا دل دونوں طرف تھا، مگر ان میں مضمر تضادات کو حل کرنا آسان نہیں تھا۔ حد درجہ مایوسی اور بددلی کے عالم میں، وہ 1926 میں یورپ اسکین کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے یورپ کو 'فرار' ہو گئے، اور اسی سال ہونے والے انتخابات تک سرگرم نہیں ہوئے۔

20 مارچ 1927 میں، دہلی میں مسلمانوں کا ایک اجلاس ہوا جس کا مقصد علاحدہ حلقہ انتخاب کے معاملے پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ فہرست مطالبات طویل تر ہوگئی تھی: اس میں بمبئی سے سندھ کی علاحدگی، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لئے

اصلاحات، پنجاب اور بنگال کی آبادی کے مطابق نمائندگی، مرکزی قانون سازیہ میں مسلمانوں کے لئے 33 فیصد تحفظ کے مطالبات شامل تھے۔ یہ اجلاس بڑی حد تک جناح کی ایما پر منعقد کیا گیا تھا، اور وہ اب ایک ایسا موقف اختیار کر رہے تھے جو ان کے سابقہ موقف، مثلاً 1916 کے لکھنؤ معاہدے کے دوران، خاص طور پر، علاحدہ حلقہ انتخاب سے متعلق موقف کے سراسر برعکس تھا۔ انہیں اس بات کا پورا اندازہ رہا ہوگا کہ صوبوں کے مسلمانوں کی طرف سے ان کے اس نئے موقف کی مخالفت کی جائے گی۔ مگر اس کے باوجود وہ اس موقف پر اٹل رہے۔ ان کا یہ موقف اس پیچیدہ قومی مسئلے کو حل کرنے کے لئے ان کے سابقہ کوششوں کے سلسلے کی ایک اور کڑی تھا۔ اس کے علاوہ یہ عوام میں کانگریس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ایک جواب بھی تھا۔

وائسرائے ارون نے آئندہ حالات کا پیش اندازہ کرتے ہوئے اس مشکل کی تعبیر ان لفظوں میں کی: 'جناح کے اصل ارادے جو بھی رہے ہوں (جو اس وقت کی بھی طرح واضح نہیں تھے)، ان کے اقدام نے دونوں فرقوں کے درمیان چیلنج کو کم کرنے کے بجائے اسے بڑھانا تھا' 40۔ اس اقدام نے اس وقت کل ہند سیاسی منظرنامے کے دو مستقل پہلوؤں کو نمایاں کردیا: صوبائی مسلم رائے عامہ کی اہمیت اور ہندو مفادات کا دھیان نہ رکھنے والی کسی بھی شرط کو قبول کرنے سے ہندو مہاسبھا کا پس وپیش۔ پھر بھی، صوبائی مسلمانوں کے طرز عمل سے بھی صورت حال میں کوئی واقعی فرق نہیں پڑا۔ ہندو مہاسبھا ہو یا مسلم لیگ، دونوں میں سے کسی کو بھی مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اپنے فرقے کی سلامتی، جیسا کہ اس بارے میں ان کا خیال تھا، کے تحفظ کی غرض سے کام کرنے کے لئے برا نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ یہی آخر کار ان کے سیاسی وجود کی بنیاد تھا۔

29 مارچ 1927 کو، حالات کی سمت ورفتار پر نظر رکھتے ہوئے جناح نے یہ واضح کرنے کے لئے اخباروں کو ایک بیان جاری کیا کہ ان کی چاروں تجاویز کو، (جن کا حوالہ ابھی دیا گیا) یا تو پوری طرح قبول کیا جائے یا پوری طرح مسترد کردیا جائے 41۔ مگر اس سے بھی صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ درحقیقت اس سال (1927) 16 اپریل کو پٹنہ میں ہندو مہاسبھا کا اجلاس ہوا تو جناح کے اس بیان کو اس پیش کش پر بالکل غور ہی نہ کیے جانے کا سبب کی طرح استعمال کیا گیا۔ صوبائی مسلمانوں کا طرز عمل بھی حوصلہ افزا حد تک بہتر نہیں تھا۔ انہوں (صوبوں) نے جناح کے کل ہند اقدامات کی مزاحمت شروع کردی تھی، اس ڈر سے کہ ان کی وجہ سے ان اختیارات میں کمی آسکتی تھی جو انہیں (صوبوں کو) اس وقت حاصل تھے۔ چنانچہ اصل پیش کش کے کئی حامیوں نے اب راہیں بدلنی شروع کردیں۔ جیسا کہ مددی من سے ان واقعات سے متعلق ایک تحریر پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا: 'یہ سیاسی حیثیت حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ کا معاملہ ہے اور ہمیشہ کی طرح مسلمان اس میں پیچھے رہ جائیں گے مگر دونوں میں سے کوئی بھی فریق چاہے بھی تو کچھ نہیں کرسکتا...' 42۔

مسلم لیگ کی تقسیم

آیئے ایک بار پھر پنجاب کی طرف پلٹتے ہیں۔ مارچ 1927 کے جناح کے اقدام کے بعد سے پنجاب مسلم

لیگ ان کے اداروں کے بارے میں مشکوک ہوگئی تھی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ ایک کل ہند ایجنڈے کے لیے ان کی صوبائی برتری قربان نہ کردی جائے۔ اکتوبر 1927 میں، شملہ میں منعقد مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کے دوران ان لوگوں نے جناح کو پارٹی کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد کرنے سے روک دیا تھا، اس اندیشے کے تحت کہ وہ جوڑ توڑ کر کے قومی ایجنڈے کے حق میں فیصلہ کرا سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اور متحدہ صوبہ جات کے اراکین نے بھی واضح کر دیا کہ لیگ کا اجلاس شمالی ہند ہی میں ہونا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں جناح نے کانگریس کے ساتھ مشترکہ اجلاس اور لاہور میں لیگ کا اجلاس دونوں ہی سے ہاتھ اٹھا لیے۔ اس کے بجائے انہوں نے کلکتہ کے حق میں حمایت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن پنجاب کے سیاست کاروں کے لیے کلکتہ اور بھی کم موزوں تھا چوں کہ پنجاب نے تعاون کی حمایت کی تھی اس لیے ان کے نزدیک یہ بات بہت اہم تھی کہ کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس ایک ایسے صوبے میں ہو جہاں ان کی پالیسی کو مقامی حمایت حاصل ہو سکے۔ فیروز خاں نون کی طرف سے کی گئی تیاریوں کی وجہ سے 20 نومبر 1927 کو دہلی میں ہونے والا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس پنجابیوں کے لیے ایک فتح مندی کی طرح تھا۔ جناح اور علی برادران کی طرف سے مخالفت کے باوجود، لاہور کے حق میں فیصلہ کرا لیا گیا جس کے نامزد صدر سر محمد شفیع تھے۔ جناح کے لیے یہ اتنا ہی غیر اطمینان بخش تھا جتنا کلکتہ اجلاس پنجابیوں کے لیے رہا تھا۔ اگرچہ اس سے ان کی حیثیت پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی مگر پھر بھی ضروری تھا کہ اس فیصلے کو واپس کرایا جائے۔ ان کے اسمبلی کے رفیق محمد یعقوب نے اس بات سے پوری طرح اتفاق کیا اور انہوں نے ڈاکٹر کچلو کو جو اس وقت لیگ کے سکریٹری تھے کونسل کا ایک اور اجلاس طلب کرنے کی ترغیب دی۔ ساتھ ہی انہوں نے ڈاکٹر انصاری 43 سے گزارش کی کہ اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے کلکتہ کے حق میں اکثریت کی حمایت حاصل کریں جس کی صدارت آغا خاں کریں گے۔

نتیجتاً 11 دسمبر 1927 کو کونسل کا دوبارہ اجلاس ہوا۔ اس میں صرف 23 اراکین نے شرکت کی، اور اگرچہ فیروز خاں نون اور ان کے حامی اکثریت میں تھے مگر اس دن غیر حاضر اراکین کے سبب فیصلہ جناح کے حق میں ہوا۔ سابقہ فیصلہ (جو لاہور کے لیے تھا) 54 (41 غیر حاضر) کے مقابلے 84 (74 غیر حاضر) ووٹوں سے بدل دیا گیا اور اس کے بجائے کلکتہ کو اجلاس کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ جناح فتح یاب ہوئے مگر یہ ایک کامیابی انہیں مہنگی پڑی؛ کیوں کہ فیروز خاں نون، سر محمد اقبال، حسرت موہانی اور نون کے کئی اور پنجابی حامی اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ قدم انہوں نے اپنی مرضی سے اٹھایا تھا۔ اس طرح لیگ میں دراڑ بڑھ گئی۔ 1927 میں دہلی میں ہوئی اس جھڑپ کے نتیجے میں دو مسلم لیگیں وجود میں آگئیں۔ بعد میں ایک کا اجلاس لاہور میں اور دوسری کا کلکتہ میں ہوا۔ سر محمد شفیع نے جو کونسل کے دونوں اجلاسوں کے صدر منتخب کیے گئے تھے لاہور اجلاس کی صدارت کی اور مولوی محمد یعقوب نے کلکتہ اجلاس کی صدارت کی۔ جیسا کہ توقع تھی، لاہور اجلاس میں منظور قراردادیں پنجاب مسلم لیگ کے اجلاس (13 نومبر 1927) میں منظور قراردادوں جیسی ہی تھیں۔ قراردادوں سے زیادہ اہم وہ متحدہ صوبہ جات اور پنجاب کے مسلمانوں کا وہ اتحاد تھا جو اس عمل کے دوران پیدا ہوا تھا۔ دسمبر 1927 میں کلکتہ میں منعقد جناح کی لیگ کے اجلاس میں انہی لوگوں نے شرکت کی جو مارچ میں دہلی کے اجلاس میں شریک

ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ صوبہ سرحد کے لوگ اور مسلم اکثریتی صوبوں کے شہری آئین پسند عناصر اب تک انہیں چھوڑ چکے تھے۔

مسلم لیگ کے کلکتہ اجلاس میں، آزادی کے حق میں اعلان کا سوال مقتدر طور پر نہیں اٹھایا گیا (44)، جو اپنے آپ میں کٹر 'خلافتیوں' کی غیر مربوط سوچ اور انڈ پنڈنٹوں جن کی نمائندگی جناح، علی امام اور محمد یعقوب کر رہے تھے کے غلبے دونوں کا مظہر تھا۔ یہ لوگ ہی اس اجلاس پر حاوی رہے۔ ان میں سے جناح مستقل صدر، یعقوب اس اجلاس کے صدر اور علی امام قراردادوں کے تحریک کار تھے۔ ان کا موقف عملی اور آئین پسندانہ سیاست کے بنیادی دھارے سے باہر نہیں تھی۔ اسی لیے وہ آزادی یا غیر مشروط بائیکاٹ کا اعلان کرنے کے خواہاں نہیں تھے۔

کلکتہ لیگ کے منتظمین نے فرقہ وارانہ اتحاد پر حد درجہ زور دیا۔ پھر بھی، اجلاس کی کارروائی کے دوران واضح ہوگیا کہ جناح کی چاروں تجاویز کو، پوری طرح، قبول نہیں کیا جائے گا، بنگال میں منعقد ہونے والے اس اجلاس میں بھی نہیں۔ نتیجتاً ان چار تجاویز کے تعلق سے لیگ اگرچہ اب بھی کانگریس کے ساتھ اپنے رشتوں کی دراڑیں بھرنے کی خواہاں تھی مگر ساتھ ہی اسے یہ فکر بھی تھی کہ بات چیت کے دوران اس کا موقف مضبوط رہے۔ لہٰذا اس سوال سے متعلق لیگ کی قرارداد میں اس بات کی صراحت کی گئی کہ علاحدہ حلقہ انتخاب کی تجویز اسی صورت میں ترک کی جائے گی جب صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کردی جائیں گی اور سندھ کو واقعی ایک علاحدہ صوبہ بنا دیا جائے گا۔

کانگریس کی دعوت پر لیگ کے رہنما دہلی میں ہونے والی آل پارٹی کانفرنس میں شرکت کو راضی ہوگئے، اگرچہ خاصے محتاط انداز سے۔ 12 فروری 1928 کو جب آخر کار یہ کانفرنس منعقد ہوئی تو یہ بات واضح ہوگئی کہ کسی سمجھوتے تک پہنچ پانا آسان نہیں ہوگا، پنڈت مدن موہن کو مالویہ جن کے بارے میں یہ تاثر بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ کانگریس کی طرف حد درجہ مائل ہیں مونجے نے اور زیادہ الگ تھلگ کہ مونجے کو نہ تو سندھ کی علاحدگی منظور تھی نہ اکثریتی فرقوں (یعنی پنجاب کے مسلمانوں) کے لیے نشستوں کا تحفظ۔ جناح نے اس اڑیل رویہ کا سامنا کلکتہ اجلاس کی شرطوں کا اعادہ کرکے کیا، جس کے بعد بات چیت کا ٹھپ پڑ جانا ناگزیر تھا۔ جناح کے نقطۂ نظر سے یہ سب پوری طرح غیر اطمینان بخش تھا۔ لیگ کا ان کا حامی حلقہ پہلے ہی الگ تھلگ کر دیا گیا تھا اور یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ وہ اپنی تمام سیاسی حمایت سے محروم نہ ہو جائیں۔ لہٰذا انہیں وائسرائے کی طرف پلٹنا پڑا۔ انہوں نے ارون سے ایک بار پھر گزارش کی کہ آئینی کمیشن کی شکل وصورت میں ردوبدل کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ یا تو ایک مخلوط کمیشن مقرر کیا جائے اور ایسا نہ ہو سکے تو پھر ہندوستانی کمشنروں کی ایک جماعت تشکیل دی جائے جو دوہرے اختیارات اور ذمے داریاں کی حامل ہو۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کی گزارشات کو ان سنا کر دیا گیا۔ ارون نے انداز، کرلیا کہ جناح کا جادو اب ٹوٹ رہا ہے، لہٰذا ایک ٹوٹتے ہوئے ستارے کی ناز برداری کیوں کی جائے۔ جناح اب سخت تذبذب میں تھے۔ ایک تو وہ کمیشن کی رکنیت حاصل نہیں کر سکے اور دوسری طرف انہیں بائیکاٹ

کرنے کا ایسا کوئی حربہ بھی ہاتھ نہیں آسکا جسے مسلمانوں کی تھوڑی بہت حمایت پھر حاصل ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں جب نہ ان کی جماعت متحدہ تھی اور نہ ان کے پاس کوئی قابل قبول موقف ہی تھا وہ آل پارٹی کانفرنسوں میں کس طرح شرکت کر سکتے تھے۔ لہٰذا گھر بیٹھ رہنا ہی واحد معقول راہ نجات تھی۔ 17 اکتوبر 1928 کو انہوں نے مسلم لیگ کے وفد کو کانفرنس سے واپس بلا لیا اور مئی تک وہ انگلینڈ میں تھے۔

لیکن صورت حال کا تضاد دیکھئے کہ کانفرنس سے لیگ کے ہٹنے اور جناح کے یورپ سدھارنے سے آل پارٹی کانفرنس بھی بجھی بجھی سی رہی۔ وجہ یہ کہ بیشتر کانگریس والوں کے نزدیک جناح ہی 'واحد شخص تھے جو مسلم لیگ کی جانب سے کچھ کر سکتے تھے۔'45 لہٰذا کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ 'ایک چھوٹی سی کمیٹی جو فرقہ واریت کے سوال پر مجموعی لحاظ سے آئین کے ساتھ اس کے تعلق کی روشنی میں غور کر کوئی راستہ نکالنے میں کامیاب ہو سکتی'46۔ موتی لال نہرو کو ایک بار پھر سربراہ بنایا گیا۔ کمیشن میں 9 اور اراکین بھی شامل تھے۔47 اس کمیٹی کے کام کا بیشتر بار پانچ افراد نے اٹھایا: موتی لال نہرو، شعیب قریشی، منگل سنگھ، انے اور سپرو۔ جواہر لال نہرو نے بھی بعد کے کئی اجلاسوں اور چند زیادہ اہم بیٹھکوں میں حصہ لیا۔

5 اور 22 جون، 1928 کے درمیان اس کمیٹی نے الہ آباد میں موتی لال نہرو کے مکان پر روزانہ کئی کئی گھنٹے غور و فکر کیا۔ اس نے آئین کے مجموعی خاکے کے بارے میں تو کچھ پیش رفت ضرور کی مگر فرقہ واریت کے مسئلے پر کوئی پیش قدمی نہ ہو سکی اور وہ ویسے کا ویسا نا قابل عمل رہا۔ آخر کار 7 جولائی 1928 کو، کمیٹی نے مفاہمت کا ایک فارمولا وضع کیا جس کے مطابق اعلان کیا گیا کہ تمام اراکین، اکثریت یا اقلیت کسی کے لئے بھی نشستوں کے تحفظ کے خلاف ہیں۔

اس کمیٹی کے مذاکرات کا ایک معمولی مخالف پہلو یہ تھا کہ جواہر لال نہرو نے جو کمیٹی کے باضابطہ رکن نہیں تھے، اس کے کئی اہم اجلاسوں میں حصہ لیا۔ موتی لال نے خود اعتراف کیا ہے کہ 6 اور 7 جولائی کی بیٹھکوں میں جواہر لال 'رپورٹ کے خاص مرتبین' میں شامل تھے48 جنہوں نے اس کا ایک اہم حصہ تحریر کیا۔ فرقہ واریت سے متعلق حصے تو موتی لال نہرو نے لکھے تھے مگر یہ جواہر لال تھے جنہوں دراصل رپورٹ کا بیشتر مواد فراہم کیا تھا۔ مسئلے کا سامنا کرنے اور اسے حل کرنے کا (موتی لال نہرو) عزم اور سماج کا موجودہ نظام تبدیل کرنے کی خواہش مند نہ ہونے کے لئے فرقہ وارانہ جماعتوں کی مذمت ایسے پہلو تھے جو صاف صاف موتی لال نہرو کے تحریر کردہ تھے، مگر ایسے خیالات پر کہ آزاد ہندوستان میں سیاسی پارٹیوں کی تشکیل 'اقتصادی بنیادوں' پر کی جائے گی فکری مواد، اسلوب اور فلسفیانہ طرز کے لحاظ سے والد کی نہیں بیٹے کی واضح چھاپ تھی۔

یہ 'نہرو رپورٹ' 21 اگست 1928 کو سامنے آئی۔ رپورٹ میں تجویز کردہ آئین اب تک کا سب ترقی پسندانہ آئین تھا۔ اور اگرچہ فرقہ واریت سے متعلق اس کی تجاویز پر زیادہ توجہ بعد میں دی گئی، اس کی سیاسی سفارشات بھی کم متنازعہ نہیں تھیں، جن کے سبب فرقہ وارانہ مناقشات کی ایک فصل پیدا ہو گئی۔ اس رپورٹ میں جس قومی حکومت کا تصور پیش

کیا تھا وہ وحدانی تھی نہ کہ وفاقی، جس میں ضمنی اختیارات بھی مرکزی حکومت کو دئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سفارش ہی سب سے زیادہ نا قابل قبول ثابت ہوئی اور کئی طرف سے اس کی پرشور مخالفت کی گئی۔ فرقہ واریت کے تعلق سے، اس رپورٹ میں علاحدہ حلقہ انتخاب اور اقلیتوں کو خصوصی رعایت دیئے جانے کو مسترد کیا گیا تھا۔ اس میں اکثریتوں کے لئے نشستوں کے تحفظ اور مرکز میں 33 فی صد نشستیں محفوظ کرنے کے مسلم مطالبے کو بھی خارج کردیا گیا تھا۔ اس میں صرف شمال مغربی صوبے کے مسلمانوں کی تشفی کا سامان تھا کیوں کہ بمبئی سے سندھ کی علاحدگی اور سرحدی صوبے کو مساوی حیثیت دیے جانے کے ایک ہفتے بعد، 28 اگست 1928 اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے اس کمیٹی کو تشکیل دینے والی آل پارٹی کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ جناح کی غیر موجودگی کے پیش نظر دونہروؤں سے گذارش کی گئی کہ اجلاس ملتوی کردیا جائے۔ انہوں نے یہ دلیل منظور کر لینے کا اثر تو دیا مگر کیا کچھ نہیں، اور پھر نہایت بے قرار انداز سے اجلاس کو صرف ایک دن کے لئے ملتوی کیا گیا۔ دونوں نہرو جناح اور تمام 'مذہبی جماعتوں' کو کوئی بھی رعایت دینے کے حق میں نہیں تھے جن میں سکھ تنظیمیں بھی شامل تھیں۔ اجلاس میں شرکت صرف تقریباً سو لوگوں تک محدود رکھی گئی۔ ایسے میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اجلاس کے نتائج وہی نکلے جو نکلنے تھے۔

اختلاف رائے کی واحد آواز اکثریتوں سے متعلق تحفظات ختم کئے جانے پر شوکت علی 49 نے اٹھائی۔ وہ اس معاملے پر موتی لال نہرو سے الگ ہو گئے اور ہندو مہا سبھا کو رعایتیں دینے کے لئے ان کی مذمت کی۔ انہوں نے ان مسلمانوں سے بھی علاحدگی اختیار کر لی جو موتی لال نہرو کے حامی تھے۔ یہ بات (شوکت علی کی طرف سے نہرو رپورٹ کی نفی) کانگریس کے لئے سخت خفت کا باعث ہوئی۔ اس سے زیادہ بڑا چیلنج ان صوبائی طاقتوں کی طرف سے پیش کیا گیا جن سے حکومت نے امیدیں باندھ رکھی تھیں۔

جب رپورٹ کو مکمل کمیٹی کے ذریعے زیر غور لایا جانا تھا تو اس معاملے میں جناح کی غیر موجودگی کا قدرے بے وقار انداز سے خیال نہ رکھے جانے کے باوجود، موتی لال نہرو کے نزدیک جناح اب بھی ایک ایسا اہم ترین عامل اور شخصیت تھے جسے نہایت لازمی اہمیت حاصل تھی۔ اگر ان کو منا لیا جائے تو نہرو رپورٹ اپنا مطلوبہ وقار حاصل کر سکتی تھی۔ لہذا اس سے پہلے کہ شوکت علی مزید نقصان پہنچا سکیں موتی لال نہرو نے پروشوتم داس ٹھاکر داس کو جناح کو آمادہ کرنے کی ذمے داری سونپی۔ جناح ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے قدرتی طور پر نہرو سفارشات کی حمایت کا اعلان نہیں کیا، بلکہ ایسی احتیاط پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو ان سے مخصوص نہیں تھا انہوں نے پہلے مسلم رائے عامہ کو بھانپنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے انہوں نے لکھنؤ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلایا مگر وہ اس سے کم نتیجہ رہی جتنی جناح چاہتے تھے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ اتفاق رائے کی اس غیر موجودگی کے سبب جناح کے لئے اس معاملے میں کانگریس کے ساتھ بات چیت شروع کرنا صرف دشوار بلکہ غیر سائشتہ بھی تھا۔

کچھ نہ ہونے کی یہی صورت حال تھی جس پر موتی لال نہرو نے دسمبر 1928 میں کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں ملال ظاہر کیا: 'غیر ملکیوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے بغیر ان کے خلاف کھڑا ہونا مشکل ہے۔ (لیکن) یہ متحدہ محاذ بنانا آسان نہیں ہے عجب یہ غیر ملکی ہمارے درمیان موجود ہے اور ہم پر حکم چلا رہا ہے'۔ جواہر لال نے بھی کہا کہ انہوں نے اس فرقہ وارانہ رکاوٹ کے اسباب پر گہرائی سے غور کیا جس نے نہرو کو اکارت کر کے رکھ دیا اور گول میز کانگرنس کے انعقاد میں رخنہ ڈال دیا۔ وہ بھی کم وبیش اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ 'سیاسی سودے بازی اور مول تول' ملک کو بہت آگے نہیں لے جاسکتی کیوں کہ 'ہم جو بھی پیش کش کریں گے، ہماری بولی چاہے جتنی اونچی کیوں نہ ہو، ہمیشہ کوئی نہ کوئی تیسرا فریق اس سے زیادہ اونچی بولی لگا دے گا اور یہی نہیں بلکہ اپنی بات کا وزن بھی ثابت کر دے گا۔ یہ تیسرا اور کنٹرول کرنے کا فریق ہی ناگزیر طور پر غالب کردار ادا کرتا ہے اور اپنی مرضی سے داد و دہش کرتا ہے'۔

واقعات کا سلسلہ بہر حال جاری رہا اور وہ بھی فیصلہ کن انداز سے۔ دسمبر 1928 میں لیگ کے کلکتہ اجلاس سے پہلے اس کا ایک اور حصہ علاحدہ ہو گیا۔ یہ خلافت والوں کا حلقہ تھا جو نہرو رپورٹ کو پہلے ہی مسترد کر چکا تھا۔ علی برادران اس وقت واضح طور پر ضرورت سے زیادہ مصروف تھے۔ کلکتہ اجلاس میں آل پارٹیز کنونشن کے لئے ایک وفد منتخب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسے تمام غیر حل شدہ فرقہ ورارانہ مسائل طے کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔ آل پارٹیز کنونشن کی ذیلی کمیٹی کے ساتھ مسلم لیگ اور خلافت مندوبین کی ملاقات کے بعد، جناح اور ٹی اے کے شیروانی 50 نے اپنے مطالبات پیش کئے جن کی تعداد اب پہلے کے چار سے بڑھ کر سات ہو گئی تھی (بعض مبصرین نے اسے چھے لکھا ہے) 51

ہر ممکن قیاس یہی کہتا ہے کہ مرکز میں 33 فی صد نمائندگی کے مطالبے کے لیے جناح ذمے دار تھے۔ مارچ 1927 میں پیش کردہ تجاویز میں یہ مطالبہ شامل تھا اور ان کے پاس اس پر بے لچک انداز سے جمے رہنے کی تمام وجہیں موجود تھیں، بنیادی طور پر اس لئے کہ مرکزی اسمبلی میں موجود اور خاص طور پر مسلم اقلیتی صوبوں سے متعلق ان کے حامی خاص اس مسئلے پر نہرو رپورٹ کے سخت نکتہ چین تھے، اس مطالبے کے دفاع میں جناح کا اصرار تھا کہ زائد نشستیں اقلیتی صوبوں کو رعایت دینے کے لئے تقسیم کر دی جائیں۔ اس سے بلاشبہ اپنے حامیوں کے جذبات کو مطمئن کرنے کا ان کا خیال ظاہر ہوتا ہے۔

ان مطالبات پر آل پارٹیز کنونشن ذیلی کمیٹی کے ردعمل کا قیاس بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے 37 اراکین میں 11 پنجاب کے ہندو، سکھ اور عیسائی تھے، ایک سندھ کی علاحدگی کا نمایاں مخالف تھا اور چھے ہندو مہا سبھا کے قد آور رہنما تھے۔ گاندھی اور سر تیج بہادر سپرو مرکز میں 33 فی صد نمائندگی دینے کے مطالبے کے حامی تھے جب کہ ہندو مہا سبھا اور سکھ اس کے خلاف تھے۔ فاضل اختیارات صوبوں کو دیئے جانے کا مطالبہ ہندو مہا سبھا اور لبرل فیڈریشن دونوں کو نامنظور تھا، حالاں کہ سپرو اور چنتامنی دونوں ہی موضوعات کی فہرست پر نظر ثانی کے لئے امادہ تھے۔ اس اہم سوال پر مباحثے کے دوران نہ

گاندھی نے کوئی مداخلت کی نہ موتی لال نہرو نے۔ پنجاب اور بنگال میں بالغ رائے دہندگی اختیار نہ کیے جانے کی صورت میں آبادی کی بنیاد پر تحفظات دیئے جانے کے مطالبے سے یہ کہہ کر پہلوتہی کی گئی کہ تمہارے نزدیک ابھی اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے'52 سندھ سے مطالبے کو اس بنیاد پر مسترد کیا گیا کہ اس سے لکھنؤ میں کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی۔ کھلے اجلاس میں، جناح نے کمیٹی کا فیصلہ تبدیل کرانے کی ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے سامعین سے کہا کہ تجویز کردہ ترمیمات 'مناسب اور معقول ہیں'، یہ کہ کوئی بھی اپنی اقلیتوں کو کچھ دیئے بغیر آزادی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔ اور یہ کہ ہندو۔مسلم مسئلے کا تصفیہ ملک کی پیش رفت کے لئے ضروری ہے 53۔ اگر ڈاکٹر سپرو نے ان کی حمایت کی مگر جناح کو ایم آر جیکر کی طرف سے نہایت مدلل مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جنہوں نے کنونشن سے کہا کہ جناح 'مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں اور رعایتیں دینے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ اس سے مسلم فرقے پر بحیثیت مجموعی کوئی فرق نہیں پڑے گا'۔54 انہوں نے کہا کہ اس کے علاوہ یہ بھی کہ جناح بہرحال انہی کی صف کے ہیں، اور وہ مسلم لیگ کو اپنے ساتھ لانے کی اپنی بہترین کوشش کریں گے'55۔ جناح کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے موقف کے بالکل الگ تھلگ پڑ جانے کا کتنا واضح احساس تھا: 'یہ لازمی ہے کہ آپ نہ مسلم لیگ بلکہ ہندوستان کے مسلمان کو اپنے ساتھ لائیں اور یہاں میں ایک مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے بول رہا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ہم سات کروڑ مسلمانوں کو جدوجہد آزادی میں شانہ بہ شانہ آگے بڑھنے کے لئے اپنے ساتھ لائیں۔ اگر میں کہوں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں تو کیا آپ اس سے مطمئن ہوجائیں گے۔ (لیکن) کیا آپ یہ چاہتے ہیں یا نہیں چاہتے کہ مسلم ہندوستان (بھی) آپ کے سات رہے؟56 یہ ایک طاقت ور پیروی تھی اور ایک اچھا سوال تھا مگر جیکر اس کا جواب پہلے ہی دے چکے تھے۔ کنونشن نے جناح کی بات ٹھکرا دی اور اس نے جناح کو 'راہوں کی جدائی' کی طرف دھکیل دیا جس کا حوالہ ہیکٹر بولیتھو نے یوں دیا ہے:

10 مارچ 1952۔ جمشید نصروانجی کے ساتھ بات چیت پر چند باتیں

وہ ایک اچھے اور معمر پارسی تھے، ایک تھیوسوفٹ جو مجھ سے ملاقات کے لئے میٹروپول ہوٹل آئے۔ وہ ایک لمبا سا سفید کرتا اور چیک والی بھوری قمیص پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں بمبئی جاؤں تو کانجی دوارکا داس سے ملاقات کروں۔ انہوں نے کہا کہ 'ان کا حافظہ بہت اچھا ہے، انہوں نے جناح کے بارے میں کہا، 'وہ ایک جذباتی اور محبت والے شخص ہیں مگر اس کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ لئے دیئے رہنا ہی ان کے لئے سب کچھ ہے۔' انہوں نے مزید کہا، 'میں نے انہیں ایک بار آب دیدہ دیکھا تھا۔ یہ ایک بھلی سی بات ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ یہ 1928-1927 میں کانگریس نے کلکتہ اجلاس کے دوران کا واقعہ ہے' تھوڑے وقفے کے بعد پھر بولے 'میں یہ بات آپ کو لکھ کر دوں گا'، انہوں نے پھر کہا کہ 'جناح میں ایک طرح کا اکیلا پن تھا۔ ایک تنہا شخص۔' اگلے دن جمشید نصروانجی میرے لئے مندرجہ ذیل تحریر لے کر آئے:

'راہوں کی جدائی'

1927 میں کلکتہ میں کانگریس کے اجلاس (1928 میں منعقد آل پارٹیز نیشنل کنونشن) کے دوران جناح کی طرف سے، جو اس وقت دہلی میں تھے، ایک تار آیا جس میں لکھا تھا کہ وہ اور مسلم لیگ کے ان کے چھے اور ساتھی کانگریس کمیٹی سے ملاقات کر کے بعض نکات پر بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کانگریس کے ساتھ مفاہمت سے متعلق ان کے مطالبات کا معاملہ تھا، جناب جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ بیشتر رہنما اس منصوبے کے خلاف تھے مگر مہاتما گاندھی ان پر حاوی ہو کر جناب جناح اور ان کی حمایت کو کلکتہ آنے کی دعوت دینے پر راضی کر لیا۔ وہ آئے اور جناب جناح نے ایک خصوصی کمیٹی کے سامنے اپنی جماعت کے مطالبات پیش کیے، مگر کمیٹی نے انہیں مسترد کر دیا۔ 18 اراکین ان مطالبات کے خلاف اور دو حامی تھے مہاتما گاندھی اور میں خود۔ جناب جناح اپنے ہوٹل واپس آئے۔ وہ آب دیدہ تھے۔ مہاتما گاندھی رنج و ملال کے عالم میں 3 بجے اپنے کمرے پہنچے اور صبح 6 بجے تک اپنے چرخے پر سوت کاتتے رہے۔ اگلی صبح تقریباً 8.30 بجے جناب جناح اور ان کے رفقا دہلی واپس چلے گئے۔ میں رخصت کرنے اسٹیشن گیا۔ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور اس وقت ان کے الفاظ تھے۔ 'اچھا تو جمشید، اب ہماری راہیں جدا ہو رہی ہیں'

اس کے بعد جناب جناح نے تمام تجاویز، یہاں تک کہ آل پارٹی قراردادوں کو مسلسل مسترد کرتے رہے۔ انہیں کانگریس کے رہنماؤں پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ انہوں نے لندن میں گول میز کانفرنس کے دوران مصالحت کی کوشش کی مگر وہاں ایک بار پھر انہیں مایوس ہونا پڑا۔ مگر یہ ساری باتیں دستاویزی نوعیت کی ہیں۔

پھر بھی ایسا نہیں کہا گیا، ابھی تک نہیں۔

جناح کو بار بار وحشت ناک تنہائی میں مبتلا ہونے پر مجبور کرنے والے حالات حد درجہ پیچیدہ تھے۔ یہ حالات اس زمانے کے سیاست کاروں کے انفرادی رویوں سے آگے کا معاملہ تھے جن میں اس وقت کے موجود سیاسی نظام کے طرز عمل کے عکس ہی زیادہ نظر آتے ہیں۔ 1920 کی دہائی کے اوائل میں، اگرچہ صوبائیت کی طاقتیں کبھی کبھی کل ہند منظرنامے پر سر ضرور ابھارتی تھیں مگر مفادات کا اصل ٹکراؤ 'قوم پرست' اور 'صوبائی سیاست کار' کے درمیان تھا۔ مفادات کا یہ تصادم سامنے تو اس وقت آیا جب مونٹیگو۔ چیمس فورڈ اصلاحات کو ایک ایکٹ کی حیثیت سے استناد حاصل ہو گیا۔ اس زمانے کا مطالعہ کرنے کی کوشش نظام کی عائد کردہ حدود اور جبر سے الجھتے ہوئے بنیادی کرداروں کا سیاسی عمل اور ردعمل دیکھنے سمجھنے میں ہے۔ ہمیشہ ایک 'ٹھوس سیاسی بنیاد' نہ ہونا ہمیشہ جناح کی بنیادی مشکل رہی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ سیاسی احتجاج کے زمانے

میں وہ ایک 'مشاورتی سیاست کار تھے۔ نتیجتاً ان کی 'قوم پرستی' چاہے جتنی بھی پرخلوص رہی ہو، وہ سیاست میں صوبوں کے مسلم سیاست کاروں اور مرکز میں اپنے کانگریس کے ساتھیوں کے درمیان محض ایک بچولیا بن کر ہی رہ سکتے تھے۔ وہ بذات خود کسی صوبائی سیاست میں شریک نہیں تھے۔ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود، انہوں نے اس وقت کی صوبائی سیاست کی مٹی کو ایک ایسی شکل دینے کی کوشش ضرور کی جو ان کے کل ہند مقاصد کے لئے موزوں ہو۔ ان کا کام ایک ایسے 'مجسمہ ساز کی طرح تھا جس کے زیر استعمال چیز اپنا رنگ روپ مستقل بدلتی رہتی ہوں' صوبے جب اپنے مطالبات پیش کرتے تھے تو جناح کو بھی لازمی طور پر اپنے سیاسی مقاصد میں تبدیلی لانی پڑتی تھی۔ 1927 میں، انہوں نے چار مطالبات پیش کئے، 1928 میں ان کی تعداد چھ اور 19129 میں چودہ ہو گئی57۔

آخر کار، جناح اور کانگریس کے درمیان بات چیت بار آور نہیں رہ گئی۔ جناح کو مستقل طور پر اور بار بار صوبوں کے اشاروں پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ وقت کی جدوجہد میں اس سرگرمی سے شریک نہیں رہ گئے تھے جتنی کہ کانگریس تھی۔ وہ محض ایک فرد کی حیثیت سے کانگریس کے پروگراموں کو حمایت نہیں دے پائے۔ شاید وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کے لئے وہ چاہتے تھے اور اس کی انہیں ضرورت بھی تھی کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا حامی بنائیں۔ یہ سیاسی طور پر ان کے لئے لازمی تھا۔ وہ مسلمان جن کی سرگرمیوں نے جناح کو قومی سطح پر بات چیت میں اپنے موقف کو تبدیل کرنے پر مجبور کیا تھا وہ صوبائی سطح پر کانگریس کی بڑھتی ہوئی صفوں کے سیاسی مخالف بھی تھے۔ جناح کی یہی بنیادی کش مکش تھی۔ وہ یا تو کانگریس کے ساتھ رہ سکتے تھے یا مسلمانوں کے ساتھ مگر وہ دونوں کے ساتھ نہیں رہ سکے۔ حالات کے اس سفاک منطقی بہاؤ اور مطالبات مسلسل تھپیڑوں نے انہیں آخر کار پاکستان کا قائد اعظم بنا دیا۔ جس طرح آزادی اور عدم تعاون کے حامی کانگریس اب دونوں نہروؤں اور سپروؤں کو چیلنج کرنے لگے تھے، اسی طرح مختلف قانون ساز اداروں کے مسلمان اب شہنشاہ برطانیہ اور آئینی طرز عمل کے لئے ان کے احترام سے وفاقی کا اعلان کر رہے تھے۔ اور اس طرح جیسے جناح سے پوچھ رہے ہوں، 'آپ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں ہیں؟'

ہندوستان کی سیاسی ہیئت منقسم ہو رہی تھی جس میں حکومت اور مسلمان ایک جانب تھے اور ہندو دوسری طرف۔ اُدھر جب کانگریس احتجاجی جدوجہد اور مہذب حکم عدولی کے دھول بھرے راستوں پر چل پڑی تھی، اور مہاتما کے قدم ڈانڈی کی طرف رواں دواں تھے تو دوسری طرف نظام سے مستفید ہونے والے (مسلمان) راج اور نظام کے دفاع میں صف بہ صف نکلتے نظر آرہے تھے۔

4

مرکوز مقاصد — کم ہوتے متبادل

موہن داس کرم چند گاندھی کو 1920 کی دہائی میں ہندوستان واپس آئے محض پانچ سال ہوئے تھے جب کہ دوسری طرف جناح تقریباً پندرہ سال سے سیاسی طور پر سرگرم تھے۔ بہرحال گاندھی کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو وہ اکیس سال تک جنوبی افریقہ میں سرگرمی کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے تھے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد انہوں نے جلد ہی سیاسی برتری حاصل کرلی۔ وہ اس طرح کہ وہ سیاست کو شہروں کی آرام دہ جلسہ گاہوں سے نکال کر اس جگہ لے گئے جہاں ہندوستان کا دل دھڑکتا تھا، وہی ہندوستان جو ہمیشہ سے گردوغبار میں اوجھل تھا اور ناقابلِ اعتنا سمجھا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کے سیاسی افق پر جو مسئلے چھائے ہوئے تھے، وہ تھے: سوراج؛ آزادی؛ حکومتِ خود اختیاری اور وہ سوالات جو ان سے متعلق تھے۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ مقصد کی حصولیابی کس طرح ہو..... کیا ایک جست میں مرحلے طے کیے جائیں یا پھر بتدریج تفویضِ اختیار و اقتدار کے ذریعہ؟ یہاں ہندو مسلم اتحاد کا سوال بھی درپیش تھا بالفرض بات اگر آزاد اور غیر منقسم و سالم ہندوستان کی ہوئی تو اس اتحاد و اتفاق کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی اور بایں ہمہ اس کی ایک اہمیت تھی۔ باوجود یہ کہ اس قابلِ قدر نصب العین کا حصول اتنا سہل نہیں تھا، جب تک کہ ایک ایسی آزاد، خودمختار حکومت کا تصور سامنے نہ ہو جسے تمام تر ہندوستانیوں، سارے فرقوں، سبھی عقیدوں کے لوگوں کو پیش کیا جاسکے۔ کیوں کہ آزادی کا مطلب صرف انگریز حکومت سے رستگاری نہیں تھی، بلکہ اس سے مقصود یہ بھی تھا کہ اکثریتی تسلط کے حقیقی یا موہوم خوف و ہیبت سے بھی نجات حاصل ہو۔ اس اتحاد و اخوت کی راہ میں کئی صدیوں کے ناخوشگوار تجربات و مشاہدات تاریخ کے تیرہ و تاریک سایے اور ماضی کے تلخ و ترش واقعات حائل تھے۔

برطانوی حکومت واضح طور پر روبہ زوال تھی۔ اسے دیکھ کر جو مسلمانوں کو ان کے عہدِ رفتہ کی شان و شوکت یاد کی

یاد آرہی تھی؛ کوئی شک نہیں؛ مسلمان برٹش راج سے چھٹکارا چاہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کے عوض ہندوستان کو ایک ایسی امکانی صورت میں بھی قبول کرنا نہیں چاہتے تھے جس پر ہندوؤں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ دوسری طرف کئی صدیوں سے محکومی اور تابعداری کے احساس ذلت میں مبتلا ہندوؤں کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب واقعتاً آزادی کی پو پھٹنے والی ہے اور انہیں ایسا لگا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہوگی اور وہ آپ اپنی تقدیر کے مالک ہوں گے۔ ان کے جذبات واحساسات کو بعد میں نغمہ نگار پردیپ نے بڑے ہی متاثر کن انداز میں نظم کیا تھا: 'دور ہٹو، دور ہٹو اے دنیا والو! ہندوستان ہمارا ہے۔'

لیکن اس خوش آئند مستقبل کے پس منظر میں ایک سوال کا دھندلکا بھی موجود تھا کہ یہ ہندوستان کس کا ہے؟ ان دنوں سارے بحث ومباحث، سمجھوتے، بات چیت، مذاکرات اسی سوال پر محیط تھے کہ آخر کیسے مختلف فرقوں کے متضاد مفادات کے مابین توافق پیدا کیا جائے اور کس طرح باہمی بے اعتمادی اور خوف کو ختم کیا جائے خواہ وہ احساس حقیقی ہو یا واہمہ۔ دوسرے لفظوں میں کہیں پر سوال تو یہی تھا کہ اقتدار میں شرکت کی صورت کیا ہو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سکھوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان بھی عدل اور مساوات کا جذبہ قائم رہے؟ علاوہ ازیں اقتدار میں کم وبیش 600 چھوٹی موٹی ریاستوں اور رجواڑوں کی حصہ داری کیسے ہو؟ اس کا حل ڈھونڈ نکالنا بھی آسان نہیں تھا۔ آزادی سے پہلے ان ریاستوں اور رجواڑوں کی حیثیت، سماجی اور سیاسی اعتبار سے، ہندوؤں سے مسلّم تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان ریاستوں کا مجموعی رقبہ ملک کا 5 / 2 حصہ تھا اور آبادی کا ایک تہائی۔ سوال یہ بھی تھا کہ برٹش حکومت کے پوری طرح سے جانے کے بعد اقتدارِ اعلیٰ کس کے ہاتھ میں ہوگا؟ ہم ان سبھی سوالوں پر غور ضرور کریں گے لیکن ہندوستان کی اس بڑی شورش میں ہماری توجہ خاص طور سے جناح کی سعی اور جدوجہد پر ہی رہے گی۔

اس سے قبل ضروری ہے کہ ہم اس بات پر بھی نظر ڈالتے چلیں کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد کے عظیم برطانیہ (گریٹ برٹین) میں کیا ہو رہا تھا؟ سبھی جنگوں کو ختم کرنے کے لیے چھڑی اس جنگ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی برطانوی شہنشاہیت کے عروج اور بالادستی کا دور بھی ختم ہو رہا تھا، ساتھ ہی امریکی غالبیت کے نئے عہد کا ظہور ہو رہا تھا۔ 1922 میں ہی سیورلیس کے معاہدے (TREATY-OF-SEVRES) نے نہ صرف عرب کے سیاسی جغرافیہ کو بلکہ ساری دنیا کے سیاسی منظرنامے کو ہی بدل دیا تھا۔ نتیجتاً قیام امن کی کوششوں سے ایسے برعکس حالات پیدا ہوئے کہ بدامنی پھیل گئی۔ اب امن کی کیا معنویت رہ گئی؟ یا ان حالات میں امن کس طرح باقی رہ سکتا تھا؟ پھر ناگہاں من مانے طریقے سے نئے نئے ممالک بنائے جارہے تھے، بن رہے تھے، کئی بار تو صرف دماغی خلل کی بنیاد پر صرف نقشوں پر لکیریں کھینچ کر۔ ہندوستان میں ہم لوگوں کو ان حالات پر زیادہ محتاط نظر رکھنی چاہیے تھی اور بہت ہی محتاط انداز سے تدریجی انکشافات کی علامات کا مشاہدہ کرنا چاہیے تھا لیکن افسوس! اس وقت لوگوں میں اس بارے میں بیداری نہیں تھی۔ اسپین کی خانہ جنگی دور پھر روس کے عظیم اکتوبر انقلاب سے صرف روس ہی نہیں بلکہ یوروپ کی

بہت سی بادشاہتوں کی جڑیں ہل گئی تھیں۔ عرب اور میسو پوٹامیا کے ممالک کی تقسیم کرنے کی کوششوں کی بجائے یوروپ کے ان واقعات نے جواہر لال نہرو کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کیا۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ انہیں پڑوسی ممالک پر زیادہ دھیان دینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے یوروپ کے واقعات پر ہی توجہ کی کیوں کہ آخر کار ہم لوگ، اس دور میں، انگریزوں کے رطب اللسان تھے اور سچے غلام بھی۔ ہر چند کہ برطانوی حکومت کے خلاف ہماری جدوجہد جاری تھی، ان کے غلام ممالک میں ہم انگریزوں کے سب سے بڑے متوالے تھے۔ ہماری نگاہیں ہمیشہ یوروپ کی طرف ہی گئیں، نہ کہ تہذیب وتمدن کے ان عظیم مراکز اور تاریخی ثقافتی اور دیگر اعتبار سے ہمارے قریب رہے بغداد، استنبول، انقرہ، قاہرہ اور تہران جیسے عظیم شہروں کی طرف تو چلیے ہم بھی اب یوروپ کی طرف ہی رخ کریں دور دیکھیں کہ آخر ان دنوں وہاں کیا ہو رہا تھا؟

مصنف ایان برنیٹ ویلز کے مطابق: '20 کی دہائی کے اواخر میں اسٹینلے بالڈون کی ٹوری حکومت کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب لیبر پارٹی مضبوط ہو رہی ہے اور وہ جلد ہی اپنی حکومت بنا لے گی۔ اس لیے ٹوری حکومت نے ہندوستان میں سیاسی اصلاحات کی پڑتال کے لیے ایک قانونی کمیشن کی تشکیل کی شروعات جلد کر دی تا کہ یقینی ہو جائے کہ ہندوستان میں ان ہی کی پالیسیاں جاری رہیں گی... ہندوستانیوں کو اس کمیشن سے قصداً باہر رکھنے کی شہ بھی ہندوستان کی حکومت سے ہی ملی تھی۔ 1926 میں لارڈ ارون نئے وائسرائے بن کر آئے اور انہوں نے خود کو ایسے مشیروں سے گھرا پایا جو کہ آئی سی ایس کی پنجاب برانچ سے تھے۔ کمیشن میں صرف گوروں کو رکھے جانے کے پس پشت اصل کار فرمائی ان ہی مشیروں، بالخصوص سر میلکم ہیلی اور جیوفری ڈی، ماؤنٹ مورینسی کی تھی۔'2

لارڈ ارون نے ہندوستان کو 'ڈومینین ریاست کا درجہ دلانے کی پوری کوشش کی۔ وزیر اعظم ریمزے میک ڈونالڈ اور ساتھ ہی پارلیمنٹ میں کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر اسٹینلے بالڈون نے ان کی اس کوشش کی حمایت کی اور یہ کنزرویٹو پارٹی میک ڈونالڈ کی قومی حکومت کا سب سے بڑا حصہ بھی تھی۔ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات (ڈومینین اسٹیٹس) دینے کے لارڈ ارون کے مطالبے پر 8 فروری 1929 کو ہاؤس آف کامنز میں بحث ہوئی۔ وزیر اعظم، درجہ نوآبادیات دینے کے حق میں ہی بولے اور بالڈون نے بھی کنزرویٹو پارٹی کی تائید کی بات کہی، لیکن کنزرویٹو پارٹی کے ہی تقریباً ایک تہائی اراکین اس لیے حق میں نہیں تھے۔ 'انہوں نے پارٹی لیڈر کو افسردہ دلی سے سنا اور یوں ہی ان کی تعریف کی... اس کے کٹر مخالف... جو شدت پسندانہ انداز میں اس کے خلاف تھے... ونسٹن (چرچل) تو غصے سے پاگل ہی ہو گئے...' اور انہوں نے اپنی مخالفت کو ڈیلی میل کے صفحات میں یہ لکھ کر ظاہر کیا کہ 'برٹین نے ہندوستان کو وحشیانہ دور سے آزاد کر دیا تھا... سیلف ریگولیشن کا خیال تو فکر سے بھی پرے ہے... (اس لیے) اس (ڈومینین اسٹیٹس) کے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہے۔ اگر وائسرائے کی تجویز کو مان لیا گیا تو برٹش حکومت کی جگہ 'گاندھی راج' آ جائے گا...'

ان حالات میں ایک سات رُکنی قانونی کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس کی سربراہی کی ذمہ داری لبرل پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ اور بیرسٹر سر جان سائمن کو سونپی گئی۔ کمیشن کے ممبروں میں 4 کنزرویٹو، اور دو لیبر پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ جو 3 فروری 1928 کو ممبئی پہنچے۔ اس کمیشن کو 1919 کی مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کی کارگزاری کا جائزہ لینا تھا۔ حالاں کہ ان اصلاحات کو ہر دس سال بعد ہی پرکھا جانا تھا۔ کمیشن کو وقت سے پہلے قائم کیے جانے کی کئی وجوہات مانی جاتی ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان میں اس وقت تک سوراج کا دباؤ زور پکڑنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ، جیسے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، بالڈون کی یہ تشخیص تھی کہ آگے چل کر لیبر پارٹی اقتدار میں آسکتی ہے۔ یہی باتیں سائمن کمیشن کی تشکیل کی بنیادی وجہیں تھیں۔ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد، مسلمانوں کی نمائندگی اور آزادی ہی خاص موضوع بنی رہیں۔ پہلے ہم ان ہی موضوعات کی بات کریں گے۔

گاندھی کے سیاسی و سماجی نظریات کا مرکزی اصول ہندو مسلم اتحاد تھا۔ سوراج کے کچھ حامیوں کو چھوڑ دیں تو گاندھی نے اس کی اہمیت کو باقی کانگریسیوں کے مقابلے کہیں زیادہ اچھے ڈھنگ سے سمجھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خلافت تحریک کی بھی حمایت کی تھی، خواہ اس کی وجہ سے خاصا تنازعہ کھڑا ہوا، کیوں کہ اگر ماضی میں جھانکیں تو تحریک خاصی غلط رہی تھی اور اس سے ہندوستان کو نقصان ہی اٹھانا پڑا تھا، گاندھی نے تو خلیفہ کے منصب کو ختم کرنے کے معاملے کو صرف ایک مذہبی امر کے طور پر دیکھا تھا اور انہیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی جھجک ہی نہیں تھی۔ 4 گاندھی کی رائے تھی کہ تحریک خلافت کی حمایت کرنے سے ہندو مسلم اتحاد کو تقویت ملے گی۔ کیوں کہ خلیفہ کے منصب کو ختم کیے جانے سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ان کا یہ اندازہ تو بجا تھا، لیکن انہوں نے اس اہم بات کو درکنار کر دیا کہ خلیفہ کا عہدہ ختم کرنے کا قدم خاص طور سے خود ترکی کے لوگوں نے بھی اٹھایا تھا۔ یہ کام مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت والے انقلاب کی بدولت ہوا تھا۔ بے شک گاندھی یہ سب جانتے تھے لیکن اس کی اہمیت کو انہوں نے اسلام میں نظر انداز کر دیا کہ اس جذباتی زک کے وقت مسلمانوں کا ساتھ دینے سے شاید وہ انگریزوں کے خلاف ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ ہو جائیں گے۔ تھوڑے وقت کے لیے ایسا ہوا بھی، لیکن المیہ یہ رہا کہ بعد میں اس کا بالکل الٹا اثر پڑا۔

ہندو مسلم اتحاد سے درجہ نوآبادیات کی طرف بڑھنا ایک واضح اور منطقی قدم تھا۔ اس سے ایک طرف تو ملک تقسیم ہونے سے بچتا 'تو' دوسری طرف 1916 کے لکھنؤ سمجھوتے کے تحت، جس کے خاص محرک خود جناح تھے، مسلمانوں کے دل میں اکثریت کا خوف بھی کم ہوتا۔ 'ڈومینین اسٹیٹس' کے بارے میں، میں لوائڈ روڈولف اور سوسین ہوبر سے بہتر، عمیق، اور زیادہ دقیق تجزیہ نہیں کرسکتا جو انہوں نے اپنے مضمون 'دی روڈ ناٹ ٹیکن' میں کہا ہے:

> گاندھی اور ان کے ہونے والے سیاسی وارث جواہر لال نہرو کے درمیان اختلاف پہلی بار 1927 میں مدراس میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر منظر عام پر آیا۔ دونوں میں اس بات پر اختلاف تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کی 'ڈومینین درجہ' کے حصول کو اپنے سیاسی نصب العین کے طور

پر رکھنا چاہیے یا اسے چھوڑ کر ایک نئے مقصد 'مکمل سوراج' کو اختیار کرنا چاہیے.... گاندھی ڈومینین درجہ کے حق میں تھے جب کہ نہرو مکمل سوراج سے آزادی چاہتے تھے۔ اصل مسئلے پر دو سال تک کش مکش جاری رہی اور یہ مسئلہ 1929 میں سلجھا جب کانگریس کے لاہور اجلاس میں نہرو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنائے گئے اور کانگریس نے مکمل سوراج کو اپنے سیاسی نصب العین کی صورت میں اپنالیا۔

جہاں دونوں لیڈروں کا مقصد حصول آزادی تھا، وہیں مگر دونوں جداگانہ توقعات اور قول و قرار کے حامل بھی تھے۔ درجہ نوآبادیات کا مطلب تھا تاج برطانیہ سے منسلک رہنا۔ شہنشاہیت سے وابستہ تمام اداروں میں شامل ہونا اور کم سے کم جزوی طور پر برطانوی سیاست اور رائے عامہ میں شرکت کرنا۔ ڈومینین حیثیت کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کس طرح اور کن شرطوں پر ہوگی، اس پر بھی سودے بازی ہوگی۔ مثال کے طور پر برٹش حکومت اس بات پر زور دیتی تھی کہ اقلیتوں کے حقوق کو یقینی بنایا جائے اور ان کی خاطر خواہ نمائندگی بھی ہو۔ دوسری طرف مکمل سوراج کا مطلب تھا برطانوی شہنشاہی کی مخالفت، واحد قوم پرستی اور اکثریتی جمہوریت، جس کا مطلب نکلتا، تمام معاہدوں اور شرطوں سے الگ ہونا اور ساتھ ہی سیاسی طور پر اتھل پتھل.... جو آگے چل کر تشکیل پانے والی حکومت کی باگ ڈور کو قوم پرست لوگوں کے ہاتھ میں سونپ دیتی... مکمل سوراج کا مطلب یہ بھی تھا کہ نئی قائم ہونے والی حکومت میں اقلیتوں کی اقتدار میں حصے داری کی امید نہیں ہوگی۔

ڈومینین حیثیت کے سلسلے میں گاندھی اور نہرو دونوں کی سمجھ الگ الگ تھی۔ گاندھی نے اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی 21 سال جنوبی افریقہ میں اقلیتی فرقے کے ایسے رُکن کے طور پر گزارے تھے جس نے ریاست کی بہت سے ہونے والی تفریق کے خلاف اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی تھی۔ جنوبی افریقہ میں 'تاج برطانیہ اور برطانوی سامراج کی شہریت' حقوق کا ایک ممکنہ وسیلہ اور جبر و استبداد سے بچنے کی ایک سبیل تھی۔ جنوبی افریقہ میں رہنے لگے گاندھی نے 'لندن جا کر قانونی مدد کی فریاد کی تھی۔ انھوں نے پہلے عالمی جنگ کے وقت برطانوی فوج کے لیے زولو اور بوید کی جنگوں میں میڈیکل ٹور میں مدد کر کے برٹش حکومت کی مدد کی تھی'۔ لیکن نہرو، جو گاندھی سے کم عمر تھے۔ مانتے تھے کہ برطانوی سامراج ایک دشمن تھا'

ڈومینن حیثیت کا مسئلہ 1927 میں بہت شدید ہو گیا تھا۔ اس سال کے ماہ ستمبر میں کانگریس نے سائمن کمیشن کا پوری طرح سے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سوراجیوں اور مسلم لیگ نے بھی اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا، جیسے کہ ایان ویلز لکھتے ہیں: 'سائمن کمیشن نے قوم پرست تحریک کی ہندوستان کے مشترکہ دشمن کی یاد دلادی۔ جناح سمیت بہت سے سیاست داں' جو کانگریس سے الگ ہو گئے تھے' وہ واپس حلقے میں لوٹ آئے۔' ویلز کہتے ہیں کہ 'جناح سائمن کمیشن کی مخالفت کے مرکز میں رہے اور انہوں نے اس کے بائیکاٹ کے لیے متحدہ محاذ کی حوصلہ افزائی کی۔' گاندھی، موتی لال نہرو اور سپرو کی طرح جناح بھی اس بات پر متفق ہو گئے کہ ہندوستان کو ڈومینین حیثیت ملنے کا وقت آچکا ہے۔ لیکن مئی 1930 میں پیش سائمن کمیشن کی

رپورٹ نے 'اقتدار منتقلی کے سبھی تصورات کو خارج کر دیا اور اس نے ڈومینین حیثیت کا اپنی رپورٹ میں ذکر تک نہیں کیا۔' اس تعطل کے بعد ہی گول میز کانفرنسوں کی شروعات ہوئی۔

31 اکتوبر 1929 کو وائسرائے اِروِن نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں آئینی اصلاحات اور ڈومینین اسٹیٹس کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے لندن میں یہ کانفرنس ہوگی۔ قوم پرستوں کے پاس پہلے ہی سے ترتیبی اصلاحات کے لیے 1928 میں تیار کی گئی نہرو کی رپورٹ کی صورت میں ایک خاکہ تیار تھا جس کے بارے میں ہم تیسرے باب میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ اس رپورٹ کی اہم سفارشات میں ہندوستان کی ڈومینین حیثیت دینے کی بات بھی شامل تھی لیکن نہرو نے 1929 میں مدراس میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں اس رپورٹ کو رد کرا دیا اور ساتھ ہی انہوں نے ڈومینین درجہ کے بدلے مکمل سوراج کے معاملے کو کانگریس کا خاص سیاسی نصب العین بنانے کی بھی کامیاب کوشش کی۔

اگرچہ 1927 میں گاندھی کے لیے ہندو مسلم اتحاد سب سے بڑی ترجیح تھی اور یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ ڈومینین حیثیت کے پابند تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس سے ہندو مسلم اتحاد کو تقویت ہوگی مگر وہ اسے یقینی نہیں بنا پائے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لیے انہوں نے باقی دوسری تدابیر کو بھی اختیار کیا۔ انہوں نے اس بات کو یقینی صورت دی کہ جیلا و معزز بزرگ مسلمان ڈاکٹر اے ایم انصاری کو کانگریس کے مدراس اجلاس میں پارٹی کا صدر بنایا جائے، گاندھی کا خیال تھا کہ اس سے مسلم فرقے میں اعتماد پیدا ہوگا، گاندھی کو امید تھی کہ انصاری 1916 کے لکھنؤ سمجھوتے کی ہی طرز پر دونوں فرقوں کے مابین سمجھوتہ کرانے میں پورا تعاون کریں گے، کچھ کچھ ویسا ہی جیسا جناح 1927 کے اوائل میں اپنی دہلی تجاویز کے ذریعہ کرنے کے لیے بے حد قریب آ گئے تھے۔ جیسا کہ ڈانڈ اور سوسین لکھتے ہیں۔ 'گاندھی کے منصوبے میں، تب ہی اڑچن شروع ہوگئی کیوں کہ گاندھی کے معتمد اور کانگریس کے لیڈر موتی لال نہرو نے یہ گزارش کی کہ ان کے بیٹے جواہر لال نہرو کو پارٹی کا صدر بنایا جائے۔ گاندھی نے موتی لال سے کہا کہ یہ جلد بازی ہوگی اور وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد پر کام کرنا زیادہ ضروری تھا' نہ کہ کانگریس کی قیادت میں تبدیلی کرنا۔ انصاری صدر منتخب ہوگئے لیکن جواہر لال نہرو کو بھی ترقی دی گئی۔ انہیں پارٹی کے کئی جنرل سکریٹریوں کی قطار سے آگے بڑھا کر ایک نیا نام 'ورکنگ سکریٹری' کا عہدہ دے دیا گیا۔

لیکن جواہر لال کی تو ترجیحات ہی جدا تھیں۔ وہ دسمبر 1927 کے آخری دنوں میں یوروپی ممالک کے دورے سے لوٹے تھے اور اس وقت مدراس میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بھی تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ 'بروسیلز میں استعماری جبر و استبداد اور سامراج کے خلاف بین الاقوامی کانگریس' میں مندوب کی حیثیت سے شامل ہو کر لوٹنے والے نہرو کی سوچ بہت بدل گئی تھی۔ سامراج کے بارے میں یہ نئی بیداری اور سوچ میں انقلابی تبدیلی کرنے سے اب نہرو کی دیہات میں جا کر کام کرنے، کھادی بُننے اور چرخہ کاتنے جیسے گاندھی کے 1920 کے نظریات بالکل بے کیف و بے لطف لگنے لگے تھے۔ ساتھ

یہ بھی تھا کہ سوراج حاصل کرنے کے لیے شروع کی گئی گاندھی کی تحریک عدم تعاون کو چھ سال گزر چکے تھے، نہرو کو تب لگنے لگا تھا کہ بس یہ کامیاب ہونے پر ہی ہے۔ لیکن ٹھیک تب چوری چورا واقعہ کے بعد تشدد بڑھنے کے اندیشہ کے پیش نظر گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی۔ جیسا کہ مدھولی مئے کہتے ہیں: '1927 کے اواخر میں ہندوستان لوٹنے والے جواہر لال نہرو کی سوچ کافی بدل چکی تھی۔ ان پر مارکسیت خاصا اثر کر گئی تھی اور وہ سامراجیت کے بالکل خلاف ہو گئے تھے۔ اب وہ پوری طرح سے آزادی اور سوشلزم چاہتے تھے۔ جواہر لال نہرو کے لیے فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے زیادہ اہمیت طبقاتی سیاست کی تھی۔ انگریزی حکومت اور کانگریس کے رشتوں کو نرم بنائے رکھنے کی گاندھی کی ہدایت کے باوجود نہرو نے 1927 کے سالانہ کانگریس اجلاس میں شدید تبدیلیاں لانے والی قراردادیں پیش کیں اور انہیں منظور کیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ کانگریس کا مقصد ڈومینین حیثیت کی بجائے مکمل آزادی ہو۔ دوسری قرارداد میں سامراج پر حملہ تھا۔ گاندھی اپنی سوچی سمجھی حکمت عملی پر نہرو کے ان حملوں سے کافی تلملا گئے۔ 4 جنوری 1928 کو کانگریس نے نہرو کو خط لکھا: 'تم بہت تیزی سے بڑھ رہے ہو۔ تمہیں سوچنے اور نئے ماحول کے حساب سے ڈھلنے کے لیے تھوڑا وقت لینا چاہیے تھا۔ تم نے قراردادیں وضع کی ہیں ان میں سے بیشتر کو ایک سال کے لیے ٹالا جا سکتا تھا۔ ری پبلک آدمی کی طرف تمہارا جھکاؤ (ڈومینین حیثیت کی بجائے مکمل سوراج کا مطالبہ کرنا) عاجلانہ قدم لگتا ہے۔'

اور پھر نہرو کی نئی انقلابی رغبت پر گاندھی کا ایک بالواسطہ حملہ: 'مجھے تمہاری ان حرکتوں (غلط وقت پر بغیر سوچے سمجھے لائی گئی تجاویز) سے اتنی شکایت نہیں ہے جتنی کہ تمہارے فتنہ پردازی اور پریشانی کھڑی کرنے والے لوگوں سے ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اب بھی پوری طرح سے عدم تشدد میں یقین رکھتے ہو یا نہیں۔ اگر تمہارے خیالات بدل گئے ہیں تب بھی تم یہ فرض کر کے نہیں چل سکتے کہ اس طرح کے غیر منتظم اور بے لگام تشدد سے ہندوستان کو فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ اگر تمہیں یوروپی ممالک کے تجربات کی بنیاد پر لگتا ہے کہ ملک میں غلط ہو رہا ہے تو ضرور تم اپنے خیالات کو ہر ممکن طریقے سے عمل میں لاؤ لیکن براہ کرم پارٹی بناؤ۔ جب تک ایسا نہیں ہو جاتا، تب تک انڈین نیشنل کانگریس کے کارگزار سکریٹری کے طور پر تمہاری یہ ذمے داری ہے کہ اپنی ساری توانائی ہندو مسلم اتحاد پر صرف کرو جو کہ پارٹی کا اصل مقصد ہے۔'

نہرو نے اس کے جواب میں 11 جنوری 1928 کو ایک بے حد ناراضی بھرا خط لکھا: 'مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ آپ نے (جو الفاظ اور زبان کے بارے میں کافی محتاط رہتے ہیں) ایسے لفظوں کا استعمال کیا ہے جو پوری طرح سے غلط ہیں۔ آپ نے قصداً کچھ تجاویز کی مذمت اور نکتہ چینی کی ہے.... آپ نے نظم وضبط کی بات کی ہے... کیا میں آپ کو یہ بات یاد دلا دوں کہ آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن ہیں اور یہ بات غیر معمولی نہیں ہے کہ آپ اپنی ہی پارٹی کی اہم تجاویز کی مخالفت کر رہے ہیں...'

اور نہرو نے پھر براہ راست نکتہ چینی کی: 'آپ نے آزادی کی تجاویز کے بارے میں کہا ہے کہ یہ عجلت میں تیار کی

گئی ہیں اور بغیر سوچے سمجھے پاس کی گئی ہیں.... (جب کہ اور باقی ممبر گذشتہ پانچ سال سے اس کو اٹھا رہے ہیں اور سالانہ اجلاس میں بھی اس موضوع پر بات ہوتی ہے)...آپ نے قراردادوں کے بارے میں عجلت میں تیار کی گئیں اور بغیر سوچے سمجھے منظور کی گئیں جیسے الفاظ کا جو استعمال کیا ہے اسے کس طرح سے درست نہیں کہا جاسکتا ہے...آزادی کا مطالبہ اور اس سے منسلک چیزیں میرے لیے بہت معنی رکھتی ہیں اور یہ میرے لیے باقی کسی بھی چیز سے زیادہ اہم ہے..... مجھے نہیں لگتا کہ چند تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر کوئی اور اس معاملے پر آپ سے متفق ہوگا..... آزاد خیال اشخاص (سر تیج بہادر سپرو، موتی لال نہرو) اور مسلمانوں (جناح) کو آزادی کے بارے میں کوئی شک یا اندیشہ ہوسکتا ہے..... اور یہ بھی مانا جاسکتا ہے کہ وہ ڈومینین حیثیت کو زیادہ ترجیح دیں..... لیکن یہ سارے اشخاص میری رائے سے متفق ہوں یا نہ ہوں مجھے یہ نہیں سمجھ میں آرہا ہے کہ کیسے کوئی قومی تنظیم ڈومینین حیثیت کو اپنا مقصد مان سکتی ہے۔ اس خیال سے ہی مجھے گھٹن ہوتی ہے۔'

نہرو نے پھر گاندھی کے خیالات اور قیادت پر سوال اٹھائے، ایسے سوال بھی کیے جو جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی سیدھی ٹکر لگتے تھے۔ انہوں نے لکھا:

'آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ میں تہہ دل سے آپ کی عزت کرتا ہوں اور آپ کی قیادت پر یقین کرتا ہوں... باوجود اس کے کہ میں آپ کی سابقہ کتابوں مثلاً انڈیا ہوم رول وغیرہ سے قطعی متفق نہیں ہوں۔ مجھے لگتا رہا ہے اور اب بھی یہی لگتا ہے کہ آپ اپنی ان چھوٹی کتابوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ جیل سے چھوٹ کر آنے کے بعد آپ کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے....آپ کا رویہ بار بار بدلتا رہا...ہم میں سے زیادہ تر لوگ اس رویے سے کافی تذبذب میں تھے...میں نے آپ سے کتنی بار پوچھا کہ مستقبل میں آپ کیا کرنے کی امید رکھتے ہیں اور آپ کا جواب ہمیشہ ہی غیر تسلی بخش رہا ہے...آپ نے کہا کہ...آپ کھادی تحریک کو تیزی سے پھیلانا چاہتے ہیں...... لیکن کوئی معجزہ نہیں ہوپایا.... میں نے ایسا سوچنا شروع کردیا ہے کہ اگر ہم ہندوستان میں کھادی کو گھر گھر پہنچانے تک آزادی کا انتظار کریں گے تو شاید ہمیں گریک کیلنڈر (ایسی تاریخ جو کبھی نہیں آتی) تک انتظار کرنا پڑے گا..... ہمارا کھادی کو پھیلانے کا کام سیاست سے بالکل الگ ہے....سوال یہ ہے کہ پھر کیا کیا جائے...آپ کچھ کہتے ہی نہیں ہیں...... صرف تنقید اور نکتہ چینی کرتے ہیں اور آپ کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملی......'

نہرو اس کے بعد دنیا کے تناظر میں لکھتے ہیں:

'ینگ انڈیا میں آپ کے مضامین..... آپ کی سرگذشت وغیرہ پڑھ کر مجھے اکثر لگا کہ میرے خیالات آپ کے خیالات سے کتنے جدا ہیں....مجھے لگتا ہے کہ آپ مغرب کی تہذیب کو بہت غلط طریقے سے دیکھتے ہیں اور وہاں کی بہت ساری ناکامیوں کے لیے تہذیب کو ہی ذمہ دار بھی مانتے ہیں...... مجھے نہیں لگتا کہ آپ کا نام نہاد 'رام راجیہ' بہت عظیم تھا اور میں اس کی واپسی بھی نہیں چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ مغربی یا

صنعتی تمدن ہندوستان پر تسلط قائم کر کے رہے گا...... میں یہ بھی مانتا ہوں کہ صنعت کاری کی خامیوں سے سب واقف ہیں اور یوٹوپیاؤں اور سماجی نظریات کا حصہ انہیں خامیوں کو دور کرتا ہے۔'

نہرو نے اپنے خط میں اس کے بعد ہندوستان کی غریبی کے اسباب اور اس کے حل کے بارے میں اپنی جدید سوچ رکھی اور گاندھی کے خیالات سے اس کا موازنہ کیا۔ نہرو نے لکھا کہ...... 'آپ نے ہندوستان میں غریبوں کے مفادات کی وکالت کی ہے..... لیکن مجھے شک ہے کہ آپ کی تجویز کردہ (گاؤں میں روزگار اور تخلیقی وتعمیری کام) تدابیر سے اس کا حل نکلے گا...... آپ نے زمینداری جیسے نظام یا سرمایہ داروں کے ہاتھوں صارفین اور مزدوروں کے استحصال کے خلاف کچھ بھی نہیں کہا۔'

آگے بڑھنے سے پہلے 11 جنوری 1928 کے نہرو کی محنت سے تحریر کردہ خط کے بارے میں غور کرتے ہیں۔ مثلاً 'صنعتی یا نئی تہذیب ایک دن ہندوستان کو پیچھے چھوڑ دے گی اور جہاں تک اس کی خامیوں کی بات ہے تو اسے مغربی یوٹوپیا اور سماجی نظریات کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے۔' نہرو آگے کہتے ہیں کہ 'چرخہ کاتنے یا کھادی کے کپڑے تیار کرنے اور پہننے سے سوراج کا جذبہ اور کمزور ہوتا ہے نہ کہ فروغ پاتا ہے۔ ہندوستان سے غریبی کو ختم کرنا ہے' جاگیرداری اور سرمایہ داری پر حملہ کرنا اور انہیں مٹانا ہوگا۔'

نہرو نے لکھا کہ 'گاندھی خود یقینی طور پر اپنی کتابوں سے کہیں بڑے ہیں۔ نہرو ہند سوراج کی مثال دیتے ہیں جسے پڑھ کر نہرو کو لگتا ہے کہ 'میرے خیالات اور آدرش آپ (گاندھی) سے کتنے الگ ہیں۔'

مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا۔ ابتدا میں اور 1920 کے وسط کے دنوں میں اپنے یوروپی دورے سے پہلے نہرو کی بات چیت سے لگتا تھا کہ ان کے خیالات گاندھیائی ہیں۔ انہوں نے تشدد کی مذمت کی اور عدم تشدد کے ذریعہ آزادی کا مقصد پورا کرنے پر زور دیا۔ 1923 میں انہوں نے کہا... ہمارے پاس دو ترجیحات ہیں ایک طرف لینن اور مسولینی ہیں تو دوسری طرف گاندھی اور دیگر لوگ- ہندوستان کو آزادی کے بعد مغربی ممالک کی ایک گھٹیا نقل بن کر نہیں رہ جانا چاہیے۔ کھادی کے پیغام کو ہم لوگوں تک پہنچا کر ایسے حالات سے بچ سکتے ہیں۔

17 جنوری 1928 کو گاندھی نے اس خط کا جواب دیا جس میں نہرو نے اپنے گاندھیائی ہونے کی تردید کی تھی۔ گاندھی نے نہرو کو لکھا کہ انہوں نے (نہرو نے) بہت ہی بہادری سے اپنے سچے جذبات کو اتنے برسوں سے دبائے رکھا۔' گاندھی لکھتے ہیں کہ وہ (نہرو) 'میرے خلاف بغاوت کرنے کے لیے آزاد ہیں۔' نہرو اور مدراس کانگرس اجلاس پر نکتہ چینی کرنے والی جو تحریریں چھپی ہیں، انہیں 'شروع سے ہی غلط ڈھنگ سے لیا جا رہا ہے۔' انہوں نے لکھا کہ 'ہمارے درمیان اتنے اختلافات ہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس وقت جب تم اپنے خیالات کو دبائے بیٹھے تھے، تم نے میری ان باتوں کو نظرانداز کیا' جو تمہارے حساب سے میری سنگین خامیاں تھیں۔ تم نے (میری طرف سے) پہلے کی نئی نکتہ چینیوں پر توجہ نہیں

کی، کیوں کہ تم صدمے کی حالت میں تھے اور تمہیں نکتہ چینیاں اتنی بری نہیں لگیں۔ جتنی اب تک رہی ہیں۔'

گاندھی کو یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی کہ آگے کیا کرنا ہے۔ انہوں نے لکھا 'جیسا تم کہتے ہو کہ میں غلط ہوں اور ملک کو اس طرح نقصان پہنچا رہا ہوں جس کی بھرپائی ہو پانا مشکل نہیں ہے..... تو یہ تمہارا فرض ہے کہ تم میرے خلاف بغاوت کرو گے۔'' مجھے لگتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو اختلاف ہیں وہ اتنے زیادہ اور اتنے بنیادی ہیں کہ اتحاد کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی ہے۔'' میں تم سے اپنا درد نہیں چھپا سکتا کہ میرا ایک ایسا ساتھی چھوٹ جائے گا جو نڈر، لائق اور ہمیشہ سے ہی ایماندار رہا ہے،'' لیکن اگر ہماری یہ قربت کسی وجہ سے ختم ہو بھی جاتی ہے تب بھی ہمارے ذاتی تعلقات اور قربت میں کسی طرح کا فرق نہیں پڑنا چاہیے۔' گاندھی نے پھر ایک دوسرے سے الگ ہونے اور اپنے اختلافات کو ظاہر کرنے کے آغاز کا راستہ تجویز کرنے کی کوشش کی...... 'میں تمہیں اپنا احتجاج ظاہر کرنے کا ایک پروقار راستہ بتاتا ہوں۔ تم مجھے اپنا احتجاج ظاہر کرنے والے خط اشاعت کے لیے دے دو۔ میں اسے ینگ انڈیا میں شائع کروں گا۔ اور اس کا مختصر سا جواب بھی لکھوں گا...... اگر تم ایک اور دوسرا خط لکھنے کی قباحت مول لینا نہیں چاہتے ہو تو تمہارا لکھا خط (11 جنوری 1928) میرے سامنے ہے۔ میں اسے شائع کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے یہ خط ایک واضح اور دیانت دارانہ دستاویز لگتا ہے۔'

لائڈ اور سوزان پھر تفصیل سے لکھتے ہیں۔ '17 جنوری 1928 کے خط سے نہرو صدمہ میں آگئے اور کافی آزردہ ہوئے لیکن نہرو نے احتجاج ظاہر کرنے کی گاندھی کی تجویز قبول نہیں کی۔ نہرو اگر ایسا کرتے تو وہ اپنے ہی رہبر اور پاسبان کو للکارنے کے مترادف ہوتا۔ نہرو نے ایسے حالات میں پیچھے ہٹنا ہی بہتر سمجھا۔ ان کا (نہرو) 11 جنوری کا لکھا خط بہت ہی جذباتی اور عاجلانہ خط تھا۔ گاندھی اس خط کو ویسے بھی چھاپنے والے نہیں تھے۔ اس کے بعد نہرو نے طے کیا کہ وہ جان بوجھ کر یا براہ راست گاندھی کے خیالات یا طور وطریق کی نکتہ چینی نہیں کریں گے۔ نہرو نے پھر لکھا 'کسی اور کا میری زندگی پر اتنا اثر نہیں رہا ہے جتنا کہ آپ کا اور نہ کسی سے مجھے اتنی تحریک و ترغیب ملی ہے۔ آپ سے میرے تعلقات خراب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا سیاست کے میدان میں میں آپ کا بچہ نہیں ہوں بلکہ ایک ایسے ضدی بچے جیسا ہوں جو بتائے بغیر ایک عرصے سے اسکول سے بھاگا ہوا ہے۔' نہرو اور گاندھی کے درمیان اس یادگار، خط و کتابت سے ہمیں یہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ کس طرح دونوں لیڈروں میں ڈومینین درجہ بنام مکمل سوراج کے سوال پر صلح کی کوششوں نے ہندوستان کے بٹوارے کو جنم دیا۔

جنوری 1928 میں نہرو اور گاندھی کا یہ اختلاف رائے درحقیقت اس بنا پر تھا کہ کانگریس کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے۔ 'کیا ملک کا مقصد ڈومینین حیثیت ہے یا پھر مکمل سوراج۔ یہ جواب سائمن کمیشن کے لیے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ اس کمیشن کے قیام کا مقصد آئینی اصلاح تھا اور یہ کمیشن 22 فروری 1928 کو ہندوستان آنے والا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے

ہیں، سات ممبروں نے اس کمیشن میں کوئی بھی ہندوستانی نہیں تھا اس میں کنزرویٹوری پارٹی کے لوگوں کی اکثریت تھی کہ یہ قوم پرستوں کے لیے اہانت وتحقیر کی بات تھی۔ خاص طور پر نوجوان طبقے کے لیڈروں کے لیے جو اس سے کافی غیر مطمئن تھے اور جن کے قائد جواہر لال نہرو تھے۔

گاندھی چاہتے تھے کہ کانگریس ڈومینین حیثیت کی تجویز منظور کرنے کے لیے بھی تیار رہے۔ اس میں مکمل سوراج کے نہرو کے مطالبے کے مقابلے اقلیتوں کے لیے یہ بھروسہ ہوگا۔ کہ ہندوستانیوں کی اپنی حکومت بننے پر اکثریتی آبادی والا اقتدار رہتے ہوئے بھی ان کے حقوق محفوظ رہیں گے اور ان کی خاطر خواہ نمائندگی بھی ہوگی۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ پنجاب، بنگال اور نوابوں کی مسلم اکثریتی ریاستوں میں اعتماد پیدا ہوگا۔ آزادی کی مساوات کے دو اہم اجزا ہوں گے جس میں ایک طرف وفاقی نظام میں خود مختاری ہوگی اور دوسری طرف ریاستوں کو اس میں خود اختیاری کا موقع بھی ملے گا۔ دونوں ہی اجزا آزادی کے لحاظ سے اہم ہوں گے۔ گاندھی نے ڈومینین حیثیت کو جو ترجیح دی اس کے پس پشت جنوبی افریقہ کے ان کے اپنے تجربات کا اثر تھا یہی وجہ تھی کہ گاندھی مکمل آزادی کی بجائے ڈومینین حیثیت پر زیادہ زور دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ گاندھی کی یہ تشخیص بھی تھی کہ 'آزادی سے متعلق ہندوستان کے مطالبات برطانیہ کے پارلیمانی نظام اور وہاں کی رائے عامہ کے آس پاس ہی رہیں۔' کیوں کہ برطانوی پارلیمنٹ کو ہندوستان میں آئینی اصلاحات اور خود مختاری کے لیے قانون بنانا ہوگا۔ گاندھی کا خیال تھا کہ ابتدائی دنوں میں برطانیہ کی پارلیمنٹ اور عدلیہ کا تعاون کافی معاون ثابت ہوگا۔

گفت وشنید کی ایسی کوشش کا، جسے برطانوی پارلیمنٹ میں منظوری ملنے کی امید تھی، خاکہ اصل میں تقریباً ایک دہائی پہلے ہی لکھنؤ سمجھوتے میں تیار کرلیا گیا تھا۔ گاندھی ان تجاویز کی بار بار مخالفت کرنے کی وجہ سے ہی نہرو پر تنقید کرتے تھے۔ 1916 میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ہونے والے لکھنؤ سمجھوتے میں دونوں ہی تنظیمیں اس پر متفق الرائے تھیں کہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری اور پارلیمانی نظام ہو بشرطیکہ مسلمانوں کی آبادی کے تناسب میں ان کے لیے زیادہ جگہیں ہوں۔ جو محفوظ ہوں، بات چیت اور صلح کی یہی شرائط 1918 کی اصلاحات کے لیے بھی رکھی گئی تھیں۔

1928 کی (موتی لال) نہرو رپورٹ خود اختیاری (مقامی حکومت) کے عمل کے اگلے مرحلے کو مدنظر رکھ کر ہی تیار کی گئی تھی۔ اس میں ڈومینین حیثیت کا ذکر تھا لیکن سمجھوتے کی ان تجاویز کو ہٹا دیا گیا تھا جن میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے مرکزی اسمبلی میں محفوظ نشستیں رکھی جائیں اور انہیں 'زیادہ توجہ' دی جائے۔ نہرو رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی، جو تقریباً ایک چوتھائی تھی، کے قریب سیٹیں دی جائیں۔ لیکن مسلم لیگ کے لیڈر کے طور پر جناح کا کہنا تھا کہ ایک تہائی سیٹیں مسلمانوں کے لیے محفوظ رکھی جائیں۔ ویلز لکھتے ہیں کہ۔ 'کل جماعتی کانفرنس میں پورا ماحول جناح کے خلاف تھا۔ جواہر لال نہرو اور کانگرس کے نوجوان قوم پرستوں کے خیالات، ہندو مہا سبھا کے نمائندوں کی تعداد اور پنجاب سے آئے ہندو نمائندوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے، جیسی امید کی جاری تھی، جناح کے سبھی چھے مطالبات (جن میں سب سے

اہم مطالبہ مسلمانوں کے لیے مرکزی اسمبلی کے دونوں ہی ایوانوں میں ایک تہائی ریزرویشن کا تھا) نامنظور کیے جائیں گے، ویسا ہی ہوا۔ سپرو سمیت تمام آزاد خیال لیڈر مسلم لیگ کے مطالبات پر غور کرنے کے لیے تیار تھے لیکن کانگریس اس کے لیے تیار نہیں تھی۔'

ویلز لکھتے ہیں کہ کل جماعتی کانفرنس میں جناح کے مطالبات کو خارج کر کے نہرو رپورٹ کو منظور کیے جانے کے بعد بھی 'جناح خود کو قوم پرست ہی مانتے رہے، ہندو مسلمانوں کو متحد کرنے کا خواب دیکھتے رہے اور دونوں فرقوں کو یکساں سیاسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کے واسطے ترغیب وتحریک دیتے رہے۔' جناح تمام تر مشکلات کے باوجود پورے 1928 تک گاندھی جی کی طرح دونوں ہی فرقوں کو قریب لانے کی کوششیں کرتے رہے۔ نہرو اور قوم پرستوں کی نئی نسل کے لیڈروں کے برخلاف جناح ہندو مسلم اتحاد کو ایک قومی مسئلے کے طور پر دیکھتے تھے نہ کہ فرقہ وارانہ تنازعے کے طور پر۔ وہ 1928 کے اواخر میں بھی یہی مان کر چل رہے تھے کہ سوراج کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ انہوں نے مکمل آزادی کے حصول کے لیے آئینی طریقوں میں اپنا یقین واعتماد قائم رکھا اور مانتے رہے کہ اسی کے ذریعے مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

جواہر لال نہرو بھی شروع میں 1928 کی نہرو (موتی لال) رپورٹ کو ہی مان کر چلتے رہے لیکن جلد ہی اس میں کہی گئی کچھ باتیں، جیسے، فرقے کی بنیاد پر نمائندگی اور ڈومینین درجہ کے تئیں وابستگی جیسی باتیں انہیں کھٹکنے لگیں۔ یوروپ کے دورے کے بعد آخر کار وہ ایک بدلے ہوئے انسان جو تھے۔ 'گاندھیائی خیالات کے تئیں ان کا میلان کہیں دبتا ہوا نظر آرہا تھا یا شاید سامراج مخالف اصولوں نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ ان کے قوم پرستانہ مطمع نظر میں بھی تبدیلی آئی۔ اب وہ ایسے سالم قوم پرستانہ جذبے کے تئیں وقف تھے جس میں یکساں شہریت ہو اور اکثریتی جمہوریت ہو۔ اب وہ دوسرے سماجی زمروں خاص طور سے مذہب کی بجائے طبقے کی بنیاد پر سیاسی عمل کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فرقہ وارانہ نمائندگی اور ڈومینین حیثیت کی نفی کرتے ہوئے انہوں نے اجتماعیت پسندانہ ریاست اور کثیر الثقافتی ریاست کے اہم پہلوؤں جیسے اقلیتوں کو نمائندگی، انہیں تحفظ، اور وفاقی ریاست کی تجویز کو بھی نامنظور کر دیا۔ یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ ڈومینین حیثیت کے بارے میں نہرو نے گاندھی کو لکھا تھا کہ ... 'اس سے مجھے گھٹن ہوتی ہے...'

اس بارے میں اے جی نورانی لکھتے ہیں کہ 'نہرو جو برطانوی طور طریقوں کو آنکھیں بند کر کے ماننے پر زور دے رہے تھے ہندوستان جیسے کثیر فرقوں والے ملک میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اقلیتوں خاص کر مسلمانوں کو تحفظ کی ضرورت ہے۔ نہرو کا خیال تھا کہ اقلیتوں کے لیے تحفظاتی تدابیر (جیسے مسلمانوں کے لیے ریزرویشن) اور انہیں زیادہ توجہ (آبادی کے مقابلے زیادہ جگہیں) کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ الگ الگ مذہب اور ذات کے باوجود ہندوستانی شہریوں کو یکساں حقوق ہوں گے اور یہ کافی ہوگا۔ بہر حال ہندوستان کے مذہبی اور سماجی طور پر اقلیتوں کے تحفظ کا یہ معاملہ ہی انگریز حکومت کے لیے بانٹو اور راج کرو کی پالیسی کا اہم حربہ بن گیا۔ ہندوستان کے مذہبی اور سماجی اعتبار سے اقلیتوں کے

تحفظ کے سوالوں کو تقویت ملی۔ کانگریسی اکثریت پسندی کے اقتدار اعلیٰ پر اجارہ داری کے دعووں سے اقلیتیں خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگیں۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نہ صرف صوبائی سطح پر بلکہ پوری ہندوستانی سطح پر بھی اقلیتیں سیاسی طور پر بیدار ہو چکی تھیں، اور انہوں نے اپنی پہچان بھی بنالی تھی۔ اقلیتیں اپنے حق کے ساتھ ساتھ نمائندگی کے لیے آواز اٹھانے لگی تھیں۔ ایک آزاد ہندوستانی قوم بننے کے لیے 'ایک ملک' کی شکل میں ہندوستان کا وجود مسلمانوں کی رضا کارانہ حمایت پر منحصر تھا۔ اس کے برعکس ٹھیک اسی بات پر مسلمانوں میں آزاد ہندوستان کے اندر اپنے مستقبل کے تئیں ڈر بھی تھا۔ کیا انہیں تب ہندوؤں کی قطعی اکثریت سے پیدا ہونے والے مظالم کا سامنا نہیں کرنا ہوگا؟ - اس طرح کے کسی بھی امکان کی نفی کرنے والے جوابوں میں صرف بے اعتباری کی کراہ ہی محسوس ہوئی اور پچھلی کئی صدیوں اور تاریخ کی باتوں نے فکر و خیال دونوں کو دھندلا کیا۔

'گاندھی اور نہرو دونوں کی توقعات کو برطانیہ کی گھریلو سیاسی □ بازیوں سے مات مل رہی تھی جو ان کے کنٹرول میں نہیں تھیں۔' وائسرائے کے طور پر لارڈ اروِن نے ہندوستان کو وہ ڈومینین درجہ دلانے کی میں بھی کی گئی تھی لیکن وزیر اعظم ریمزے میک ڈونالڈ کوشش کی تھی جس کی سفارش 1928 کی نہرو (موتی لال) رپورٹ کی غیر پائیدار حکومت ہندوستان کو ڈومینین درجہ دینے کے سوال پر اختلافات سے دوچار تھی۔ اس کے علاوہ دسمبر 1929 میں کانگریس کی طرف سے مکمل سوراج کے مطالبے کے بعد ڈومینین درجہ کا مقصد تو بس ایک اصول بھر ہی تو رہ گیا تھا۔

پنڈت موتی لال نہرو کی 1928 کی رپورٹ نے جو حاصل کیا، وہ مقصد تو بالکل ہی اَن چاہا تھا، اس رپورٹ کی وجہ سے کئی مسلم گروپوں کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک ہی چھت کے نیچے آنا پڑا۔ یہ چھت تھی آل انڈیا مسلم کانفرنس 14 (جو مسلم لیگ سے الگ تھی) اور انہیں اجتماعی طور پر اپنی ایک رائے سامنے رکھنی تھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ہی دیکھا ہے، نہرو کی 1928 کی رپورٹ 1916 کے لکھنؤ سمجھوتے کے بالکل برعکس تھی۔ اس میں جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر الیکشن بند کرنے اور اقلیتوں کی کثیر آبادی والے صوبوں، جیسے یوپی، بہار اور اس زمرے میں آنے والے دیگر صوبوں کو الگ سے کوئی توجہ نہ دینے کی سفارش بھی کی گئی تھی۔ ان دونوں باتوں کا سیدھا اثر اقلیتی صوبوں کی مسلم نمائندگی پر ہوا جس سے مرکزی قانون سازیہ (سینٹرل اسمبلی) میں ان کی تعداد کم ہوگئی۔ اس کے بعد یہ خلاف وضع نہیں تھا کہ جناح اور مرکزی قانون سازیہ میں ان کے ساتھی اس سے بری طرح پریشان ہوں۔ نتیجتاً انہوں نے صوبائی مسلم لیڈروں کے ساتھ مل کر اپنا مشترکہ نصب العین بنایا۔

اس مقصد کے لیے آغا خان کی قیادت میں 31 دسمبر 1928 کو مسلم کانفرنس کی میٹنگ طلب کی گئی۔ اس پورے پروگرام کے منتظم پنجاب کے یونین پارٹی کے لیڈر فضل حسین تھے۔ اس سے وابستہ ہونے والے لوگ خصوصاً دو

طبقوں سے تھے۔ پہلے پنجاب کے یونین پارٹی سے منسلک لوگ، دوسرے تھے یوپی کے بیدار مسلمان یا پھر ایسے لوگ تھے جو کہ برٹش حکومت کے خلاف جاری لڑائی سے تنگ آچکے تھے۔ انہیں یہ یقین بھی نہیں ہو رہا تھا کہ جناح کی کانگریس سے جاری بات چیت سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ بھی پہنچنے والا ہے، ایسے لوگوں میں صوبہ سرحد، پنجاب اور بنگال کے شہری مسلمانوں کے علاوہ تحریک خلافت کے حامی اور سندھ کے مسلمان تھے۔

اس مسلم کانفرنس میں جو اہم قرارداد آئی تھی، وہ اس طرح تھی: صوبوں کو مکمل خود مختاری ملے، ایک حقیقی وفاقی ڈھانچہ ہو، پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو مسلمانوں کے لیے علیحدہ سیٹیں محفوظ ہوں۔ مسلمانوں کی کم آبادی والے صوبوں میں انہیں توجہ ملے، ساتھ ہی مرکزی قانون سازیہ میں مسلمانوں کے لیے 'ایک تہائی نمائندگی' برقرار رہے۔

جناح نے دسمبر 1928 میں دہلی میں ہونے والی اس کانفرنس میں حصہ نہیں لیا، لیکن مارچ 1929 میں کانفرنس کے لیڈروں نے جناح سے ملاقات کی اور ان سے ترجمان بننے کی گزارش کی جناح نے اس میں اپنے مشہور 14 نکات 15 کو پیش کیا جناح کے تمام 14 نکات کو کانفرنس نے منظور کر لیا اور انہیں ہی اپنا مقصد مانتے ہوئے نہرو کمیٹی کے پاس بھیج دیا لیکن موتی لال نہرو مسلم کانفرنس کی ان تجاویز سے متفق نہیں تھے نہرو کا خیال تھا کہ یہ تجاویز سیاسی طور پر بالکل عملی نہیں ہیں۔ ان تجاویز کے بارے میں موتی لال نہرو نے گاندھی کو اگست 1929 میں لکھا کہ 'جناح بے تکے مطالبات کو رکھ کر صرف خود کو اور اپنے حامیوں کو پھر سے قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں...... میرے خیال سے سچے قوم پرستانہ نظریے والے مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کا راستہ تب ہی ممکن ہے جب جناح اور علی برادران کو درکنار کر دیا جائے' نتیجتاً مسلم کانفرنس کی نمائندگی آگے نہیں بڑھ سکی۔

مسلم کانفرنس کے لیے اگلی شدید چیلنج تب کھڑا ہوا جب 1930 میں سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی لیکن اس سے پہلے سائمن کمیشن کی تیاریاں ہی تنازعہ کا شکار ہو گئیں۔ تنازعوں اور مڈیمن کمیٹی (دیکھیے باب-2) میں خود اپنے پرانے تجربوں کو دیکھتے ہوئے جناح کسی بھی آئینی کمیٹی میں شامل کیے جانے والے لوگوں اور ان کے حالات کو کافی توجہ دینے لگے تھے۔ مارچ 1926 میں قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے جناح نے حکومت سے کہا کہ 1919 کے قانون کے نظم کے تحت آئینی کمیشن کی تشکیل کی جائے۔ جناح نے تب ہی صاف کر دیا تھا کہ 'اگر شاہی کمیشن بنایا جاتا تو کمیشن کے اراکین کا انتخاب اس طرح سے ہونا چاہیے کہ لوگوں کی تسلی ہو۔' جناح نے آگے کہا کہ 'ایسے کمیشن کا کوئی مطلب نہیں ہے جس پر لوگوں کا بھروسہ نہ ہو اور جس کے تئیں لوگوں میں قدر نہ ہو۔' سائمن کمیشن کے ممبروں کے اعلان سے میں ایک ہفتہ پہلے لارڈ ارون نے جناح کو بلایا اور خفیہ طریقے سے حکومت کے اس فیصلے کے بارے میں آگاہ کیا کہ مجوزہ کمیشن میں کن کن لوگوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس بات چیت کے دوران جناح موڈ کو بھانپتے ہوئے ارون نے لکھا... 'جناح سے آج میری

طویل گفتگو ہوئی۔ انہوں نے ساری باتیں بہت غور سے سنیں اور پھر آخر میں کہا کہ اس معاملے میں ان سے کچھ کہتے نہیں بن رہا ہے کیوں کہ جب ساری باتیں پہلے ہی طے ہو چکی ہیں تو ان میں کہنے کے لیے بچا ہی کیا ہے۔' پھر سائمن کمیشن کی تشکیل کے بارے میں جناح نے تھوڑی اور بات چیت کی اور کمیشن کے خالصتاً پارلیمانی ہونے پر اعتراض ظاہر کیا۔ جناح نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ کمیشن ایک عدالتی جانچ کی طرح ہے جس میں ہندوستانیوں کو گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سے قومی وقار کو ٹھیس پہنچے گی اور ہندوستانیوں کے قومی جذبات مجروح ہوں گے۔ جناح کو اس بات کا شک تھا کہ پارلیمانی کمیشن کی تشکیل کے بعد کافی احتجاج ہوگا۔ ایسے میں کمیشن کے لوٹنے کے بعد قانون سازیہ کی خصوصی کمیٹی 18 کی تشکیل کی تجویز کھٹائی میں پڑ جاتی جناح کے لیے خصوصی کمیٹی کی تشکیل کی کافی آئینی اہمیت تھی۔ ہم نے ان تمام پہلوؤں پر گفت وشنید کی لیکن انہوں نے اس بات کا کوئی اشارہ نہیں کیا کہ کمیشن نے ممکنہ نتائج کے سلسلے میں ان کے ارادوں میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ جناح نے یہ ظاہر کیا کہ کمیشن کی تشکیل کے اعلان کے بعد لوگوں میں جو ردعمل ہوگا وہ حوصلہ افزا نہیں ہوگا۔'19

اروِن نے اپنی اپیل کے ذریعہ ہندوستانی لیڈروں اور فرقوں کے مابین فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے کی کافی کوششیں کی تھیں تاکہ جناح کی نظر میں وہ سرخرو ہو سکیں۔ 20 اس لیے اروِن نے بات چیت میں بھلے ہی جناح کے اندر مایوسی کا احساس کیا ہو، لیکن جناح نے بڑے ہی ضبط وتحمل سے کام لیا۔ جناح نے اروِن کے ساتھ اس ملاقات کے ایک ہفتے کے بعد ان سے کہا کہ وہ ہندوستان میں 'سبھی پارٹیوں کے لیڈروں' کے سامنے رازداری محفوظ رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اس بات کی ہر ممکن کوشش کریں کہ کمیشن میں کم از کم دو ہندوستانیوں کو شامل کیا جائے' جس سے انفرادی رائے کا اختیار ملک کو کسی ایک راستے کا پابند نہ کر دے' انہوں نے ہندوستانی لیڈروں سے بھی ملاقات کی تاکہ 'تجاویز کو آخری شکل دیے جانے سے پہلے ان پر مشترکہ بحث رکھے اور ایک ساچھا منصوبہ عمل بن سکے۔' ہندوستان میں لوگ کافی حد تک یہ بات مان کر چل رہے تھے کہ برٹش لیبر پارٹی ہندوستانیوں کا ساتھ دے گی۔ لیکن بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایسا بالکل نہیں تھا۔ سائمن کمیشن کے اعلان کے پہلے لیبر پارٹی کی پارلیمانی پارٹی نے باضابطہ ایک بیان جاری کر کے کہا کہ 'ہندوستانی لوگوں کو پارلیمنٹ کی بحث کا نتیجہ نکلنے کا انتظار کرنا چاہیے اور اس کے بعد ہی کمیشن کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کیا جانا چاہیے۔' 21 ایک موقر برطانوی اخبار مینچسٹر گارڈین نے بھی 'ہندوستانی کمیشن میں ممکنہ ردوبدل کی پیشگوئی کی تھی۔' 22 کمیشن کی تشکیل کا اعلان ہونے کے ایک ہفتے بعد 14 نومبر 1927 کو جناح نے برطانیہ کی انڈی پنڈنڈینٹ لیبر پارٹی کے فنبر براکوے کو ایک ٹیلی گرام بھیجا جس کا مضمون اس طرح تھا:

'کمیشن میں ہندوستانیوں کو شامل نہ کرنا بنیادی طور سے غلط ہے۔ اب تک ترمیم کی جو بھی تجویز رکھی گئی ہے یا اس سے منسلک جو بھی خبریں آئیں ہیں، وہ قطعی ناممکن ہے۔ کوئی بھی غیرت مند اور مستند ہندوستانی اس کمیشن میں شامل نہیں ہوگا یا وابستہ ہوگا، جب تک کہ اس کو دیگر لوگوں کے ساتھ برابری کے درجے اور حقوق کے ساتھ نہیں بلایا جائے گا۔ میں لیبر پارٹی سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرے اور ان کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اپنی پارٹی

کے ایک بھی ممبر کو اس کمیشن میں شامل نہ کرے۔ یہ ایک ایسا کمیشن ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں کو نیچا دکھانا اور ان کی غیرت اور ان کو چوٹ پہنچانا ہے۔'23

آخرکار ٹوری حکومت پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ 26 نومبر 1927 کو کمیشن کے تقرر کے لیے شاہی وارنٹ پر دستخط ہو گئے۔ اگلے دن جناح نے ایک پریس انٹرویو میں اس معاملے پر اپنے پختہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'ہندوستان موجودہ پالیسی اور کمیشن کے کام میں کسی طرح کا اور کسی بھی سطح پر تعاون نہیں کرسکتا کیوں کہ اس میں ہندوستان کو ساجھے دار کا درجہ نہیں دیا گیا ہے۔'24 مجوزہ سائمن کمیشن پر احتجاج اور اس کے خلاف رائے عامہ بنانے کی جناح کی کوششوں سے متعلق خبریں دسمبر ماہ کے ہندوستانی اخبارات میں خوب شائع ہوئیں۔ ساتھ ہی جناح اور پنجاب کے تمام مشہور مسلم لیڈروں کے احتجاج کی خبریں بھی اخباروں میں خاص اہتمام سے شائع ہوئیں۔ سائمن کمیشن پر احتجاج انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اس کا اندازہ یکم جنوری 1928 کو کولکاتا میں مسلم لیگ کے ان کے صدارتی خطبے سے لگایا جاسکتا ہے:

'عظیم برطانیہ کے خلاف آئینی لڑائی (مسلم لیگ کی طرف سے) چھڑ چکی ہے۔ سمجھوتے اور صلح کے لیے پہل ہماری طرف سے نہیں ہوگی۔ امن کے لیے اب حکومت کو کوشش کرنی ہوگی۔ ہمیں برابری کا درجہ نہیں دیا گیا ہے اور ہر اس کا جتنا زیادہ سے زیادہ احتجاج کرسکتے ہیں اتنا احتجاج کریں گے۔ جلیان والا باغ قتل واقعہ میں تو لوگوں کے ساتھ جسمانی مظالم ہوئے تھے لیکن سائمن کمیشن نے تو ہماری روح کا خون کیا ہے۔ لارڈ برکین ہیڈ نے اعلان کردیا کہ ہم حکومت خود اختیاری کے لائق نہیں ہیں۔ میں پنڈت مالویہ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے باقی ہندو لیڈروں کی طرف سے بڑھائے گئے دوستی کے ہاتھ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ پیش کش انگریز حکومت کی طرف سے پیش کیے جانے والی کسی بھی تجویز سے زیادہ اہم ہے۔ ایسے میں ہمیں دوستی کے اس ہاتھ کو تھام لینا چاہیے۔ یہ حقیقت میں بہت ہی اچھا دن ہے اور ہمیں اس کے لیے لارڈ برکین ہیڈ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔'25 ظاہر ہے جناح کے یہ بیان کافی تیکھے رہے۔ سائمن کمیشن کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں میں بھلے ہی اتحاد قائم نہ ہوا ہو، لیکن کم سے کم انہوں نے اتحاد کے بارے میں بات کرنا تو شروع کر ہی دیا۔ جناح کی 1928 میں کانگریس پارٹی کے ان دنوں کے صدر شری نواس کی ینگر کے ساتھ انگلینڈ گئے تھے ان کے ہمراہ دیوان چمن لال بھی تھے اور اس دوران جناح وہاں تقریباً چھ ماہ رہے۔ اس عرصے میں وائسرائے ارون مسلسل اس بات کی خبر لیتے رہے کہ آخر جناح ہندوستانی نمائندوں کو سائمن کمیشن میں شامل کرانے کے لیے برٹش لیبر پارٹی اور انڈیا آفس کو کس طرح سے متاثر کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ جناح کی کوششوں کا حالاں کہ کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور وہ بغیر حوصلہ افزا نتیجے یا کسی خاص امید کے بغیر اکتوبر 1928 میں ہندوستان لوٹ آئے۔ ممبئی لوٹنے کے بعد 26 اکتوبر 1928 کو ٹائمز آف انڈیا کو دیے گئے ایک انٹرویو میں جناح نے ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کی کہ 'برطانیہ کی کسی بھی پارٹی سے بڑی حمایت کی توقع کرنا ہماری یعنی ہندوستانیوں کی سب سے بڑی بھول ہوگی۔' انہوں نے کہا

کہ ہندوستانیوں کے پاس بس ایک امید یہی ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد قائم رکھیں۔' 1928 میں نہرو رپورٹ آنے کے بعد بھی مسلمانوں کے لیے سیٹوں کے ریزرویشن سمیت باقی دوسرے مقاصد کو حاصل کرنے کے بارے میں جناح کافی پُر امید تھے، اس لیے ایک بار پھر نئے سرے سے انہیں حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے۔

پہلے ہی یعنی مارچ 1928 میں جناح لارڈ ارون کو مشکلات کے حل کے لیے دو مشورے دے چکے تھے۔ پہلا یہ کہ سائمن کمیشن کو ایک مخلوط کمیشن میں بدلا جائے اور دوسرا یہ کہ اس کمیشن کے متوازی ایک اور کمیشن بنایا جائے جس کے اختیارات سائمن کمیشن کے جیسے ہوں۔ 26 اس موقع پر جناح نے یہ بھی کہا تھا کہ- ان کی ان دونوں تجاویز میں سے اگر ایک بھی منظور کر لی جائے اور اس کا انجام برا ہو تو اس کی ذمہ داری بھی لینے کے لیے وہ تیار ہیں۔ ارون کو ایسا ہی مشورہ دینے کے سر چمن لال ستیلواڑ جون 1928 میں ملے۔ جناح کی ان تجاویز پر لارڈ ارون نے تہہِ دل سے عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور حالات یہاں تک آ پہنچے کہ ارون اور اس وقت کے لئے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ برکین ہیڈ کے درمیان اس موضوع پر یعنی ان تجاویز پر کشیدگی ہو گئی۔ برکین ہیڈ کا خیال تھا کہ ان تجاویز میں ہندوستانیوں کا ایک غیر ضروری 'دباؤ' نظر آتا ہے اور اگر ہندوستانیوں کی ان تجاویز کو مان لیا گیا تو آگے چل کر یہ دباؤ اور شدید ہو جائے گا۔ لیکن ارون کے اصرار پر آخر یہ تجاویز برطانوی کابینہ کے سامنے رکھی گئیں، لیکن وہاں پر قدرتی طور پر برکین ہیڈ زیادہ باا‌ثر ثابت ہوئے اور انہوں نے ارون کی تجاویز کو کابینہ کے ذریعہ نامنظور کرا دیا۔

اس کے بعد ارون کا سیاسی رُخ ہندوستان کی بجائے برطانیہ کی طرف ہو گیا۔ 1929 کے وسط میں انہوں نے چھٹی لے کر گھر جانے کا پروگرام بنایا تا کہ برطانیہ میں اعلیٰ حکام سے براہ راست گفتگو کا موقع اور قائدہ دونوں ملیں اور وہ ہندوستان کے پیچیدہ مسئلوں پر کھل کر بات کر سکیں۔ لیکن پھر اچانک ہی حالات بدل گئے۔ برکین ہیڈ نے اکتوبر 1928 میں انڈیا آفس سے استعفیٰ دے دیا، اس سے ارون کے راستے کی ایک اڑچن دور ہو گئی۔ جون 1929 میں جب ارون چار ماہ کی چھٹی پر گھر جانے والے تھے تب ہی برطانیہ میں لیبر پارٹی اقتدار میں آ گئی اور انتھونی وج ووڈ بین کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا بنا دیا گیا۔ ارون کا کام اب آسان ہو گیا۔ نتیجتاً اب وہ اپنی بات سائمن کمیشن کے اراکین کے علاوہ بھی آگے رکھ سکتے تھے۔ اس لیے ارون کو اب نہ تو 'کمیشن کا کوئی مطلب' نظر آ رہا تھا اور نہ ہی اس بات کا کہ 'کمیشن کیا سفارشات پیش کر سکتا ہے' ارون نے اپنے خاندانی رشتہ دار اور سائمن کمیشن کے رُکن جارج لین فاکس سے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ- 'اب یہاں یہ دیکھنا اہم ہوگا کہ سائمن کمیشن جب تک اپنا کام پورا کرتا ہے اور سفارشات پر عمل کی شروعات ہو پاتی ہے اُس وقت ہندوستان میں سیاسی مزاج کیا ہوگا۔ بہتر تو درحقیقت یہی ہوگا کہ جب تک ہندوستان میں احتجاج اور لوگوں میں غصہ ہے، تب تک وہاں کسی بھی نئی پلاننگ کو نافذ نہ کیا جائے۔' پانچ ماہ بعد نومبر 1929 میں ارون نے دوبارہ لکھا لیکن اس بار انہوں نے کینٹربری کے آرچ بشپ کو لکھا:

'مجھے صاف طور پر نظر آتا ہے کہ پالیسیوں میں جو تبدیلیاں ہوں گی وہ یا تو بہت ہی کم ہوں گی یا پھر بہت زیادہ ہوں گی۔ حقائق کی بنیاد پر کر مجھے موجودہ حالات میں پہلے متبادل کا امکان زیادہ لگتا ہے۔ میں اس نتیجے کو بھی حالاں کہ درکنار نہیں کر پاتا ہوں کہ جو بھی پالیسیاں بنیں گی، ان کا اثر ہندوستانی سیاست کو لمبے عرصے کے لیے بائیں بازو کی طرف لے جانے والا ہوگا لیکن ایسا بھی لگتا ہے کہ دوسرے متبادل پر اتفاق رائے کے آثار نمایاں ہو سکتے ہیں'۔

ان دنوں کے حالات میں ارون کے دو مقاصد تھے۔ پہلا تو یہ کہ 'ہندوستانیوں کے دل میں ان کے سیاسی مستقبل کے تئیں برٹش حکومت کے ارادوں کے بارے میں اعتماد پیدا کرنا جو قانون ساز اسمبلی میں سر میلکم ہیلے کے 8 فروری 1924 کی تقریر سے کافی ہل گیا تھا۔ 28 دوسرے، ارون یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی اور ان کے برطانوی نمائندوں کے درمیان برطانیہ میں گول میز کانفرنس ہو جس کا مقصد خیر سگالی کے ماحول میں ہندوستانی آئین کے لیے آگے کی سمت متعین کرنا ہو۔ ایسی کانفرنس کا مطالبہ پہلے بھی 1922 میں پیش کیا گیا تھا اور جس کے سلسلے میں جنوری 1922 کے وسط میں 'لیڈروں کی ایک کانفرنس' ممبئی میں ہوئی تھی۔ اس میں پنجاب کے جلیان والا باغ واقع، خلافت کی غلطیاں وغیرہ موضوعات زیر بحث آئے اور سوراج پر زور دیا گیا۔ جناح نے اس کانفرنس میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ فروری 1924 میں قانون ساز اسمبلی میں بھی قرارداد منظور کر کے گول میز کانفرنس کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے ارون نے 1929 میں قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار پھر گول میز کانفرنس کا معاملہ اٹھایا لیکن یہ تب ہی جب سائمن کمیشن نے اپنے خیالات رکھ دیے تھے۔ ارون نے اس تقریر میں کہا۔ 'میں ایوان سے پھر یہ کہتا ہوں اور اس ایوان کے ذریعہ پورے ہندوستان کے سامنے ایک بار پھر دہرانا چاہوں گا کہ ہم 1917 کے اعلانیہ پر اب بھی قائم ہیں اور برطانیہ کے لوگ اس اعلانیہ پر ایک باضابطہ عہد و قول کی طرح (آگے بھی) قائم رہیں گے۔ وہ ایک ایسا عہد و قرار ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں کو مکمل، قومی سیاسی حیثیت حاصل کرنے میں مدد کرنا ہے اور یہ عہد و پیمان کبھی نہیں توڑا جائے گا اور چوں کہ کام کو الفاظ سے کہیں زیادہ طاقت ور مانا جاتا ہے۔ میں بھی اضافہ کرنا چاہوں گا کہ میں آج آپ سب کے سامنے کھڑا نہیں ہوتا...... اگر مجھے تھوڑا سا بھی شک ہوتا کہ برطانیہ کے لوگ آپ کو دیے گئے باضابطہ وعدے سے پیچھے ہٹ گئے ہیں یا ہٹیں گے......' 29

1930 کے وسط تک اس کمیشن کے باقی ماندہ اختیارات کترے جا چکے تھے۔ پہلے تو ہندوستانی عوام کے بائیکاٹ کے سبب پھر وائسرائے کی گول میز کانفرنس کی تجویز کی وجہ سے، پھر بھی سائمن کمیشن کو باقاعدہ اپنی رپورٹ کو پیش کرنی ہی تھی۔ پنجاب کے فضل حسین نے بھی کمیشن کی رپورٹ کے تئیں اندیشہ ظاہر کیا تھا 'چوں کہ کمیشن کو، لندن میں پارلیمنٹ نے مقرر کیا تھا اس لیے اگر اس رپورٹ میں 'مسلم اکثریت' کے مسئلے کا صاف صاف ذکر نہیں ہوگا تو مسلم کانفرنس کے مفادات کے لیے یہ خطرہ ثابت ہو سکتی ہے'۔

اور جب رپورٹ منظر عام پر آئی تو وہی ہوا، سائمن کمیشن نے اس بارے میں اپنی رپورٹ میں کچھ بھی نہیں لکھا لیکن کمیشن سے جو مانگا گیا تھا، وہ بھی نہیں ملا۔ مثلاً سندھ صوبے کا بٹوارہ یا شمال مغربی صوبہ سرحد (این ڈبلو این پی) کو برابری کا درجہ دیے جانے کا مطالبہ، ان دونوں کو بھی درکنار کر دیا گیا۔ رپورٹ میں بلوچستان کے لیے بھی کسی تبدیلی کی بات نہیں کی گئی۔ اور سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ جداگانہ انتخابات کے معاملے میں سائمن نے کوئی بھی ہمدردی نہیں دکھائی۔ اس کے علاوہ کمیشن نے مرکزی قانون سازیہ میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی کے نظم کو ہی ختم کرنے کی سفارش کر دی۔ اس رپورٹ میں پنجاب اور بنگال میں جداگانہ انتخابات کے ذریعہ مسلمانوں کی اکثریت کے مطالبے پر غور تک نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم کانفرنس کے لیے تو یہ رپورٹ کافی مایوس کن رہی اور اس کے بہت سے لوگوں کو یہ ایک کھلا چیلنج سا لگا۔ جب کہ آزاد خیال مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ ایسی رپورٹ کے ذریعہ انہیں دانستہ بھڑکانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ایسے حالات میں خاص طور پر یہ فضل حسین ہی تھے جنہوں نے حکومت کے سامنے کی بگڑی حالت کو سنبھالنے کی کوششیں کیں پہلے تو انہوں نے حکام سے ملاقات کر کے صوبہ سرحد کے مسلمانوں کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی پھر دھیرے دھیرے وہ ان حکام کو صوبہ سرحد میں اصلاحات کی اہمیت قبول کرنے کے قریب لے آئے۔ اس کے بعد فضل حسین نے زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری کے حق میں کام کر کے مسلم اکثریت صوبوں میں مسلمانوں کی پوزیشن مضبوط کی۔ اقلیتوں کے معاملے میں پوچھے جانے پر فضل حسین کا کہنا تھا کہ ....'انہیں مذہب یا ثقافت کی فکر نہیں، وہ تو بلدیاتی اداروں اور خدمات میں اقلیتوں کے لیے نمائندگی چاہتے ہیں۔' فضل حسین شروع سے ہی یہ کہتے کر رہے تھے کہ سائمن کمیشن نے 1916 کے لکھنؤ معاہدے کی بنیاد پر سفارشات تیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی کی ہے۔' ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پنجاب اور بنگال کو مسلم اکثریتی صوبے کا درجہ دینا اس شرط پر مبنی نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی اقلیت والے صوبوں میں انہیں (یعنی مسلمانوں کو) خاص توجہ دینے کا اصول ترک کر دیا جائے۔' آخر فضل حسین کی آواز ان صوبوں کی آواز تو تھی اور ان کے لیے پنجاب اور مغربی بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی کا معاملہ تو بالکل الگ ہی درجے کا تھا۔ فضل حسین کا خیال تھا کہ مرکز میں تب تک کوئی تبدیلی نہیں کی جائے جب تک صوبے خود کو پوری طرح قائم نہ کر لیں۔ لیکن جب ایک بار اصولی طور پر فیصلہ ہو گیا کہ کچھ مضمونوں کو بدلا جائے گا ہی، تب فضل حسین نے پوری کوشش کی کہ یہ تبدیلیاں کم سے کم ہوں۔ فضل حسین نے اسمبلی میں بالواسطہ طریقے سے انتخاب کی سفارش کی بھی مخالفت کی۔ ان کی دلیل تھی، ایسا کرنے سے اقتدار یا تو گروپوں (طبقات) کے ہاتھ میں آجائے گا یا پھر اسمبلی میں کانگرس کا دبدبہ ہو جائے گا۔ وہ (فضل حسین) شروع ہی سے اس وجہ سے فکر مند تھے کہ آخر کار فروغ پانے والے اقتدار کی نوعیت کیا ہوگی۔ ان کی یہ فکر، غیر یقینی سی لگ رہی پہلی گول میز کانفرنس کے بارے میں سفارشات کو قطعی شکل مل جانے تک باقی رہی۔ ایسے پیچیدہ ماحول میں انجام کار 1930 میں لندن کی پہلی گول میز کانفرنس بلا ہی لی گئی۔

پہلی گول میز کانفرنس-12 نومبر 1930

مئی 1929 میں گھر جانے سے پہلے ارون نے جناح نے ذاتی طور پر طویل بات چیت کی۔ اس میں جناح نے انہیں جامع طور پر کانفرنس سے متعلق اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد ارون نے برطانوی وزیر اعظم ریمزے میک ڈونالڈ کو لکھے خط میں ڈومینین حیثیت اور گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت کو پھر دہرایا۔ 131 اکتوبر 1929 کی مرکزی اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے ارون یہ دونوں باتیں پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ اس طرح انہوں نے ہندوستان کو وہ سب دیا جو جناح اور ان کہ ہم خیال لوگوں نے مانگا تھا۔ اس وقت تک کے کسی بھی وائسرے میں جو کچھ بھی کرنے کا حوصلہ رہا ہو، یا پھر کوئی بھی وائسرے جو کچھ بھی کر پایا ہو، ارون یقیناً ہی ان سب سے کہیں زیادہ دے پائے۔

ارون کے اس اعلان پر جناح نے ان تجاویز کو کامیاب بنانا، اپنی ایک ذاتی ذمہ داری بنالی کیوں کہ وہ (جناح) محسوس کرتے تھے کہ یہ ان کا اخلاقی فرض تھا۔ اس دوران کانگرس نے ایک 'لیڈروں کا اعلانیہ' عنوان کی ایک دستاویز جاری کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ گول میز کانفرنس اس بات پر بحث کے لیے منعقد نہیں ہونی چاہیے کہ ڈومینین حیثیت کب قائم ہوگا۔ بلکہ ہندوستان کے ایک 'ڈومینین آئین' کا کیا منصوبہ ہو۔ اس کا خاکہ تیار کرنے کے لیے انعقاد ہونا چاہیے۔ یہ دو مختلف ترجیحات لگتی ہیں اور حقیقت میں یہ دو الگ سوچ بھی ظاہر کرتی تھیں۔ پہلی سوچ نے ڈومینین حیثیت کو ایک حاصل شئے کے طور پر قبول کیا۔ اسے وہ نقطۂ آغاز مانا جہاں سے اور آگے بڑھا جا سکے اور اس لیے ایک عملی طریقے اور راستے کی شکل میں اس کی وکالت کی۔ دوسری سوچ اس حیثیت سے پہلے ڈومینین 'آئین' وضع کیے جانے پر زور دیتی تھی۔ یہ موٹی بات پر اپنی رضامندی دینے سے پہلے تمام باریکیوں والی باتوں پر منظوری حاصل کرے گا ایک محتاط قدم بہ قدم، قانونی پہل کا راستہ تھا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ زیادہ صحیح تھا، اہم بات یہ ہے کہ کس راستے ہندوستان اتحاد اور آزادی کے جڑواں مقاصد تک زیادہ آسانی سے پہنچتا ہے۔ ڈومینین حیثیت کے ساتھ شروعات کر کے اور اسے ایک پیمانہ بنا کر آگے بڑھا جانا تو یہ اتحاد کو بڑھانے میں بہت تعاون دیتا۔ اس سے کافی اخوت پیدا ہوگی اور آزادی کے آخری مقصد کو حاصل کرنے کی سمت میں تیزی سے بڑھنا ممکن ہو پاتا۔

کانفرس کے لیے جناح کو پہلے گاندھی اور کانگرس کو منانا ضروری تھا۔ اس لیے وہ ارون کے ہندوستان لوٹتے ہی، ان سے کانفرنس کی ساخت، اس کی تاریخ اور سیاسی قیدیوں کو معاف کرنے کا سوال، ان تین عملی اہمیت کے مقاصد پر تبادلہ خیال کے لیے ممبئی میں ملے۔ جناح پہلے ہی سے بلاواسطہ یا بالواسطہ گاندھی کے ربط میں تھے۔ تب سے لے کر تقریباً 1929 کے دسمبر کے اختتام تک سر تیج بہادر سپرو کے ساتھ مل کر جناح وائسرائے اور کانگرس لیڈروں میں میٹنگ کرانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔

آخر کار 23 دسمبر 1929 کو میٹنگ منعقد ہوئی جس میں وائسرائے کے علاوہ گاندھی، موتی لال نہرو، سر تیج

بہادر سپرو، وٹھل بھائی پٹیل اور جناح شامل ہوئے۔ اس میٹنگ میں وائسرائے کو محسوس ہوا کہ میٹنگ میں شامل گاندھی اور موتی لال نہرو کچھ دباؤ میں تھے (کانگرس کے نوجوانوں کے؟) اور وہ دونوں ایک پیشگی یقین دہانی کے لیے شروع سے ہی جیسے تہیہ کیے ہوئے تھے۔ ان کا مطالبہ کہ اس یقین دہانی کا تھا جس سے کانفرنس کا واحد مقصد ڈومینین کے لیے آئین کی وسیع تفصیلات پر غور کرنا ہو۔ جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس میں لکھا ہے، ایک قسم کی دقیقہ سنجی تھی۔ اگر کانفرنس میں ڈومینین کے اصول کو منظور کرنے سے پہلے ہی، اس کی باریکیوں پر غور کیا جاتا ہے: مثلاً وفاق بنام مرکز، ریزرویشن، مرکزی قانون سازیہ میں نمائندگی اور ایسے متنازعہ معاملات آسانی سے اس پوری پہل پر پانی پھیر سکتے تھے۔ تب اس کی ذمہ داری بھی کانگرس پر عائد نہیں ہوگی مگر یہ وائسرائے کے چاہنے پر بھی اس کے دائرہ اختیار میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے یہ میٹنگ تو ناکام ہوگئی۔ اروِن نے میٹنگ کا ذکر کرتے ہوئے بعد میں تبصرہ کیا کہ میٹنگ کے دوران 'گاندھی اور موتی لال' نے جو 'رویہ' اختیار کیا۔ اس میں سپرو، جناح اور پٹیل (وٹھل بھائی) صاف طور پر ناراض تھے۔' ایک غیر منقسم ہندوستان کا (امکان) متبادل اب اور کم ہو گیا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ پہلے سے ہی بہت سارے متبادل تو ختم ہی ہو چکے تھے کیوں کہ کانگرس 1929 کے آخر میں لاہور میں 'آزادی' کی قرارداد منظور کر چکی تھی، ساتھ ہی 1930 میں ملک گیر سول نافرمانی تحریک بھی شروع کر دی تھی۔ جناح کو ڈر اس بات کا تھا کہ اگر احتجاج ستیہ گرہ کے اس راستے پر چلا گیا تو جواب میں انگریزوں کو لامحالہ اسے دبانا ہی پڑے گا اور اس کا پسندیدہ راستہ (جناح کو بڑھاوا) ختم ہو جائے گا۔ اس لیے جناح نے وائسرائے گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ طے کرنے اور اس میں 'مدعوئین کی فہرست انہیں دکھانے' کے لیے کہا، اس مقصد سے کہ شاید وہ اس میں کچھ 'مشورے' دینا چاہیں۔30

ایسے حالات میں ایم آر جیکر کے ساتھ سر تیج بہادر نے کانگرس اور حکومت کے درمیان امن قائم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے دونوں نہروؤں (والد اور فرزند) کو گاندھی سے ملوایا۔ اس وقت دونوں ہی سول نافرمانی تحریک کی وجہ سے الگ الگ جیلوں میں بند تھے، لیکن یہ کوشس بھی ناکام رہی۔ کیوں کہ گاندھی کو ایسا وقت، جب قیادت جیل میں ہو، ایک پروقار سمجھوتے کے لیے مناسب نہیں لگا۔ اس بار 19 اگست 1930 کو جناح نے آخر وائسرے کو رائے دی کہ وہ ایسے قوم پرستوں کے تئیں اب سخت رویہ اپنائیں۔ جناح کو اب صرف لندن سے ہی آگے کچھ توقع نظر آتی تھی۔ اور اپنی تیاری کے لحاظ سے اگست 1930 کے وسط تک انہوں نے ڈاکٹر محمد اقبال کو مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے مدعو کر لیا تھا۔ کیوں کہ خود انہیں بھی لندن جانا تھا۔

طویل عرصے سے جس کانفرنس کا انتظار تھا، وہ گول میز کانفرنس آخر کار 1930 کی سردیوں میں لندن میں طلب کی گئی۔ ایسی امید تھی کہ یہ تخلیق آئین کے ذریعہ ہندوساتن کی آزادی کی کوششوں میں نئے دور کا آغاز کرے گی۔ لوگوں کی

دلچسپی اس بات پر مرتکز ہونے لگی کہ ہندوستان سے کونسے نمائندے ہوں گے، کون کیا کہے گا اور کس کے لیے کہے گا۔ فضل حسین کے لیے نئی ترجیح اور نیا چیلنج بھی تھا کہ وہ ایسے نمائندے کو بھیج سکیں جو مسلم کانفرنس کی باتوں کو موثر اور درست انداز سے واضح کر سکے۔ ان کا خیال یہ تھا جو مناسب بھی تھا۔ کہ جناح جیسے لیڈر خاص طور رسے مرکز میں ہی ذمہ داری لینے میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس لیے ایسے لیڈروں کی وجہ سے خطرہ تھا کہ صوبائی مسلم مفاد ہاتھ سے پھسل جائیں گے۔ فضل حسین نے سر میلکم ہیلی کو لکھا بھی تھا: 'بظاہر یہ خیال مجھے پسند نہیں کہ جناح ہی ساری باتیں کریں۔ اور اگر کہیں جناح ایسے خیالات رکھنے لگیں جو ہندوستانی مسلمانوں کو منظور نہیں ہوں تو وہاں کوئی بھی مضبوط نظریات والا ایسا کوئی لیڈر نہیں ہوگا جو ان کی مخالفت کر سکے۔' جناح اور محمد علی ہندوستان کے دو معروف وکیل تھے۔ یہ دونوں ہی اعلیٰ ترین سطح کے سیاسی مباحثوں سے اچھی طرح واقف تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں ہی مسلمانوں کے ممتاز نمائندے بھی تھے لیکن پھر بھی صوبوں کی بات کہنے والا کوئی ہو اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس ضمن میں فضل حسین نے متحدہ صوبے سے ظفر اللہ خاں اور شفقت احمد کو اور ان کے ساتھ چھتاری کے نواب صاحب کو نامزد کرتے ہوئے توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔

اتنی احتیاط کے باوجود بھی فضل حسین غیر مطمئن ہی رہے کیوں کہ کل ہند رعایات اور صوبائی فائدوں کے درمیان ایک بڑا اندرونی فرق تھا۔ ان دو نظریات کے نمائندے ہندوستان میں متفق الرائے ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے اپنے معاملات پر حکومت ہند سے الگ، اور آزادانہ طور پر گفتگو کرتے تھے لیکن لندن میں دونوں کو ہی موجود رہنا تھا۔ ایک ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر ایک نئے ثالث لیبر حکومت کے سامنے باتیں رکھنی تھیں۔ ادھر کل ہند لیڈروں پر اتفاق رائے قائم کرنے کا دباؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہندوستان کے آزاد خیال لیڈروں، جیسے سر تیج بہادر سپرو، اور شری نواس شاستری کو کانگرس کے زیر قیادت عدم تعاون کا طویل عرصے تک مزید کھنچے جانا خود ان کے اپنے سیاسی مستقبل کے لیے بھی سنگین خطرہ لگنے لگا تھا۔ انہیں گولا زمی طور پر مضطرب ہونا ہی تھا کہ وہ کچھ مثبت کامیابیوں کے ساتھ ہندوستان لوٹیں تا کہ کانگرس کو آئینی راستے پر لوٹانے کے لیے رضامند کرنے میں مدد ملے۔ ان آزاد خیال ہندوستانیوں کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ مرکز میں کچھ ذمہ داری بھی پا سکیں جس کے لیے انہوں نے برٹش انڈیا کے فیڈریشن، ہندوستانی صوبوں اور رجواڑوں کا تصور بھی پیش کیا مگر ان سب کو حاصل کرنے کے لیے پہلے فرقہ وارانہ سوالوں کو حل کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات پر فراخدلانہ رخ بھی اختیار کیا ہوا تھا۔ وہیں دوسری طرف جناح اور محمد شفیع بھی قومی لیڈروں کے طور پر ابھرنے کے لیے اتنے ہی آرزومند تھے۔ کانفرنس کے دوران پوری نہیں، تو کافی حد تک یہی ماحول چھایا رہا اور ان سب میں ابھی تک ہم نے راج گھرانوں کے موقف کو پرکھا ہی نہیں ہے لیکن اس وقت ہم ان پیچیدگیوں میں نہ الجھیں تو اچھا ہے۔

جناح 4 اکتوبر 1930 کو سمندری جہاز سے لندن روانہ ہوئے، گول میز کانفرنس 12 نومبر 1930 کو شروع ہوئی۔ آغا خاں کو مسلم وفد کا لیڈر مقرر کیا گیا اور لندن کا رٹز ہوٹل ان کا ہیڈ کوارٹر بنا۔ ہاؤس آف لارڈز میں باضابطہ افتتاح کے ساتھ اس کانفرنس کا آغاز ہوا جس کی صدارت شاہ جارج پنجم نے خود کی۔ اس کے بعد آغا خاں کو کانفرنس کے برٹش انڈین

سیکشن' کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس شعبے میں ملک کے راجاؤں کو چھوڑ کر، سبھی ہندوستانی نمائندگان شامل تھے۔ کانفرنس کی اس کے بعد کی ساری کارروائی 'سٹیٹ جیمس پیلیس' میں ہوئی۔ اور سبھی بڑے اور اہم فریق اپنے مصمم ارادوں، نظریات اور حل کی تلاش کے ساتھ اس میں شامل ہوئے۔ انہیں اپنے اپنے دعووں کو سب کے سامنے رکھنا تھا جس کے بعد ان کے مختلف خیالات ونظریات میں موافقت ومصالحت کی کوششیں ہونی تھیں۔ ظاہر تھا کہ اس عمل میں متضاد دعووں اور جوابی دعووں کے مجموعوں کیساتھ انگریز بھی موجود تھے ہی۔ اس لیے ہندوستان کے نمائندوں کی پہلی ترجیح تھی کہ ایک متحدہ محاذ بنایا جائے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے برطانیہ ہندوفد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین خلیج پاٹنے کی سبیل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی جانی تھی۔ مقصد صاف تھا کہ اس مرحلے کو عبور کرنے کے بعد ہی برطانوی نمائندگان کو آئینی اصلاحات کے لیے ایک مشترکہ قرارداد دیا جاسکے۔ جن اہم اشخاص نے اس مقصد کے لیے اپنی مساعی کے ذریعہ تعاون دیا ان میں بھوپال کے اس وقت کے نواب صاحب 32 اہم تھے۔ انہوں نے اور آغا خان نے ایک وفاقی ریاست کے طور پر آزاد ہندوستان کا تصور پیش کیا تھا جس میں اختیار واقتدار مرکزی حکومت کو دیے گئے تھے لیکن ساتھ ہی معاون حصوں کو بھی خود اختیاری کے حقوق اور کارگزاریاں تفویض کی گئی تھیں۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والے سر چمس لال ستیل واد نے اپنی کتاب ری کلکشنز اینڈ ریفلکشنز میں قلم بند کیا ہے کہ 'گول میز کانفرنس شروع ہونے سے کافی پہلے جب ہم لندن پہنچ گئے تو یہ طے پایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے چند نمائندگان آپس میں بیٹھ کر کسی فرقہ وارانہ تصفیہ کے سوال پر غور وفکر کریں۔ سپرو، شاستری، خود مجھے، جیکر، مونجے اور امبیڈکر کو اس میٹنگ کے لیے مامور کیا گیا اور آغا خاں، جناح اور ایک اور صاحب کو مسلمانوں کی نمائندگی سونپی گئی۔... جب ہماری نشست شروع ہوئی تو میں نے آغا خاں کے سامنے ایک سوال رکھا، آیا ہم دوسرے نکات کے کسی تسلی بخش تصفیے تک اگر پہنچ گئے تو کیا وہ مشترکہ انتخابات کے سوال پر رضامند ہوجائیں گے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر آپ دیگر تمام امور سے متعلق ہمارے مطالبات کے بارے میں ہمیں یقین دلا دیتے ہیں تو ہم مشترکہ انتخابات پر راضی ہوجائیں گے، لیکن مسلمانوں کے لیے سیٹیں مخصوص ہونی چاہئیں۔' اس کے بعد پھر سب نے ایک سوال کیا 'اگر ہم مشترکہ انتخابات سمیت تمام معاملات کا تصفیہ کرلیتے ہیں تو کیا مسلم مندوبین کانفرنس میں کوئی مطالبے کی تائید کریں گے۔' اس پر ان کا جواب خصوصیت کا حامل تھا۔ انہوں نے کہا 'اس صورت میں آپ قیادت کریں گے اور ہم تقلید کریں گے۔'

اس کے آگے سر چمن لال بیان کرتے ہیں کہ 'سپرو اور شاستری کے ساتھ وہ سب مطالبات پر فی الفور رضامند ہوگئے ہوتے لیکن جیکر اور مونجے کے رویے نے انہیں بری طرح مایوس کردیا' انہوں نے (سر چمن لال) سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ 'ایک سنہرا موقع ہاتھ سے نکل گیا' آغا خان نے بھی اپنی سرگزشت میں اس گفت وشنید کا حوالہ یوں دیا ہے' 'سر چمن لال ستیل واد نے اپنے تذکرے میں میری پیش کردہ تجاویز کا حوالہ دیا ہے اور ان کی یہ شہادت کم ازکم ریکارڈ میں موجود ہے کہ پہلی گول میز کانفرنس سے جو توقعات وابستہ تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں، اور انجام کار نہ تو ڈومینین حیثیت ملی اور نہ

ہی ملک ایک رہا، ہندوستان کا بٹوارہ بھی ہوگیا۔ ان سب اہم واقعات میں سے کچھ کی شروعات کو یقیناً ہندو وفد کے ذریعے میری پیش کش کو نامنظور کرنے سے ہوئی تھی۔'

شروع میں کئی مسلم نمائندے بالخصوص جناح، وفاق کے خیالات کے تئیں فکر مند تھے اور ان کا یہ رخ کانفرنس سے پہلے بھی تھا۔ ان کے لیے وفاق کے خدشات ایسے نہیں تھے کہ انہیں بہت ہی کم یا غیر اہم تصور کیا جائے۔ بالخصوص اس لیے کہ اس میں ایک نوزائیدہ جمہوریت کو، جو ابھی وجود میں آئی تھی، بہت سی دیسی ریاستوں کے ساتھ منسلک کرنا تھا۔ مسلم فرقے کے ذہنوں میں ایسے نظم سے ایک اور خطرہ لاحق تھا، وہ یہ کہ راج کاج سنبھالنے والے زیادہ تر راجہ ہندو تھے۔ اس سے پورے وفاق میں شامل مسلم فرقے کے سیاسی اثر کو شدید گزند پہنچ سکتا تھا۔ حالاں کہ آغا خان کو یقین تھا کہ فوری طور پر خواہ جو بھی دقتیں پیش آئیں، فیڈریشن کا یہ منصوبہ ہی ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا سب سے قابل قبول حل ہوگا۔ آغا خاں کی نظر میں ایک اور چیز تھی وہ یہ کہ ایسا موقع شاید پھر کبھی نہیں آئے گا اسی وجہ سے اسے عمل میں لانے کے لیے کچھ سمجھوتے کرنے پڑیں تب بھی وہ ایک چھوٹی قیمت ہی ہوگی۔ 31

حکمراں ریاستوں نے بھی وفاق جیسی کسی ساخت کو جزوی رضامندی دے دی تھی۔ اب صرف یہ خطرہ کہیے یا یقین دہانی جو باقی تھی اور اس کا مطالبہ بھی کیا جارہا تھا کہ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریتوں کو قانونی نظم کے سہارے کہیں اقلیتوں میں نہ بدل دیا جائے۔ ساتھ یہ بھی مطالبہ تھا کہ سندھ کو ممبئی سے الگ کیا جانا چاہیے نیز شمال مغربی صوبہ سرحد میں اصلاحات لائی جائیں۔ اس کے علاوہ یہ مانگ بھی کی گئی تھی کہ فوج اور سول سروس میں مسلمانوں کے لیے ایک خاص تعداد میں ریزرویشن کی قانونی گنجائش بھی ہونی چاہیے۔ دلیل یہ تھی کہ مسلم وفد ایک متحدہ محاذ کی شکل میں انگریزوں کے سامنے اپنی بات زیادہ موثر انداز میں رکھ سکے گا۔ آغا خان نے اس سلسلے میں مشورہ بھی دیا کہ ایک تاثر ہندوستانی لیڈر کے تحت ایک متحدہ کان بنائی جائے جسے وہ بعد میں مسلم فرقے کی منظوری بھی دلوا دیں گے۔

سر چمن لال نے ان سب واقعات کو یاد کرتے ہوئے لکھا تھا پہلی گول میز کانفرنس سے جو توقعات تھیں، وہ حاصل نہیں ہوسکیں اور انجام کار نہ تو ڈومینین حیثیت ملی اور ہندوستان کا بٹوارہ بھی ہوگیا۔ ان سب اہم واقعات میں سے کم سے کم کچھ کی شروعات تو یقیناً ہندو وفد کی طرف آغا خان کی پیش کش کو نامنظور کرنے سے ہوئی تھی۔ تیج بہادر سپرو اور شاستری مسلمانوں کی تجاویز قبول کرنے کے خلاف نہیں تھے مگر وہ اپنے رفیقوں اور (صاف ہے) ہندو مہا سبھا کی مخالفت سے سہم گئے تھے۔

آغا خاں کے جذبات ان کی تحریر کردہ ان سطروں سے صاف عیاں ہیں: 'اگر میرے خیالات پر اتفاق ہو جاتا تو بعد کی تاریخ بالکل الگ راہ پر چلی ہوتی...... ہی ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت کافی پہلے بن گئی ہوتی جس میں ہندو اور مسلمان ملک کے روزمرہ کے انتظامی کام کاج میں حصے دار ہوتے... میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہمارے کام کا کوئی حقیقی یا

پائیدار نہیں نکلنے کا اندیشہ مجھے ہمیشہ سے تھا کیوں کہ 1930 میں ہندوستان کے کئی بڑے حقائق کو فراموش کر دیا گیا تھا ... پہلی اور سب سے بڑی بات، یہ بھلا دی گئی تھی کہ ہمیشہ سے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بنیادی فرق رہے ہیں... اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ یہ فرق ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقے کے مسلمانوں اور باقی حصوں کے ہندو اکثریت کے علاقوں کے درمیان سب سے زیادہ تھے... یہ بھی بھلا دیا گیا تھا کہ دانشور طبقے کو جو اگرچہ ہندو آبادی کا صرف دس فی صد یا تقریباً چار سے پانچ لاکھ کے درمیان ہی ہو، مگر اسے 'بہت چھوٹی سی اقلیت' کہہ کر خارج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ بھی بھلا دیا گیا کہ ان کی خواہش انگریزوں کو بوریا بستر سمیت ہمیشہ کے لیے نکال باہر کرنے کی تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے جدوجہد کی اور واقعی میں 1947 اس کا ہی نتیجہ تھا... یہ بھی بھلا دیا گیا کہ رجواڑوں کے پاس ساری متاع و دولت، قابلیت، ذاتی دلکشی، وقار اور برٹش رسم وراہ کے تئیں وفاداری کے باوجود کوئی اختیار تھا نہ اثر ورسوخ۔33

نومبر 1930 کے وسط میں ہندوستان لبرل بھی کوئی پیش رفت نہیں کر سکے، کیوں کہ حلقہ انتخاب کے سوال اور باقی بچے اختیارات سے متعلق معاملات پر بات چیت تعطل کا شکار ہوگئی۔ بات چیت پھر شروع ہوئی تو پنجاب کے خصوصی مطالبات، سمجھوتے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے۔ ہندو اور سکھ 'جداگانہ انتخابات کے ذریعہ اکثریت' پر رضامند نہیں ہوئے۔ فضل حسین نے اس کے لیے انگریزوں کی طرف سے لیبر پارٹی کے رویے کو، اور ہندوستان کی طرف سے جناح، بھوپال کے نواب محمد شفیع، اور فضل الحق کے رویے کو زیادہ ذمہ دار ٹھہرایا۔ فضل حسین کو سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں مرکز میں اقتدار کی منتقلی کے چکر میں مسلمان علاحدہ حلقہ انتخاب سے دست بردار نہ ہو جائیں۔ اس لیے فضل حسین نے اس بات کی پرزور مخالفت کی اور وائسرائے سے کہا کہ اس 'مشترکہ حلقہ انتخاب' کی بنیاد پر لندن میں ہونے والی کسی بھی بات چیت کو ہندوستان کے مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ لیبر حکومت نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کبھی نہیں جس پر فضل حسین نے لیبر حکومت کو ہدف تنقید بنایا۔ ان دنوں ہی سازشی انداز میں یہ بھی کہا جانے لگا کہ گول میز کانفرنس میں شامل دو پنجابی مسلم نمائندگان، محمد شفیع اور ظفر اللہ خاں -- پنجاب کے سکھ اکثریتی علاقوں سے ہیں، اور ہندوؤں اور سکھوں کے بائیکاٹ کے سبب شفیع بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور سیالکوٹ کے بیرسٹر ظفر اللہ خاں پورے مسلمان بھی نہیں ہیں کہ وہ احمدی ہیں۔ آخری بات تو نہایت بے رحمی کی تھی لیکن اس طرح کی سوچ نے یقیناً شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر اثر ڈالا اور یہ اثر بڑا ہی تباہ کن تھا جس کی وجہ سے بعد میں اس کے کئی نامساعد نتائج بھی دیکھنے کو ملے۔

فضل حسین کی کوششوں کے باوجود، اس وقت موجود سیاسی صف بندی کے نتیجے میں اس کانفرنس میں کوئی مفاہمت نہیں ہوسکی۔ یہ بھی واضح ہوگیا کہ ریاستوں، رجواڑوں اور سیاست دانوں کے مقاصد الگ ہیں۔

جناح نے پہلے اجلاس میں اپنی تقریر میں کچھ قدم اٹھانے کی ضرورت پر پورا زور دیا تھا، انہوں نے تب کہا تھا کہ 'مجھے ڈومینین وزیر اعظم اور نمائندوں کی موجودگی پر بہت مسرت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ یہاں سب ایک نئے ڈومینین

ہندوستان کے معرض وجود میں آنے کے گواہ بن رہے ہیں جو اقوام کی برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہو کر ان کے ساتھ چلے گا۔' پنجاب اور متحدہ صوبہ جات کے سابق گورنر میلکم ہیلے نے مسلم وفد کے بارے میں لارڈ اِروِن کو رپورٹ دیتے ہوئے لکھا' آغا خان ان کی قیادت نہیں کرتے لیکن یہ کہتے ہیں کہ وہ خود اکثریت کے ساتھ چلیں گے۔ انہیں جناح پر کافی حد تک بے اعتباری پائی جاتی ہے۔ کانفرنس کے آغاز میں انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا جس پر ان کی پارٹی بھی متفق ہو سکے۔ جس کے نتیجے میں وہ لوگ تھوڑے ملول ہیں۔ انہوں نے کانفرنس کے سیکریٹریٹ کی تقریر کی نقل پیشگی دینے سے انکار کر دیا جب کہ دیگر سبھی لوگوں نے ایسا کر دیا۔ مگر بہر حال، جناح تو ہمیشہ سے پکے پاجی رہے ہیں اور ان سا سا□نما مچھلیوں کی طرح ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں، ان کے اجداد بمبئی کے بازار میں جو کاروبار کرتے تھے۔'34

بارلڈون کی ٹوری حکومت میں 1922 سے 1924 تک سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی ذمہ داری سنبھالنے والے لارڈ پیل کو، جو اس وقت کنزرویٹو پارٹی کے وفد کی قیادت کر رہے تھے، جواب دیتے ہوئے جناح نے اس بات پر زور دیا کہ 'سائمن کمیشن کی رپورٹ ختم ہو چکی ہے۔'35 جناح کو اس کانفرنس کے دوران فیڈریشن کا ڈھانچہ تیار کرنے والی کمیٹی (فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی) میں ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اس کمیٹی میں بھی جناح نے واضح طور پر کہا کہ جب تک مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو تحفظ کا احساس دلانے کا انتظام شامل نہیں کیا جاتا تب تک کوئی بھی آئین کام نہیں کر سکے گا۔ پہلی گول میز کانفرنس نے جناح کی گومگو کی حالت کو بالکل اجاگر کر دیا۔ تمام مبصروں میں مانچسٹر گارڈین نے ہی سب سے واضح اور سلجھے الفاظ میں اس کش مکش کو بیان کیا: 'گول میز کانفرنس میں جناح کی حالت عجیب وغریب تھی۔ ہندو سوچتے تھے کہ وہ ایک فرقہ پرست مسلمان ہیں اور مسلمان انہیں ہندو نواز گردانتے تھے۔ راجاؤں نے انہیں حد سے زیادہ جمہوری تصور کیا اور انگریز انہیں ایک پر جوش انتہا پسند مانتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہر جگہ ہوتے ہوئے بھی کہیں نہیں تھے۔ کوئی انہیں پسند نہیں کر رہا تھا۔'36

جناح نے اس کانفرنس کے دوران اپنے اس کردار کے بارے میں خود کئی سال بعد 2 مارچ 1936 کو لاہور کے ایک جلسہ عام میں اپنی تقریر کے دوران اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: 'میں نے مسلمانوں کو ناخوش کیا۔ میں نے 'مشہور' 14 نکات کو رکھ کر ہندو دوستوں کو بھی ناراض کیا۔ میں نے راجاؤں کو ناخوش کیا کیوں کہ میں ان کی خفیہ سرگرمیوں کے بالکل خلاف تھا۔ ساتھ ہی میں نے برطانوی پارلیمنٹ کو ناراض کیا کیوں کہ مجھے شروع میں ہی محسوس ہو گیا تھا کہ یہ سب دھوکہ ہے اور میں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ کچھ ہی ہفتوں میں وہاں میرا کوئی دوست نہیں رہ گیا تھا۔'37

گاندھی-اروِن سمجھوتہ

یہ کانفرنس چاہے جس طرح بھی ختم ہوئی ہو، اسے کچھ فیصلے تو کرنے ہی تھے اور آگے کی کارروائی کا ایک خاکہ بھی بنانا تھا۔ اس لیے وزیر اعظم ریمزے میک ڈونالڈ نے اعلان کیا کہ 'اگر وفاقی بنیاد پر قانون سازیہ بنائی جا سکے تو برٹش حکومت

مرکز میں اقتدار کی منتقلی'38 قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ ہندوستان کے نرم عناصر کے لئے سودے بازی کا وسیلہ تو ضرور تھا مگر اسے فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلتا تھا، کیوں کہ جب تک کانگریس اور مسلم لیگ ایک ساتھ مل کر آئین بنانے میں پوری طرح شامل نہ ہوں، تب تک اس معاملے میں کوئی پیش رفت ممکن ہی نہیں تھی۔ پھر بھی اس پہل کو آگے بڑھانے کے لیے برٹش حکومت نے کانگریس کے کئی بڑے لیڈروں کو رہا کر دیا تاکہ وہ پہلی گول میز کانفرنس سے اٹھنے والی باتوں پر اپنے اپنے موقف کے بارے میں پھر سے سوچ سکیں۔ نتیجتاً گاندھی اور وائسرائے اروِن کے درمیان آخر کار بات چیت بھی ہوئی جسے بعد میں 5 مارچ 1931 کے 'دہلی سمجھوتے' کا نام دیا گیا۔ اس سمجھوتے کی بنیاد پر حکومت نے ایک آرڈی نینس کے ذریعہ نافذ ضابطہ معطل کر دیا اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے پر راضی ہوگئی۔ اس کے جواب میں کانگریس نے سول نافرمانی تحریک واپس لینے، ڈومینین حیثیت کو اپنا نصب العین ماننے اور دوسری گول میز کانفرنس میں شامل ہونے پر اپنی منظوری دے دی۔ بھلے ہی ہندوستان کی حکومت کانگریس کو آئین سازی کے عمل میں تعاون کے راستے پر واپس لانے کے لیے کچھ رعایتیں دینے کو تیار تھی لیکن وہ اپنے 'صوبائی حلیفوں' کی قیمت پر ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

جب اس دہلی معاہدے یا (گاندھی اروِن سمجھوتہ) پر دستخط ہوئے تو ایسا لگا جیسے 'حکومت نے جتنا سوچا تھا، اس سے کہیں زیادہ فائدہ تو کانگریس کو مل گیا ہے'۔ اس سے دیہی علاقوں میں یہ تاثر قائم کیا گیا، جس کی توقع نہیں تھی، کہ کانگریس کو ایک بڑی جیت مل گئی ہے۔ اس لیے اب 'رام راج'39 بھی دور نہیں ہے۔ سول نافرمانی تحریک واپس لے لیے جانے کے بعد حالات تو اب حکومت کے قابو میں تھے لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت کے جابرانہ اختیارات کی معطلی نے کانگریس کے لیے اپنا اثر قائم کرنے کے کئی اور مواقع فراہم کر دیے تھے۔ کانگریس کے کئی بڑے لیڈروں نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا نہرو نے 10 مارچ 1931 کو ایک سرکولر جاری کر کے کانگریس کے سبھی لیڈروں اور کارکنوں کو پیغام دیا کہ یہ سمجھوتہ 'محض جنگ بندی ہے مکمل امن' نہیں۔40 الہ آباد کے کلکٹر نے افسوس کے ساتھ کہا 'سمجھوتے سے کچھ پہلے حالات سدھر رہے تھے اور لگان (رینٹ) پھر سے آنا شروع ہو گیا تھا۔ تب ایسا لگ رہا تھا کہ 'لگان نہ دینے' کی مہم جلد ہی ٹوٹ جائے گی لیکن تبھی اس سمجھوتے کی وجہ سے بہت برا اثر پڑا۔ اسے مزارعوں کی جیت کی طرح دیکھا جا رہا ہے اور لگان کی ادائیگی پھر سے گھٹنے لگی ہے' اگرچہ کہ کانگریس نے اس مہم کو روک دینے کا وعدہ کیا تھا مگر حقیقت میں یہ مہم نہ صرف جاری تھی بلکہ بہت موثر بھی تھی کیوں کہ کون مزارع یا کسان اپنی کڑی محنت کی کمائی کا ایک حصہ اس طرح دینا چاہے گا، اگر اس سے بچنا ممکن ہو۔

مسلمانوں کو عموماً اور خاص طور پر مسلم کانفرنس کو ہلکا سا احساس بھی ہونے لگا کہ ان کے ساتھ 'دھوکہ' ہو گیا ہے۔ ان ہی دنوں متحدہ صوبے میں کچھ مہلک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان سے پیدا ہونے والی تکلیف اور غصے نے ان کے اس احساس کو شدید تر کر دیا۔ اس واقعے سے پورے شمالی ہند میں مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت برا اثر پڑا۔ پھر مسلم کانفرنس کے مطالبات کا سخت تر ہو جانا فطری تھا۔ اس لیے اس نے پہلی بار یہ مطالبہ رکھا کہ 'بنیادی حقوق کو قانونی کارروائی کے لائق بنایا جائے، مسلمانوں کے مذہبی معاملات سے متعلق تمام امور پر ان کا اپنا پرسنل لا ہی نافذ ہو، ساتھ ہی کبھی، کسی بھی حکومت

کو اس قانون کو بدلنے کا اختیار نہ ہو'۔ یہ بہت ہی سنگین اور اہم تبدیلیاں تھیں، جن میں مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کی تشویش کی جھلک بھی تھی، اور ساتھ ہی ایک بار پھر سیاسی اور مذہبی معاملوں کی بڑھتی ہوئی یکجائی بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ ان باتوں کے ساتھ ہی دیگر مطالبات بھی ابھرے، جن کا مقصد صوبائی خود مختاری کے دائرے کو اور بڑھانا تھا۔ جس کی ایک بڑی مثال تھی فیروز خاں نون کی یہ عجیب تجویز جو پوری سنجیدگی سے پیش کی گئی تھی کہ فوج کو بھی صوبائی دائرے میں لایا جائے۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ انگریزوں کی طرف سے اقتدار کی منتقلی کے بعد، فوج کو مرکز کے بجائے، صوبوں کے ماتحت رہنا چاہیے کیوں کہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر مرکز کا کنٹرول ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلا گیا تو فرقہ وارانہ بدامنی کے وقت فوج ہندوؤں کے اشارے پر چلے گی۔ پنجاب کے مسلمانوں اور یونینسٹ پارٹی کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مرکز کو اقتدار کی منتقلی سے ان کے صوبائی سیاسی مفادات کے ساتھ ساتھ راج شاہی کی فوج میں ان کی برتری کے لئے بھی خطرہ ہو جائے گا۔

جیسے ہی حکومت نے کانگرس کی طرف کچھ مصالحانہ اشارے کئے، جواب میں کانگرس نے بھی مسلمانوں کے ساتھ میل ملاپ کی کوششیں شروع کر دیں۔ دہلی سمجھوتے کے مطابق گاندھی نے دوسری گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کی رضامندی تو دے دی تھی لیکن ان کا واضح طور سے یہ بھی ماننا تھا کہ اگر وہ ایک متحدہ ہندوستان کے مطالبات کو پیش کرنے والے شخص کی حیثیت سے لندن جائیں گے تو ان کی پوزیشن کہیں زیادہ مضبوط ہوگی۔ اس لیے سمجھوتہ ہونے کے بعد گاندھی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ 'فرقہ وارانہ سوال کا حل نکالے بغیر لندن جانا بیکار ہے۔' ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ سمجھوتے کے انعام کے طور پر مسلمانوں کو وہ سب کچھ دینے کو تیار ہیں جو وہ چاہتے ہوں، حالاں کہ اس بات میں شبہ ہے کہ خود گاندھی کو بھی ایسی کسی تجویز پر کانگرس کی طرف سے حمایت کا پورا یقین تھا۔ کیوں کہ عدم تعاون تحریک ظاہر کر چکی تھی کہ دونوں فرقوں کا مشترکہ مطالبہ قابل عمل نہیں ہے پھر بھی اپنے اس مقصد کے لیے گاندھی اپریل 1931، میں دہلی میں، مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی سے ملے مگر جس طرح پہلے لندن میں علاحدہ حلقہ انتخاب کے مسئلے پر بات نہیں بنی تھی اسی طرح یہاں بھی بات چیت ناکام رہی۔ کانگرس کے اندرونی اختلافات ساتھ ہی قوم پرست مسلمانوں سے کانگرس کے اختلافات نے، انہیں کوئی بھی رعایت دینے پر روک رکھا تھا۔

لہذا مئی 1931 میں گاندھی نے فرقہ وارانہ مسئلے پر یہ تجویز رکھی کہ ارون خود ہی ثالثی کریں، اور یہ ساری کوششیں کرتے ہوئے انہوں نے کانگرس کے اس دعوے کو برقرار رکھا کہ 'وہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے' اسے مصالحت سے متعلق بات چیت میں شریک نہ رکھتے ہوئے۔ یہ سچ مچ ایک کش مکش کی حالت تھی۔ اگر کانگرس بات چیت کے دروازے بند کرتی ہے تو لندن میں اس کی پوزیشن کمزور ہوگی، اور اگر وہ بات چیت میں حصہ لیتی ہے تو اس کے اپنے حامیوں کے بٹ جانے کا خطرہ تھا۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مسلم کانفرنس اور کانگرس دونوں میں ایسے بھی مسلمان تھے جو سمجھوتے کے لیے کام کرنے اور اسے حاصل کرنے کے لیے تیار تھے۔ مسلم کانفرنس کے 'خلافتی' عناصر بھی کانگرس کے ساتھ کسی سمجھوتے کے خلاف نہیں تھے۔ پنجاب کے شہری آئین پسندوں نے بھی اسی طرح کا رجحان ظاہر کیا تھا، لیکن گول میز کانفرنس میں محمد شفیع

کی وکالت نے یونینسٹوں کو مزید ناراض کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ بیس کی دہائی میں، پنجاب میں یونینسٹوں کا اثر بڑھنے سے سمجھوتہ چاہنے والوں کو کسی طرح سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ (اقبال بھی کسی حد تک اسی زمرے میں آتے تھے۔ اقبال کشمیر نژاد شہری مسلمان تھے، بطور مقبول شاعر، عوام پر ان کا کافی اثر تھا مگر بیشتر یونینسٹوں سے ان کے خیال کم ہی ملتے تھے۔ اقبال کانگرس سے سمجھوتے کے حق میں تھے اگر اس سے مسلمانوں کو فائدہ ہوتا ہو لیکن محمد شفیع کے برعکس اقبال پر فضل حسین کا بہت اثر تھا اور اس لیے ہی وہ آئندہ بات چیت کا ایک حصہ بھی بنے۔

دوسری طرف، سبھی کانگرسی مسلمان جو متحدہ ہندوستان کے ساتھ عہد بستہ تھے، سمجھوتے کے خواہاں تھے۔ انصاری، خلیق الزماں اور شیروانی جیسے لوگوں کے لیے ابھی تک کی راہ مشکل رہی تھی، مگر انہوں نے علی برادران کے رعب میں آنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور کانگرس کے لیے مسلسل کام کرتے رہے۔ مگر 1929 کی میں کانگرس کے لاہور اجلاس نے انہیں بہت مایوس کیا کیوں کہ اس میں 1928 کی 'نہرو رپورٹ' کو بے اثر ہو جانے دیا گیا تھا، جس پر انہوں نے اپنے فرقے کے بہت سے لوگوں اور دوستوں سے بگاڑ بھی کر لیا تھا۔ 'مکمل سوراج' (آزادی) کو اب سول نافرمانی تحریک کے ذریعے حاصل کرنا تھا جس میں صاف ہے کہ مسلمانوں کو نمایاں جگہ نہیں ملتی۔ تحریک کے دوران فرقہ وارانہ سمجھوتے پر کسی طرح کی بات چیت بھی ممکن نہیں تھی؟ اسی مایوسی کے سبب 1930 کے اوائل میں انصاری، خلیق الزماں اور شیروانی نے کانگرس میں اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا لیکن وہ معمولی 'چار آنہ' 41 ممبر بنے رہے۔ ان دنوں شیروانی نے مسلم لیگ سے اپنے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی کانگرس کو مصالحت کے رویے کی طرف لانے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ چناں چہ کانگرسی مسلمانوں کے لیے یہ گاندھی اِرون سمجھوتہ ایک بہت مبارک قدم تھا۔

اگرچہ اپریل 1931 کی کوششوں میں کانگرس کے مسلم اراکین پیش پیش رہے تھے، لیکن وہ حلقہ انتخاب سے متعلق اپنے موقف پر بھی ثابت قدم رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مشترکہ حلقہ انتخاب اور بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہی وفاقی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے ممبروں کا انتخاب ہونا چاہیے۔ اسی سلسلے میں تمام مسلم تنظیموں کی ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی گئی لیکن ایسی کسی پہل میں، مسلم کانفرنس کے لیے کافی خطرے بھی پوشیدہ تھے۔ فضل حسین اس شرائط پر بات چیت میں اس طرح شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جیسے کانفرنس کے موجودہ مطالبات پر مول تول ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس معاملے سے الگ رہنے کی کوشش کی اقبال اور شفیع کو بھی قوم پرست مسلمانوں کے ساتھ الگ سے بات چیت کرنے سے روکنا چاہا۔ فضل حسین کی صلاح کے باوجود، شفیع، اقبال، شوکت علی اور دیگر لوگوں نے قوم پرست مسلمانوں کے ساتھ 19 جون 1931 کو، ایسی ہی ایک، ملاقات میں ایک فارمولا پیش کیا گیا جو فضل حسین کو قبول تھا۔ اس فارمولے میں مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے لئے خصوصی ترجیح جاری رکھنے، ساتھ ہی پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو تسلیم کرنے کی بات شامل تھی لیکن بالغ حق رائے دہی اور مشترکہ حلقہ انتخاب کی تجویز شامل نہیں تھی 42۔ یہ ایسی تجویز تھی جس پر اتفاق رائے ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی قوم پرست مسلمانوں سے یہ بات چیت ختم ہوگئی۔ اِرون اور گاندھی کے درمیان ہونے

والے سمجھوتے کو اسی پورے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ اس سمجھوتے میں طوفان سے پہلے کی خاموشی کی جھلک تھی، تقریباً ویسی ہی جیسے سول نافرمانی تحریک کے اتھل پتھل بھرے دنوں سے پہلے دیکھی گئی تھی۔ اس نے نفاق اور شدید جذبات کو ہوا دی۔ کراچی کانگرس نے اس سمجھوتے کو تقریباً اتفاق رائے، لیکن برٹش راج کے تئیں معاندانہ جذبے کے ماحول میں منظور کیا تھا۔ اس بات پر وائسرائے نے کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا ہے کانگرس کے کارکنوں اور لیڈروں کی جیت کا وہم ہوگیا۔ جو برطانوی راج کے ساتھ تعاون کی خواہش نہیں بلکہ اس وقت موجود عام تاثر کے مطابق 'سرکشی پر اتارو فتح مندی کے جذبہ' سے عبارت تھی۔

گول میز کانفرنس میں گاندھی کی شرکت بالکل آخری لمحوں تک غیر یقینی رہی۔ اس تاخیر نے یقینی طور پر تشویش کو بڑھا دیا۔ مگر کچھ قیاس آرائیوں کو بھی ہوا تھا، مثلاً: کچھ اڑچنیں آرہی تھیں، گاندھی کچھ 'اخلاقی پریشانیوں' کا سوال اٹھا رہے تھے۔ یہ انکل بھی تھی کہ حکام سمجھوتے کو توڑ رہے تھے یا پھر ہندو مسلم مسئلے کو پہلے حل کرنا ضروری تھا یا پھر گاندھی کا دل بدل گیا تھا۔ (جو ان کے ساتھ اکثر ہو جاتا تھا) یا پھر سب سے برا، انگریزوں کا ذہن بدل گیا تھا۔ (جو اکثر ہوتا تھا) یا پھر کچھ اسے سے بدتر درحقیقت گاندھی نے اپنے 'ضمیر کی آواز' پر اس سمجھوتے کو تحلیل کرنے کی دھمکی تو ضرور دی تھی۔ دوسری طرف گاندھی ارون سمجھوتے سے پیدا شدہ ابتدائی جوش و ولولہ بھی سرد پڑنے لگا تھا جو کہ بہر حال ہونا ہی تھا۔ جب بھی ناقابل عمل ابتدائی توقعات حقیقت سے ٹکراتی ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ نتیجتاً، کانگرس کو اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر، عوام کے سوالوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گاندھی نے اس پیچیدہ صورت حال کو سنبھالنے کے لیے مقامی حکام کے خلاف ایک 'فرد جرم' بھی ارسال کی جس میں انہوں نے انگریز افسروں پر دہلی سمجھوتے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا تھا۔ مگر تب تک ارون کی جگہ ولنگڈن وائسرائے بن چکے تھے۔ انہوں نے فرد جرم کا جو جواب دیا، وہ حکومت کے کام کاج میں دخل اندازی کی اجازت دینے سے فوری اور صاف انکار جیسا تھا۔ اس سے اچانک ہی صورت حال پھر کشیدہ ہوگیا اور سیاسی ماحول پھر گرم ہوگیا۔ اس کے بعد لارڈ ولنگڈن اور گاندھی کے درمیان کشیدہ ماحول میں بات چیت ہوئی۔ گول میز کانفرنس کے لیے ہندوستانی نمائندوں کے روانہ ہونے کا وقت قریب آچکا تھا مگر انگلینڈ جانے والے جہاز پکڑنے کے لیے آخری ٹرین بھی چھوٹ چکی تھی۔ ولنگڈن کی بات چیت کے دوران کشیدگی پیدا ہوتی جارہی تھی اور جب یہ تناؤ انتہا تک پہنچ گیا تو اچانک گاندھی نے ولنگڈن کی پیش کش پر اپنی رضامندی کا اعلان کردیا۔ چناں چہ انتظار میں کھڑی ایک خصوصی ٹرین سے گاندھی کو جلد سے جلد ممبئی پہنچایا گیا۔ ولنگڈن نے نہ تو کسی اہم موقف کو ترک کیا تھا اور نہ ہی حکومت کے کسی مفاد کو چھوڑا تھا تو پھر گاندھی کو حاصل کیا ہوا؟

دوسری گول میز کانفرنس ـــ پس منظر

اس دوران دوسری گول میز کانفرنس کے پہلے بین الاقوامی سیاق وسباق بالکل ہی غیر متوقع طور پر نامساعد ہو چکا

تھا۔ کئی مبصروں نے اس کا ذکر کیا ہے (جن میں ویلز اور لوائیڈ روڈولف بھی شامل ہیں کا مشاہدہ قابل غور ہے۔: 'پوری دنیا میں آنے والی اقتصادی کساد بازاری سے عالمی معیشت رو بہ زوال تھی۔ اس مندی کے دوران خاص کر دو بڑی معیشتوں۔ برطانیہ اور امریکہ پر تو شدید اثر پڑا تھا۔ نتیجے کے طور پر برطانیہ نے (21 ستمبر 1931 کو) اور بعد میں امریکہ نے (جنوری 1933 کو) گولڈ اسٹینڈرڈ، چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ مندی کی وجہ سے بہت تیزی سے بے روزگاری پھیلی اور قومی آمدنی میں تیزی سے گراوٹ آئی (ایسی ہی عالمی اقتصاری کساد بازاری ستمبر-نومبر 2008 میں بھی آئی تھی)۔ اس سب کی میک ڈونالڈ کی لیبر حکومت نے اور 24 اگست کو استعفا دے دیا۔ اس کے بعد کنزرویٹو، لبرل اور لیبر پارٹی کے اتحاد سے ایک قومی حکومت تشکیل دی گئی۔ اس حکومت بھی 27 اکتوبر 1931 کو عین اس وقت پر مستعفی ہوگئی جب دوسری گول میز کانفرنس دو تہائی اس کے بعد نئے انتخابات کی نوبت آگئی اور اکتوبر 1931 کے عام انتخابات میں میک ڈونالڈ اتحاد اکثریت کے ساتھ لوٹا۔ کنزرویٹو پارٹی کے غلبہ والی اس حکومت کو خود اختیاری کے ہندوستانی عزائم کے تئیں کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ ایک حد تک معاندانہ رویہ تھا۔ یہ حکومت جون 1935 کے عام انتخابات تک برقرار رہی۔

دنیا شدید کساد بازاری اور گولڈ اسٹینڈرڈ کے سقوط کے اثر سے تھوڑا ابھری ہی تھی کہ دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔ دنیا ایک اور بین الاقوامی تصادم کی کی گرفت میں آگئی۔ ستمبر 1939 میں عالمی جنگ چھڑنے سے بساط پر ان آخری چالوں کی شروعات ہوئی جن کا انجام ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کی شکل میں سامنے آیا۔ یہی اسباب تھے جن سے 1931 کی دوسری گول میز کانفرنس کا وقت بہت ہی غلط ثابت تھے۔ یہ کانفرنس جس تناظر میں ہوئی اسے دیکھیں تو ایک طرف تو برطانیہ میں لوگوں کے روزگار چھوٹ رہے تھے تو دوسری طرف مخلوط حکومت گرگئی اور عام انتخابات کا اعلان انتخابات کا اعلان کردیا گیا۔ ایسے حالات میں ہندوستانی آئین کے مباحثہ کو تو ایک طرح سے گوشۂ گمنامی میں ہی جانا تھا۔ نتیجتاً یہ کانفرنس ایک اضطراب انگیز تعطل کی شکار ہوگئی۔ جو یہاں تک بڑھا کہ مسلم نمائندوں نے تو کانفرنس کے بائیکاٹ کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ آخرکار انہیں کسی طرح رکے رہنے پر آمادہ تو کرلیا گیا لیکن اس صرف گردش ایام کو تکتے رہنے کے لئے۔ انتخابات کے بعد کنزرویٹو پارٹی کے غلبے والی حکومت آنے کے بعد اس کے بارے میں کئی نئی افواہیں اڑنے لگیں۔ مایوس کرنے والی ان سبھی باتوں کے باوجود آخر میں کانفرنس کا انعقاد تو ہوگیا مگر بے قاعدگی سے۔ طریق کار سے متعلق نقائص پر غور کرنے کی ذمے داری اس کی مختلف کمیٹیوں کو سونپی گئی۔ یہ ہندوستان کے مسائل کو سلجھانے کا نہ صرف ایک غیر منظم بلکہ نہایت بھونڈا طریقہ تھا۔ مسلسل کئی دن تک کانفرنس کا کھلا اجلاس نہیں ہوسکا اور □ظریفی یہ کہ آخرکار جس دن یہ منعقد ہوا، وہی دن گاندھی کے 'مون' (خاموشی) کا تھا۔ کانفرنس کا آغاز 30 نومبر 1931 کی صبح ہوا لیکن اس کے بعد ہونے والی طولانی تقریروں میں کے آگے ان میں اہم آئینی موضوع دب کر رہ گئے۔ آخر جب آدھی رات کے بعد گاندھی کا 'مون' ٹوٹا، مگر افسوس کہ ان کی تقریر مایوس کن رہی۔ ایک مبصر کے الفاظ میں ان کی تقریر سے صرف ایک طرح کی 'اخلاقی تلخی' ہی سامنے آئی۔ اس کے بعد کسی کو، کوئی بھی شک نہیں رہ گیا کہ کانگرس جلد ہی سول نافرمانی تحریک کی طرف دوبارہ لوٹ جائے گی۔

بہر حال، مسلم کانفرنس کے ساتھ ٹکراؤ تو اسی وقت سے تیز ہو گیا تھا جب گاندھی نے علی امام اور ایم اے انصاری کو بطور کانگرس نمائندوں کے شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مسلم کانفرنس نے اس قدم کو مسلمانوں کے بنیادی نمائندے کی حیثیت سے ان کی اسلامی پہچان کو زک پہنچانے دانستہ کوشش قرار دیا۔ اس طرح کی لایعنی باتوں نے یقیناً فضل حسین کو اتنی قوت دے دی کہ وہ کانگرس ٹیم سے انصاری کے اخراج کو یقینی بنا سکیں۔ اس گول میز کانفرنس سے کوئی حیرت انگیز بات سامنے نہیں آئی۔ گاندھی فرقہ وارانہ سوال پر کسی مباحثے کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ وہ ان معاملوں پر صرف ثالث ہی بنے رہنا چاہتے تھے۔ اس سے جو صورت حال پیدا ہوئی وہ 1930 کے مقابلے میں بس تھوڑی ہی مختلف تھی۔ پچھلی بار کی طرح ہی ہندوستان کے لبرل عناصر نے محسوس کیا کہ مسلم نمائندے تو سمجھوتے کے لیے تیار ہیں مگر ایک بار پھر کسی عام مفاہمت تک پہنچنے میں پنجاب ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن گیا۔

اس سلسلے میں آغا خان نے اپنی سرگزشت بھی لکھا ہے کہ گاندھی نومبر 1931 میں کانگرس کیواحد نمائندے کے طور پر لندن پہنچے تھے۔ ان کے ہمراہ سروجنی نائیڈو بھی تھیں۔ گاندھی سے اپنی ملاقات کے بارے میں آغا خان لکھتے ہیں:

> 'دوسری گول میز کانفرنس کے نمائندوں کے طور پر ہماری یہ ملاقات آدھی رات کو ہوٹل رٹز میں میرے کمرے میں ہوئی۔ ہم نے پریس کے لیے ساتھ ساتھ تصویریں کھنچوائیں اور اس کے بعد ہماری بات چیت شروع ہوئی۔ میں نے مہاتما جی سے یہ کہتے ہوئے سلسلہ کلام کا آغاز کیا کہ اگر وہ سچ مچ ہندوستان کے مسلمانوں کے اصلی باپ بن کر دکھاتے ہیں تو جواب میں ہندوستان کی آزادی کی ان کی جدوجہد میں وہ لوگ بھی اپنی پوری طاقت سے ان کا ساتھ دیں گے۔ مہاتما جی میری طرف مڑے اور جواب دیا' میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرے اندر 'مسلمانوں کے تئیں پدرانہ شفقت جیسا کوئی جذبہ ہے۔ لیکن اگر آپ سیاسی ضرورتوں کی بنیاد پر یہ بات رکھیں تو میں پورے تعاون کے جذبے سے اس پر تبادلہ خیال کے لیے تیار ہوں۔ میں کسی جذبے کی رو میں نہیں بہہ سکتا۔'

ہو سکتا ہے، ان کی یہ بات ازراہ شرارت یا خوش طبعی کے طور پر رہی ہو۔ لیکن شروع میں ہی اس جواب نے بات چیت کے ماحول کو بالکل سرد کر دیا۔ آغا خان اپنے تذکرے میں آگے لکھتے ہیں ء اس نے جو سرد مہری پیدا کی وہ ہماری آگے کی ساری بات چیت پر چھائی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ جب بھی میں نے ایک دیانت دارانہ جذباتی لگاؤ اور بھائی چارے کا ثبوت دینے کی کوشش کی تو اس کے جواب میں ویسا ہی کوئی رد عمل مہاتما جی کی طرف سے نہیں ملا' اور پھر آگے کہ 'برسوں بعد 1940 میں، میں نے انہیں اس بات کی یاد دلائی۔ انہوں نے کہا' یہ واقعہ انہیں پوری طرح یاد ہے۔ میں بہت معذرت خوردہ ہوں کہ آپ نے میرے جواب کو غلط سمجھا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا یا مجھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا جذبہ نہیں ہے۔ میرے کہنے کا بس اتنا مطلب تھا کہ مجھے پوری طرح خونی رشتوں کے بھائی چارے کا احساس تو تھا

لیکن وہ احساس نہیں تھا جو باپ ہونے میں مضمر میں ہوتا ہے۔' اس پر آغا خان کی رائے زنی تھی: 'اس لفظ 'باپ' سے میرا مطلب صرف ضعیفی اور لاغری کے تئیں تعظیم کا اظہار تھا۔ میرا اشارہ ان کی جسمانی یا ذہنی کمزوری کی طرف نہیں تھا۔'

بدقسمتی سے لفظوں کی یہ ابتدائی غلط فہمی محض وقتی تھی۔ اس کا اثر صرف اس رات ہی نہیں بلکہ پوری گول میز کانفرنس تک قائم رہا۔' آغا خاں لکھتے ہیں کہ 'ہندو مسلم سمجھوتے پر پہنچنے کی ہماری کوشش پوری طرح سے سیاسی تھی۔ اس میں طویل عرصے سے ساتھ کے تعلقات میں استحکام لانے والی جذباتی وابستگی اور ایک دوسرے کی تہذیب وتمدن کے احترام کی کمی تھی۔ ہمارے درمیان ایسی کوئی ہم آہنگی نہیں رہی تھی جو کسی مفاہمت کی راہ دکھا سکتی۔ ہم پھر سے ایک سرد مہرانہ سیاست کی طرف دھکیل دیے گئے، جس میں جذباتی مفاہمت کی وہ گرم جوشی نہیں تھی جو ہماری بات چیت کو مضبوط کرے۔' وہ اس نتیجے پر ٹھیک ہی پہنچے تھے، ایک افسوسناک مگر درست نتیجہ۔

یہ سب آغا خان کی خودنوشت کے بعض حصے تھے۔ بلا شبہ یہ تبصرے نجی اور ذاتی ہیں اور یہ آغا خان کے اپنے مشاہدات تھے۔ میں نے یہاں انہیں اس لیے پیش کیا کہ یہ یقینی طور پر اس وقت اور خاص طور سے اس کانفرنس والوں کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ دوسری گول میز کانفرنس کے بارے میں آغا خان کہتے ہیں: 'یہ ابتدائی بات چیت ہمیں بہت آگے تک نہیں لے جا سکی۔ اس کے بعد ہماری بات چیت کا ایک اور سلسلہ چلا۔ یہ بات چیت اکثر آدھی رات کو رٹز ہوٹل میں میرے کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ بطور میزبان میں صدارت کرتا تھا۔ بات چیت میں ایک طرف مسٹر جناح اور سر محمد شفیع ہوتے تھے تو دوسری طرف مہاتما گاندھی۔ یہ غیر رسمی باتیں تھیں، جنہیں کہیں لکھا نہیں جاتا تھا۔ میں بہت کم ہی کچھ بولتا تھا، اور بات چیت کا دارومدار مسٹر جناح، سر محمد شفیع اور ساتھ ہی ان دوسرے نمائندوں پر تھا جنہوں نے وقتاً فوقتاً اس میں حصہ لیا۔ ان میں سر ظفر اللہ خاں، مسٹر شوکت علی، اور مرحوم شفاعت علی خاں شامل تھے... یہ بات چیت بار بار عموماً اختلاف کے کچھ خاص بنیادی نکات پر لوٹ آتی تھی۔ مثلاً: ہندوستان ایک قوم ہے یا دو قومیں ہیں کیا اسلام صرف ایک اقلیتی مذہب ہے یا پھر مسلمان جن علاقوں میں اکثریت میں ہیں وہاں انہیں خصوصی سیاسی تفوق اور ذمے داری ملنی چاہیے؟ کانگرس کا رویہ بڑا ہی اصول پرستانہ اور غیر حقیقت پسندانہ لگتا تھا۔ وہ لوگ ایک قوم کے اپنے اصول کی ضد پکڑے تھے لیکن ہم جانتے تھے کہ اس کی تاریخی اعتبار سے حمایت کرنا مشکل ہے۔ ہمارا کہنا تھا کہ انگریزوں کا راج آنے سے پہلے برصغیر ہند کے مختلف علاقے ایک ملک کبھی نہیں رہے اور یہ کہ انگریزوں کے راج نے ایک مصنوعی اور ناپائیدار اتحاد قائم کر دیا۔ جب انگریزی راج چلا جائے گا تب یہ اتحاد بھی بچا نہیں رہ سکے گا۔ مختلف لوگ اپنے گہرے نسلی اور مذہبی اختلافات اور نا اتفاقیوں کی وجہ سے ہمیشہ ایک ساتھ نہیں رہ سکیں گے اور جب بھی بیداری آئے گی اپنے اپنے راستوں پر چلے جائیں گے... اس لیے تمام نکات پر اتفاق کے نزدیک پہنچنے کے باوجود اصولوں پر اس نا اتفاقی کو دور نہیں کیا جا سکا.....'

انہوں نے مزید لکھا ہے: 'مہاتما گاندھی نے سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ لگانے کی کوشش کی کہ مسلمان اپنے لیے کوئی ضمانت مانگنے سے پہلے کانگرس کی سوراج کے مفہوم یعنی خود اپنی حکومت کو اپنا نصب العین تسلیم کریں۔ جناح نے اس کا یہ بالکل درست جواب دیا کہ 'جب مہاتما گول میز کانفرنس میں شامل ہونے والے مختلف وفود کے ہندو اراکین پر یہ شرط نہیں لگا رہے تو صرف مسلمانوں پر ہی یہ شرط کیوں اس کے علاوہ ایک اور بڑی اڑچن بھی تھی... کیوں کہ جناح نے آگے یہ دلیل رکھی کہ '' ہماری شرائط ہمیشہ ایک جیسی ہی رہی ہیں... دفاع اور امور خارجہ کو چھوڑ کر دیگر امور پر مرکز کے پاس بہت کم اختیار رہنے چاہئیں۔ خاص کر پنجاب، بنگال، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد جیسے مسلم اکثریتی صوبے میں، باقی انتظامی اختیارات صوبوں کو سپرد کرنے چاہئیں۔ ہم اس بات پر اس لئے بضد تھے کیوں کہ ہمیں معلوم تھا کہ پنجاب اور بنگال میں رہنے والے کی اکثریت بھی اس پر بضد تھی'' اس پر آغا خان آگے لکھتے ہیں: مہاتما گاندھی نے ہمارے اون کے ساتھ آنے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ مگر کسے معلوم شاید وہ ہمارے خیالات سے اتفاق کرنے کی راہ پر بھی تھے مگر پنڈت مدن موہن مالویہ اور ہندو مہا سبھا نے ہمارے خلاف کافی دباؤ ڈالا۔ انہوں نے دقیق سیاسی نظریوں اور اصولوں کی بنیاد پر ایسی دلیل رکھی جو ہندوستان کے بنیادی حقائق سے بالکل غیر متعلق تھے اور 1947 میں ہندوستان کی تقسیم نے اسے ثابت کیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، بال کی کھال زیادہ نکالی جانے لگی اور دلیلیں زیادہ غیر عملی ہونے لگیں۔ مثلاً کوئی ملک اپنے ہی صوبوں کو غیر متعینہ اختیارات نہیں دے سکتا، یہ ان کا طریقوں کو حد میں رکھنے کا کوئی آئینی راستہ نہیں جس سے اکثریتوں کو اقلیتوں میں بدلا جاسکے۔ یہ بڑے دل کش والے عالمانہ مسئلے تھے مگر ہندوستانی زندگی کے حقائق اور حقیقی صورت حال سے ان کا شاید ہی کوئی سروکار رہا ہو۔''

محمد شفیع کی صاحبزادی بیگم شاہنواز نے دوسری گول میز کانفرنس میں نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ اگر ان کی باتوں پر یقین کیا جائے تو وہ ان واقعات کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ 'ایک وقت ایسا آیا جب مسلمان اور لبرل عناصر آپس میں متفق الرائے ہوگئے تھے اور مفاہمت واقعی ممکن لگنے لگی تھی، یہاں تک کہ شفیع نے خوش ہوکر مٹھائی اور شراب بھی منگوالی اور مسلم نمائندے اس موقع پر جشن منانے کے لیے ہوٹل رٹز میں آغا خان کے کمرے میں جمع ہوگئے تھے۔ لیکن یہ تقریب شروع ہی نہیں ہو پائی، کیوں کہ سکھوں اور ہندو مہا سبھا کی رضامندی لینے کے لیے جانے والے گاندھی خالی ہاتھ ہی لوٹے۔ انہوں نے واپس آکر کہا '' میں معافی چاہتا ہوں کہ میں سمجھوتے کی اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ہم نے جن جن شرائط کی تجویز رکھی ہے، انہیں قبول کرنے کے لیے سکھ فرقہ اور مہا سبھا کے لوگ تیار نہیں ہیں۔'' بیگم شاہنواز کہتی ہیں ہیں کہ— 'یہ سنتے ہی کمرے میں سناٹا چھا گیا... ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کو ایسا لگنے لگا کہ بس وہ رو پڑیں گے۔'' شفیع کے پاس ایک متبادل تجویز تھی۔ انہوں نے گاندھی سے کہا '' تو پھر چلئے، آج رات مسلمان اور کانگرس ان ہی شرطوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔'' گاندھی نے جواب دیا: 'شفیع، میں اپنی حد جانتا ہوں اور میں ایسا نہیں کرسکتا—'' اور اس طرح فرط و

انبساط کا یہ ماحول ہوا ہو گیا۔ شفیع اور ان کی صاحبزادی گھر لوٹ گئے'' اور جب ہم اپنے فلیٹ پر پہنچے تو والد صاحب جو بالکل ٹوٹ گئے تھے، بے ہوش ہو گئے۔43

جن شرائط پر سکھوں اور ہندو مہا سبھا کی رضامندی نہیں ہوئی تھی، ان کا خود کو پابند کر لینے سے انکار کرنا گاندھی کی اسی پالیسی کا حصہ تھا جس پر انہوں نے 1931 کی گرمیوں میں ہندوستان میں عمل کیا تھا۔ وہ ثالث بننے کے لیے تو تیار تھے لیکن وہ کسی کی طرفداری کرنا نہیں چاہتے تھے یا وہ کر ہی نہیں سکتے تھے؟۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب تک یہ واضح نہ ہو کہ کیا رعایتیں ملنے والی ہیں، ایسا کوئی وعدہ کرنا کانگرس کو اسے حاصل حمایت سے محروم کرنا تھا۔ گاندھی نے حساب لگایا تھا کہ کانگرس کو یہ سب کرنے اور اپنی ساکھ خراب کرنے کی بجائے حکومت کو ہی یہ فیصلہ کرنے دینا زیادہ صحیح ہو گا اس لیے دوسرے نمائندوں سے بات چیت کی ساری پریشانیاں جھیلنے کے بعد گاندھی نے ساری ذمہ داری حکومت کے سر ڈال دی۔ اقلیتوں سے متعلق ذیلی کمیٹی میں مفاہمت تک نہ پہنچ پانے پر انہوں نے کچھ افسوس اور بیکی کا احساس ضرور ظاہر کیا تھا لیکن انہوں نے اس کی ذمہ داری اس بات پر ڈال دی کہ وفد کو حکومت نے ہی تو نامزد کیا تھا۔ دراصل گاندھی یہ کہنا چاہتے تھے کہ حکومت سیاسی رعایات پر تبادلہ خیال کی قیمت کی شکل میں فرقہ وارانہ سمجھوتے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مگر ایسا کوئی سمجھوتہ تب ہی ممکن تھا جب حکومت پہلے رعایات کا اعلان کر دیتی۔ یہ بال کی کھال نکالنے کا کتنا المناک، ظریفانہ، افسوسناک چکر تھا کہ حکومت پہلے ''فرقہ ورانہ سمجھوتہ ہونے کے بعد رعایات دینے کی بات کر رہی تھی جب کہ جواب میں حکومت سے کہا جا رہا تھا کہ ''نہیں، پہلے رعایات کا اعلان کیا جائے پھر فرقوں کے بطور ہم خود ہی آپس میں سمجھوتہ کر لیں گے۔''

دوسری گول میز کانفرنس ختم ہونے کے کچھ عرصے بعد، کانگریس نے پھر سول نافرمانی تحریک شروع کر دی۔ دراصل کسی بھی طرح سے دیکھیں تو یہ اس وقت کے حالات کے مطابق منطق ہی تھا۔ مصالحت کے دکھاوے کے باوجود 1928 تک صوبائی سطح پر سیاسی طاقتوں کی ایسی صف بندی ہو چکی تھی جس نے ہندوستانی سیاست کو پوری طرح باہم متصادم، فرقہ وارانہ دھڑوں میں اس طرح بانٹ دیا کہ میل ملاپ کی ساری کوششیں فضول لگنے لگیں۔ گاندھی ارون سمجھوتے کے بعد کچھ دنوں کے لئے کانگریس اور حکومت نے زیادہ لچیلا رخ ضرور اپنایا تھا لیکن افسوس کہ یہ صورت حال بہت کم وقت تک ہی جاری رہ سکی۔

دوسری گول میز کانفرنس سے پہلے ہندوستان میں کانگرس نے بے شک کافی کچھ حاصل کر لیا تھا لیکن لندن میں پلڑا برٹش حکومت کی طرف پھر جھک گیا۔ حکومت کانگریس کو معقول نظر آنے والی جماعتوں میں سے محض ایک جماعت بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ نتیجے کے طور پر حکومت برطانیہ کے ہاتھ مضبوط ہوئے، خاص کر اس وقت جب ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم کا دوسرا دور شروع ہو گیا تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے، دوسری گول میز کانفرنس نے ان کی پوزیشن مضبوط اور محفوظ کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ مسلمانوں کو اب اس بات کا قطعی یقین نہیں رہا کہ جب بھی آخری فیصلہ

سامنے آئے گا، وہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا۔ اس لئے 'فرقہ وارانہ بخشش' 44 نزدیک آنے پر انہوں نے جارحانہ رویہ اختیار کرلیا۔

جب گاندھی ہندوستان لوٹے تب حکومت کا اصل مقصد آئندہ کے آئینی مذاکرات میں کانگریس کا تعاون حاصل کرنا تھا مگر یوپی میں 'لگان نہ دینے' کی سرگرمیوں اور صوبہ سرحد (این ڈبلو ایف پی) میں آویزش 45 کی تیاری جاری رہتے ہوئے یہ تعاون بالکل ممکن نہیں تھا۔ اسی وجہ سے کچھ ماہ کے اندر ہی حکومت نے طاقت دکھانی شروع کی۔ یوپی میں 'لگان نہ دینے کی' تحریک ختم ہوگئی اور ''فرنٹیئر'' میں احتجاج کو کچل دیا گیا۔ لہذا اب کچھ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

4 جنوری 1932 کو، گاندھی کو براودا جیل میں بھیج دیا گیا۔ انہیں مقید کیے جانے کے چند ہی دنوں کے اندر ہندوستان کے لبرل رہنماؤں نے ان کی رہائی کے مطالبے کا ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا اور دوسری پارٹیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ پریس نے بھی گاندھی کی رہائی کے لئے آواز اٹھائی۔ مگر ولنگڈن اس کے لئے اس وقت تک تیار نہیں ہوئے جب تک سول نافرمانی تحریک کو واپس نہیں لے لیا جاتا۔ گاندھی کی رہائی کے لئے یہ آواز پریس، قانون ساز اداروں اور ہاؤس آف کامنز تک میں اٹھی یہاں تک کہ سر سیموئل ہور نے ہاؤس آف کامنز میں یہ بیان دیا کہ'' کانگریس کا تعاون پانے کی شرط پر کسی طرح کے مول بھاؤ کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔'' 46

دوسری گول میز کانفرنس 1931 کے آخر میں ختم ہوئی تھی اور یہ جس طرح سے ختم ہوئی تھی، اس نے کئی معاملوں کے حل کی ضرورت سامنے رکھ دی تھی۔ لہذا تین کمیٹیاں بنائی گئیں جن کا مقصد ایک وفاقی آئین کے تحت 'حق رائے دہی'، 'مالیات' اور 'راجاؤں کی عملداری والے صوبوں کی حیثیت' کے سوالوں پر ہندوستان کے عوام کی رائے معلوم کرنا تھی۔ لارڈ لوتھیَن کی سربراہی میں قائم 'حق رائے دہی کمیٹی' نے حقائق معلوم کرنے کے لئے پورے ملک کا دورہ کیا۔ اس کے بعد کمیٹی نے رائے دہندگان کی تعداد کو 70 لاکھ سے بڑھا کر 3.60 کروڑ کرنے کا مشورہ دیا جو ایک اہم اضافہ تھا، حالاں کہ اس میں تعلیمی قابلیت کے علاوہ جائیداد کو بھی اہلیت کا بڑا پیمانہ بنا دیا گیا تھا۔ خواتین کے لئے الگ جماعت حلقہ انتخاب بنانے کی بات بھی کہی گئی تھی مگر نافذ نہیں ہوئی۔ وفاقی مالیاتی کمیٹی کے صدر سر یوسٹیس پرسی نے اپنی رپورٹ مئی 1932 میں پیش کی۔ اس رپورٹ میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے لئے مالیاتی بندوبست کا کافی تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا تھا اور یہ امید بھی کی گئی تھی کہ اس سے نئے آئین کا خوش اسلوبی کے ساتھ کام کرنا یقینی ہو سکے گا۔ صوبوں کی کمیٹی نے صوبوں اور برٹش ہندوستان کی حکومت کے درمیان سیاسی تعلقات کا جائزہ لیا اور آئندہ کے تصفیہ کے لئے وسیع اصول پیش کئے۔

1932 کے اوائل میں وائسرائے کی صدارت میں ایک مجلس مشاورت بنائی گئی تھی جسے وفاق کی کارگزاریوں کی باریکیوں پر غور کرنا تھا۔ اس میں گول میز کانفرنس کے 19 نمائندہ ممبروں کو شامل کیا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے کام کاج میں لگاتار رکاوٹیں پیش آتی رہیں کیوں کہ چند مسلم ممبروں نے تب تک کسی بھی قرارداد پر بحث سے انکار کر دیا جب تک کہ 'فرقہ وارانہ

بخشش' کا اعلان نہیں کر دیا جاتا۔ مسلمانوں کا یہ تذبذب اس اندیشے کی وجہ سے تھا کہ مرکز کی ذمہ داریاں کانگریس کے موافق شرطوں پر دی جائیں گی اور مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز کر دیا جائے گا یا یقینی طور پر انہیں بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ ولنگڈن نے مجلس مشاورت میں مسلمانوں کی حصے داری پر ان کے شبہ کو جنوری 1933 میں کم ضرور کیا، مگر جب کام کاج کو آگے بڑھانے کی باری آئی تب مسلم ممبروں نے یہ کہہ دیا کہ جب تک ان کے مطالبات کو مان نہیں لیا جاتا تب تک وہ مرکز میں اقتدار کی منتقلی سے متعلق کسی بھی معاملے پر بات نہیں کریں گے۔ اس وجہ سے فروری 1932 کے آخر تک اس مجلس کا کام پوری طرح ٹھپ ہو گیا۔ اس کے بعد ولنگڈن کے سامنے کارروائی معطل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس سے دوسری کمیٹیوں پر بھی اثر پڑا، حالاں کہ ان کی کارکردگی نے کچھ حد تک تیسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کا راستہ ہموار کر دیا۔

فرقہ وارانہ بخشش (کمیونل ایوارڈ)

دوسری گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں، گاندھی نے مسلمانوں کو چھوڑ کر بھی دیگر فرقوں کے لئے علاحدہ حلقۂ انتخاب کی مخالفت کی تھی اور ہریجنوں کے لئے نشستوں کے ریزرویشن کے نہایت سخت موقف اختیار کیا تھا۔ ہندوستان لوٹنے پر 'کمیونل ایوارڈ' کے اس پیچیدہ سوال پر ایک متفقہ حل ضرور ڈھونڈ نکالا جانا تھا۔ ایسے حالات میں اگست 1932 میں وزیر اعظم ریمزے میک ڈونالڈ نے ایک 'کمیونل ایوارڈ' کا اعلان کیا۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ دبے کچلے طبقوں (ہریجن/ دلت لفظ تو بعد میں آیا) کے لئے خصوصی انتخابی حلقوں میں کچھ سیٹوں کا ریزرویشن کرنے اور ایک خاص تعداد میں سیٹیں محفوظ کرنے جیسی تجویز شامل تھی۔ اس فیصلے کے شائع ہونے کے پانچ ماہ پہلے ہی، گاندھی نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو اپنے عزم سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ دبے کچلے طبقات کے لئے جداگانہ انتخابات کی کسی بھی کوشش کی مخالفت میں وہ اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے ہندو سماج میں گہری دراڑ پڑ جائے گی اور دلتوں کی تحقیر بڑھے گی۔ فرقہ وارانہ فیصلے کے بعد، 18 اگست 1932 کو گاندھی نے وزیر اعظم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور اعلان کیا کہ اگر 20 ستمبر تک 'ہریجنوں' کو متاثر کرنے والے اس تجویز کو بدلا نہیں گیا تو 'کفارے کے طور پر' وہ 'مرن برت' شروع کر دیں گے۔

مقررہ دن گاندھی بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ اس پر اچانک جیسے پورا ہندوستان ہی مخالفت میں اٹھ کھڑا ہوا، پورے ملک میں قومی بھوک ہڑتالوں اور پرارتھنا دِوسوں کا اعلان کیا گیا صرف آٹھ ماہ کے بعد ہی سارے ملک زبردست بھیڑ بھاڑ والے جلسے پھر کئے جانے لگے۔ ان سارے جذبات کا حتمی نتیجہ ایک سمجھوتے کی شکل میں سامنے آیا جس میں وزیر اعظم ریمزے میک ڈونالڈ کے ذریعے پہلے اعلان کئے گئے علاحدہ انتخابی حلقوں کی تجویز کے بدلے ہریجنوں کے لئے 148 سیٹیں مخصوص کی گئیں۔

وائسرائے ولنگڈن اس وقت خاصے پریشان تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ ایسی صورت حال میں مرکزی

حکومت کو آئینی ذمہ داری دے کر مضبوط بنانا ہی ایک واحد عملی حل ہے۔ یہی بات نومبر 1931 سے مارچ 1932 کے درمیان ولنگڈن اور اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سر سیموئل ہور کے درمیان خط وکتابت کا خاص موضوع تھی۔

ولنگڈن کی طرف سے مرکز کو مضبوط بنانے کی کوششیں برٹش سامراج کی کش مکش کے ایک پہلو کو یہاں اجاگر کرتی ہیں، تو مسلمانوں کی حمایت واپس پانے کا ان کا عزم، اس کش مکش کے دوسرے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ ان دنوں مسلم کانفرنس نے بھی فیصلہ کن انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر جون 1932 کے آخر تک اصلاحات پر فیصلے کا واضح اعلان نہیں کیا گیا تو وہ بھی 'راست کارروئی' کا پروگرام شروع کر دیں گے۔ اب یہ صاف ہو چکا تھا کہ سمجھوتے کے بغیر آگے کی آئینی پیش رفت ممکن نہیں ہے۔ ڈر یہ تھا کہ جو بھی فیصلہ کیا جائے گا اس سے انگریزی راج کو تو کمزور ہی ہونا تھا۔ اسی لئے وائسرائے کے کو درپیش سوالات خاصے سنگین تھے۔ کیا مسلم صوبہ پسندی کی حوصلہ افزائی کی جائے؟۔ ایسا کرنے پر مرکز کا کیا ہوگا؟ لیکن مرکز کو مزید مضبوط کرنے والی بات تو پہلے ہی نامنظور کی جا چکی تھی، اس لئے اب صوبوں کو مضبوط کرنا ہی واحد متبادل رہ گیا تھا۔ اسکا مطلب تھا پنجاب اور مسلم صوبہ پسندی کو فتح یاب کرنا جس میں جناح اور ان کی سیاست کے لئے کوئی فائدہ نہیں تھا اور کانگرس کے لئے ایسے پس منظر میں تیسری گول میز کانفرنس کا اعلان کر دیا گیا۔

سکریٹری آف اسٹیٹ نے 27 جون 1932 کو ہاؤس آف کامنز میں یہ اعلان کیا کہ چوں کہ مجوزہ ہندوستانی وفاق کی تشکیل میں ابھی وقت لگے گا اس لئے وفاق کے حقیقی آغاز کے لئے سبھی ضروری اقدامات کو پورا کرنے کا انتظار کئے بغیر صوبوں کو ذمہ داری کا عمل شروع کر دیا جائے گا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے ایک مشترکہ پارلیمانی کمیٹی بنانے کی بھی تجویز رکھی۔ اس کمیٹی کو ہندوستانی رائے عامہ کے نمائندوں کو مدعو کرنا تھا تا کہ اصلاحات کی تجاویز کو پارلیمنٹ میں باضابطہ پیش کئے جانے سے پہلے ان کا جائزہ لیں۔

اس اعلان سے برطانیہ کی لبرل پارٹی برہم ہوگئی، کیوں کہ اسے ہتک محسوس ہوئی۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کانفرنس کے طریقے کو ترک کیا جا رہا ہے اور مشترکہ طور پر صلاح مشورے اور غور وخوض کا سلسلہ بھی ترک کر دیا گیا ہے۔ اپوزیشن لیبر پارٹی نے بھی یہی رخ اختیار کیا۔ ہندوستانی پریس کے ان عناصر نے، جنہوں نے کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور جو سول نافرمانی تحریک سے کافی مضبوط، اخلاقی اور روحانی وابستگی رکھتے تھے، سکریٹری آف اسٹیٹ کے اعلان کی جم کر مذمت کی۔ اس کے بعد جلد ہی لیبر پارٹی کے ممبروں نے مختلف مشاورتی اور دیگر کمیٹیوں سے استعفا بھی دے دیا۔ حکومت ہندوستانی رائے عامہ کے اس طبقے کو الگ تھلگ نہیں کر سکتی تھی جس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے 5 ستمبر کو حکومت نے اعلان کیا کہ برطانوی ہندوستان اور صوبوں کے چیدہ نمائندوں کو پھر سے لندن میں ایک کانفرنس میں بلایا جائے گا جو نومبر 1932 کے وسط میں منعقد ہوگی۔ اس طرح ہندوستان پر چھائے ہوئے نحوست آمیز خطرات کے بادل

چھوٹ گئے۔

تیسری گول میز کانفرنس (1932)--پس منظر

تیسری گول میز کانفرنس کی ساخت عملی نوعیت کی تھی۔اس میں شرکاء کی تعداد کم تھی اور اس کا ماحول خطیبانہ انداز بیان اور سیاسی اصولوں کے عالمانہ اعلانات اور دعووں سے بھی پاک تھا۔جن کی وجہ سے سابق کانفرنس میں تبادلہ خیال کے عمل کے دوران کافی رخنہ اندازی ہوتی تھی۔ پھر بھی تصویر حوصلہ بڑھانے والی نہیں تھی کیوں کہ شرکاء کے مفادات اتنے مختلف تھے اور باہمی اختلافات بھی وقت کے ساتھ کم ہونے کی بجائے اس قدر بڑھتے جارہے تھے کہ مندوبین سب سے اہم سوالوں کا حل ڈھونڈے بغیر ہی منتشر ہوگئے۔اب نہ تو حکومت برطانیہ اور نہ ہی ہندوستانی حکومت زیادہ وقت برباد کرسکتی تھی۔انگریزوں کا خیال تھا کہ سمجھوتے پر اتفاق رائے قائم کرنے میں معروف فریقوں کے لئے خاطر خواہ وقت دیا گیا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور شرکاء کسی فیصلہ پر پہنچے بغیر ہی کانفرنس ختم ہوگئی۔ہندوستان کے لبرل لیڈر غیر مطمئن لوٹے، راجے مہاراجے بھی لوٹ آئے۔وائسرائے اس ماحول کی اہمیت سے واقف تھے اور اس لئے اسے شدید تر ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ دینا چاہتے اس لئے وائسرائے نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ انہوں نے بھی نمائندوں کو تفصیلی ملاقاتوں کے لئے بلایا، یہ جاننے کے لئے کہ مجوزہ آئین میں ہندوستانی لبرل رہنماؤں اور دیگر لوگوں کے خیالات کی گنجائش کس طرح پیدا کی۔

جناح تو اس کانفرنس کے صرف ابتدائی دو اجلاسوں میں ہی شریک ہوئے تھے اور تیسرا اجلاس تو ہو بھی نہیں پاتا اگر ہندو لبرل، خاص طور پر سپرو اور جیکر نے ایک سخت رخ اختیار نہیں کیا ہوتا۔نتیجے کے طور پر تب کے سکریٹری آف اسٹیٹ سموئیل ہوران ہندوستانی لبرلوں کے دباؤ میں آگئے۔حالاں کہ اس اجلاس کے لئے ہندوستانی نمائندوں کا انتخاب اس احتیاط سے کیا گیا تھا تا کہ صرف 'قدامت پرست' اور 'صوبائی' عناصر ہی ان میں شریک ہوسکیں۔جناح کے اس اجلاس اور مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے لئے منتخب کئے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔انہیں پارلیمانی کمیٹی کے سامنے بیان دینے کے لئے بھی نہیں بلایا گیا جب کہ کئی ہندوستانیوں اور انگریزوں کو تو اس کے لئے دعوت دی گئی تھی۔اگر حکومت نے جناح کو بلایا ہوتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں شریک ہوتے اور پارلیمانی کمیٹی کا نمائندہ بننے یا کمیٹی کے روبرو بیان دینے کے لئے بھی تیار ہوجاتے۔پھر بھی کانفرنس سے ہونے والی مایوسیوں کے باوجود جناح نے اپنے ہاتھ نہیں کھینچے تھے اور وہ اس کے دونوں اجلاسوں کے مکمل ہونے تک لگاتار کام کرتے رہے۔

اگرچہ گاندھی تیسری کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے لیکن اس کانفرنس میں کانگریس سے باہر کی اگلی صفوں کے ہندوستانی قوم پرستوں کی خاصی اچھی تعداد موجود تھی۔اس کانفرنس کے دوران جو کچھ ہوا، اسے یاد کرتے ہوئے آغا خان نے جناح کی عدم موجودگی پر اتنا ہی افسوس ظاہر کیا جتنا گاندھی کی غیر حاضری پر۔انہوں نے کہا' کافی افسوس ناک تھا کہ ہم

مسلمانوں نے اپنے ساتھ مسٹر جناح کی موجودگی کے لئے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اگر جناح وفد کے ممبر ہوتے تو وہ اس بات پر رضامندی دے سکتے تھے جو میری نظر میں ان گول میز کانفرنسوں سے برآمد سب سے گراں قدر نتیجہ تھا۔' آغا خان کے مطابق 'وہ برطانیہ کی حکومت کے سامنے رکھا گیا ایک مشترکہ میمورینڈم تھا جس میں ہندوستان برطانیہ تعلقات کی تاریخ میں پہلی بار سبھی فرقوں کی طرف سے ایک مشترکہ مطالبہ کیا گیا تھا' اور جس میں سبھی اہم سیاسی نکات کو عملی طور پر شامل کیا گیا تھا۔ ایسی تجویز موثر پیش رفت کے لئے ایک بڑا قدم ہوتا --- حقیقت میں ڈومینین درجے سے ٹھیک پہلے کا قدم۔ اس کے ذریعہ ہم نے چاہا تھا کہ ذمہ داریوں کی مزید منتقلی کے عمل میں ایک تسلسل رہے۔ اس پر سبھی غیر سرکاری ہندوستانی نمائندوں کے دستخط تھے۔ یہ عملی طور پر سبھی اختیارات ہندوستانی ہاتھوں میں سونپے جانے کا دعوا تھا۔ اس خاکے پر اگر ایک آئین منظور کرلیا جاتا تو بعد میں جو نازک حالات پیدا ہوئے جیسے 1939 میں جنگ کا اعلان، 1942 میں کرپس مشن کے سامنے آنے والی مشکلات اور اقتدار کی آخری وحتمی منتقلی، ان سب میں کم مشکلیں پیش آئی ہوتیں۔ اگر یہ آئین پوری طرح سے قائم ہوجاتا تو آگے چل کر ان محفوظ اختیارات کو ختم کرنا مقابلۃً کافی آسان ہوجاتا جو مسودے میں اقتدار منتقلی کے آخری مرحلے سے متعلق تھے۔'

کہیں یہ تو نہیں کہ آغا خان ان باتوں کو یاد کرتے وقت زیادہ ہی پُر امید ہو رہے تھے؟ یا غیر حقیقت پسند تو ایسی قیاس آرائیاں بے معنی ہوچکی تھیں کیوں کہ واقعات اب پوری طرح خودکار ہوجاتے تھے، کوئی معاہدہ ہو یا نہ ہو۔ آغا خان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے متعلق مشترکہ کمیٹی کے سامنے، اس دور میں رونما واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: 'میں ذمہ دار حکومت کے لفظ کو قبول کرتا ہوں لیکن مثالی صورت کے طور پر میری ترجیح خود اختیاری ہے... لیکن موجودہ حقائق کو سمجھنا ضروری ہے... ہندوستان جیسے کئی ریاستوں کے مجموعے کے لئے، جیسا کہ اسے ہونا ہے، موزوں کی آئندہ منصوبے کی طرف پیش رفت کے لئے ذمے دار حکومت، ہی ہمارا راستہ ہوسکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امریکی وفاقی منصوبے جیسا ہی کوئی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔' انہوں نے آگے کہا کہ " ہمارے مشترکہ میمورنڈم کو، اس کی سبھی خوبیوں (جیسا کہ ہم نے سوچا تھا) کے باجود کانگریس نے نہیں اپنایا اور اسی سبب برٹش حکومت بھی اسے نامنظور کرنے پر مجبور ہوئی" آغا خاں کے یہ خیالات برطانوی ہندوستان کے ازیت ناک کشمکش کے ماحول میں اہمیت حاصل نہیں کرسکتے اور راجے رجواڑوں کے درباروں میں بھی ایسے خیالات کو جگہ ملنی مشکل تھی۔ آئینی مباحثوں سے باہر رکھے جانے پر جناح نے 34-1932 کے درمیان کافی وقت انگلینڈ میں ہی گزارا۔ سوال اٹھتا ہے: کیا یہ ایک طرح کی خود جلاوطنی تھی؟ ہندوستانی سیاسی زندگی سے دست برداری کی پہل تھی یا کچھ اور؟ جناح نے اس وقت کے ایک جدید علاقہ ہیمپسٹیڈ میں ایک بڑا اور کشادہ مکان خریدا اور اپنی اکلوتی بیٹی دینا کو پاس کے ایک پرائیوٹ اسکول میں داخل کرایا۔ یہ اپنی مرضی کی جلاوطنی تھی یا نہیں، اس بارے میں آج بھی کافی قیاس آرائیاں جاری ہیں اور ان دنوں بھی ہوئیں۔ لیکن اس کی ایسی ترجمانی جناح کے عزم اور ان کی قوم پرستی کو بہت ہی غلط طریقے سے دیکھنا ہوگا۔ حقیقت میں ایسے کئی ذاتی اور اجتماعی اسباب تھے جن سے جناح کو لندن میں رکنا پڑا۔ شاید اس طرح انہوں نے

فرصت اور آرام کا کچھ عرصہ حاصل کیا ہو، کیوں کہ سچ مچ ان دنوں جناح ایک طرح کے سیاسی ''نو مینس لینڈ'' (ویلز) میں تھے۔ ساتھ میں ولنگڈن سے ان کی شدید نا اتفاقی بھی تھی۔ اصل میں جناح نے بعد میں سینئر صحافی درگا داس کو بتایا تھا کہ 'میں لندن اس لئے آیا ہوں کہ میں اس وا ہیات وائسرائے سے نہیں ملنا چاہتا تھا'

لیکن لگتا ہے کہ یہ محض ایک بنائی ہوئی بات تھی کیوں کہ وائسرائے سے بدمزگی تو کافی عرصے سے چلی آرہی تھی۔ ایک اور پہلو ہے۔۔۔ جناح کے تئیں جواہر لال نہرو کی تلخ ناپسندیدگی اور گاندھی سے ان کی مسلسل خط و کتابت، جو مسلم مفادات کے خلاف رہی، ان سبھی باتوں نے جناح کو کانگریس اور برٹش سول سروس، دونوں کے سخت بیزار کر دیا تھا۔ برٹش سول سروس سے ان کی ناراضگی اس لئے کہ جناح، جان گئے تھے کہ انگریز حکام میں ہندوستانی وزراء کے ماتحت کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ دوسری طرف نہرو نے ان کے خلاف جارحانہ رخ اختیار کر رکھا تھا۔۔۔ ''جناح نے جب 5 ستمبر 1931 کی کانفرنس میں یہ بات رکھی کہ نئے آئین میں مسلمانوں کے لئے مناسب ضمانت ہونی چاہیے اور اگر انہیں یہ مہیا نہیں کرائی جاتی تو نیا آئین یقیناً ناکام رہے گا۔''50 تو اس پر جواہر لال نہرو کا ردعمل بہت ہی تیکھا تھا۔ جواہر لال نے اسے حیران کن بکواس اور تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کا ملغوبہ تک قرار دیا تھا51 انہوں نے جناح کے 14 نکات کو مضحکہ خیز کہا اور اس کی مزید مذمت کی52 جناح لگاتار مطالبہ کرتے رہے کہ ان کے 14 نکات کو پوری طرح منظور کیا جائے جس پر ستمبر کے آخر تک جواہر لال کا تیکھا طنز کیا: ''مجھے نہیں لگتا کہ جہنم کی سزا بھی میرے لئے اس راستے پر جانے سے زیادہ بھیانک ہوگی۔ اگر مجھے اپنے دوست محمد علی جناح کی 14 نکات کی ذرا سی کم نہ ہونے والی بکواس کو کچھ اور سننا تو میں ساؤتھ سی آئی لینڈس میں بے کی سوچوں گا۔ جہاں کچھ ایسے لوگوں کے ملنے کی امید تو ہوگی جو اتنے سمجھدار یا انجان ہوں کہ ان 14 نکات پر بات نہ کریں۔''53

اس ماحول میں جناح کی قیادت والی لیگ اور نہرو کی قیادت والی کانگریس کیسے ساتھ مل کر کام کر سکتی تھی۔ اس کا انجام آخرکار علاحدگی اور جدائی ہی ہونا تھا۔

اس کے علاوہ جناح کا ایک گھریلو اور نجی پہلو بھی تھا۔ نوجوان رتی (رتن بائی پٹیٹ) سے ان کی رومانی شادی کی چمک دمک، ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سیاسی تقاضوں کی شدید گرم بازاری میں ماندی پڑنے لگی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی کو وقت اور توجہ کی ضرورت تھی مگر ہندوستان کی آزادی بھی ان سے یہی مطالبہ کرتی تھی، اور اس کا نتیجہ ان کی نجی زندگی کو ہی بھگتنا پڑا۔ رتی اور جناح، دونوں ایک بہت ہی گہرے صدمے سے گزرے، اور پھر تھک کر دونوں میں علاحدگی ہوگئی۔ اس کے باوجود جناح نے رتی سے قریبی تعلقات قائم رکھے۔ آخر طویل علالت کے بعد 1929 میں رتی چل بسیں جس کے بعد جناح کی صحت بھی کافی خراب ہونے لگی۔ وہ بھی تو اب ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ وہ شدید سیاسی تناؤ کے تحت لگاتار سگریٹ اور سگار پھونکتے رہتے تھے۔ ان سب کے علاوہ اب ان پر ایک بچی کی ذمے داری بھی آگئی تھی۔ انہیں کم سے کم کچھ دنوں کے

لئے تو آرام، ایک تبدیلی، ایک الگ ماحول کی ضرورت تو تھی ہی۔

ان گول میز کانفرنسوں، ہندو مسلم تعلقات میں تعطل اور برطانوی سامراج کی سرد مہری سے پیدا ہونے والی مایوسی نے جناح کو یہ سوچنے اور سوال کرنے کے لئے بھی مجبور کیا تھا کہ اب ان کی آگے کی زندگی کدھر جا رہی ہے؟ ''کیا ہاؤس آف کامنز کی رکنیت کے ذریعے برطانوی سیاست میں شریک ہونے کی کوشش کی جائے'؟ انہوں نے اس پر غور کیا اور اس کی طرف کچھ وقت کے لئے مائل بھی ہوئے لیکن پھر ان کو لگا کہ کوئی بھی برطانوی پارٹی انہیں قبول نہیں کرے گی کیوں کہ وہ ان کے لئے تو پہلے سے ہی بہت 'بڑے' ہیں اور پھر ہندوستان تو لگاتار انہیں بلا ہی رہا تھا۔ مارچ 1933 میں ہندوستان کی انتخابی اصلاحات پر جاری وائٹ پیپر کے شائع ہونے کے فوراً بعد جناح نے لندن میں اس پر علانیہ اپنے خیالات ظاہر کئے۔ انہوں نے اس وائٹ پیپر میں ہندوستان کی سیاسی پیش رفت سے وابستہ قراردادوں کا جائزہ لیا، گورنر جنرل اور صوبوں کے گورنروں کو دئے گئے اختیارات اور کاموں کی مذمت کی اور اس میں پیش کردہ تحفظات پر نکتہ چینی کی۔ پھر انہوں نے وہ بات کہی جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے: ''مجھے پورا یقین ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حقیقی اور سچے اتحاد کے بغیر ہندوستان کے لئے کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی اور یہ اتحاد صرف ہندوؤں کی مدد سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ اکثریت میں ہیں۔ دلوں اور دماغوں کی تبدیلی بہت ضروری ہے، تب ہی ہندوستان کو پوری دنیا میں عزت ملے گی اور اس کی اور حقیقی معنی میں موثر ہو سکے گی جب تک ہندوستان منقسم ہے تب تک سلیکٹ کمیٹی سے ہندوستان کے حق میں اہم تبدیلیوں کی امید کرنا فضول ہے۔'

درحقیقت ہندو مسلم اتحاد میں لگاتار ناکامی ہی جناح کی کی مایوسی کا سب سے بڑا سبب تھی۔ بعد کے ایک بیان میں جناح نے 1938 میں علی گڑھ اینگلو اورینٹل کالج کے طلبا کے سامنے یہ خیال بھی رکھے تھے:

گول میز کانفرنسوں کے اجلاسوں میں مجھے زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا۔ میں نے خطرے کے اصل چہرے کو دیکھا۔ ہندوؤں کے جذبات، ان کے ذہن اور ان کے رویے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اتحاد کی اب کوئی امید نہیں۔ اس سے مجھے اپنے ملک کے بارے میں سخت مایوسی ہوئی۔ یہ افسوسناک صورت حال تھی۔ مسلمان تب تک ''نو مینس لینڈ'' میں رہنے والے لوگوں کے برابر ہو گئے تھے وہ یا تو برٹش حکومت کے خوشامدیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے یا کانگریس خیمے کے پیروکار تھے۔ جب بھی مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک طرف چاپلوسوں اور جی حضوریوں اور دوسری طرف کانگریسی خیمے کے غداروں نے ان کوششوں کو ناکام کر دیا۔ میں نے تب محسوس کرنا شروع کیا کہ میں نہ تو ہندوستان کی مدد کرسکتا ہوں اور نہ ہندوؤں کی ذہنیت کو بدل سکتا ہوں اور نہ مسلمانوں کو ان کی حالت زار کا احساس پیدا کرسکتا ہوں۔ جس کے بعد ہی میں نے بہت مایوسی اور دکھ کے بعد لندن بسنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی نہیں کہ ہندوستان سے مجھے پیار نہیں رہا تھا، لیکن ان دنوں میں نے اپنے آپ کو بہت ہی زیادہ لاچار محسوس کیا۔''[54]

اس بیان کی خوبی خامی خواہ جو بھی ہو لیکن یہ دل کو ہلا دینے والا اعتراف ہے۔

1933 میں اگست اور ستمبر کے دو مہینوں کے فرق سے ہندوستانی نمائندوں کے ساتھ مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں 120 سے زیادہ گواہوں کو سنا گیا' کمیٹی کے سامنے بیان دینے والے ہندوستان اور برطانیہ کے لوگوں میں سر مائکل اوڈائر، ونسٹن چرچل، اور ڈاکٹر بی ایس مونجے نے کافی شدید خیالات ظاہر کئے۔ ان لوگوں کے بیانات کی خبروں نے جناح کی مایوسی کو یقیناً مزید بڑھایا ہوگا۔ وہ جنوری 1934 میں آزردہ سے ہندوستان لوٹے۔ ممبئی میں 20 جنوری 1934 کو بامبے مسلم اسٹوڈینٹس یونین کی طرف سے ایم سی چھاگلہ کی صدارت میں اپنے اعزاز میں منعقد ایک میٹنگ میں جناح نے کہا کہ انہیں ''روشنی کی کوئی کرن'' بھی دکھائی نہیں دیتی۔ انہوں نے حاضرین سے پوچھا کہ ''ایسا کیا ہے جو میں کرسکوں؟'' انہوں نے ہندوستان میں سیاسی ہم آہنگی نہ ہونے پر پھر افسوس ظاہر کیا اور اتحاد کے لئے اپنی اپیل کو اس طرح دہرایا: 'برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لئے ملک کے پاس کوئی ایک طے شدہ مقصد نہیں اور ایک بھی ایسی تنظیم نہیں جو متحدہ ہندوستان کی طرف سے بولنے کا دعوی کر سکے، اور نہ ہی کوئی ایسا رہنما جس کے پیچھے یا ساتھ پورا ملک کھڑا ہونے کے لئے تیار ہو۔ اس لئے اگر ملک کے رہنما اپنے اختلافات کو نہیں بھلاتے اور از سر نو حالات کی تشخیص نہیں کرتے تو ہندوستان پر اس وائٹ پیپر کو لادے جانے کا خطرہ قائم رہے گا۔' اور پھر آگے کہا 'جب تک آپ مستقبل بعید سے متعلق اپنے تصورات کو بھول کر موجودہ خطرے کے بارے میں نہیں سوچتے اور جب تک آپ اتحاد حاصل نہیں کرتے تب تک کوئی امید نہیں اور برطانوی راج اس ملک کے اہم محکموں پر کنٹرول قائم رکھے گا۔''

اس کے بعد انگلینڈ لوٹنے سے پہلے جناح نے جنوری سے اپریل 1934 تک چار مہینے ہندوستان میں ہی گزارے۔ اسی دوران انہوں نے جس اتحاد کی بات ممبئی کے مسلم طلبا کے سامنے کی تھی اسی سمت میں وہ کام بھی کرتے رہے۔ آغا خان بھی ان دنوں ہندوستان میں ہی تھے اور ان کی کوششوں سے مسلم لیگ میں 1927 میں آئی دراڑ پاٹ دی گئی۔ اس کے بعد فروری 1934 میں جناح نے مسلم لیگ کی صدارت پھر قبول کرنے کی اپنی خواہش ظاہر کی۔ لیگ کی تنظیم کو پھر سے درست کرنے کے لئے کچھ ابتدائی باتوں کو پورا کرنے کے بعد جناح نے پھر سے فرقہ وارانہ سوال کا حل نکالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک نیا فرقہ وارانہ فارمولا سامنے رکھا جس کے تحت ان کی تجویز تھی کہ فرقہ وارانہ فیصلے میں سب کے لئے علاحدہ حلقہ انتخاب کے نظم کو ہندو فی الحال قبول کرلیں، اس باہمی مفاہمت کے ساتھ کہ پہلے سے طے شدہ ایک مدت کے بعد علاحدہ حلقہ انتخاب کی بجائے مشترکہ حلقہ انتخاب تشکیل دیئے جائیں گے؟ اس کے فوراً بعد جناح اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے درمیان بات چیت ہوئی، حالاں کہ یہ بات چیت بھی جلد ہی ناکام ہوگئی اور صوبوں کے معاملات، خاص طور پر پنجاب اور بنگال صوبوں کی قانون سازیہ میں مسلم نمائندگی سے متعلق سوال، پھر سامنے آنے لگے۔ جناح نے تب پنڈت مالویہ سے ہونے والی بات چیت کی تفصیل دیتے ہوئے ایک لمبا چوڑا بیان جاری کیا اور اپریل 1934 میں وہ انگلینڈ کے لئے روانہ ہوگئے۔ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ نومبر 1934 میں شائع ہوئی۔ ٹھیک اسی وقت اسمبلی کے انتخابات بھی آئے ہوئے۔ اور

جناح 'مسلم شہری بامبے سٹی' اسمبلی حلقے سے پھر بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو پھر سے شروع کرنے کے لئے دسمبر 1934 میں ہندوستان لوٹے۔ یہ ایسا وقت تھا جب لندن میں 'آئینی مذاکرات' ختم ہو چکے تھے، اور سیاسی منظر نامے کا مرکز کشش کھسک کر واپس ہندوستان آ چکا تھا، ایک نیا منظر نامہ ابھر رہا تھا۔ یوروپ میں ایک نئی طاقت سامنے آ رہی تھی۔ ''نازی جرمنی''۔ اس سب کے درمیان مسلم لیگ نے الگ الگ دھڑے جناح کو متحدہ مسلم لیگ کی صدارت کے لئے اب مدعو کر رہے تھے۔ ایس ایس پیرزادہ نے اپنی مرتب کتاب ''فائنڈ پشنٹز (جلد۔2، صفحات 228-194) میں درج کیا ہے:

''وہی فضل حسین جنہوں نے 1930 میں لکھا تھا کہ جناح گول میز کانفرنس میں نقصان پہنچانے کا کام کر رہے ہیں (22 دسمبر 1030۔ فضل حسین کی ڈائری، پیپرز جلد۔6) انہیں نے اب جناح کو یہ لکھتے ہوئے مدعو کیا ہے کہ مسلم ہندوستان آپ کو کھونا برداشت نہیں کر سکتا۔ واضح بصیرت، آزاد فیصلہ اور طاقتور کردار کے لوگ بہت کم ہیں۔'' 60

پرسویل اسٹیر نے اپنے مضمون ''جناح۔ دی کریٹر آف پاکستان'' میں مشاہدہ پیش کیا کہ بوٹتھو نے اپنی نگارشات میں واضح طور پر تبصرہ کیا ہے کہ ''جناح بظارہ ہندو مسلم اتحاد کے ایک علمبردار کے طور پر کھڑے ہو کر اپنی سیاسی زندگی کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ جون 1934 میں ان کی ہندوستان واپسی اسی نظریے، اور ایک موہوم امید کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کی محرکانہ علاحدگی پسندی کی اس وقت تک مدافعت کی جب تک کانگریس نے واضح نہیں کر دیا کہ لیگ کے ساتھ کوئی سیاسی تعاون نہیں ہو سکتا۔ جس نے انجام کار جناح کو فرقہ پرست بنایا، وہ کانگریس کی یہی آمریت پسندی تھی: ''جناح کی وہ مجروح انا نہیں تھی بلکہ کانگریس کا وہ زعم تھا جس نے سلسلہ جنبانی کو اس بڑی تبدیلی کے برے انجام تک پہنچا دیا۔

5

چھوٹی دہائی: طویل بازی

مسلم لیگ-1935

جس مسلم لیگ کی قیادت کے لئے محمد علی جناح کو مدعو کیا گیا وہ اس وقت کوئی فعال سیاسی تنظیم نہیں تھی۔36-1935 کے دوران مسلم لیگ میں قیادت کے تقریباً ہر اعلا عہدے پر خطاب یافتہ اشراف، نوابوں اور زمینداروں کا قبضہ تھا۔ ویسے ابن الوقت اور مفاد طلب لوگ تمام سیاسی جماعتوں میں ناگزیر طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی اور آج بھی۔ یہ قیادت مسلم مقاصد کے لئے کام تو کرنا چاہتی تھی لیکن اس طرح کہ ان کے ذاتی یا برطانوی حکومت سے وابستہ مفادات کو نقصان نہ پہنچے۔ 1906ء کے بعد سے جب مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اس کی تمام سرگرمیاں بند کمروں تک محدود تھیں؛ اشراف کے درمیان نرم و نفیس مباحثوں کی صورت میں جن کی ان کے سوا اور کسی کے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اس کا سالانہ اجلاس بھی یا تو سجے سجائے پنڈالوں یا پھر بڑے ایوانوں میں ہوا کرتے تھے جن میں صرف چند لوگوں کو ہی شریک ہونے کی اجازت تھی، اور وہ بھی دعوت ناموں کے ذریعے مسلم لیگ اس وقت تک عوامی تحریکوں سے واقف نہیں تھی۔ 1906 کے بعد سے ہی اس کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں تھا جو درحقیقت محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا ایک حصہ تھا جسے بمشکل تمام کسی علاحدہ اہمیت کا حامل کہا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ سرسید کے دور سے ہی بیشتر مسلم تحریکوں کا مرکز رہا تھا۔ آخر کار 1910 میں لیگ کا دفتر لکھنؤ منتقل کیا گیا۔ لیگ کے مالی وسائل جو ممبر شپ اور سالانہ چندے پر منحصر تھے ان سے کوئی اور سرگرمی تو دور دفتر کا خرچ چلا پانا بھی مشکل تھا۔ لکھنؤ میں لیگ بڑی حد تک تین ہزار روپے کی اس سالانہ گرانٹ پر منحصر تھی جو راجہ صاحب محمود آباد کی عطا تھی۔ ان ابتدائی دنوں میں لیگ کو کانگریس کے برخلاف مالدار بہی خواہوں کی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔

خلافت تحریک کے دوران اس قلیل آمدنی کے سوتے بھی خشک ہو گئے اور لیگ صرف کاغذ پر سمٹ کر رہ گئی۔ اس دوران اس کے جلسے تبھی ہی ہوتے تھے جب خلافت یا کانگریس کے اجلاس منعقد ہوں۔ لیگ کے اجلاس کا خاتمہ اس سال ایک تنظیم کے لحاظ سے اس خاتمہ جیسا تھا اور حکومت ہند کی سرکاری دستاویزوں کے علاوہ کسی کو یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ لیگ نے کیا کہا اور کیا کیا۔ لیگ میں شامل لوگ بھی تقریباً ویسے ہی تھے جیسا مثلاً خلافت تحریک میں، مگر ایسا کوئی معاملہ موجود نہیں تھا جو لیگ یا مسلمانوں کو اس طرح متحرک کر سکے جیسا 42-1941 میں خلافت تحریک کے دوران ہوا تھا۔ 1935 میں لیگ کا سالانہ اجلاس نہیں ہوا۔ خلافت کمیٹی نے بھی اب اپنے اجلاس کرنے بند کر دیے تھے۔ لیگ کی یہ تقریباً قریب المرگ حالت ایک اہم حقیقت کا اشاریہ تھی کہ مسلم سیاست کا اصل مرکز صوبوں میں ہے مگر اس وقت وہاں بھی اس کے لئے کسی تحرک پر آمادہ کرنے والا مسئلہ یا کسی ہندوستان گیر سرگرمی کا کوئی امکان موجود نہیں تھا۔

صوبائی انتخابات عنقریب تھے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے فروری 1936 میں خلیق الزماں نے دہلی میں لیگ کی ایک میٹنگ رکھی اور اس کے لئے دعوت نامے روانہ کئے۔ جناح کو بطور صدر مدعو کیا گیا۔ اس میٹنگ کے دوران جناح کے ساتھ اس تجویز پر گفتگو ہوئی کہ کیوں نہ مسلم یونٹی بورڈ کو مسلم لیگ میں ضم کر دیا جائے۔ اس میٹنگ کے بارے میں خلیق الزماں اپنی کتاب پاتھ ویز ٹو پاکستان میں جناح کے حوالے سے لکھتے ہیں:1 'میں جانتا ہوں کہ مسلم کی تنظیم صاف ستھری ہو اور اسے ایک نئی زندگی ملے، اور اس مقصد کے تحت میں 10 مئی 1936 کو بمبئی میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس منعقد کرنے جا رہا ہوں جہاں میں مسلم لیگ سے آنے والے انتخابات کے لئے ایک پارلیمانی بورڈ تشکیل دینے کی اجازت طلب کروں گا ... اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس بورڈ میں آپ کی پارٹی کے لوگوں کی اکثریت ہو۔ اگر ہم مسلم ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیتے ہیں تو مسلم ووٹ کے بٹنے سے ہم میں سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے آیئے ہم مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے مشترکہ پلیٹ فارم سے ان انتخابات میں حصہ لیں۔'2 1936 میں مسلمان سیاسی طور پر بٹے ہوئے تھے اور ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ مرکزی اور صوبائی قانون ساز اداروں کے انتخابات کے لیے پارٹی کو منظم کر کے ایک متحدہ محاذ بنایا جا سکے۔ اس کمی کے پیش نظر جناح نے مولانا احمد سعید سے جو جمعیۃ العلماء ہند کے سکریٹری تھے، 1937 کے انتخابات میں ایک مشترکہ مسلم پلیٹ فارم پر لڑنے کے لئے بات چیت شروع کی۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا جب مسلم یونی ورسٹی بورڈ اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو جائے کیوں کہ مسلم یونیورسٹی بورڈ 1934 کے انتخابات میں مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی مسلم نشست کو جیتنے کی وجہ سے اپنے آپ کو اصل مسلم پلیٹ فارم خیال کرتا تھا۔ سیاسی تنظیموں کے لئے خواہ وہ کتنی ہی بے اثر کیوں نہ ہوں انتخابات میں کامیابی سے حاصل کی گئی حیثیت سے دست بردار ہونا آسان نہیں ہوتا لیکن یہ سوال اس وقت ایک تشفی بخش جواب چاہتا تھا کیوں کہ 1937 کے صوبائی انتخابات بالکل سر پر تھے۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے کیوں کہ اب تک اس پر پوری طرح غور نہیں کیا گیا ہے کہ 47-1927 تک مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی پہلی خالص سیاسی تحریک تھی۔ سر سید احمد خان کی کوششیں مسلمانوں کی تعلیمی اور تہذیبی بہتری پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کے آگے کبھی نہیں بڑھے بلکہ انہوں نے دراصل

مسلمانوں کی 'سرگرم سیاسی شرکت...کی حوصلہ شکنی کی تھی'۔

جناح مکمل سیاسی شخص تھے حالاں کہ یہ بات اس وقت تک واضح لفظوں میں کہی نہیں جاتی تھی۔ وہ واضح طور پر ایک مسلم علاقہ چاہتے تھے نہ کہ اسلامی ریاست اس معاملے میں راجہ صاحب محمود آباد جو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے سب سے کم عمر رکن تھے، کے ساتھ ان کا ایک طویل عرصے سے اختلاف رائے چلا آرہا تھا۔

پھر بھی، چوں کہ 1930 کی دہائی کے اوائل میں مسلمان مایوس کن حد تک بٹے ہوئے تھے اور لیگ تب بھی ایک طاقت تھی۔ اس لئے 1937 کے انتخابات میں اسے مسلمانوں کا صرف 4.8 فی صد ووٹ ہی حاصل ہو سکا۔ ہیکٹر نے اپنی کتاب اِن کوئسٹ آف جناح میں اے۔ بی۔ (صوفی) حبیب اللہ کے ساتھ اپنی بات چیت نقل کی ہے تاریخ 2 اپریل 1952 ہے۔ حبیب اللہ کہتے ہیں:

> 'میں لیگ کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد جناح کے اولین شاگردوں میں سے تھا اور میں ان کے ساتھ چار سال، 1936 سے 1940 تک رہا۔ 1938 یا 1939 میں 'نازی' ذہن کے ایک شخص نے جناح کو میری 'قوم' کا رہنما کہا۔ جناح نے جواب دیا ''میں تمہارا رہنما تو ہوسکتا ہوں لیکن کسی الگ قوم کا رہنما نہیں ہوسکتا۔''
>
> جناح میں زبردست انا تھی اور وہ ہمیشہ خوشامد میں آجاتے تھے۔ 1943 تک وہ کسی بحث کو نہ صرف برداشت کرتے تھے بلکہ ان سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے لیکن اس کے بعد جیسے جیسے ان کی صحت خراب ہوتی گئی وہ چڑچڑے ہوتے چلے گئے۔ انہیں بحث مباحثے برے لگنے لگے اور وہ 'جی حضور' قسم کے لوگوں کو ترجیح دینے لگے۔ لیکن ان کا تبسم ہمیشہ ایسا رہا کہ سب 'مسکرانے لگیں۔ ان کا سر پیچھے کو جھٹک کر قہقہہ لگانے کا انداز بھی بڑا دلکش تھا۔ ان کی بے صبری بے پناہ تھی۔ جب راجہ آف محمود آباد نے یہ کہا کہ 'میرا رہنما قابل ترین سیاست داں نہیں بلکہ ایسا شخص ہونا چاہئے جو خدا کا سب سے مقرب ہے، تو جناح نے انہیں الگ کردیا انہوں نے یوپی مسلم لیگ کے صدر اسماعیل خاں کو بھی اس لئے ایک کنارے کردیا کہ وہ جب بھی جناح کو اپنے خیال میں غلط پاتے تھے تو ان کی مخالفت کرتے تھے۔

1937 کے انتخابات-ابتدائی قدم

برطانوی حکام کو اس تاثر کے تحت کہ کانگریس کے حوصلے اس کے اہم رہنماؤں کی طویل قید سے پست ہوچکے ہوں گے 1937 کے پہلے عام انتخابات کے نتائج کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ کانگریس یکساں طور پر

ہم خیال لوگوں کی جماعت تھی۔ کئی کانگریسی رہنما، خاص طور پر وہ جو بائیں بازو کے تھے، بلاشبہ آئین کو اندر سے توڑنے کی باتیں کرتے تھے۔ پارٹی اہم رہنماؤں کے باہمی اختلافات کا شکار تھی۔ مہاتما گاندھی کے تمام بنیادی خلیفہ ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہونے کی دھمکی دے چکے تھے، اگر جواہر لال نہرو نے سوشلزم کو کانگریس کا نصب العین قرار دینے کی باتیں ترک نہ کیں۔ اس بات کو نہیں چھوڑا کہ سوشلزم کانگریس کا ایک اہم مقصد ہے۔ پارٹی کی بنیادی رہنما پریشان تھے۔ نہرو کا یورپ سے لایا گیا سوشلزم ان کے لئے سخت پریشان کن تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد، سی راج گوپالا چاری، آچاریہ کرپلانی، اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے اراکین نے جون 1936 کے اواخر میں اس وقت کے کانگریس کے صدر نہرو کے نام ایک سخت لہجے والے مکتوب میں واضح طور پر کہا:

> ہماری رائے ہے کہ آپ کی تقریروں اور دیگر سوشلسٹ ساتھیوں کی تقریروں اور سرگرمیوں کے سبب کانگریس تنظیم سارے ملک میں کمزور ہوگئی ہے اور ان سرگرمیوں کا ایسا کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچا جس سے اس کی تلافی ہو سکتی۔ ملک کو فوری طور پر درپیش سیاسی کام، بطور خاص، الیکشن کے پروگرام پر آپ کے پروپگنڈے سے مرتب ہونے والے اثرات بہت نقصان دہ رہے ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس صورت حال میں، ہم آنے والے انتخابات کی تیاری اور ان میں حصہ لینے کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتے۔ لہٰذا کافی پس و پیش کے بعد ہم نے ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

اگر چہ یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے سلجھ گیا مگر اس سے یہ ظاہر ہوگیا کہ جواہر لال نہرو کی 'یورپ زدہ' فکر کس قدر بے چینی پیدا کر رہی تھی۔

لہٰذا جب انتخابی عمل شروع ہوا تو جناح کو امید تھی کہ یوپی میں نیشنل ایگری کلچرسٹ پارٹی (این اے پی) اور مسلم یونیٹی بورڈ کے اختلافات کو ایک غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے حل کر لیا جائے گا۔ انہوں نے اب چھتاری اور چودھری خلیق الزماں دونوں کو آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا رکن نامزد کیا، مگر ایسا کرنے کے فوراً بعد ہی، این اے پی کے نواب چھتاری اور سر محمد یوسف نے بورڈ سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی بیانات بھی جاری کئے جن میں اپنی پارٹی کے موقف کو جائز قرار دیا گیا تھا اور مسلم لیگ کے ساتھ اختلافات واضح کئے گئے تھے۔

سر محمد یوسف نے سوشلزم سے متعلق اپنے خدشات ظاہر کئے، اور نواب چھتاری کی طرح یہ دلیل دی کہ اس کا مقابلہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یوپی کے حالات باقی ہندوستان سے نمایاں طور پر مختلف ہیں۔ خلیق الزماں دھڑے کے ساتھ سیاسی مطابقت کے بارے میں ان کے خیالات چھتاری کی بہ نسبت واضح تر تھا۔ انہوں نے کہا: ہم نے نواب زادہ لیاقت علی خاں کے توسط سے آپ کے سامنے یہ صاف کر دیا

تھا کہ ہمارے لئے پارلیمانی بورڈ میں شامل رہنا اب بھی ممکن ہو سکتا ہے مگر تبھی جب ہمیں مسلم لیگ اور این اے پی دونوں کے ٹکٹ پر انتخاب میں کھڑے ہونے دیا جائے اور یہ کہ لیگ کونسل میں ان صوبوں کی نمائندگی کرنے والے پچاس اراکین کو ایک صوبائی پارلیمانی بورڈ تشکیل دینے کی اجازت دی جائے جس میں ہمیں مناسب نمائندگی حاصل ہو۔ لیکن حال ہی میں منظور کئے گئے پارلیمانی بورڈ کے ضابطوں سے یقینی طور پر ہمارے درمیان تعاون کا کوئی امکان باقی نہیں بچتا'۔3

جناح نے جو ایک کل ہند مسلم تنظیم اور محاذ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ پارلیمانی بورڈ کے اراکین کی فہرست جاری کرنے سے پہلے 27 اور 28 اپریل 1936 کو دہلی میں بہت سے امور پر بات چیت کرنے کے لئے کئی ملاقاتوں کا اہتمام کیا۔ اس بات چیت کے دوران لیاقت علی خاں نے جناح کو کسی ایک حلقے کو دوسرے سے زیادہ نمائندگی دئے جانے کے خلاف آگاہ کیا۔ اس کے بعد ان پیچ دار مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جن کے نتیجے میں ایک پہلے سے زیادہ پیچیدہ اسکیم سامنے آئی۔ ان کی تفصیلات اس قدر تھکا دینے والی ہیں کہ یہاں ان کے ذکر میں نہ الجھنا ہی مناسب ہوگا۔ صرف اتنا ہی کافی ہوگا کہ اتفاق رائے پیدا ہو جانے کے بعد جناح کے آخر کار مئی 1936 کو ناموں کا اعلان کر دیا۔ لیکن جیسی توقع تھی، راجہ صاحب سالم پور اور چودھری خلیق الزماں نے، 8 اور 9 جون کو، نئے اعتراضات پیش کر دئے۔ یہ اعتراضات لاہور میں طے شدہ شرائط کے بارے میں تھے۔

ان انقلابات کو حل کرنے کے لئے، راجہ محمود آباد، راجہ سالم پور اور چودھری خلیق الزماں نے لاہور میں جناح اور لیاقت علی خاں سے دوبارہ ملاقات کی جہاں ایک اور فارمولا نکالا گیا جس کے مطابق:

'اس بات پر اتفاق کیا گیا ہے کہ دہلی کے چار نمائندوں کو چھوڑ کر، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے یو پی سے متعلق تمام اراکین کو یو پی کا صوبائی بورڈ تشکیل دینے کے مقصد سے کی جانے والی مجوزہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ اتفاق رائے کے مطابق اراکین کی مجموعی تعداد ایک سو ہونی چاہیے (اگر ممکن ہو) اور باقی 44 کو مندرجہ ذیل طریقے سے نامزد کیا جائے گا۔

'نواب زادہ لیاقت علی خاں 18 اور نواب اسماعیل خاں 26 اراکین کو نامزد کریں گے۔ یہ بات جناب خلیق الزماں کے سوا یہاں موجود تمام اراکین کو منظور ہے جنہوں نے کہا ہے کہ وہ اس فیصلے کے پابند رہیں گے۔'4

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس 'فارمولے' سے بھی اختلافات ختم نہیں ہوئے، خاص طور پر اس لئے کہ اس کا مطلب سمجھ پانا تقریباً ناممکن تھا۔ اس لئے نواب چھتاری اور سر محمد یوسف دونوں نے، جو لاہور کی دوسری ملاقات میں موجود نہیں تھے، استعفا دے دیا۔ لیاقت علی خاں نے اس سب میں کسی سازش کی بو محسوس کی۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ خلیق الزماں حلقے نے کہیں کانگریس کے ساتھ کوئی خفیہ سمجھوتا تو نہیں کر لیا۔ ویسے بھی اس حلقے کے بعض لوگ، پہلے کانگریس سے وابستہ رہے تھے اور بعض اب بھی تھے۔

بعد کے سلسلہ واقعات نے اس پیچیدہ اور مشکل الفہم لاہور فارمولے کو اور بھی بے اثر کر دیا۔ راجہ محمود آباد نے لیاقت علی خاں کو ذاتی طور پر مطلع کیا تھا کہ نواب اسماعیل کے کوٹے سے 26 اراکین منتخب کرنے کے لئے 9 جولائی 1936 کو ایک بیٹھک ہونے والی ہے۔ لیکن اس بیٹھک نے اس 26 اراکین کا انتخاب (لاہور فارمولے کے مطابق) کرنے کے بجائے 300 اراکین کا ایک اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ لیاقت علی خاں نے اس پر احتجاج کیا اور اب گیند پھر جناح کے پالے میں تھی۔ اس سے پہلے کہ صورت حال خراب تر ہو، لیاقت علی خاں نے تجویز پیش کی کہ لاہور میں ہونے والے اتفاق رائے کے برخلاف اگر مسلمانوں کی زیادہ بڑی تعداد کو دعوت دی جاتی ہے تو پھر مدعوئین کو نمائندہ کردار' کا حامل ہونا چاہیے۔ مگر یہ تجویز نہیں مانی گئی۔ لہذا اب بغاوت کی باری وفادار لیاقت علی کی تھی۔ انہوں نے جناح کو تار بھیج کر کہا کہ وہ بورڈ میں کام نہیں کر سکیں گے۔ انہوں نے ایک بیان بھی جاری کیا جس میں یو پی پارلیمانی بورڈ کو مختر نمائندہ' قرار دیا گیا تھا۔

لیاقت علی خاں کے خدشات کی کچھ بنیادیں ضرور تلاش کی جا سکتی ہیں۔ خلیق الزماں کے ساتھ ایک ایسا حلقہ مسلم لیگ کی صفوں میں داخل ہو سکتا تھا جو کانگریس کے تابع فرمان ہوتا۔ رفیع احمد قدوائی مخصوص انتخابی حربوں کا استعمال کرتے ہوئے چودھری خلیق الزماں، نواب محمد اسماعیل خاں اور دیگر مسلم کانگریسیوں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر چناؤ لڑنے کے لئے آمادہ کر سکتے تھے (ہندوستان میں انتخابی سیاست کا ایک عام قاعدہ)۔ اس قسم کی چالوں کا فائدہ آخر کار کانگریس کو ہی پہنچنا تھا اور سب کو معلوم تھا کہ خلیق الزماں انتخابات کا اعلان ہونے تک کانگریس کے رکن تھے۔

اس صورت حال میں، باہم متصادم حلقوں کے لئے اپنی سیاسی ترجیحات کا فیصلہ محض نظریاتی بنیادوں پر کر پانا مشکل تھا۔ اگر یہ مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ انتخابی ہم آہنگی کے لئے کام کرنے کی بات کہہ چکی تھی مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھی کہ اس عمل کے دوران اس کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ جواہر لال نہرو بالکل یہی چاہتے تھے جسے جناح مسترد کر چکے تھے۔ لیگ کا ایک علاحدہ سیاسی وجود ہی دراصل اصل مسئلہ تھا اور خلیق الزماں کی طرف سے اسی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ خلیق الزماں کے خلاف لیاقت علی خاں کی مزاحمت کا مقصد لیگ کے وجود کا محفوظ رکھنا تھا۔

جناح نے، جو اب تک ان ناقابل فہم تنازعات میں غیر ملوث رہے تھے، مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کے بعد اپنے بیان میں واضح کیا کہ 'بورڈ ہر ممکن حد تک نمائندہ بنانا چاہتے ہیں؟ ان کی تمام تر کوششیں مسلم لیگ کے تمام دھڑوں کے لئے گنجائش پیدا کر کے اور انہیں یکجا رکھنے پر مرکوز تھیں۔ نواب چھتاری اور سر محمد یوسف کے الگ ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے کوئی سخت رخ اختیار نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو مختلف دھڑوں کے درمیان اختلافات سے الگ رکھا اور کسی اصولی موقف پر اصرار نہیں کیا۔ ان کا لہجہ خلیق الزماں جیسے اپنے حلیفوں کے مقابلے کہیں زیادہ مفاہمت والا ہوتا تھا۔ کلکتہ میں دی گئی ان کی ایک تقریر کی رپورٹ کہتی ہے: 'جناح نے اپنے نکتہ چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک حلقے کو اندیشہ ہے کہ مسلمان کہیں رجعت پسندوں کے اثر میں نہ آ جائیں۔ دوسری طرف قدامت پسند حلقے کو خدشہ ہے کہ جناح

مسلمانوں کو لے کر کانگریس اور انتہا پسند بائیں بازو والوں کی طرف نہ چلے جائیں۔ جناح نے جواب دیا کہ "خود مسلمانوں کو ہی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کدھر جائیں۔ نکتہ چیں اس سلسلے میں پیش گوئیاں کیوں کرتے رہتے ہیں؟" جب تک علاحدہ حلقہ انتخاب موجود تھے، مسلمانوں کی علاحدہ تنظیم ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں یہ کوئی مثالی صورت حال تھی اور یہ کہ وہ اس سے مطمئن تھے۔ تاہم انہیں حقائق کا سامنا کرنا تھا اور ان حالات میں ان سے جو بھی ممکن ہے کریں گے۔5

10 مئی 1936 مسلم لیگ کا بمبئی اجلاس سر وزیر حسن کی صدارت میں ہوا۔ یو پی کے بیشتر زمیندار اشراف کے لیے بھری گرمی کے دنوں میں ہندوستان کے تقریباً بیچوں بیچ سے ہو کر اتنا طویل سفر کر پانا حد درجہ دشوار اور پریشان کن تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ یو پی میں بہت سے لوگ این اے این میں شامل ہو چکے تھے اور انہیں جناح اور یونٹی بورڈ کے درمیان مفاہمت کی خبر بھی لگ چکی تھی۔ بمبئی اجلاس میں لیگ کی جانب سے جناح کو ہندوستان بھر کے کم سے کم 35 افراد پر مشتمل ایک پارلیمانی بورڈ نامزد کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ اس بورڈ کو اپنا ایک انتخابی بورڈ تیار کرنا تھا اور آنے والا الیکشن لڑنے کے لیے تمام ضروری قدم اٹھاتے تھے۔

جناح نے اس دوران بنگال کا سفر کیا تاکہ وہاں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کر سکیں۔ بنگال کے دو معروف رہنما، فضل الحق 6 اور خواجہ ناظم الدین 7 ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے ہوئے تھے۔ فضل الحق کرشک پرجا پارٹی 8 کے ٹکٹ پر چناؤ لڑنے کی تیاریوں میں تھے جو خواجہ ناظم الدین اور ان کا حلقہ مسلم لیگ کے محاذ سے لڑنا چاہتا تھا۔

انتخابات میں متحدہ صوبہ جات کے کھیتہر کسانوں نے، پہلی بار، اپنی حالت اور حالات کے خلاف احتجاج درج کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کے تمام انتخابات (1937 سے پہلے) انہوں نے لگاتار زمین داروں کے امیدوار کو ووٹ دیا تھا، مگر اس بار وہ ان کے کہے میں نہیں تھے۔ زمین داروں کو آخری گھڑی تک اس کی بھنک تک نہیں لگی، یہاں تک کہ گورنر یو پی سر ہیری ہیگ کو بھی یقین رہا کہ کانگریس 144 ہندو نشستوں میں سے 60 سے زیادہ نشستیں حاصل نہیں کر سکے گی۔ مگر ہوا یہ کہ کانگریس نے دوسروں کا صفایا کرتے ہوئے 144 میں سے 134 نشستیں حاصل کر لیں۔ مسلم لیگ نے بھی ان 36 نشستوں میں سے 29 نشستیں جیت لیں جہاں اس نے پارٹی ٹکٹ پر چناؤ لڑا تھا۔ یہ بھی ایک معنی خیز کامیابی تھی۔ دوسری طرف، کانگریس کے ٹکٹ پر ایک بھی مسلمان چناؤ نہیں جیت سکا جو آئندہ کے لیے ایک خطرے کا اشارہ تھا مگر صرف اس صورت میں جب اس پر دھیان دیا جائے۔

انتخابات کے نتائج کا اعلان ہونے ہی والا تھا کہ بابو راجیندر پرساد نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ 'کانگریس قانون سازیہ میں کسی اور حلقے یا پارٹی کے ساتھ تعاون نہیں کرے گی۔'9 ذرا جلد بازی میں دیے گئے اس بیان نے شروع ہی میں اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی۔

یو پی کی صوبائی کابینہ میں مسلم لیگ کی نمائندگی کے بارے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مذاکرات کے دوران نہرو کے سامنے اہم سوال یہ نہیں تھا کہ مسلم لیگ میں کتنے نمائندوں کو کابینہ میں جگہ ملنی چاہیے بلکہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کے اراکین کی شمولیت کے بعد یو پی کابینہ اپنی ہم آہنگی برقرار رکھ سکے گی یا نہیں۔ ان مذاکرات میں نہرو نے بہت کم حصہ لیا کیوں کہ انتخابات کے بعد طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے وہ زیادہ آنند بھون میں ہی قیام پذیر رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (جو کانگریس کی طرف سے ان مذاکرات کو انجام دے رہے تھے) اس سلسلے میں ان سے صلاح مشورہ ضرور کرتے تھے مگر فیصلوں کا دارومدار نہرو پر نہیں تھا۔ جی بی پنت، رفیع احمد قدوائی، کے ایم اشرف، پی ڈی ٹنڈن اور یو پی قانون سازیہ کے دیگر اراکین نے بھی مذاکرات کے نتائج کو اثر انداز کر رہے تھے۔ نہرو اور صوبائی کانگریس رہنماؤں کے سامنے اہم ترین سوال یہ تھا کہ اگر مسلم لیگ اپنے زمین داروں حامیوں کے ساتھ، کابینہ میں شامل ہوتی ہے تو کانگریس کا زرعی اصلاحات، خاص طور پر زمین داری کے خاتمے کا پروگرام، خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں تھا کیوں کہ مسلم لیگ کی جانب سے یو پی میں زرعی اصلاحات سخت مخالفت اسی سمت اشارہ کر رہی تھی۔

مئی 1937 تک، صوبائی انتخابات کے تمام نتائج کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اب کانگریس، مسلم لیگ اتحاد قائم کرنے کے لیے بات چیت شروع ہوئی جس کا ذکر خلیق الزماں کی کتاب پاتھ ویز ٹو پاکستان میں قدرے تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، جنھوں نے مسلم لیگ کی جانب سے اس بات چیت کے لیے پہل کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: "10 میں 12 مئی 1937 کو نہرو سے پہلی بار آنند بھون میں ملا۔ مجھے ان کو قانون ساز اسمبلی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون کی ضرورت سمجھانی تھی، جس سے میری رائے ہندوستان کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا اور ملک کی مکمل آزادی کی راہ ہموار ہوتی۔ مگر میرے خیالات نے یکسر برعکس، وہ (نہرو) یہ مانتے تھے کہ ہندوستان میں ہندو۔ مسلم سوال صرف چند مسلم دانش وز مین داروں اور سرمایہ داروں تک محدود ہے جو ایک ایسا مسئلہ ایجاد کر رہے ہیں جس کا عوام کے ذہن میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ انہوں نے قانون سازیہ میں مسلمانوں کی کوئی علاحدہ تنظیم ہونے کے خیال کو مضحکہ خیز قرار دیا۔ فرقہ بند کو جاری رکھنے کے خطرات کی دلیل کے طور پر انہوں نے اسپین کی خانہ جنگی اور یورپ کے دیگر ملکوں کی مثالیں پیش کیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہندوستان کا مسلم مسئلہ بالکل منفرد ہے اور یہ کہ اس کی کوئی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں دیکھی جا سکتی...... (لہٰذا) جو چیز کناڈا یا دیگر مغربی ملکوں پر عائد ہوتی ہے اس سے مثالیں دینا ہندوستان کی تاریخ اور ملک کے مسلم مسئلے کی سنگینی کو پوری طرح نظر انداز کرنا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ جمہوریت ملک سے بھلے کے لیے ہے مگر ملک کو مغرب سے مستعار نظام حکمرانی کے لیے قربان نہیں کیا جانا چاہیے جس نے کبھی بھی اس مسئلے کا سامنا نہیں کیا جو ہندوستان کو در پیش ہے۔ ہم متفق نہیں ہو سکے اور مجھے نامراد لوٹنا پڑا۔

تبھی اس واقعے سے بالکل مختلف ایک اور واقعہ پیش آیا یعنی الہ آباد میں 17 مئی 1937 کو یو پی کے علماء کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ انہوں نے مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ چھوڑ کر بلا شرط کانگریس میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ جواہر لال

نہرو سے خلیق الزماں کی ملاقات کے صرف پانچ دن بعد کی بات ہے، جس سے نہرو کی دلیل کو تقویت حاصل ہوئی، حالاں کہ علماء کے موقف میں یہ تبدیلی مولانا آزاد کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ دریں اثناء پنڈت پنت نے بھی اتحاد کی صورت میں کابینہ کی نشستوں کی تقسیم کے سوال پر خلیق الزماں سے ملاقات کی۔ خلیق الزماں نے جواب میں کابینہ کے اراکین میں 33 فی صد کا حصہ طلب کیا۔ تب ان سے پوچھا گیا کہ مسلم لیگ کے وزیروں کا انتخاب کرنے میں ان (پنت) کا کوئی دخل ہوگا۔ ان کا جواب تھا: 'اتنا ہی جتنا مجھے آپ (کانگریس) کے انتخاب میں ہونا چاہیے۔'

5 جولائی 1937 کو، کانگریس حکومت سنبھالنے پر رضامند ہوئی اور اس کے ایک ہفتے بعد 12 جولائی کو مولانا آزاد خلیق الزماں سے ملنے لکھنؤ پہنچے۔ ایک بار پھر خلیق الزماں کے الفاظ میں: 'مولانا آزاد نے پوچھا'' اگر کانگریس انگریز حکومت کے ساتھ کسی مسئلے پر اسمبلی چھوڑنے اور استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرتی ہے تو اس پر اسمبلی میں مسلم پارٹی کا کیا رویہ ہوگا؟'' میں نے جواب دیا: ''جب ہم ایک مخلوط حکومت میں ہیں تو ہمارا اخلاقی فرض ہوگا کہ کانگریس کے ساتھ اسمبلی چھوڑ دیں۔ وسیع بنیادوں پر تعاون سیاسی اتحاد کی لازمی شرط ہے۔'' پھر اچانک انہوں نے مجھ سے سوال کیا: ''کیا آپ حافظ ابراہیم کو کابینہ کا رفیق بنائیں گے؟'' میں نے کہا: ''نہیں! کابینہ میں میرے ساتھی نواب اسماعیل خاں ہوں گے کیوں کہ انہیں نہ میری پارٹی بلکہ صوبے کے مسلمانوں کا اعتماد بھی حاصل ہے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا: ''کیا آپ یہ بات مجھے لکھ کر دے سکتے ہیں کہ اگر کانگریس اسمبلی چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے تو آپ بھی یہی کریں گے؟'' میں نے کہا: ''میری زبان ہی کافی ہونی چاہیے۔ لیکن اگر کانگریس تحریر چاہتی ہے تو یہ حاضر ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد 15 جولائی 1937 کو خلیق الزماں سے دوبارہ بات چیت کرنے کے لیے ایک بار پھر لکھنؤ پہنچے۔ اس بار پنڈت گووند ولبھ پنت بھی ان کے ساتھ تھے۔ خلیق الزماں بیان کرتے ہیں: ''چند ابتدائی باتوں کے بعد مولانا آزاد نے مجھے دو صفحات کی ایک ٹائپ شدہ تحریر دی جس پر مجھے کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے اتحاد کی قیمت کے طور پر دستخط کرنا تھا۔ یہ تحریر کچھ یوں تھی:''11

> ''متحدہ صوبہ جات قانون سازیہ میں مسلم لیگ کا حلقہ ایک علاحدہ حلقے کے طور پر کام کرنا بند کر دے گا۔ متحدہ صوبہ جات اسمبلی میں موجود مسلم لیگ پارٹی کے اراکین کانگریس پارٹی کا حصہ ہو جائیں گے اور کانگریس پارٹی کے اراکین کی طرح پارٹی کے دیگر اراکین کے مراعات اور فرائض میں شریک ہوں گے اس طرح انہیں پارٹی کے مذاکرات میں بھی شرکت کا اختیار حاصل ہوگا۔ کانگریس کے دیگر اراکین کی طرح وہ بھی پارٹی کے نگرانی اور تنظیم وضبط کے ماتحت ہوں گے، اور قانون سازیہ کے کام کاج اور دیگر عمومی طرز عمل کے معاملے میں بھی وہ کانگریس پارٹی کے فیصلوں کو ماننے کے پابند ہوں گے۔ تمام امور کا فیصلہ پارٹی کے اکثریتی ووٹ کی بنیاد پر ہوگا اور ہر رکن کا

ووٹ ہوگا۔

''ان اراکین سمیت کانگریس پارٹی کے تمام اراکین'' کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ذریعے قانون سازیہ کے اپنے اراکین کے لیے طے شدہ پالیسی اور بااختیار کانگریس تنظیموں کی ہدایات کی پوری وفاداری کے ساتھ پابندی کریں گے۔

''متحدہ صوبہ جات کا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ برخاست کر دیا جائے گا، اور اس کے بعد یہ بورڈ کسی بھی ضمنی انتخاب میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کر سکے گا۔ پارٹی کے تمام اراکین، خالی ہونے والی کسی بھی جگہ کو پُر کرنے کے لیے کانگریس کے نامزد امیدوار کی سرگرم حمایت کریں گے۔''

''کانگریس پارٹی کے تمام اراکین، کانگریس پارٹی کے ضابطوں کے پابند ہوں گے اور کانگریس پارٹی مفادات اور وقار کو فروغ دینے میں پورا تعاون دیں گے۔''

''اگر کانگریس پارٹی وزارت یا قانون سازیہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے تو مذکورہ بالا حلقے کے تمام اراکین اس فیصلے کے پابند ہوں گے۔''

''ایسی شرائط پیش کرنے والی اس ٹائپ شدہ تحریر کے ساتھ مولانا آزاد نے یہ مختصر نوٹ بھی جوڑ دیا تھا: 'امید ہے کہ اگر ان شرائط سے اتفاق کیا جاتا ہے اور مسلم لیگ کا حلقہ اراکین مکمل اراکین کی طرح کانگریس پارٹی میں شامل ہوتا ہے تو یہ حلقہ ایک علاحدہ حلقے کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا۔ صوبائی کابینہ کی تشکیل کے لیے یہ مناسب سمجھا گیا کہ انہیں نمائندگی دی جائے۔'

''یہ تحریر پڑھنے کے بعد میں نے کہا: ''مولانا، یہ تو ایک عجیب و غریب تحریر ہے۔ کیا آپ مجھ سے مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ اور مسلم لیگ تنظیم، جس کی نمائندگی میں کر رہا ہوں، کے پروانہ موت پر دستخط کرانا چاہتے ہیں۔ میں آپ سے مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے نمائندے کے سوا اور کسی حیثیت سے بات نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ، اس تحریر میں ایسے اور بھی کئی نہایت قابل اعتراض امور ہیں۔ میں اس دستاویز پر دستخط نہیں کر سکتا۔''

''اس کے بعد ایک طویل بحث شروع ہوئی، لفظ در لفظ، جملہ در جملہ، جو آٹھ بجے تک جاری رہی۔ جب میں چلنے کو ہوا تو پنت جی بولے: ''اچھا تو ٹھیک ہے'' میں ایک دو روز میں آپ کو کانگریس کے حتمی موقف سے مطلع کر دوں گا۔''

'جس دن بعد میں نے مولانا کو ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ کیا وہ مفاہمت کے لئے اس شرط کو منظور کریں گے:

'بہ شرطے کہ یوپی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی اراکین کو فرقہ وارانہ امور پر اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دینے کا اختیار ہو! ایسا لگا کہ مولانا ٹیلی فون پر یہ بات سن کر بہت زیادہ پریشان ہو گئے، اور انہوں نے کہا کہ اس کے جواب پر غور کرنا ہوگا جس کے بارے میں جلد ہی مجھے مطلع کرایا جائے گا۔ شام کو پنت جی نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا، 'فرقہ وارانہ امور سے آپ کی کیا مراد ہے؟' میں نے جواب دیا، 'پنت جی، ہم اپنی زندگی میں کافی فرقہ وارانہ سوالات جھیل چکے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ امور کیا ہیں۔ مگر پھر بھی آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان میں مذہب، مذہبی تقریبات، زبان، تہذیب و ثقافت، ملازمتیں وغیرہ شامل ہیں'۔ انہوں نے پوچھا کہ میں کب واپس آرہا ہوں، میں نے جواب دیا، 'اگلی صبح، نواب اسماعیل خاں اور میں، دونوں لکھنؤ پہنچ پائیں گے'۔

'لکھنؤ اسٹیشن سے ہم لوگ سیدھے پنت جی کی رہائش گاہ پہنچے جہاں مولانا آزاد چائے پی رہے تھے۔ ہم نے وہ تحریر مولانا کو واپس کر دی اور کہا کہ 27 جولائی 1937 کو، جب اسمبلی کا اجلاس شروع ہوگا تو ہم حزب اختلاف میں بیٹھیں گے اور نتائج کا سامنے کریں گے'۔

یوپی کے اس تنازع کی اچھائی برائی اپنی جگہ، مگر 1937 کے واقعات نے، بلاشبہ، جناح پر زبردست اور تکلیف دہ اثر ڈالا۔ صوبائی خودمختاری سے متعلق جذبات کی لہر آتی جاتی رہیں اور جناح کو ساحلوں پر درماندہ، چھوڑ گئیں۔ زیادہ رنج اس بات کا نہیں تھا کہ ان کی پارٹی یوپی کابینہ میں اپنی شرطوں پر دو نشستیں بھی حاصل نہ کر سکی۔ ملال اس کا تھا کہ وہ تصورات تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئے جن کی بنیادوں پر گزشتہ بیس برسوں کے دوران انہوں نے اپنی سیاست کی تعمیر کی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری امیدیں علاحدہ حلقہ انتخاب، مسلمانوں کو ایک علاحدہ سیاسی محاذ پر حملے کرنے، صوبے بنوانے اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کے لئے ترجیحی نمائندگی حاصل کرنے سے باندھ رکھی تھیں۔ نئے آئین میں ان کے 'چودہ نکات' کو عملاً منظور کر لیا گیا تھا۔ پھر بھی، ان تمام تحفظات اس طرح نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے جیسی انہیں توقع تھی۔ ان مسلم اکثریتی صوبوں میں جہاں مسلم لیگ کو اقتدار میں آنے کی توقع تھی، اسے زبردست انتخابی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا 12 مسلم لیگ کو سندھ کی قانون ساز اسمبلی میں تین، پنجاب میں ایک نشست حاصل ہوئی تھی۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں اسے ایک بھی نشست نہیں مل سکی تھی۔ بنگال کی قانون ساز اسمبلی میں، اس نے مسلم نشستوں (مجموعی نشستوں کا چھٹا حصہ) میں ایک تہائی نشستیں جیتی تھیں، مگر یہاں بھی۔ اسے غالب حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں سیاسی اتحاد مذہبی بنیادوں پر نہیں کئے گئے تھے۔ پنجاب میں سر سکندر حیات، بنگال میں فضل الحق اور سندھ میں سر غلام ہدایت اللہ نے جناح کی 'مسلم اتحاد' کی اپیل پر کان دھرے تھے اور بظاہر مذہبی رشتوں سے زیادہ ذاتی اور طبقاتی مفادات انہیں اپنی طرف

کھینچ رہے ہیں۔

ڈاکٹر زیدی نے اس سلسلے میں یہ پتے کی بات کہی ہے کہ 'ذمے دار حکومت کے حصول کے لئے 1936-37 کے انتخاب میں شرکت اور وزارتوں کی تشکیل کا تجربہ ہندوستانی سیاست کی اندرونی مرکبات کا مظہر تھا۔ اس سے اکثریت اور اقلیت دونوں کے رویے ایک نئے اور توجہ انگیز طور پر سامنے آگئے۔ اہم ترین بات ہندوستان میں ایسا ایک پارٹی نظام حکومت قائم کرنے سے متعلق کانگریس کا رویہ تھا جو تمام دیگر سیاسی جماعتوں کو اپنے اندر سمو لے۔ دوسری اہم بات تھی مسلمانوں کا ابھرتا ہوا اتحاد' ان برسوں کے تجربات نے جناح نے عملی سیاست کے کئی سبق دیئے، جو خالص نظری طریقوں سے حاصل نہیں جاسکتے تھے۔ وہ اور مسلم لیگ 'انتخابات کے دریا میں آدرش پسندوں کی طرح اترے اور سیاسی حقیقت پسندوں کی طرح ابھرے۔ ہندوستان اور اس کی آزادی کے مستقبل کے لئے اس سے زیادہ اہم تبدیلی اور کیا ہوسکتی تھے'13

ڈاکٹر زیدی مزید لکھتے ہیں کہ 'ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے کا مسلم حل، اجتماعی طور پر شاید پہلی بار، مولانا حسرت موہانی نے دسمبر 1921 کے اواخر میں احمد آباد میں ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس سے بحیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے پیش کیا۔ تائید یا تفصیل کے معمولی فرق کے ساتھ، اس خطبے میں دوسری اور تیسری دہائی کے دوران مطالبوں کا نچوڑ پیش کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی، مسلم اکثرتی صوبوں میں غلبہ حاصل کرنے کے مسلمانوں اسے مطالبے کا جواز فراہم کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ کہا جا رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ میں، ہندوستان کی دیگر قوموں سے پوری طرح الگ ایک 'قوم' ہیں اور اس لئے انہیں اپنا حق خودارادیت استعمال کرنے اور اپنا ایک وطن قائم کرنے کا اختیار ہے یہاں وہ اسلامی تہذیب و اقدار کی بنیاد پر اپنی تقدیر کے فیصلے کرسکیں۔ اس دوران، ایک طرف سر محمد اقبال جیسے لوگ تھے جو 1930 میں 'ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہندوستان کی تشکیل، چاہتے تھے۔ تو دوسری جانب رحمت علی تھے جو 1933 میں 'مسلم ہندوستان' کی باقی ہندوستان سے مکمل علاحدگی اور ایک نئی مسلم ریاست ("پاکستان") کے قیام کی وکالت کررہے تھے۔

1937 نے انتخابات کے نتائج کے فرقہ وارانہ ذہن والے مسلمانوں کو سخت صدمے اور حیرت سے دوچار کیا۔ ان سے ظاہر ہوا کہ مسلمان کمزور، پارہ پارہ اور غیر منظم ہیں'۔

اس ایک واحد واقعے پر مختلف باخبر لوگوں کے طرح طرح کے ردعمل سامنے آئے مگر ان سب میں ایک قدر مشترک بھی موجود تھی۔ کانگریس کے موقف پر خالص نظری اور عملی انداز سے بڑی بحثیں ہوئیں اور اور اس کے طرح طرح کے جواز پیش کئے گئے، مگر اصلاً نہرو کا موقف اور لیگ کے ساتھ اتحاد کو خارج کرنے کا اقدام آخر کار اتحاد کے حق میں تباہ کن ثابت ہوا۔ کانگریس کے لئے، یوپی یا پھر ہندوستان میں کہیں بھی مسلمانوں کی موجودگی تو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ شہریوں

کے طور پر ان کی موجودگی کو قبول کرنے میں ان کی جمہوری نمائندگی کا حق بھی مضمر تھا۔ 1909 سے 1919 تک اور تمام گول میز کانفرنسوں میں یہی بحث تو چلتی رہی تھی۔ نہرو کی اندھی اصول پرستی کئی سوال پیدا کرتی ہے بلکہ ان کا اعادہ کرتی ہے: کیا انتخابی جمہوریت میں تعداد ہی سب کچھ ہوتی ہے؟ اگر ہندوستان ایک منفرد ملک ہے، جیسا کہ وہ ہے، تو پھر اسپین، اٹلی یا یورپ کے طور طریقوں اور شخصیات کی مثالیں ہماری رہنمائی کیسے کر سکتی ہیں، ان کا ہندوستان میں جمہوری عمل کی بنیاد بن پانا تو خیر بہت دور کی بات ہے؟

کے ایم منشی نے اپنی کتاب پلگری میسج ٹو فریڈم (آزادی کے لیے تیرتھ یاترا) میں کہا ہے: اس وقت یہ سب اس قدر خوفناک حد تک دشوار نہیں لگا تھا؟ مگر جیسا کہ واقعات کے بہاؤ نے دس سال بعد دکھایا، یہ ایک متحدہ ہندوستان کے خاتمے کی شروعات تھی......' 14۔ 1937 کا سال ایک اہم موڑ ہے جو مجھے وہ سوال دہرانے پر مجبور کر رہا ہے جو اس کتاب کے آغاز میں کیا گیا تھا، یہ کہ اگر جمہوریت نمائندگی ہے تو پھر اس نے ہندوستان کو جوڑنے کے بجائے بانٹ کیوں دیا؟ اور یہ آج بھی حد درجہ تکلیف دہ انداز میں اور مسلسل ایسا ہی کیوں کیے جا رہی ہے؟ ہم 1937 پر ذرا دیر اور ٹھہریں گے۔

1973 - جمہوریت سیاست کا ایک موڑ

مرکز میں کل ہند سیاست کار کی حیثیت سے ابھرنے کی جناح کی آرزو اب بھی بڑی حد تک صوبوں میں قابل لحاظ انتخابی طاقت کے مظاہرے پر منحصر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے متحدہ صوبہ جات میں اس سیاسی شراکت کو برقرار رکھنے کے لیے سخت کوششیں کیں۔ اگرچہ جناح عوامی سیاست کے مطالبات کی جانب ذرا بھی مائل نہیں تھے مگر ان کے خیالات اس وقت کے بیشتر کانگریسیوں سے بہ مشکل ہی الگ تھے۔ نہرو کے سوانح نگار ایس گوپال نے جناح اور ان کی سیاست کو اس طرح بیان کیا ہے: 'جب جناح نے 1936 میں مسلم لیگ کی قیادت دوبارہ سنبھالی تو وہ ابھی تک قوم پرست تھے اور بیرونی اقتدار کی حمایت یا جس پر انحصار کے بالکل قائل نہیں تھے۔ ان کی تنہائی اور لاتعلقی، غیر منظم صلاحیت اور استعمار مخالف رویے نے انہیں انگریزوں اور کانگریسیوں، دونوں کے لیے ناپسندیدہ بنا رکھا تھا۔ وہ 1916 میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہونے والے لکھنؤ معاہدے کے خاص معمار رہے تھے اور اس لیے ایسی ہی کسی اور مفاہمت کی امید رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے کسی وفادار امیدوار کے بجائے لکھنؤ کے ایک سبک دوش جج سر وزیر حسن کو لیگ کا صدر منتخب کرایا جس کا خاندان یوپی میں کانگریسی قیادت سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ لیگ کا انتخابی منشور، جسے خود جناح نے وضع کیا تھا، کانگریس کے منشور سے کافی مماثلت رکھتا تھا، اور لیگ کے پارلیمانی بورڈ میں جمعیت العلماء جیسی مسلم جماعتوں کے نمائندے موجود تھے جو کانگریس کے حامی تھے۔' 15۔

کانگریس دراصل یہ مان چکی تھی کہ مسلم نشستوں کو یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کو سونپ کر ہی وہ الٹا مسلم نشستوں

کو جیت سکتی ہے۔اس میں یہ بات مضمر تھی کہ اگر کانگریس انتخابات کے بعد حکومت سازی کی حالت میں ہوتی ہے تو کابینہ کا مسلم حصہ یوپی مسلم لیگ کی طرف سے فراہم کیا جائے گا۔ کانگریس کے با اختیار تاریخ نگار سیتا رمیا کے مطابق: 'کانگریس اور مسلم لیگ نے انتخابات کے لیے مسلم امیدواروں کے انتخاب کا کام دراصل مل جل کر کیا تھا۔ کانگریس نے صرف 9 نشستوں (کانگریس کے لیے محفوظ) پر چناؤ لڑا اور باقی نشستیں یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے لیے چھوڑ دی گئیں۔ صلاح مشورے کی یہ قربت اتنی بڑھی کہ رفیع احمد قدوائی، عام انتخابات میں ہار جانے کے بعد بھی، ایک ضمنی انتخاب میں بلا مقابلہ کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے لوگ یہ ماننے لگے کہ انتخابات کے بعد ایک مخلوط حکومت قائم ہوگی۔ کانگریس کو 228 نشستوں کے ایوان میں 134 نشستوں کی واضح اکثریت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ ایک طرح سے کانگریس کی ادھوری کامیابی تھی کیوں کہ وہ ایک بھی مسلم نشست نہیں جیت سکی تھی جب کہ یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ 66 میں سے 26 مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل کی تھی۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سیاسی اتحاد کے لیے ہونے والے مذاکرات نے دم اس لیے توڑا کہ کانگریس نے، اکثریت حاصل کرنے کے زعم میں، لیگ کے وزیروں کو کابینہ میں شامل کرنے کے لیے اتنی سخت شرطیں رکھ دی تھیں جن کے پیش نظر یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے قائد خلیق الزماں کے سامنے انہیں مسترد کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ لہٰذا اندیشے پیدا ہوئے کہ کانگریس یوپی مسلم کے ساتھ اتحاد کرنے سے زیادہ دلچسپی اسے اپنے اندر ضم کر لینے میں ہے۔ مگر اس وقت کے حالات کے پیش نظر یہ مناسب رہا یا نہیں مگر ناممکن ضرور تھا۔ مسلم لیگ اتحاد کی شرط کے طور پر اپنے خاتمے کو کس طرح قبول کر سکتی تھی؟ ستم ظریفی دیکھئے کہ ہوا اس کا الٹا۔ کانگریس اور اس عمل کو مہمیز لگا دیا جس کا انجام ہندوستان کی تقسیم پر ہوا۔

ایس گوپال نہرو کے دفاع میں کہتے ہیں: 'جو بھی مفاہمت ہوتی وہ یہ بات عملاً تسلیم کرنے کی بنیاد پر ہوتی کہ سیاست اعلا طبقات کے درمیان جوڑ توڑ کا معاملہ ہے، اور یہ غیر فرقہ وارانہ ذہن رکھنے والے مسلمانوں کے ساتھ ایک طرح کی عہد شکنی ہوئی (اور) اس کا مطلب اس اقتصادی پروگرام کو ترک کرنا ہوتا جس پر جواہر لال نہرو اتنا زور دے رہے تھے۔ ایسی کوئی بھی مفاہمت پائیدار نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ لیگ کے پاس کوئی طویل مدتی اقتصادی یا سماجی مقصد نہیں تھا۔ اس کے رہنماؤں کے لئے دلچسپی کی واحد وجہ عہدوں کی امید تھی، اور یہ سب حاصل ہوتے ہی اختلافات کا اور گہرا ہونا لازمی تھا۔۔۔ ان حالات میں، خلیق الزماں کے ساتھ ہونے والی بات چیت کی کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی، اور اس کی ناکامی کے بعد بھی کوئی اہم معاملہ سامنے نہیں آیا'16 مگر مصنف کے اس تجزیے اور اخذ کردہ نتیجے کی تصدیق بعد میں ظاہر ہونے والے واقعات سے نہیں ہوتی۔

نہرو کی جانب سے پیش کردہ ایک جواز اس دلیل پر مبنی تھا کہ چوں کہ مخلوط وزارت تشکیل کے لئے باضابطہ معاہدہ نہیں کیا گیا تھا، اس لئے اس کے لئے ٹوٹ جانے سے پیدا شدہ نتائج کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ تکنیکی لحاظ سے یہ دلیل شاید

درست تھی، مگر یہ واضح طور پر ایک کھوکھلی اور قانون پسندانہ دلیل تھی کیوں کہ کانگریس حکومت بنانے پر رضامند ہوتی ہے تو اس میں لیگ بھی شامل ہوگی۔ دوسرا جواز جو اکثر پیش کیا جاتا ہے اس نظریاتی خلیج کا ہے جو لیگ اور کانگریس کو الگ کرتی تھی۔ اگر اس سے مراد ایک واضح طور پر فرقہ پرور (مسلم لیگ) اور ایک سیکولر فرض کی جانے والی پارٹی (کانگریس) کے درمیان اختلاف ہے تو پھر یہ دلیل کا بھی دیر تک اپنے پاؤں پر کھڑا رہ پانا مشکل ہے کیوں کہ کانگریس اس فرقہ پرور جماعت کے ساتھ الیکشن بازی کے لیے اتحاد کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ، جہاں تک نہرو کی جدت پسندانہ فرض کی جانے والی پالیسیوں (جو مجموعی طور پر کانگریس کی پالیسیاں نہیں تھیں) اور یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کی قدامت پسندی کے درمیان فرق کا سوال ہے تو اس کی تردید میں بھی کئی دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں: خلیق الزماں اور اسماعیل خاں کو عموماً کانگریس ذہن کا مسلمان سمجھا جاتا تھا اور یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے کئی ایسے اراکین تھے جن کے خیالات کانگریسیوں ہی طرح جدت پسندانہ تھے۔ یوپی مسلم لیگ کا سماجی کردار بھی اس وقت اس سے بہت کم رجعت پسندانہ تھا جتنا بعد میں ہو گیا۔ اس وقت بیشتر زمین دار، جو لیگ کے برائے نام رکن تھے، آزاد یا نیشنل ایگری کلچرسٹ پارٹی کے امیدواروں کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہے تھے۔ اس کے علاوہ، خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں بنگال کانگریس کے ان اراکین سے زیادہ قدامت پرست نہیں تھے جنھوں نے بٹائی داری اور قرضہ نظام کی اصلاحات کی جم کر مخالفت کی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ سردار پٹیل نہرو کی سوشلسٹ سوچ کے حامی نہیں تھے۔ آخر میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان نظریاتی فاصلہ اس بات کے بنیادی فرق پر مبنی ہے کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بارے میں دونوں کے تصور کے درمیان پایا جاتا ہے۔ 1937 میں حکومت سازی کے تناظر میں دیکھیں تو فرق حقیقی سے زیادہ محض فریب نظر معلوم ہوتا ہے جیسا کہ جناح نے اکتوبر 1937 میں، مسلم لیگ کے لکھنؤ میں منعقد 25 ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: 'بے خبر اور ناخواندہ عوام کے استحصال کے لیے بہت سے فقروں کا سرمایہ لٹایا جا رہا ہے۔ مختلف فقرے استعمال کیے جا رہے ہیں مثلاً پورن سوراج، خود حکمرانی، مکمل آزادی، ذمے دار حکومت، آزادی کا جوہر اور ڈومینین حیثیت بعض لوگ مکمل آزادی کی بات کرتے ہیں ... جو لوگ مکمل آزادی کا جتنا ذکر کرتے ہیں اس کے مفہوم سے اتنا ہی کم واقف ہیں۔ کیا گاندھی - ارون معاہدہ مکمل آزادی سے ہم آہنگ ہے؟ کیا حکومت حاصل کرنے سے پہلے طلب کی جانے والی یقین دہانیوں کو قبول کرنا اور صوبائی آئین پر عمل کرنا پورن سوراج سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور کیا ان یقین دہانیوں کا انکار اور حکومت برطانیہ کے وضع کردہ اور ہندوستان پر استعماری طاقت کی طرف سے جبراً تھوپے گئے صوبائی آئین کے تحت کام کرنا اور عہدے حاصل کرنا کانگریس پارٹی کی پالیسی، پروگراموں اور اعلانات کے مطابق ہے؟ یہ کاغذی اعلانات، یہ نعرے اور یہ بکڑے کے جالے ہمیں کہیں بھی نہیں لے جا سکتے۔ ہندوستان کو ضرورت ہے تو ایک پوری طرح متحدہ محاذ اور خلوص مقاصد کی، اور اس کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی کہ آپ اپنی حکومت کو کیا نام دیتے ہیں، جب تک کہ یہ حکومت عوام کی، عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے ہے۔' کانگریس اور لیگ کے درمیان اتحاد سے متعلق جناح کی بنیادی دلیل پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اقتدار سنبھالنے کے پس پشت کانگریس کی اصل

نیت جو بھی رہی ہو (اس میں حکومت کو توڑنا یقینی طور پر شامل نہیں تھا)، اس کے 1935 کے آئین کے تحت کام کرنے سے اتفاق کیا تھا، اور اس طرح، کم از کم اقتدار میں رہنے کی مدت کے دوران، وہ ایک آئینی تنظیم بن گئی تھی جس کی حیثیت وہی تھی جو برطانوی حکام اور تاج برطانیہ کی تھی۔ لہٰذا یہ دلیل بھی کہ ناقابل عبور اختلافات نے اتحاد کے امکان کو خارج کر دیا، بے بنیاد ہے۔

1937 کے انتخابات کے بعد کانگریس کی سرگرمیوں کا ایک ایک روز نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ 1939 کے وسط تک، جناح نے تمام صوبائی لیگوں پر آل انڈیا مسلم لیگ کی لگام کس دی تھی، اس حد تک کہ اب انہیں مرکزی پارٹی تنظیم سے مشورے کے بغیر کوئی بھی معاہدہ کرنے سے روکا جا سکتا تھا۔ صوبائی تو اب معلوم ہو چکا تھا کہ کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک کل ہند حیثیت، ایک سیاسی موقف اور تنظیم بہت ضروری چیزیں ہیں اور اب یہی چیزیں مسلم لیگ کے ایک مسلم جماعت کی حیثیت باقی رہنے کی بنیاد بن گئیں۔ اس سے جناح کو بڑی مدد ملی جو اب اپنے اثرات وسیع تر کرنے اور اس بات کو یقینی بنانے میں لگے تھے کہ ان کا سکہ صوبوں میں بھی چلنے لگے۔ یہ ایک نہایت اہم اور دوررس نتائج کے حامل پیش رفت تھی۔ یہ ایک اور اہم معاملہ تھا جو 1937 کی کوکھ سے پیدا ہوا۔

اس کے بعد نہرو کے عوامی رابطے کا پروگرام ایک نئے تنازعے کا باعث بن گیا۔ یہ بھی ایک اور نظریاتی طور پر درست مگر عملاً تباہ کن قدم ثابت ہوا۔

نہرو کا بار بار یہ کہنا کہ مسلم لیگ جیسی خواص پسند مسلم تنظیموں کے ساتھ معاہدوں کے زمانے اب لد گئے ہیں اور ایسے میں مسلمانوں کے ساتھ براہ راست عوامی رابطہ وقت کی ضرورت ہے، نظری طور پر ایک ایسا موقف ضرور تھی جسے ہندوستان میں سرگرم کوئی بھی سیاسی پارٹی اختیار کرے، مگر یہ وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں تھا، غیر حقیقت پسندانہ تھا؛ (مسلم ذہن اور تعینات کے غلط اندازے پر مبنی ہونے کی وجہ سے)؛ غیر مربوط تھا (کیوں کہ کانگریس اکثر اس سے بالکل مختلف موقف بھی اختیار کرتی رہی تھی)؛ اور فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ تھا۔ اس کا یہ الذکر نتیجہ اس طرح ظاہر ہوا کہ مسلم لیگ اس سے تحریک پاکر اور زیادہ غیر معقول باتیں کرنے لگی۔ اگر یہ سب وہی تھا جس پر کانگریس اب واقعی یقین رکھتی تھی تو پھر اسے شروع سے ہی مسلم لیگ کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ اسے 'ملاؤں اور سبز پرچموں' کے ساتھ مل کر ضمنی انتخابات لڑنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرنی چاہئے تھی۔ جیسا کہ اس نے کئی بار کہا۔ نہرو نے این اے شیر والی کی اس بات کے لئے سرزنش کی کہ انہوں نے انتخابی مہم کے لئے مولویوں کی مدد حاصل کرنے کی درخواست کی تھی مگر اس کے باوجود شیر والی علماء کی مدد حاصل کرنے سے باز نہیں رہے۔ کانگریس کو یہ ضرورت بھی محسوس نہیں کرنی چاہئے تھی کہ جمعیت العلماء اپنے ساتھ لانے کے لئے مولانا آزاد کا استعمال کرے، کیوں کہ آخر۔ ایک ایسی سوچ اور طریقے کے ساتھ مولویوں کا کیا سروکار ہو سکتا تھا جو اپنے آپ کو 'سماجی - اقتصادی اتحادوں' ناقابل تردید سیکولر کردار اور جدت پسندانہ

پروگراموں، پر مبنی قرار دیتا تھا، جس کی مثال نہرو کے مطابق، اسپین یا یورپ کے دیگر ملکوں میں پائی جاتی تھی۔

اس اتحاد کے خلاف ایک اور دلیل یہ تھی کہ لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے کا مطلب یہ ہوتا کہ کانگریس مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ لیکن پھر وہی کہ وہ اس کوتاہی کا مظاہرہ پہلے ہی کر چکی تھی یہ پہلے تو یہ کہ اس نے یوپی میں صرف 9 مسلم نشستوں پر الیکشن لڑنے کا اعلان کیا اور پھر بنگال میں ایک بھی مسلم نشست پر چناؤ نہ لڑنے کی بات کہی، جو اس 'سیکولر جماعت' کا حیرت انگیز رویہ تھا۔ کانگریس سے مسلمانوں کو اپنی صفوں میں شامل تو کیا، مگر عوامی سیاست کے اس زمانے میں بھی یہ بھی حلیف مسلم تنظیموں کے مدد کے ذریعے کہا گیا۔ عدم تعاون تحریک اور دوسری دہائی کے اوائل میں خلافت والے اس کے 'مددگار' تھے۔ گاندھی کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کی حمایت کرنا مسلمانوں کو اپنا ہم نوا بنانے کا چھوٹا راستہ ہے۔ یہ حکمت عملی ناکام رہی، مگر یہ ایک الگ بحث ہے۔ مہذب حکم عدولی کی تحریک کے دوران، کسی مضبوط مسلم حلیف کی ناموجودگی میں، مسلمانوں کی شرکت بہت کم ہوگئی تھی۔ تیسری اور چوتھی دہائیوں کے دوران، کانگریس نے مسلم کانگریسیوں سے زیادہ ان سے الگ مسلم تنظیموں مثلاً جمیعت علمائے ہند، احرار 17، مسلم یونیٹی بور، 18، مومن کانفرنس 19 وغیرہ پر زیادہ بھروسا کیا کہ اس طرح 1937 میں مسلم لیگ نے، کانگریس کے ساتھ غیر رسمی اتحاد کے تحت یوپی میں 29 نشستیں جیتی تھیں۔ اس اتحاد کو بڑھا کر ایک مخلوط حکومت تک لے جانا اس عمل کے عین مطابق ہوتا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اب معاملہ محض احتجاجی سیاست کا نہیں، قانون ساز اداروں اور سیاسی اقتدار کا تھا۔

تو پھر کانگریس لیگ کے ساتھ مفاہمت کیوں نہیں کرسکی؟ انتخابی اتحاد کو مسترد کرنے کی فوری وجہ ظاہر ہے کہ منتخب اراکین کی تعداد تھی کیوں کہ کانگریس کو اب قانون سازیہ میں اکثریت ہو چکی تھی۔ یہ انتخابی اتحاد کر لیا جاتا اگر کانگریس کو اس نتیجے کا یقین نہ ہوتا کیوں کہ اس وقت اسے یہ تعداد بڑھانے کے لیے کسی حلیف کی ضرورت درپیش ہوتی، اس سے قطع نظر کہ وہ بعد میں آئین کو اندر سے ناکام کرنے یا اس کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کرتی۔ جب اس نے اپنے بل بوتے پر اکثریت حاصل کر لی تو اسے ان انتخابی حلیفوں کے ساتھ جن کے اراکین کی تعداد کم تھی اور جن کی حمایت اب بے معنی ہو چکی تھی، کوئی رعایت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ خالص اور بے ملاوٹ اکثریتی پسندی کا مظاہرہ تھا، جس کا نظری طور پر تو شاید کوئی جواز تلاش کیا جا سکے مگر جو اپنے نتائج کے لحاظ سے تباہ کن ثابت ہوئی۔

ایسے میں کانگریس کے موقف کی کوئی قابل فہم اور معقول توجیہہ کہاں تلاش کی جائے؟ اسے جزوی طور پر کانگریس سیاسی نظریے میں تلاش کیا جاسکتا ہے جو سیکولرزم اور اکثریت پسندانہ جمہوریت کے ناموں سے معروف اس کے خود عائد کردہ اسلوب پر مبنی تھا۔ کانگریس کے مفروضہ سیکولرزم کا پلیٹ فارم، قومی پارٹی ہونے کے اس کے وعدے کی بنیاد کا حصہ تھا۔

'سیکولرزم' کی بحث

سیکولرزم کی اصطلاح سے متعلق بحث دراصل یورپ کی سماجی وسیاسی تاریخ کی ایک ضمنی پیداوارتھی (ہے) جو نوآبادیاتی علمی مباحث کے ساتھ براہ راست ہندوستان میں منتقل ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ماحول سے اس کی مطابقت شروع سے متنازعہ بن گئی۔ ہندو ایک فرقہ وارانہ شناخت کا حامل لفظ بن گیا، ایک ایسا عقیدہ یا عمل جو لازمی طور پر سیکولرزم کے خلاف ہو۔ ہندوستان کے ماہرین سیاسیات، سماجیات داں یا دیگر سرگرم ذہن سیکولرزم کے راست، مغربی تناظر سے متعلق مفہوم کی وضاحت نہ ٹھیک ٹھیک کر سکے یا نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے نزدیک اسے ہندوستان کے سماجی ماحول پر ٹھیک ٹھیک عائد نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ٹی این مدان کے مطابق یہ ہندوستانی مذہبی روایات سے میل نہیں کھاتی؛ پارتھا چٹرجی کا خیال ہے کہ سیکولرزم بطور نظریہ اکثریتی فرقہ پرستی سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک دلچسپ مٹھاس بھری سخت کلامی ہے جو بائیں بازو کی سوچ رکھنے والوں میں بہت عام ہے۔ اس کا ایک مضمر مفہوم یہ ہے کہ اقلیتی فرقہ پرستی زیادہ قابل قبول ہوسکتی ہے اور اسے سیکولر یا اسی طرح کا ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ بعض اور لوگ کہتے ہیں کہ چوں کہ ہندوستان فطرتاً ہندو ہے اس لیے وہ حقیقی معنی میں کبھی بھی سیکولر نہیں ہوسکتا۔ یہ اس ہندو یا 'سناتن' فکر کی اصل نوعیت کے بارے میں ایک بڑی غلط فہمی کی علامت ہے۔

تقسیم کے بعد سیاسی فکر، پلیٹ فارم یا نظریہ کے طور پر سیکولرزم کی کئی طرح کی اور بڑے پیمانے پر تعبیریں کی گئیں۔ بعض حلقے اسے ایک طرح کی مبہم سی رواداری سے تعبیر کرتے ہیں جس سے سیاسی زندگی میں مذہب کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف گاندھی نے کسی پس وپیش کے بغیر مذہبی محاورے بلکہ خود مذہب کا استعمال مساوات پر زور دانے کے لیے کیا تو دوسری طرف جواہر لال نہرو جیوں نے سیکولرزم کو ریاست کے بنیادی اصول کے طور پر اختیار کیا جسے مذہب سے لاتعلق رہنا لازمی ہے، حالاں کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ 'ہندوستان کے ہندو کلچر کے ہلکے نہروی جشن 3 کو اس خیال میں شامل کرنے کی بھی اجازت دی گئی'۔ اس تعبیر کو غلط اور تنگ ذہنی کے ساتھ اس طرح عمل میں لایا گیا جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ صرف کانگریس ہی 'سیکولر'، وہ چاہے جو بھی کرے، دوسرا کوئی نہیں۔

یہ دوسرے 'سیکولرزم کو 'سرودھرم سمبھاؤ' کے ہم معنی سمجھتے ہیں جس کا مطلب تمام مذاہب کی ہم آہنگی ہے۔ اس فقرے میں ترمیم کر کے دھرم کی جگہ 'پنتھ' کا لفظ رکھ دیا گیا جو اس کی روح کو زیادہ صحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ ایسے حلقے بھی ہیں جن کا دعوا ہے کہ مغرب 'سیکولرزم' کے جس تصور تک بہت بعد میں پہنچا اسے ہندوستان میں ایک زندہ فلسفیانہ روایت کے طور پر کئی الفیوں پہلے ہی حاصل کرلیا گیا تھا، جس سے درپردہ مراد یہ ہوتی ہے کہ فرقہ وارانہ صف آرائی کی ذمے داری مسلم فرقے پر عائد ہوتی ہے۔ 20

1937 کے انتخابات میں، کانگریس نے بہت کم مسلم نشستوں پر الیکشن لڑا تھا اور ان میں بھی اس کا صفایا ہوگیا

تھا، مگر وہ اب بھی اپنے آپ کو ایک قومی جماعت مانتی تھی کیوں کہ اب اس نے اپنی توجہات اپنے مفروضہ 'سیکولرزم' پر مرکوز کردی تھیں، جو اس کے لیے مسلم جماعت کا نعم البدل بن گیا تھا۔ یہ واقعہ ایک آلودہ سوچ تھی۔ یہ دلیل کہ صرف اس وجہ سے کہ پارٹی اپنے آپ کو سیکولر کہتی تھی وہ قومی بھی ہوگئی اور اس خود اختیار کردہ نام کی بدولت اس نے خود بہ خود تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کا منصب بھی حاصل کرلیا، اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ انتخابی نتائج کچھ اور کہہ رہے تھے، لائق یقین و اعتبار نہیں ہے۔ 'سیکولرزم' کے اس تصور نے محض تصور عمل نہیں، بعد میں کسی بھی عملی حقیقت سے زیادہ اہمیت اختیار کرلی۔ اس خود فریبانہ ذہن کی جھلک فیض پور کانگریس میں نہرو کے خطبے میں موجود تھی، 21 جہاں انہوں نے اپنا یہ مشہور دعوا پیش کیا تھا کہ ہندوستان میں صرف طاقتیں ہیں، ایک کانگریس جو 'قوم پرستی' کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری انگریز جو 'استعماریت' کے نمائندے ہیں۔ اس کے چند ماہ بعد، واضح طور پر جناح کے اس دعوے کے حوالے سے کہ مسلمانوں کی جماعت تیسری طاقت ہے، نہرو نے لکھا 22 کہ تیسرے فریق غیر اہم ہیں کیوں کانگریس ایک 'تاریخی تقدیر' کی حامل ہے؛ مگر یہ خود اختیار کردہ مفروضہ 'تقدیر' یقیناً ملک کو تقسیم کی جانب لے جانے والی نہیں ہوسکتی تھی۔

کانگریس کے سیکولر ہونے کے اس خود اختیار کردہ یقین نے نہرو کو، یوپی میں مسلم حلقوں میں کانگریس کی تباہ کن کارکردگی کی تعبیر ایک امید افزا سکون کے طور کرنے کا موقع دیا۔ انہوں نے کہا کہ 'اگرچہ یوپی میں کانگریس کے امیدوار ہار گئے مگر میں یہ نہیں مانتا کہ مسلم عوام پر کانگریس کا کوئی اثر نہیں ہے'، اور یہ کہ '۔۔۔۔۔اس موقعے پر ہماری ناکامی نے دکھادیا ہے کہ کامیابی بہ آسانی ہماری گرفت میں ہیں اور مسلم عوام زیادہ سے زیادہ (؟) کانگریس کی طرف رخ کررہے ہیں' 23۔ نہرو کے مطابق کانگریس کو مسلمانوں میں ناکامی کا منہ اس لیے دیکھنا پڑا کہ وہ ان میں کام نہیں کرسکتی۔ یہ بات شاید درست تھی، اور یہ بھی کہ لیگ کے پاس اپنی کوئی تنظیمی بنیاد بھی نہیں تھی (جو ایک درست رائے ہے)، مگر لیگ کے پاس ایک بنیاد ضرور تھی، حالاں کہ فرقہ وارانہ تھی اور اس پر صوبائی مفادات کے حامی تھے۔

نہرو سمجھتے تھے کہ یوپی کے مسلمان بے چینی اور جذباتی اتھل پتھل میں مبتلا ہیں۔ وہ غیر مؤثر فرقہ پرست قیادت سے اوب چکے ہیں اور فرقہ پرستی کا گھسا پٹا راستہ چھوڑ کر آزادی اور ترقی کی طاقتوں کی صفوں میں آنا چاہتے ہیں۔ ان انتخابات نے 'فرقہ پرستی کے عفریط کو دفن کرنے میں کچھ پیش رفت کی ہے۔' 24۔ اگر مسلمانوں کا ایک حلقہ کانگریس سے برگزشتہ تھا تو وہ دیہی نہیں بلکہ شہری مسلمان تھے۔ 'مجھے یقین ہے کہ آئندہ موقع پر ہم دیہی علاقوں میں ایک بھی مسلم نشست نہیں ہاریں گے، حالاں کہ میں شہری نشستوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا: 25۔ 1937 کے انتخابات کے بارے میں اس قسم کے امید پسندانہ غیر حقیقی اندازے کے پیش نظر یہ ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے کہ نہرو نے، یوپی میں، مسلم لیگ کے بغیر اقتدار سنبھالنے کے بارے میں ایسا سفاک رویہ کیوں اختیار کیا۔

کانگریس کے سیاسی نظریے کا دوسرا پہلو، جو اسے مسلم ووٹروں میں اپنی جماعت نہ ہونے کی واضح حقیقت کو

نظر انداز کرنے کی طرف لے گیا، اکثریتی حکومت کے وسٹ منسٹر ماڈل کی 'کانگریسی قسم' کے ساتھ اس کی وابستگی تھا، جو جس کے تحت قانون سازیہ میں ایک واضح اکثریت حکومت سازی کے لیے کافی ہوتی ہے یعنی تعداد ہی اقتدار کی واحد بنیاد ہوتی ہے، مگر ہندوستان میں ایک پیچیدہ تر سماجی ریاضی بھی عمل پذیر تھی۔ اس تصور کے سبب ہی نہرو اور کئی دیگر کانگریسیوں کو اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں موند لیں کہ علاحدہ حلقہ انتخاب کے نظام کے تحت (اور کانگریس نے 1935 کے ضابطوں کے تحت سیاسی کھیل کھیلنا منظور کر لیا تھا) قائم ہونے والی کسی بھی حکومت کو، جو خالصتاً اکثریت پر مبنی ہو اور معقول حد تک اقلیتوں کی نمائندگی (یعنی مسلم ممبران اسمبلی) سے محروم ہو اسے ایک غیر نمائندہ حکومت سمجھا جائے گا۔ کانگریس کے اندر اور باہر بھی ایسے بہت سے لوگ تھے (اب بھی ہیں) جن کے لیے یہ سیاسی ماڈل یو پی میں مسلمان کو ان کی 'جگہ' دکھانے کا مقصد کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔

جب کانگریس نے حکومت سیاسی اور اس طرح کہ تمام مسلم اراکین حزب اختلاف میں بیٹھے ہوئے تھے تو غیر کانگریسی مسلمانوں کو اچانک اس سنگین حقیقت کا سامنا ہوا کہ وہ پوری طرح بے طاقت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس پر یہ حقیقت ایک بجلی کی طرف منکشف ہو گئی کہ اگرچہ کانگریس کو ایک بھی مسلم نشست حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن (ہندو) نشستیں جیتنے کی بنیاد پر، کو وہ خود اپنی طاقت پر حکومت بنا سکتی تھی اور اس صورت میں، حکومت کا حصہ بننے کے لئے انہیں اپنی علاحدہ سیاسی شناخت سے دست بردار ہونا پڑتا مگر ایسا کر کے وہ انتخابات میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں متحدہ ہندوستان کے لئے ایک نہایت سنگین اور تباہ کن پیغام پوشیدہ تھا: یہ کہ: اکثریت پسندانہ ذہن کے حامل اور کانگریس کے زیر اقتدار ہندوستان میں مسلمانوں، اور کسی بھی سیاسی اقلیت کے لئے کوئی جگہ نہیں، جب تک کہ کانگریس اپنے آپ کو الگ تھلگ نہ پائے کہ تب وہ کسی سے بھی اتحاد کرنے کو تیار ہو گیا۔

مخلوط حکومت تشکیل نہ دینے کے فیصلے کے بارے میں، ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ ان انڈیا کہتی ہے: 'اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کانگریسی لیڈروں کا یہ فیصلہ نہایت غیر دانش مندانہ تھا اور اس کے نتائج تباہ کن ہونے لازمی تھے، اب مسلمانوں کو پوری طرح محسوس ہو گیا کہ ایک علاحدہ فرقے کی حیثیت سے ان کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہے۔ کانگریس کا انتباہ راہوں کے جدا ہونے کا اشارہ تھا، جو مرحلہ بہ مرحلہ، پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کی۔'

وی پی مینن اپنی کتاب ٹرانسفر آف پاور میں لکھتے ہیں: 'کانگریس نے خود اپنی طاقت پر متجانس وزارتیں تشکیل دینے کا فیصلہ کیا اور کانگریس پارٹی کے اراکین ہی میں سے مسلم وزیر منتخب کیے۔ یہ کانگریس اور لیگ کے درمیان ایک سنگین علاحدگی کا آغاز تھا اور جس نے غیر جانب دار مسلم رائے عامہ کو جناح کی حمایت پر مائل کر دیا۔26

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی، جو 1939 سے 1946 تک کانگریس کے صدر تھے، اپنی سیاسی سوانح حیات انڈیا ونس فریڈم میں 1937 کے انتخابات کے بعد کی صورت حال پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اگر یوپی مسلم لیگ کے تعاون کی پیش کش مان لی جاتی تو مسلم لیگ پارٹی عملاً کانگریس میں ضم ہو جاتی۔ جواہر لال کے اس اقدام نے مسلم لیگ کو یوپی میں ایک نئی زندگی دے دی... یوپی میں بھی لیگ کی کو از سر نو منظم کیا گیا۔ جناب جناح نے اس صورت حال کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ایک ایسا پلہ بولا جو آخر کار تقسیم تک جا پہنچا۔'27ے

بریچر، نہرو کی سوانح حیات پر مشتمل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: وہ انتخابات میں کانگریس کی جیت کا فوری اور سب سے دور رس نتائج کا حاصل اثر یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے ساتھ اس کی خلیج وسیع تر ہو گئی۔ کانگریس نے کامیابی نے زعم میں دیگر تمام سیاسی جماعتوں کی طرف ایک تحکمانہ رویہ اختیار کیا، ایک 'بہت بڑی ہمالیائی غلطی'؛ جس کے لئے آنے والے دنوں میں اسے بھاری قیمت چکانی تھی۔ اس کی بنیاد خود نہرو نے مارچ 1937 میں اپنے اس متکبرانہ بیان سے رکھی کہ" آج ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں، برطانوی سامراج اور ہندوستانی قوم پرستی جس کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے۔' جناح نے اس کا جواب دینے میں دیر نہیں کی: "نہیں، ایک تیسرا فریق بھی ہے، مسلمان" ۔ تاریخ ان کی تصدیق کرنے والی تھی، 28ے

شیوا راؤ نے 1969 میں، 1937 کے انتخابات کے حوالے سے لکھا تھا کہ یہ اہم بات تھی کہ جناح انتخابات کے بعد بھی ایک علاحدہ ریاست پاکستان کے بارے میں نہیں سوچ رہے تھے: '1937 میں انتخابات کے چند دن بعد ایک بیان میں انہوں نے اعلان کیا تھا، 'ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک پروقار مفاہمت کا استقبال مجھ سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا اور کوئی بھی نہیں جو مجھ سے زیادہ اس میں مدد کے لئے تیار ہو': اور وہ اپنی اس بات کو یہ سوال حل کرنے کے لئے گاندھی سے اپیل کرنے تک لے گئے۔ موخر الذکر کا رد عمل قدرے مایوس کن تھا: "چاہتا تو ہوں کہ کچھ کر سکوں، مگر میں حد درجہ بے بس ہوں۔ اتحاد میں میرا یقین ہمیشہ کی طرح روشن ہے؛ لیکن مجھے دن کا اجالا کہیں نظر نہیں آیا، صرف گھٹا ٹوپ اندھیرا نظر آتا ہے اور اس بے بسی کے عالم میں گڑگڑا کر اور خدا سے روشنی کے لئے دعا کرتا ہوں' 29ے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خدا اس وقت کانگریس کی راہ دانش مندی یا روشنی سے بھرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا، اور کانگریس میں اور کون تھا جسے گاندھی سے زیادہ اپنے خالق کی سماعتوں تک رسائی حاصل ہو۔ وہ بلا شبہ ایک پکے ہندو تھے، یقینی طور پر نہرو سے کہیں زیادہ، جس کا ذہن اور طریقہ (افسوس کہ زبان اور محاورہ بھی) ہندوستان کے عقیدے، فکر اور دانش کی عظیم روایت سے زیادہ در آمد شدہ مغربی تصورات سے روشنی حاصل کرتا تھا۔

لیگ کے وزیروں کو سخت ترین شرائط ماننے کے سوا اور کسی بھی طرح وزارت میں شامل کرنے سے کانگریس کے انکار سے دو نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے۔ پہلا، یوپی کے مسلم سیاست کاروں کو اپنی سیاسی حکمت عملی اور مقاصد دونوں پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ پہلے اجمالی طور پر ذکر کیا جا چکا ہے، اب یوپی کے مسلم لیگیوں نے، یہ دیکھ کر کہ کانگریس صوبائی سطح پر ان کے ساتھ کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتی، اپنی امیدیں جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ کر لیں، اس کل ہند مسلم اتحاد کے لئے جو ان کے نزدیک قومی اور صوبائی دونوں سطحوں پر کانگریس سے رعایت حاصل کرنے کے لئے ضروری

تھا۔ 1937 کے اواخر تک، کانگریس کے موقف کے سبب خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کی اتحاد سے متعلق تمام کوششیں بے اعتبار ٹھہر چکی تھیں، اور اس کے بعد صوبائی سطح پر سمجھوتے کی کوئی یقینی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ اب جناح نے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل کل ہند سطح پر تلاش کرنے کی کوششیں شروع کیں اور اس بات پر اصرار کرنے لگے کہ کانگریس باضابطہ طور پر مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی واحد جماعت تسلیم کرے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب تک مسلم لیگ کے 'واحد ترجمان' اور واحد مسلم جماعت ہونے کا موقف پوری طاقت کے ساتھ پیش نہیں کیا جاتا تب تک کانگریس، لیگ کو اس کا جائز حق بھی نہیں دے گی۔ اور اب وہی جناح اور خلیق الزماں، جنہوں نے کانگریس کے ساتھ باضابطہ اتحاد کے دنوں میں، ایک زمین دار مخالف موقف اختیار کر لیا تھا، اپنی اس روشنی سے ہٹ کر، سرمایہ اور مسلم اتحاد دونوں مقاصد کے تحت، یوپی کے بیشتر مسلم خواص کی جانب راغب ہو گئے۔

کانگریس دو سال سے اقتدار میں تھی۔ ان برسوں کے دوران، مسلمانوں کا عمومی تاثر کانگریس حکومت کے حق میں نہیں تھا۔ اس سے قطع نظر کہ لیگ کی جانب سے پیش کردہ تمام مثالیں صحیح تھیں یا غلط، مسلمانوں میں بالعموم یہ احساس گھر کرنے لگا تھا کہ 'ہندو راج' آ گیا ہے۔

اس کا ایک اور بہت سنگین نتیجہ بھی سامنے آیا۔ اس بات کا براہ راست تجربہ کرنے کے بعد کہ علاحدہ حلقہ انتخاب یا ترجیحی نمائندگی اقتدار حاصل کرنے یا اس کو لگام دینے کے معاملے میں بالکل غیر موثر ہے، یوپی کے مسلم سیاست کاروں نے ایک ایسی تدبیر پر غور کرنا شروع کیا جو سیاسی اقتدار تک رسائی کا زیادہ کارگر آلہ کار بن سکے۔ سوال یہ تھا کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی حدود کو پار کر کے ایک موثر آواز کس طرح حاصل کی جائے۔ اس تلاش نے ہی آخر کار 'برابری' کے تصور کی راہ دکھائی۔ اب یہ سوچا جانے لگا کہ کس کے پاس کتنی تعداد ہے اور جمہوریت میں منتخب اکثریت کی کیا اہمیت اوت متعلق ہے اس سے قطع نظر جو چیز بے انتہا اہم اور لازمی ہے وہ ہے اکثریت اور اقلیت کے درمیان موثر سیاسی برابری، اس لئے کہ صرف برابری ہی مسلمانوں کو ان کی مطلوبہ آواز دے سکتی تھی اور چوں کہ جناح کے نزدیک مسلمان ایک قوم تھے اس لئے یہی طریقہ اس قوم کی مناسب نمائندگی کا ضامن ہو سکتا تھا۔

کانگریس کے فیصلے ایک اور، زیادہ پائیدار نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ کانگریس کے 'سیکولر' ہونے کے خود اختیار کردہ دعوے پر ایسی سخت ضرب لگی جیسی پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ اب وہ حکمراں جماعت تھی اور یوپی میں پالیسی اور نظم و نسق اور کسی خلفشار کی صورت میں امن و امان برقرار رکھنے کی تمام تر اور راست ذمے داری اسی پر تھی؛ اور یوپی جیسے بڑے صوبے میں کچھ نہ کچھ گڑبڑی تو ہوتی ہی رہتی تھی اور ایسی صورت میں ساری گاج کانگریس پر ہی گرتی تھی۔ اب جب کہ تمام مسلم نمائندے حزب اختلاف میں بیٹھے ہوئے تھے، فرقہ وارانہ نوعیت کا کوئی مسئلہ سامنے آتے ہی، اس کانگریسی حکومت کے تمام اقدامات کا، کسی مسلم آورز کی غیر موجودگی میں، اور زیادہ مشکوک ہو جانا ناگزیر تھا۔ پھر یہ بھی کہ چوں کہ یوپی کے مسلم رائے دہندگان

کانگریس امیدواروں کو فیصلہ کن طور پر مسترد کر چکے تھے، کانگریس اگر اب بھی ایک قومی جماعت ہونے کی دعویدار تھی تو اس کے اس دعوے کی صداقت کا انحصار اس بات پر تھا کہ وہ فرقہ وارانہ اتحاد اور ہم آہنگی کے پلیٹ فارم سے اپنی وابستگی کا مظاہرہ کتنے موثر طور پر کرتی ہے۔ متحدہ صوبہ جات کے مسلمانوں کے لیے، کانگریس کے 'سیکولرزم' کے تمام دعووں کا عملی اور حقیقی ثبوت پیش کیا جانا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ، اگر حزب اختلاف کے مسلم سیاست کاروں کے ناگزیر الزاموں کو رد کیا جانا تھا، تو کانگریس پارٹی اور حکومت دونوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے معاملات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہو کر انجام دیں اور یہ دکھائی کہ وہ پوری سنجیدگی اور منصفانہ طریقے سے مکمل طور پر غیر جانب دار ہیں۔ مگر یہ یوپی میں اس وقت موجود حالات کے پیش نظر تقریباً ناممکن تھا۔

یہی وجہ ہے کہ یوپی کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اتحاد کے مذاکرات کی ناکامی تقسیم کے پہلے یوپی کی صوبائی سیاست کا ایک نہایت اہم موقع ثابت ہوگی۔ اس علاحدگی نے مسلم لیگ کی تنظیم اور سیاسی پروگراموں کی کایا پلٹ کردی اور کانگریس کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیا جس پر اس کی شبیہ داغ دار ہوتی چلی گئی اور یوپی کے مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ دور ہوتا چلا گیا۔ اس سے زیادہ بڑا فرق یہ ہوا کہ یہ واحد واقعہ تھا جس کے سائے اگلی دہائی کے دوران بھی ہندوستان کے سیاسی مباحث اور خطابے کے لہجے اور مواد پر پڑتے رہے، اور جس نے آخر کار 1947 میں ملک کی تقسیم میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

جہاں تک جناح کا معاملہ تھا، ان کا کام اب واضح ہو چکا تھا۔ 1937 کے انتخاب کے بعد کی صورت حال میں، مسلم لیگ کو مسلمانوں کی 'واحد ترجمان' جماعت کے طور پر فروغ دینا سب سے بڑی ضرورت بن گیا۔ اس کام میں جناح کو، بہت سے عوامل اور واقعات کے ساتھ ساتھ، کانگریس اور برطانوی حکومت دونوں کی پالیسیوں سے مدد ملی۔ جناح نے کہا تھا کہ 'سیاست شطرنج کی کھیل کی طرح کرنی چاہئے۔' اسی لئے انہوں نے محسوس کر لیا کہ انہیں سب سے پہلے مسلم لیگ کو ایک نئی طاقت دینی چاہئے۔ چوں کہ یہ وقت طلب کام تھا، اس لیے جناح نے تجویز پیش کی کہ لیگ کو کسی سے کوئی سمجھوتا کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہئے۔ تمام تر غور وفکر کے بعد آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ چوں کہ اصل اقتدار انگریزوں کے پاس ہے، اس لئے وہی ہیں جو اس اقتدار کا کچھ حصہ منتقل کر سکتے ہیں یا اس میں شرکت دے سکتے ہیں، اور اس لئے کانگریس کے ساتھ کوئی مفاہمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس درمیان، لیگ کے سامنے بہترین راستہ صرف یہی تھا کہ پہلے وہ اپنے آپ کو تنظیمی لحاظ سے مضبوط تر کرے اور کانگریس کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ اس کے بعد ہی شروع کیا جائے۔ لیکن اس سب کے ساتھ ہی، جناح کو برطانوی اقتدار کے خلاف آواز بھی اٹھاتے رہنا تھا اور یہ کام بھی انہوں نے کافی کیا۔

اب یہ دوسرا سوال کہ کانگریس اقتدار سنبھالے یا نہیں نمایاں ہو کر سامنے آ گیا اور جلد از جلد طے کئے جانے کا تقاضا کرنے لگا۔ یہاں اصل سوال گورنروں کے خصوصی اختیارات کے استعمال سے متعلق تھا۔ کانگریس رہنماؤں نے، اپنی

کل ہند کمیٹی کی ہدایات کے تحت، یہ ضمانت طلب کی کہ کوئی گورنر 1935 کے حکومت ہند ایکٹ 30 کی دفعہ 93 کے تحت حاصل خصوصی اختیارات استعمال نہیں کرے گا۔ یہ ایک مشکل مطالبہ تھا، اور چوں کہ ایسی کوئی ضمانت حاصل ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا، اس لیے کانگریس نے اقتدار سنبھالنے سے انکار کردیا۔

وائسرائے لن لتھگو کے لئے بالکل آغاز ہی میں لگنے والا دھچکا تھا۔ دوسری طرف ان صوبوں میں جہاں کانگریس کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی تھی وزارت سازی میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مارچ 1937 تک، گاندھی بے چین ہونے لگے، یہ سوچ کر کانگریس کہیں خود اپنی ہی بنائی ہوئی اندھی گلی میں پھنس کر تو نہیں رہ گئی ہے؟ لہٰذا انہوں نے کانگریس کو مشورہ دیا کہ گورنروں کے ساتھ متبادل امکانات کے بارے میں بات چیت، بہ الفاظ دیگر راہ فرار حاصل کرنے کا کوئی فارمولا تلاش کیا جائے۔ کانگریس کو خود اس کے ہی پیدا کردہ مخمصے میں پھنسا دیکھ کر سید وزیر حسن نے، جو مسلم لیگ نے سابقہ اجلاس کے صدر تھے، یہ بیان جاری کیا کہ چوں کہ اقلیتی وزارتیں تشکیل دینا قانون کی رو سے درست نہیں ہوگا اس لیے حکومت کو حکومت ہند ایکٹ کی دفعہ 93 کا استعمال کرنا چاہئے۔ مگر لن لتھگو کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا، کیوں کہ وہ کانگریس کو وہ راہ فرار نہیں دینا چاہتے تھے جس کی اسے شدید ضرورت تھی، اور وہ بھی انگریزوں کے عائد کردہ گورنر راج کی دفعہ 93 کے ذریعے۔

حکومت ہند ایکٹ، 1935 کے تحت صوبائی انتخابات کے مکمل ہوجانے کے بعد اصلاح کی فہرست میں اگلا معاملہ وفاق کا تھا۔ اس سلسلے میں رجواڑوں سے متعلق تجاویز نے ان ریاستوں کو خدشات سے دوچار کردیا۔ تاہم 1930 میں ہونے والی گول میز کانفرنس اور ایکٹ کی منظوری کے درمیان پانچ سال کے عرصے میں رجواڑوں کے رویے میں نمایاں تبدیلی آئی کہ اب وہ خودمختاری پر زیادہ زور دینے لگے۔ اس بات پر بھی اعتراضات کئے گئے کہ یہ ایکٹ ان کی داخلی اقتدار اعلا کی خلاف ورزی کرسکتا ہے۔ رجواڑوں نے مجوزہ وفاقی حکام کی جانب سے ہندوستانی ریاستوں کو دئے جانے والے کم سے کم اختیارات پر بھی سوالات قائم کئے۔ انہوں نے یہ خیال پیش کیا کہ وفاق کے ساتھ رجواڑوں کی وابستگی عملاً برطانوی حکومت کے ساتھ حلیفوں اور مساوی حیثیت والوں کے درمیان ایک دوطرفہ معاہدے کی صورت میں ہونی چاہیے۔ اگرچہ سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس دعوے کو سختی سے مسترد کردیا مگر یہ واضح تھا کہ رجواڑے اپنی خودمختار حیثیت اور اپنے اوپر برطانوی برتری کی اصل نوعیت کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھے۔

اس میں لازمی طور پر دیر لگتی تھی اور لن لتھگو 1939 کے اوائل تک ہی وہ شرائط وضع کرسکے جن پر ایکٹ کے ساتھ رجواڑوں کی وابستگی قابل قبول ہوسکتی۔ اسی دوران بعض رجواڑوں میں کانگریس کی حمایت یافتہ پرجا پریشد کے مظاہروں میں شدت آگئی تھی۔ بعض ایسی بڑی ریاستیں، جن کا وفاق کے ساتھ الحاق بہت اہم تھا، وفاقی خزانے میں اپنی آمدنی کے حصے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تشویش سے دوچار ہونے لگیں۔ لارڈ لوتھیان نے جو نومبر 1937 میں ان معاملات کا جائزہ لینے کے مشن پر ہندوستان آئے تھے، کہا کہ نہرو اس بات کے سخت خلاف تھے کیوں کہ وہ مرکز میں ایک ایسی حکومت بنانے کی

ذمے داری اٹھانے کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتے تھے جس میں مرکز کی بیشتر آمدنی دفاع کے لیے مختص ہو اور ان اصلاحات کے لیے پیسہ باقی ہی نہ بچے جن کے لیے وہ کانگریس کو پابند کر چکے تھے۔ مزید یہ کہ ان کے لیے حکومت میں رجواڑوں کی شرکت قابل قبول تھی جب تک وہ نمائندگی کے اداروں کو نہ اپنا لیں۔ لہٰذا لوتھیان کو محسوس ہوا کہ اگر وفاق کی تجاویز عمل کرنے میں عجلت کی گئی تو کانگریس کوئی بحران پیدا کر سکتی ہے۔

لن لتھگو اس کے باوجود پر امید تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر کانگریس کو ایک سال اور اقتدار میں برقرار رکھا جا سکے تو پھر وہ وفاق میں شامل ہونے سے انکار نہیں کر سکے گی۔ یہ واضح نہیں ہے کہ وہ اس نتیجے پر کس طرح پہنچے۔ اس دوران مسلمان یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر انہیں اپنی زمین پر قائم رہنا ہے، جو بہ حیثیت ایک جماعت ان کے لیے ضروری تھا، تو انہیں ہندو کانگریس کے مقابلے میں ایک موثر حزب اختلاف کی طرح عمل کرنا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں، آزادی کے بعد ہندوستان کے متحد رہنے کے امکانات کم سے کم ہوتے نظر آنے لگے، اور یہ سب اب تک کے کانگریس کے اقدامات اور اس کی پالیسیوں اور غلط فیصلوں کے سبب ہوا۔ وفاق کی مخالفت میں پوری بے باکی سے آواز اٹھانے کے بعد، جواہر لال نہرو نے اس سے آگے اور قدم بڑھایا اور اکتوبر 1937 میں شمالی اور شمال مغربی ہندوستان کے دورے کے موقع پر اس بات پر زور دیا کہ 'کانگریس کا حتمی مقصد موجودہ آئین کو اکھاڑ کر ختم کرنا اور اس کی جگہ انگریزوں کے علاحدگی پر مبنی آئین لانا ہے' 31۔ ان کی یہ پیش گوئی بھی اہم تھی کہ یورپ میں جنگ ناگزیر ہے جس سے کانگریس کو آزادی کے لیے لڑنے کا موقع ملے گا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ 'ہماری جدوجہد کا اہم ترین پہلو 32 اقتدار قبول کرنا نہیں بلکہ عوام کو منظم کرنا اور ان میں ''عوامی انقلاب کا ذہن'' پیدا کرنا ہے۔' انہوں نے کہا کہ 'مسلمانوں کو کانگریس کی صفوں میں شامل کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے۔' 33۔

اس کے برعکس، گاندھی کا موقف واضح اور کسی بھی طرح انتہا پسندانہ نہیں تھا۔ انہوں نے ذاتی طور پر اس تجویز کو منسوخ کر دیا کہ اگر مجوزہ 'وفاق نافذ کیا جائے' تو کانگریس وزراء کو مستعفی ہو جائیں، حالاں کہ لارڈ لوتھیان سے متعلق نہرو کے اعتراضات کے حامی تھے۔ گاندھی نے رجواڑوں کی حیثیت کے بارے میں نہرو کے اعتراضات کے سبب 'وفاق' کی مخالفت نہیں کی، انہیں دفاع اور امور خارجہ کے مختص کیے جانے پر کہیں زیادہ تشویش تھی اور انہوں نے یہ یقین دہانی طلب کی کہ دونوں معاملات مرکز سے مخصوص نہیں کیے جائیں گے۔

جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے، ان آزمائش کے دنوں میں ایک ایسی کل ہند شخصیت کی ان کی تلاش کو، جو ان کی قیادت کر سکے، محمد علی جناح میں، مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے نہ صرف ایک 'واحد ترجمان' بلکہ درحقیقت ایک 'واحد نجات دہندہ' بھی حاصل ہو گیا۔ جب جناح پہلی بار لن لتھگو سے ملے تو انہیں ذرا بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ آگے چل کر مسلمانوں پر جناح کی گرفت کتنی مضبوط ہونے والی ہے۔ وائسرائے نے ان دنوں تحریر کیا تھا کہ 'سچ کہوں تو مجھے ان کے اندر کوئی گہرا اعتماد محسوس نہیں ہوا اور مجھے شک ہے کہ وہ ان سیاست کاروں میں ہیں جو بس ذاتی کامیابی حاصل کر سکتا ہے

اور کچھ نہیں، اور جس کی اپنے پیروؤں کی وفاداری برقرار رکھ پانے کی صلاحیت پر بہت سے سوال قائم ہوتے ہیں'۔ 34 یہ 1937 تھا جب وائسرائے کا یہ سطحی اور جلد بازی میں کیا گیا تبصرہ یہ دیکھنے سے قطعاً محروم تھا کہ حالات تبدیل ہو رہے ہیں اور ان کے اندازے سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ۔ جناح تب تک قومی سطح پر مسلم سیاست کی محوری شخصیت بن چکے تھے۔

گاندھی کی طرح جناح نے بھی وفاق کی تجویز کی دوٹوک انداز میں مخالفت نہیں کی۔ اگرچہ انہوں نے قانون ساز یہ میں 1935 کے ایکٹ کے وفاق سے متعلق حصے پر حملے کرتے ہوئے اسے 'پوری طرح سڑا گلا' بنیادی طور پر برا اور مکمل طور پر ناقابل قبول، اور اس کے ساتھ ہی 'ناقابل عمل' قرار دیا تھا۔ مگر انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ فی نفسہ ایک کل ہند وفاق کے نہیں بلکہ صرف برطانوی حکومت کی پیش کردہ اسکیم کے خلاف ہیں (ہندوستان کی آئینی اصلاحات سے متعلق مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ پر قانون ساز اسمبلی میں 7 فروری 1935 کی تقریر)۔

ان ہندو رہنماؤں کی طرح، جن سے وائسرائے لن لتھگو نے ملاقات کی تھی، جناح نے بھی ان کے ساتھ ملاقات کے دوران سوچا کہ انہیں ایک وفاقی برطانوی ہندوستان کے ساتھ شروعات کرنی چاہیے۔ ریاستوں کو اس میں شامل کیا جاسکتا ہے بشرطے کہ ان کے نمائندے 'وسیع تر رائے دہندگی اور عوامی اداروں کی بنیاد پر' منتخب کیے جائیں۔ اگرچہ نے قدر لے تلخی کے ساتھ یہ شکایت بھی کی کہ لن لتھگو کی 'گاندھی سے ملاقات دانش مندانہ نہیں تھی' کیوں کہ ایسا کر کے انہوں نے 'کانگریس کا بھاؤ بہت بڑھا دیا' جس سے مسلمانوں کے امکانات کو صدمہ پہنچا۔ لن لتھگو نے اس ملاقات کے دوران جناح کو ہی زیادہ بولنے دیا۔ کیوں کہ ان کے لئے یہ پہلی ملاقات محض اندازہ کرنے کے لئے تھی، 35

انتخابات میں صرف کچھ عرصہ پہلے ہی اپنی جماعت کی ناکامی کے باوجود جناح پورے تکبر کے ساتھ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا حق ہونے کا دعوا کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا: 'جب میں دس کروڑ کہتا ہوں تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے 99 فی صد ہمارے ساتھ ہیں، ان لوگوں کو چھوڑ کر جو غدار، خبطی، فوق انسان یا پاگل ہیں'۔

چند ہفتے بعد (اکتوبر 1937، لکھنؤ اجلاس) جناح نے مسلم لیگ کے اجلاس میں کانگریس کی ایک خالصتاً 'ہندو پالیسی' پر عمل پیرا ہونے کے لئے سخت مذمت کی: 'ایک ایسی پالیسی جس کا نتیجہ 'خلفشار' تلخی، فرقہ وارانہ تصادم اور ہندوستان پر سامراج کی گرفت مضبوط تر ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا'، 36۔ جناح نے کہا کہ 'مسلمانوں کو کانگریس کی حکومت سے انصاف کی توقع ہے نہ غیر جانب داری کی اور یہ کہ ان (لیگ اور کانگریس) کے درمیان کوئی مفاہمت ممکن نہیں ہے'، 37۔ اس اجلاس میں، سر سکندر حیات نے لن لتھگو کے بقول 'ایک حیرانگیز اور اہم قدم' اٹھایا 38۔ انہوں (سکندر حیات) نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ پنجاب کی اپنی یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلم اراکین کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کا مشورہ

دیں گے۔ بنگال کے رہنما فضل الحق نے اسی طرز کا بیان بنگال کے مسلمانوں کے تعلق سے جاری کیا۔ اس لکھنؤ اجلاس میں وفاق کی اسکیم کی مذمت اور 'آزادی' کو مسلم لیگ کا آخری نصب العین قرار دینے سے متعلق ایک قرارداد بھی منظور کی گئی۔ یہ اجلاس مجموعی لحاظ سے جناح کے لئے ایک زبردست کامیابی کا مظہر ثابت ہوا۔ لیگ اب خاص طاقت ور ہو چکی تھی اور اپنی تنظیمی توسیع کے لئے سرگرم ہونے والی تھی۔ پنجاب اور بنگال کے وزرائے اعلا نے بھی اپنے آپ کو اب جناح کے دباؤں میں ایسے فیصلوں میں شرکت کے لئے مجبور پایا، جو مخلوط حکومت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے، جو وہ نہایت پس و پیش کے ساتھ ہی لے سکتے تھے۔

1938 کے اوائل میں، لن لتھگو نے شاہ کے نام ایک مکتوب میں ہندو۔ مسلم کشیدگی میں قابل لحاظ اضافے کا ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جناح مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے مسلم لیگ چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو جانے پر بہت خطرہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ وزراء سیاسی سرپرستی کے حامل ہونے کی حیثیت سے 'اپنے دوستوں کی مدد کرنے اور مخالفین کے لئے دشواریاں پیدا کرنے، کی طاقت رکھتے ہیں۔ جناح نے ردعمل میں مسلمانوں کو ابھارنا اور یہ کہنا شروع کیا کہ 'کانگریس کی یہ بڑھتی ہوئی طاقت مسلم تہذیب کے لئے خطرہ ہے،39۔

وائسرائے نے 16 اپریل 1938 کو ملاقات کی۔ اس مسلم رہنما (کہ اب تک جناح یہی ہو چکے تھے) نے وفاقی ہندوستان میں ہندو اکثریت پیدا کرنے والی کسی بھی اسکیم کی حمایت سے انکار کر دیا۔ ان کا ستارہ بلندی پر تھا اور اب اپنے اس موقف سے دور ہو گئے تھے جو انہوں نے وائسرائے کے ساتھ پہلی ملاقات کے دوران اختیار کیا تھا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کی کوششوں کے سبب فرقہ ورانہ رویے میں نمایاں سختی آ گئی تھی، مدراس جیسے صوبوں تک میں جو عموماً فرقہ وارانہ تنازعات سے بہت دور رہے تھے۔

اس دوران دونوں فریقوں کی عہدوں کے لیے کی جانے والی جوڑ توڑ کے سبب فرقہ وارانہ کشیدگی بہت بڑھ چکی تھی۔ مسلم لیگ نے کلکتہ میں کئی جلسے کیے جن میں جناح اور فضل الحق نے سخت تقریریں کیں، موخر الذکر نے وائسرائے پر گاندھی سے ملاقات کرنے کے لیے نکتہ چینی کی بلکہ گاندھی کو بے اصول طریقے سے سات صوبوں میں کانگریس حکومتوں کے طرز عمل پر اپنے اطمینان سے واقف کرانے کا الزام بھی لگایا۔ جولائی 1938 میں، لن لتھگو سکندر حیات سے ملاقات کی جنہوں نے اس بنیاد پر وفاق کو ملتوی کرنے کو کہا کہ اس کے جلد نفاذ کے نتیجے میں مرکز میں پیدا ہونے والی کانگریس کی اکثریت فوراً ہی دفاع اور امور خارجہ کو مرکزی امور کے طور پر مخصوص کئے جانے کو نشانہ بنائے گی۔ ان کی دلیل تھی کہ اس سے فوجی بھرتی کے معاملے میں پنجاب کو حاصل برتری ختم ہو جائے گی۔ اس کے بجائے انہوں نے ہندوستان چھ یا سات علاقائی اکائیوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی جن میں سے ایک علاقہ پاکستان ہو سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے مرکزی نمائندگی کے ایک ایسے پیچیدہ نظام کی خواہش ظاہر کی جس سے آئندہ

کسی بھی کل ہند قانون سازیہ میں ہندوؤں کی اکثریت کو روکا جاسکے۔ وائسرائے نے اس تمام خالصتاً بے سر پیر کی باتوں کو صبر و سکون سے سنا، کیوں کہ انگریز بری طرح چاہتے تھے مسلمان ان کے حلیف بن جائیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دونوں فرقے (ہندو اور مسلمان) ان سے دور ہو جائیں اور مل کر راج کی مخالفت کریں۔ انگریز جب تک ہندوستان میں رہے 1857 ان پر اپنا طویل سایہ ڈالتا رہا۔

لن لتھگو کو اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ 1935 کے ایکٹ میں ترمیم کے لیے دباؤ جاری رکھیں یا مزید انتظار کریں۔ انہوں نے تمام گورنروں کی رائے لی تھی اور اگر چہ ان کے خیالات میں اختلاف تھا مگر ان کا مجموعی طور پر ان کا یہ مشورہ تھا کہ صورت حال کے مزید ابتر ہونے کے اندیشے کے تحت اس معاملے کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے بعض معمولی ترمیمات کی جاسکتی تھیں مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وائسرائے کی رائے بھی اب یہی ہو رہی تھی کہ بہتر ہے یہ سارا معاملہ ملتوی کر دیا جائے، اور 1935 ایکٹ کو ترمیم کرنے سے متعلق ریاستوں اور برطانوی ہندوستان کے دباؤ کو روکے رکھا جائے۔

1938 کے نصف آخر کے دوران، دونوں فرقوں کے نمائندوں کے درمیان کئی بات چیت ہوئی۔ جناح تب تک کھلے عام کانگریس کی مذمت کرنے لگے تھے اور لیگ کی پالیسی کے طور پر 'کوئی مفاہمت ممکن نہیں' جیسے اعلانات کر رہے تھے۔ انہوں نے کارگزار وائسرائے (لارڈ بریبورن) کو تجویز کیا کہ مرکزی حکومت کو اسی طرح رہنے دیا جائے جیسی وہ ہے۔ اور یہ کہ انگریزوں کو چاہیے کہ وہ کانگریس والے صوبوں میں مسلمانوں کو تحفظ دیں اور مسلمان اس کے بدلے نئی دہلی میں برطانوی راج کی حفاظت کریں۔ اپنی زبردست ذہانت کی روشنی میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ یہ سب ممکن ہو سکتا ہے، مگر اس وقت محض ایک حربے کے طور پر ہی سہی سب تجویز ہی پیش کر دینا ان کے حق میں تھا۔

اسی زمانے میں، لن لتھگو نے جناح کے ساتھ خصوصی طور پر وفاق سے متعلق تجاویز کے بارے میں بات کی۔ مسلم رہنما نے کہا کہ وہ وفاق کے تصور کو پوری طرح مسترد تو نہیں کرتے مگر وفاق ایسا ہونا چاہیے جس میں مسلم اور ہندو ووٹوں میں مناسب توازن کو یقینی بنایا جائے تاکہ دونوں فرقوں کے درمیان ایک نمایاں اساوات قائم ہو سکے۔ وائسرائے نے دریافت کیا کہ اسے کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟ جناح کے ذہن علاقائی ووٹوں کے جوڑ توڑ اور علاقائی تقسیموں کے تال میل کا ایک نقشہ تھا جو انہوں نے پیش کیا، مگر جب ان سے ان تجاویز کے نتائج کے بارے میں بتانے پر اصرار کیا کہ ملک کی تقسیم کے بجائے اپنے ان خیالات کو ترجیح دیتے ہیں، اس پر وائسرائے نے جناح سے پوچھا کہ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مساوات انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد بھی باقی رہے گا تو جناح کا جواب تھا کہ اس میں بہت دشواری ہوگی۔ کیا وہ اس وقت چاہتے تھے کہ انگریز ملک میں برقرار رہیں؟ یہ ان چند استثنائی موقعوں میں سے ایک موقع تھا جب جناح بے لفظ ہو کر رہ گئے۔

بعد میں وائسرائے نے اس بات چیت کا ریکارڈ رکھنے کی غرض سے سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ زیٹ لینڈ

کے نام مکتوب میں لکھا: 'انہوں (جناح) نے قدرے پس و پیش کے ساتھ اعتراف کیا کہ یہ غالب گمان ہے کہ یہی موقف ابھر کر سامنے آنے والا ہے؟ مگر انہوں نے یہ بھی کہا کہ بہت سے لوگوں کا اعتماد ہم (انگریزوں) پر سے اٹھ رہا ہے۔ یہ بالکل واضح تھا ہم طے نہیں کر پاتے ہیں کہ ہم جا رہے ہیں یا نہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے صرف یہی ایک راستہ بچا ہے کہ وہ ہمیں اجتماعی طور پر زیادہ تیز آواز میں برا بھلا کہہ سکیں، کہیں کچھ تو اس لئے کہ ہم صورت حال سے نمٹنے میں اتنے بودے رہے ہیں اور کچھ اس لئے کہ مسلمان لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بھی اتنے ہی زیادہ قوم پرست اور اتنے ہی اچھے ہندوستانی ہیں جتنا کوئی اور فرقہ۔ درپردہ وہ زیادہ پرتعاون رویہ اختیار کر سکتے ہیں جب تک کہ ہم چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں کرتے'40

'دوسری طرف اگر ہم واقعی اس ملک پر اپنا اختیار چھوڑنے کا ذہن بنا لیں یہ بالکل واضح تھا کہ مسلمان احتجاج کرتے اور لڑنے کو تیار ہو جاتے، اور انہیں خاصا یقین تھا کہ اس کام میں وہ کانگریس کی طرف مدد کے لئے دیکھ سکتے تھے۔'41

'انگریزوں کے مساوی سلوک' کے بارے میں بس اتنا ہی۔ مارچ 1938 میں، خلیق الزماں نہرو، آزاد اور گاندھی کے درمیان طویل مراسلت ہوئی۔ اس پر خلیق الزماں کا تبصرہ تھا: 'یہ ایک دل چسپ صورت حال تھی کہ جب میں ان کے پیچھے پیچھے یہ التجا کرتا بھاگ رہا تھا کہ بحران کو ٹالیے تو انہوں نے میری ایک نہ سنی اور اب وہی باب ملال ایک بار پھر کھولنا چاہتے ہیں جو اس دوران پیچیدہ تر اور زیادہ ناقابل حل ہو گیا ہے۔'42

مولانا ابوالکلام بھی کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت کے لئے بے چین تھے، بنیادی طور پر کانگریس کے مفاد میں اور خود اپنے وقار کو بچانے کے لئے بھی، کیوں کہ لیگ کے ساتھ یہ 'جھگڑا' جاری رہنے سے 'فرقے میں ان کی اپنی حیثیت...... تضاد کی شکار ہو جائے گی۔'43

اس مرحلے پر، سبھاش چندر بوس نے، جو 1938 میں کانگریس کے صدر تھے، اس فرقہ وارانہ مسئلے میں ہاتھ ڈالا۔ فروری 1938 میں، کانگریس کی ہری پورا اجلاس کے بعد، انہوں نے جناح کے ساتھ مکتوبات کا تبادلہ کیا جس کے بعد مئی 1938 میں بمبئی میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ جناح سے ملاقات کے بعد 15 مئی 1938 کے اپنے پہلے مکتوب میں، بوس نے جناح سے ایک ایسی نمائندہ کمیٹی تجویز کریں جو مشترکہ طور پر شرائط کر کے مفاہمت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ جناح نے اپنے جواب میں انہیں یقین دلایا کہ اس معاملے کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے جس کا اجلاس جون 1938 میں ہونے والا تھا۔44 کانگریس کے نئے صدر کے ساتھ بات چیت کے دوران جناح نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ جو بھی مفاہمت ہو اسے کانگریس اور لیگ کے موقف کی واضح سمجھ پر مبنی ہونا چاہیے۔ پھر انہوں (جناح) نے کہا کہ ان کی بات چیت اب ان خطوط پر ہونی چاہیے کہ 'آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی

بااختیار اور نمائندہ جماعت کی حیثیت سے اور کانگریسی ہندو رائے عامہ کی بااختیار جماعت ہونے کی حیثیت سے، دو بڑے فرقوں کے درمیان معاہدے اور ہندو۔ مسلم سوال کے تصفیے کے طور پر ان شرطوں سے اتفاق کرتی ہیں۔ مزید بات چیت کے بعد اس مجوزہ فارمولے میں ترمیم کر کے، کانگریس کے صرف ہندوؤں کی نمائندگی کرنے کا ذکر نکال دیا گیا، اور اب اس کی عبارت یوں ہوگئی:

'کانگریس اور ہندوستان کے مسلمان کی بااختیار اور نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ ایک معاہدے کی صورت میں ہندو۔ مسلم تصفیے کی ان شرطوں سے اتفاق کرتی ہیں۔'47

بوس نے، اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہ مسلم لیگ مسلم رائے عامہ کے ایک بہت بڑے حصے کی نمائندہ جماعت ہے۔ یہ خیال ظاہر کیا کہ کانگریس اس معاملے میں ان مسلم تنظیموں سے صلاح ومشورے کی پابند ہے جو اس (کانگریس) کے ساتھ تعاون کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا: 'اگر دیگر گروپ یا اقلیتی تنظیمیں شریک ہوتی ہیں تو ان کے نمائندوں سے بھی صلاح مشورہ ضروری ہوگا'48 بات چیت اسی معاملے پر ختم ہوگئی۔ بعد میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے 4 جون 1938 کو بمبئی میں ہونے والے اجلاس میں، سبھاش بوس کے طور پر ایک قرارداد وضع کی گئی جس کے ذریعے کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ کی قیمت پر 'دیگر اقلیتوں' کی حمایت حاصل کرنا کانگریسی 'ایک بہت غیر منصفانہ قدم ہے'۔ اس کے مطابق جناح نے اگلے ہی دن، 5 جون 1938، کو بوس نے لکھا:

'میں اس مکتوب کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس منتظمہ کی متفقہ رائے منسلک کر رہا ہوں جیسا کہ میں نے اپنے مکتوب مورخہ 16 مئی میں اس تحریر کے حوالے سے جو کانگریس کی جانب سے آپ نے مجھے دی تھی اور آپ کے مکتوب مورخہ 15 مئی 1938 کے حوالے سے وعدہ کیا تھا'۔

قرارداد نمبر 1

آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس منتظمہ نے صدر جناب ایس بوس کے ذریعہ کانگریس کی جانب سے جناب جناح، صدر آل انڈیا مسلم لیگ کو 16 مئی کو دی گئی تحریر اور ان کے مکتوب مورخہ 15 مئی 1938 پر غور کیا اور پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لئے ہندو۔ مسلم تصفیے کے سوال پر کانگریس کے ساتھ بات چیت کرنا ممکن نہیں ہے سوا اس بنیاد کے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی بااختیار اور نمائندہ جماعت ہے۔

قرارداد نمبر 2

مجلس نے جناب گاندھی کے مکتوب مورخہ 22 مئی 1938 پر بھی کیا اور اس کی رائے ہے کہ کانگریس کی طرف سے مجوزہ کسی بھی کمیٹی میں کسی مسلمان کو شامل کیا جانا مناسب نہیں ہے۔

قرارداد نمبر 3

مجلس منتظمہ یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی اعلان شدہ پالسی ہے کہ دیگر تمام اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کو اس طرح تحفظ دیا جانا چاہیے کہ ان میں احساس تحفظ پیدا ہو ان کا اعتماد حاصل کیا جا سکے اور آل انڈیا مسلم لیگ جب بھی ضروری ہوگا ان اقلیتوں اور شریک کیے جانے والے دیگر گروپوں کے نمائندوں سے صلاح مشورہ کرے گی۔

بوس نے، پھر اس وقت واردھا میں تھے، کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اپنے رفقا سے صلاح مشورے اور غور وفکر کے بعد اس کا جواب دیا۔ ان کے مکتوب میں لیگ کی ہر قرارداد کو تفصیلی جواب کا مستحق سمجھا گیا تھا۔ انہوں نے کہا:

"پہلی قرارداد

اگرچہ قرارداد میں 'صرف' کی صفت استعمال نہیں کی گئی ہے۔ قرارداد کی زبان کہتی ہے کہ یہ صفت اس میں مضمر ہے۔ ایسی مسلم تنظیمیں موجود ہیں جو مسلم لیگ سے الگ رہ کر کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کانگریس کی پکی حامی ہیں۔ کانگریس کے لئے اس بات کو تسلیم کرنا نہ صرف ناممکن بلکہ نامناسب ہے جس کی لیگ کی کونسل کانگریس سے خواہش رکھتی ہے۔ لہذا ورکنگ کمیٹی کو امید ہے کہ لیگ کونسل کانگریس ناممکنات پر عمل کرنے کو نہیں کہے گی۔" کونسل کی قرارداد کے تعلق سے، مجھے خوف ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے لئے ان میں ظاہر کی گئی خواہش کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔" تیسری قرارداد کو ورکنگ کمیٹی سمجھنے سے قاصر ہے۔"

اس پر جناح کا جواب فوری، تیز وتند اور بالکل غیر مبہم تھا، لہجے اور مواد دونوں اعتبار سے، جس نے کانگریس صدر سبھاش بوس کی کوشش کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ اس میں دیگر امور کے علاوہ کہا گیا تھا،" آل انڈیا مسلم لیگ کو کانگریس سے کوئی چیز تسلیم کرانے یا منوانے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ بمبئی میں منظور شدہ مجلس منتظمہ کی قرارداد کو، مگر اس بات کے پیش نظر کہ لیگ کی حیثیت بلکہ دراصل اس کے پورے وجود پر پنڈت جواہر لال نہرو، (سابق) صدر کانگریس کی طرف سے، اپنے ایک بیان میں سوالیہ نشان لگائے تھے اور کہا تھا کہ 'ملک میں صرف دو فریق ہیں، برطانوی حکومت اور کانگریس'، مجلس منتظمہ کانگریس کو اس بنیاد سے مطلع کرنا سمجھتی ہے جس پر دونوں جماعتوں کی بات چیت آگے چل سکتی ہے۔'

اس طرح اس دشوار گذار راستے پر بوس کے تنہا سفر کا خاتمہ ہوا۔ تاہم اس دوران اور تقریباً اس کے ساتھ ہی، جناح اور گاندھی، اور نہرو کے ساتھ دو اہم مکتوبات کا تبادلہ ہوا جن کا مقصد متصادم نقاط نظر میں مصالحت پیدا کرنا تھا۔ آیئے پہلے نہرو کے ساتھ جناح کی مراسلت پر غور کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے، ایک ذرا پس منظر پر بات کر لی جائے۔ جناح کے بارے میں نہرو کی ذاتی رائے جو شدید ذاتی اور جذباتی وجذبات اور کراہت کے رویے سے بنی تھی، جناح کے ساتھ ان

کے تمام معاملات میں در آئی تھی۔ دونوں کئی لحاظ سے یکساں تھے: دونوں کا تعلق ذیلی سماجی طبقوں سے تھا۔ (جناح خوجہ مسلم تھے، نہرو کشمیری پنڈت)، دونوں تربیت یافتہ وکیل، انگریزیت زدہ، تنک مزاج اور گھمنڈی تھے اور 1920 میں جناح کے کانگریس چھوڑنے سے پہلے تک پارٹی کے رفیق تھے۔ مگر ان کی ایک دوسرے کے لئے ناپسندیدگی ذاتی، شدید، اور محسوس کی جاسکنے والی تھی۔ نہرو نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

'مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم کہ جناح سے کس طرح نباہ ہوسکتا ہے، جہاں تک نقطہ نظر کا تعلق ہے میں ان کے اور اپنے درمیان بہت کم چیزیں مشترک پاتا ہوں'۔ اس مراسلت اور ان برسوں پر دوبارہ نگاہ ڈالنا کسی بھی تبصرے سے کہیں زیادہ اس بات کو ظاہر کردیتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو کس قدر ناپسند کرتے تھے۔ نہرو نے 25 فروری 1938 کو بمبئی سے لکھے گئے اپنے مکتوب میں جارحانہ انداز سے لیگ کے وجود کی بنیادوں پر ہی سوالیہ نشان لگائے اور قدرے غیر مخلصانہ انداز سے لاعلمی کا دکھاوا کیا۔ انہوں نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ لکھا: 'مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ میں اب تک نہیں سمجھ پایا کہ تنازعے کے بنیادی امور آخر ہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سے ان کی وضاحت کرنے کی گزارش کرتا رہا ہوں۔ اب تک مجھے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں ملی ہے، اس کے بعد خواہ مخواہ کا یہ وعظ: 'لیکن جب ہم ملیں گے (اگر ملے تو) تو بات کیا کریں گے؟ ذمے دار لوگوں کے لئے جن کی پشت پر پوری پوری تنظیمیں ہوں ہوا میں باتیں کرنا مشکل ہے'۔

جناح کا جواب تھا: 'جب آپ کہتے ہیں کہ '' مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میں اب تک سمجھ نہیں پایا کہ تنازعے کے بنیادی امور آخر ہیں کیا۔''، تو مجھے آپ کی لاعلمی پر حیرت ہوتی ہے۔' مگر نہرو نے بھی بس نہیں کی، چند روز بعد ہی، 8 مارچ کو الہ آباد سے چھیڑنے والے انداز میں لکھا: 'میں آپ سے یہ بتانے کی گزارش پر گزارش کئے جارہا ہوں کہ آخر تنازعے کی وجوہات نہیں ہیں اور آپ اس پر اڑے ہوئے ہیں کہ یہ بات خطوط کے ذریعے نہیں کی جاسکتی'۔ اس پر جناح چڑھ گئے اور تیز لہجے میں جواب دیا جس میں طنز کا لہجہ چھپائے نہیں چھپتا۔: 'مجھے حیرت ہوتی ہے جب آپ یہ کہتے ہیں۔ کہ وہ کون سے امور ہیں اور مربوط ہیں۔ شاید آپ نے چودہ نکات کے بارے میں سنا ہو۔' پھر بھی، اس سارے معاملے کو پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو لگتا ہے کہ نہرو کے موقف میں ایک تسلسل تھا، وہ ان تمام برسوں کے دوران مسلسل یہ کہتے رہے تھے کہ 'فرقہ وارانہ مسئلہ' ہے ہی نہیں۔ اس کے پیش نظر لاہور کے نیو ٹائمز نے یکم مارچ 1938 کو یہ تبصرہ کیا، 'کانگریس نے اپنے آخری ہری پور اجلاس میں اقلیتوں کو ان کے مذہبی اور تہذیبی حقوق کا یقین دلانے کے لئے ایک قرارداد منظور کی تھی۔ یہ قرارداد نہرو نے پیش کی اور انہوں نے کہا کہ میں نے نام نہاد فرقہ وارانہ مسئلے کو دوربین کے ذریعے دیکھا ہے اور، اگر اس میں کچھ بھی نظر نہیں آتا، تو مجھے لگتا ہے کہ ان بنیادوں پر مبنی قرارداد پیش کرنا حد درجے کی بددیانتی ہے اگر کسی اقلیتی مسئلے کا وجود نہیں ہے تو اس قسم کی قرارداد منظور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ کوئی اقلیتی مسئلہ ہے ہی نہیں۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب نہرو نے یہ ظاہر نہ کیا ہو کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلے کو دیکھ یا سمجھنے سے پوری طرح قاصر ہیں۔ نہرو نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ 'فرقہ وارانہ مسئلہ محض متوسط یا اعلا طبقوں کی طرف سے قانون سازیہ میں چند نشستوں یا سرکاری ملازمتوں پر تقرر یا وزارتی منصب حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا گیا مسئلہ ہے۔'

نہرو کا کہنا تھا کہ کئی مطالبے ایسے ہیں جو آئین میں ترمیم کا تقاضا کرتے ہیں اور 'ہمیں یہ سب کرنے کا اختیار نہیں ہے' پھر یہ کہ 'چودہ نکات قدرے فرسودہ ہو چکے ہیں'، اور یہ کہ 'فرقہ وارانہ رعایتوں کو قوم دشمن قرار نہ دینا صاف جھوٹ ہوگا'۔ اس کے ساتھ ہی نہرو نے یہ بھی کہا، 'میری سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد جماعت تسلیم کرنے کا کیا مطلب ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ مسلم لیگ ایک اہم فرقہ پرست جماعت ہے اور ہم اس کے ساتھ اسی لحاظ سے معاملہ کررہے ہیں۔ مگر ہمیں ان تمام جماعتوں اور افراد سے معاملہ کرنا ہے جو ہمارے دائرے میں ہیں۔ ہم ان کی اہمیت یا امتیاز کا تعین نہیں کرتے۔' یہ واضح طور پر دھتکارنے والا رویہ تھا اور جناح کا جواب بھی اتنا ہی ترکی بہ ترکی، بپھرا ہوا اور نوک دار تھا۔ نہرو کے 6 اپریل کے کلکتہ سے بھیجے گئے مکتوب کے جواب جناح نے بمبئی سے اپنے 12 اپریل کے مکتوب میں دیا: 'آپ کا خط پڑھ کر مجھے حد درجہ تکلیف پہنچی۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ میرے خط کو صحیح صحیح سمجھ تک نہیں سکتے کیوں کہ جیسا آپ نے سچائی کے ساتھ کہا ہے، آپ کے ذہن پر بین الاقوامی صورت حال (حوالہ 1938) اور اس آنے والی تباہی کا احساس طاری ہے جس کے سائے دنیا پر منڈلارہے ہیں۔ لہذا آپ کی سوچ کا دائرہ ان حقیقتوں سے بالکل الگ ہے۔ جو ہمیں ہندوستان میں درپیش ہیں۔ جس نے جو باتیں آپ کو لکھی تھیں، آپ نے انہیں جس طرح توڑا مروڑا ہے اور میرے اس موقف کو جسے میں نے آپ کی گزارش پر پیش کیا تھا آپ نے جس طرح ایک بالکل غلط شکل دے دی ہے، اس پر میں صرف افسوس ہی ظاہر کرسکتا ہوں۔

'کیا کوئی آئینی تبدیلی ضروری ہے، کیا ہمیں یہ سب کسی معاہدے، مفاہمت وغیرہ کے ذریعے کرنا چاہیے، یہ سب میرے خیال میں بات چیت کے امور ہیں، مگر مجھے اس بات پر انتہائی افسوس ہے کہ آپ نے اپنے مکتوب میں اپنا فیصلہ سنا دیا ہے...... آپ کے لہجے اور زبان سے بھری رعونت اور شدت پسندانہ ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے جیسے کانگریس کوئی مقتدر اعلا طاقت ہے اور، اس کی علامت کے طور پر، آپ نے اپنی سرپرستی فرماتے ہوئے کہا ہے کہ ''یہ بات بالکل صاف ہے کہ مسلم لیگ ایک اہم فرقہ پرست جماعت ہے اور ہم اس کے ساتھ اس لحاظ سے معاملہ کررہے ہیں اور ان تمام جماعتوں اور افراد سے معاملہ کرنا ہے جو ہمارے دائرے میں آتے ہیں''۔ یہاں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ میری رائے میں، جیسا میں سرعام کئی بار کہہ چکا ہوں جب تک کانگریس مسلم لیگ کو مکمل برابری کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتی، اور اس کے تحت ہندو۔ مسلم تصفیے کے لئے بات چیت پر تیار نہیں ہوتی، تب تک ہمیں انتظار کرنا چاہیے اور اپنی اندرونی طاقت پر بھروسا کرنا چاہیے جو '' ان کی اہمیت یا امتیاز کا تعین'' کرے گی۔ آپ کی ذہنیت کے پیش نظر میرے لیے واقعی بہت مشکل ہے کہ آپ کو اپنا موقف اس سے

اور زیادہ سمجھا سکوں۔'

جناح نے اس مکتوب میں مزید لکھا کہ 'وہ ان امور پر مراسلت کے ذریعے کوئی بات چیت کرنا نہیں چاہتے'

یہ بڑی توجہ طلب بات ہے کہ اگرچہ اس وقت ہندوستان کی تیزی سے تبدیل ہونے والی صورت حال کے اسٹیج پر موجود تمام کردار۔ وائسرے، کانگریس کی تمام تر قیادت، گاندھی، سبھاش بوس اور دیگر تمام سیاسی جماعتیں، جناح اور ان کے حوالے سے مسلم لیگ کی مرکزیت کو مضمر طور پر تسلیم کرتے تھے، مگر پھر بھی نہرو کے لئے، تقریباً آخری لمحے تک، اس حقیقت کو تسلیم کرنا دشوار رہا۔ سبھاش بوس اور نہرو کے ساتھ جناح کی مراسلت اچانک اور بے نتیجہ ختم ہوگئی مگر ابھی گاندھی کو کچھ کہنا تھا:

محترم شری جناح

کھیر نے مجھے آپ کا پیغام پہنچایا۔ میں بہت چاہتا ہوں کہ کچھ کرسکوں مگر میں حد درجہ بے بس ہوں۔ اتحاد میں میرا یقین آج بھی ہمیشہ کی طرح روشن ہے، مگر مجھے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں کوئی اجالا بجھائی نہیں دیتا، اور میں اس پریشانی کے عالم میں خدا سے گڑگڑا کر روشنی کے لئے دعا کرتا ہوں۔'

آپ کا

ایم کے گاندھی

جناح نے بی جی۔کھیر 48 کو گاندھی کے پاس ہندوستان کی آزادی کے لیے مل کر کام کرنے اور ہندو مسلم اتحاد سے متعلق ایک پیغام دے کر بھیجا تھا۔ کھیر گاندھی جی سے جنوبی گجرات کے تیتھل میں ملے اور اس کے بعد گاندھی نے یہ خط جناح کو لکھا جو ان کی طرف سے ایک لاجواب ردعمل تھا۔ ''آپ میری خاموشی کے شکایت کرتے ہیں۔ میری خاموشی کی صحیح وجہ میرے نوٹس میں ہے۔ یقین کیجئے، دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے پاس لانے کے لئے جس لحہ میں کچھ کرسکوں گا، دنیا کی کوئی طاقت مجھے اسے کرنے سے نہیں روک سکے گا۔''

اس طرح شروع ہوا خط وکتابت کا یہ نیا دور کافی دنوں تک چلتا رہا۔ جناح 15 فروری 1938 کے اپنے خط میں متاسفانہ انداز میں یاد کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں'' آپ کہتے ہیں کہ جب 1915 میں آپ جنوبی افریقہ سے لوٹے تو ہر شخص نے مجھے کٹر قوم پرستوں میں سے ایک اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی امیدوں کے طور پر پیش کیا تھا اور آپ اب مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ'' کیا اب بھی میں وہی جناح ہوں۔'' اور اس طرح پوچھتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں، ''اگر آپ کہتے ہیں کہ اپنی تقریروں کے باوجود آپ ویسے ہیں تو میں آپ کی بات مان لوں گا۔ کیا آپ سوچتے ہیں کہ ایسا کہنے میں آپ حق بجانب ہیں۔' میں یہ کہنا پسند نہیں کروں گا کہ 1915 میں لوگوں نے آپ کے بارے میں کیا کہا تھا اور وہ آج آپ کے

بارے میں کیا کہتے اور سوچتے ہیں قوم پرستی پر کسی ایک شخص کی اجارہ داری نہیں ہے اور اس وقت اس کی توضیح کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن میں اس تنازع کو آگے بڑھانے کی خواہشات نہیں رکھتا۔ جہاں تک اتحاد کے قیام کے فارمولوں کو منضبط کرنے کی بات ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام خط و کتابت سے کیا جا سکتا ہے؟"

گاندھی کا جواب تھا، "جہاں تک میرا سوال ہے تو ہندو مسلم اتحاد پر ڈاکٹر انصاری میری رہنمائی کر رہے تھے اور اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اس طرح اب میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا ہے۔ اس لئے آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ کے مولانا صاحب کے درمیان بات چیت پہلی فرصت میں شروع ہو جانی چاہئے۔ اور ہر معاملے میں آپ مجھے اپنے ساتھ سمجھئے۔"

یہ بات واضح ہے کہ بات چیت کے لیے مولانا آزاد کو گاندھی کے متبادل کے طور پر بجھانا ایک بڑی غلطی تھی۔ مولانا جب کوئی ترجمان تو تھے نہیں جن کے ساتھ جناح کام کر پاتے۔ جناح کا جواب تو چند ہی دنوں میں 3 مارچ 1938 کو نئی دہلی سے ارسال کیا گیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا، "میں دیکھتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ چوں کہ 'ڈاکٹر انصاری نہیں ہیں' اس لیے آپ مولانا ابوالکلام آزاد کی ہدایت پر چلیں تو آپ کے رویے اور ذہنیت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ آپ اگر اس راستے پر چلتے ہیں تو پھر اس المیے کا اعادہ کریں گے جس کا اظہار آپ نے اپنی بے چارگی ظاہر کرتے وقت کیا تھا۔ کیوں کہ کٹر خیالات والے ڈاکٹر انصاری متفق نہیں تھے اور آپ کو کہنا پڑا کہ 'آپ راضی تھے لیکن آپ کہہ بھی کیا سکتے تھے؟ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ بات گول میز کانفرنس میں آپ کے جانے سے پہلے ہوئی تھی، گول میز کانفرنس میں آپ نے یہی المیہ دوہرایا تھا۔ جب آپ تو چاہے عارضی طور پر ہی سہی، کچھ شرائط تسلیم کرنے کے خواہش مند نظر آ رہے تھے، لیکن وہاں بھی آپ نے کہا کہ چوں کہ ہندوؤں کی خواہش نہیں ہے، اس لیے آپ لاچار ہیں، لیکن اگر ہندو اور مسلمان کسی سمجھوتے پر پہنچ جاتے ہیں تو کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ہم ایسی پوزیشن میں پہنچ گئے ہیں جہاں آپ آل انڈیا مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی باضابطہ نمائندہ تنظیم کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں، اس سلسلے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے، وہیں دوسری طرف آپ کانگریس اور ملک بھر کے ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ صرف اسی بنیاد پر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور راستہ نکالنے کی کوئی لیبل ڈھونڈ سکتے ہیں۔

واقعی میں آپ سے مل کر خوش ہو جاؤں گا اور اگر آپ چاہیں تو میں پنڈت جواہر لعل نہرو یا سبھاش چندر بوس سے مل کر بھی اتنا خوش ہو جاؤں گا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو آپ کے پاس بھیجے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس لیے میں آپ ہی سے ملنے کو ترجیح دوں گا۔" یہ خط و کتابت جاری رہی۔ گاندھی نے آٹھ مارچ کو ستیگاؤں سے ایک نوٹ بھیجا جس میں انہوں نے اپنی ذمہ داری سے آنا کانی کی۔ انہوں نے جناح کو لکھا "آپ کے خط سے پیدا دو سوالات محتاج جواب ہیں۔ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا اب مجھے روشنی دکھائی دے گئی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ

نہیں۔ آپ مجھ سے ملک بھر کے ہندوؤں اور کانگریس کی طرف سے بولنے کی امید رکھتے ہیں۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اس اتحاد میں کھرا نہیں اتر سکتا۔"

مولانا صاحب کا ایک ابتدائی ترجمان یا نمائندہ ہونے کا سوال کچھ دنوں تک یوں ہی رہا۔ جس پر گاندھی تو زور دیتے رہے اور جناح اس کی مذمت کرتے رہے۔ بدقسمتی سے ان دنوں وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ گاندھی نے اسی بنیاد پر اس بات پر زور دینا جاری رکھا کہ 'کانگریس صرف ہندو پارٹی نہیں تھی۔ اس لیے انہیں مسلم نمائندہ ادا کرنے کا حق تھا اور جناح بھی آخر تک اپنے موقف سے نہیں ہٹے۔ وہ اڑے ہی رہے کہ صرف وہی ہندوستانی مسلمانوں کے واحد ترجمان ہیں۔ گاندھی کے اپنے مقصد کی خاطر سرگرم رہنے سے یہ بحران بھی جاری رہا۔ 15 اپریل کو انہوں نے دہلی سے جناح کو لکھا۔'

"کسی بھی حالت میں کیا مولانا ابوالکلام آزاد میرے ساتھ بات چیت کرسکتے ہیں؟ براہ کرم واردھا کے پتے پر لکھیے، جہاں میں کل پہنچ رہا ہوں۔" اس پر جناح کا جواب تلخ تو تھا لیکن (اب بھی) اس جیسا نرم گوئی کا فقدان نہیں تھا۔ انہوں نے 16 اپریل کو کلکتہ سے فوراً جواب دیا؛ "میں آپ سے تنہا ملنے کو ہی ترجیح دوں گا۔"

--------- جناح

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت کے خطوط نویس سیاست داں کتنے محنتی اور مستقل مزاج ہوا کرتے تھے، حالاں کہ اس وقت ٹیلی گرام اور ٹیلی فون آگئے تھے۔ تاہم، اس معلومات کے باوجود کہ انگریزی حکومت کے اہلکار ڈاک کھول کر پڑھتے ہیں اس کی نقل تیار کرتے ہیں اور پوری جاسوسی کرنے کے بعد ہی خطوط وصول کنندہ تک پہنچاتے وہ لوگ ہمیشہ خط و کتابت ہی کا سہارا لیتے تھے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان دنوں تحریری خط ہی بالآخر مواصلات کا مہذب ذریعہ بنا ہوا تھا۔

اب ہمیں پھر اصل موضوع کی طرف واپس آنا چاہیے۔ جس وقت اہم شخصیات کے مابین خط و کتابت کا یہ سلسلہ چل رہا تھا، اور بھی کئی طاقتیں اپنا کام کررہی تھیں۔ مثال کے طور پر جون 1938 میں خلیق الزماں مولانا آزاد سے کلکتہ میں ملے اور محسوس کیا کہ سیاسی واقعات کے اس موڑ پر مولانا کافی تشویش میں تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ کانگریس۔ لیگ معاہدہ نہ ہونے سے مسلم معاشرے میں ان کی اپنی پوزیشن بھی کافی متاثر ہوگی۔ شاید اسی لئے انہوں نے خلیق الزماں سے پوچھا بھی کہ 'کیا وہ کوئی فارمولہ سمجھا سکتے ہیں جو کانگریس اور لیگ دونوں کو قابل قبول ہو، اس پر خلیق الزماں نے مولانا صاحب سے کہا تھا کہ 'مسلم لیگ کو بوس فارمولہ قابل قبول ہوسکتا تھا' بشرطیکہ وہ دیگر مسلم تنظیموں اور دیگر اقلیتوں کا سوال نہ اٹھائے۔ کانگریس، مسلم لیگ اور حکومت کے مابین بات چیت کے کئی ادوار کی ناکامی کے بعد، لیگ۔ کانگریس مذاکرات میں تعطل مسلمانوں کو بھی تکلیف دینے لگا تھا۔ بالخصوص ایسے میں جب کہ ان کو ہی دینے والا کوئی واضح نقطہ نظر موجود ہی نہیں تھا۔ وہ حیرت سے سوچنے لگے تھے کہ کیا لیگ کا حشر بھی تحریک کی ناکامی کے بعد خلافت کمیٹی کی طرح، یا پھر 1923 کی تحریک عدم

تعاون کے بکھر جانے کے بعد کانگریس کی طرح ہونے والا تو نہیں ہے؟

اس وقت ایسے پیچیدہ بحران کے درمیان، خلیق الزماں نے مسئلہ فلسطین پر صلاح ومشورہ کے لئے لندن اور قاہرہ کا دورہ کیا۔ وہ یکم نومبر 1938 کو لندن پہنچے مگر ان کے پاس مہینوں تک عرب نمائندہ وفد کی آمد کے انتظار کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ لندن میں ایک شام وہ لفظ 'پاکستان' کے موجد چودھری رحمت علی سے ملے۔ خلیق الزماں اس طرح سے اپنی ملاقات اور اس کے بعد کے ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے بالآخر مارچ 1940 کی پاکستان تجویز میں اپنا تعاون دیا' ''مسلم پاکستان کی اسکیم کے بارے میں بات کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس سوال پر گہرائی سے سوچا ہے بلکہ وہ اسے عملی جامہ پہنانے کے تئیں ایماندار بھی ہیں۔ ہمیں ہندوستان میں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ انہوں نے اس اسکیم توجہ کو پہلی گول میز کانفرنس میں مسلم لیڈروں کے سامنے رکھا لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی.......... اچھی گفتگو کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ میں اس خیال کا پہلے ہی حامی ہو چکا ہوں۔ لیکن میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں تقسیم ملک کے لئے لفظ 'پاکستان' کے استعمال کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیوں کہ ایک طرف تو اس سے انگریزوں کو شک ہو جائے گا اور دوسری طرف وہ مخالف ہو جائیں گے۔ ہم پاکستان کا نام بیچ میں لانے کے بجائے کیوں نہ اپنے علاقوں میں حق خود اختیاری کا دعوا کریں؟ لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہم نے اس موضوع پر بعد میں اور بھی گفتگو کی۔ ایک موقع پر میں نے ان سے اپنی اسکیم کی تفصیلات بھیجنے کو کیا جو انہوں نے 12 دسمبر 1938 کو لکھے اپنے خط میں فراہم کیں.......... میں نے وہ مسلم وفاق کے خیال کو ترجیح دی۔ بنگال اور آسام سمیت ایک مشرق میں اور دوسرا شمال مغربی ہندوستان میں جس میں سندھ، پنجاب اور شمال مغربی صوبہ سرحد شامل تھے۔'' 49

خلیق الزماں آگے کہتے ہیں۔ ''فلسطین کانفرنس کے تعطل کے بعد ہمارے لیے لندن میں مزید رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اور 10 مارچ 1939 کے آس پاس ہم نے ہندوستان واپس آنا کم کیا۔ چند دنوں کے بعد میں نے پریس میں یہ خبر پڑھی کہ ہندوستان کے انڈر سکریٹری ملک کا دورہ کر کے لوٹ آئے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ مسلم لیگ کی طاقت اور ہماری پالیسی کے بارے میں وہ کیا نظریہ لے کر لوٹے ہیں، اس کا پتہ لگانے کے لیے ان سے ملنا سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے اس پر رحمان سے تبادلۂ خیال کیا اور ہم نے انڈر سکریٹری کرنل میور ہیڈ سے ملاقات کا وقت مانگا جو 14 مارچ 1939 کا طے ہوا۔ بیٹھتے ہی میں نے ان سے پوچھا کہ ہمارے اختیارات اور پالیسیوں کے بارے میں ہمارے لیڈروں سے ملنے کے بعد انہوں نے کیا رائے قائم کی۔ میں یہاں کرنل میور ہیڈ سے ہوئی بات چیت کی کچھ تفصیلات پیش کرتا ہوں۔ (میرا خیال ہے کہ انڈر سکریٹری کا نام کرنل میور ہیڈ تھا۔)

کرنل میور ہیڈ: ''ہاں میں نے آپ کے لیڈروں سے ملاقات کی اور ان کی باتیں سنیں۔ ہمیں آپ کے ساتھ کافی ہمدردی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ مدد کیسے کریں۔ آپ کہتے ہیں کہ برطانوی جمہوریت آپ کو راس نہیں آتی اور میں

دیکھتا ہوں کہ یہ سچ ہے لیکن ہم کسی اور قسم کی جمہوریت کے بارے میں نہیں جانتے۔ ہم جو اصول اپنے ملک میں نافذ کرتے ہیں وہی ہندوستان میں بھی نافذ کرتے ہیں اور آپ کوئی متبادل نہیں بجھاتے۔''

جوں ہی انہوں نے جملہ ختم کیا، میں اٹھ کر ہندوستان کے نقشے کے پاس چلا گیا جو کمرے میں لٹک رہا تھا، اور دو علاقوں-شمال مغرب اور مشرق کی طرف اشارہ کیا، جو کہ مسلم علاقے تھے اور جنہیں ملک کے بقیہ حصوں سے الگ کیا جاسکتا تھا۔ جس میں اپنی جگہ پر واپس آیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: ''ہاں! یہ ایک متبادل ہے۔ کیا آپ نے اس بارے میں لارڈ، زیٹ لینڈ سے گفتگو کی۔''

میں : نہیں، لارڈ زیٹ لینڈ سے، ہم کابوئینل سکریٹری میکڈانلڈ سے ملے تھے۔

کرنل میور ہیڈ: آپ ان سے کیوں نہیں ملتے؟

میں : میں 21 مارچ کو ہندوستان کے لیے روانہ ہو رہا ہوں اور میں نہیں جانتا کہ ان کے پاس ہم سے ملاقات کا وقت ہوگا؟ نہیں؟

کرنل میور ہیڈ: ارے نہیں، میں کوشش کروں گا کہ وہ آپ کو وقت دیں۔ آپ ان کو صرف ایک خط لکھئے، وقت مل جائے گا۔

اس کے بعد ہم وہاں سے چلنے کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دروازے تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ اس قت میں نے ان سے کہا، ''میں نہیں جانتا کہ وہ (لارڈ زیٹ لینڈ) ہمارے بارے میں جانتے ہیں۔''

''اس کی فکر مت کیجئے'' ان کا جواب مناسب تھا۔'ان کے سامنے ہر چیز ہوگی۔' تو گویا انگریزی رویے کے بارے میں میرا خیال صحیح ثابت ہو رہا تھا۔

ملاقات کے لیے ہمارے خط کے جواب میں ہمیں مطلع کیا گیا کہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، میرے انگلینڈ سے ہندوستان کے لیے روانہ ہونے سے ٹھیک ایک روز قبل 20 مارچ کی دوپہر کو ہم سے ملیں گے۔

لارڈ زیٹ لینڈ بہت کھلے دل سے ملے، اور موسم کے بارے میں تبادلہ خیال کے بعد سب نے ان کے سامنے گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں سے زیادہ وقفے پر محیط مسلمانوں سے انگریزی حکومتوں کے تعلقات کے ایک مختصر جائزے سے شروعات کی اور اسے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 تک لے گیا۔ اس کے بعد میں نے کہا'' اب آپ ہندوستان کو مزید اختیارات دے رہے ہیں۔ لیکن جب تک آپ یہ کام پورا کریں گے۔ اس وقت تک دس کروڑ مسلمان خود کو اکثریت کے غلام کی حیثیت سے پائیں گے۔'' اس پر انہوں

نے مجھے درمیان میں ٹوکا اور وہی جملہ ادا کیا جو کہ انڈر سکریٹری نے ادا کیا، یعنی" لیکن آپ کوئی متبادل نہیں بجھاتے۔" مجھے اپنے دفاع کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیوں کہ میں نے متبادل تو کرنل میور ہیڈ کے سامنے پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ اس لیے انہوں نے جوں ہی متبادل کا سوال اٹھایا، میں نے فوراً جواب دیا کہ' آپ ملک کے بقیہ حصے سے مسلم علاقوں کو تقسیم کر سکتے ہیں جو بقیہ حصے سے آزاد ہوں گے اور انہیں شامل کئے بغیر ہندوستانی صوبوں کے فیڈریشن کی اپنی اسکیم جاری رکھ سکتے ہیں۔'

لارڈ زیٹ لینڈ: صوبوں کا کیا ہوگا؟

میں: انہیں اپنی جغرافیائی صورت حال کی پابندی کرنی ہوگی۔ اگر وہ ہندو علاقوں میں ہیں تو انہیں ان کے ساتھ جانا چاہئے اور اگر وہ مسلم علاقے میں ہیں تو انہیں اس کے ساتھ جانا چاہئے۔

لارڈ زیٹ لینڈ: دفاع کے امور کا کیا ہوگا؟

میں: کس وقت کے لیے مائی لارڈ؟ اگر آپ اس وقت کے لیے جاننا چاہتے ہیں جب آپ کسی نہ کسی شکل میں ہندوستان کی انتظامیہ سے منسلک ہوں گے، تو اس وقت ہندوستان کے دفاع میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ آپ اپنی ضرورت کے مطابق ان دونوں علاقوں کی فوج کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اگر آپ اس وقت کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جب ملک کی انتظامیہ کے ساتھ آپ کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، تو پھر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ یہ سوال میرے سامنے نہ رکھیں۔ کیوں کہ ایسے میں اللہ ہی جانتا ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔

لارڈ زیٹ لینڈ: کیا آپ مجھ سے جواب چاہتے ہیں؟

میں: آپ کے سامنے اتنے بڑے سوال کا ذکر کر کے جواب کے لیے کہنا میرے لیے دیدہ دلیری کی بات ہوگی۔ میں آپ کو مطلع کر چکا ہوں کہ مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس میں مسلمانوں کا یہی موقف رہے گا۔ آپ کے پاس اس سلسلے میں سوچنے کے لیے وافر وقت ہے۔

ہم ڈیڑھ گھنٹے تک لارڈ زیٹ لینڈ کے ساتھ رہے اور جب وہ جانے کے لیے اٹھے تو انہوں نے اطلاع دی کہ انہیں کابینہ کی ایک اہم میٹنگ میں جانا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ عالمی حالات بہت سنگین ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ مستقبل قریب میں جنگ بھی ہو سکتی ہے۔

خلیق الزماں 12 مئی 1939 کو بمبئی لوٹ آئے اور اسی شام وہ جناح سے ملے اور انہیں انڈر سکریٹری اور سکریٹری آف اسٹیٹ سے ہوئی بات چیت کی تمام تفصیلات بتائیں۔

1937 سے 1939 تک کانگریس وزارت-نتیجہ

تقریباً دو سال تک کانگریس کی وزارتیں اپنے کام میں مصروف رہیں، مگر وہ تحفظ فراہم کرنے والی طاقت تک حاصل نہیں کر سکیں۔ ادھر مسلم لیگ نے شمالی ہند میں مسلم حمایت کی حصولیابی اور اس کے استحکام کی سمت میں کام شروع کر دیا۔ بنیادی طور پر اس کی وجہ اس دور میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات اور ان سے پیدا غصہ تھا۔ اور یہ فسادات کانگریسی دور حکومت ہی میں ہوئے تھے۔ واضح ہے کہ ان فسادات کی تمام تر ذمے داری کانگریس پر ڈالنا جائز نہیں ہے، لیکن چوں کہ وہ برسر اقتدار تھی۔ اور اسے یعنی صرف کانگریس کو ہی جواب دینا تھا۔ لہٰذا پورے متحدہ صوبے میں جو کچھ ہوا اس کے لیے کانگریس کو ہی ذمے دار ٹھہرایا جائے گا۔

جس وقت کانگریس وزارتوں نے استعفاء دیا۔ اس وقت تک کی حکومت کے دوران ہوئے فرقہ وارانہ تشدد اور کشیدگی اس کے کھاتے میں لکھ دی گئی تھی۔ ان فسادات سے ابھرے عوامی غصے کے سبب متحدہ صوبے کے مسلمانوں کے لیے لیگ جیسی فرقہ پرست جماعت میں اپنا اعتماد ظاہر کرنا آسان ہو گیا۔ کانگریس کے جو بناوٹ میں بنیادی طور پر ہندو ہی تھی، اقتدار میں آنے کے سبب ہندوؤں میں اندازے کے مطابق ایک جارحانہ ذہنیت پیدا ہو گئی اور پھر نتیجتاً اس کا امکان بہت کم ہو گیا کہ متحدہ صوبے کے مسلمان کسی قسم کی راحت یا پناہ کے لیے کانگریس کی طرف دیکھیں گے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے مسلسل آواز اٹھانے کے سبب اور فرقہ وارانہ فسادات سے نمٹنے کے طریقے پر کانگریس حکومت کی شدید مگر جائز تنقید سے مسلم لیگ نے مسلمانوں کو کانگریس کے تئیں مشکوک بھی کر دیا اور اپنے خیمے کی طرف کھینچ بھی لیا۔

حکومت سازی کی اس سچائی نے کانگریس کی پوزیشن اتنی نازک اس لیے بنا دی کیوں کہ اب وہ حکومت 50 تھے۔ اور اس وجہ سے فرقہ وارانہ طور پر حساس متحدہ صوبے میں کانگریس پر فسادات کو کنٹرول نہ کر پانے کا الزام لگانا آسان تھا۔ اس کے نتیجے میں کانگریس کے برسر اقتدار رہنے سے مسلم لیگ کے ہاتھوں میں ایک زبردست ہتھیار آ گیا۔ تیزی سے تقسیم ہوئے اس دو جماعتی نظام میں، جیسا کہ متحدہ صوبے میں 1937 کے عام انتخابات کے بعد قائم ہوا تھا، دراصل اپوزیشن پوری طرح مسلمان تھے اور جو پارٹی حکومت میں تھی وہ پوری طرح ہندو تھی۔ اس الزام کے بہت سنگین نتائج برآمد ہوئے۔ وہ ایسے تباہ کن تھے کہ تقسیم کی موجودہ خندق اور وسیع ہو گئی۔ وہی خندق جسے واقعات، نادیدہ ضد اور انگریز حکومت کی منافرت نے کھود کر تیار کیا تھا۔

فرقہ وارانہ فسادات نے ایک طرف متحدہ صوبے کے مسلمانوں کے درمیان کانگریس کا اثر و رسوخ ختم کر دیا تو دوسری طرف مسلمانوں میں لیگ کے اثرات میں زبردست اضافہ ہوا۔ ایسا دو طرح سے ہوا: فسادات نے مسلمانوں تک

پہنچنے کی کانگریس کی کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے، منفی اثر ڈالا اور لیگ نے کانگریس کے ذریعے فسادات سے نمٹنے کے طریقوں کی مخالفت کر کے مسلمانوں میں کانگریس کی بنیاد کمزور کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ دوسری طرف فسادات نے لیگ کو مسلمانوں کے رہنما کے طور پر پیش کرنے میں مدد دی۔ یہ فسادات گاؤں اور چھوٹے قصبوں میں ہوئے تھے۔ جن سے بیشتر مسلم کاشتکار اور کاشتکار متاثر ہوئے۔ اس صورت حال نے لیگ کو مسلمانوں کے لیے کھڑے ہونے، ان کی طرف سے بولنے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کا ایک سنہرہ موقع دے دیا۔ یہ موقع لیگ کے لیے بہت اہم تھا کیوں کہ ابھی تک وہ سماجی طور پر اور پروگراموں کے نقطۂ نظر سے ایک روایتی تنظیم ہی رہی ہے۔ اگر مسلم لیگ آس پاس نہیں ہوئی تو مقامی کانگریسیوں کی کارگزاریوں فسادات کے تعلق سے کانگریسی لیڈروں کی بیان بازیوں اور تفریق کے امکانات کی مثالوں کے باوجود کانگریس۔ مسلم تعلقات کشیدہ نہیں ہوتے۔ لیگ کے ذریعے کانگریس کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کا مقصد دراصل لیگ اور مسلمانوں کے مابین رشتہ قائم کرنا تھا۔ وہ مسلم لیگ ہی تھی جس نے حکومت کی ناکامی کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کیا۔ لیکن اسمبلی میں مداخلت کرنے سے کہیں زیادہ ان کا متحدہ صوبے کے گاؤں اور قصبوں 51 میں (لیگ کا) وہ پروپیگنڈہ تھا جس میں اس نے کانگریس کے تئیں مسلم رویہ کو اور مضبوط کیا۔ متحدہ صوبے میں دیر تک اور دور تک ہونے والا فرقہ وارانہ تشدد کر کے پہلا تجربہ نہیں تھا لیکن اب تو وہ ایک اہم پہلو رہ گیا تھا۔ 39-1937 کے ان فسادات کو جس بات نے ایک نیا رخ دیا وہ تھی پہلی بار صوبے میں کانگریس حکومت کی موجودگی۔ کیوں کہ اس وقت تقریباً ہر منتخب مسلمان اپوزیشن میں بیٹھا تھا، فرقہ وارانہ تشدد کا ہر واقعہ کانگریس کو مجرم ٹھہرائے جانے اور اس کے خلاف ماحول سازی کا سبب بن گیا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی مخلوط حکومت میں فرقہ وارانہ فسادات کے امکانات کو ٹالا نہیں جاسکتا۔ لیکن اگر اتحاد ہوتا تو مسلم لیگ پر بھی اس کی ذمے داری عائد ہوجاتی۔ اس کے علاوہ مسلم نمائندوں کا ایک بڑا حصہ حکومت میں ہونے کی وجہ سے قطعی طور پر حکومت پر متعصب ہونے کی الزام تراشی سے اسے بچانے کی کوشش کرتا۔ اس سے حکومت کی پوزیشن اتنی نازک نہیں ہوئی۔ جو حالات تھے اور جو واقعات ہوئے تھے۔ اس کے تناظر میں متحدہ صوبے کے مسلمانوں کو فسادات کا تجربہ ہوا۔ ان تمام باتوں نے ایک غیر مذہبی نقطۂ نظر کے امکانات کو تقریباً ناممکن ہی بنا ڈالا۔

کانگریس نے ان حالات کے ردعمل اور اصلاحی قدم کے طور پر ایک ''مسلم عوامی رابطہ مہم'' چلائی۔ یہ قدم انگریزی حکومت کے خلاف متحدہ جدوجہد میں مسلمانوں کو یکجا کرنے کی یہ آخری اور سنجیدہ کوشش تھی۔ یہ سب کچھ اپوزیشن میں مسلم لیگ کی موجودگی اور اس وقت کے فرقہ وارانہ مسئلے کی پیچیدگی کو ذہن میں رکھے بغیر ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ صرف نہرو کے اندازوں پر مبنی تھا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ کانگریس کی اس عوامی رابطہ مہم کا نتیجہ بھی جناح کو حاصل مسلم حمایت میں اضافہ کی شکل میں سامنے آیا۔ بلا شبہ جواہر لال نہرو اور اس پروگرام کے دیگر حامیوں نے متعدد دشواریوں کا سامنا کیا۔ جن میں جناح کی جانب سے سخت احتجاج ان کے کانگریسی حامیوں کا ہلکا پھلکا ردعمل اور فسادات سے ابھری ایک گہری نفرت، یہ سب کچھ شامل تھا۔ مگر یہ مسائل نہ تو نئے تھے اور نہ ہی ایسے کہ ان سے نمٹا نہیں جا سکتا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود مسلم لیگ میں اب بھی بہت سی خامیاں تھیں۔ وہ منقسم تھی اور مقابلتاً کم منظم تھی۔ اس کے علاوہ جناح کے ساتھ اب بھی پنجاب، متحدہ صوبہ اور بنگال کے طاقت ور صوبائی گروپوں کی پوری پوری وفاداری نہیں تھی۔ ان پہلوؤں کے تناظر میں بھی عوامی رابطہ کے تعلق سے جناح کا غصہ 53 اور لیگ کے ذریعہ پروگرام کی پیش رفت کو روکنے کی کوشش کو صحیح سمجھا جاسکتا ہے۔ کانگریس نے جلد ہی ہمت ہاردی اور مسلمانوں تک پہنچنے اور عوامی رابطہ مہم کے تعلق سے جو بھی تھوڑا بہت جوش تھا وہ جاتا رہا۔ اس سے دوبارہ جناح کو فرقہ وارانہ فسادات سے خراب ہوتے حالات سے فائدہ اٹھانے، واحد مسیحا کے طور پر ابھرنے، مسلمانوں کو اپنی قیادت کے تحت یکجا کرنے اور الگ مسلم ملک کی توقع پالنے کی کھلی آزادی مل گئی۔

دوسری عالمی جنگ - کانگریس اور مسلم لیگ

اس بحرانی صورت حال میں دوسری عالمی جنگ ہندوستان آپہنچی۔ 4 ستمبر 1939 کو لارڈ لن لتھگو نے اس جنگ میں ہندوستان کو اپنا معاون ملک اعلان کردیا۔ اس وقت تک یہ جنگ یوروپی جنگ میں بدل چکی تھی۔ کانگریس نے اس اعلان کی مخالفت کی۔ وائسرائے کی آئینی پوزیشن یہ تھی کہ چوں کہ ہندوستان برطانیہ کا ماتحت ملک ہے اور برطانیہ جنگ میں شامل ہے۔ لہٰذا فطری طور پر ہندوستان بھی جنگ میں ایک حلیف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعد میں ہندوستان اور برطانیہ کے کچھ لوگوں نے اس بات کے لیے وائسرائے پر نکتہ چینی کی کہ انہوں نے جنگ میں ہندوستان کے شامل ہونے کے سلسلے میں قانون ساز اسمبلی کی رائے کیوں نہیں لی؟ لیکن دراصل جس وقت لن لتھگو نے اس بارے میں اپنا بیان جاری کیا تھا، اس وقت گاندھی یا کسی دوسرے ذمے دار لیڈر نے کوئی نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ یہ سب تو بعد میں ہوا۔ آئینی پوزیشن کے برعکس، بعد میں قانون ساز اسمبلی سے رائے نہ لینے کے سلسلے میں لن لتھگو سے استفسار بھی کیا گیا۔

4 ستمبر 1939 کو وائسرائے جناح سے ملے۔ ملاقات سے قبل سکندر حیات خان نے انہیں ایک پیغام بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ" وہ ایسا کچھ بھی نہ کریں جس سے جناح کا حوصلہ اور ان سے نمٹنا مشکل ہوجائے۔" سکندر خان نے اس بات کو بھی دوہرایا جسے وہ پہلے ہی عوام کے سامنے کہہ چکے تھے کہ" جنگ کے متعلق سے پنجاب اور بنگال پوری طرح حکومت کے ساتھ ہیں جناح اور ان کے دوست کچھ بھی کہیں۔" 54

وفاقی مذاکرات کو معطل کرنے کی ضرورت کے بارے میں وائسرائے نے گاندھی کی مانند جناح کو بھی پیغام بھجوایا۔ جناح نے کہا کہ انہیں افسوس ہے کہ سکندر حیات خان کو حمایت مانگنے کے لیے تلک میں ان کے حامیوں کے آگے دوڑنا پڑا۔ سکندر حیات خان کے خلاف ان کے دل میں کوئی برا خیال نہیں، لیکن جب سکندر خود اپنے کام کو پورا نہ کرسکے تو جناح نے ہی وائسرائے کو ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے کہا، وہ چاہتے تھے کہ کچھ مثبت باتیں ہوں، جن کو وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھیں، ترجیحی طور پر آئین کو ازسرنو نئی شکل میں مرتب کرتا۔ لن لتھگو نے کہا کہ اگر وہ ایسا چاہتے ہیں تو کیا

کانگریس وزارت کو ختم کر دیا جائے؟" ہاں! انہیں پوری طرح ہٹا دیا جانا چاہیے۔ دوسرا کوئی طریقہ ہے ہی نہیں جس سے وہ ہوش میں آئیں۔ آپ کو یقین نہیں کہ سو گئے دو سال قبل تک میں نے بھی یقین نہیں کیا تھا۔ ان کا مقصد آپ انگریزوں اور اہم مسلمانوں دونوں کو تباہ کرنا ہے۔ یہ کبھی بھی آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔"55 اس پر وائسرائے نے ان سے اس بیان کے بارے میں پوچھا جو انہوں نے حال ہی میں عوام کے درمیان دیا تھا کہ" ہندوستان کے پاس اپنی حکومت پانے کا اور کیا طریقہ ہے؟' جناح نے جواب دیا تھا کہ اس بحران سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے 'تقسیم'۔

یہ شاید پہلا موقع تھا جب جناح نے اس طرح رسمی طور پر تقسیم ہند کا کہیں ذکر کیا ہو۔ پانچ اکتوبر 1939 کے ایک روز بعد وائسرائے جناح سے پھر ملے۔ اس بار جناح انہیں کہیں زیادہ دولت اور معاون نظر آئے۔ جناح نے مسلمانوں کو متحد رکھنے میں لن لتھگو کے ذریعے ان کی (جناح کی) حمایت کے لیے شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ وائسرائے نے اس شکریہ کا کچھ اس طرح جواب دیا کہ" یہ عوام کے مفاد میں تھا تا کہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر پوری طرح سامنے آئے۔" پھر وائسرائے نے شکایت کی کہ کانگریس کے ساتھ ان کی بات چیت میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے اور یہ بھی کہا کہ کسی بھی اعلان میں موجودہ آئینی نظام میں ترمیم کی یقین دہانی سے زیادہ کچھ کرنا، اور وہ بھی جنگ کے خاتمے پر، مشکل ہوگا۔ دو بڑے فرقوں میں اگر ابتدائی سودے پر کم از کم اس کی شکل و صورت 56 پر ہی اتفاق نہیں ہوا، تو قیام امن کے بعد ایک آزاد وفاق کا درج دینے کے ارادے کا اعلان زیادہ موثر نہیں ہوگا۔ جناح کو اس قسم کے اعلان کا خیال پسند نہیں آیا۔ کیوں کہ ان کے نزدیک اس سے صرف فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوگا۔ انہیں (جناح) اتحاد کا کوئی موقع اس وقت تک نظر نہیں آرہا تھا جب تک کہ کانگریس تمام جماعتوں کی نمائندگی کا اپنا دعویٰ ترک نہیں کر دیتی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ نہیں مانتی۔ حالاں کہ انہوں نے یہ تو تسلیم کیا کہ وہ اس مسئلے پر نہرو کو راضی کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ اس پر جناح نے مسلمانوں کے لیے اور زیادہ تحفظ کا مطالبہ کیا۔ وائسرائے نے جواب دیا کہ وہ بہت محتاط انداز میں صورت حال کا جائزہ لے چکے ہیں۔ لیکن انہیں ظلم و زیادتی کے واقعات نظر نہیں آئے۔ اس پر جناح کا جواب تھا کہ 'ہندو مسلمان کو زیر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'57 انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ 'یہ ارادہ شمال مغربی صوبہ سندھ میں ہندی کی ضروری تعلیم کے لیے جاری ہدایات میں نظر آتا ہے۔'

نومبر 1939 کے وسط تک تمام کانگریسی وزارتوں نے استعفادے دیا۔ متعدد نے یہ قدم بہت جھجکتے ہوئے اٹھایا تھا۔

جنگ کے آغاز اور اس کے فوراً بعد کانگریس وزارتوں کے استعفے سے ہندوستانی سیاست میں ایک نئے عنصر کا داخلہ ہوا۔ اور وہ تھا کانگریس کا سودے بازی کی اپنی طاقت کو پوری طرح کچھ دینا۔ عہدہ ترک کرنے کی سیاسی غلطی کانگریس کی سابقہ غلطیوں میں ایک اضافہ بن گئی۔ جب تک کانگریس برسراقتدار تھی وائسرائے لن لتھگو اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے

تھے۔ کیوں کہ زمینی حقیقت یہ تھی کہ برٹش ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ میں کانگریس کی حکومت تھی اور وہ برٹش حکومت کی جنگی کوششوں کو پوری طرح نقصان نہیں بھی پہنچا سکتے تھے، تب بھی اس میں رکاوٹ بننے کی اہلیت تو رکھتے ہی تھے۔ چیز جب کانگریس وزارتوں نے استعفے دے دی تو لنلتھگو کا رویہ بھی بدل گیا، کیوں کہ اب کانگریس کو خوش کرنے کی انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ کانگریس اقتدار والے صوبوں میں پارلیمانی نظام معطل ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے جنگی کوششوں کو عملی جامہ پہنانا بہت آسان ہو گیا تھا۔ برٹش حکومت کو یقین تھا کہ کانگریس فاشزم کے خلاف کیے گئے اپنے تمام وعدے چھوڑ کر پھر تحریک عدم تعاون شروع کر دے گی۔ کیوں کہ بلاشبہ ایسا ہونے پر، عالمی آئینے عامہ دولت ممالک کی جنگی کوششوں کو ناکام بنانے والی کسی بھی کارروائی کی پوری طرح مذمت کرے گی۔ اس کے علاوہ وائسرائے کو یہ یقین تھا کہ اگر کبھی ضرورت پیش آئی بھی تو عدم تعاون کی کانگریس تحریک سے نمٹنے کے لیے برطانوی حکومت کے ہاتھوں میں پوری طاقت موجود ہے۔

1939 کے نصف رول تک حکومت کی جنگی کوششوں کی حمایت میں مسلم لیگ کھل کر تو نہیں آئی، لیکن اس نے ان کوششوں کی کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔ دراصل بنگال اور پنجاب کی مسلم وزارتوں نے بھی غیر شروع حمایت دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن کانگریس تعاون دینے کے لیے تیار ہونے سے قبل اس جنگ کے مقاصد واضح کرنے پر زور دے رہی تھی۔ اس پر لنلتھگو کو شک ہوا کہ کانگریس نے برطانیہ کی دشواریوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہی یہ چال چلی ہے۔ اس پر کانگریس کی مخالفت کو ناکام بنانے اور شاید برٹش حکومت کے خلاف اپنی دشمنی میں کانگریس اور مسلمانوں کے اتحاد کے خوف سے وائسرائے نے دوسرے حلقوں سے حمایت کی تلاش شروع کر دی۔ اور وہ تو واضح طور پر واحد متبادل کانگریس اور مسلم لیگ تھی۔ ایسے میں لنلتھگو کو مسلم لیگ سے دوستی اور اسے کل ہند سطح پر کانگریس کا حریف بننے کے لیے اکسانا بہت حفیہ نظر آیا۔ حکومت نے اس سلسلے میں اپنی پوزیشن کو اور مضبوط کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین 'باہمی لڑائی' کی موجودگی کا پورا پورا استعمال کیا۔ اس تبدیل شدہ صورتحال کو سمجھنے میں جناح نے تاخیر نہیں کی۔ انہوں نے کہا ''جنگ شروع ہونے کے بعد میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا گیا جیسا کہ گاندھی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس پر میں حیرت زدہ رہ گیا کہ اچانک مجھے ترقی کیوں دیدی گئی ہے اور مجھے بالکل گاندھی کے برابر جگہ کیوں دی جا رہی ہے۔''58

اس طرح وائسرائے لنلتھگو حمایت حاصل کرنے کے لیے جناح کی طرف مڑے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اب حالات کے تقاضے کے تحت جناح پر یقین کر سکتے ہیں۔ جناح نے اگست 1938 کی طرح فوراً ہی اس وقت کے کارگزار وائسرائے پر یہاان کو یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ ''مسلم لیگ برٹش حکومت کو تعاون دینے کو تیار ہو سکتی ہے'' (پر یہاان کے بیان کے مطابق) جناح کی اس حیرت انگیز تجویز نے اس امکان کو ختم ہی کر دیا کہ برٹش حکومت '' مرکز کو ویسا ہی رہنے دے جیا س وہ ابھی ہے۔ ہمیں کانگریس صوبوں میں مسلمانوں کا دفاع کرتے ہوئے ان کے ساتھ دوستی کر لینی چاہیے۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو مسلمان مرکز میں ہمارا دفاع کر لیں گے۔''59

جناح کی اس بات پر لارڈ زیٹ لینڈ کو کوئی حیرت نہیں ہوئی بلکہ اس سے ان کا یہ خیال اور پختہ ہو گیا کہ ہندوستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بالادستی میں اضافہ ہوگا۔''60 حالانکہ کافی دنوں تک وہ یہ مانتے رہے کہ ''اسلام کے ساتھ ہماری ہمدردی ایک مشکل امر ہے، اس بارے میں ذہنی مشق بیکار ہے۔''61

بعد میں 1945 میں جنگ چھڑنے کے بعد کی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے جناح نے کہا کہ ''گفتگو اور کانگریس میں سمجھوتہ ہونے والا تھا۔ اللہ نے ہماری مدد کی۔ جنگ کا کسی نے خیر مقدم نہیں کیا کہیں وہ ہمارے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی۔''62 جناح برٹش حکومت سے ملنے والے فائدوں کو سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس صورتحال کا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنا موقف بھی واضح طور پر بدل دیا۔ حالاں کہ انہوں نے بہت زیادہ حمایت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، برٹش حکومت کو بھی ناراض نہیں کیا اور نہ ہی اس کے برعکس جنگی کوششوں میں اس کی غیر مشروط حمایت کی۔ انہوں نے برٹش حکومت کی پیش کش کو براہ راست نہیں ٹھہرایا لیکن اس سے قبل کہ انگریز ان کا ایک مطالبہ پورا کرتے، وہ دوسرا رکھ دیتے تھے۔ بڑی چالاکی سے چالیں چلتے ہوئے وہ مسلم لیگ کے لیے کانگریس مساوی جگہ پانے میں بالآخر کامیاب ہو گئے۔ دوسری طرف کانگریس میں دور اندیشی، لچکدار رویے اور قائدانہ صلاحیتوں کا فقدان تھا نتیجتاً وہ بالادستی حاصل کرنے کی اپنی پوزیشن سے محروم ہو گئی۔ اس وقت وی پی مینن نے لکھا تھا: ''(سامراجی) حمایت کی (اس) روش میں لیگ کا تیزی سے فروغ ہوا۔63

جنگی کوششوں کے سلسلے میں لیگ کی یا کہیں کہ جناح کی پیشکش اور برطانوی راج کے ساتھ ان کے قریبی تعاون کے مابین پیدا ہوئے اختلاف پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، جو مہاتما گاندھی کی پیشکش کے بالکل برعکس تھا۔ گاندھی نے وائسرائے گفتگو کے توسط سے برطانوی حکومت اور عوام کے سامنے عدم تشدد کے ذریعے تعاون، کی پیش کش کی تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ انگریز اپنے تمام ہتھیار ترک کر دیں اور 'عدم تشدد' کو اختیار کر لیں۔ یہ گاندھی کی انتہائی سنجیدہ اور مثبت تجویز تھی۔ جولائی 1940 کے اوائل میں گاندھی نے برطانوی حکومت کے نام ایک مکتوب لکھا جو چار جولائی 1940 کے امرت بازار پتر کا میں ''عدم تشدد کا طریقہ: برطانوی باشندوں سے مہاتما گاندھی کی اپیل'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس خط میں ایک جگہ کہا گیا تھا کہ میں جنگ کے خاتمے کی اپیل کرتا ہوں... کیوں کہ جنگ بری ہوتی ہے۔ آپ نازی ازم کو قتل کرنا چاہتے ہیں، لیکن آپ کے فوجی پناہ کاری کا وہی کام کر رہے ہیں جو جرمنوں نے کیا صرف ایک ہی تو فرق ہے کہ شاید آپ کے فوجی اتنے پختہ نہیں ہیں جتنے کہ جرمن۔ میں آپ کے سامنے ایک اعلا اور جرأت مندانہ راستہ رکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہی بہادر سپاہیوں کا راستہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نازیوں سے ہتھیاروں کے بغیر صرف عدم تشدد کے ہتھیار سے لڑیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ہتھیار ترک کر دیں۔ کیوں کہ آپ کو یا انسانیت کو بچانے میں ان ہتھیاروں کی کوئی افادیت نہیں ہے ... آپ ہٹلر اور سینور مسولینی کو بلائیں، اور اپنے قبضے والے ملکوں سے وہ سب کچھ انہیں سونپ دیں۔ جو بھی وہ چاہتے ہیں۔ بہت ساری خوبصورت عمارتوں سے گھرے اپنے جزیروں پر انہیں قبضہ کر لینے دیں۔ آپ یہ سب کچھ انہیں دے دیں لیکن اپنی روح اور اپنا دل انہیں نہ دیں۔ ...''64

اس صاف ستھرے خط پر غیر جانبدار اور باوقار تبصرہ کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ خط کئی سوال تو اٹھاتا ہی ہے۔ مثال کے طور پر کہ خط کی وصولیابی کے بعد وائسرائے نے اس پر کیا سوچا؟ کیا انہوں نے یہ مشورہ لندن بھیجا یا نہیں، اور برطانوی ہندوستانی اور آزاد افواج کے لبرل، بحری اور فضائی فوجی اس سلسلے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟ (آخر یہ ایک کھلا خط تھا جو شائع بھی ہوا تھا) جو لڑ رہے تھے، جو مارے گئے یا جو مارے جا رہے تھے، ان کے رشتے داروں اور اہل خانہ نے اس اپیل کو پڑھ کر کیا سوچا؟ خیر۔

آیئے! جناح کے سفر پر لوٹیں۔ لیگ کی پوزیشن انتہی مضبوط کرنے میں مدد دینے کے لئے جناح لنلیتھگو کے شکر گزار تھے۔ ایک انٹرویو میں جناح نے ان کی جماعت کو منظم رکھنے میں لنلیتھگو نے جو کچھ کیا اس کے لئے مہذب انداز میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور ممنونیت کا اظہار کیا'' ۔65 کانگریس غیر معاون تھی، اس کے مطالبات کا سامنا کرنے کے لئے وائسرائے کو یہ ضروری محسوس ہوا کہ مسلم لیگ کو ایک حریف کے طور پر مضبوط کیا جائے۔ حکومت ہند کے افسران کی عام رائے کانگریس کے ساتھ کسی بھی قسم کے سمجھوتے کے خلاف تھی۔ اس کی جگہ پر مسلم لیگ کے مطالبات کے تئیں نرم دل کے بارے میں حکومت کا رویہ صاف نظر آرہا تھا۔ اسے بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ وائسرائے کی پہلی ذمے داری، جنگ کے دوران ہندوستانی سامراج کو قائم رکھنے اور ہندوستان کی جنگی کوششوں کو اور تیز کرنے کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جنگ اور اقلیتوں کے ناجائز مطالبات کی تشہیر کے بھی حق میں تھے، انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ کسی آئینی پیش رفت کے لئے اہم جماعتوں (کانگریس اور لیگ) کے مابین سمجھوتہ ایک ناگزیر شرط ہے۔ لنلیتھگو کے اس مشورے کے جواب میں لارڈ زیٹ لینڈ نے ہاؤس آف لارڈس، میں کہا کہ 'برطانوی حکومت کسی بھی آئینی ترمیم کی پیشگی شرط کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ایک معاہدے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔

نومبر 1939 کے آغاز میں ہی لن لتھگو نے گاندھی، راجیندر پرساد اور جناح کو مشترکہ مذاکرات کے لیے مدعو کیا۔ انہوں نے دعوا کیا کہ '' اہم فرقوں کے مابین اتفاق، مثلاً مرکز میں خوش اسلوبی کے ساتھ کام کاج میں تعاون کا یہ فقدان'' ہی بنیادی طور پر آئینی پیش رفت میں ہورہی تاخیر کے لئے ذمے دار تھا۔ لہٰذا وہ انہیں باہمی میل جول میں اضافہ اور اس قسم کی مفاہمت کے لیے کہتے تھے۔'' (جس سے) مرکز میں گورنر جنرل کی کونسل کی توسیع قبول کی جاسکے۔'' یہ بھی لگتا تھا کہ کانگریس کو اس کی منتخب شرطوں پر اقتدار میں واپس لانے کے لیے لن لتھگو تیار نہیں تھے۔ کانگریس نے وائسرائے کی تمام تجاویز کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ وائسرائے نے عوام کی رضامندی کے بغیر ہی ہندوستان کو جنگ میں مشغول ملک قرار دے دیا، جس سے ہندوستان میں یہ مسئلہ پیدا ہوا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ کسی لڑائی کی وجہ سے تو استعفا دیا نہیں تھا۔ لہٰذا اس وجہ سے کسی اقرار نامہ پر کام کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کانگریس نے جن مذاکرات کا دعوا کیا تھا، وہ کانگریس اور برطانوی حکومت کے مابیان بنیادی اختلافات کے سبب ناکام ہوگئے۔ لنلیتھگو نے اپنے مذاکرات کی ناکامی کے باوجود اپنے عوامی بیانات میں ایک بار بھی کانگریس اور برطانوی حکومت کے مابین تنازعہ کا ذکر نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کانگریس

اور لیگ کے تنازعات کی ہی بات کرتے رہے۔ اس لیے اس شبہے کو جواز حاصل ہوتا ہے کہ ان مذاکرات کے پس پردہ لن لتھگو کا مقصد ان دونوں کے اختلافات کا پروپیگنڈہ کرنا اور یہ دعوا کرنے کے لئے ان کا استعمال کرنا تھا کہ برطانوی حکومت کی کوششوں کے باوجود یہ اختلافات برقرار ہیں۔ اس وقت کی یہ بہت ہی افسوسناک حقیقت ہے کہ واضح طور پر برطانوی حکومت مخالف تحریک ہماری اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہندو مسلم اختلافات میں بدل کر رہ گئی۔ اس طرح برطانوی حکومت کی مخالفت بے اثر ہوگئی۔ اب قطعی طور پر اس کا مقصد برطانوی سامراج کی مخالفت نہیں رہا بلکہ یہ صورت حال ایک کھلے طور پر ہندو مسلم جھگڑے میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے بعد یہ لکھنے میں بہت دکھ ہوتا ہے کہ اس کا الزام کس کے سر عائد کیا جائے، سوائے ہمارے اپنے۔

کانگریس لیڈروں نے جناح سے ملاقات تو کی تھی، لیکن کوئی اتفاق رائے قائم نہیں ہوسکا۔ کیوں کہ جناح کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ وہ کانگریس کے ذریعے جنگ کے مقاصد کے سلسلے میں ایک المدینہ کے مطالبے کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیےعلی الاعلان انکار کرسکتے تھے۔ لیکن اگر وہ اس مطالبے کو نقصان پہنچاتے تو ان کی امیج ایک 'قوم مخالف' اور برطانیہ پرست قائد کی بن جاتی۔ دوسری طرف جناح لیگ کے لیے کچھ رعایتیں حاصل کئے بغیر ہی کانگریس کی حمایت بھی نہیں کرسکتے تھے۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تو نہ صرف یہ کہ برطانوی حکومت کی حمایت سے محروم ہو جاتے بلکہ اس سے کانگریس کی پوزیشن، وہ بھی لیگ کی قیمت پر زیادہ مضبوط ہو جاتی۔ وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کی قیمت کے طور پر اپنی پانچ شرائط رکھ کر اصل مذاکرات سے بچ نکلے، وہ تھیں: صوبوں میں مخلوط وزارتیں تشکیل دی جائیں، دو تہائی مسلم ممبران کے اعتراض کی صورت میں کابینہ میں کوئی بھی فیصلہ نہ لیا جائے سرکاری عمارتوں پر کانگریس کا پرچم نہ لہرایا جائے وندے ماترم گانے پر پابندی لگے اور کانگریس مسلمانوں میں اپنی عوامی رابطہ مہم فوراً بند کردے۔ یہ سب بالکل ہی ناممکن تھا۔ کانگریس ان میں سے کسی ایک بھی شرط پر راضی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس طرح جناح نے سمجھوتے تک پہنچنے یا اپنی ناکامی کا الزام کانگریس کے سر تھوپ دیا۔

گزشتہ اقتباسات میں اس بات کے کافی ثبوت ہیں کہ جناح ان حالات میں وائسرائے سے مل کر کام کر رہے تھے۔ لنلیتھگو کے ساتھ ایک میٹنگ میں جناح نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ گاندھی نے ان سے پوچھا تھا: 'کیا کانگریس اور مسلم لیگ کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ مشترکہ طور پر اس اعلانیہ کا مطالبہ کریں، جس کے لیے کانگریس برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالتی آرہی تھی'؟ اس سوال نے جناح کو ایک الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ان کے لیے کانگریس کے مطالبے کی حمایت کرنے میں دشواری تھی۔ اس پر کانگریس کے لیڈروں نے یہ وارننگ بھی دی تھی کہ جناح اگر ایک مطالبہ رکھنے میں بھی ان کے ساتھ آنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، تو انہیں ہندوستان کی آزادی کی راہ میں اصل رکاوٹ کے طور پر عوام کے سامنے بے نقاب کیا جائے گا۔ اس صورتحال میں لنلتھگو نے ایک کل جماعتی کانفرنس بلانے کا خیال ملتوی کردیا۔ جس کا منصوبہ انہوں نے پورے ہندوستان کی بات کرنے والی کانگریس کے وعدے کی مکمل سمجھوتے کے لیے ہی بنایا تھا۔ وائسرائے کا خیال تھا کہ اس قسم کی کانفرنس

شاید کانگریس کے مکمل ہندوستان کی نمائندگی کرنے کے دعوے مشکل میں ڈال دے گی۔ لیکن ایسی صورت میں کانگریس کا یہ الزام بھی سچ ثابت ہو جائے گا کہ جناح برطانوی حکومت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ جناح کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیل زیٹ لینڈ کو بھیجتے ہوئے لنلیتھگو نے ایمانداری سے تسلیم کیا کہ '' کانگریس کے دعوؤں کے خلاف کھڑے ہو کر انہوں نے بیش قیمت تعاون دیا تھا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یہ واضح تھا کہ اگر جناح نے کانگریس کے مطالبے کی حمایت کر دی ہوتی اور مشترکہ مطالبے کے ساتھ میری مخالفت میں کھڑے ہو گئے ہوتے تو میرے اور ہز میجسٹی حکومت کے سامنے بہت بڑا بحران پیدا ہو گیا ہوتا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں ان کی پوزیشن سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔'' 67

مذکورہ اقتباس لیگ کو اکسانے کے پس پردہ برطانوی حکومت کے مقصد کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ بالآخر وہ ایک جنگ میں مشغول تھے، جو حکومت برطانیہ کے لیے موت وزیست کا سوال بن گئی تھی اور کانگریس کے مطالبات (جو موثر طور پر آزادی دینے کے مساوی تھے) کو اس صورت میں تسلیم نہ کرنا کہ انہیں لیگ کی بھی حمایت حاصل ہو گئی ہو، تقریباً ناممکن ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی بھی طرح مسلم لیگ کو کانگریس سے ہاتھ ملانے سے روکنا برطانیہ کے لیے قطعی طور پر، جنگ کے دوران پہلی ترجیح تھی۔ اور کانگریس کے لیے، صورت حال کو پلٹنے کی غرض سے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ برطانوی حکومت کی اس واضح چال میں نہ پھنسے۔ بلاشبہ، اب یہ سب واقعات بعد کی باتیں ہیں۔ لیکن کانگریس پھنس تو گئی تھی۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔

لیکن وائسرائے نے عوام کے سامنے ایک الگ موقف رکھا۔ بقول ان کے انہوں نے ''سمجھوتے کے لیے کوئی بھی کسر نہ چھوڑنے کی خاطر'' 68 لیڈروں سے درخواست کی اور ان پر زور دیا کہ صرف ہندوستانیوں کو متاثر کرنے والا سوال ہے اور اس پر انہی کے درمیان اتفاق رائے کی ضرورت ہے۔ لندن میں کانگریس کی نمائندگی کرنے والے کرشنا مینن کی زیر قیادت تنظیم 'انڈیا لیگ' نے گرچہ اس وقت یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ لن لتھگو کا کھیل کیا ہے؟ اس لیے انہوں نے ایک جواب الجواب جاری کیا جس میں اس بات سے انکار کیا گیا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مدعوں پر بات چیت ٹوٹ گئی ہے اور وعدا کیا گیا کہ جناح نے ایسے اعتراضات اٹھائے ہی نہیں ہیں۔ اس میں یہ بھی وعدا کیا گیا کہ مذاکرات کو روکنے کا مطلب فرقہ وارانہ نا اتفاقی نہیں ہے، بلکہ برطانوی پالیسیوں پر اختلاف کا گہرا ہو جاتا ہے اور اس برطانوی حکومت سے علاحدگی ہے جو ایک اطمینان بخش اعلان سے انکار کر رہی ہے۔ 69

انڈیا لیگ کے بیان نے انڈیا آفس میں کچھ گھبراہٹ ضرور پیدا کر دی۔ ان کی تردید کرنے کی خواہش میں زیٹ لینڈ نے لن لتھگو سے پوچھا کہ '' کیا جناح کو انڈیا لیگ کے دعوے کی تردید میں کوئی بیان رائٹرس کے لیے جاری کرنے کے لیے راضی کر پانا ممکن ہو سکے گا؟' اگر ہو سکے تو اس جواب کو برطانیہ اور امریکا دونوں جگہ خوب تشہیر ملے گی۔'' جناح نے دلچسپی ضرور دکھائی لیکن اس 'کسی مناسب موقع پر دنداں شکن جواب دینے کا وعدہ کیا۔ حالاں کہ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے کہ جناح نے پھر کبھی وہ دنداں شکن جواب دیا۔

دسمبر 1939 کے تیسرے ہفتے میں کانگریس اور لیگ کے مابین تناؤ۔ کو کم کرنے کے طریقے، ڈھونڈنے کے لیے نہرو سے خط و کتابت کرتے ہوئے جناح نے ایک بیک اپنے کردار کے برعکس مظاہرہ کیا۔ اور انہوں نے مسلم لیگ سے 'یوم نجات' کا جشن منانے کی اپیل کر ڈالی۔ "یہ گزشتہ ڈھائی برسوں کے کانگریس اقتدار کے دوران ناانصافی استعمال اور ظلم و زیادتی" 71 سے ملنے والی نجات تھی۔ جناح نے حکومت پذیر، کانگریس حکومتوں کی مسلم مخالف پالیسیوں کی جانچ کرنے پر بھی زور دیا۔ اس یوم نجات کے اعلان کو واپس لینے کے لئے انہیں راضی کرنے کی کوشش ناکام رہیں اور ان کے بیانات کو کانگریس پر کھلے حملے کی طرح دیکھا گیا۔ نتیجتاً نہرو اور جناح کے مابین ثالثی کا فوراً خاتمہ ہو گیا۔ کسی قطعی ثبوت کے فقدان میں یہ کہنا جلد بازی ہو گی کہ جناح کی یہ اپیل برطانوی حکومت کی ترغیب پر آئی۔ لیکن لن لتھگو اسے انڈیا لیگ کے بیان کا دنداں شکن جواب ماننے کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے مگر سکریٹری آف اسٹیٹ سے خط و کتابت میں وعدا کیا کہ جناح نے یوم نجات کی اپیل کر کے اس بات کا واضح ثبوت دے دیا ہے کہ فرقہ پرستی ایک زندہ مسئلہ ہے اور اسی لیے آئینی پیش رفت میں اڑچنیں بھی ہیں۔ اسی دوران برطانوی کابینہ اور پارلیمنٹ کے سامنے مسلمانوں کی پوزیشن کی بہتر وضاحت کرنے کے لیے لن لتھگو نے مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد لندن پہنچنے کی تجویز پیش کی۔ اس خیال کو وقت کے مواقف نہ مان کر زیٹ لینڈ نے اس پر اعتراض کیا۔ ان کا خیال تھا کہ پروپیگنڈہ منفی اصرار تک محدود نہیں رہنا چاہیے، تاکہ مسلمان صرف ایک نااہل اکثریت کے اصول پر ہی ہندوستان میں سیلف گورنس کے ایک فریق نہ بنیں۔ لیگ کو کامیاب ہونے کے لیے ان شرائط کو واضح کرنا تھا، جن کی بنیاد پر وہ سیلف گورنس کے لیے تیار تھی۔

اس کے بعد لن لتھگو نے کانگریس کے آزادی کے مطالبے کا توڑ کرنے اور آزاد ہندوستان کے لیے آئین وضع کرنے کی غرض سے مسلم لیگ کو مخصوص تجویز رکھنے پر زور دینا شروع کر دیا۔ کئی مواقع پر لن لتھگو کی جناح سے بات ہوئی کہ برطانیہ میں حکومت کو محض ایک عرضداشت پیش کر کے عوامی رائے عامہ ہموار کرنا، بالخصوص ہاوس آف کامنس کے چھ سو نمائندوں کو ہموار کرنا یکسر ناممکن ہے۔ اس معاملے پر زیٹ لینڈ کو رپورٹ دیتے ہوئے لن لتھگو نے پھر لکھا تھا کہ 'میں نے تعمیری پالیسی کے تعین اور اشاعت کے لیے مسلم دلیل دوبارہ سامنے رکھی اور ہماری گفتگو کی روشنی میں انہوں نے کہا کہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کے اور ان کے دوستوں کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ اپنی پوزیشن کی صحیح صورتحال وہ کس صحیح موقع پر ہی عام کر لیں۔" 73

ان تمام باتوں کے باوجود اب بھی لیگ کی پوزیشن بہت مضبوط نہیں تھی۔ غالباً اس صورتحال میں وہ خود کو آئینی ا ☐ کا پابند بنانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ لیکن ایسی کسی پابندی کو وہ غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے 1935 کے ایکٹ میں موجود ایک آل انڈیا وفاق کی تشکیل کی برطانوی اسکیم کو مسترد کر دیا تھا۔ کانگریس نے اس کا جواب آئین ساز اسمبلی کے ذریعے وضع کئے جانے والے آئین کے متبادل منصوبے سے دیا تھا۔ لیگ نے اپنا کوئی منصوبہ رکھے بغیر برطانوی اور کانگریسی دونوں تجاویز کی مخالفت کی۔ پہلے اس نے ہندوستان کے لیے غیر

معینہ وفاق کے خیال کی تائید کی تھی۔ 1937 کے انتخابی نتائج سے یہ بالکل واضح تھا کہ علیحدہ الیکٹوریٹ اور نشستوں کے ریزرویشن کے باوجود، لیگ وفاق میں کوئی فیصلہ کن رول ادا کرنے کی امید نہیں کر سکتی تھی اور ایک آل انڈیا وفاق سے منسلک ہونا اسے بہت نقصان پہنچاتا۔ اس نے اس کے برعکس یہ مشورہ دیا کہ انگریزی حکومت کو ہندوستان کے آئندہ کے آئین پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

قرارداد پاکستان-لاہور 1940

ان حالات میں بیسویں صدی کی چوتھی اور ایک سنگین دہائی آئی۔ 1940 نے ملک کے سامنے دو بنیادی مسئلوں سے آغاز کیا۔ کیا وائسرائے کی اپنی کونسل کی توسیع کی تجویز اہم سیاسی جماعتوں کو تسلیم ہوگی؟ اور کیا جنگ کے دوران ہندوستانی لیڈروں کا ایک مشاوراتی گروپ متعلقہ سیاسی پارٹیوں کو قبول ہوگا؟

فروری 1940 میں دہلی میں لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں وائسرائے کے مشورے پر لیگ کے نمائندہ وفد کو وزیر اعظم اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے اپنا موقف رکھنے کے لیے لندن بھیجنے کی ایک تجویز پر بحث ہوئی۔ جناح کا مشورہ تھا کہ خلیق الزماں کو بھی اس وفد میں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اس سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ نمائندہ وفد کے ممبران فضل الحق، سر سکندر حیات خاں، خواجہ نظام الدین اور خلیق الزماں تھے۔

اس کے بعد مجوزہ وفد کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے برطانوی حکومت کے سامنے رکھے جانے والے مسائل پر جناح سے رہنمائی مانگی گئی۔ اس وقت خلیق الزماں نے زیٹ لینڈ اور کرنل حیدر ہیڈ سے ہوئی ملاقات کے بارے میں کمیٹی کے ممبران کو بتایا۔ اس پر ورکنگ کمیٹی نے وفاقی مقصد کے متبادل پر گفتگو کی۔ اس وقت ہندوستان کو سات مختلف خطوں میں تقسیم کرنے کے سر سکندر کے مجوزہ منصوبے پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ انہوں نے اپنی وفاقی اسکیم کی وکالت کی لیکن جناح نے اس کی مخالفت کی، 'مسلم خطوں' کو بقیہ ہندوستان سے الگ کرنے کے منصوبے کو بھی، جس پر پہلے زیٹ لینڈ اور میور ہیڈ کے مابین تبادلہ خیال ہو چکا تھا۔ حتمی طور پر منظور کر لیا گیا۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کرنے تقسیم ہند کا دعوا کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کیسے ہوگا اور کن صوبوں کو اور کہاں پر ہندوستان کو تقسیم کرنا ہے، تاہم تقدیر کی بے رحم لکیریں اور گہری ہوئی جارہی تھیں۔

6 فروری 1940 کو جناح نے باضابطہ طور پر وائسرائے کو مطلع کر دیا کہ مسلم لیگ لاہور میں اپنے کھلے اجلاس میں 23 مارچ کو تقسیم ملک کا مطالبہ کرنے جارہی ہے۔ لارڈ زیٹ لینڈ کو بھی ان سرگرمیوں کی پوری خبر تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے 23 مارچ 1940 کے اس اجلاس نے، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 میں موجود وفاق کی اسکیم کو بزور طاقت مسترد کر دیا۔ اس کی قرارداد میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی

صوبہ سرحد کے لیے مکمل خودمختاری اور اقتدار اعلا کے اختیارات اور دیگر صوبوں میں 74 مساوی اختیارات کے ساتھ وفاق کا مطالبہ کیا تھا۔ فضل الحق نے کھلے اجلاس میں اس قرارداد کو رکھا اور جناح نے خلیق الزماں کو اس کی تائید کرنے کے لیے کہا۔

23 مارچ 1940 کی نصف شب میں اسے منظور کرلیا گیا۔☆ اگلی صبح ہر جگہ اخبارات کی سرخیاں تھیں کہ قرارداد پاکستان منظور ہوگئی ہے۔ گرچہ کسی نے بھی اپنی تقریر میں اس لفظ کا استعمال تک نہیں کیا تھا اور نہ ہی یہ ریزرویشن کے اصل مضمون میں ہی تھا۔ لیکن پریس نے عام مسلمانوں کو ایک نعرہ دے دیا۔ اس سرخی نے ایک نئے ملک کے خیال کو عام کردیا کیوں کہ ویسے اگر ہم دیکھیں تو مسلم لیڈروں کو قرارداد لاہور کی تشریح اور اس کا صحیح مفہوم اور اس کی اہمیت کو سمجھانے میں کافی وقت لگتا۔ شہریوں میں قرارداد کا پورا احساس اور مفہوم عام کرنا اب بہت آسان ہوگیا۔ پریس نے بھی قرارداد کو 'قرارداد پاکستان' کا نام دیکر اس کی افشاء اور تیز کردی۔ تقدیر نے ایک اور نہ مٹنے والی لکیر کھینچ دی۔

بنیادی تبدیلیوں پر غور کریں تو ایک ہی مسئلے میں آزادی کی لڑائی ہندو مسلم سوال میں بدل گئی۔ قرارداد لاہور کے بعد تک جو ایک فرقہ وارانہ مسئلہ تھا، اس قرارداد نے اس کی بنیادی حیثیت ہی بدل ڈالی۔ یہاں تک کہ جو حل سُجھائے گئے تھے یعنی علیحدہ الیکٹوریٹ۔ مشترکہ کابینہ، نشستوں کا ریزرویشن اور مساوات، جن جن باتوں پر بھی غور کیا گیا، سبھی یک لخت پوری طرح غیر اہم ہوگئے۔ اس وقت ایک انگریزی اخبار نے لکھا تھا ''اسی لمحے کے لیے جناح نے ایک بار پھر ہندوستان میں نراج قائم کردیا۔'' 75 اس قرارداد پاکستان نے آئینی تنازع کی پیچیدگیوں میں بہت اضافہ کردیا، جسے اس وقت تک کانگریس لیڈروں نے صرف اپنے اور انگریزی حکومت کے مابین ایک آسان مدعے کی حیثیت سے ہی دیکھا تھا۔

جناح کے نقطہ نظر سے 'قراردار پاکستان' ان کے ذریعے احتیاط سے بنائی گئی حکمت عملی کا محض ایک حصہ تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں یا ہندوستان کے باہر 'مسلم ملک کا خیال' سب کو متاثر کرنے والا ثابت ہوگا۔ انہوں نے اس 'پاکستان' کی مفصل توضیح کرنے سے مسلسل انکار کیا۔ کیوں کہ بنیادی طور پر انہیں خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے اور کس پاکستان کا

☆ یوم پاکستان کی حیثیت سے 23 مارچ کی تقریبات 1956 سے قبل شروع نہیں ہوئیں۔ شروع میں تو اسے پہلے آئین کے منظور ہونے اور پاکستان کے آزاد جمہوریہ کی شکل میں ابھرنے کو واضح کرنے کے لیے یوم جمہوریہ کی حیثیت سے منایا گیا اور اس کی اہمیت ویسی ہی تھی جیسی کیہ ہندوستان میں 26 جنوری کی۔ لیکن جب جنرل ایوب آئین میں ترمیم کر کے 1958 میں مارشل لا نافذ کردیا تو ان کے سامنے ایک مشکل آ کھڑی ہوئی۔ وہ نہ تو ملک کو ایسے آئین کے یوم کا جشن منانے دے سکتے تھے۔ جسے خود انہوں نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور نہ ہی وہ جشن کو پوری طرح روک سکتے تھے۔ جشن کو جاری رکھ کر اسے یوم قرارداد پاکستان کا دوہرا نام دے کر درمیان کا راستہ نکالا گیا۔

مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے حامیوں کو اپنے اپنے تصور اور تفصیل کے مطابق پاکستان کا نقشہ بنانے کی آزادی تھی۔ جہاں دقیانوسی لوگوں نے اصل اسلام کی نمائندگی کرنے والے ملک کا خواب دیکھا، وہیں جن کا نظریہ کچھ واضح تھا، وہ اس نئے بننے والے ملک میں، خود اپنے ہی ملک میں، مستقبل میں ملنے والے مالی فائدوں کے امکانات کے آگے جھک گئے۔ اس کے علاوہ اس آزاد مسلم ملک کے خاکے میں ماضی کے مسلم حکمرانوں کی شان وشوکت کا بھی خواب تھا۔ اس لیے بہت سے مسلمانوں نے انتہائی جوش اور مسرت کے ساتھ اس خیال کو اپنایا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوسرے عوامل ومحرکات کے درمیان یہ قرارداد پاکستان بھی وائسرائے کی تعمیر قرارداد کے مسلسل اصرار کے جواب میں مسلم لیگ کا ایک ردعمل تھا؟

6

برطانوی راج کا غروب

ایک ڈوبتے بینک کے لئے مؤخر چیک

لاہور قرارداد (23 مارچ 1940) - تناظر

کسی منفی چیز سے کوئی مثبت نتیجہ مشکل سے ہی نکالا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بیج سال بہ سال، مسلسل بوئے جاچکے تھے؛ یہ بیج ہم (ہندوؤں اور مسلمانوں) نے بھی اتنے ہی بوئے تھے جتنے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد کم زور ہوجانے والے انگریزوں نے! انگریزوں نے تو اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے ہمیں تقسیم کیا مگر ہم نے بھی تو خود کو تقسیم کردیا تھا: اس کا نتیجہ تباہ کن تقسیم کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا؟

ایم آر اے بیگ نے جناح کی انگلینڈ سے واپسی پر 1934 سے ان کے ساتھ کام کرنا شروع کیا جس کا سلسلہ مارچ، 1940 تک جاری رہا۔ اس سے پہلے بھی وہ سروجنی نائیڈو جیسی شخصیتوں کی معیت میں کئی بار جناح سے مل چکے تھے۔ جیسا کہ خود بیگ نے بھی بیان کیا ہے، سروجنی نائیڈو جیسی شخصیتوں کی معیت میں جناح سے ملاقات ہونے کی وجہ سے انہوں نے جناح کو اتنی زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا جتنا خود جناح اپنے بارے میں سنجیدہ تھے۔ اس کے نتیجے میں، جناح کے بیشتر پیروکاروں کے برخلاف بیگ جناح سے کبھی مرعوب نہیں رہے۔ لاہور قرارداد پر ان کا جناح سے اختلاف ہوگیا کیوں کہ وہ اس قرارداد کو فرقہ پرستانہ سمجھتے تھے۔ اس کے بعد وہ جناح کے سکریٹری بن گئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں تحریر کیا ہے 'مسٹر جناح غالباً مارچ 1940 کے وسط میں اپنے فیصلہ کن سفر اور مہم پر لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ میں اُن کی روانگی

سے ایک روز قبل ان سے ملا تھا مگر انہوں نے اپنی کسی بات یا رویہ سے ذرا سا بھی اشارہ نہیں دیا کہ لاہور قرارداد پیش کی جانے والی ہے۔' بہر حال واقعی تقسیم کے ارادے سے یا اس کے بغیر یہ قرارداد پیش کر دی گئی۔ اس کے بعد بیگ نے پنڈیرل مون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ 'جناح نے لاہور میں ایک یا دو لوگوں سے نجی طور پر یہ کہا کہ یہ قرارداد دراصل ایک چال ہے؛ اس بات سے اس کے چھے سال بعد وہ مطلق تقسیم سے کم کسی بھی فیصلے کو قبول کرنے کے لیے راضی ہو گئے تھے، یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ 1940 میں اس سے ناقابل تنسیخ حد تک عہد بستہ نہیں تھے۔ جزوی طور پر اس وقت یہ قرارداد ایک ایسی چال کی طرح رہی ہوگی جس سے کانگریس سے ایسی زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر لی جاتیں کہ شراکت کو زیادہ سے زیادہ قابل برداشت بنایا جاسکے۔ اُس وقت اس قرارداد کے مضمرات، یہاں تک کہ مجوزہ 'آزاد ریاستوں' کی ساخت اور ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں یقیناً غور نہیں کیا گیا۔ ان میں سے بعض امور کی وضاحت بعد میں کی گئی مگر جناح نے پاکستان کی صحیح نوعیت کی توضیح میں کبھی بھی دل چسپی نہیں لی اور 1947 تک یہ واضح نہیں ہوسکا تھا کہ وہ کیا قبول کرنے والے ہیں۔'

دوسری طرف گاندھی کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو بھی ویسا ہی حق خود اختیاری حاصل ہونا چاہیے جیسا کہ باقی ہندوستان کو حاصل ہے۔ 'اس وقت ہم ایک مشترکہ خاندان ہیں۔ خاندان کا کوئی بھی فرد خود تقسیم کا دعوا کر سکتا ہے۔' انہوں نے اس طرح کا خیال بار بار ظاہر کیا۔ بہر حال قرارداد پاکستان کے بارے میں نہرو کا ردعمل یہ تھا کہ.........'اگر لوگ ایسی باتیں چاہتے ہیں جیسا کہ لاہور میں مسلم لیگ نے کہا ہے' تو وہ ہمارے ساتھ کس طرح کام کر سکتے ہیں۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اس کانگریس نے اپریل 1942 میں سی راج گوپالا چاری کی اس تجویز کو بھاری اکثریت سے مسترد کر دیا تھا کہ گفت و شنید کے مقصد سے کانگریس کو چاہیے کہ کسی نہ کسی شکل میں مسلم علاحدگی پسندی کو تسلیم کر لے۔'

راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی خودنوشت چند یادیں (Some Memories) میں (ایچ آر اے بیگ کی خودنوشت میں کہی گئی باتوں کی بازگشت کے طور پر) لکھا ہے کہ 'میری طرف سے ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کی وکالت کی وجہ سے جناح کے ساتھ میرا ٹکراؤ ہو گیا، انہوں نے میرے نظریے کو ماننے سے مکمل طور پر انکار کر دیا تھا اور مجھے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس طرح کے خیالات کے اظہار سے روک دیا تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ جناح میرے خیالات کے حامی ہیں اور مجھ سے اس طرح کی باتیں کہلا رہے ہیں۔' میں چوں کہ اپنے نظریے کو درست سمجھتا تھا اور جناح کے موقف کے بارے میں کوئی سودے بازی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے میں نے اپنا راستا الگ کر لیا، اور ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں اور دوسرے رسمی مواقع کے علاوہ تقریباً دو سال تک ان سے فاصلہ قائم رکھا۔'[1]

آنے والے پُر از واقعات چھے برسوں کے دوران متحدہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ارادی یا غیر ارادی طور پر پانسے پھینکے جاتے رہے۔ کرپس مشن (1942)؛ ہندوستان چھوڑو (اپریل تا ستمبر 1942)؛ ویول کا وائسرائے ہونا، (جون 1943)؛ شملہ کانفرنس (ستمبر 1944)؛ دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ — کیبنٹ مشن (جولائی

1946)؛ عبوری حکومت (جولائی 1946)؛ ویول سے ماؤنٹ بیٹن تک — میعاد کا تعین اور آخرکار ہندوستان کی رد تشکیل۔ دراصل یہ سب ہندوستان کے مختلف مرحلے تھے۔ اس کا کوئی مثبت نتیجہ کیسے برآمد ہوتا جب ہم لگاتار 'متحدہ ہندوستان' کو پارہ پارہ کرنے کے درپے تھے۔ یہی وہ مختصر سا پُر از واقعات عرصہ ہے جس کے دوران ہم ان مردوں اور عورتوں کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے جا رہے ہیں متحدہ ہندوستان کا مستقبل اس وقت جن کے ہاتھوں میں تھا:

کیا لازم ہے کہ ایک لاچار انسان

جہالت کے اندھیرے میں

تقدیر کے دھارے پر یوں ہی بہتا چلا جائے'

[('سیموئل جانسن: دی وینٹی آف ہیومن وشز' 1749)]

پس منظر

سابقہ عام باتوں کے باوجود 'کرپس مشن' کو ایک ممکنہ شروعات کے طور پر دیکھا جا رہا تھا۔ یہ مانا جاتا ہے کہ اس مشن کے پس پشت سرگرم دیگر عوامل میں کرپس کے دیہی مکان فلکنس (Filkins) میں گزارے گئے ہفتے کے آخری دو دن (Weekend) بھی شامل تھے جس میں شرکت کے لیے نہرو کو چند سال قبل جولائی - اکتوبر 1938 میں انگلینڈ کے دورے کے موقع پر مدعو کیا گیا تھا۔ وہ کرشنا مینن کے ساتھ گئے تھے۔ دیگر مہمانوں میں ایلی، انیورین بیوں، اور ہیرالڈ لاسکی کے ساتھ ساتھ خود کرپس بھی شامل تھے۔ 2 اس طرح اس ملاقات کو انڈین کنسی لی ایشن گروپ کی سب کمیٹی کے اجلاس کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ جو موضوعات زیر گفتگو آئے، ان میں یہ بھی شامل تھا کہ اگلی لیبر پارٹی کی حکومت ہندوستان کو اقتدار کی منتقلی کس طرح عمل میں لائے گی۔ اس کے علاوہ جن دیگر باتوں پر غور کیا گیا ان میں جداگانہ اقلیتی نمائندگی اور رجواڑوں کے ممبران کے انتخاب کی شرط کے ساتھ عام حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کا خیال بھی شامل تھا۔ جیسے ہی یہ ادارہ آئین وضع کرے گا رجواڑوں کے ساتھ تاج برطانیہ کے معاہدے کالعدم ہو جائیں گے، اس سب کمیٹی، میں اس وقت کم سے کم یہی خیال قائم تھا..... پندرہ دن کے بعد لندن میں نہرو نے ایک میٹنگ 3 میں کہا تھا کہ ایک آئین ساز اسمبلی کے حق میں کل ہند وفاق کے خیال کو ترک کر دینا چاہیے۔

اس عرصے کے دوران، ڈومینین حیثیت سے متعلق بحث جاری تھی کیوں کہ 1926 میں لارڈ بیلفور نے حیثیت (STATUS) کی توضیح 'مکمل حکومت خود اختیاری اور برطانوی دولتِ مشترکہ 4 میں شراکت کو ختم کردینے کی ملکی آزادی' کے طور پر کی تھی۔ سرکاری پالیسی سے نا مطمئن ہو کر کرپس نے نومبر 1939 میں، اس وقت ہندوستان کے لیے مستقل انڈر سکریٹری سر اسٹیورٹ کو ایک اسکیم بھیجی جس میں ہندوستان کو ایسی ہی ڈومینین حیثیت دینے کا وعدہ کیا گیا

تھا۔ اس اسکیم میں یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ برطانیہ کے وعدوں کو فوراً عمل میں لایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کو آئین ساز اسمبلی کے ذریعے اپنا آئین وضع کرنے کا حق بھی دینے کی بات ٹھان لی گئی تھی۔ چوں کہ اس کے لیے پارلیمنٹ کے ذریعہ ایکٹ منظور کرانا ہوتا، اس سے تھوڑی بہت تاخیر ناگزیر تھی مگر تاج برطانیہ کی حکومت نے یہ اقرار کیا کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ایک بل پیش کروایا جائے گا اور مناسب موقع پر یہ بل اس سے پہلے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد کرپس نے ایک ایسی دستور ساز اسمبلی کا خاکہ تیار کیا جس کے ارکان کی تعداد دو ہزار ہوتی، جن کا انتخاب موجودہ صوبائی انتخابیہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، ریاستوں کے لوگوں کو مناسب طریقہ پر مناسب نمائندگی دی جاتی۔ بہر حال کرپس نے دستور ساز اسمبلی کے سلسلے میں دوسرے متبادل کے بارے میں بھی اپنا ذہن کھلا رکھا تھا۔ بشرطیکہ وہ متبادل ہندوستان کے متعلقہ فریقوں کے لیے قابل قبول ہوں! برطانیہ ان فیصلوں کی ہی توثیق کرتا جو دستور ساز اسمبلی میں 60 فی صد (3/5) کی اکثریت کے ذریعے پاس کیے جاتے؛ صرف اس شرط کے ساتھ کہ اسمبلی ایک معینہ مدت کا معاہدہ کرے گی؛ (کرپس نے اس معاہدے کی مدت 15 سال تجویز کی تھی) جس کے ذریعے برطانیہ رجواڑوں، اقلیتوں کی خدمات کے تئیں نیز دفاع، مالیات، اور تجارت کے سلسلے میں بھی اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا! یہ کہا گیا کہ فی الوقت برطانیہ جنگ کے دوران 5 ہندوستان کے لوگوں کو موجودہ قانون کے تحت حکومت خود اختیاری کے تمام ممکن فوائد سے مستفید کرانے کے لیے ہندوستان کے لوگوں کے نمائندوں کے ساتھ مل کر اپنی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ان تمام باتوں کا ذکر یہ دکھانے کے لیے کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے سوال پر کرپس کو لیبر پارٹی کے انتہائی روشن خیال لیڈر کے طور پر پیش کرنے کے علاوہ، آخر کیوں اور کس طرح کرپس کی نیک نیتی نہرو کی ذہن میں گھر کر گئی تھی!

ہندوستان کے ایک غیر سرکاری دورے کے سلسلے میں 8 اگست 1939 کو الہ آباد پہنچنے پر کرپس کو اس اسکیم کے بارے میں نہرو کے ساتھ ایک بار پھر تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ نہرو کے ابتدائی ردعمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہرو، کرپس کی تجویز کو ایک طرح کی بنیادی پیش کش سمجھتے تھے حالاں کہ اس میں بالغ رائے دہی جیسی ضروری بات شامل نہیں تھی۔ مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں مسلم نمائندے کسی ایسے نظر ثانی شدہ دستور کے بارے میں کانگریس سے قطعی متفق نہ ہوئے جس میں لیگ کے طبقاتی اور فرقہ وارانہ مفادات کا خیال نہ رکھا جاتا۔ دوسری طرف نہرو نے بالغ رائے دہی کی تجویز کے ذریعے ان کی توجہ مسلم زمینداروں اور متوسط طبقوں پر مرکوز رکھی نہرو کا کہنا تھا کہ اگر ان لوگوں کو ساتھ لے لیا جائے تو کانگریس اقلیتوں کے لیے مصنوعی فرقہ وارانہ نمائندگی کو منظوری دینے کے لیے ابھی راضی ہو جاتی، حالاں کہ انہوں نے DOMINIUN STATUS جیسے الفاظ پر اپنا اعتراض جاری رکھا تھا۔ یہ بات دراصل ان کے ذہن میں بُری طرح بیٹھ گئی تھی۔ معاہدے کی مدت 15 سال کے کرنے کے بارے میں، یا، دستور کی بجائے کسی دوسرے طریقہ سے اقلیتی نمائندگی فراہم کرنے کے بارے میں ان کے ذہن میں کچھ شبہات تھے۔ گاندھی کے سکریٹری مادھو ڈیسائی کو رپورٹ دیتے ہوئے نہرو نے یہ کہا تھا کہ اس اسکیم میں کچھ اچھی باتیں شامل ہیں لیکن اس میں دو یا تین زبردست خامیاں بھی ہیں...... اب یعنی 1939 میں وہ

(نہرو) 1927 والے نہرو نہیں تھے کہ اس معاملے پر گاندھی سے فوراً ہی لڑ جاتے! بہر حال دکھ کی بات ہے ایک متبادل کے طور پر اب وہ ڈومینین درجہ دینے کی بات میں کافی تاخیر ہو چکی تھی۔

اب ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کی پیچیدگیاں دھیرے دھیرے کرپس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں، کیوں کہ تب جی ڈی برلا جیسے کانگریسی بھی یہ اعتراف کرنے لگے تھے کہ 1937 میں کانگریس نے غیر کانگریسی مسلمانوں کو صوبائی کابینہ سے باہر رکھ کر بھاری بھول کی تھی۔ 6 اس کے نتیجے میں اتر پردیش میں لیاقت علی خان جیسے مسلمانوں کو یہ محسوس ہوا کہ انہیں اپنے ہی ملک میں ہمیشہ کے لیے اپوزیشن (حزب اختلاف) بنا کر رکھ دیا جائے گا۔ وہ ثقافتی تحفظات کے ساتھ ساتھ سیاست میں اپنا وزن بھی چاہتے تھے تاکہ اپنے مفاد کی منافی قانون سازی کو ویٹو کر سکیں! ایک بار پھر بدقسمتی سے یہ ہوا کہ واقعات افکار کو مات دے گئے اور شاید تحفظات کا وقت ختم ہو گیا تھا، جناح اب برطانوی حکمرانی سے آزادی کے معاملے کے حل سے پہلے آئینی خطوط پر فرقہ وارانہ مسئلے کا حل چاہتے تھے۔ کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے سلسلے میں ان کے تجربے نے لیگ کے لوگوں کو اور خود جناح کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ جب تک اکثریتی جبر کے خلاف آئینی طور پر قانونی تحفظات فراہم نہیں کیے جائیں گے، مسلمان سب کچھ گنوا دیں گے؛ اس صورت حال کے مضمرات ایسے ہوں گے کہ اکثریتی ووٹ کی بنیاد پر کام کرنے والی دستور ساز اسمبلی میں مسلمان شرکت نہیں کر سکیں گے۔ اس سے بھی زیادہ اہم، حکمتی لحاظ سے بہت ہی نازک اور تکلیف دہ بات بھی ہے: برطانوی ملوکیت کے خلاف تحریک آزادی کانگریس بمقابلہ مسلم لیگ تحریک کی شکل اختیار کر گئی ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ یہ تحریک اب ہندو مسلم مسئلہ بن گئی ہے۔ یہ انگریزی راج کے لیے بہت ہی سازگار صورت حال تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ دوسری عالمی جنگ کے چیلنجوں کا کسی پریشانی کے بغیر مقابلہ کر پاتی، کیوں کہ ہندوستان کی بڑی پارٹیاں خود کو پھوٹ کا شکار بنا چکی تھیں اور انگریزوں کے لیے حکومت کرنے کے سوا کوئی اور کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔

11 دسمبر 1939 کو کرپس نے ٹرین کے ذریعے لاہور کا سفر کیا جس کے دوران انہوں نے چند خیالات پر غور و فکر کیا: صوبوں پر مشتمل ایسے ڈھیلے ڈھالے وفاق کی تقدیر جس کے پاس کچھ محفوظ اختیارات ہوں، صوبے جب چاہیں وفاق سے علاحدگی اختیار کر سکیں، ممکنہ حل کے خطوط کے طور پر مسلم یا ہندو غالب اکثریت والے صوبوں کی تشکیل کے لیے نئی سرحدیں، ایک ایسی دستور ساز اسمبلی جو اسکیم کا خاکہ تیار کر سکے، وغیرہ وغیرہ! دستور ساز اسمبلی کے نتیجے کی بنیاد سے پیشگی طور پر اتفاق کرنا ضروری ہو سکتا ہے۔ 7 اگلے دن 12 دسمبر 1939 کو لاہور میں، جہاں اس وقت یونینسٹ (UNIONIST) پارٹی کی حکومت تھی، وزیر اعظم سکندر حیات خاں کے ساتھ تبادلہ خیال میں کرپس کے افکار کے ساتھ تال میل سامنے آیا — : مفصل قانون سازی کی پیشگی شرط کے طور پر ایک 'ڈھیلے ڈھالے وفاق' کے لحاظ سے تصفیہ!

15 دسمبر 1939 کو کرپس نے بمبئی میں جناح سے ملاقات کی جہاں جناح نے ایک بار پھر ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کو ناممکن قرار دیا جس میں اکثریتی فرقے کو ناگزیر طور مستقل غلبہ حاصل رہتا ہے؛ جناح نے اس بات

پر اصرار کیا کہ دستور ساز اسمبلی اس وقت تک بالکل صحیح طریقہ کار ثابت نہیں ہو سکتی جب تک کہ انگریزوں کو نکال باہر نہ کر دیا جائے۔ اس لیے سب سے پہلے طاقت کے عامل کے بارے میں فیصلہ ہونا ضروری ہے؛ 8۔ اُن کی فوری نوعیت کی تجاویز یہ تھیں کہ........ 'کانگریس، مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ تسلیم کرے، یہ کہ مسلمانوں کو صوبائی حکومتوں میں نمائندگی حاصل ہونی چاہیے، 9 یہ کہ اگر قانون ساز یہ کے دو تہائی مسلم ممبران فرقہ وارانہ بنیاد پر کسی بل کی مخالفت کریں تو اُس پر آگے کی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔' کرپس نے کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے خاتمے پر مسلمانوں سے 22 دسمبر کو یوم نجات منانے کے جناح کے نعرے کے بارے میں بھی سوالات کیے۔ یہیں سے نہرو اور جناح کے درمیان پھر سے ڈائیلاگ شروع کرنے کی تجویز سامنے آئی۔ کرپس کا خیال تھا کہ جناح اس کے خواہش مند ہیں۔ پیش رفت میں ازچن اگلے دن پیدا ہو گئی جب کرپس نے نہرو کو صلاح دی کہ انہیں جناح سے ملاقات کر لینی چاہیے۔ نہرو نے اصرار کیا کہ ملاقات سے پہلے مسلم لیگ یوم نجات منانے کے پروگرام کو واپس لے لے۔ یہ ایک ایسا مطالبہ تھا جسے واپس لینا جناح کے لیے ممکن نہیں تھا کیوں کہ لیگ کانگریس کی غلط حکمرانی سے مسلمانوں کی نجات کے پروگرام کی قیادت کر رہی تھی۔ کیوں کہ کانگریس ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے جناح کی پوزیشن مضبوط ہوتی جائے جب کہ جناح سے ملاقات کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا۔ اس کے علاوہ اس کا مطلب مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہونے کے مطالبے کے تئیں رعایت کی شکل میں لیا جاتا۔ چنانچہ کانگریس نے یہ بات نہیں مانی!

اس دورے سے کرپس کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مدد ملی کہ جہاں کانگریس کوئی نتیجہ برآمد ہونے کی امید میں کچھ مدت خاموش رہنے کے لیے تیار تھی مگر وہ انگریزوں کے ذریعہ اپنی گزارشات کی منظوری کا زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ کے بعد کانگریسیوں نے عوام کی تائید کا دائرہ بڑھانے کے لیے ماوراء آئین مہموں کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی عرصہ کے دوران جناح کی یوم نجات کی اپیل غیر متنازعہ طور پر فرقہ وارانہ غم و غصے سے بوجھل تھی۔ اس سے بھی لیگ اور کانگریس کے درمیان گفت و شنید کی ضرورت اجاگر ہو گئی تھی۔ یہ مذاکرات اب زیادہ اہم ہو گئے تھے۔ مگر راہ میں تمام پرانی رکاوٹیں بدستور موجود تھیں؛ کانگریس لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اور مسلم لیگ تھی کہ اپنے اس وعدے کو دوہراتی رہتی تھی! ایسی صورت حال میں انگریزی حکومت کو مداخلت کرنی ہوتی اور ایک ایسے حل کی پیش کش کرنی پڑتی جو دونوں کے لیے قابل قبول ہوتے ایسا ان دونوں کے تعاون کے آگے پیشگی شرط کے طور پر کیا جاتا۔

ایک دوسری رکاوٹ بھی پیدا ہو گئی یا صرف وائسرائے ہی ان دونوں کو اکٹھا کر سکتا تھا۔ حالاں کہ کرپس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا ہندوستانیوں اور انگریزوں یعنی دونوں میں وائسرائے لنلتھگو کی مذاکراتی صلاحیت کے بارے میں زبردست شکوک و شبہات تھے۔ اس کے بعد اس میں ایک اور نا اہلیت جڑ گئی۔ وائسرائے کی ایگزیکیٹو کی تشکیل اس وقت تک 1919 کا انڈیا ایکٹ کی بنیاد پر ہوتی تھی جو کہ خود وائسرائے، کی تدران چیف - بھارت، ہندوستان میں دس سال کا تجربہ رکھنے والے تین انگریز افسران اور تین غیر سرکاری ہندوستان پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ برطانیہ میں وزیر اعظم چیمبرلین کی کابینہ

میں سر سیموئل ہور (لارڈ پرائیوی سیل)، سر جان سائمن (خزانہ کے چانسلر)، اور لارڈ ہیلی فیکس (خارجہ سکریٹری) جیسے حوصلے مند لوگ سے ملے تھے جن سبھی کو چرچل، جو کہ اب ایڈمنسٹری کے فرسٹ لارڈ بن چکے تھے، بونا سمجھتے تھے اور برطانیہ کی 'بزدلانہ' انڈیا پالیسی کے ذمہ دار قرار دیا کرتے تھے۔ چنانچہ توسیع شدہ مرکزی عاملہ کے لئے لنلتھگو کی مجوزہ تحریک پر کابینہ میں بحث میں چرچل نے پارٹیوں کے دباؤ کو ہرگز قبول نہیں کیا، جو کہ برطانیہ کو درپیش خطرات کا فائدہ اٹھا رہی تھیں۔10 آخر کار کابینہ نے تجویز سے اتفاق کیا مگر وائسرائے کا اقتدار اعلا محفوظ رہے گا، ہندوستان میں فوجیں تعینات کرنے کی برطانیہ کی آزادی متاثر نہیں ہوگی اور جنگ کے دوران نہ تو کسی طرح کی قانون سازی ہوگی اور نہ کوئی ایسا وعدہ کیا جائے گا جو جنگ کے بعد برطانیہ کی پارلیمنٹ کو پابند بناتا ہو:

یہ ہدایت موصول ہونے پر لنلتھگو نے توسیع شدہ عاملہ میں سیٹوں کی تقسیم کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ کے کسی متفقہ بنیاد پر پہنچنے کے امکان کے بارے میں گاندھی، راجندر پرساد اور جناح کو ہموار کرنے کی کوشش شروع کردی! کانگریس نے تعرض کیا: اس کا کہنا تھا کہ 'پہلے' جنگ کے بعد اپنا آزاد دستور وضع کرنے کے ہندوستان کے حق کا اعلان کیا جائے۔ جناح کے مطالبات کی فہرست کافی طویل تھی: لیگ اس طرح کے اعلان کو تسلیم نہیں کرے گی تاوقتیکہ کانگریس مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم کے طور پر تسلیم نہیں کرے گی، اس کے بعد مسلم لیگ کی شکایات کو دور کیا جائے گا، ان شکایات میں کانگریس کی قیادت والے صوبوں کی وزارتوں سے مسلم لیگ کو باہر رکھنے کا معاملہ بھی شامل تھا۔ صورتحال ایک بار پھر جمود کا شکار ہوگئی اور لنلتھگو کو اس نتیجے پر پہنچنا پڑا جو کہ شروع سے ہی واضح تھا' .... دونوں فرقوں کے درمیان (کسی) اتفاق رائے کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔11 یہ اکتوبر 1938 کے شروع کی بات ہے۔

10 جنوری 1940 کو بمبئی کے اورینٹ کلب میں تقریر کرتے ہوئے لنلتھگو نے کہا تھا کہ ......'برطانیہ کا مقصد ہندوستان کو ویسٹ منسٹر جیسی ڈومنین حیثیت دینا تھا اور یہ کہ وہ کانگریس، لیگ اور رجواڑوں کو نمائندگی دینے کے لیے اپنی عاملہ میں جلد ہی توسیع کریں گے، گاندھی نے کچھ پیش رفت محسوس کرتے ہوئے لنلتھگو سے ملاقات چاہی جو 5 فروری 1940 کو ہونی طے پائی۔ اس اثناء میں لنلتھگو کانگریس کے ساتھ مفاہمت کے لئے لیگ کو کم سے کم شرطوں کا پتہ لگانے کے لئے جناح سے ملاقات کرچکے تھے۔ یہ شرطیں اس طرح تھیں: صوبوں میں مخلوط وزارتیں؛ صوبائی قانون سازیہ میں پیش کیے جانے والے کسی بھی ایسے بل کو ویٹو کردینے کا مسلم ارکان کو حق جس کی مخالفت ان میں سے دو تہائی ممبران کرچکے ہوں؛ وندے ماترم کو ترک کرنے؛ سرکاری اور عوامی عمارتوں پر کانگریسی جھنڈا الہرانے پر روک۔ یہ مطالبات، لفظ آغاز کے طور پر کافی حد تک نامبارک تھے۔ دوسرے محاذ کے کاروائی کی وجہ سے ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ چرچل اور سائمن کسی بھی طرح کی پہل کے خلاف تھے۔ چرچل کانگریس کے خلاف مضبوط موقف اپنانے کی وکالت کررہے تھے۔ چرچل کا خیال تھا کہ کئی برس کے بعد پہلی بار کانگریسی حکومت والے صوبوں میں ایک بار پھر انتظام ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔ اس کا اس سلسلے میں یہ بھی کہنا تھا کہ وہ ہندو اور مسلم فرقوں کے درمیان اتحاد کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے قطعی بے چین نہیں تھے۔ دراصل اس طرح کا

اتحاد عملی سیاست کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ اور اگر اس طرح کا اتحاد قائم بھی ہو جائے تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا متحدہ فرقے ہمیں باہر کا راستہ دکھانے کے لئے ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ وہ ہندو مسلم مناقشے کو ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی کے لئے آڑ سمجھتے تھے۔ 12 (ہمیں آخر 1857 کی بندوقوں کی آواز کیوں سنائی دیتی رہتی ہے اور انگریزی راج کی نفسیات پر ان کا اثر ابھی تک کیوں چھایا ہوا ہے؟)۔

اس سلسلے میں سر جان سائمن کا یہ بھی کہنا تھا کہ....'ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا چاہئے'۔ 13 اور چیمبر لین اتنے معروف تھے کہ وہ اس سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔'اب لنلتھگو کے سامنے کوئی متبادل نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ لنلتھگو کو بھی یہ کہنا پڑا کہ۔'سب سے اچھا یہ ہوگا کہ 'کوئی کارروائی ترک کی جائے' اور یہ کہ۔' اور کانگریس کے پیچھے بھاگنے کے احترام کیا جائے۔ 14

وائسرائے کے ساتھ گاندھی کی بات چیت 6 فروری 1940 کو ختم ہوگئی جو کہ نامکمل رہی، سب سے بڑھ کر اس وجہ سے کہ خود لنلتھگو سے کہیں زیادہ چرچل اور سائمن بھی پہل کے خلاف تھے۔ درحقیقت کسی نئی تحریک کو آگے نہ بڑھنے دینے کے لئے سائمن نے 13 فروری 1940 کو چیمبر لین کو باقاعدہ لکھا تھا۔ اس سلسلے میں سائمن نے جناح کی اس شکایت کا بھی ذکر کیا تھا کہ ایسا....'کبھی ظاہر نہیں ہوا کہ وائسرائے کا گاندھی سے کوئی اختلاف ہے اور ہمیشہ یہی تاثر چھوڑتا ہے کہ وہ گاندھی سے پہلے ہی سے ملاقات کرنے والے ہیں اور یہ کہ گفت وشنید پھر سے شروع ہو جائے گی'۔ 15

سائمن نے لکھا کہ۔'یہ ہمارے ہندوستانی سیاست کا بندوبست کے خلاف مضبوط بنیادوں پر کی گئی نکتہ چینی ہے.... ایک بڑا عرصہ گزر چکا ہے.... اور یہ ایک ایسا طریقہ کار اور طرز عمل ہے جو سنگین ترین خطرات سے پُر ہے'۔ 16 کانگریس کو زیادہ زیادہ پیش کش کرنے کے نتیجے میں۔'یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ ہم مسلسل پسپائی اختیار کئے ہوئے ہیں' اور اس کا نتیجہ' ہماری تباہی کی شکل میں' سامنے آئے گا۔ 17

چرچل نے اس بات سے اتفاق کیا اور چیمبر لین کو یہ لکھا کہ اسے سائمن کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔' گاندھی اور کانگریس کے پیچھے بھاگتے رہنے کی پالیسی' 18 جسے وائسرائے ایسا فرض منصبی سمجھتا ہے' انگریزی اقتدار کے ہر ستون کو کمزور تر کرتی جا رہی ہے' سیکریٹری آف اسٹیٹ کو وائسرائے کے لئے ایسی ہدایات جاری کرنی چاہئیں جن میں جنگ کے دوران اس کے طرف عمل کی توضیح اور تصحیح کی گئی ہو۔

اس اثناء میں گھریلو محاذ پر بھی واقعات بڑی تیز رفتاری سے رونما ہو رہے تھے۔ کانگریس کے رام گڑھ اجلاس (20,19 مارچ 1940) نے ایک قرارداد پاس کر کے پورن سوراج کا مطالبہ کیا اور بالغ رائے دہی کی بناء پر چنی گئی اسمبلی کے ذریعہ دستور اساسی وضع کیے جانے کا نعرہ دیا۔ اسی طرح مسلم لیگ نے بھی لاہور کے اجلاس میں 23 مارچ 1940 کی قرارداد پاکستان منظور کی!

نومبر 1939 اور مارچ 1940 کی درمیانی مدت میں سیکریٹری آف اسٹیٹ کی تمام تر کوششوں کے باوجود، اپنا دستور وضع کرنے کے ہندوستان کے حق کی بنیاد پر کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت شروع کرنے سے متعلق کرپس کی حکمت عملی اپنانے کے لئے نہ تو وائسرائے ہی تیار تھا اور نہ کابینہ! اب اس قیاس آرائی کا کوئی فائدہ نہیں کہ آیا اس سے بھی زیادہ باصلاحیت کوئی ایسی شخصیت' جسے ہندوستان کے بارے میں پوری جانکاری رہی ہو، پارٹیوں کو اس طرح کے انتہا پسندانہ مطالبات سامنے رکھنے سے روک سکتی تھی؛ جو کہ رام گڑھ میں اور لاہور میں پیش کیے گئے؟ بہر حال اس تناظر میں دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرپس نے جو نتائج دسمبر 1939 میں اخذ کیے تھے وہ اس وقت کی سرکاری پالیسی کے مقابلے میں کہیں زیادہ اس وقت کے سیاسی حقائق سے ہم آہنگ تھے۔ مارچ 1940 میں کرپس نے جو کہ اس وقت چین میں تھا۔ نہرو کو لکھ کر اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ برطانوی حکومت احمقانہ طرز عمل سے کام لے رہی ہے جب کہ مجھے امید یہ تھی کہ وائسرائے سے میری بات چیت کے بعد حالات سدھر جائیں گے'۔ 19

اگست، 1940 کی پیش کش

10 مئی 1940 کو ونسٹن چرچل نے جنگ زدہ برطانیہ کے وزیر اعظم کے عہدے کا حلف لیا۔ یہی وہ وقت تھا جب انگریزوں کی فکر اور توانائی کو ان کے سب سے بڑی دشمن نازی جرمنی کے مقابلے کی جنگ میں جھونک دیا گیا تھا۔ حالات واقعات سے باخبر رہے ہوئے کرپس نے تب ہندوستان کے لئے اگلے سکریٹری آف اسٹیٹ لیو پولڈ ایمری سے بات کی اور اپنی اسکیم کے بارے میں بتایا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ کانگریس کے سلسلے میں سختی سے کام لیا جائے گا یا مصالحانہ رویہ اپنایا جائے گا کیوں کہ اب جنگ کی دوران انگریزی راج کے سامنے سِول نافرمانی کا خطرہ کھڑا تھا۔ کرپس نے ذاتی طور پر مصالحت کی تائید کرتے ہوئے، یہ اعلان کرنے کے لئے کہا کہ ہندوستان کو اپنا مستقبل طے کرنے کا حق حاصل ہوگا اور پارٹیوں کو اکٹھا کرنے کے مقصد سے دو یا تین مذاکرہ کاروں کی ایک ٹیم بھیجی جائے گی۔ کرپس نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستانی رائے عامہ میں موجود اختلاف صرف صورت حال کو اور بگاڑنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ اُس نے اتفاق رائے کا نقطۂ آغاز معلوم کرنے اور وہاں سے کام شروع کرنے کی فوری ضرورت کے حق میں زوردار دلیل دی 20۔ یہ اس وقت ہندوستانی مسلے کو حل کرنے کے سلسلے میں کرپس کی اہم خدمت تھی کیوں کہ مئی 1940 میں چرچل کے وزیر اعظم بننے کے چند روز کے اندر ہی کرپس کو ماسکو بھیج دیا گیا جہاں وہ جنوری 1942 تک سفیر کے طور پر مامور رہا۔ چرچل ماسکو میں کسی بائیں بازو والے کو برطانیہ کے نمائندے کے طور پر دیکھنا چاہتا تھا کیوں کہ اسٹالن جنگ میں برطانیہ کا اہم ترین اتحادی تھا لیکن چرچل ہندوستان اور کرپس کو بھی راہ سے ہٹا دینا چاہتا تھا، بطور خاص ایسے وقت میں جب کہ وہ جرمنی کے خلاف زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا'

یورپ میں رونما ہونے والے واقعات کا سلسلہ، جو کہ شروع سے ہی تباہ کن رہا، کچھ اس طرح کا تھا۔ اس نے

اضافی مشکلات کی روک تھام یا ہندوستان میں انقلابی تحریکات کے تدارک کا کام کیا، اور جنگ میں برصغیر کا بلکہ اس ملک کے لیڈروں کا مدد حاصل کرنا ہی مقصد بن گیا۔ 2 جون 1940 کو ایمری نے لنلتھگو کے سامنے تجویز رکھی اور برطانیہ اپنا آئین خود وضع کرنے کے ہندوستان کے حق کو مان لے، مگر اس بندش کے ساتھ کہ برطانیہ کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے مناسب انتظامات کیے جا رہے ہیں اور اس شرط کے ساتھ کہ ہندوستان کی پارٹیاں اس بات سے اتفاق کرلیں کہ جنگ کے بعد آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے گی۔ لنلتھگو کے ذہن میں کچھ شبہات تھے۔ لیکن ایمری نے کوشش جاری رکھی، شاید اس وجہ سے کہ اسے جنگ کی صورت حال کا بہتر احساس تھا یا حالاں کہ اسے یہ خدشہ تھا کہ ہندوستان کے سلسلے میں ایک اور بامعنی پہل کے لیے چرچل کی جنگ کے زمانے کی کابینہ کو ہموار کرنا آسان نہ ہوگا۔ ایمری جنگ کے بعد ہندوستان کو ایک مکمل ڈومی نیز کا درجہ دیے جانے کے بارے میں کام کر رہا تھا، بشرطیکہ ہندوستان کی سیاسی قیادت دستور کے بارے میں متفق ہو جائے۔ ایمری کو امید تھی کہ اس سلسلے میں چرچل اور سائمن کی طرف سے پیش آنے والی مشکلات کو دور کرانے میں جنگی کابینہ کے کچھ لیبر ممبران مدد کریں گے۔ جب 12 جولائی 1940 کو کابینہ کی میٹنگ ہوئی تو چرچل نے اس طرح کے کسی وعدے کا اعلان کرنے کی مخالفت کی اور چرچل کے نوآبادیاتی سکریٹری لارڈ لائیڈ کو ایسی کسی بھی تحریک یا کوشش سے نفرت تھی جس سے کہ انگریزوں کے خلاف ہندو اور مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آجاتے! اس کے بعد چرچل نے سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور لنلتھگو کو تار بھیج کر براہ راست طریقہ پر یہ سوال کیا کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ برطانیہ پر کسی بھی وقت حملہ ہوسکتا ہو، اس طرح کا اعلان کو کرنے میں کہاں کی دانش مندی ہے! 21 یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے میں جب کہ برطانیہ پر جنگ کا زبردست دباؤ تھا، لندن میں کابینہ نے ہندوستان کے مائل کے لیے کافی وقت دیا اور کافی کوشش کی اور پارلیمانی معقولیت پسندی کے پہلو کو نمایاں رکھا۔

لنلتھگو نے ایک بار پھر پلٹا کھایا اور چرچل کو یہ جواب دیا کہ اس نے یہ کوشش ایمری کی اس درخواست پر کی تھی کہ ایک ایسے اعلان کے بارے میں کابینہ کی تائید حاصل کی جائے جس سے کہ ماضی کے سارے بیانات القط ہو جاتے ہیں۔ اب چوں کہ اسے کابینہ کے تحفظات کا علم ہوگیا ہے، اس لیے وہ نیا مسودہ بھیجے گا۔ اس میں بھی یہ مان لیا جائے گا کہ برطانیہ کا مقصد جنگ کے خاتمے کے ایک سال کے اندر اندر ڈومینین حیثیت دے دینے کا ہے، اور یہ کہ ہندوستانیوں کو اپنا آئین خود ہی وضع کرنا چاہیے، طریقہ کار کی تبدیلی کو نظر انداز کر دیا جائے گا، برطانیہ کی ذمہ داریوں پر زور دیا جائے گا۔ اور کسی بھی طرح کے معاہدے کے ذکر کو حذف کر دیا جائے گا۔ اس کا آخری نکتہ زبردست خسارے کا سبب تھا، کیوں کہ جب اسے پہلی بار پیش کیا گیا تھا تو اس میں........ ایک معاہدے کے مساوی فریق کے طور پر برطانیہ اور ہندوستانی ڈومینین کا حیثیت میں مساوی ہونا مضمر تھا۔ جب لنلتھگو کا نظر ثانی کردہ مسودہ 25 جولائی 1940 کو کابینہ کے سامنے رکھا گیا تو چرچل نے یہ کہا کہ ایمری نے اپنے رفقاء کو یہ باور کرا کر گمراہ کیا ہے کہ یہ پہل وائسرائے کی طرف سے کی گئی تھی۔ چرچل کی طرف سے دوسرا حملہ یہ ہوا کہ لنلتھگو کے ساتھ ایمری کی ساری مراسلت کو کابینہ کے وزراء کے سامنے رکھنے کے لیے کہا گیا۔

پانچ دن بعد 30 جولائی 1940 کو، جنگی کابینہ نے چرچل کی اس تجویز پر غور کیا کہ — کابینہ پیشگی طور پر کسی ایسے 'ادارے' کا وعدہ نہیں کر پائے گی جو کہ دستور وضع کرے گا، ایسا دستور جس سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر اتفاق کریں گے۔' 22 نیز یہ کہ مستقبل میں برطانیہ کی پارلیمنٹ کسی بھی طرح، اور فوری طور پر پابند بنانے والے کسی قدم کے ذریعے، خود کو ہرگز پابند نہیں محسوس کرے گی۔ بہرحال ان سارے امور پر جنگ کے بعد توجہ دی جائے گی۔ چرچل نے ڈومینین حیثیت دینے کے سلسلے میں میعاد کی حد کے ذکر کو حذف کر دیا اور اس کی جگہ پر یہ کہا کہ جنگ کے بعد کم سے کم مدت میں ایک ایسے ادارے کی تشکیل میں مدد کرے گا جو دستور وضع کرے گا اور ایسا کرنے کی بنیادی ذمہ داری خود ہندوستانیوں کی ہوگی۔ اپنا آئین خود وضع کرنے کا ہندوستانیوں کا حق؛ ڈومینین حیثیت کی ایک محدود میعاد اور ہندوستان کی مساوی حیثیت کی علامت، یعنی دونوں کے درمیان معاہدے کی بات ہی ختم ہوگئی تھی۔ یہی حشر دولت مشترکہ کے شراکت کار ممبر کے طور پر ڈومینین درجہ دینے کی تجویز کا بھی ہوا!

6 اگست 1940 کو اس تجویز کا اعلان کر دیا گیا۔ وائسرائے کی پیش کش میں ماضی کی پالیسی کی تسلسل پر زور دیا گیا (جب کہ اس کا اظہار اکتوبر 1939) میں کیا گیا تھا؛ یہ کہ ڈومینین کو مستقبل کے مقصد کی حیثیت حاصل رہے گی یا اور موجودہ پیش کش دراصل پارٹی نمائندوں، کو شامل کرنے کے لیے وائسرائے کی کونسل میں توسیع اور جنگ سے متعلق صلاح کار کمیٹی کی تشکیل کے لیے ہے۔ اقلیتوں کے تئیں برطانیہ کی ذمہ داریوں کا ذکر ایک پیراگراف میں کیا گیا تھا جسے بعد میں مسلمان ایک عہد کی شکل دلانے میں کامیاب ہو گئے تھے' — یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جلالت مآب کی حکومت ہندوستان کے امن اور اس کی بہبود کے لیے اپنی ذمہ داریاں کسی ایسے نظام حکومت کو منتقل کرنے کے بارے میں غور نہیں کر سکتی تھی جس کی حاکمیت اور اختیارات کو ہندوستان کی قومی زندگی کے بڑے اور طاقت ور عوامل ماننے سے انکار کر دیں'۔ 23 جو چیز لیگ کے لیے ایک عہد کی حیثیت رکھتی تھی۔ (جو کہ 23 مارچ 1940 قرارداد پاکستان کے بعد کی چیز تھی) وہ دوسرے بہت سے مبصرین کے ہندوستان کی تقسیم کی پیشگی اعلان کے مماثل تھی۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ تمام ہی پارٹیوں نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ برطانیہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اگر وہ ایسا کر سکتا، تو انگریزوں کے ذریعے استحصال کے لیے اس ملک کو ہمیشہ اپنا غلام بنا کر رکھتا۔ اس پر وائسرائے نے صلاح دی اور کابینہ نے اس سے اتفاق کیا کہ ان حالات میں وائسرائے کی کونسل میں توسیع کی کارروائی جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بہرحال مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اس کے برعکس فیصلہ کیا۔ اس نے وائسرائے کے اعلان پر اطمینان کا اظہار کیا اور جناح کو اس سلسلے میں گفتگو سے مزید تفصیلات حاصل کرنے کا اختیار دے دیا، بہرحال وائسرائے کے ساتھ بات کے بعد جناح نے بھی اس پیش کش کو مسترد کر دیا؛ وہ وائسرائے کی کونسل کے ہندوستانی ممبران میں مسلم لیگ کی اکثریت

چاہتے تھے جس سے وائسرائے کسی طرح بھی اتفاق نہیں کر سکتا تھا اور اس نے نہیں کیا۔ جناح نے بڑا قانونی سوال اٹھایا تھا۔ 'اگر چہ لیگ حکومت چلانے کے سلسلے میں بھاری ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار ہے جب کہ کانگریس سول نافرمانی کی تحریک چلا رہی ہے، اگر کانگریس نے اپنا مشغلہ بدل دیا اور کونسل میں پھر سے شرکت فیصلہ کر لیا تو کیا ہوگا؟ کیا ایسے میں وہ پارٹی جو تعاون کر رہی ہے، یعنی کہ مسلم لیگ، کیا اس کے نتیجے پر نہیں پہنچے گی کہ حکومت نے اس سے منھ موڑ لیا ہے اور کانگریس کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس بات کی ضمانت دینے کے لیے کہا کہ لیگ کے ساتھ معاہدہ ہو جانے کے بعد، مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر کانگریس کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا..... وائسرائے نے اسی طرح کے حالات میں کونسل کے ممبروں کے ساتھ صلاح مشورے کی ضرورت کو تو مانا مگر جناح کو جلالت مآب کی حکومت کے فیصلوں کو ویٹو کر دینے کا اختیار دینے سے اتفاق نہیں کیا۔ چنانچہ 26 دسمبر 1940 کو مسلم لیگ نے ایگزیکٹیو کونسل اور دفاعی مشاورتی ادارے سے متعلق دونوں پیش کش کو مسترد کر دیا۔

تاہم جنگ کے دوران جناح نے جنگ میں تعاون کے سوال پر منصوبہ بند اور متوازن رویہ برقرار رکھا۔ جناح نے کہا کہ مسلم لیگ حکومت میں موثر حصہ حاصل کیے بغیر مکمل طور پر مثبت موقف اختیار نہیں کر سکتی مگر وہ جنگ سے متعلق کوششوں میں رکاوٹ بھی نہیں پیدا کرے گی۔ صوبوں میں مسلم لیگ کے وزراء کو اپنے فرائض انجام دینے کی اجازت ہوگی لیکن اگر حکومت نے مسلم لیگ کے مفادات کے منافی کوئی قدم اُٹھایا تو وزراء استعفا دے دیں گے اور لیگ حکومت کے خلاف موقف اختیار کرے گی۔

جہاں تک کانگریس کا سوال ہے اُسے اپنے موقف کی سیاسی قیمت چکانی پڑی۔ اس کے ذریعے اگست میں کی جانے والی پیش کش قبول کر لیے جانے کی صورت میں صوبوں میں اس کی حکومتیں بحال ہو جاتیں! کانگریس لیڈروں میں محض سردار ولبھ بھائی پٹیل اور سی۔ راج گوپال اچاری نے ہی موافقانہ رویہ اپنایا تھا۔ جب وائسرائے ان تجاویز کے سلسلے میں دوسرے لیڈروں کے ساتھ تبادلہ خیال کے لیے بمبئی آیا تھا تو اس سے ملنے کے لیے پٹیل کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ پارٹی کو اندر سے، خاص طور پر ناراض سوشلسٹ گروپ کی طرف سے درپیش مشکلات کو بخوبی سمجھتے ہوئے پٹیل، تجویز میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کے خلاف نہیں تھے۔ ایسے موقع پر بمبئی میں وائسرائے اور پٹیل کی ملاقات سے اس سلسلے میں مدد ملی ہوتی۔ مگر اس سے پہلے یہ ضروری تھا کہ وائسرائے کو، ملاقات کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کے سلسلے میں پٹیل کے زاویہ نگاہ سے آگاہ کر دیا جائے۔ لنلتھگو جب جنوبی ہندوستان میں تھا تو اس نے سی راج گوپال اچاری سے بھی ملاقات نہیں کی تھی اور بدقسمتی سے پٹیل کو بمبئی میں وائسرائے سے ملاقات کے لیے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ جب پٹیل کو اس سلسلے میں دعوت نامہ بھیجا جانے والا تھا کہ مولانا آزاد کا تار آ پہنچا، جن کو کانگریس کے صدر کی حیثیت سے دعوت نامے میں شامل کیا جانا تھا۔ تار میں کہا گیا تھا کہ ان کے خیال میں 8 اگست کی تجویز میں تصفیے کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے۔' اس لیے انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کے لیے بمبئی آنے سے معذرت کر لی۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری الیتھوائر نے یہ نتیجہ اخذ کیا

کہ پٹیل سے وائسرائے کے ساتھ اکیلے ہی ملاقات کے لیے کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس پر پٹیل کا ردعمل کافی مایوس کن تھا، کیوں کہ اُن کا خیال یہ تھا کہ صلاح ومشورے کا ایک اور موقع گنوا دیا گیا، نیز یہ کہ یہ اگست تجویز بھی ناکام ہوئی اور اس کی وجہ سے سول نافرمانی اور انگریزوں کے جبر واستبداد کی انتقامی پالیسی اور قید وبند کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن چوں کہ صرف یہی طریقہ کار زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے لنلتھگو نے اعتدال پسندوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے 22 نومبر 1941 کو ایک اور رعایت کی پیش کش کی؛ اُس نے نیشنل ڈیفینس کونسل کی تشکیل کرنے، جس کا کافی پہلے وعدہ کیا جا چکا تھا، اور اس کی ہندوستانی رکنیت بڑھانے کی تجویز پیش کی۔ چرچل نے اس پر فوراً ہی اپنا ردعمل ظاہر کیا جو کہ بہت ہی خراب تھا، 'ہندوستانیوں کو عہدوں کی شکل میں اس طرح کی مراعات دینے سے نہ تو جنگ میں کوئی مدد ملے گی اور نہ ہی اپوزیشن کو خاموش کیا جا سکے گا، بلکہ اس سے نئے تنازعات پیدا ہو سکتے ہیں۔' اس موقع پر اس طرح کی آگاہی کے باوجود لنلتھگو نے اپنی کوشش جاری رکھی اور اپنی اس تجویز کو منظور کرانے میں کامیاب رہا۔ 1941 کے موسم گرما میں دوبارہ تشکیل کی گئی وائسرائے کی مجلس عاملہ میں کمانڈر ان چیف، داخلہ، مالیات اور مواصلات کے لیے تین سرکاری برطانوی ممبران اور اب آٹھ ہندوستانیوں کو شامل کر لیا گیا۔ اس طرح وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کو پہلی بار اکثریت حاصل ہوگئی تھی، مگر اس کی حیثیت خالی خولی عددی دلاسے کے سوا کچھ اور نہیں تھی، کیوں کہ حکومتِ ہند کے آئین میں کوئی ردوبدل نہیں کیا گیا تھا اور کسی ہندوستانی کو کوئی قلم دان نہیں دیا گیا۔... وائسرائے نے امن وامان، مالیاتی استحکام، اقلیتوں وغیرہ کے سلسلے میں اپنی خصوصی ذمہ داریوں کو اپنے پاس ہی رکھا۔ یہ وہ امور تھے جن کے سلسلے میں اُسے اپنی صواب دید سے اقدام کرنا تھا۔ نیشنل ڈفنیس کونسل کی حیثیت محض ایک صلاح کار تنظیم کی رہی، جس کا کام —— صوبوں اور ریاستوں کو، نیز تجارت، صنعت اور لیبر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو جنگ کے معاملے میں راست طور پر مرکزی حکومت کے رابطے میں لانا تھا' —— 24 اس میں (22) برطانوی ہندوستانی تھے جن میں سے بیشتر صوبائی اسمبلیوں سے اور (9) رجواڑوں سے لیے گئے تھے۔

اگرچہ چرچل نے کونسل کی تشکیل نو کو مان لیا لیکن جب ہندوستان کے تعلق سے برطانیہ کے مقاصد کا سوال اٹھا تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یہ موقع روزویلٹ - چرچل اٹلانٹک چارٹر پر اس کی تقریر کا تھا جس پر اگست 1941 میں دستخط کیے گئے تھے۔ اس چارٹر کی دفعہ 3 میں —— 'لوگوں کے اپنی پسند کے طرز حکومت کے انتخاب کے حق ——' کا ذکر کیا گیا تھا۔ 25 یہ ایک اہم بات تھی کہ یہاں تک کے امریکی سفیر —— گائی وینٹ —— 26 کی صلاح کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا جسے چرچل نے اپنی مجوزہ تقریر کی ایک نقل پیشگی طور پر بھیج دی تھی۔' وینٹ کا خیال تھا کہ —— اس دفعہ کا ہندوستان پر اطلاق نہ کرنے کے نتیجے میں —— صرف یہی ہوگا کہ —— 'سامراج کے الزام میں شدت پیدا ہو جائے گی اور برطانیہ عظمیٰ' 'کچھ نہ کرنے کی پالیسی' کی حالت میں رہ جائے گا۔ 27 چرچل نے اپنی تقریر کے متعلقہ اقتباس کو بدل دینے سے انکار کر دیا... اس نے 9 ستمبر 1941 کو ہاؤس آف کامنس میں کہا کہ یہ دفعہ صرف ان یوروپی اقدام سے تعلق رکھتی ہے جو نازیوں کے زیر تسلط ہیں۔ اس کا - ہندوستان، برما غیر مملکت کے دوسرے حصوں میں آئینی حکومت کے فروغ' - سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

چرچل کا اصرار تھا کہ تاج برطانیہ کے 29 علاقوں اور اس کی رعایا میں اپنی حکمرانی کے اداروں کے ترقی پسندانہ ارتقا اور نازی ازم سے یورپ کی نجات کے درمیان فرق کیا جانا ضروری ہے۔ بہر حال اس کے قطعی برعکس، اٹلانٹک چارٹر کی اس تقریر نے ناراضگی کی لہر کو اور بھی شدید کر دیا اور اب کے مقابلے تب برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان خلیج بہت زیادہ وسیع ہو گئی تھی۔

کرپس مشن

چرچل نے ہاؤس آف کامنس میں (ہندوستانی احساسات کے خلاف) اس جارحانہ اٹلانٹک چارٹر کی ابھی وضاحت کی ہی تھی کہ واقعات امید افزا تیز رفتاری سے رونما شروع ہو گئے۔ 9 ستمبر 1941 کی اس پالیسی تقریر کے چند ہفتوں کے اندر اندر جاپانی طیارے نے پرل ہاربر میں امریکی جنگی جہاز یو ایس اے اری زونا کو غرقاب کر دیا۔ اس ایک ہی حیرت انگیز اور انتہائی جوکھم بھرے اقدام کے دو انتہائی اہم عواقب یکے بعد دیگرے سامنے آئے: امریکہ اپنی پوری صنعتی، تکنیکی، مالی اور فوجی طاقت کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گیا؛ اور دوسرے یہ کہ اس طرح دوسری عالمی جنگ ایشیا تک پہنچ گئی۔ جاپان کے خلاف اس جنگ میں ہندوستان کی عسکری مرکزیت تیزی سے سامنے آ گئی۔

جاپانی فوجیں حیرت انگیز تیز رفتاری سے اس طرح آگے بڑھتی گئیں، کہ یورپ میں جرمن افواج کی ابتدائی پیش قدمی کی یاد تازہ ہو گئی۔ ان کے تابڑ توڑ حملوں میں ایک کے بعد دوسرا ملک پسپا ہوتا گیا؛ پھر پرل ہاربر کے واقعہ کے ڈیڑھ ماہ بعد، 15 فروری 1942 کو سنگاپور میں برطانوی افواج کے کمانڈران چیف جنرل پرسیور نے جاپان کے جنرل یاماشیٹا کی حملہ آور فوجوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ جلد ہی برما (میانمار) بھی زد پر آ گیا، اور رنگون بھی، تو کیا اس کے بعد ہندوستان کی باری تھی؟ کیا اب ہندوستان کو بھی مشرق کی طرف سے حملہ کا سامنا کرنا پڑے گا؟ فیلڈ مارشل لارڈ ایلین بروک نے اپنے اسی تاریخ (12 فروری 1942) کے روزنامچے میں بڑی افسردگی کے ساتھ تحریر کیا۔ 'کسی مملکت کی سلامتی کے لیے لازمی لازمی تحفظ کا انتظام نہ کرنے کی اب ہم بہت بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔ ماضی میں مملکتوں کے زوال کی عام طور پر یہی وجہ رہی ہے۔' یہ ایک طرح سے برطانوی سلطنت کے زوال کی ابتدا کی پیش گوئی تھی۔ اس کے علاوہ سنگاپور کا ہاتھ سے نکل جانا اتحادیوں کے حوصلے پر ایک کاری ضرب تھی۔ اگرچہ بعد میں سنگاپور کو واپس حاصل کر لیا گیا، مگر اس کو بھاری قیمت چکانی پڑی کیوں کہ انگریز اپنے پرانے استعماری حوصلے کو دوبارہ پیدا نہ کر سکے۔

واضح طور پر، اس طرح کے حالات میں 'کچھ نہ کرنے کی پالیسی' کوئی متبادل نہیں تھی۔ ہندوستانی پارٹیوں کے ساتھ گفت و شنید پر مبنی نئی پہل ضروری تھی اور ایسا کیا بھی گیا۔ چوں کہ اسٹیفورڈ کرپس کا ہی ایک ایسا تعمیری رویہ تھا جو کہ جنگ کے ابتدائی دو برسوں میں تیار کیا گیا تھا، اس متبادل کو پھر سے زندہ کیا گیا حالاں کہ واضح طور پر جنگ کو برطانیہ عظمیٰ کے سب سے اہم سروکار کی حیثیت حاصل رہی۔ اور ہندوستان کے مستقبل کو نسبتاً کم ترجیح حاصل رہی؛ نیز یہ کہ جنگ کے زمانے کے چرچل کی قد آور شخصیت کے مقابلے میں کرپس سامراجی مشینری کے ایک کم تر اہل کار تھے۔ بہر حال جس چیز سے مدد ملی وہ

ممبران پارلیمنٹ کے کل پارٹی گروپ کے خیالات تھے۔ اس گروپ کے ممبران، جیسا کہ سرجارج شسٹر 30 نے ایمری کو بتایا تھا، ہز مجسٹیز کی حکومت (HMS) کی 'خالصتہ' منفی پالیسی' سے بے چین تھے۔ اس گروپ نے جس لائحہ عمل کی بات کی وہ کرپس کے طریقہ کار کے ہی مشابہ تھا یعنی کہ — ایک نئے دستور کی تفصیلات کے بارے میں تبادلہ خیال جیسی ذہنی مشقت میں ہندوستانی پارٹیوں کے لیڈروں کو شامل کرنے کے لیے ایک پارلیمانی مشن بھیج دیے۔ لنلتھگو نے شروع میں اس خیال کو مسترد کر دیا۔ لیکن 7 دسمبر 1941 کو پرل ہاربر جاپان کے حملے کے بعد اس عرضداشت کو کئی طرف سے حاصل ہوئی۔ ہندوستان کو اب بحرالکاہل اور جنوب مشرقی خطے میں کارروائی کے لیے ایک اہم اڈے کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ صرف ایک ماہ کے اندر اندر چرچل کو تین اہم حلقوں — اپنی کابینہ کے لیبر ممبران، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر، اور ہندوستان سے سرتیج بہادر سپرو اور ہندو مسلم اعتدال پسند گروپ کی طرف سے سفارشات موصول ہوئیں۔ ایک دوسرا عامل بھی تھا؛ دوسری عالمی جنگ اب ہندوستان کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اس جنگ کے تقاضوں اور جاپانیوں کی پیش قدمی پر روک لگانے کی ضرورت نے اچانک ہی ہندوستان کی عسکری معنویت کو ہی بدل دیا۔

فروری 1941 کے اوائل میں سرتیج بہادر سپرو نے ہندو مسلم کے سوال پر گاندھی اور جناح کے درمیان مصالحت کے لیے کوشش کی۔ یہ کوشش ٹائیں ٹائیں فش ہو گئی کیوں کہ گاندھی نے جناح سے جو کہ خود کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ بتاتے تھے، خالصتہ ایک ہندو لیڈر کے طور پر ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال جب جاپانی ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے اور یہاں تک کہ انہوں نے کاکی ناڈ، وشاکھاپٹنم اور کلکتہ پر ایک دو بم بھی پھینکے تھے، (جس سے کہ غیر ضروری ہراس پھیل گیا تھا)۔ جب مدراس کے ساحل سے چند میل کے فاصلے پر جاپانی جہاز بھی دیکھے گئے تو اس طرح کی کسی میٹنگ کی معنویت ہی بالکل مختلف ہو گئی۔

مدراس کے گورنر آرتھر جیمس ہوپ نے، جو رن کیلور کا دوسرا بیرن تھا، بدحواسی میں اپنے برطانوی عملے کو ساتھ لے کر اوٹا کمنڈ بھاگ گیا تھا۔ سنگاپور کی یاد ابھی اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ مگر محض اس بدحواس افسر کی گھبراہٹ کی ہی بات کیوں کی جائے۔' اس وقت کا کمانڈر ان چیف لارڈ ویول اس حد تک برہم ہو گیا تھا کہ اس نے وائرلیس کے ایک سخت پیغام کے ذریعے، اپنا عہدہ اس طرح خالی چھوڑ جانے کے نازیبا طرز عمل پر اس کی سخت سرزنش کی تھی۔ گاندھی نے، جو کہ کوئی بڑے فوجی ماہر نہیں تھے، اس وقت پٹیل کو یہ لکھا تھا کہ اڑیسہ پر حملے کا امکان معلوم ہوتا ہے کہ وہاں حکومت نے کافی فوج جمع کر لی ہے۔' 31 یہ کتنی دل چسپ بات ہے کہ جنگ کس طرح لوگوں کی توجہات کا مرکز تبدیل کرتی رہتی ہے۔

4 مارچ 1942 کو چرچل نے روزویلٹ کو یہ ٹیلی گرام بھیجا۔ 'ہم اس بات کا سنجیدگی سے جائزہ لے رہے ہیں کہ کیا جنگ کے بعد ڈومینین حیثیت کا اور حسب خواہش (وفاق سے) الگ ہو جانے کے حق کا اعلان اس اہم وقت میں کیا جانا چاہیے؟ ہمیں لازمی طور پر مسلمانوں سے تعلقات منقطع نہیں کرنے ہوں گے جن کی تعداد دس کروڑ ہے اور ہماری آرمی

میں ان کی خاصی تعداد ہے اور فوری نوعیت کی جنگ کے لیے ہمارا انہیں پر انحصار ہے.....32 چرچل نے اس ٹیلی گرام میں یہ بھی کہا کہ ملک میں چار کروڑ اچھوت اور آٹھ کروڑ رجواڑوں کی رعایا ہے۔' کانگریس کے ساتھ ان سب کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ ان کا لحاظ رکھا جانا ہے۔ چرچل کا یہ بھی کہنا تھا کہ 'یہ بالکل فطری بات ہے کہ حملے کے اس موقع پر ہم ہندوستان میں انتشار نہیں چاہتے۔33 روزویلٹ نے اپنے 10 مارچ 1942 34 کے جواب میں ہندوستان میں ایک ایسی عارضی حکومت کی تشکیل کی صلاح دی جس کی قیادت ایک چھوٹا نمائندہ گروپ کرے اور اسے عبوری ڈومینین حکومت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ روزویلٹ نے صلاح دی کہ 'اس جیسا طریقہ کار اپنانے کے نتیجے میں ہندوستان میں نئی شروعات ہوسکتی ہے اور لوگ اس کی وجہ سے اپنے شدید احساسات کو بھلا بھی سکتے ہیں، برطانوی سلطنت کے اور زیادہ وفادار بن سکتے ہیں اور جاپانی تسلط کے خطرے پر زور دے سکتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی انتشار انگیز انقلاب کی جگہ پرُ امن ارتقاء کا عمل جاری رکھا جاسکتا ہے۔35 چرچل نے اس طرح ردعمل ظاہر کیا۔ وہ اب سابقہ مزاحمتی رویہ کی جگہ پر ایسے ہندوستان کی عسکری مرکزی حیثیت کو محسوس کرنے کے لیے تیار تھا جو مکمل طور پر جنگ میں شامل ہو۔ اگلے ہی دن، یعنی 11 مارچ کو چرچل نے پارلیمنٹ میں کرپس مشن کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سلسلے میں امریکہ کے، اور روزویلیٹ کے دباؤ نے کام کیا مگر چرچل نے اس 'دخل اندازی' 36 کو بہت زیادہ خوش آمدید نہیں کہا، بلکہ ایک معقولیت پسند ہونے کے ناطے ایسا ہونے دیا۔

سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ برطانیہ کی جنگی کابینہ کی تجاویز کے بارے میں کابینہ کے نمائندے کے طور پر تبادلہ خیال کے لیے 23 مارچ 1942 کو نئی دہلی پہنچا۔ تب تک پٹیل بھی پہنچ گئے۔ ایسے میں جب کہ ہمیں چھ ماہ کی مدت میں اپنے دوسرے بچاؤں (جاپانیوں) سے نپٹنا ہے، کانگریس آخر کس طرح برطانوی حکومت سے معاملے کی بات کر سکتی ہے۔37 پٹیل کے خیال میں دراصل امریکہ اور چین کے دباؤ نے ہی انگریزوں کو ہندوستان کے مسائل پر توجہ دینے کے لیے مجبور کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں کرپس مشن کا تقرر عمل پر آیا تھا۔ پٹیل الہ آباد میں کہہ چکے تھے کہ کرپس مشن ایسے وقت ہندوستان آرہا ہے جب کہ وقت کی ریت مٹھی سے پھسلتی جارہی ہے، ایک ایسے وقت میں جب کہ برطانوی حکومت کا ہمیں کچھ دینا اور ہمارا برطانوی حکومت سے کچھ لینا ناممکن ہوگیا ہے۔38 پٹیل کا یہ موقف اُن کے اگست 1940 کے موقف سے قطعی مختلف تھا۔ اس وقت انہوں نے کھل کر یہ کہا تھا کہ کانگریس کا ایک حلقہ برطانوی حکومت کے ساتھ سمجھوتے کے حق میں ہے۔ اس کے بعد پٹیل اور گاندھی نے یہ یقینی بنانے کا کے لئے کام کیا کہ کانگریس کے نمائندے کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کرپس سے ملاقات کریں اور نہرو، راجاجی، اور بھولا بھائی ڈیسائی کو ہر حال میں پس منظر میں رکھا جائے۔ اس زمانے کے اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ کرپس کی دہلی آمد کے بعد جواہر لال تین یا چار دن الہ آباد میں رہے۔ لیکن جیسے جیسے بات چیت میں پیش رفت ہوتی گئی نہرو نے ناگزیر طور پر گفت وشنید میں اپنا رول ادا کرنا شروع کر دیا۔

ایک اور بات بھی تھی جو کانگریس لیڈروں کے حق میں گئی۔ گاندھی، پٹیل اور مہادیو ڈیسائی کا یہ خیال تھا کہ

چوں کہ برطانیہ جنگ ہار رہا ہے اس لیے جاپان ہندوستان پر حملہ کرے گا ہی، تو ایسی صورت میں کرپس کی تجاویز کو قبول کر کے انگریزوں کے ساتھ کیوں کوئی معاملہ کیا جائے! ہریجن کے ایک مضمون میں مہادیو ڈیسائی نے کرپس کی تجاویز کو 'پیدائش سے ہی مردہ' بتایا تھا۔ صرف بھولا بھائی ڈیسائی اور نہرو نے، اس سے مختلف نتیجہ اخذ کیا مگر ان کے خیالات دوسروں کے خیالات پر حاوی تو کیا ہوتے، فوری طور پر اثر انداز بھی نہیں ہوئے۔ گاندھی دراصل کرپس کی تجاویز کو پوسٹ ڈیٹیڈ چیک کی حیثیت دیتے تھے 39۔ گاندھی کرپس سے ملاقات کے فوراً بعد ہی واردھا لوٹ جانا چاہتے تھے مگر ورکنگ کمیٹی نے انہیں دہلی میں رُکے رہنے کے لیے رضامند کر لیا۔ ابوالکلام آزاد نے کانگریس کی طرف سے کرپس سے کئی ملاقاتیں کیں۔ 29 مارچ 1942 کو ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کر کے کرپس کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اس قرارداد سے کرپس کو تو مطلع کر دیا گیا مگر اسے اپریل کے پہلے ہفتے تک عام نہیں کیا گیا۔ اسی ہفتے کے دوران جواہر لال نہرو منظر نامے پر آ گئے۔ ہندوستان کے وزیر دفاع کے اختیارات اور ذمہ داریوں کے بارے میں از سرِ نو تبادلہ خیال ہوا۔ کرپس نے اس وقت کے کمانڈر ان چیف ویول، آزاد اور نہرو کی ملاقات کا بندوبست کیا۔ گاندھی کی طرف سے اور پٹیل کی طرف سے مخالفت کے باوجود ورکنگ کمیٹی کی اکثریت نے نہرو کی تائید کی اور برطانوی حکومت کی تجاویز قبول کر لی ہوتیں مگر جیسے ہی یہ تجاویز قبول کی جانے والی تھیں، اچانک ہی چرچل نے انہیں واپس لے لیا۔ یہ تجاویز واپس لے لی گئی تھیں اس بات کی وضاحت دارالعوام میں ہندوستان کے بارے میں ایک بحث کے دوران کی گئی۔ چرچل نے چند سال بعد، 12 دسمبر 1946 کو ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا..... 40

'......مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح ایک عزت مآب عالم و فاضل شخص کو اس حکومت کے نمائندے کے طور پر بھیجا گیا تھا جس کا میں سربراہ تھا اور پھر کس طرح اس کی سرزنش کی گئی تھی۔ (دخل اندازی) میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

سر اسٹفورڈ کرپس: 'اگر یہ عالم و فاضل شخص یہ ظاہر کرنا چاہے کہ اس موقع پر میرے اور کابینہ کے درمیان کیا بات ہوئی تھی، تو مجھے امید ہے کہ وہ سب کچھ افشا کر دے گا۔

مسٹر چرچل: وہ عالم و فاضل شخص اپنی بات کہنے میں حق بجانب ہے، اور اب میں اس معاملے کو آگے نہیں بڑھاؤں گا۔'.....

کرپس مشن کی ناکامی کے لیے چرچل کے رویے کو ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے، اس بات کی توثیق کرنل لوئس جانسن کے ردِ عمل سے بھی ہوئی ہے۔

'کرپس بہت سنجیدہ ہے، جانتا ہے کہ یہ معاملہ حل ہو جانا چاہیے۔ اگر کرپس کو کسی طرح کی آزادی یا اختیار دے دیا جائے تو وہ اور نہرو اسے پانچ منٹ میں حل کر سکتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے، جب ایک اطمینان بخش حل یقینی معلوم ہونے لگا تھا۔ وہ بھی معمولی سی رعایتوں پر، تو کرپس نے کافی پریشانی کے عالم میں مجھے بتایا تھا کہ وہ چرچل کی منظوری کے بغیر اعلان

کے اصل مسودے میں ذرا بھی ردوبدل نہیں کر سکتا تھا اور یہ کہ چرچل نے تار بھیجا ہے کہ وہ اس وقت تک کوئی منظوری نہیں دے گا جب تک کہ ویول اور وائسرائے، الگ الگ تار کے ذریعے کرپس کی مطلوبہ تبدیلی کی توثیق نہیں کر دیں گے۔ تب تک میرا اعتماد قائم رہا تھا۔ لندن کی حکومت یہی چاہتی تھی کہ کانگریس ان تجاویز کو ماننے سے انکار کر دے۔'41

42 11 اپریل 1942 کو چرچل نے روزویلیٹ کو کرپس مشن کی ناکامی سے مطلع کر دیا اور روزویلیٹ نے فوراً ہی جوابی تار کے ذریعے یہ صلاح دی کہ گفت وشنید کو مکمل ناکامی سے بچانے کے لیے ایک آخری کوشش تک کرپس کو ہندوستان میں رُکے رہنا چاہیے چرچل نے جواب دیا کہ کرپس پہلے ہی ہندوستان سے روانہ ہو چکا ہے۔ ہز میجسٹی کی حکومت ہندوستان کے مسئلے کو حل ہی نہیں کرنا چاہتی تھی وہ بھی تب، جب وزیر اعظم کی حیثیت میں چرچل سلطنت برطانیہ کے مستقبل کے بارے میں فیصلے کر رہا تھا۔

ان تجاویز کا مسودہ تیار کرنے والوں نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ایک ایسا بندوبست پیش کرنے جا رہے ہیں جس سے مسلم لیگ بھی مطمئن ہو جائے گی اور ان خیالات کی بھی تکمیل ہو جائے گی جو کہ سر سکندر حیات خاں پہلے ہی وزیر اعظم چرچل کے سامنے رکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ لیگ نے بھی ان تجاویز میں اہم نوعیت کی کچھ خامیاں نوٹ کی تھیں۔ جیسے کہ: آسام صرف ہندوؤں کی 60 فیصد اکثریت سے شامل ہونے سے اتفاق کر سکتا تھا جس سے مسلم اکثریت والا سلہٹ ضلع ہندوستان میں شامل ہو جاتا۔ دوسرے یعنی رائے شماری والے مرحلے میں، پنجاب میں لوگ علاحدگی کے حق میں ووٹ دے سکتے تھے، مگر بنگال کی صورت حال ابھی بھی غیر واضح تھی کہ اب اس صوبے میں فضل الحق 'کرشک پرجا پارٹی' اور مسلم لیگ کے درمیان سیاسی لڑائی چھڑ گئی تھی۔ یہ پیش گوئی کرنا ناممکن تھا کہ اگلے الیکشن یا رائے شماری پر اس کا کیا اثر مرتب ہوگا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کرپس منصوبے کو مسترد کر دیا! کانگریس نے، جو کہ اس منصوبہ کے 'جنگ کے بعد' والے پہلو کے خلاف تھی، اس اسکیم میں موجود، ملک کو تقسیم کر دینے کے امکان پر اعتراض کیا۔ مزید یہ کہ کانگریس کے لیڈر اب بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ برطانیہ جنگ ہارتا جا رہا ہے۔

اس مرحلے پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک اہم رکن سی راج گوپال آچاری نے، جو کہ اس سے پہلے، اعلان کر چکے تھے کہ کانگریس جس راستے پر چلنے جا رہی ہے وہ غلط ہے، ایک نیا پینترا بدلا! راجاجی نے کہا کہ جنگ میں مدد کرنے کی کانگریس کی طرف سے مخالفت اور اس کا یہ موقف کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا جائے، یہ دونوں ہی باتیں غلط تھیں! راجاجی کا خیال تھا کہ اگر مسلمان اپنی اکثریت والے علاقوں میں علاحدہ حکومت کے لیے اڑ جاتے ہیں تو یہ مان لیا جائے کہ اس کا کوئی متبادل نہیں ہے اور اسی بنیاد پر تصفیہ کیا جائے۔ اگر کوئی معاہدہ ہو جائے یا اس مفروضہ کی بنا پر تعاون ہو سکے تو اس حل کو چن لینا جانا چاہیے کیوں کہ اسے اس صورت حال پر، یقیناً ترجیح دی جائے گی جس میں نہ تو کوئی معاہدہ ہو پائے گا اور نہ ہی کسی طرح کی پیش قدمی کو ممکن بنایا جا سکے گا!

چناں چہ راجا جی نے مدراس پریذیڈنسی کی اسمبلی کے کانگریس ممبران کو اپنی تجویز کے بارے میں بتانے کے لیے اکٹھا کیا۔ 23 اپریل 1942 کی میٹنگ میں دو قراردادیں پاس کی گئیں۔ ایک قرارداد کے ذریعے یہ سفارش کی گئی کہ اے آئی سی سی تقسیم کے لیے مسلمانوں کے مطالبے کو مان لے اور اس کی بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ پھر بات چیت شروع کرے۔ اس کے بعد باہمی افہام وتفہیم کے ذریعے ایک عبوری قومی حکومت کی تشکیل کی جائے تا کہ جنگ کے ہنگامی حالات کا سامنا کیا جاسکے! دوسری تجویز یہ تھی کہ مدراس میں اسمبلی اور وزارت کو بحال کیا جائے اور مسلم لیگ سے کابینہ میں شامل ہونے کے لیے کہا جائے۔ ان دونوں کو، خاص طور پر پہلی قرارداد کو کانگریس میں بہت سارے لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ چھ دن بعد 29 اپریل 1942 کو یہ سفارشات الہ آباد میں کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں رکھی گئیں۔ جنھیں بھاری اکثریت سے مسترد کر دیا گیا، کانگریس نے یہ بھی فیصلہ لیا کہ ملک کو تقسیم کرنے کے مقصد سے پیش کی جانے والی کوئی بھی تجویز ہندوستان کے عوام کے مفادات کے منافی، اور صوبوں، رجواڑوں بلکہ پورے ملک کے لیے نقصان دہ ہے'۔ مگر راجا جی ہمت نہیں ہارے، انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی مدراس اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے افکار کی تبلیغ ایک آزاد سیاسی ورکر کے طور پر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ساتھ اسمبلی کے دیگر سات ارکان نے بھی استعفیٰ دے دیا۔

کانگریس واضح طور پر ایک ایسی تنظیم کے طور پر نہیں ابھر سکی جو سب کی نمائندگی کرتی ہو یا دعوے جو بھی رہے ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اس وسیع جغرافیائی سماجی، اور سیاسی وسعت کو صرف ایک ہی ظرف میں سمو کر نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

صوبوں کی سیاست

اس اثنا میں رجواڑوں نے بھی اپنے سیاسی اختیارات پر اقرار کرنا شروع کر دیا تھا۔ کئی پیچیدہ واقعات کے بعد بنگال میں مولوی فضل الحق کی وزارت کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان واقعات کا سلسلہ 1941 میں وائسرائے کی دفاعی صلاح کار کونسل کی تشکیل سے شروع ہوا تھا۔ یہ کونسل 8 اگست 1940 کو وائسرائے کی طرف سے پیش کیے گئے منصوبے کا حصہ تھی، اس منصوبے کو تب ملتوی کر دیا گیا تھا مگر جولائی 1940 میں اعلان کے ایک سال بعد، یعنی اب اسے نافذ کیا گیا تھا۔ آگے کی کارروائی کرتے ہوئے وائسرائے نے صوبائی وزرائے اعلا کو اس دفاعی صلاح کار کونسل کا ممبر بننے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اُن کا خیال تھا کہ انہیں اپنی پارٹی (مسلم لیگ) کے ممبر کی حیثیت کی بجائے وزیر اعلا کی ذاتی حیثیت کے طور پر دی گئی تھی۔ چوں کہ انہیں مسلم لیگ نے جنگ میں تعاون کرنے کی کھلی آزادی دے دی تھی اس لیے انہوں نے یہ باور کر لیا کہ مسلم لیگ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرے گی۔

اس کے بعد وائسرائے نے جناح کو ان اقدامات کے بارے میں بتایا جو کیے جانے تھے؛ اس کے ساتھ ہی جناح کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ کسی طرح کی ناانصافی نہیں ہوگی

اور تین مسلم وزرائے اعلا- پنجاب کے سر سکندر حیات خان، بنگال کے مولوی فضل الحق اور آسام کے سر محمد سعد اللہ کے نام بطور مثال پیش کیے۔ ان کے تقرر کی نوعیت کی وجہ سے فوراً ہی تنازعہ کھڑا ہو گیا، کیوں کہ جناح کی تاویل کے مطابق ان تینوں کا تقرر مسلم فرقہ کے نمائندے کے طور پر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی 'واحد نمائندہ' والی انا کو اس بات سے بھی ٹھیس پہنچی تھی کہ مراسلہ بمبئی کے گورنر کے توسط سے موصول ہوا تھا۔ اس لیے جناح نے مسلم لیگ کے سکریٹری کو حکم دیا کہ 'ضابطہ شکنی' کے لیے ان تینوں وزرائے اعلا کو فوراً وجہ بتاؤ نوٹس جاری کیا جائے۔ انہیں مطلع کیا گیا اس سلسلے میں رسمی کارروائی 24 اگست 1941 کو بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں کی جائے گی۔

اس طرح مجبور ہو کر سکندر حیات خاں اور آسام کے سعد اللہ کونسل سے مستعفی ہو جانے کے لیے راضی ہو گئے اگر چہ فضل الحق نے بھی ایسا ہی کیا مگر وہ ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل سے بھی الگ ہو گئے۔ فضل الحق نے اپنے مراسلے میں لیگ کے صدر کے غیر آئینی اور آمرانہ رویہ کی شکایت کی اور یہ کہا کہ جناح نے سوال اس طرح بنایا ہے کہ اس کے خلاف اکثریت کا فیصلہ، خود مسلم لیگ کے صدر کے طور پر جناح کے خلاف عدم اعتماد کے فیصلے کے مترادف ہوتا۔ اگر چہ اس سے بحران تو ختم ہو گیا مگر اس سے فضل الحق کی عزتِ نفس کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی، اور انہوں نے استعفادے کر جناح کے خلاف بغاوت کر دی چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس استعفے پر عمل 28 مارچ 1942 کو ہوا جب کہ بنگال اسمبلی نے ریاست کا بجٹ پاس نہیں کیا تھا اور اگلا عالمی سال محض تین دن بعد ہی شروع ہونے والا تھا۔ یہ پلٹ کر وار کرنے کا فضل الحق کا طریقۂ کار تھا۔ اُس وقت سندھ، بنگال اور آسام میں رسہ کشی چل رہی تھی اس سے پنجاب دور رہا تھا۔

بہر حال فضل الحق جیسی انتہائی شخصیت کو بھی مسلم لیگ چھوڑ دینے اور (1941) مہا سبھا اور کانگریس کے ساتھ شیاما پرساد-حق مخلوط وزارت کی تشکیل کرنے پر مشرقی بنگال کے ہر شہر میں کالے جھنڈوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 43

محمود حسین نے مزید لکھا ہے کہ- 'جہاں تک تحریک پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی خدمات کا سوال ہے، 1940 سے 1947 تک کا عرصہ اب تک کا سب سے سرگرم، نتیجہ خیز اور اہم زمانہ رہا۔' سب سے پہلے تو یہ کہ یونیورسٹی کے طلباء میں مسلم لیگ کو مضبوط تائید حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے ایک سابق طالب علم فضل الرحمن نے ایک پندرہ روزہ رسالہ- 'پاکستان' کے تاسیس اور اشاعت میں مدد کی جو جولائی 1942 میں ڈھاکہ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ جہاں عملے کے کچھ نوعمر مسلم ممبروں نے اس رسالے کے لیے رضا کارانہ طور پر کام کیا، وہیں ایک سرکردہ ہندو عالم نے بنگالی ادب کی ایک نئی تاریخ لکھی اور اسے 'اسلامی لٹریچر' کا عنوان دیا۔' (اسلامی بنگلہ ساھتیہ، سوکمار سین)۔

اب واقعات کافی تیزی سے، رونما ہو رہے تھے، گاندھی نے اعلان کیا کہ اگر 'برطانیہ حرکت میں نہ آیا تو ہم حرکت میں آ جائیں گے۔' گاندھی نے 19 اپریل 1942 کو 'ھری جن' میں لکھا- 'برطانیہ اور ہندوستان، دونوں کی ہی حفاظت اور مفاد ہندوستان سے انگریزوں کی باقاعدہ اور بروقت واپسی میں مضمر ہے۔' اس طرح گاندھی نے ہندوستان

چھوڑو تحریک کا اشارہ دے دیا تھا۔

اس کے بعد اپریل 1942 کے آخری ہفتہ میں الہ آباد میں کانگریس ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میٹنگ میں منظور کی گئی قرارداد میں کہا گیا تھا: 'کمیٹی اس خیال کو مسترد کرتی ہے کہ ہندوستان میں آزادی کسی دوسرے ملک کی مداخلت یا جارحیت سے آسکتی ہے' (اس کا) دعوا کچھ بھی ہو، اور....... حملہ..... اس کی مزاحمت لازماً کی جائے۔ اس طرح کی مزاحمت صرف عدم تشدد اور عدم تعاون کی شکل میں ہو سکتی ہے، کیوں کہ برطانوی حکومت نے کسی بھی شکل میں لوگوں کے ذریعے فوجی دفاع کی تنظیم میں رُکاوٹ پیدا کر دی ہے۔'44

ایسا سابقہ موقف سے ہٹ کر کیا گیا تھا، کیوں کہ قرارداد میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ نہرو نے برطانیہ کی غیر مشروط تائید سے متعلق اپنے نظریات کو واپس لے لیا تھا۔ جاپانی حملہ آوروں کی پر تشدد مزاحمت کو بھی مسترد کر دیا گیا تھا۔

الہٰ آباد کے بعد جولائی 1942 میں واردھا میں ہندوستان چھوڑو قرارداد پاس کی گئی۔ سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر امبیڈکر، سر سکندر حیات خان، جناح، برطانیہ کی لیبر پارٹی اور راجاجی نے اس قرارداد پر نکتہ چینی کی۔ دوسری طرف حکومت بھی پریشان ہو گئی اور اس نے جولائی 1942 کی واردھا قرارداد کی بنیاد پر کانگریس کے لیڈروں کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا، کیوں کہ اس میں انگریزوں سے جنگ کے دوران ہی واپس ہو جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس وقت بمبئی کے گورنر روجر لملے نے ٹیلی فون کے ذریعے وائسرائے کو یہ اطلاع دی کہ ہندوستان چھوڑو قرارداد منظور کر لی گئی ہے۔' وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں اور ملک بھر میں کانگریس کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لینے کا اتفاق رائے سے فیصلہ کیا۔

ایک ماہ بعد، اگست 1942 میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی بمبئی میں میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ نے کانگریس کو ہندوستان چھوڑو تحریک کی پیروی کی! مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ سے چند روز قبل ہی کانگریس کے لیڈر گرفتار کر لیے گئے تھے۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں میٹنگ ہوئی اس کے کئی ممبروں کا یہ خیال تھا کہ اب انگریزوں کے خلاف کانگریس کے ہاتھ ملانے کا مناسب وقت آ گیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے موقعے پر راجا صاحب محمود آباد، ایم اے ایچ اصفہانی، اور جمال میاں نے اس خیال سے آگاہ کرنے کے لیے جناح سے ملاقات کی اور اس بات پر زور دیا کہ انگریزوں کے خلاف 'ہندوؤں' کے ہاتھ ملا لینے کے اس موقع کو کسی طرح نہ گنوایا جائے! چودھری خلیق الزماں نے بھی اسی طرح کا خیال ظاہر کیا مگر جناح اپنے اس نظریے پر اڑے رہے کہ انگریزوں کے خلاف اس جنگ میں مسلمانوں کو شامل نہیں ہونا چاہیے۔ جب انگریزوں کے خلاف کانگریس کی تائید کرنے کی قرارداد رائے شماری کے لیے پیش کی گئی تو تین لوگ - ایم اے ایچ اصفہانی، راجا صاحب محمود آباد اور نواب اسماعیل خان نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا۔ سندھ کے جی ایم سعید نے ووٹ نہ دینے سے انکار کر دیا اور قرارداد کے خلاف ووٹ دیا۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی، بلکہ اصل میں جناح کے، اس فیصلے نے مسلم لیگ کے لیڈروں کو جیل سے باہر رکھا اور مسلم لیگ کی طاقت میں اضافہ ہوا۔ اسے زیادہ تر طاقت اس زمانے (1942) اور 1946 کی درمیانی مدت میں حاصل ہوئی۔ دوسری طرف کانگریس کو زبردست دھکا لگا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس اہم عرصے کے دوران سیاسی منظرنامے سے دور رہی تھی کانگریس کے لیڈر جیل میں تھے اور ان کی طرف سے کوئی بھی تبادلۂ خیال شروع نہیں کر سکا تھا۔ اس سے جناح کو سیاسی منظرنامے پر حاوی ہو جانے؛ اس موقع کو کام میں لانے اور کانگریس سے حکومت کی برہمی کا فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا! درحقیقت کانگریس اور حکومت، دونوں ہی اندھی گلی میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ 'دونوں ہی نہ تو واپس لوٹ سکتے تھے اور نہ آگے بڑھ ہی سکتے تھے! حکومت کا خیال تھا کہ کانگریس جب تک ہندوستان چھوڑو تحریک واضح طور پر واپس نہیں لے لیتی، نہ تو لیڈروں کو رہا کیا جائے گا اور نہ اصلاحات کے سلسلے میں آگے کے مذاکرات ہی شروع کیے جاسکیں گے۔ اس کے جواب میں کانگریس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پہلے اس کے لیڈروں کو رہا کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی روپوش کانگریس سوشلسٹوں کی پرتشدد تحریک سے حکومت کی برہمی بڑھ گئی اور تعطل مزید گہرا ہو گیا!

انگریزوں کے لیے سب سے بڑا سروکار یہ تھا کہ ایشیا اور یوروپ میں جنگ کے معاملات ٹھیک چلتے رہے۔ ہندوستان چھوڑو قرارداد کی منظوری کے بعد ملک بھر میں حالات خراب ہو جانے پر، اس کی تاویل برطانوی حکومت نے، اور خاص طور پر امریکہ نے...... 'جنگ کے معاملات میں دانستہ دخل اندازی' کے طور پر کی، خاص طور پر ایسے وقت میں جب کہ جاپان کے خلاف حملے، جنگ کے خاص اڈے اور رسدات کے مرکز کے طور پر ہندوستان کی سرزمین سے کیے جارہے تھے...... یہ احساس عالمی رائے عامہ پر مہینوں اثر انداز رہا اور وہ عناصر بھی الگ ہو گئے جو اس سے پہلے ہندوستان کی تحریک آزادی کو مثبت زاویے سے دیکھتے آئے تھے۔ نہرو نے اتحادیوں کا پوری طرح ساتھ دینے کی جو بات کہی تھی وہ بالکل بروقت تھی، کانگریس کی قرارداد کے سلسلے میں وقت کا اور مواد کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا تھا۔

لارڈ لنلتھگو کی وائسرائی

لارڈ لنلتھگو کے جانشیوں کو جن تین بڑی مشکلات کا سامنا تھا وہ تھیں: اقلیت اور اکثریت کے درمیان برابری قائم کرنا؛ ہندوستان کے سیاسی اتحاد کی شکست پر حکومت برطانیہ کی اجازت کا ٹھپہ لگانا؛ اور اقلیت کو ہندوستان میں یا ہندوستان کی کسی پیش رفت کو ویٹو کردینے کا بالواسطہ حق دینا، اس کے علاوہ جسے لیگ قابل قبول سمجھتی ہو۔ ہندوستان کی قوم پرستانہ تحریکات کو نقصان پہنچانے کے معاملے میں فرقہ اندازی کے ریکارڈ کے طور پر لنلتھگو کی مدت عہدہ اس سے پہلے کے اور اس کے بعد کے تمام وائسراؤں کے طرز عمل کو مات دے گئی تھی۔ 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا وفاقی حصہ جو کہ مرکز میں ذمہ داریوں کے اصول کو متعارف کراتا، بالکل اسی طرح جس طرح کہ صوبوں میں متعارف کرایا گیا تھا، جناح کے لیے ہمیشہ سے پریشانی کا باعث رہا تھا۔ عرض داشت پر لارڈ لنلتھگو نے مسلم لیگ کے مطالبے کو مان لیا اور 11 ستمبر

1939 کو اس نے اعلان کیا کہ وفاق کے تعارف کے سلسلے میں کی جارہی تیاریاں جنگ کے خاتمے تک ملتوی رہیں گی۔ جناح نے اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اس کا خیر مقدم کیا جس نے ایک ہفتے بعد ہی قرارداد پاس کر کے اس التوا کی ستائش کی اور یہ امید ظاہر کی کہ وفاق کی اسکیم کو ہی ترک کر دیا جائے گا'

جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے بارے میں کانگریس کے موقف نے برطانیہ میں کنزرویٹیو مخلوط حکومت کو سخت برہم کر دیا تھا۔ ادھر ہندوستان میں لنلتھگو کی قیادت میں افسر شاہی بھی ناراض ہو چکی تھی۔ اس کے بعد راج نے مسلم لیگ کی مدد کرنے اور اسے مضبوط بنانے (خاص طور پر بنگال، سندھ اور آسام میں بھی) اور کانگریس کو کمزور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

مثال کے طور پر بنگال میں فضل الحق کو، جو کہ ممبران اسمبلی کے اعتماد سے مخلوط وزارت کی قیادت کر رہے تھے، مارچ 1943 میں استعفا دینے کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ پر ناظم الدین کی قیادت میں مسلم لیگ کی حکومت بنوا دی گئی تھی۔ گورنر نے ناظم الدین کو اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی چھوٹ دے دی۔ ناظم الدین نے وزراء کی تعداد بڑھا کر 13 کر دی اور اتنی ہی تعداد میں پارلیمانی سکریٹریوں کے تقرر کی بھی اجازت دے دی۔ جب کہ فضل الحسن کو دو درج فہرست ممبروں کے ذریعے 8 کی کابینہ میں توسیع کی اجازت نہیں دی گئی تھی!

سندھ میں گورنر نے اکتوبر 1942 میں قوم پرست مسلمان اللہ بخش کی صوبائی حکومت کو برخواست کر دیا تھا، کیوں کہ انہوں نے قوم پرست ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو تسلیم نہ کیے جانے پر احتجاج کرتے ہوئے 'خان بہادر' اور او بی ای کے خطاب کو لوٹا دیا تھا۔ اس کے بعد اسمبلی میں لیگ کے لیڈر کو دعوت دی گئی تھی اور حکومت بنوانے میں گورنر کے ذریعے مدد کی گئی تھی۔ آسام میں روہنی کمار چودھری (آزاد) نے دعوا کیا تھا کہ وہ حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہیں، مگر انہیں مدعو نہیں کیا گیا اس کے برخلاف گورنر نے اگست 1942 میں لیگ کے لیڈر سے وزارت بنانے کے لیے کہا۔

مسلم لیگ بھی وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل سے باہر رہی تھی۔ بطور خاص اس وجہ سے کہ اس کے مطالبات کو فوراً ہی نہیں مان لیا گیا تھا اور اس کے لیڈر یہ نہیں چاہیے تھے کہ انہیں انگریز حامی سمجھا جائے۔ بہر حال لیگ نے کانگریس کے ہندوستان چھوڑو مطالبے کی مخالفت کر کے جنگ کو مسائل میں تعاون کیا۔ اس مطالبے کو مسلم لیگ کو نظر انداز کر دینے کی کوشش کو بتایا گیا تھا۔

مسلم لیگ کی طاقت بڑھانے، اور ان صوبوں میں جہاں کانگریس کی وزارتوں نے استعفے دے دیے تھے، مسلم لیگ کی حکومت بنوانے میں لارڈ لنلتھگو کی بھرپور مدد کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔

جنگ کے آغاز پر کسی بھی صوبے میں مسلم لیگ کی حکومت نہیں تھی مگر نومبر 1943 میں لارڈ لنلتھگو کی برائی کے وقت چاروں صوبوں، بنگال، آسام، سندھ اور صوبۂ سرحد میں، جن کا دعوا لیگ نے پاکستان کے لیے کیا تھا، لیگ کی

وزارتیں تھیں!

اس سمت میں ایک اور قدم اس وقت اٹھایا گیا جب فروری 1943 میں آغا خان پیلیس کی ڈیٹینشن کیمپ میں گاندھی کی بھوک ہڑتال شروع ہونے کے بعد وائسرائے کی ایگزیکیٹو کے تین ممبروں نے احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا تھا۔ لنلتھگو نے نامزدگی کے ذریعے خالی جگہوں کو فوراً ہی پُر کردیا۔ 8 مئی 1943 کو اس پر دی نیو اسٹیٹس مین اور دی نیشن نے اس طرح تبصرہ کیا تھا: 'یہ نو واردین متاثر کن لوگ نہیں ہیں، مگر ان لوگوں سے متعلق ایک انتہائی اہم نکتہ یہ ہے کہ اس طرح کونسل کی تشکیل نو سے تعداد کے لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابری کا جناح کا مقصد حاصل ہوگیا ہے۔ جب ایک بار اس طرح کی نظیر قائم ہو جائے گی تو اقلیت اس کا دعوا ایک حق کے طور پر کرے گی!'

اس کے بعد انگریزوں نے یہ نظریہ پھیلانا شروع کردیا کہ اکثریت کے ووٹ کے ذریعہ فیصلہ کرنے کے جمہوری اصول کا ہندوستان پر اطلاق نہیں ہوتا کیوں کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک دوسرے سے الگ ہیں، یہاں تک ان میں بنیادی نوعیت کے اصولوں کے بارے میں بھی اتفاق رائے نہیں ہے۔ اس لیے ایک فرقہ کے طور پر مسلمانوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس طرح مسلم لیگ کے دوقومی نظریے کو ایک آئینی لباس فراہم کردیا گیا۔ ونٹرٹن، ایمری، زیٹ لینڈ اور چرچل جیسے سرکردہ کنزرویٹو ارکان نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ سے باہر اپنی تقریروں کے ذریعے اس نظریے پر اپنی مہر لگا کر اُسے فروغ دینے کی حتی المقدور کوشش کی۔ ایمری نے اپنی 18 نومبر 1941 کی تقریر میں وضاحت کی:۔ 'غلط یا صحیح طریقے پر، برطانوی پارلیمنٹ کے خطوط پر، صوبائی حکومت خود اختیاری کے تجربے نے مسلمانوں کو یہ باور کرادیا ہے کہ وہ ہندوستان کے لیے کسی ایسی مرکزی حکومت کو نہیں مانیں گے جس میں منتظمہ کا براہ راست انحصار پارلیمانی اکثریت پر ہو؛ اور صوبوں کے تجربے سے ہی اشارہ ملتا ہے کہ یہ پارلیمانی اکثریت بھی کانگریس اعلا کمان کی ترجمان بن کر رہ جائے گی۔'

برطانوی حکومت نے کانگریس کو 'ہندو' کہنا شروع کردیا تھا حالاں کہ اس پارٹی میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں شامل تھے، مسلمان اس کے صدر بھی رہے اور اس کی عاملہ میں بھی شامل رہے۔ دوسری طرف کانگریس حسب معمول منفی باتوں پر ہی زور دیتی رہی۔ اس نے اس پاکستان کی کبھی توضیح نہیں کی جس کا دعوا کیا جارہا تھا' اس نے مسلمانوں کے سامنے، اور ان لوگوں کے سامنے بھی پاکستان کی مکمل تصویر رکھنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی جو اس مطالبے کو ماننے والے تھے یا اس نے یہ طے کرنے کی بھی کوشش نہیں کی جغرافیائی اعتبار سے یہ پاکستان کیسا ہوگا، اس لیے کہ ایسا کیا ہی نہیں جاسکتا تھا؛ اس بات سے قطع نظر کہ پاکستان کی سرحدیں کس طرح طے کی گئیں پورے ہندوستان میں مسلمان اتنا زیادہ پریشان تھے ان کا ایک قابل لحاظ حصہ یہیں چھوٹ گیا! لیگ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ اگر پاکستان کی توضیح کی گئی

'تو ان لاکھوں مسلمانوں کے لیے اس کی کوشش فوراً ہی ختم ہو جائے گی جو کہ ظاہری طور پر (جغرافیائی لحاظ سے) اس کے فوائد کے دائرے سے باہر ہو جائے! آخر کار پاکستان کی حتمی توضیح ایک زبردست آپریشن کے ذریعہ تقسیم کی شکل میں ہوئی۔' اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ پاکستان کا تصور کسی بھی قسم کے تجزیے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا حالاں کہ اُسے ایک پر اثر نعرۂ جنگ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس طرح اسے ایک مثالی اور تابناک نظریہ ہی بنا رہنے دیا گیا۔ چنانچہ جب 16 اپریل 1941 کو اپنے ایک بیان کے ذریعے لیگ کے صدر کو اپنا مطالبہ واضح طور پر پیش کرنے کی دعوت دی تا کہ کانگریس اس پر تبادلۂ خیال کر سکے تو جناح نے اس پیش کش کو ہی مسترد کر دیا اور یہ کہا کہ سب سے پہلے کانگریس کو ہندوستان کی تقسیم کے اصول کو قبول کرنا ہوگا۔' لیگ کی یہ ہٹ دھرمی راج کے لیے ترپ کے پتے کی حیثیت رکھتی تھی۔ انگریز ہندوستان میں اپنا اقتدار جب تک برقرار رکھ سکتے تھے، تب تک لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی حوصلہ افزائی کی، خود کو اس سے منتفی نہیں کیا۔ اس مطالبے کو دراصل کانگریس کی قوم پرستی کے خلاف دھمکی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بہر حال جیسے جیسے لیگ کو انگریزوں کے اقتدار کے لیے اس کی اہمیت کا احساس ہوتا گیا وہ اپنے حق کے لیے اصرار کرتی رہی جس کے لیے انگریز تیار نہیں تھے۔ مگر کچھ وقت کے بعد دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ 'لیگ جن طاقتوں کی نمائندگی کر رہی تھی انہیں اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے انگریزوں کی تائید کی ضرورت تھی (اور) ہندوستان میں سامراج کو ان طاقتوں کی تائید کی ضرورت تھی۔' اس طرح ان دونوں کے درمیان در پردہ گٹھ جوڑ جاری رہا، حالاں کہ دونوں کے مقاصد الگ الگ تھے، اور اس کے نتیجے میں کبھی کبھی چڑ کے بھی لگتے رہتے تھے۔'

یہی وجہ ہے کہ کلکتہ سے شائع ہونے والے یوروپی ملکیت کے روزنامے - دی اسٹیٹس مین، کے اس وقت کے ایڈیٹر آرتھر مور نے یہ تبصرہ کیا تھا: 'خود ہندوستانیوں کے ذریعے قانونی آئین سازی کے نظریاتی راستے پر اصرار کر کے - اور وہ بھی جنگ کے زمانے میں - ہز مجیسٹی کی حکومت نے اپنے بھروسے کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر لیے ہیں۔'

فیلڈ مارشل لارڈ ویول کی وائسرائی

اکتوبر 1943 میں لارڈ لنلتھگو کی مدت عہدہ پوری ہو گئی۔ وہ جب ہندوستان سے روانہ ہوا تو گاندھی اور دوسرے کانگریس لیڈر جیل میں ہی تھے۔ فیلڈ مارشل لارڈ ویول کو نیا وائسرائے بنایا گیا۔ ہندوستان کے تمام وائسرایوں میں ویول نے ہی اس عہدے کو تجربے اور ہندوستان کی بابت سمجھ، ملک کے لیے برطانوی ہندوستانی آرمی اور ہندوستانی فوجیوں کے لیے عہد بستگی سے سب سے زیادہ ہم کنار کیا۔ وہ ہندوستان میں ایک عرصہ تک ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ کام کر چکا تھا، انہیں کمان کر چکا تھا، پھر ایک جنرل کی حیثیت سے دونوں جنگوں میں حصہ لے چکا تھا۔ جس وقت ویول نے وائسرائے کا عہدہ سنبھالا، جنگ کی صورت حال بھی تبدیل ہو چکی تھی، بالآخر اتحادی فوجوں کی جیت کے اشارے ملنے لگے تھے۔

گاندھی کے ایک چیلے اور ان کے سوانح نگار پیارے لال کا یہ کہنا ہے کہ ویول 'ایک پر وقار شخص تھا۔ خاموش طبع، ارادے کا پکا، اور گرم جوش۔ لگاوٹ میں لوگ اسے 'گنگی۔ اے ورڈ' ویول کے نام سے پکارتے تھے یعنی وہ ویول جس کا ایک لفظ ایک گنی کے برابر ہوتا تھا۔ اس کا خلوص شک وشبہ سے بالاتر تھا، اس میں شک نہیں کہ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ہندوستان آزادی کے راستے پر آگے بڑھے، وہ اس میں مدد کرنا چاہتا تھا، اس کا احساس وفاداری بھی حیرت ناک تھا، جس کی وجہ سے اسی نے، ایک سے زائد بار دوسروں کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی..... بالکل تیکھا فوجی انداز..... لیکن..... اس کا فوجیوں کا ناک کی سیدھ والا ذہن قانونی اور آئینی خوبیوں کو بہت کم سمجھ پاتا تھا، بعض اوقات وہ ان کی وجہ سے ابہام کا شکار ہو جایا کرتا تھا بلکہ وہ بے چین بھی ہو جاتا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی افسروں نے اس کی ان خوبیوں سے نیز منصوبوں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں اس کی حدود سے خوب کام لیا۔ اس کا نتیجہ المیے کی شکل میں سامنے آیا۔45

6 مئی 1944 کو گاندھی جیل سے رہا کر دیے گئے، وہ بیمار چل رہے تھے، اور انگریز اس سلسلے میں کسی طرح کی ممکنہ پیچیدگی کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے تھے۔ نظر بندی کے زمانے میں ملک میں جو کچھ ہوتا رہا تھا اس سے گاندھی کا کوئی راست تعلق نہیں تھا۔ تاہم 17 جولائی 1944 کو اپنی رہائی کے بعد انہوں نے جناح کو خط لکھا اور ملاقات کی پیش کش کی اور کہا کہ وہ مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں، بلکہ جناح کے بلکہ پوری نسل انسانی کے دوست ہیں۔ انہوں نے جناح سے کہا کہ وہ اس معاملے میں انہیں مایوس نہ کریں۔ گاندھی نے جناح کو یہ خط گجراتی میں لکھا تھا، انہیں یہ یاد دلایا کہ دونوں کا خاندان گجرات سے تعلق رکھتا ہے اور یہ کہ وہ اپنے مشترکہ وطن اور اخوت کے لیے ایک نئی بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آئین اور قانون کے ماہر جناح نے اس خط کا جواب انگریزی میں دیا اور اس کی یہ وضاحت کی کہ یہ وہ زبان ہے جس میں اپنے خیالات کی وضاحت کرنے میں ان کے غلطی کرنے کا امکان کم سے کم ہے۔ جناح نے گاندھی کو مطلع کیا کہ وہ کشمیر جا رہے ہیں لیکن اگر ان کی واپسی پر گاندھی ان کے گھر تشریف لائیں تو یہ ان کے لیے بڑی عزت کی بات ہوگی۔ گاندھی اپنے آشرم میں، اپنے پیروکاروں کی خلل اندازیوں کی وجہ سے اپنے مہمانوں سے مشکل ہی سے ملاقات کر پاتے تھے۔ اسی بڑی وجہ سے جناح نے گاندھی کو پوری بے باکی سے بتا دیا کہ وہ ان سے ملاقات کرنے کے لیے ان کی رہائش گاہ پر کبھی نہیں گئے۔

گاندھی-جناح مذاکرات (حصہ اول)

اگست 1942 میں کانگریس لیڈروں کی گرفتاری کے وقت سے راجاجی ('ہندوستان چھوڑو' کی علانیہ مخالفت کرنے کی وجہ سے راج گوپال اچاری کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔) کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کی کوشش کرتے جا رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کانگریس سے اسی وقت ہاتھ ملائے گی جب مسلم اکثریت کے علاقوں کے لیے حق خود ارادیت کی یقین دہانی کرا دی جائے گی۔ مگر انگریز کسی بھی حالت میں، جنگ کے زمانے میں

اقتدار منتقل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ راجا جی کو گاندھی کے سامنے اپنا فارمولہ پیش کرنے کا موقع اس وقت ملا جب گاندھی کو عارضی طور پر رہا کر دیا گیا تھا۔ ان تجاویز میں، جنھیں بعد میں راجہ جی فارمولا کا نام دیا گیا، اہم باتیں تھیں: (1) مسلم لیگ کو ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کی توثیق کرنی چاہیے، اور عبوری مدت کے لیے عارضی اور عبوری حکومت کی تشکیل میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے؛ (2) جنگ کے خاتمے کے بعد کانگریس ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے اُن باہم متصل اضلاع کی حد بندی کے لیے ایک کمیشن کے تقرر کی تائید کرے گی جہاں مسلمان مطلق اکثریت میں ہیں، (3) اس طرح نشان زد کیے جانے والے علاقوں میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر تمام باشندوں میں رائے شماری کرائی جائے یا کسی دوسرے طریقہ سے ہندوستان سے علاحدگی کے معاملے کو طے کیا جائے۔ اگر اکثریت ہندوستان سے الگ ایک خود مختار حکومت کے حق میں فیصلہ کرتی ہے تو اس فیصلے کو عمل میں لایا جائے، (4) علاحدگی کی صورت میں دفاع، تجارت، مواصلات اور دوسرے لازمی امور کے سلسلے میں باہمی نوعیت کے معاہدے کیے جائیں گے، اور آخر میں (5) یہ کہ یہ ساری شرطیں اس وقت ہی نافذ ہوں گی جب انگریز ہندوستان کی حکمرانی کے لیے سارے اختیارات منتقل کر دیں گے۔

اپنی رضامندی دینے کے لیے گاندھی کو مشکل سے ایک لمحہ لگا۔ گاندھی کی رضامندی کی طاقت کے ساتھ راجا جی نے اس کے بعد جناح سے ملاقات کی جنہوں نے اس فارمولے کی توثیق کرنے سے معذوری ظاہر کی کیوں کہ اس میں لیگ کا پاکستان کا مطالبہ شامل نہیں تھا۔ بعد میں انہوں نے مسلم لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس فارمولے کو 'ایک سایہ، کوڑا، لنگڑا لولا، اور کرم خوردہ' بتایا تھا۔ تاہم انہوں نے یہ پیش کش بھی کی اگر راجا جی چاہیں گے تو یہ فارمولا مسلم لیگ کونسل کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ یہ بخوبی جانتے ہوئے کہ جناح کی اپنی منظوری کے بغیر، ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اور اسے عوام کے ساتھ بے ایمانی اور اسکیم کے تئیں ناانصافی تصور کرتے ہوئے راجہ جی نے جناح کے ساتھ اپنی خط کتابت کے ساتھ اس فارمولے کو پریس کے لئے جاری کر دیا۔ انہوں نے آخری بار جناح کو لکھا: "اس کے ساتھ ہی ہماری نجی گفت وشنید ختم ہوتی ہے۔ عوام کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔"

ہندوستان چھوڑو قرارداد کی منظوری (4 اگست 1942) سے چار روز قبل گاندھی نے کانگریس - لیگ تصفیے کے لئے جناح سے ایک اہم سلسلہ جنبانی کی۔ اس مرتبہ یہ کوشش، دونوں کے ایک مشترکہ مسلم دوست میکلائی کے توسط سے، درج ذیل خطوط پر کی گئی: اس شرط کے ساتھ کہ مسلم لیگ فوراً آزادی کے لیے کانگرس کے مطالبے کی تائید کسی طرح کے تحفظات کے بغیر کرے گی، جو اس بات سے مشروط ہوگی کہ آزاد ہندوستان محوری طاقتوں کی جارحیت پر روک لگانے کے لئے اتحادیوں کی فوجوں کو کارروائی کرنے کی اجازت دے گا، اور اس طرح چین اور روس دونوں کی مدد کی جائے گی اور برطانوی حکومت کے پاس اب جو اختیارات ہیں انہیں پورے ہندوستان کی طرف سے مسلم لیگ کو منتقل کئے جانے پر کانگریس کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔' اور یہ کہ مسلم لیگ عوام کی طرف سے جو حکومت بنائے گی، کانگریس نہ صرف یہ کہ اس میں

کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرے گی بلکہ آزاد ملک کی مشنری چلانے کے لئے حکومت میں شامل بھی ہوگی۔

جناح کا ردعمل یہ تھا کہ وہ کسی ایسی پیش کش یا تجویز پر توجہ نہیں دے سکتے جو راست طور پر انہیں پیش نہ کی گئی ہو۔ گاندھی اگر چند روز قبل ہی اچانک جیل میں نہ ڈال دئے گئے ہوتے تو وہ گاندھی سے ضرور ملاقات کرتے۔

گاندھی کی نظربندی کے دوران اپریل 1943 میں، دہلی میں مسلم لیگ کے کھلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جناح نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر گاندھی واقعی مسلم لیگ سے مصالحت چاہتے ہیں تو ان (جناح) سے زیادہ کوئی اور اس کا خیر مقدم نہیں کرے گا۔' اگر گاندھی کی یہ خواہش ہے، تو راست طور پر مجھے لکھنے سے انہیں کون چیز روک رہی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ اس ملک میں یہ حکومت واقعی اتنی مضبوط ہو، لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ اگر اس طرح کا کوئی خط بھیجا جائے تو وہ اسے روکنے کی ہمت کر سکے گی۔ اگر اس طرح کا کوئی خط روکا گیا تو یہ بہت ہی سنگین بات ہوگی۔ اگر ان کے موقف میں کوئی تبدیلی آگئی ہے تو وہ مجھے چند سطریں لکھ بھیجیں۔ اس کے بعد مسلم لیگ پیچھے نہیں رہے گی۔' جواب میں گاندھی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ جناح سے ملنا چاہتے ہیں۔' آپ کی دعوت کے ساتھ ''اگر'' لگا ہوا ہے' کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کو تبھی چٹھی لکھوں جب میرے نظریات میں تبدیلی آگئی ہو؟ دلوں کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ میں یہ چاہوں گا کہ آپ مجھے ویسا ہی سمجھیں جیسا کہ میں ہوں۔ ایک مشترکہ حل کی تلاش کے لئے اور آپ کو فرقہ وارانہ اتحاد کے سوال پر کیوں غور نہیں کرنا چاہیے اور اپنے حل کو ان تمام لوگوں کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے، جو اس سے سروکار رکھتے ہیں۔ مل کر کیوں نہیں کام کرنا چاہیے۔؟

حکومت برطانیہ کے عزائم کے بارے جناح کے خیالات سے قطع نظر حکومت نے یہ خط جناح تک نہیں پہنچنے دیا۔ البتہ اس کے مضمون سے جناح کو آگاہ کر دیا۔ اس پر جناح نے یہ جواب دیا کہ انہوں نے یہ نہیں چاہا تھا، بلکہ یہ چاہا تھا کہ گاندھی پہلے مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان سے اتفاق کرلیں اور پھر انہیں خط لکھیں، 'گاندھی کے اس (موجودہ) خط کو ان کی اس کوشش کے طور پر لیا جاسکتا ہے جس کا مقصد خود اپنی رہائی کے لئے مسلم لیگ کو حکومت سے بھڑانا ہے۔' بہر حال انگریزوں کے ذریعے سینسر شپ کے اس بے محابہ مظاہرے کو جناح نے نظرانداز کر دیا خواہ اس سے پہلے وہ اس طرح کے معاملہ کو کتنا ہی سنگین کیوں نہ سمجھتے رہے ہوں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اصل خط کو روک لینے اور اس کے مواد سے آگاہ کردینے کا طریقہ کار اس سازش میں ملوث فریقوں (جناح اور انگریزوں) کے لئے مفید مطلب تھا۔ بہر حال جب اگلی بار، کیبنٹ مشن کے ساتھ گفت وشنید کے دوران جناح ایک مرتبہ پھر لارڈ ویول کی طرف سے پیش کردہ کانگریس کے ایک خط کے صرف ''مضمون'' پر، اصل متن کا انتظار کئے بغیر قانع ہوگئے تو ان کے لئے یہ بات کافی مہنگی ثابت ہوئی۔ مگر اس کا مطلب ایک بار پھر واقعات سے کترا کر گزر جانا، اس لئے ان سب کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔

17 جولائی 1944 کی رات دیر گئے گاندھی نے جناح کو خط لکھا اور انہیں 'براور جناح' سے خطاب کیا اور اس پر دستخط 'تمہارا بھائی گاندھی' کے طور پر کیے۔ انہوں نے گجراتی میں لکھا:

'ایک وقت وہ بھی تھا جب میں نے آپ کو مادری زبان میں بات کرنے کے لئے اکسایا تھا۔ آج میں آپ کو مادری زبان میں خط لکھ رہا ہوں۔ میں جیل سے بھیجے گئے دعوت نامے میں میرے اور آپ کے درمیان ملاقات کی ایک تجویز پہلے ہی رکھ چکا ہوں۔ میں نے اپنی رہائی کے بعد آپ کو کوئی خط نہیں لکھا ہے۔ آج میں خود کو ایسا کرنے کے لئے تیار پا رہا ہوں۔ آپ جب بھی چاہیں، ہماری ملاقات ہونی چاہئے۔ مجھے اسلام کا یا ہندوستانی مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھئے۔ میں ہمیشہ آپ کا اور پوری انسانی نسل کا خادم اور دوست رہا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔'

یہ خط اراتا گجراتی زبان میں لکھا گیا تھا، جو کہ ہندوؤں، پارسیوں اور اس مسلم فرقہ کی مشترکہ مادری زبان تھی جس سے خود جناح تعلق رکھتے تھے اور جس کے وجود کو ہی پاکستان کے فلسفے میں کوئی جگہ نہیں دی گئی تھی۔ ''براور جناح'' نے فوراً ہی سری نگر کے ایک ہاؤس بوٹ کوئین الیزابیتھ سے 'ڈیر مسٹر گاندھی' کو انگریزی میں جواب بھیجا اور گاندھی کو مطلع کیا کہ اگست 1944 کے وسط میں کسی وقت کشمیر سے واپسی پر ممبئی میں گاندھی کو اپنے مکان پر خوش آمدید کہہ کر انہیں بہت خوشی ہوگی۔ لبرل لیڈر تیج بہادر سپرو نے گاندھی سے کہا 'مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ...... آپ جیسا کوئی آدمی خوش آمدید کہے جانے کا متحمل ہوسکتا ہے۔'

گاندھی-جناح مذاکرات (حصہ دوم)

جیسا کہ 1944 میں صورت حال تھی، برطانوی نظام کے تحت، راج، مسلم لیگ اور کانگریس کے فرقہ وارانہ تکون کی طرف سے درپیش مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل پا رہا تھا۔ تاہم ہمیں یہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ برطانوی حکومت سے باہر یہ مسئلہ اس شکل میں ہرگز موجود نہ ہوتا اگر دونوں فرقوں نے کسی نہ کسی طریقہ پر اپنے تنازعات کے حل تلاش کر لیے ہوتے۔ جس سیاسی اور تاریخی پس منظر میں 1944 میں گاندھی اور جناح کے مذاکرات ہوئے، اس نے لیگ کے اندر اور لیگ سے باہر، جناح پر گاندھی کے ساتھ مصالحت کے لئے دباؤ بڑھا دیا تا کہ ہندوستان کی آزادی کا راستہ صاف ہو سکے۔ اس ملک میں اس بات کی زبردست توقع تھی کہ ان مذاکرات کا کوئی نہ کوئی قابل لحاظ نتیجہ برآمد ہوگا۔ جناح نے اپنے عام طریقہ کار سے بہت اہم انحراف کرتے ہوئے گاندھی کو 'مہاتما' کہا اور کچھ مدت کے لیے سیاسی جنگ بندی کے لیے اپیل کی، 'یہ سب کی خواہش ہے کہ ہماری ملاقات ہونی چاہیے' اور اب جب کہ ہم ملاقات کرنے جا رہے ہیں، ماضی کو بھلا دیجئے۔'

اگر اس میں کوئی ایسا فریق تھا جو تصفیہ نہیں چاہتا تھا تو وہ انگریز تھے۔ وہ ان تمام باتوں سے بہت زیادہ پریشان تھے کیوں کہ وہ ہندو مسلم تصفیہ کے امکانات سے سنگین خدشہ محسوس کر رہے تھے۔ ملاقات کے موقع پر وائسرائے نے ان پر یہ بات واضح کر دی کہ، اس سے پہلے کہ حکومت برطانیہ کچھ محدود اختیارات کے ساتھ ایک عبوری قومی حکومت کی تشکیل کے

بارے میں سوچے، ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے اہم عوامل کے درمیان ہر حال میں تصفیہ ہو جانا چاہیے۔' اس کے بعد لندن ٹائمز میں ایک لیڈنگ آرٹیکل شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا۔ 'مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح کے درمیان کوئی بھی معاہدہ، ان دونوں کے پیروکاروں کے لیے کتنا ہی اطمینان بخش کیوں نہ ہو، ہندوستان میں اس وقت تک سیاسی پیش رفت کو مادی طور پر آگے نہیں بڑھا سکے گا جب تک کہ اس میں وسیع تر مفادات،........ دبے کچلے طبقات کی بے چینی...... رجواڑوں کے دعووں، کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔' یہ سب پروپیگنڈے کی باتیں نہیں ہیں؛ اشاروں اور کنایوں سے مذاکرات میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ بلکہ اس کے لیے یہ واضح کیا جائے کہ ایک تیسرا فریق بھی ہے اور وہ، راج ہے۔ یہ راج ہی ہے جس کے پاس ترپ کا پتہ ہے۔'

اس ملاقات کے اعلان نے ہندو مہاسبھا کے ارکان کو بھی برہم کر دیا تھا۔ دوسری طرف ایک نیم فوجی مسلم تنظیم خاکساروں، کا ایک جتھا بمبئی پہنچ گیا تھا اور کانگریس۔ لیگ تصفیے کے عمل میں تیزی لانے کے مقصد سے ماحول سازگار بنانے کے لیے پریڈیں کر رہا تھا۔ اسی طرح کمیونسٹ بھی عوامی جلسے کر کے اُس کے ذریعے نازی جارحیت کی مزاحمت کی طرح ان دونوں لیڈروں کو جمہوریت کے دفاع کے لیے باہم متحد ہو جانے کے لیے مجبور کرنا چاہتے تھے۔ یہ خدشہ محسوس کرتے ہوئے کہ گاندھی کہیں مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو تسلیم نہ کر لیں، سکھوں نے بھی اپنے لیے 'سکھستان' کا مطالبہ پیش کر دیا۔ وہ پنجاب میں ایک علاحدہ حق خود ارادیت والی ریاست چاہتے تھے جس کی تشکیل جائداد کی بنیاد پر کی گئی ہو، یعنی جن علاقوں میں انہوں نے اپنی محنت سے بے کار زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا ہے اور جن میں ان کی بیشتر زمین جائداد واقع ہے، انہیں ملا کر ایک جداگانہ سکھ ریاست بنا دینا چاہیے۔ اس اثناء میں بمبئی کی پولیس نے احتیاط کے طور پر 'چند سڑکوں اور عوامی جگہوں کے استعمال پر پابندی لگا دی؛ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو ان سڑکوں کے ارد گرد کے علاقوں کے باشندے ہیں یا ان لوگوں سے کسی حقیقی ضرورت کے تحت ملنا چاہتے ہوں۔' مزید یہ کہ جناح نے یہ عجیب و غریب اعلان کر دیا کہ 'پریس کے نمائندے، مجھے امید ہے، یہ سمجھ لیں گے کہ اس میٹنگ کے دروازے پریس والوں کے لیے نہیں کھلے رہیں گے، اس لیے میں ان سے یہ درخواست کرنا چاہوں گا کہ وہ میری رہائش گاہ پر آنے کی زحمت نہ کریں........ بہر حال مسٹر گاندھی کے پہنچنے پر فوٹو گرافروں کو فوٹو لینے اور فلم کمپنیاں کو شوٹنگ کرنے کی آزادی ہوگی۔'

جناح کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ 9 ستمبر 1944 سے شروع ہوا اور بمبئی کی 10۔ ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر واقع ان کے مکان پر 18 دن جاری رہا۔ گاندھی نے جناح کے پاس گیہوں کے بنے کچھ مخصوص ویفر بھیجے جو خود ان کے لیے مذاکرات کے دوران پڑنے والی عید کے موقع پر بنائے گئے تھے۔ انہوں نے جناح کو معالجاتی مساج دینے کے لیے مذاکرات کے دوران ان کے پاس اپنے نیچرو پیتھ کو بھی بھیجا تھا۔

جیسا کہ پیارے لال نے دی فائنل فیز میں قلم بند کیا ہے: 'دونوں ملے، دونوں نے مصافحہ کیا، دونوں نے

ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات حقیقی انسانی احساس کا تاثر پیش کرتی معلوم ہورہی تھی۔ مہاتما کا استقبال کرنے اور انہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے جناح پورچ تک باہر آئے بلکہ ان کے ساتھ فوٹو بھی کھنچوایا۔ مبصرین کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے جناح کے وداعی گرم جوشانہ مصافحہ میں محض اداکاری سے کہیں زیادہ بھی کچھ دیکھا تھا۔ مگر بس اتنا ہی۔ جناح نے سب سے پہلے گاندھی کی نمائندہ حیثیت کے بارے میں سوال کھڑا کردیا، مگر بعد میں ڈھیلے پڑ گئے اور بات چیت جاری رکھنے سے اتفاق کیا۔ جیسے جیسے بات چیت میں پیش رفت ہوتی رہی، سچائی سامنے آنے لگی کہ صرف 'لینے' کے بارے میں بات ہوگی، 'دینے' کے بارے میں نہیں! قائداعظم اتفاق کرنے بلکہ تبادلہ خیال کرنے نہیں آئے تھے: اعتراض اس لیے اٹھایا گیا تھا کہ مانگنے والے کو روشنی حاصل کرنے اور وفاداروں کے گروہ میں شامل ہونے کا موقع دیا جاسکے۔' واپسی پر گاندھی سے سوال کیا گیا تھا کہ کیا آپ جناح کے پاس سے کچھ لے کر آئے ہیں؟ جواب تھا۔ 'صرف پھول۔' بعد میں انہوں نے اپنی ساڑھے تین گھنٹے کی بات چیت کی پوری کہانی راجاجی کو سنائی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات چیت 'انتہائی مایوس کن' تھی: یہ میرے صبر و تحمل کا امتحان تھی۔......اپنے اس صبر و تحمل پر خود مجھے بھی حیرت ہے.....' بہرحال ہر لحاظ سے یہ ایک دوستانہ بات چیت تھی، پیارے لال کے بیان کے مطابق، گاندھی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: آپ کے، (راجہ جی) کے فارمولے کے لیے (جناح کی) حقارت اور آپ کے لیے حقارت سراسیمہ کردینے والی بات ہے۔اس بات سے آپ کی قدر میری نگاہ میں بڑھ گئی کہ آپ اتنی دیر ان سے بات کرتے اور یہ کہ یہ فارمولا تیار کرنے کی زحمت اٹھائی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ نے ان کا مطالبہ مان لیا ہے، اس لیے مجھے بھی مان لینا چاہیے۔ اس پر میں نے کہا کہ میں راجہ جی کے فارمولے کی توثیق کرتا ہوں، اگر آپ چاہیں تو اسے پاکستان کا نام دے سکتے ہیں۔ پھر انہوں نے لاہور قرارداد کے بارے میں بات کی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اور میں اس کے بارے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔ آیئے، ہم راجہ جی کے فارمولے کے بارے میں بات کریں! اگر اس میں کوئی خامی یا کمی پائیں تو اس کی نشان دہی کرسکتے ہیں۔'

'بات چیت کے درمیان انہوں نے پھر گڑے مردے اکھاڑنے شروع کردیے کہ آپ یہاں ایک ہندو کی حیثیت سے، ہندو کانگریس کے نمائندے کی حیثیت میں آئے ہیں۔' میں نے جواب میں کہا۔ 'نہیں! میں یہاں نہ تو ایک ہندو کی حیثیت سے آیا ہوں اور نہ کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے! میں یہاں ایک فرد کی حیثیت سے آیا ہوں۔ آپ مجھ سے ایک فرد کی حیثیت سے، مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے، یعنی جس حیثیت میں چاہے، بات کرسکتے ہیں۔ اگر آپ نے راجہ جی سے اتفاق کرلیا ہے اور ان کے فارمولے کو جان لیا ہے تو نہیں اور آپ کو اپنی اپنی تنظیموں سے رجوع کرنا چاہیے تھا اور اسے قبول کرلینے کے لیے ان سے درخواست کرنی چاہیے تھی! اسی لیے راجاجی آپ کے پاس آئے تھے۔ آپ اسے دوسری پارٹیوں کے سامنے بھی رکھتے۔ اب یہ کام مجھے اور آپ کو کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ لیگ کے صدر ہیں۔ اگر میں اپنے علاوہ کسی اور کی نمائندگی نہیں کررہا ہوں تو پھر اس بات چیت کی بنیاد ہی کیا رہ جاتی ہے۔ یہ کام کیسے انجام دینا ہے؟ میں وہی شخص تھا جیسا انہوں نے مجھے 1939 میں پایا تھا۔ مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے اس طرح کی بات

کرنی چاہیے کہ 'جی ہاں! میں وہی شخص ہوں، چوں کہ آپ یہ سوچتے ہیں کہ مجھ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے تو میں چلا جاؤں گا!' مگر میں نے اپنے آپ کو ایسا کرنے سے روکا، میں نے ان سے کہا۔ 'آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ ایک شخص کو بدل دیں! اگر آپ میرے خیالات بدل سکتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں، میں دل کی گہرائیوں سے آپ کی تائید کروں گا، انہوں نے کہا۔ 'ٹھیک ہے! میں جانتا ہوں کہ اگر میں آپ کو بدل سکوں تو آپ میرے لیے 'علی' بن جائیں گے۔'

بعد میں گاندھی نے کہا کہ 'یہ ان کے لیے بہت بڑا انکشاف تھا کہ میں پاکستان کے اس پیغمبر سے ملاقات کر رہا تھا جسے اپنے 'علی' کی تلاش تھی۔' پیارے لال کی روایت کے مطابق، گاندھی نے کہا کہ 'انہوں نے کہا کہ مجھے پاکستان کے مطالبے کو مان لینا چاہیے، اس کے بعد وہ میرا پورا ساتھ دیں گے، وہ جیل چلے جائیں گے، بلکہ گولی بھی کھائیں گے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ مل کر ان کا سامنا کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ 'ہوسکتا ہے کہ آپ ایسا نہ کریں۔' میں نے کہا کہ 'مجھے آزما کر دیکھ لیجیے۔'

'ہم پھر فارمولے پر واپس آ گئے، وہ آزادی کے بعد نہیں بلکہ ابھی پاکستان چاہتے ہیں ان کا کہنا تھا۔ ہم پاکستان اور ہندوستان کے لیے آزادی چاہیں گے، انہوں نے کہا۔ 'ہم کوئی معاہدہ کریں، اس کے بعد حکومت کے پاس جائیں اور اسے قبول کرنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالیں۔' میں نے کہا کہ میں اس میں فریق نہیں بن سکتا، میں انگریزوں سے ہندوستان پر تقسیم تھوپنے کے لیے نہیں کہہ سکتا۔' 'اگر آپ الگ ہونا چاہتے ہیں تو میں آپ کو نہیں روک سکتا، آپ کو مجبور کرنے کے لیے میرے پاس کوئی اختیار نہیں ہے، اور اگر میرے پاس ہوتا تو میں اسے آپ کے خلاف ہرگز استعمال نہ کرتا۔' انہوں نے کہا۔ 'مسلمان پاکستان چاہتے ہیں، لیگ مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور علاحدگی چاہتی ہے۔' میں نے کہا کہ 'میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ لیگ مسلمانوں کی سب سے طاقت ور تنظیم ہے اور میں یہ تک مان سکتا ہوں کہ آپ اس تنظیم کے صدر کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔ علاقے کے تمام باشندوں کی رائے شماری کرائیے اور دیکھیے۔' جواب میں ان کا یہ کہنا تھا۔ 'آپ غیر مسلموں کی رائے شماری کی بات کیوں کرتے ہیں۔' میں نے کہا کہ۔ 'آپ آبادی کے کسی حصے کو اس کے ووٹ کرنے کے حق سے محروم نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ انہیں ساتھ لے کر چلنا ہوگا، اور اگر آپ اکثریت میں ہیں، تو آپ کو ڈر کاہے کا ہے۔' میں نے انہیں بتایا کہ مجھ سے کرن شنکر رائے نے کیا کہا تھا۔ 'اگر صورت حال حد درجہ بگڑ گئی تو بنگال کے ہم سب لوگ پاکستان چلے جائیں گے مگر خدا کے لیے، بنگال کو ہرگز تقسیم نہ کیجیے، اس کے حصے بخرے نہ کیجیے۔'

میں نے کہا کہ ''اگر آپ اکثریت میں ہوں گے تو فیصلہ آپ کا ہوگا، میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے لئے اچھی چیز نہیں ہے، لیکن اگر آپ سب یہی چاہیں گے تو ایسا ہی ہوگا، مگر یہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک طرح کی مفاہمت ہوگی، ایسا اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ انگریز یہاں رہیں گے۔''

'انہوں نے فارمولے کی مختلف شقوں کے بارے میں سوال جواب شروع کر دیے میں نے ان سے کہا: ''اگر آپ ان باتوں کی وضاحت چاہتے ہیں، تو کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ آپ فارمولا بنانے والے سے بات کریں۔'' انہوں نے کہا کہ۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ میں نے کہا: ''تو پھر مجھ سے سوال جواب کرنے کا کیا فائدہ'' انہوں نے خود کو سنبھالا۔ انہوں نے کہا: ''میں آپ سے سوال جواب یا پوچھ تاچھ نہیں کر رہا ہوں۔'' پھر یہ بھی کہا: ''بس پوری زندگی ایک وکیل رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ میرے طریقہ کار سے آپ کو یہ محسوس ہوا ہو کہ آپ سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں۔'' میں نے ان سے کہا کہ وہ فارمولے کے سلسلے میں اپنے اعتراضات تحریر کر دیں۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔'' کیا مجھے ایسا لازماً کرنا چاہیے۔'' انہوں نے پوچھا، اور پھر راضی ہو گئے۔'' آخر میں انہوں نے کہا'' میں آپ کے ساتھ کوئی معاہدہ چاہوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔'' آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے کے لئے اس وقت تک ملتے رہنا چاہیے جب تک کہ کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔'' انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔'' وہ اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ میں نے مشورہ دیا۔'' کیا ہمیں یہ بات بھی بیان میں شامل کرنی چاہیے۔'' انہوں نے کہا'' نہیں! اچھا ہے کہ ایسا نہ کیا جائے'' تاہم ہمارے درمیان مفاہمت رہے گی اور بات چیت میں جس دوستی اور یگانگت کا مظاہرہ ہوا ہے اس کی عکاسی ہمارے عوامی بیانات میں بھی ہوگی۔''

'راجاجی: کیا آپ کے خیال میں وہ کوئی تصفیہ چاہتے ہیں؟'

'گاندھی: میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، ان کا خیال ہے کہ شاید وہ چاہتے ہیں۔'

'راجاجی! تو کیا آپ اسے کامیاب ہو جانے دیں گے۔'

'گاندھی: جی ہاں، بشرطیکہ مجھ تک صحیح بات پہنچے۔'

اگلے دن ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ جناح کا کہنا ہے کہ 'یہ رمضان کے مہینے کی 21 ویں تاریخ ہے جو کہ مسلمانوں کے لئے ایک بہت اہم دن ہے۔' اس پر جناح کے ایک سابق رفیق کار نے کہا'' انہوں نے یہ کیوں نہیں کیا کہ وہ اتوار کا دن تھا اور چھٹی چاہتے تھے۔ وہ اتوار کو رمضان سے بہتر سمجھتے ہیں۔''

11 ستمبر کی شام بات چیت کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ مہاتما نے شام کا کھانا جناح کی رہائش گاہ پر ہی بات چیت کے دوران کھایا۔ ان کی ٹفن باسکیٹ میں اُبلے ہوئے پانی کی ایک بوتل بھی رکھی گئی تھی، اس خیال سے کہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مہاتما ایک مسلمان کے گھر کھانا کھاتے وقت مقدس گنگا جل یا اس جیسی کوئی چیز استعمال کر رہے ہیں، گاندھی نے ہدایات دیں کہ اس کے بعد ان کے کھانے کے ساتھ پانی کی بوتل نہ بھیجی جائے۔ قائداعظم کی طرف ان پر ڈورے ڈالے جانے کا سلسلہ 12 ستمبر کو بھی جاری رہا۔ پیارے لال کے ذریعے نقل کئے گئے گاندھی کے الفاظ میں:

'انہوں نے حکومت پاکستان کی ایک رجھانے والی تصویر پیش کی کہ وہ (پاکستان) ایک مکمل جمہوری ملک ہوگا۔' میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے ہی یہ نہیں کہا جمہوریت ہندوستان کے حالات کے لئے مناسب نہیں رہے گی؛ انہیں یہ بات یاد نہیں آئی۔ انہوں نے مجھ سے یہ بتانے کے لئے کہا کہ انہوں نے واقعی کیا کہا تھا، چناں چہ میں نے انہیں ساری بات بتائی کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ اور میں نے یہ بھی کہا کہ ہوسکتا ہے کہ میں ان کی بات ٹھیک نہ سمجھ پایا ہوں! اگر میں غلطی پر ہوں تو میری اصلاح کردی جائے لیکن جب میں نے تفصیل سے دوہرایا کہ انہوں نے کیا کہا تھا، تو وہ اس سے انکار نہیں کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں! انہوں نے ایسا کہا تھا۔ لیکن وہ بات تھوپی جانے والی جمہوریت کے بارے میں تھی۔

'اس کے بعد انہوں نے کہا:'' کیا آپ کے خیال میں ہمارے سامنے مذہبی اقلیت کا معاملہ ہے۔ میں نے کہا: 'جی ہاں' اگر نہیں تو وہ بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے پورا لکچر پلا دیا۔ میں یہاں ساری باتیں نہیں دوہراؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ پاکستان میں دوسری اقلیتوں؛ سکھوں، عیسائیوں، پس ماندہ اور مظلوم لوگوں اور کچلے ہوئے طبقات کا کیا ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ یہ سب پاکستان کا حصہ ہوں گے۔ میں نے پوچھا کہ ان کی مراد کہیں مشترکہ حلقہ انتخاب سے تو نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ میں اسی بات کی طرف آرہا تھا۔ انہوں نے کہا'' ہاں، وہ چاہیں گے کہ یہ سب ایک کُل کا حصہ بنیں۔ وہ مشترکہ حلقہ انتخاب کی خوبیاں بتائیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے جداگانہ حلقہ انتخاب چاہا تو ویسا ہی ہوگا۔ اگر سکھ چاہیں گے تو گورمکھی ان کی زبان ہوگی اور حکومت پاکستان انہیں مالی مدد دے گی۔ میں نے پوچھا، جاٹوں کے بارے میں کیا کہنا ہے، پہلے تو انہوں نے اس خیال کا ہی مذاق اڑایا، پھر یہ کہا کہ'' اگر وہ یہ چاہیں گے تو انہیں ملے گا۔ اگر وہ چاہیں گے تو انہیں جداگانہ وجود حاصل ہوگا۔ میں نے پوچھا' اور عیسائیوں کا کیا ہوگا، وہ بھی کچھ ایسے علاقوں کے لئے مطالبہ کررہے ہیں جہاں وہ اکثریت میں نہیں، اور جہاں وہ حکومت کر سکتے ہیں، جیسے ٹراونکور۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہندوؤں کا مسئلہ ہے۔ میں نے یہ بات یہ سمجھ کر کہی تھی کہ ٹراونکور پاکستان میں ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ اسے ہندوؤں کو دے دیں گے۔ انہوں نے اس سلسلے میں نیوفاؤنڈ لینڈ کی مثال پیش کی۔ باقی بات چیت کوئی خاص نہیں تھی۔ میں ان کے ذہن کو سمجھنا جاری رکھوں گا۔

'راجاجی: پتہ لگاؤ، وہ کیا چاہتے ہیں؟

'گاندھی: میں یہی کررہا ہوں۔ میں ان کی زبان سے یہ کہلوادوں گا کہ پاکستان کی یہ ساری تجویز ہی بکواس ہے، میرے خیال میں وہ الگ ہونا نہیں چاہتے۔ میں اپنی طرف سے کوئی جلد بازی نہیں کروں گا۔ لیکن وہ مجھ سے توقع نہیں کرسکتے کہ میں کسی غیر معینہ پاکستان کی توثیق کردوں گا۔

'راجاجی: کیا وہ آپ کے خیال میں اپنے دعوے سے دست بردار ہوجائیں گے؟

'گاندھی: اگر کوئی حل نکلنا ہے تو انہیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔ وہ حل چاہتے ہیں، مگر وہ کیسا حل چاہتے ہیں، نہیں جانتے! میں انہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آپ کا فارمولا ہی وہ چیز ہے جس کے لیے وہ مطالبہ کرسکتے ہیں۔'



محمد علی جناح شاندار لباس میں



جناح آرام کی حالت میں، ایک نادر تصویر



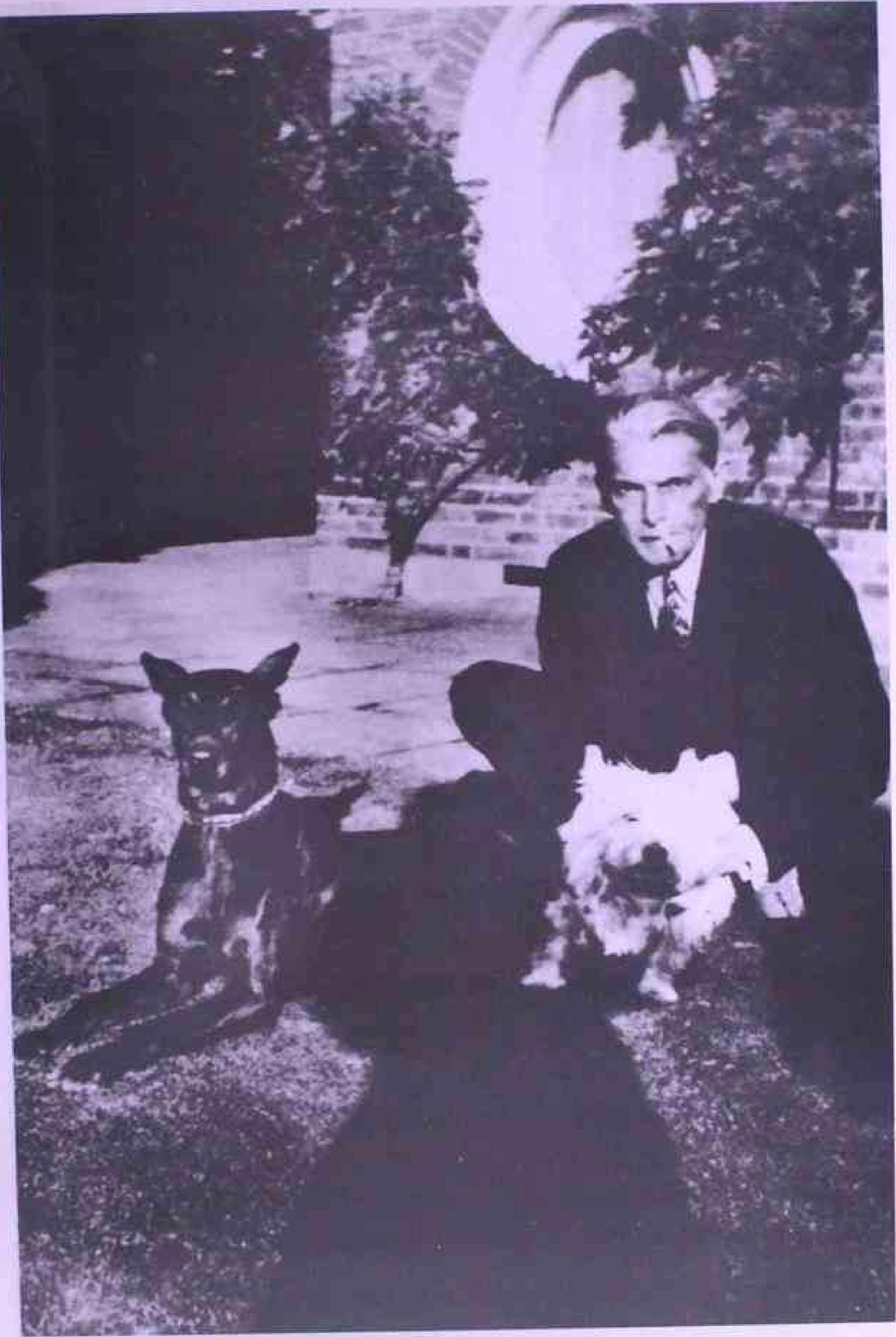
بیرسٹر جناح اپنے چیمبر میں



جناح پیسٹن جی کے ساتھ کار میں سیر پر نکلے ہوئے، پیچھے ایچ جے رستم جی، ہومی رستم جی کے ساتھ



جناح 1916 میں انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس میں بطور صدر



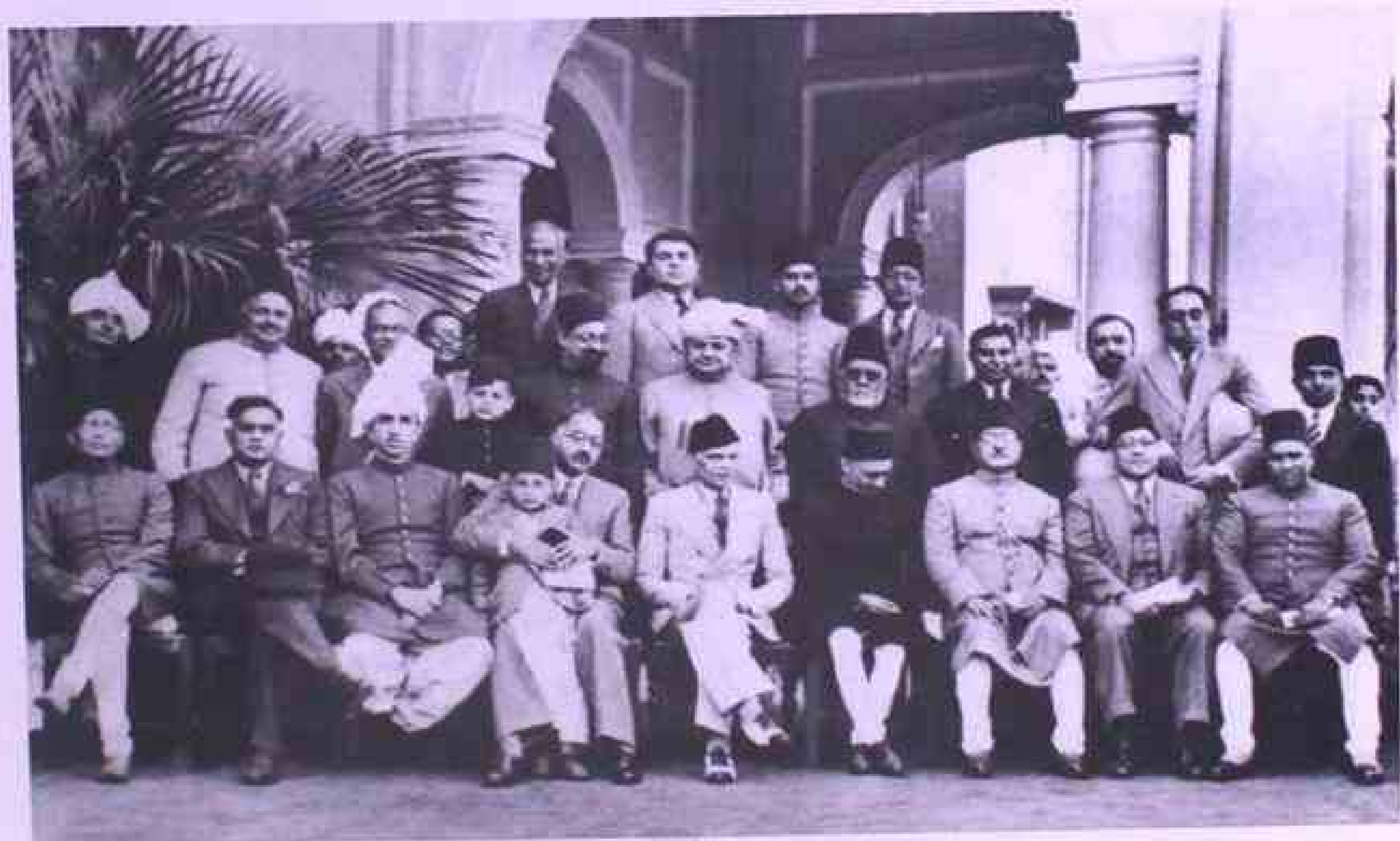
جناح اپنے گھر میں، اپنے کتوں کے ساتھ: 1940



والد اپنی بیٹی کے ساتھ



جناح اپنی بہن فاطمہ اور بیٹی دینا کے ساتھ



مسلم لیگ کے رہنما میاں بشیر احمد کی رہائش پر عشائیے کے بعد



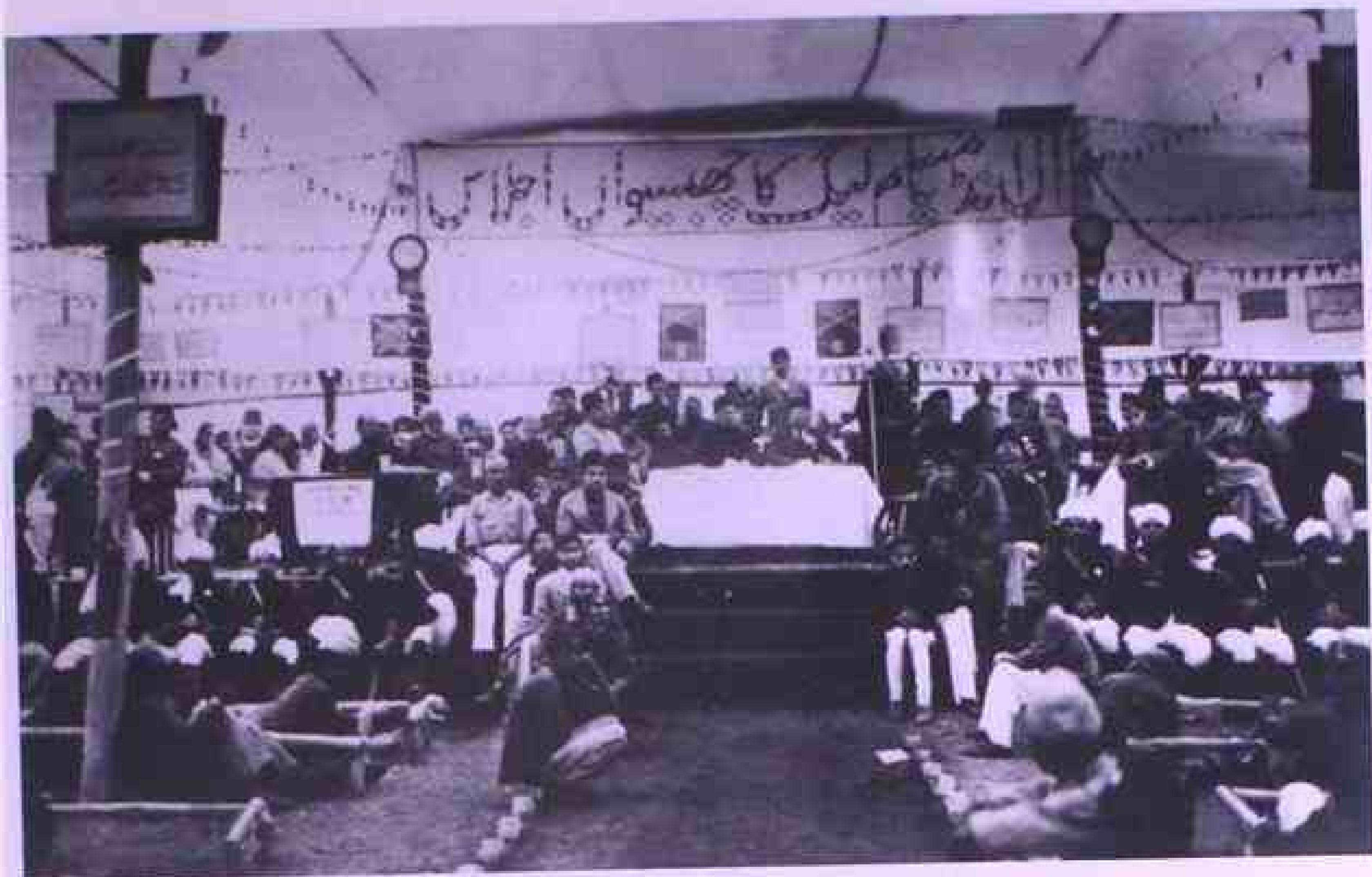
ریمزے میک ڈانلڈ کے زیرِ صدارت گول میل کانفرنس، لندن، 1931

صدر کے بائیں بیٹھے ہندستانی رہنما: موہن داس کرم چند گاندھی، مدن موہن مالویہ،

شری نواس شاستری اینگر اور تیج بہادر سپرو



سبھاش چندر بوس اور جناح



آل انڈیا مسلم لیگ کا 26واں اجلاس، پٹنہ، 28-26 دسمبر 1938

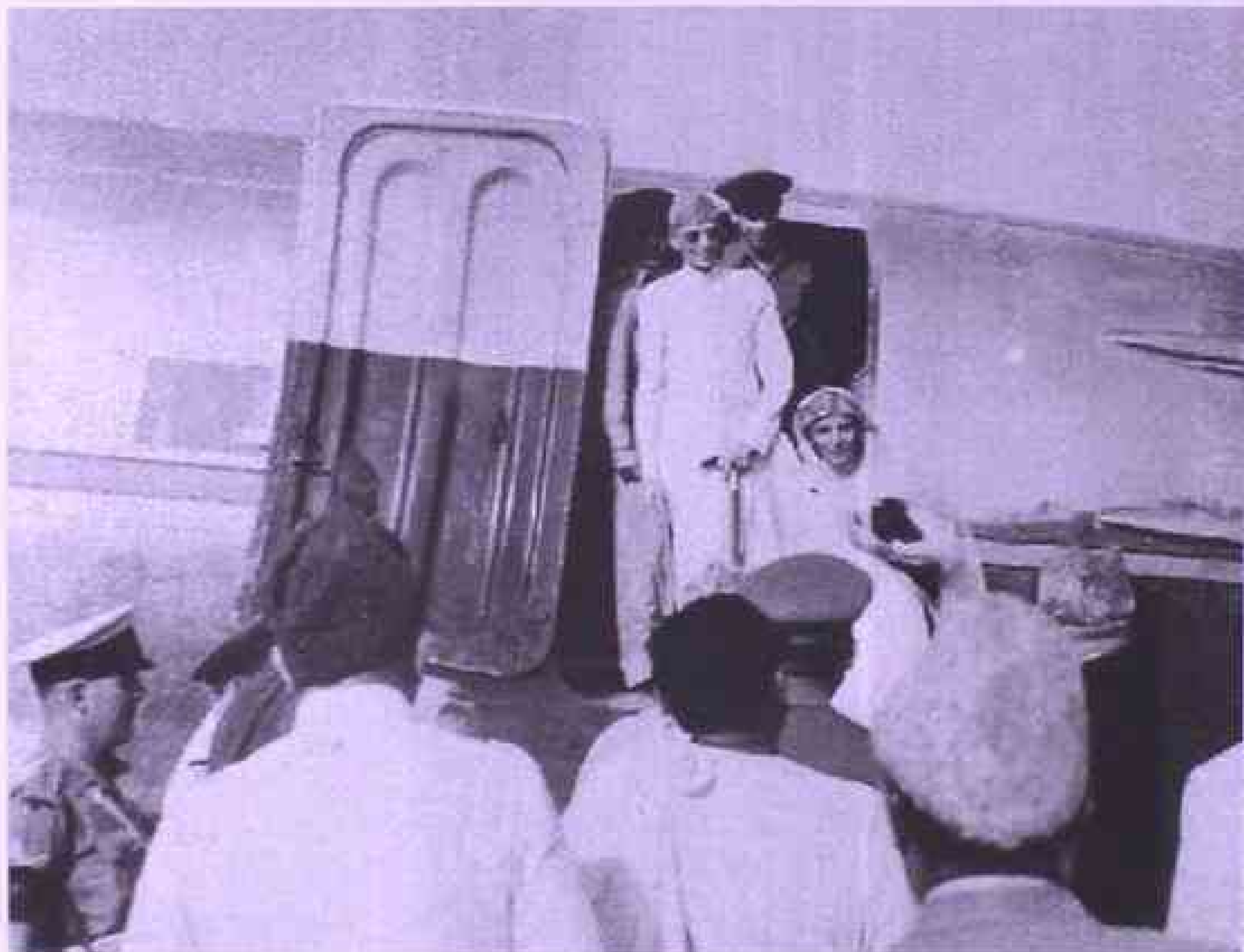


جناح 10 اورنگ زیب روڈ، نئی دہلی میں، 45-1944



لندن کانفرنس کے دوران انڈیا ہاؤس میں استقبالیہ، 6 دسمبر 1946

بائیں سے دائیں: لیاقت علی، سر ایس رگھوناتھن، جناح اور دیگر



جناح، پاکستان کے نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی ہوائی اڈے پر اترتے ہوئے،

7 اگست 1947



قائداعظم جناح اور فاطمہ جناح اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں، یکم جولائی 1948، بینک کے گورنر زاہد حسین خطاب کرتے ہوئے، تھکے ہوئے جناح



جناح 1945 میں کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر اپنے حامیوں کے درمیان

جناح اور رسالہ ٹائم کے لوئی فشر کے ساتھ، 1945



جناح، مسلم لیگ خواتین گارڈ کے ساتھ

جناح اور ان کی بہن فاطمہ، بعد کے برسوں میں



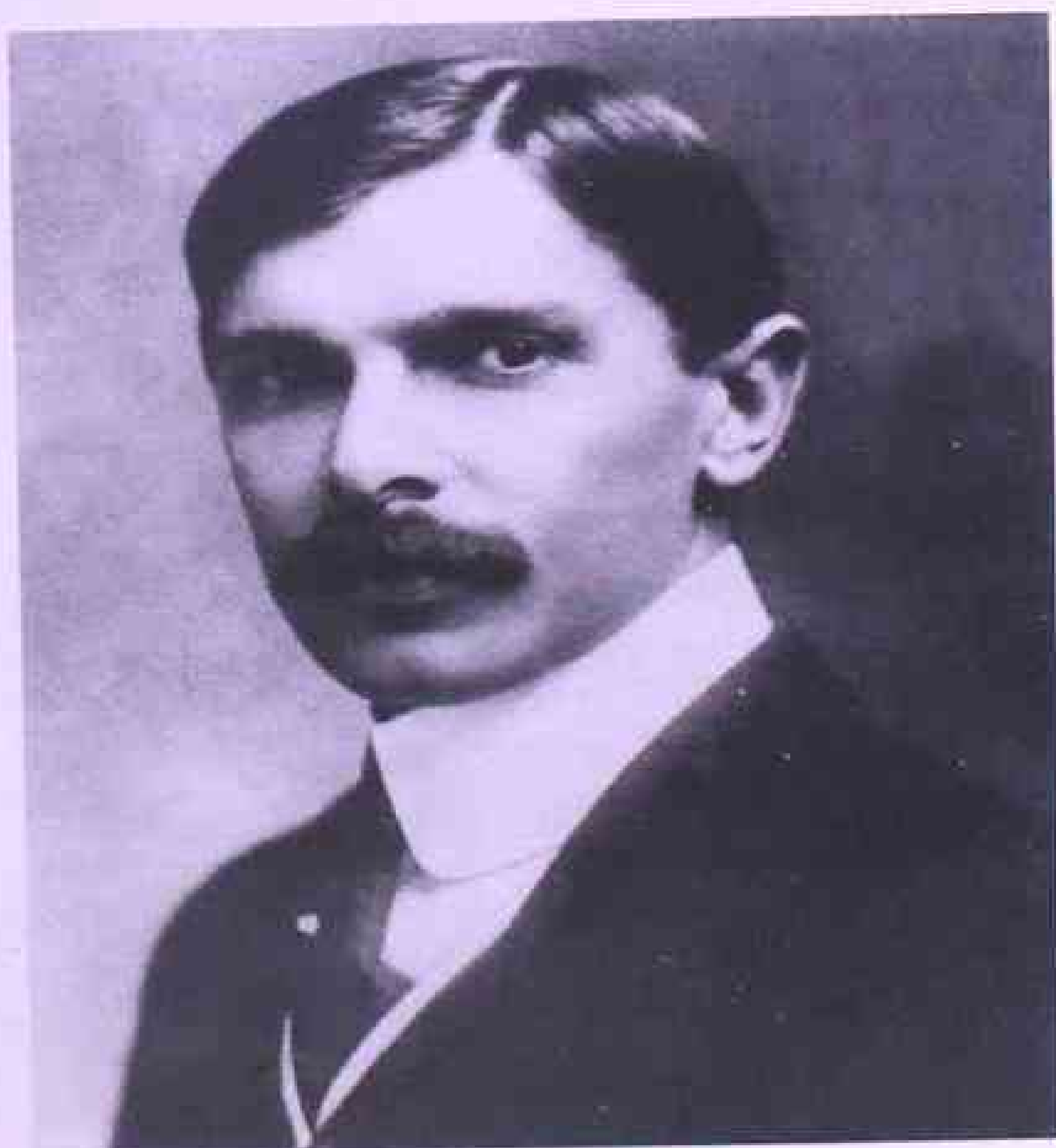
جناح، ہندوستان میں اپنے مطالعے کے کمرے میں



جناح، جودھپوری لباس میں



بائیں اور نیچے: بیرسٹر جناح





جناح: تفریح کے لمحات

جناح: تفریح کے لمحات



قائداعظم گورنر جنرل محمد علی جناح

جہاں تک باہر کی دنیا کا تعلق ہے، 9 سے 13 ستمبر تک امیدیں کافی دبی ہوئی بلکہ کمزور تھیں۔ اس کے بعد 14 سے 19 ستمبر تک کا عرصہ۔ جب جناح نے عید کے پیغام میں، ایک قوم کی طرح مسلمانوں کی پیش رفت کا ذکر کیا اور دوستی اور خیر سگالی کی کوئی بات کہے بغیر 'ملت کے ان دشمنوں کو برا بھلا کہا جو ہماری ترقی، میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں' - دراصل بڑھتی ہوئی ناامیدی کا عرصہ تھا، اس کے بعد تیزی سے بگاڑ شروع ہوا جس کا نقطۂ عروج 20 ستمبر کو مکمل مقاطعے کی شکل میں سامنے آیا۔

اس پورے عرصے خطوط کا تبادلہ جاری رہا- یہ ایک ایسی عجیب وغریب مراسلت تھی جو دوستانہ بات چیت کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ یہ خط مراسلت اور بات چیت کبھی بھی ایک ساتھ نہیں ہوئی، بلکہ ان کا سلسلہ متوازی طور پر چلا جس کے لیے مختلف زبانوں کا استعمال کیا گیا۔ اس پر راجاجی کا تیکھا تبصرہ اس طرح تھا- 'بات چیت آس پاس آنے کے لیے ہوئی جب کہ مراسلت کا سلسلہ ناکامی کی مراسلت کے قیاس پر مبنی تھا'

گاندھی نے ابتدا اس موقف سے کی تھی کہ ان کی زندگی کا اصل مشن ہندو مسلم اتحاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی، مسلمانوں کی طرف سے خواہش ظاہر کیے جانے کی صورت میں، مسلم لیگ کے مطالبے کو، جیسا کہ لاہور قرارداد میں پیش کیا گیا تھا یعنی ان علاقوں کے لیے خودارادیت جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، ماننے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ آزادی کے بغیر خودارادیت کو عمل میں نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ اور تمام دوسرے گروپوں کو مشترکہ جدوجہد کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کے لیے متحد ہو جانا چاہیے۔

جناح کے نزدیک یہ گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے جیسی بات تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے مشترکہ اقدام لیگ کے ساتھ سمجھوتے کے بعد ہونا چاہیے نہ کہ اس سے پہلے! دوسری طرف گاندھی کا زور اس بات پر تھا کہ جب تک تیسرے فریق کو نکال باہر نہیں کیا جاتا، وہ ایک دوسرے کے ساتھ امن سے نہیں رہ سکیں گے۔ تاہم وہ امن قائم کرنے کے طریقے اور وسیلے تلاش کرنے کی کوشش کے لیے ہمیشہ تیار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے راجاجی کے فارمولے کو اپنی منظوری دے دی تھی۔ اس میں مطالبے کا بنیادی مفہوم بھی شامل تھا جو کہ لاہور قرارداد کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ انہوں نے اسے ایک متعین شکل دی تھی: جناح نے اعتراض کیا کہ راجاجی کے فارمولے کی رُو سے مسلم لیگ کو ایک متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر آزادی کے مطالبے کی تائید کرنی تھی- 'اگر ہمارے درمیان کوئی تصفیہ ہو جاتا ہے......تو ہم مشترکہ کوشش کے ذریعے ہندوستان کے لیے آزادی حاصل کر لیں گے۔ جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا، ہم حدود کی نشان دہی کریں گے، رائے شماری ہوگی اور اگر متعلقہ لوگوں نے تقسیم کے حق میں ووٹ دیا، تو ملک کی تقسیم عمل میں آجائے گی۔' گاندھی کا سوال تھا کہ کیا یہ خودارادیت کا اصل حصہ نہیں تھا۔

اس کے بعد جناح نے قانونی موشگافیوں کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ فارمولے میں کیا کمیاں ہیں:

مثال کے طور پر حدود کی نشان دہی کے لیے کمیشن کا تقرر کون کرے گا، رائے شماری کی شکل کون طے کرے گا، اور رائے شماری کرائے گا جیسا کہ فارمولے میں کہا گیا ہے، رائے شماری کے فیصلے کو کون عمل میں لائے گا؟ اس پر گاندھی نے جواب دیا کہ 'عبوری حکومت'!

جناح نے پوچھا: -'وہ کون سی بنیاد ہے جس پر عبوری قومی حکومت کی تشکیل کی جائے گی؟ گاندھی نے جواب دیا کہ اس بنیاد کے بارے میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان معاہدہ کرنا ہوگا۔ فطری طور پر اگر ان دونوں کے درمیان کسی بنیاد کے بارے میں اتفاق رائے ہو جاتا ہے تو ان دونوں کو اس کے بارے میں دیگر پارٹیوں سے صلاح مشورہ کرنا ہوگا، —— اس سے جناح مطمئن نہیں ہو سکے، وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر گاندھی کے پاس کوئی متعین خاکہ ہے تو وہ اسے پیش کریں۔ ان کا کہنا تھا کہ چوں کہ یہ گاندھی کا فارمولا ہے، اس لیے انہوں نے اس پر یقیناً غور کیا ہوگا۔ گاندھی نے وضاحت کی کہ وہ کوئی خاکہ لے کر نہیں آئے ہیں، لیکن اگر لاہور قرارداد کے سلسلے میں جناح کے پاس کوئی خاکہ ہے تو 'میرے خیال میں اس کو بھی عمل میں لانے کے لیے ایک عبوری حکومت کی ضرورت ہوگی' اس پر تبادلہ خیال کیا جا سکتا تھا۔ یہاں سے یہ دونوں لاہور قرارداد پر آگئے۔

سوال یہ تھا کہ جب گاندھی کے مطابق راجاجی فارمولے میں لاہور قرارداد کے اصل مفہوم کو تسلیم کر لیا گیا تھا تو پھر انہوں نے لاہور قرارداد کو قبول کیوں نہیں کیا۔ اس کے سلسلے میں گاندھی نے اپنی مشکلات کا ذکر کیا، 'لاہور قرارداد مبہم اور غیر متعین تھی یہاں تک کہ اس میں لفظ 'پاکستان' کا ہی کہیں ذکر نہیں تھا۔ اس میں دو قومی نظریے کی بات بھی شامل نہیں تھی۔ اگر لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد مذہبی تھی تو کیا اتحاد اسلامی اس کا بدیہی نصب العین تھا، کیوں کہ دنیا کے سارے مسلمان ایک ہی امت ہیں؟ اگر دوسری طرف پاکستان صرف ہندوستانی مسلمانوں تک محدود رہے گا تو کیا جناح یہ وضاحت کریں گے اگر مذہب نہیں تو، پھر وہ دوسری کون سی چیز ہے جس کی بنیاد پر وہ ایک ہندوستانی مسلمان کو دوسرے ہندوستانی سے ممیز کریں گے؟ کیا ہندوستانی مسلمان کسی ترک یا کسی عرب سے مختلف ہے؟

جناح نے جواب دیا کہ اتحادِ اسلامی محض ایک بہانہ ہے۔ انہوں نے مانا کہ لفظ 'پاکستان' کا ذکر نہ تو لاہور قرارداد میں آیا اور نہ انہوں نے یا لیگ نے اس لفظ کا استعمال اس کے اصل مفہوم میں ہی کیا ہے۔ -'یہ لفظ اب قرارداد لاہور کا مترادف بن گیا ہے...... ہمارا یہ ماننا ہے کہ ہندو اور مسلمان ہر لحاظ سے دو بڑی قومیں ہیں'...... 'مسلمان..... اپنی ممیز ثقافت اور تمدن، زبان و ادب، فن تعمیر، نام اور عرفیت، اقدار، قانون اور ضابطۂ عمل، رسم و رواج، تقویم، تاریخ اور روایات کے لحاظ سے ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے وطن میں جداگانہ، مقتدر اعلا وجود کے مستحق ہیں۔'

'محض دعوا ہی ثبوت نہیں ہوتا' یہ گاندھی کا جواب تھا۔ اس کے بعد گاندھی نے جناح سے اس بات پر غور کرنے کی درخواست کی کہ وہ جن آزاد ریاستوں کی بات کر رہے ہیں، انہیں تقسیم سے کس طرح فائدہ ہوگا، اور کیا یہ آزاد ریاستیں خود

اپنے لیے بھی اور باقی پورے ہندوستان کے لیے مصیبت نہیں بن جائیں گی؟ جناح کا بے لوچ جواب تھا کہ ہندوستان کے مسئلے کا صرف یہی ایک حل ہے اور یہ کہ ہندوستان کو اپنی آزادی کی قیمت تو ادا کرنی ہی ہوگی۔'

تب تک پاکستان کا تصور کافی مبہم رہا تھا۔ اب پہلی بار اس کے خطوط سامنے آنے لگے تھے۔' بات چیت کے پہلے ہفتے کے خاتمے پر، 15 ستمبر کو گاندھی نے جناح کو لکھا' جب میں (لاہور) قرارداد کو عمل میں لائے جانے کے بارے میں غور کرتا ہوں تو مجھے پورے ہندوستان کی تباہی کے سوا کچھ اور نہیں دکھائی دیتا۔'

اس کے بعد تبادلۂ خیال، ٹکراؤ کے مرحلے میں داخل ہوگیا۔ جناح کو گاندھی کا یہ کہنا بُرا لگتا تھا کہ وہ اگرچہ کسی کی نمائندگی نہیں کرتے، 'لیکن وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کی نمائندگی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ کیوں کہ وہ ذاتی طور پر ان کے مصائب اور ان کی بدحالی کو محسوس کرتے ہیں جس سے طبقے، ذات اور مسلک کی تفریق کے بغیر سب ہی متاثر ہیں۔' یہ بات آئندہ کے قائد اعظم کی برداشت سے باہر تھی۔ اگرچہ انہوں نے یہ قبول کرلیا تھا کہ گاندھی ایک عظیم انسان ہیں اور ہندوؤں میں، خاص طور پر عوام میں زبردست اثر رکھتے ہیں، مگر وہ گاندھی کے اس بیان کو قبول نہیں کرسکے کہ وہ تمام باشندوں کی نمائندگی کرنے کے آرزومند ہیں۔ چنانچہ جناح نے کہا کہ-' یہ بخوبی واضح ہے کہ آپ ہندوؤں کے علاوہ کسی اور کی نمائندگی نہیں کرتے، اور جب تک آپ اپنی حقیقی پوزیشن کو محسوس نہیں کریں گے، آپ سے بحث کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔'

' گاندھی کا جواب تھا' آپ یہ بات کیوں تسلیم نہیں کرسکتے کہ میں ہندوستان کے لوگوں کے تمام حلقوں کی نمائندگی کرنے کا آرزومند ہوں، گاندھی نے جواب جاری رکھتے ہوئے کہا-' کیا آپ ایسی آرزو نہیں رکھتے، کیا ہر ہندوستانی کو ایسی آرزو نہیں کرنی چاہیے؟'- یہ الگ بات ہے کہ' یہ آرزو، ہوسکتا ہے کہ کبھی پوری نہ ہو۔

جناح نے اصرار کیا کہ گاندھی، لاہور قرارداد میں مذکور' بنیاد اور بنیادی اصولوں' کو تسلیم کریں۔ گاندھی نے ان سے کہا کہ یہ اتنا ضروری نہیں ہے کیوں کہ وہ ان ٹھوس عواقب کو پہلے ہی تسلیم کرچکے ہیں جو کہ تسلیم کرلینے کی صورت میں سامنے آئیں گے، خاص طور پر جہاں تک کہ اس کے معقول اور قابل عمل ہونے کی بات ہے!' گاندھی نے کہا کہ وہ لاہور قرارداد کو تسلیم نہیں کرسکتے جیسا کہ آپ چاہتے ہیں، خاص طور پر اس وقت جب کہ آپ اس کی تاویل میں وہ نظریے اور دعوے بھی شامل کرنا چاہتے ہیں جنھیں وہ تسلیم نہیں کرسکتے اور ہندوستان کو اسے تسلیم کرنے کے لیے رضامند نہیں کرسکتے۔'

آخر میں گاندھی نے کہا کہ کیا ہم اس بات پر راضی نہیں ہوسکتے کہ دو قوم ہونے کی بات کو نظر انداز کرکے مسئلے کو خود ارادیت کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کریں؟'

گاندھی کی اس پیشکش کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوستان کو دو یا زائد قوموں کا ملک سمجھنے کی بجائے ایک ایسا کنبہ سمجھا جائے، جس کے بہت سے لوگوں میں سے ایک، مسلمان، جنھیں مخصوص علاقوں میں مطلق اکثریت حاصل ہے، باقی

ہندوستان سے الگ رہنا چاہتا ہے۔' اُن کا کہنا تھا کہ اگر لاہور قرارداد کی رُو سے، مسلم اکثریت کے علاقوں کو الگ کیا جانا ہے تو علاحدگی کے اس سنگین قدم کو متعلقہ علاقوں کے لوگوں کے سامنے رکھنا اور ان کی منظوری حاصل کرنا چاہیے۔ مسلم لیگ کے مجوزہ دوقومی نظریے کی عمومی بنیاد سے اختلاف کرتے ہوئے گاندھی نے کہا تھا کہ اس کے باوجود بھی وہ ان علاقوں کی علاحدگی کے دعوے کو مان لینے کے لیے کانگریس اور پورے ملک سے سفارش کر سکتے تھے۔ اگر ان تمام حصوں کی آبادی کی بالغ اکثریت علاحدگی کے حق میں ووٹ دیتی ہے تو اس صورت میں ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی ایسے علاقوں پر مشتمل ایک علاحدہ ریاست کی تشکیل کی جائے گی۔

اسے انہوں نے 'دو بھائیوں کے درمیان بٹوارے' کا نام دیا۔ یہ دونوں بھائی اس کنبے کے بچے تھے جو مذہب کے فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے نا مطمئن تھے، اگر وہ چاہتے تو الگ ہو سکتے تھے، مگر یہ علاحدگی ان کے اندر ہوتی نہ کہ پوری دنیا کے سامنے۔..... 'جب دو بھائی الگ ہوتے ہیں تو دنیا کی نظر میں وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو جاتے۔...... علاحدگی اور بٹوارے کے بعد بھی دنیا انہیں بھائی ہی مانتی ہے۔'

اس بات پر کہ دونوں حصے الگ الگ رہنے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ گاندھی نے تجویز رکھی کہ علاحدگی کے معاہدے میں دفاع، امور خارجہ، داخلی مواصلات، کسٹم، تجارت اور دوسرے امور کی انجام دہی اور اطمینان بخش بندوبست اور دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے حقوق کا نظم کیا جانا چاہیے۔ کانگریس اور لیگ کے ذریعے اس سمجھوتے کے تسلیم کر لیے جانے کے فوراً بعد ہی دونوں فریق، آزادی کے حصول کے لیے کوئی مشترکہ لائحہ عمل طے کریں گے، بہر حال لیگ کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ کسی بھی ایسے راست اقدام سے باہر رہے، جو کانگریس کی طرف سے کیا جا سکتا ہو اور لیگ اس میں حصہ لینا نہ چاہے۔

مگر جناح ایسی رائے شماری کے ذریعے تقسیم کے حق میں نہیں تھے جس میں وہ تمام باشندے حصہ لیتے جو اس تقسیم سے متاثر ہو سکتے تھے، بلکہ وہ اس معاملے کو صرف مسلمانوں تک محدود خودارادیت کی بنیاد پر حل کرنا چاہتے تھے۔ 'ہم خودارادیت کا دعوا ایک قوم کی حیثیت سے کرتے ہیں...... آپ اس غلط خیال کے تحت کوشش کر رہے ہیں کہ 'خودارادیت' کا مطلب محض 'علاقائی اکائی' سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارا معاملہ تو تقسیم کا؛ اور دو بڑی قوموں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتے کے ذریعے دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کی تشکیل کا ہے، نہ کہ کسی موجودہ یونین سے علاحدگی کا، جس کا ہندوستان میں کوئی وجود نہیں ہے۔'

15 ستمبر کو گاندھی نے جناح کو لکھا۔ 'تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی کہ مذہب تبدیل کر لینے والوں اور ان کی اولاد کی ایک جماعت اپنے اصل اسلاف سے کٹ کر، ایک علاحدہ قوم ہونے کا دعوا کرنے لگے' اگر اسلام کی آمد سے پہلے ہندوستان ایک قوم تھا، جو اس کے بچوں کی ایک بڑی جماعت کی تبدیلی مذہب کے باوجود اسے اب بھی ایک قوم ہی رہنا چاہیے...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قومیت کے مفہوم میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کر دیا ہے۔ اگر میں اسے تسلیم کر لیتا

ہوں تو اس طرح مجھے بہت سارے دعووں کو قبول کرنا ہوگا اور اسی طرح ایک ناقابل حل مسئلے کا سامنا کرنا ہوگا۔' گاندھی کے اس سوال پر کہ، انہوں نے لاہور قرارداد کے تحت، دفاع اور اس جیسے دوسرے اہم معاملے کے سلسلے میں کس طرح کا بندوبست سوچا ہے، جناح کا جواب تھا: 'جب ایک بار یہ تسلیم کرلیا جائے گا کہ پاکستان اور ہندوستان دو الگ آزاد اور خودمختار ملک ہیں تو ایسی صورت میں دفاع یا کسی دوسرے مشترکہ سروکار کا کوئی سوال ہی نہیں رہے گا، ماسوا اس کے کہ دونوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہو جائے۔' جہاں گاندھی اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے دفاع اور دوسرے مشترکہ سروکار کے امور کے اطمینان بخش انتظام کے لیے دونوں حصوں کے لیے کوئی معاہدہ چاہتے ہیں تو وہ مسلم علاقوں کو الگ ہو جانے دیں گے، جب کہ جناح یہ چاہتے تھے کہ پہلے تقسیم عمل میں آئے اور مشترکہ مفاد کے تحفظ کا معاہدہ بعد میں ہو، ایسی شرطوں پر جن سے کہ دونوں اتفاق کریں گے بشرطیکہ وہ ایسا کرسکتے! یہ بات، جیسا کہ بعد میں کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا۔ شادی سے پہلے ہی طلاق دے دینے جیسی تھی! اگر ان میں سے کوئی ایک معاہدہ توڑ دے یا مشترکہ سروکار جیسی کوئی چیز باقی نہ رہے تو کیا ہوگا؟ جواب یہ تھا کہ 'نتیجہ وہی ہوگا جو اب تک ساری دنیا میں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ یعنی 'جنگ'! دوسرے الفاظ میں جناح چاہتے تھے کہ پاکستان کے لئے ہندوستان مخالف قوتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ بلکہ یہاں تک کہ ہندوستان کے خلاف جنگ چھیڑ دینے کی آزادی کو تسلیم کرلیا جائے۔ گاندھی کا کہنا تھا کہ اس طرح کی آزادی کسی بھی طرح معاہدے کے ذریعے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ وہ 'جھگڑے کی صورت میں کنبے کے افراد کی کنبہ سے الگ ہو جانے کی خواہش، کی بنیاد پر، علاحدگی کے لئے راضی ہو گئے تھے۔ بعد میں گاندھی نے جناح کے ساتھ ان مذاکرات کی وضاحت کرتے ہوئے تیج بہادر سپرو کو لکھا تھا کہ 'یہ رضامندی سارے معاملات کے بارے میں نہیں تھی جیسے کہ سب دوسرے کے دشمن ہوں؛ گویا کہ ان دونوں کے درمیان دشمنی کے سوا کچھ اور مشترک بنیاد ہو ہی نہیں۔

انہوں نے 22 ستمبر کو جناح کو لکھا تھا 'ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک دائرے میں چل رہے ہیں، اور اگلے دن۔ یعنی 23 ستمبر کو بات چیت میں ایک موڑ آگیا۔'

اس دن جناح کے لیے ایک نوٹ میں گاندھی نے لکھا تھا: 'گزشتہ شام کی بات چیت نے منھ کا ذائقہ خراب کر دیا ہے۔' پھر 28 ستمبر کو: انہوں نے لکھا: 'آپ برابر یہ کہتے رہتے ہیں کہ میں ان چند مخصوص باتوں کو تسلیم کرلوں جنہیں آپ لاہور قرارداد کی بنیاد اور بنیادی اصول کا نام دیتے ہیں، جب کہ میں یہ کہتا آیا ہوں کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے، جو ایک دوسرے سے مختلف سوچ رکھتے ہیں، بہترین راستہ یہ ہے کہ مطالبے کو ٹھوس شکل دی جائے، کیوں کہ وہ حل کی راہ میں رکاوٹ ہے، اور پھر باہمی اطمینان کے لیے اس پر کام کیا جائے۔

جناح نے گاندھی کی اس تجویز پر تبادلہ خیال کرنے سے انکار کردیا۔ 'آپ یہ بات دوہراتے رہتے ہیں کہ اگر میں اور آپ کسی مشترکہ لائحہ عمل پر راضی ہوسکیں تو آپ اسے کانگریس سے اور پورے ملک سے تسلیم کرانے کے لیے اپنے

تمام ممکنہ اثرات کو بروئے کار لائیں گے، میں شروع سے ہی یہ کہتا آیا ہوں کہ اتنا ہی کافی نہیں ہے۔'

وہ مہاتما کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس لیے راضی ہو گئے تھے کہ مہاتما یہ کہہ چکے تھے کہ' وہ روشنی اور علم کی تلاش میں آئے ہیں۔' جناح نے ان سے کہا تھا کہ' ہندو ہندوستان پر آپ کے زبردست اثرات کے پیش نظر اگر میں آپ کو تبدیل کر سکا تو یہ میرے لئے کوئی معمولی بات نہیں ہوگی۔' مگر وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ، جو مکمل اختیارات سے لیس اور تسلیم شدہ نمائندہ نہ ہو، سمجھوتے کے لیے کسی تجویز پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں تھے'...... جہاں تک ہم نے خود کو لاہور قرارداد تک محدود رکھا..... آپ کی نمائندہ حیثیت کے بارے میں کوئی سوال کھڑا نہیں ہوا، مگر اب آپ نے...... اپنے طور پر ہی، اور اپنی ہی بنیاد پر ایک نئی تجویز پیش کی ہے۔ مگر جب تک یہ تجویز آپ کی طرف سے آپ کی نمائندہ حیثیت میں پیش نہ کی جائے اس کے بارے میں مزید کچھ کرنا مشکل ہوگا۔' اس پر گاندھی کا جواب' میری نمائندہ حیثیت نہ ہونے کے بارے میں آپ کا بار بار ذکر کرنا واقعی بے معنی ہے۔' 'اگر آپ الگ ہوتے ہیں، تو ایسا اس لئے نہیں ہوگا، کہ میری کوئی نمائندہ حیثیت نہیں، بلکہ اس لیے کہ لاہور قرارداد میں شامل دعوے کے سلسلے میں آپ کو مطمئن کرنا نہیں چاہتا!'

جب بات چیت ٹوٹنے کی حد تک پہنچ گئی تھی تو آخری بار گاندھی نے یہ مشورہ دیا کہ انہیں اپنی تجاویز کی معقولیت دکھانے کے لیے مسلم لیگ کونسل سے ملنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔' میری التجا ہے کہ پیشکش کو مسترد کر دیے جانے کی ذمے داری آپ نہ لیں۔ تجاویز کو کونسل کے حوالے کر دیجیے۔ مجھے انہیں مخاطب کرنے کا موقع دیا جائے۔ اگر وہ اسے مسترد کر دینے کے قابل محسوس کریں تو میں آپ سے یہ چاہوں گا کہ آپ کونسل کو یہ مشورہ دیں کہ اسے لیگ کے کھلے اجلاس کے سامنے رکھا جائے۔ اگر آپ میرے مشورے کو مان لیں گے اور مجھے اجازت دے دیں گے تو میں کھلے اجلاس میں شرکت کروں گا اور اسے خطاب بھی کروں گا۔'

انہوں نے ایک متبادل کے طور پر یہ مشورہ بھی دیا کہ یہ معاملہ کسی ثالث کے سامنے بھی رکھا جا سکتا ہے۔' کیا باہر کی مدد، رہنمائی، صلاح، بلکہ ثالثی سے ایک دوسرے کو ہم خیال بنانے کی کوشش کو تقویت پہنچانا بے معنی اور نا قابل عمل ہے؟' یہ گاندھی کا سوال تھا۔ اگر یہ دونوں واقعی کسی سمجھوتے پر پہنچنا ہی چاہتے تھے تو اس طرح کے بہت سے متبادل موجود تھے جنہیں بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔

بہر حال ان میں سے کوئی بھی تجویز جناح کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔' ویسے تو یہ ایک انتہائی اہم اور بے مثال قسم کی تجویز ہے، (لیکن) کوئی مندوب یا ممبر ہی کونسل کی میٹنگ کی کارروائی میں یا کھلے اجلاس میں حصہ لینے کا مجاز ہے۔' پیارے لال کی ڈائری کے 24 ستمبر 1944 کے درج ذیل اقتباس میں بات چیت حتمی طور پر ٹوٹ جانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

'شام 10-7 بجے واپسی پر باپو نے راجاجی سے بات کی؛ اور پھر پراتھنا کے بعد بھی کی، جناح نے باپو کی تجویز پر

تبادلہ خیال کرنے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ انہیں نہ کوئی اختیار تھا اور نہ وہ کسی کے نمائندے تھے۔ ’اگر آپ دفاع کو اور اس طرح کی دوسری باتوں کو مشترک بنانا چاہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں ’مرکز‘ کا تصور ہے۔‘‘ ’’نہیں ایسا نہیں ہے، لیکن میں یہ ہر حال میں کہوں گا کہ عملی طور پر ایک ایسا ادارہ ہوگا جو اس طرح کی چیزوں کی نگرانی کرنے کے لیے ان دونوں کے ذریعے منتخب کیا جائے گا۔‘‘

’اس کے بعد وہ اگست (1942) کی قرارداد پر آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے خلاف جاتی ہے۔ ’مگر کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ مطلق طور پر ایک بے بنیاد الزام ہے، اس تمام قانونی بصیرت کے ساتھ جو کہ آپ سے منسوب کی جاتی ہے، آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ اس کا تمام تر تعلق ہندوستان اور برطانیہ کی حکومت سے ہے۔ اس کا مسلمانوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ آپ اس معاملے پر کسی سرکردہ وکیل کی رائے حاصل کر سکتے ہیں کہ اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو مسلم لیگ یا مسلمانوں کے خلاف سمجھی جا سکے۔

’انہوں نے کہا کہ انہیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ جب میں خود ہی اسے بخوبی سمجھتا ہوں تو پھر کسی دوسرے کی رائے کیوں لوں؟‘‘۔ ’میں نے وہ موضوع چھیڑا جو میں نے 12 اکتوبر کو سیوا گرام کے لیے طے کر رکھا تھا۔‘ انہوں نے کہا۔ ’میں 30 کو روانہ ہونا چاہوں گا اور چار پانچ دن میں لوٹ آؤں گا۔‘ انہوں نے کہا۔ ’اتنی طویل مدت کیوں؟ اب ہم زیادہ قریب آ چکے تھے۔ میں ہر چیز منگل کو تیار رکھوں گا (ان کا اشارہ ان کی مراسلت کی طرف تھا)۔ آپ نقول کی جانچ کریں گے، اور میں بھی ایسا ہی کروں گا۔‘ انہوں نے تعارفی نوٹ بھی تیار کر لیا تھا۔ اور اسے بہ آواز پڑھا بھی تھا۔ ’میں نے کہا کہ مجھے اس کے خلاف کچھ نہیں کہنا ہے۔ لیکن اگر میرے پاس اس کی نقل ہوتی تو میں اس کی جانچ کر لیتا۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا منگل کو کر سکتا ہوں، میں نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ نہ تو تیسرے فریق کو ملوث کریں گے اور نہ اپنی اسکیم ہی سامنے لائیں گے۔ انہوں نے اگست قرارداد کی مذمت کی۔ انہوں نے کافی تفصیل سے یہ مشورہ دیا کہ اس میں رد و بدل ہونا چاہیے۔ یعنی اسے از سر نو تیار کیا جائے۔‘

27 ستمبر کو شام کی پرارتھنا میں بھاری تعداد میں موجود لوگوں کو بات چیت کی ناکامی کی اطلاع دیتے ہوئے، گاندھی نے کہا کہ اگرچہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جس کی وہ امید کر رہے تھے مگر مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ اس ناکامی کا بھی کوئی اچھا نتیجہ ہی سامنے آئے گا۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ سب کی بھلائی اور جناح کے زاویہ نگاہ کو سمجھنے کے لیے انہوں نے وہاں تک جانے کی بھرپور کوشش کی جہاں تک کہ وہ جا سکتے تھے۔ انہوں نے تو قائد اعظم کے دروازے پر دستک دی تھی مگر وہ ناکام رہے۔

نیوز کرانیکل کے مسٹر جیلڈر کو انٹرویو دیتے ہوئے گاندھی نے کہا: ’مجھے یقین ہے کہ جناح سنجیدہ ہیں، لیکن میرے خیال میں وہ واہموں کا شکار ہو جاتے ہیں، جب وہ یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ ہندوستان کے غیر فطری بٹوارے سے

متعلقہ لوگوں میں خوش حالی یا خوشی ملے گی۔'

کچھ اور اخبار والوں سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بات چیت غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہوئی ہے۔' انہوں نے کہا۔ 'میں اس بات سے متفق ہوں کہ مسٹر جناح ایک اچھے انسان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم پھر جلد ہی ملیں گے......اس اثنا میں لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ صورت حال کو انگیز کریں اور ہم پر اپنی رائے کا دباؤ ڈالیں۔'

گاندھی نے مصالحت کی اور تقسیم کی تباہی راکھ سے کچھ دانے چننے کی ایک آخری کوشش کی تھی۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کے علاوہ بد اعتمادی کا جو کھم بھی اٹھانا پڑا تھا؛ اسے مکمل آزاد وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خوف کی بنیاد پر آزادی کی کوئی شاندار عمارت کسی بھی حال میں کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی۔

گاندھی کا کہنا تھا کہ راجا جی فارمولے میں لیگ کے مطالبے کی بنیادی باتوں کو، ان کے معقول ہونے کی حد تک مان لیا گیا تھا۔ انہیں اسے 'پاکستان' کا نام دیے جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن چوں کہ جناح اسے مارچ 1940 کی لیگ کی لاہور قرارداد 'پیروڈی' یا 'تردید' یا تارپیڈو کر دینے کی کوشش قرار دے چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے جناح کے اعتراض کی بنیاد کو سمجھنا ضروری محسوس کیا۔ اگر لیگ کا مطالبہ، جسے وہ پاکستان کا نام دے رہی تھی، جنگ چھیڑنے کے معاہدے یا ایک کُل سمجھے جانے والے دونوں حصوں کے لیے ضرر رساں اقدامات سے احتراز کو چھوڑ کر صرف مکمل اقتدار اعلا کے لیے نہیں تھا، تو پھر آخر پاکستان تھا کیا؟ اگر مقصد ایک ایسی اکائی کی تشکیل کا تھا جس میں مسلم مذہب وثقافت کے پھلنے پھولنے کی، اور مسلم فرقے کے لیڈروں کی شخصیت اور ذہانت کے اظہار کی مکمل گنجائش ہو، ......کسی اور زیادہ غیر معمولی ذہانت سے مغلوب ہوئے بغیر جس کا خطرہ انہیں غیر منقسم ہندوستان میں ہو سکتا تھا، تو ایسی صورت میں گاندھی کے خیال میں یہ فارمولا پوری طرح مطمئن کر سکتا تھا اور اگر اس کے برخلاف 'پاکستان' کا مقصد ہندوستان کے خلاف کے حربوں کو استعمال کرنا تھا تو وہ ایسا کبھی نہ ہونے دیتا۔'

گاندھی نے جناح کی ذہنی یکسوی اور ان کی اس زبردست اہلیت اور یگانگت کا احترام کرنا جاری رکھا جسے کسی بھی قیمت پر نہیں خریدا جا سکتا تھا۔

محب وطن جناح برادر کش جنگ چھیڑنے کی آزادی یا ایسا کچھ بھی کرنے کے لیے جس سے کہ معاشی طور پر ایک ہی سمجھے جانے والے یہ دونوں حصے کمزور ہوتے یا دفاع کے سلسلے میں، آزادی کے لیے ہرگز اصرار نہ کرتے۔' یہی وجہ ہے کہ گاندھی نے ان کے دروازے پر دستک دی تھی، چھان بین کے لیے اپنے پتے ان کے سامنے ڈال دیے تھے اور ان سے اپنے پتے کسی طرح کے تحفظات کے بغیر پیش کر دینے کی درخواست کی تھی۔

بہر حال پانسا ان کے خلاف پڑ چکا تھا۔ مہاراشٹر کے ایک سرکردہ ماہر قانون اور لبرل لیڈر ڈاکٹر ایم۔ آر۔ جیکر نے گاندھی کو لکھا کہ 'خط کتابت سے واضح ہو جاتا ہے کہ کسی دن مسٹر جناح اپنے اہل وطن کی بجائے انگریزوں سے ہی سمجھوتا

کرلیں گے۔' وہ اس فارمولے کو انگریزوں کے ساتھ سودے بازی کے لیے استعمال کریں گے اور ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ آئندہ کی بات چیت کے لیے اسے بنیاد بنائیں گے۔'

درحقیقت یہ وہ آخری مسلسل کوشش تھی جو گاندھی نے تقسیم سے بچنے کے لیے کی تھی، جسے وہ چیر پھاڑ کا نام دیتے تھے۔') ہندوستان کی سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ اور جناح، دونوں ہی جوانی کے مرحلے سے گزر چکے تھے، اور تمام اہم کرداروں کے لیے وقت بڑی تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ صورت حال بہت ہی سنگین نوعیت کی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کوشش کرنی تھی کہ وہ بے سود ثابت ہوسکتی ہے یا معاملات اور بگڑ سکتے ہیں۔ گاندھی نے متحدہ ہندوستان کے لیے کوشش کی جس میں انہیں کامیابی نہیں ملی۔ عوام کی امیدیں بہت ہی بڑھی ہوئی تھیں جو تار تار ہو کر رہ گئیں۔ گاندھی کی اس آخری کوشش پر نکتہ چینی کی گئی مگر ان کے نزدیک جدوجہد کرنا ان کا 'دھرم' تھا۔

ڈیسائی-لیاقت معاہدہ: اسقاط

اس مرحلے پر، جب کہ صورت حال کافی مایوس کن اور تاریک محسوس ہورہی تھی کانگریس کے ایک اہم ممبر اسمبلی بھولا بھائی ڈیسائی نے سیاسی تعطل کو دور کرنے کے لیے اپنی طرف سے کوشش کی۔

جنگ کی وسیع پیمانے پر تبدیل شدہ صورت حال اور خود ہندوستانی سیاست میں تبدیلی کے مدنظر کانگریس اور بھولا بھائی ڈیسائی نے مرکزی قانون سازیہ کا بائیکاٹ ختم کرکے اپنی نشستیں سنبھال لی تھیں۔ بھولا بھائی نے اسمبلی میں مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر لیاقت علی خان سے مفاہمت کی اور دونوں نے کئی بار فروری، مارچ 1945 کے دوران حکومت کو شکست دی۔ یہ سمجھا جارہا تھا کہ بھولا بھائی اور لیاقت علی خان کسی ایسے سمجھوتے یا منصوبے پر متفق ہوگئے ہیں جس کی بنیاد یہ تھی کہ اسمبلی میں دونوں اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈر جناح اور ڈیسائی کو موجودہ آئینی ڈھانچے کے اندر مرکز میں عبوری حکومت تشکیل کرنی چاہیے اور ایگزیکیٹو کونسل کے تمام ممبروں کا تقرر کرنا چاہیے جو کہ گورنر جنرل اور کمانڈر ان چیف کے علاوہ سارے کے سارے ہندوستانی ہوں! اور یہ کہ ایگزیکیٹو کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین برابری ہوگی! موتی لال سیتل وار کے مطابق جو کہ بھولا بھائی کو اچھی طرح جانتے تھے:46

'اگرچہ گاندھی کو رہا کردیا گیا تھا مگر کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبران اور دوسرے لیڈر جیل میں ہی تھے۔ بھولا بھائی نے 1944 کے اواخر اور 1945 کے اوائل کے درمیان وائسرائے کے ساتھ، ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے اتفاق رائے سے ایک عبوری حکومت کی تشکیل کے امکان کے بارے میں بات چیت کی تھی۔ ظاہری طور پر لیاقت علی خان سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے جو کہ اسمبلی میں مسلم لیگ گروپ کے ممبر اور جناح کا داہنا ہاتھ تھے۔ کچھ بات چیت جنوری 1945 میں بھی ہوئی تھی جب عبوری حکومت کی تشکیل کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا تھا۔ عبوری حکومت کا پہلا کام یہ ہوتا کہ قید سیاست دانوں کو رہا کردیا جائے۔ بھولا بھائی نے، جن پر گاندھی کو پورا اعتماد تھا، ان سے ان تجاویز کے

بارے میں کئی بار تبادلہ خیال کیا اور اس کے لیے واردھا گئے جہاں گاندھی اس وقت رہائش پذیر تھے۔ بھولا بھائی کی تحریر میں تجاویز کا مسودہ گاندھی کو دکھایا گیا جسے انہوں نے منظوری دے دی تھی، جس میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے تھوڑا بہت ردوبدل بھی کیا تھا۔

ان تجاویز کی دو نقول بھولا بھائی اور لیاقت علی نے تیار کر کے ان پر دستخط کر دیے تھے۔ دستخط شدہ دستاویزات کے مشمولات سے، جنہیں بعد میں ڈیسائی۔ لیاقت علی معاہدے کا نام دیا گیا، صاف واضح ہے کہ لیاقت علی نے اس پر دستخط کرنے کی آمادگی کے پہلے یقیناً اسے جناح کو دکھایا ہوگا یا ان سے صلاح مشورہ کیا گیا۔ ہر طرح کی افواہیں اور ان تجاویز سے متعلق تبصرے وقتاً فوقتاً ہندوستانی اخبارات میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ تب تک ہندوستانی عوام کو بااختیار طور پر کوئی بات نہیں بتائی گئی تھی۔

جون 1945 میں بالآخر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد اس معاہدے پر کانگریس کے اندر طوفان برپا ہوگیا۔ بھولا بھائی پر گاندھی کی پس پشت کام کرنے اور کانگریس کے ساتھ غداری کا الزام لگایا گیا۔ یہ الزامات اخبارات میں اہم ممبروں کے ذریعے لگائے گئے تھے۔ اس پر گاندھی سامنے آگئے اور ایک بیان جاری کر کے یہ کہا کہ بھولا بھائی نے ان کے ساتھ صلاح مشورے سے یہ کام کیا ہے، انہیں میری طرف سے اس کا اختیار حاصل تھا۔ گاندھی اور بھولا بھائی کی تائید کرنے والے دوسرے کانگریسی لیڈروں کے بیانات کے باوجود، کچھ دوسرے لیڈروں نے بہت ہی جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ گاندھی نیز مولانا ابوالکلام آزاد کے ظاہر کردہ خیالات کے باوجود، ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں نے طے کیا کہ اس معاہدے کو کالعدم کر دیا جائے اور واجب اختیار کے بغیر کام کرنے کے جرم میں بھولا بھائی سے کنارہ کشی کر لی جائے۔ الزام لگایا گیا کہ بھولا بھائی نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا اور ایک ایسی مفاہمت (بلکہ سودے بازی) کی کوشش کی جو قطعی کانگریس کے مفاد میں نہیں تھی۔ اس سلسلے میں سیتلواد نے لکھا ہے: 'مجھے یقین ہے کہ بھولا بھائی نے ایمانداری سے گاندھی کے مکمل اعتماد اور اختیار سے کام کیا تھا۔ واضح طور پر کچھ ذاتی یا دیگر وجوہ سے بھولا بھائی ورکنگ کمیٹی کے کچھ ممبروں کے لیے قابل قبول نہیں تھے، جنہوں نے ان کی ساکھ خراب کرنے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔'

سیتلواد نے سلسلہ تحریر جاری رکھتے ہوئے لکھا: 'اگرچہ کانگریس، اسمبلی کے لیے الیکشن لڑنے کا ارادہ کر رہی تھی، جو کہ جلد ہی ہونے والے تھے، کانگریس میں جو لوگ اقتدار میں تھے انہوں نے شرارت کے طور پر بھولا بھائی کو مرکزی اسمبلی کے لیے کانگریس کا امیدوار نہ بنانے کا فیصلہ کیا۔' سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شرارت کہاں سے ہو رہی تھی؟ اور گاندھی نے اس کی ذمہ داری کیوں نہیں لی یا اس ذمہ داری میں خود کو حصہ دار کیوں نہیں بنایا؟ سیتلواد نے ڈیسائی کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ اصل نوٹ محفوظ کر لیا تھا جسے ڈیسائی نے 3 اور 5 جنوری 1945 کے درمیان گاندھی کو دکھایا تھا۔ اس نوٹ میں وہ اضافے اور ترمیمات

شامل ہیں جو گاندھی نے اپنے ہاتھ سے کی تھیں۔ سیتلواد نے بھی اس نوٹ کی تصدیق کی تھی۔

لیاقت علی خاں اس بحران سے نکلنے میں کامیاب رہے مگر نیشنل ڈیفنس کونسل میں شامل ہونے کی پاداش میں سر سلطان احمد، فضل الحق اور بیگم شاہ نواز کو مسلم لیگ سے نکال دیے گئے تھے۔ لیاقت علی کا معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین تھا، جو کہ عبوری حکومت کی تشکیل سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر جناح سے صلاح مشورہ نہ کیا گیا ہوتا تو انہوں نے بھی ایسی ہی سختی سے اپنا ردعمل ظاہر کیا ہوتا۔ یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خاں کچھ عرصہ سے ایک دوسرے کے ذاتی دوست تھے۔ ڈیسائی کا فارسی زبان کا علم اور اردو شاعری سے ان کی دل چسپی ان دیگر عوامل میں شامل تھی جو ان دونوں کی قربت کا باعث ہوئے تھے۔ اس طرح یہ دونوں لیڈر ان تجاویز کی وجہ سے ہی پہلی بار ایک دوسرے کے قریب نہیں آئے تھے۔ لیاقت علی اپنے جنوبی ہندوستان کے دورے پر اسی دن چلے گئے تھے جس دن انہوں نے مسودے پر دستخط کیے تھے اور اس سے پہلے کہ لیاقت علی اس سے جناح کو ذاتی طور پر آگاہ کرتے، ڈیسائی نے اسے عام کر دیا۔ جناح کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اس میں کچھ اور باتیں ہیں جو شکایت کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ مگر انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس میں مواخذے کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ 'شاید وہ (جناح) بھی کانگریس سے بالکل مختلف طریقہ پر کارروائی چاہتے تھے۔'

'ڈیسائی تجاویز' کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انہیں کانگریس کی بھرپور تائید حاصل نہیں تھی، اور شاید اس سارے واقعہ پر فاتحہ جمنا داس مہتا نے اس طرح پڑھی تھی جب بعد میں انہوں نے اپنے ایک بیان میں یہ کہا تھا کہ- 'شملہ کانفرنس اس لیے ناکام ہوئی تھی کہ کانگریس نے لیاقت- ڈیسائی فارمولے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔'

مہتا کے بقول جناح نے جو راستہ اختیار کیا، قرارداد پاکستان کے بعد ان کے لیے صرف وہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ لیکن اگر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مساوات ہوتی، تو جناح اس کوشش کی تائید کرتے۔ اس موقع پر اس طرح مساوات ایک ایسی ہاتھ نہ آنے والی چیز تھی جس نے ڈیسائی کی تجویز کردہ عبوری حکومت، اور بعد میں تشکیل کی گئی عبوری حکومت کے درمیان فرق پیدا کر دیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ متبادل حل کا دائرہ سکڑتا جا رہا تھا، کھیل کا آخری مرحلہ اور زیادہ کشیدہ، اور زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا، انگریزوں کی تھکان ظاہر ہو رہی تھی، فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی، بحث ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی، اختلاف رائے کے نکات پہلے ہی جیسے رہے، جستجو میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی، سوال یہ تھا: اکثریتی جبر کے خلاف کس طرح تحفظ فراہم کیا جائے؛ اس طرح کی سیاسی وسعت کس طرح پیدا کی جائے جس میں ہندوستان کے مسلمان اپنی سماجی، مذہبی اور سیاسی تقدیر کا فیصلہ کسی روک ٹوک کے بغیر خود ہی کر سکیں؛ انہوں (مسلمانوں) نے جو چاہا تھا وہ یہی سیاسی وسعت، اور اعتماد بحال کرنے والا، نظام تھا (ہندوستان میں ہی اور ناگزیر حالت میں ہندوستان سے باہر بھی)۔ کیا ان سوالوں کا جواب تمام لوگوں کے سمجھوتے کے ذریعے اس طرح کا نظام وضع کیے جانے میں مضمر ہے جو کہ درکار اعتماد کو بحال کر سکے یا مسئلہ صرف

رویوں کا ہے؟ یہ آخری بات، یعنی کہ 'رویہ' جو کہ صدیوں کے تاریخی تجربات کا نتیجہ تھا، اب مختلف فرقوں کی سماجیاتی خصوصیات کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ کسی بھی حکومت کا کوئی بھی حکم رویوں کو تبدیل نہیں کر سکتا؛ یہ تو، تبدیل شدہ حالات کے پیدا کردہ معاشروں کا ایقان ہے، جو ضروری باہمی اعتماد اور یقین دہانی کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ یہ کام ہندوستان کو اپنے طور پر انجام دینا تھا۔ ہندوستانی معاشرے کے داخلی ٹھہراؤ کا طریق کار یہ کام انجام دے سکتا تھا: پھر یہ کہ احساسات کا ارتفاع ہی یہ کام کرتا (یا کر سکتا تھا)۔ صرف یہی بات ہندوستان کو نا قابل شکست طور پر متحد رکھ سکتی تھی۔ وائسرائے، ویول یا کوئی دوسرا شخص صرف یہ کر سکتا تھا کہ یا تو باہمی تعاون کے نظام کو خارجی طور پر لاگو کرتا، یا اس کے پیدا ہونے میں مدد دیتا اور/ یا اسے وضع کرتا، صرف حکمرانی کے لیے نہ کہ رویوں جیسے دوسرے سماجی عناصر کے لیے۔ فرقہ وارانہ بھائی چارہ اور اتفاق رائے اور احترام باہم ہندوستان کی ذمہ داری تھی، صرف غیر منقسم ہندوستانیوں کی۔ یہ ذمہ داری غیر اور سامراجی اقتدار کی تو ہرگز نہیں تھی! آخر کار ہم نے ان سے اس کے لیے کہا ہی کیوں؟ یہ خیال اور یہ سوال ہمارے ذہنوں میں ہلچل مچاتا رہتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب ہم اس ہیبت ناک انسانی المیہ کی طرف، بٹوارے کی طرف، ہندوستان کی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ہتھیار گرا دو، ڈھول تاشے کی آواز ڈوب جانے دو، دور، بہت دور، سست رفتار جلوس میں آگے بڑھو

(دی سولجرز ڈیتھ، این فنچ)

کیوں کہ ایک متحدہ ہندوستان کی دلدوز تقسیم میں کیا ہے، جس کا جشن منایا جا سکے؟

7

جانشینی کی جنگ - الگ ہوتی راہیں

ویول-فوجی وائسرائے-اکتوبر 1943-تا-مارچ 1947

لن لتھگو کے جانشین کے طور پر فیلڈ مارشل ویول کا ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے تقرر اور آخری سے والے وائسرائے کے طور پر ان کا عرصہ تقرر، دونوں ہی، ویول تقرر سے لے کر رخصتی تک ہنگامہ خیز رہے۔ اول تو یہ کہ وزیر اعظم چرچل کے ساتھ ان کے تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے رہے/ جن سے انہیں بت کہ حقیقی قسم کا تعاون ملا اور تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ ویول کو اس طرح کا تعاون چرچل کے جانشین وزیر اعظم ایٹلی سے بھی حاصل نہیں ہوا: جس ویول کو ہندوستان کا وائسرائے بنایا گیا تھا، برطانیہ کو دوسری عالمی جنگ کے چیلنجوں کا سامنا تھا، اس لیے ہندوستان کو مشکل سے ہی جانشین لیبر حکومت کی بھی ضروری توجہ حاصل نہیں ہو سکی۔ ویول تو یہی چاہتے تھے کہ وہ فوجی ہی رہیں، اگر انہیں در کنار کر دیا جاتا تو بھی انہیں کوئی شکایت نہ ہوتی۔ ان کی 24 جون 1943 کی ڈائری میں ان کی اس مشکل کا اور دیگر معاملات کا ذکر ملتا ہے جن کا انہیں سامنا کرنا پڑ رہا تھا: 'میں نے وائسرائے کے عہدے کو فوجی تقرر کے جذبے سے قبول کیا جس میں دوران جنگ شرائط اور سوالات کے بغیر اس جگہ جانا ہوتا ہے جہاں جانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس تقرر کو سیاسی جذبے سے لینا چاہیے تھا اور پتہ لگانا چاہیے تھا کہ ہندوستان کے بارے میں پالیسی کا رُخ اختیار کرنے جا رہی ہے، میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی شرطیں رکھنی چاہیے تھیں، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح کے کسی شخص کی تلاش میں ونسٹن کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہر حال اب میں اس عہدے پر ہوں، اور مجھے سخت کوشش کرنی ہوگی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جسمانی راحت اور ذہنی مشقت والے ان پانچ برسوں کے تصور نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔

'مجھے یقیناً 1944 اور اس کے مسائل کا کوئی انتظار نہیں ہے۔ غذا، کوئلے، اور افراط زر کے مسائل میں کوئی کمی

دکھائی نہیں دیتی۔ برما کے محاذ پر جنگ میں کسی قدر پیش رفت کا امکان ہے؛ مگر مجھے سیاسی میدان میں کسی طرح کی پیش قدمی کا امکان دکھائی نہیں دے رہا ہے۔'1

اس تقرر کے لیے' ویول کی اہلیتوں کا مصنفانہ طریقہ پر ذکر پینڈرل مون نے اپنی تالیف-ویول - وی وائسرائز جرنل میں کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے: ویول، 1858 میں تاج برطانیہ کے ذریعے ہندوستان کا کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لیے جانے کے بعد، وہ پہلا مغربی تھا، جسے ہندوستان کا وائسرائے بنایا گیا تھا۔ اور وہ بھی اشرافیہ طبقے سے نہیں بلکہ اعلا متوسط طبقے سے...... جس پر برٹش راج کا سارا تکیہ تھا- اس میں اس طبقے کی تمام چیزیں صفات موجود تھیں....... اولین اور سب سے اہم، عوامی فریضہ اور عوامی خدمت کا احساس تھا، وہ اپنے خیالات میں راسخ، اور مکمل دیانت داری کا حامل تھا؛ اس میں مشکل اور سخت کام کرنے کی بھرپور توانائی اور سکت تھی۔ اس کے اندر کچھ نادر قسم کی صفات بھی موجود تھیں، جس کی طرف جواہر لال نہرو کی چھوٹی بہن کرشنا نہرو ہتھی سنگھ نے توجہ دلائی ہے۔ کرشنا نہرو نے لکھا ہے-'' ایک اچھا وائسرائے تھا، اور باضمیر ہونے کے ساتھ ساتھ سمجھ دار بھی تھا اور انسان دوست بھی!''........ لارڈ ویول ہندوستان میں برطانوی ایڈمنسٹریٹروں- وارن ہیسٹنگس، منرو، مالکم، سکیمین، اور ہنری لارنس اہم ترین صف میں شامل تھا- یہ سب کے سب عوام کا احترام کرتے تھے، ان کے احساسات کے تئیں ہمدردی رکھتے تھے، اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے تھے بعد میں چرچل کا کہنا تھا-' درحقیقت یہ زمانہ جنگ کا ایک عارضی تقرر تھا اور یہ کہ حالانکہ اس مرحلے پر اینتھونی ایڈن جیسے دوسرے ناموں پر بھی غور کیا گیا تھا' جیسا کہ بعد میں پتہ چلا، فیلڈ مارشل لارڈ ویول کی وائسرائی نہ تو عارضی نوعیت کی ثابت ہوئی اور نہ ہی ربڑ کی مُہر!

ویول نے اپنے اوپر کچھ اضافی ذمہ داریاں بھی ڈال لیں! اُن میں نفرت کا وہ احساس تھا شامل جو چرچل بالعموم ہندوستان کے بارے میں، ہندوستانی آرمی کے بارے میں اور ہندوستانوں کے بارے میں رکھتا تھا۔ ہندوستانیمعاملات کے سلسلے میں چرچل کے کٹر اور جھگڑالو رویے کے بارے میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ بہرحال اس سے پہلے کہ ہم ہندوستان کی وائسرائی کے سفیر پر ویول کے ساتھ چلنا شروع کریں، چند مثالیں دینا کافی ہوگا۔ ان مثالوں کا ذکر خود ویول نے اپنے الفاظ میں بہت ہی اچھے ڈھنگ سے کہا ہے 2 چرچل واقعی-' ہندوستان سے اور اس کے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے 3 نفرت کرتا تھا۔' اور جیسا کہ اس وقت ایمری کا مشاہدہ تھا کہ' وہ (چرچل) ہندوستانی مسئلے کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا جتنا کے جارج سوم امریکی نوآبادیوں کے بارے میں۔ ایک دوسرے موقع پر ویول نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ ہندوستان کے بارے میں چرچل کے خیالات توپ خانے کے ایک نچلے درجے کے اہل کار جیسے ہیں جس کی فوجی سوچ جنگ بوئیر تک محدود ہوئی ہے۔ لیکن کابینہ جس طرح ہندوستان کے سلسلے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی تھی، اس کے لئے ویول تیار نہیں تھے۔' میں نے پتہ لگایا ہے کہ کابینہ ہندوستان میں پیش رفت کرنے کی اعلان شدہ خواہش کے بارے میں ایماندار نہیں ہے، اور یہ دور اندیشی یا سیاسی حوصلہ کابینہ کے بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔'6

ویول کی یہ رائے بالکل صحیح تھی کہ چرچل کو ہندوستان کے سوال پر کنزرویٹو ممبروں میں پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا، اور یہ کہ اس طرح کی پھوٹ جنگ کے زمانے کی مخلوط حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گی اور اس طرح اس کی حکومت کو تباہ کردے گی۔ تب یہ بات چرچل کے ایجنڈے کا یقیناً کوئی حصہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی پالیسی کے سلسلے میں چرچل کے مخالفین صرف جنگ کے زمانے تک چرچل کے تعصبات کو نظر انداز کردینے کی معقول وجہ رکھتے تھے۔ کیوں کہ بلا انتشاہ طور پر اس وقت جنگ میں فتحیاب ہونا ہی سب سے بڑا مقصد تھا۔ اسی وجہ سے کہ ہندوستان کی آزادی کے متعلق اقدامات پر برطانیہ میں زمانۂ جنگ کے اتحاد کو ہمیشہ ترجیح حاصل رہی تھی۔ اس لحاظ سے ویول نے اپنی نئی ذمہ داریاں ایسے وقت میں سنبھالیں جب کہ ہندستان کے مسئلے کے حل کی شروعات کو سب سے کم ترجیح حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عہدہ سنبھالنے کے پورے ایک سال بعد ہی، انہوں نے ہندوستان کے آئینی مسائل پر توجہ دینا شروع کی۔ بہرحال جب انہوں نے کوشش کی ابتدا کی تو کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ گفت وشنید ناگزیر ہونے پر زور دیا۔ چرچل یا اس کی کابینہ کے برخلاف ویول نے 'زمانۂ حال کو ایک مبارک لمحہ' سمجھا، کیوں کہ دلیل دی کہ 'جنگ کے بعد، سیاسی قیدیوں کی رہائی، مورچوں سے فوجوں کی واپسی، اور گولہ بارود کے کارخانے بند ہوجانے پر، احتجاج کے لیے زرخیز زمین ناگزیر طور پر تیار ہوجائے گی 5 ویول نے موجودہ آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے کرپس کے اعلان میں تجویز کردہ نوعیت کی بنیاد پر ایک عبوری سیاسی حکومت کی تشکیل کی پیروی کرنا جاری رکھا۔ اور اس کے ساتھ ہی آئینی تصفیے کی کوشش کی، انہوں نے اپنی اسکیم کا خاکہ پیش کرتے ہوئے وضاحت کی کہ وہ اپنی اسکیم کا آغاز، ایک عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے متفقہ تجاویز وضع کرنے اور صوبوں میں عوامی حکومتیں پھر سے قائم کرنے کی تجویز پر غور کرنے کے لیے سیاسی لیڈروں کی ایک چھوٹی سی کانفرنس بلانے کی شکل میں کریں گے؛ اس وقت صوبوں میں گورنر راج چل رہا تھا۔ چرچل کا جوابی عمل قطعی قرین قیاس تھا، اور وہ یہ کہ 'یہ سارے بڑے مسائل یہ تقاضہ کرتے ہیں کہ ان پر فرصت اور فتح کے بعد امن کے ماحول میں غور کیا جائے۔' ویول نے اس بات پر زور دیتے ہوئے اپنی کوشش جاری رکھی کہ 'ہندوستانی مسئلے کے سلسلے میں پیش رفت کرنے کے لیے یہ وقت کچھ برسوں کے لیے ایک سازگار ترین موقعہ ہے،' اور انہوں نے ایمری کو اطلاع دی کہ اگر اس کی سفارشات پر فوری طور پر توجہ نہ دی گئی تو وہ اپنے معاملے کو ذاتی طور پر پیش کرنے کے لیے وطن پرواز کرنے کی اجازت چاہیں گے۔

اس اثناء میں بھولا بھائی ڈیسائی ویول سے ملنے کے لیے آئے تھے؛ یہ 15 نومبر 1944 کی بات ہے۔ تب ڈیسائی نے 1935 کے آئین کے تحت قومی حکومت کی تشکیل کی تجویز پیش کی، جس کے ممبران موجودہ قانون ساز اسمبلی سے لیے جائیں۔ بہرحال اس تجویز میں، کانگریس ورکنگ کمیٹی کے قید ممبران کی رہائی اور حکومت کے سیکشن 93 کی تبدیلی اور اس طرح گورنر راج کے خاتمے کی شرط بھی شامل تھی۔ ڈیسائی نے 12 جنوری 1945 کو وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سر جارج ایبل سے اگلی میٹنگ میں یہ اطلاع دی کہ مخلوط حکومت کی تشکیل کی تجویز کے سلسلے میں ان کے پاس گاندھی اور جناح کا

کا معاہدہ موجود ہے۔ چوں کہ یہ بات حوصلہ افزا معلوم ہوتی تھی اس لیے وائسرائے نے حکومت برطانیہ کو اس کی اطلاع دے دی۔ وائسرائے نے ڈیسائی کو مدعو کیا کہ وہ بذات خود اس تجویز کی وضاحت کریں۔'میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات کافی فائدے والی ہوگی کہ یہ خیال ہندوستان کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔'ایک ہفتے بعد، 20 جنوری 1945 کو ویول نے تجویز کا جائزہ لینے کے لیے، نیز ڈیسائی کو حاصل حمایت کا بذات خود تعین کرنے کے لیے ڈیسائی سے ملاقات کی، کیوں کہ ان تجاویز کو حاصل تائید کے بارے میں انہیں یقین نہیں تھا لیکن وہ اتنے بے تاب ہو گئے تھے کہ لندن تار بھیج کر اس سلسلے میں جناح سے بھی ملاقات کرنے کی تجویز رکھ دی بشرطیکہ حکومت راضی ہو جائے۔ لندن کی حکومت نے اس تجویز سے اتفاق کیا مگر عام نوعیت کے کچھ سوالات بھی سامنے رکھے۔ اس پر وائسرائے نے ایک ذاتی پیغام کے ذریعے یہ جواب دیا کہ'ہندوستان کے مسئلے کے سلسلے میں کسی قدر پیش رفت کے لیے یہ بہترین موقع ہے جو برسوں بعد سامنے آیا ہے اور یہ کہ اس موقعے کو فوراً کام میں لایا جائے اور تفصیلات، یا کرپس کی یا اس جیسی کسی 7 پیشکش سے اس کے موازنے کے بارے میں ہرگز پریشان نہ ہوا جائے۔' حکومت نے اپنی رضامندی دے دی، لیکن اس وقت جناح اتنے مصروف تھے کہ دہلی نہیں آ سکتے تھے۔ اس لئے وائسرائے نے جناح سے بمبئی میں ہی ملاقات کرنے اور ڈیسائی کی تجاویز کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے بمبئی کے گورنر سر جان کول ویل کو مقرر کیا۔ اس میٹنگ میں جناح نے حیران کن انداز سے ڈیسائی کے ساتھ لیاقت علی خاں کو کسی بھی بات چیت سے واقف ہونے سے ہی انکار کر دیا۔ ویول کو محسوس ہوا کہ جناح غلط بیانی کر رہے تھے۔ تاہم جناح نے مطلع کیا کہ وہ اس طرح کی کسی بھی پیشکش پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں اور یہ کہ وہ 6 مارچ 1945 کو دہلی میں ہوں گے اور تب وہ بات چیت کے لیے دہلی دستیاب ہوں گے۔ 8

جناح کو ویول سے 7 مارچ 1945 کو ملاقات کرنی تھی جو ان کے پھر بیمار پڑ جانے کی وجہ سے نہ ہو سکی! انگریزوں کے نزدیک اس ملاقات کی اہمیت کا اندازہ، ویول کی اُس مایوسی سے کیا جا سکتا ہے جو فوری نوعیت کے صلاح مشورے کے لئے انہیں لندن طلب کرنے کے سلسلے میں حکومت برطانیہ کی آناکانی کا نتیجہ تھی۔'میں نہیں چاہتا کے وہ ڈیسائی اور جناح کو تاخیر کے سبب کے طور پر استعمال کریں۔ آخرکار تبادلہ خیال کے لئے میرے وطن جانے کے اصول کو ڈیسائی کی تجاویز سامنے آنے سے کافی پہلے ہی قبول کر لیا گیا تھا۔ میں جناح اور ڈیسائی کے ذہن سے کہیں زیادہ ہز میجسٹیز گورنمنٹ کے ذہن کو جاننا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ 9

درحقیقت ڈیسائی کا طریقہ'فوجی وائسرائے کے لئے بیزار کن تھا' انہوں نے (ڈیسائی) لیاقت علی کے ساتھ مل کر حکومت کو شکست دینے کے لئے اسمبلی میں پابندی سے تعاون کیا تھا۔ ویول نے اپنے'جرنل' میں لکھا ہے کہ'ڈیسائی اور لیاقت نے مجھے یہ دکھانے کا گھیہ کیا ہوا ہے کہ میرے لئے بہتر یہ ہوتا کہ میں اپنی ایگزیکیٹو کونسل سے چھٹکارا حاصل کر لیتا اور ساری سہولتیں انہیں دے دیتا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ڈیسائی اپنے دوستوں کو قلمدانوں کی پیشکش کرتے رہے نہیں۔ میں نے ذہن بنا لیا ہے کہ میں وطن جانے سے پہلے ڈیسائی سے نہیں ملوں گا۔' 10 صلاح مشورے کی غرض سے لندن جانے کے

سرکاری اعلان کے بارے میں ویول کے اپنے بھی منصوبے تھے۔ جب ویول 22 مارچ 1945 کو لندن کے لئے روانہ ہوئے تو ان منصوبوں کے ساتھ ساتھ ان کے پاس ڈیسائی - لیاقت معاہدے کے ایک نقل بھی تھی۔

اس اثناء میں دو صوبوں میں مسلم لیگ کی وزارتیں اکثریت کھو بیٹھی تھیں: صوبہ سرحد میں سردار اورنگ زیب خان کی کابینہ 12 مارچ 1945 کو اور بنگال میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت 28 مارچ 1945 کو گر گئی تھی۔ کانگرس ہائی کمان کے جس حدایت کے تحت اکتوبر 1939 میں کانگرس کی وزارتوں نے استعفا دے دیا تھا، اسے ابھی تک کالعدم قرار نہیں دیا گیا تھا، حالاں کہ ڈاکٹر خان صاحب کو صوبہ سرحد میں ایک متبادل وزارت کی تشکیل کے لئے کوشش کرنے کی خصوصی اجازت دی گئی تھی۔ بنگال میں چوں کہ 9 ماہ بعد ہی انتخابات ہونے والے تھے اس لیے وہاں کوئی وزارت نہیں بنائی جا سکی! ویول کا دورہ بے نتیجہ طور پر 9 ماہ تک طول کھینچ گیا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ وزیر اعظم ان کے ملنے سے کتراتا رہا، اسے ڈر تھا کہ ویول ہندوستان کے سلسلے میں اس کے سامنے ایسے مطالبات رکھ سکتے ہیں جو کہ ان کے لیے قابل قبول نہ ہو، بہر حال ویول کی مسلسل کوشش چرچل کی ہچکچاہٹ کی مورچہ بندی کو توڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ اگست 1942 کے بعد پہلی بار 'ہندوستان کے وائسرائے نے ہندوستان کے شہریوں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی اور گفت وشنید اور سمجھوتے کی باتیں پھر سے ایجنڈے میں شامل ہو گئی تھیں۔' ویول کو کابینہ کی حتمی رضامندی سے پہلے، کرپس کی پیشکش کے قلیل مدتی پہلو کو دوبارہ سامنے لانے کے سلسلے میں ابھی بھی بہت سارے اعتراضات پر قابو پانا تھا۔ ہر حال میں معاہدے کی نوعیت عارضی رضامندی جیسی تھی تا کہ ہندوستان کے مسئلے کو انگلینڈ میں انتخابات کی مہم سے باہر رکھا جا سکے جو جون 1945 میں ہونے تھے؛ نیز اس وجہ سے بھی کہ برطانوی کابینہ، کانگرس اور لیگ، یعنی دونوں کی تائید حاصل کرنے میں ویول کی کامیابی کو بعید از امکان تھی۔ یہاں تک کہ جو لوگ ہمدردی رکھتے تھے، وہ بھی یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ ایگزیکٹیو کی کسی شکل میں بھی تشکیل نو سے، جو کہ تجاویز میں شامل تھی، وائسرائے کی پوزیشن گھٹ جائے گی اور اس طرح اقتدار 'چند غیر جمہوری، غیر نمائندہ، رہنماؤں کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ ایملی یہ چاہتا تھا کہ مرکزی اور ریاستی اسمبلیوں سے چن کر سیاست دانوں کا ایک پینل بنایا جائے جس میں سے ویول اپنی کونسل کا انتخاب کر سکتے تھے۔ انڈیا کمیٹی کے کچھ دوسرے ممبروں کی تائید کے ساتھ کرپس یہ محسوس کرتا تھا کہ چوں کہ ایگزیکٹیو کی تشکیل نو سے وائسرائے کے اختیارات یقیناً کم ہو جائیں گے، اس لئے اس تخفیف کی حد قانونی طور پر کم کر دینی چاہئے۔ برحال ویول نے اس طرح کے سارے دباؤ کی مزاحمت کی اور کابینہ سے، اپنی کونسل کے لئے انتخاب کی آزادہ حاصل کر لی، اور اس کے ساتھ ہی اس تخفیف کو با اثر بنا دینے کا اختیار بھی اپنے ہی پاس رکھا۔

بدقسمتی سے تبھی دو واقعات ایسے ہوئے جن کی وجہ سے ویول کی واپسی میں مزید تاخیر ہوئی۔ پہلا واقعہ یہ کہ 13 اپریل 1945 کو صدر روزویلٹ کی موت ہوگئی، جس نے ایک پکھواڑے کے لئے سارا پروگرام درہم برہم کر دیا اور اس کے بعد، 'نازی' جرمنی کے سقوط کے نتیجے میں یورپ میں تابڑ توڑ کئی واقعات ہوئے جن کی وجہ سے معاملات میں مزید تاخیر ہوگئی۔ اس طرح اس مسئلے پر توجہ دینا اہم ہو گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے معاملے میں تاخیر کی وجہ سے ملک میں

بے اعتمادی اور بے چینی پیدا ہو گئی تھی؛ اگر رہنما اپریل 1945 میں رہا کر دیے گئے ہوتے یعنی جرمنی کے سقوط سے پہلے نیز اس کے بعد وائسرائے کی کانفرنس طلب کر لی گئی ہوتی تو 'کامیابی' کے امکانات روشن ہو سکتے تھے، مگر اب اس طرح کی قیاس آرائی کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک (تقریباً ڈھائی ماہ بعد) واپس آتا، صرف دو ہی صوبوں - سندھ اور آسام - مسلم وزارتیں باقی رہ گئی تھیں۔ اگرچہ جناح کی خود اعتمادی کو کوئی دھکا نہیں لگا تھا مگر اب انہوں نے پہلے سے کہیں زیادہ، ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کے بلا شرکت غیرے حق پر اور سختی سے زور دینا شروع کر رہا تھا۔

پہلی شملہ کانفرنس

ویول 4 جون 1945 کو واپس آئے۔ اور ایک ایسی کانفرنس بلانے کے لیے اپنی تجویز کا اعلان کر دیا جس طرح کی کانفرنس بلانے کا ارادہ وہ شروع سے ہی کرتے آرہے تھے۔ اعلان کردہ چار نمایاں باتیں یہ تھیں: نئی ایگزیکٹیو کونسل کی ساخت پر تبادلہ خیال کے لیے تمام پارٹیوں کی نمائندگی کرنے والے 21 رہنماؤں کی کانفرنس 25 جون 1945 کو شملہ میں ہوگی، جو وائسرائے اور کمانڈر ان چیف کے علاوہ جن کے پاس جنگ سے متعلق قلمدان ہوں گے خالصۃً ایک ہندوستانی کونسل ہوگی، اور خارجہ کا معاملہ بھی (جس کا انتظام ابھی تک وائسرائے کے ہی پاس تھا) نئی کونسل کے کسی ہندوستانی رکن کے چارج میں دے دیا جائے گا۔ یہ نئی کونسل موجودہ آئین کے تحت کام کرے گی۔ اس کے بعد یہ تجویز رکھی گئی کہ - برطانیہ کے تجارتی اور دیگر مفادات کی نمائندگی کرنے کے لیے دیگر ممالک محروسہ (Dominions) کی طرح ہی ہندوستان میں بھی ایک برطانوی oh:y کمشنر کا تقرر کیا جائے۔ لارڈ ویول نے یہ وضاحت بھی کی کہ اس عبوری حکومت کی تشکیل سے حتمی آئینی تصفیے کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ نئی ایگزیکٹیو کونسل کا سب سے اہم کام، سب سے پہلے جنگ کے سلسلے میں جاپان کے خلاف کارروائی کرنا۔ دوسرے یہ کہ نئے اور مستقل نوعیت کے آئین پر اتفاق رائے قائم ہونے تک، برطانوی ہند کی حکومت کو برقرار رکھنا، اور تیسرے، اس مفاہمت تک جلد از جلد پہنچنے کے لئے طریقے تلاشی کرنا۔

گاندھی ان دونوں کے نزدیک واقع بل اسٹیشن پنچ گنی میں تھے اور حالیہ بیماری کے سبب اب بھی خاصے کمزور تھے۔ ایسے میں وائسرائے کے اُس نشریے کا متن، جس میں گاندھی کو شملہ مدعو کیا گیا تھا، ایک اخباری نامہ نگار نے گاندھی جی کے ہاتھ میں دیا۔ انہوں نے فوراً ہی وائسرائے کو تار بھیجا کہ وہ (گاندھی) کسی جماعت کی نمائندگی نہیں کرتے اور 1934 سے کانگرس کے ابتدائی رکن بھی نہیں - وائسرائے نے ان کی دلیل کی طاقت کو مان لیا اور غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے، کانفرنس میں شرکت کے لیے کانگرس کے صدر کو مدعو کیا۔ تاہم گاندھی وائسرائے سے ملنے کے لیے شملہ جانے اور جب تک وائسرائے چاہیں، وہیں رُکے رہنے کے لیے راضی ہو گئے۔

وائسرائے کے نشریے میں محض لفظ 'آزادی' کو ہی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا بلکہ بنیادی شرط کے طور پر مجوزہ قومی حکومت میں 'اعلا ذات ہندو - مسلم برابری' کا شوشہ بھی چھوڑا گیا تھا۔ گاندھی نے اس بات کی طرف وائسرائے کی توجہ

مبذول کراتے ہوئے تار میں لکھا۔'ذاتی طور پر نہ تو میں ہی اسے (اعلاذات ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابری) مان سکتا ہوں اور نہ ہی کانگرس مان سکتی ہے۔ باوجود اس کے کہ کانگرس میں غالب اکثریت ہندوؤں کی ہے، کانگرس نے خالصۃً ایک سیاسی جماعت ہی بنے رہنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس بات کا اہل ہوں کہ تمام غیر ہندوؤں کو اور زیادہ یقینی طور پر تمام غیر اعلاذات ہندوؤں کو نامزد کرنے کے لیے کانگرس کو مشورہ دے سکوں۔ اور پھر یہ کہ' کانگرس نے اپنی شناخت کو کبھی بھی اعلاذات ہندوؤں سے یا غیر اعلاذات ہندوؤں کے وابستہ نہیں کیا ہے، کبھی کر بھی نہیں سکتی، یہاں تک کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے بھی نہیں! چوں کہ ایسی صورت یک طرفہ، غیر حقیقی اور خودکشی کے مترادف ہوگی۔' وائسرائے نے اپنے جواب میں گاندھی کو یقین دلایا کہ دعوت نامے کی قبولیت کسی بھی چیز کے لیے 'فریقوں کو پابند' نہیں کرتی۔ 'ممبروں کو کانفرنس میں تجاویز پر تبادلہ خیال کرنے، اور انہیں قبول کرنے یا مسترد کردینے کی پوری آزادی ہوگی۔ اس وضاحت نے کانفرنس میں کانگرس کی شرکت کے لیے میدان صاف کردیا۔

اب ممبئی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی، جو تین سال ہوئی تھی، اور کانفرنس کے لیے مدعو اپنے 9 نمائندوں کے لیے ہدایات تیار کیں۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس نے اس بات پر بھی غور کیا کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نیز کانگرس کی دوسری کمیٹیوں پر ابھی بھی پابندی لگی ہوئی تھی۔ یہ بات راستے کی رکاوٹ تھی جسے لازماً ایک جابرانہ دباؤ مانا جانا چاہیے۔ مزید کہ کانگرس قیدیوں کی بڑی تعداد کو کانفرنس کی پیش رفت میں مداخلت کرنی چاہیے، کانگرس کے بیشتر رہنما جیلوں سے باہر آچکے تھے اور ان کی صحت کافی خراب ہوگئی تھی۔ ایک دوست نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کو 'بیماروں کی پریڈ' کا نام دیا تھا۔ بہر حال انہوں نے فیصلہ کیا کہ 'ایک تنظیم کے طور پر کانگرس کو شملہ کانفرنس میں شرکت کرنی چاہیے۔ اس کے بعد کانگرس کمیٹی نے کانفرنس کے لیے اپنے نمائندوں سے کہا کہ وہ یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں کہ 'جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادیوں کی فتح کا مطلب برطانیہ یا دوسرے ملکوں کے سامراجی کنٹرول سے، متعلقہ ملکوں کی آزادی ہونا چاہیے...... دوسرے ملکوں کو آزادی سے محروم کرنے کے لیے ہندوستان کے وسائل کے استعمال پر پابندی کو ایک تسلیم شدہ حقیقت کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔'

جب کانگرس کے اراکین سفر کر رہے تھے، بمبئی سے شملہ تک 1100 میل لمبے راستے میں پڑنے والے مختلف اسٹیشنوں پر پرُ جوش بھیڑ ان کی پذیرائی کے لیے موجود ہوتی تھی...... یہ ایک طرح سے کانگرس لیڈروں کی رہائی کا جشن بھی تھا۔

جزیرہ نمائے ہند میں جون سال کا گرم ترین مہینہ ہوتا ہے، اس لیے وائسرائے نے سوچ سمجھ کر یہ ہدایت جاری کی تھی کہ گاندھی اور شملہ جانے والے دوسرے کانگرس رہنماؤں کے لیے مناسب ایئر کولڈ (AIR-COOLED) کوچ (تب ایئر کنڈیشنگ نہیں تھی) محفوظ کردیئے جائیں۔ بہر حال گاندھی نے اس طرح کی

سہولت استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔

میں گاندھی کے ساتھ 'یونائیٹڈ پریس آف امیرکا' کے پریسٹن گروور بھی سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے گاندھی کی صحت کے بارے میں پریشان ہو کر ایک اسٹیشن پر انہیں ایک مختصر سا نوٹ دیا تھا۔ 'کیا یہ دانش مندی کی بات نہیں ہوگی کہ شام کو آپ کانگرس کی نسبتاً ٹھنڈی کوچ میں چلے جائیں تاکہ کچھ دیر کے لیے خود کو آرام دے سکیں۔ پچھلے 24 گھنٹوں میں آپ کی ذرا بھی آنکھ نہیں لگی ہے۔ اس بات سے آپ کو کوئی مدد نہیں ملے گی کہ راستے میں پڑنے والے اسٹیشنوں پر نیند میں خلل پڑنے کی وجہ سے آپ تھکے ماندے شملہ پہنچیں! ہم لوگ امریکہ میں کہتے ہیں 'اپنے آپ کو بریک (آرام) دے لو'۔ پریسٹن گروور کو یہ جواب ملا۔ 'آپ کے اس تو جہ بھرے نوٹ کے لیے بہت بہت شکریہ! آپ مجھے اس قدرتی گرمی میں تپ پگھلنے دیجیے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس گرمی کے بعد راحت افزا ٹھنڈک آئے گی جس سے میں لطف اندوز ہوں گا۔ مجھے حقیقی ہندوستان کو قریب سے محسوس کرنے دیجیے!'

شملہ پہنچنے پر جلدی جلدی نہانے اور کھانا کھانے کے بعد گاندھی وائسرائے سے پہلی بار ملنے کے لیے سیدھے وائسرائے لاج چلے گئے۔ ویول کو اس بات میں بہت زیادہ دلچسپی تھی کہ گاندھی اس کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کریں، مگر وہ گاندھی کو اس کے لیے راضی نہیں کر سکے۔ گاندھی کا یہ کہنا تھا کہ اس جیسی کسی بھی نمائندہ کانفرنس میں اس شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو کتنا ہی اہم ہو مگر مندوب نہ ہو! آئینی طریقے کا تقاضہ ہے کہ اگر ان کے مشورے کی ضرورت محسوس کی جائے تو وہ کانفرنس کے دوران شملہ میں ہی رہیں گے بلکہ ایک مشاہد کے طور پر اس میں شرکت بھی کر سکتے ہیں! وائسرائے نے کہا کہ وہ یہ چاہیں گے کہ گاندھی جی رُکے رہیں جسے انہیں منظور کر لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جناح نے اس پر یہ کہتے ہوئے شکایت کی کہ گاندھی تو' کانفرنس سے الگ ہو گئے تھے، گاندھی نے پریسٹن گروور کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ 'اگر مسٹر جناح مجھے وہاں دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ مجھے وہاں لے جا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سخت قسم کے اختلافات اور کانفرنس کو در پیش رُکاوٹوں کے باوجود سمجھوتا چاہتے ہیں'۔

ہر لحاظ سے ویول نے کانفرنس کا آغاز بالکل ٹھیک طریقے پر کیا اور کانفرنس کی کارروائی بڑی سوجھ بوجھ سے چلائی۔ 'میں نے اپنے نشریے میں کہا تھا کہ کچھ ایسی باتیں ہیں جو تمام فریقوں کے لیے بھول جانے یا معاف کر دینے کی ہیں، فی الحال آپ کو میری قیادت ہر حال میں قبول کر لینی چاہیے...... میں اس کانفرنس کے تبادلۂ خیال کی رہنمائی اس مقصد کے لیے کروں گا، جسے میں ملک کا بہترین مفاد سمجھتا ہوں۔' وائسرائے کی تقریر کے اس حصے کا حوالہ دیتے ہوئے گاندھی نے یہ تبصرہ کیا، 'یہ ایک بہت اچھا اور باوقار طرزِ اظہار ہے جس کا لارڈ ویول نے استعمال کیا ہے۔ اس طرح وہ کانفرنس میں اس کے قائد کا کردار ادا کر رہے ہیں نہ کہ وہائٹ ہال کے ایجنٹ کا!'

وائسرائے نے اس وقت اُن پریشانی کن امور سے صرف نظر کیا جب وہ پیش رفت میں رکاوٹ کا خطرہ بننے لگے

تھے۔ انہوں نے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ جب جناح نے کانگرس کو ایک ہندو تنظیم بتاتے ہوئے اس کے خلاف لفظی جنگ چھیڑ رکھی تھی تو انہوں نے (ویول) کبھی بھی اور کہیں بھی یہ نہیں کہا تھا کہ کانگرس ایک ہندو تنظیم ہے۔ ایک اقتباس اس طرح ہے:

وائسرائے: 'میری تجاویز میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو کہ کانگرس کو ایک ہندو تنظیم قرار دیتی ہو!'

جناح : 'ہم یہاں فرقوں کی حیثیت سے آئے ہیں اور کانگرس ہندوؤں کے سوا کسی اور کی نمائندگی نہیں کرتی۔'

وائسرائے: 'کانگرس اپنے ممبروں کی نمائندگی کرتی ہے۔'

ڈاکٹر خاں صاحب: 'ان کا مطلب کیا ہے؟ میں ایک کانگرسی ہوں، تو کیا میں ہندو یا مسلمان ہوں؟'

وائسرائے: 'معاملہ یہیں چھوڑ دیا جانا چاہیے، کانگرس اپنے ممبروں کی نمائندگی کرتی ہے۔'

گاندھی نے کانگرس کے لیڈروں سے کہا کہ برابری کے سلسلے میں انہوں نے وائسرائے کے اعلان کا یہ مطلب لیا تھا کہ کوئی بھی فرقہ، دوسرے فرقے سے زیادہ نمائندگی کے لیے نہیں کہہ سکے گا، بلکہ 'اگر وہ چاہے تو اس سے کم نمائندگی بھی قبول کر سکتا ہے۔' کانگرس کو یہ بات قبول کر لینی چاہیے کہ غیر درج فہرست ہندوؤں کی تعداد کسی بھی حالت میں مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہوگی اور وہ تمام اقلیتی گروپوں کے بہترین ہندوستانیوں، نیز اینگلو انڈین، انگریزوں، پارسیوں، سکھوں، یہودیوں (اگر دستیاب ہوں)، ہندوستانی عیسائیوں، درج فہرست ذاتوں اور عورتوں کے ایک ایک نمائندے کو نامزد کر کے اس برابری کو ختم نہیں کریں گے، اور ایسا اس بات کا لحاظ رکھے بغیر کیا جائے گا کہ یہ لوگ کانگرس کے ممبر ہیں یا نہیں۔

گاندھی کی دلیل تھی کہ درج فہرست ذاتوں کے علاوہ ایک یا دو سے زائد ہندوؤں کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور پھر یہ کہ انہیں بھی اعلا ذات ہندوؤں کے بجائے، اس حیثیت میں موجود رہنا چاہیے کہ وہ دستیاب 'بہترین ہندوستانی ہیں۔' گاندھی کی دلیل تھی کہ وہ ہندوؤں کی طرف سے برابری کے حق کے استعمال سے انکار کر کے بہت سی گرہی پیچیدگیوں کو پار کر جائیں گے اور آزاد ہندوستان کی ٹھوس اور مضبوط اساس رکھیں گے، اور وہ بھی خالصۂ قوم پرستانہ بنیاد پر! اگر وہ (مجوزہ) مساواتی فارمولے کو مان لیتے ہیں، تو اس کے نتیجے میں وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک طرح کا معرکہ چھڑ جائے گا اور وائسرائے کے لیے ویٹو استعمال کرنے کی نوبت آجائے گی۔ البتہ وہ رضا کارانہ طریقے سے اپنے نمائندوں کی بھاری تعداد اقلیتی فرقوں میں سے نامزد کر کے اور ہندوؤں کے لیے ذیلی برابری کا انتخاب کر کے وائسرائے کی تجویز میں شامل برابری کے فارمولے والے حصے کو بے اثر کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں کہ پانچ مسلمان ممبر اور پانچ اعلا ذات ہندو ممبر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہوں، مسلم لیگ، وائسرائے اور کمانڈر ان چیف کی مدد سے کابینہ میں کسی بھی وقت برابری کی صورت پیدا کر سکتی ہے۔ اگر اس کے برخلاف کابینہ کے زیادہ ارکان کی تعداد قوم پرست محب وطن مسلم گروپ کے نمائندوں پر مشتمل ہو، اور محض ایک، دو یا تین ہی اعلا ذات ہندو ہوں تو ایسی صورت میں کابینہ میں کسی طرح

کی فرقہ وارانہ خانہ بندی نہیں ہوگی اور اگر مسلم لیگ ہندو اکثریت کی حکمرانی کے نام پر کوئی واویلا کرے گی تو اس کی آواز صدا بہ صحرا ہوگی۔

یہ گاندھی کا مخصوص طریقہ کار تھا جس نے، بہ ظاہر ناقابل عمل دکھائی دیتے ہوئے بھی، ایک تنازعے کو بڑی ہوشیاری سے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ بہرحال بدقسمتی سے کانگرس ورکنگ کمیٹی کو گاندھی کی تجویز مان لینے پر راضی نہیں کیا جا سکا، حالاں کہ ورکنگ کمیٹی کے متعدد ممبران اور انفرادی طور پر کانگرس کے کچھ لیڈر بھی گاندھی کے موقف کی دانش مندی سے اتفاق رکھتے تھے۔ ایک صوبے کے ایک سابق وزیر اعلا نے اپنے ایک ساتھی سے کہا 'یہ مجھے اپیل کرتا ہے۔ گاندھی کا موقف بالکل صحیح ہے۔' اور 'مگر کیا، یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہندوؤں کے لیے ذیلی برابری کا فارمولا قبول کر لینے کے بعد، ہم رائے دہندوں کا سامنا کر پائیں گے؟'

جب 29 جون کو کانفرنس منعقد ہوئی تو وائسرائے کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ چوں کہ حکومت کی ساخت اور تعداد کے بارے میں متعلقہ پارٹیوں میں اتفاق رائے نہیں ہو پایا ہے، اس لئے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ ذاتی اثرات کو بروئے کار لائیں گے۔ انہوں نے تمام نمائندوں سے کہا کہ وہ انہیں ان تمام لوگوں کی فہرست بھیجیں جنہیں وہ قومی حکومت میں شمولیت کے لیے منتخب کرانا چاہیں گے۔ وہ ان فہرستوں میں اپنے طور پر بھی کچھ ناموں کا اضافہ کرے گا۔ اور تمام ناموں کی چھان بین اور متعلقہ پارٹیوں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے بعد، وہ ایسی فہرست تیار کرنے کی کوشش کریں گے جو کانفرنس کے لیے عام طور پر قابل قبول ہوگی۔

جناح کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ سب سے پہلے یہ جاننا چاہتے تھے کہ اگر لیگ کوئی فہرست بھیجے تو کیا وائسرائے اُسے من وعن قبول کر لیں گے؟ وائسرائے نے جواب دیا کہ وہ پیشگی طور پر کسی طرح کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ حتمی انتخاب کرنا ان کا کام ہے۔ بہرحال کانفرنس کو اس کے سفارش کردہ ناموں پر غور کرنے اور انہیں قبول یا مسترد کر دینے کا موقع دیا جائے گا۔ تب جناح نے پوچھا کہ کیا کسی ایک پارٹی کے ذریعہ حتمی طور پر مسترد کر دیئے جانے کے بعد بھی وائسرائے اپنی تجویز کی پیروی جاری رکھیں گے، جس کا جواب وائسرائے نے یہ دیا کہ وہ پیشگی طور پر خود کو اس بات کا پابند نہیں بنا سکتے کہ کس صورت حال میں وہ کیا قدم اٹھائیں گے۔' آخر میں جب وائسرائے نے جناح سے صاف صاف پوچھا کہ لیگ ناموں کی فہرست پیش کرے گی یا نہیں، تو جناح نے جواب دیا کہ وہ اس وقت وہاں اپنی ذاتی حیثیت میں موجود ہیں،' اور کوئی متعین جواب دینے کے لیے انہیں وائسرائے کی تجویز کی تحریری شکل میں ضرورت ہوگی تاکہ اسے لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھا جا سکے۔ جناح سے کہا گیا کہ انہیں تحریری شکل میں تجویز مل جائے گی۔

اس کے بعد کانفرنس ایک پندرہ دن کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

اسی دوران، مسلم لیگ کے سوا باقی تمام پارٹیوں نے اپنے ناموں کی فہرست وائسرائے کو بھیج دی۔ یورپی گروپ

نے اپنی طرف سے کوئی علاحدہ فہرست پیش نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کانگریس نے مجوزہ ایگزیکٹو کونسل کے لئے 15 ناموں کا پینل پیش کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ اقلیتی فرقوں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دینے کے لیے ایگزیکیٹیو کونسل کے ممبران کی تعداد، وائسرائے اور کمانڈران چیف کے علاوہ، بڑھا کر 15 کردی جائے۔ کانگریس کے پینل کے نام ضمیمہ 9 میں شامل نہیں۔

دوسری طرف جناح نے نام پیش کرنے کے سلسلے میں لارڈ ویول کو مطلع کیا کہ، ناموں کا پینل پیش کرنے کے لئے آپ کی تجویز کے سلسلے میں........ورکنگ کمیٹی (مسلم لیگ کی) یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ جب آپ عزت مآب کے پیش رو لارڈ لنلتھگو نے اس طرح کی تجویز رکھی تھی تو ورکنگ کمیٹی نے اس کی مخالفت کی تھی اور جب اس کے اعتراضات لارڈ لنلتھگو کے علم میں لائے گئے تھے تو انہوں نے تجویز واپس لے لی تھی اور دوسرا متبادل سامنے رکھا تھا۔ لارڈ لنلتھگو کی متبادل تجویز اس مراسلے میں شامل تھی جو لارڈ لنلتھگو نے جناح کے نام 25 ستمبر 1940 کو لکھا تھا؛ میں اس بات پر راضی ہوں کہ نمائندوں کا انتخاب، جب کہ وہ گورنر جنرل کے دائرۂ کار میں ہو، مسلم لیگ کے معاملے میں رسمی طور پر داخل کئے گئے پینل پر مبنی ہونے کے بجائے متعلقہ پارٹی کے قائد اور میرے (وائسرائے) درمیان رازدارانہ، تبادلہ خیال پر مبنی ہو! ویول لنلتھگو کے نام اپنے مراسلے میں جناح نے لکھا تھا؛ ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے تھے کہ....سابقہ موقعے پر طے کئے گئے طریقہ کار پر ہی اس معاملے میں بھی عمل کیا جانا چاہئے، خاص طور پر مسلم لیگ کے سلسلے میں! یہ تجویز ویول کے خیال پر قابل اعتنا نہیں تھی۔ چناں چہ جناح نے پھر لکھا، 'کمیٹی..... یہ چاہتی ہے کہ میں یہ کہوں کہ اسے یہ جان کر افسوس ہوا کہ عزت مآب سے یہ یقین دہانی نہیں کرا پائے ہیں کہ مجوزہ ایگزیکیٹو کونسل کے تمام مسلم ممبران مسلم لیگ سے چنے جائیں گے،......اور موجودہ حالات میں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں مجوزہ کونسل میں شمولیت کے لئے مسلم لیگ کی طرف سے نام بھیجنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'

14 جولائی کو کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں وائسرائے نے یہ انکشاف کیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کی طرف سے ناموں کی کوئی فہرست موصول نہ ہونے کے باوجود کاغذ پر ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کرلی ہے جو ان کے خیال میں کانفرنس کے لیے قابل قبول ہوگی۔ انہوں نے اُس وقت جو مسلم نام تجویز کیے تھے وہ جناح کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ بہرحال وائسرائے نے اپنی فہرست کانگریس کے صدر کو نہیں دکھائی، حالاں کہ ایسا کرنے کے لیے کہا بھی گیا تھا۔ وائسرائے نے اپنی فہرست کانفرنس کے سامنے بھی نہیں رکھی۔ انہوں نے محض یہ اعلان کیا کہ کانفرنس اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام ہوگئی ہے اور یہ کہ انہوں نے ناکامی کی ساری ذمے داری اپنے اوپر لے لی ہے۔

اس وقت وائسرائے کے نام اپنے خط میں گاندھی نے لکھا: 'مجھے یہ سوچ کر دکھ ہو رہا ہے کہ جو کانفرنس خوش گوار ماحول میں اور امیدوں کے ساتھ شروع ہوتی تھی وہ، بظاہر پہلے جیسے سبب کی وجہ سے اس طرح ناکام ہوجائے گی۔ اس مرتبہ آپ نے اس ناکامی کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، لیکن دُنیا اس کے مختلف طریقے پر سوچے گی۔ ہندوستان یقیناً یہی

سمجھتا ہے۔' انہوں نے ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر کا سلسلہ جاری رکھا، 'میں خود کو اس تک شک وشبہ سے نہیں بچا سکتا کہ اس کا زیادہ اہم سبب یہ ہے کہ حکام اقتدار چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کا مطلب اس اقتدار کا ان افسران کے سابقہ قیدیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جانا ہے۔'

یہ کتنے دکھ کی بات تھی کہ تعطل کو ختم کرنے کی یہ کوشش ایک بار پھر پرانے تعصبات کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی، 'ملک بظاہر سمجھوتے کے لیے برطانیہ کی تجویز کو قبول کرنے کے لیے اتنا زیادہ پہلے کبھی تیار نہیں ہوا تھا۔ وائسرائے کے اس سے پہلے کے بیانات نے لوگوں میں یہ امید پیدا کر دی تھی کہ اس مرتبہ نئی شروعات ہوگی۔ لوگوں کا سوال تھا کہ اگر کسی پیش رفت کے لیے کانگرس اور لیگ کے درمیان اتفاق رائے کو ضروری شرط کی حیثیت دینا ہے تو پھر آل پارٹی کانفرنس بلانے کی ضرورت ہی کیا ہے؛ یہ بھی کہ تعاون کرنے سے لیگ کے انکار کر دینے پر اگر وائسرائے اپنی تجویز کو آگے نہیں بڑھائے گا تو یہ ساری کوشش کس لیے! کیا ایسے میں یہ بہتر نہ ہوتا کہ صرف کانگرس اور مسلم لیگ کے صدور کو ہی مدعو کیا جاتا اور دوسروں کو اس تماشے سے الگ رکھا جاتا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جو بار بار دہرایا جا رہا تھا۔

جناح نے، اپنے ایک بیان میں ویول کے منصوبے کو مسلم لیگ کے ایک 'جال' اور 'پروانۂ موت' قرار دیا، کیوں کہ اگر تمام ممبران مسلم لیگ ہی کے ہوتے تو بھی، وہ کابینہ میں ایک تہائی موجودگی کے ساتھ اقلیت میں ہی ہوتے۔ جناح کا کہنا تھا: 'تمام اقلیتوں کے نمائندے...... عملاً اور یقینی طور پر، حکومت میں ہمارے خلاف ووٹ دیتے۔' اس سے پہلے جناح یہ کہا کرتے تھے کہ مسلم لیگ ہندوستان میں تمام اقلیتوں کی علم بردار اور محافظ ہے، اور کانگرس 'ہندوؤں' کی بھی نہیں، بلکہ صرف 'اعلا ذات ہندوؤں' کی ہی نمائندگی کرتی ہے۔ مگر اب ان کا یہ کہنا تھا کہ ارج فہرست ذاتوں، سکھوں اور عیسائیوں جیسی اقلیتوں کا بھی وہی مقصد ہے جو کانگرس کا ہے۔ ان کا نصب العین اور ان کا نظریہ...... ایک متحدہ ہندوستانی کا ہے...... نسلی اور ثقافتی لحاظ سے یہ اقلیتیں ہندو معاشرے کے ساتھ بڑی مضبوطی سے گتھی ہوئی ہیں۔ یقیناً ایک وقت میں دونوں ہی باتیں صحیح نہیں ہوسکتیں۔' اس کے علاوہ یہ سوال بھی کیا گیا تھا کہ اگر کابینہ میں تمام مسلم ممبران کی نامزدگی مسلم لیگ سے ہی کیے جانے کے لیگ کے مطالبے کو مان بھی لیا جاتا تو ویول کا منصوبہ آخر کس طرح ایک 'جال' یا 'پروانۂ موات' نہ رہ جاتا۔

کانفرنس میں قائداعظم کے رویے کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر جیکر نے گاندھی کو لکھا تھا، 'اس تقریر میں جہاں انہوں نے ویول کے بندوبست کو 'شکاری کا جال' قرار دیا ہے، مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ انہیں خدشہ تھا کہ اگر وہ اس عبوری انتظام کو قبول کر لیتے ہیں تو ساتھ کام کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہم آہنگی سے وہ تلخیاں اور مخاصمتیں کمزور پڑ جائیں گی جن کے بطن سے پاکستان کی تشکیل اور پرورش ہوئی ہے، اور یہ معلوم ہو جانے پر کہ اس پاکستان کی بنیاد حقائق کی بجائے محض طویل عرصے سے پالے پوسے گئے شکوک وشبہات پر قائم ہوگی تو جداگانہ وجود کے لیے مسلمانوں کا جوش وخروش

ٹھنڈا پڑ جائے گا.......انہوں نے تجویز قبول کرنے کے لئے دو شرطیں رکھیں؛ جنہیں ان کو ناممکن سمجھ لینا چاہیے تھا: 1۔ پاکستان کے بارے میں یقین دہانی اور 2۔ ہندوستان کے دوسرے گروپوں کے ساتھ مسلم ووٹ کی برابری! اپنی عادت کے مطابق، جو کہ مسلسل کامیابیوں کی وجہ سے اور بھی پختہ ہوتی گئی ہے، وہ ان مراعات کا ذکر نہیں کرتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہو چکی ہیں، جیسے اعلاذات ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابری اور اب وہ مجموعی طور پر ایک طرف ملک کے عام دوسرے گروپوں اور دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان برابری چاہتے ہیں یعنی 50 صرف مسلمانوں کے لئے اور 50 دیگر تمام گروپوں یا باقی تمام ہندوستان کے لئے- جسے 27 اور 23 کو برابر قرار دینے والا کوئی ریاضی کا شعبدہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ انہیں آزادی حاصل کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے، وہ اس آزادی کا مطالبہ اس قیمت پر کریں جس سے اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

کانفرنس کا اصل نتیجہ عملی سیاست میں اعلاذات ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابر کا فارمولا متعارف کرائے جانے اور سرکار کی طرف مذہب کی بنیاد پر، بٹوارے کے اصول پر مسلسل زور دینے کی صورت میں سامنے آیا، وہ بھی جب آزادی عنقریب تھی۔ اس کانفرنس سے ایسی کوششوں کی ابتدا ہوئی جسے بعد میں کیبنٹ مشن مذاکرات کے دوران اہمیت حاصل ہوئی، انگریزوں کی ذومعنی باتوں کے سبب جن میں ان کے اعلانات ان کے ارادوں کی تکذیب کرتے تھے۔

گاندھی کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران اقوام متحدہ کے ایلیف اینڈ ری ہیبلیٹیشن ایڈمنسٹریشن کے فرانس سیئر نے کہا تھا، اور آپ یہ مانیں گے کہ ویول نے تعطل ختم کرانے کے لئے ایماندارانہ کوشش کی تھی،' گاندھی کا جواب تھا کہ ایک 'ایماندارانہ کوشش ایمان دارانہ طریقے پر ہی ختم ہونی چاہیے تھی۔'

29 جون (جب کانفرنس پندرہ دن کے لئے ملتوی کر دی گئی تھی) اور 16 جولائی کے درمیان (جب کانفرنس پھر سے بلائی گئی) واقعات کا کیا سلسلہ رہا؟ ویول نے 16 جولائی کی میٹنگ میں یہ اعتراف کیا کہ وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہو گئے ہیں۔ اس کی توثیق پندرہ دن کے بعد لندن سے پنڈت نہرو کو موصول ایک خط سے ہوئی، 'اس بات سے اب بھی واقف ہیں کہ ویول کہ پیش کش کو الیکشن کی ضروریات کے ایک حصے کے طور پر برقرار رکھا گیا تھا اور یہ کہ ویول کے ذریعے، جناح کے بغیر حکومت کی تشکیل کا راستہ اپنائے جانے کے پہلے ہی بات چیت ختم کر دیے جانے کا فیصلہ لندن کی ایما پر کرایا گیا تھا۔ آخری لمحہ میں ایمری نے بھی 19 ویں کو تاریخ کو مشورہ دیا تھا کہ چوں کہ مسلم لیگ ایکزیکٹو کونسل کی تشکیل میں تعاون کرنے سے انکار کر رہی ہے، اس لئے وہ اب مزید کوشش نہ کریں، یا ور کیا جاتا ہے کہ ایمری نے معقول وجہ کے ساتھ کہا تھا کہ چوں کہ برطانیہ میں پارلیمانی انتخابات کے نتائج 25 جولائی کو آنے کی توقع ہے اس لئے چرچل، ایمری کے لئے اور برطانوی کابینہ کے لئے حتمی ہدایات جاری کرنا ممکن نہیں ہوگا، اس لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ اس معاملے کو ابھی یوں ہی رہنے دیا جائے۔ اس کا مطلب کانفرنس کی ناکامی تھا، کیوں کہ لندن کی حکومت ابھی کچھ بھی کرنے کی حالت میں نہیں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ویول نے اپنی آخری تقریر میں کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کرتے ہوئے، ایک فوجی کمانڈر کی طرح؛ جو کہ واقعی وہ تھا اور آخر تک رہا، تھا: میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کانفرنس کی ناکامی کی ذمے داری میری ہے۔ اس کانفرنس کا بنیادی خیال میرا ہی تھا۔ اگر یہ کانفرنس کامیاب رہتی تو اس کا سہرا میرے سر ہوتا۔ میں اس کانفرنس کی ناکامی کے لئے کسی بھی ایک پارٹی کو موردالزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ میں پارٹی کے لیڈروں سے کہتا ہوں......وہ یہ یقینی بنائیں کہ کسی طرح کی الزام تراشی نہیں کی جائے گی۔' مگر یہ امید غلط ثابت ہوئی کیوں کہ اس کے فوراً بعد ہی پورے زور وشور سے ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ دوسرے جو بھی اسباب رہے ہوں، اس کی اصل وجہ مسلم نمائندگی کے بارے میں جناح کی ہٹ دھری تھی۔ ویول کے لئے صرف کانگرس کے نامزد اراکین پر مشتمل کونسل کی تشکیل کرنا بہت دشوار تھا اور اس وقت تو ہر گز نہیں! یہ بھی کیسی ستم ظریفی ہے کہ بعد میں اُسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا!

بہر حال کچھ دوسرے عوامل بھی تھے اور بہت زیادہ بنیادی نوعیت کے جو زیادہ تر کرپس مشن کے وقت سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ تھے۔ ویول کی اسکیم ایک قابل ستائش اقدام تھا، اپنے مثبت مشمولات کے لحاظ سے بھی اور وقت کے لحاظ سے بھی! مگر جناح کے ذریعے پیدا کی جانے والی رکاوٹ کرپس مشن کے بعد کی تبدیلیوں کا مظاہرہ تھی جن کا ذکر ہم اس طرح کرتے ہیں کہ کرپس کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نمائندگی کی برابری کی رعایت دیے جانے کے نتیجے میں غیر متوقع واقعات سامنے آئے: اس سے جناح کے دو قومی نظریے کو عملی جواز مل گیا تھا۔ اس لیے ان کا یہ مطالبہ کہ مجوزہ نئی کونسل کے لیے صرف اور صرف مسلم لیگ ہی مسلم ممبروں کو نامزد کر سکتی ہے، ان کی اس منطق کا زائیدہ تھا کہ صرف مسلم لیگ ہی اس 'مسلم قوم' کی واحد آواز ہے۔ بہر حال یہ حد سے متجاوز مطالبہ تھا، جس کے اثرات دور تک جاتے تھے، اور اس سے ہندوستان کے موجودہ سیاسی پلیٹ فارم پر نا قابل برداشت بوجھ پڑ رہا تھا اور کانگرس پارٹی کی ساکھ کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ پھر یہ کہ جب سب کچھ پہلے ہی مان لیا گیا تھا تو پھر کانگرس کے اپنے نمائندے نامزد کرنے کے حق پر جناح کو ویٹو حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی تھی۔ اس وجہ سے پنجاب کے گورنر سر برٹرینڈ گلینسی سے جناح کا مطالبہ' کافی واہیات' قسم کا تھا کیوں کہ صرف سندھ اور آسام (جہاں مخلوط وزارتیں مستحکم حالت میں تھیں) میں ہی لیگ کی وزارتیں تھیں۔ دوسری طرف یونینسٹ پارٹی کے لیے جو اس وقت پنجاب میں برسر اقتدار تھی یہ بات واضح نہیں تھی کہ اصل مقصد سے ہٹ کر سیاسی اہمیت کی راہ اپنانے پر کانگرس کو کیوں اور کس طرح خوشی منانی چاہیے۔ یہ سوال بھی اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا مسلم لیگ کا یہ دعوا کہ وہی تمام مسلمانوں کی واحد ترجمان ہے۔ بہر حال جناح کا دعوا نا قابل قبول تھا۔ جسے مسلسل چیلنج کیا جاتا رہا۔ اس طرح کانگرس کے اس وعدے کو کہ پورے ہندوستان میں وہی سب کی نمائندگی کرتی ہے، اس لئے نہیں مانا جا سکتا تھا اپنی ایکزیکیٹیو کی تشکیل نو کرنا اور ایسا مسلم لیگ کے بغیر کرنا ویول کے لئے ممکن نہیں تھا چرچل کی حکومت نے اس کی شملہ پہل کو اس یقین دہانی پر منظوری دی تھی کہ مجوزہ تشکیل نو کی کارروائی تمام فریقوں کے مکمل اتفاق رائے سے ہی آگے بڑھائی جائے گی: اس کی دلیل فرقہ وارانہ اختلاف رائے کے لئے گنجائش پیدا کرنے پر مبنی تھی۔ اس وقت اگر ایلی اقتدار

میں ہوتا تو وہ عدم نمائندگی یا جماعتوں کی نامکمل نمائندہ حیثیت کے بارے میں مشکوک ہونے پر ایسی ایگزیکٹیو (یعنی وزارت) کو ہی مسترد کر دیتا جس میں ہندو کانگرس کو زبردست غلبہ حاصل ہوتا۔ اگر پارٹی لیڈران میں عبوری مخلوط حکومت پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا یا وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے تو ان کے اپنے اپنے دعوؤں کی جانچ پڑتال انتخابی تائید کے لیٹمس (LITMUS) سے کی جاتی۔ اس کا مطلب تھا انتخابات جو جلد ہی آ گئے۔

سیاست سے کانگرس کی غیر حاضری کے برسوں کے دوران لیگ کو کافی فائدہ ہوا تھا اور اسے ایک بڑی کل 'ہند پارٹی' کی حیثیت حاصل ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس وقت وہ چند صوبوں میں اقتدار میں بھی تھی۔ 1937 سے اس کی ایک بڑی کامیابی یہ رہی تھی کہ مضبوط صوبائی تنظیمی اکائیوں کے ذریعے اس نے ایک موثر تنظیم تیار کر لی تھی۔ ایک انگریزی روزنامہ شروع کر دیا تھا' نیشنل گارڈس کا ایک منظم کیڈر کھڑا کر لیا تھا اور امکانی 'پاکستانی' علاقوں میں تعلیم اور اقتصادی ترقی کے منصوبوں میں تال میل کے لئے تنظیم اور ادارے قائم کیے جا رہے تھے... یہ سب ہر لحاظ سے فائدے کی باتیں تھیں: ایک مسلم قوم کے لئے جناح کے مسلسل دعوے، اور اس دعوے کے تسلیم کیے جانے تک ہر طرح کی پیش رفت روک دینے کی ان کی صلاحیت کو، ویول نے کم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بہر حال جناح تب تک گفت و شنید کے دوران 'دو قومی نظریے' پر چابک دستی کے ساتھ زور دے کر ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو کانگرس اور مسلم لیگ جیسے دو گروپوں میں تقسیم کر دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور اس طرح انہوں نے برطانیہ کے موجودہ تعصبات کا وزن بڑھا کر ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کے لئے ایک آواز حاصل کر لی۔ جو انہیں محض ممبران کی تعداد کے ذریعے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

کرپس مشن کے وقت جناح کو اس کے لئے تیار کر لیا گیا تھا کہ لیگ مرکزی حکومت میں حصہ لے گی حالاں کہ اس وقت اس کی حیثیت محض حزب اختلاف کی تھی جو کہ مسلم اکثریت والے کسی بھی صوبے میں حکومت نہیں کر رہی تھی۔ بعد میں انہوں نے انہی صوبوں کو پاکستان میں شامل کرنے کا دعوا کیا۔ اس وقت جناح کو ایسا کوئی یقین نہیں تھا کہ مسلم اکثریت کے یہ صوبے کبھی یونین آف انڈیا سے الگ ہو، لیکن محض پاکستان کی، یا سیدھے طور پر اُس کے اصول نہ کہ کسی مختلف سرزمین کی پیش کش نے، مسلمانوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے ایک طاقتور مقناطیس کا کام کیا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے آئینی تعطل سے جناح اور لیگ کو اپنی تنظیم کو مضبوط کرنے، اپنے فرقہ وارانہ نظریے کو پھیلانے اور لیگ کے اثرات کو طاقتور بنانے کے لیے تین انمول سال مل گئے۔ 1942 اور 1945 کے درمیان ہندوستان کی سیاسی صورت حال میں بھی تبدیلی آئی، کیوں کہ ان تین برسوں میں لیگ صوبۂ سندھ، بنگال، صوبۂ سرحد اور یہاں تک کہ ہندو اکثریت والے صوبۂ آسام میں بھی حکمراں پارٹی کی حیثیت حاصل کر گئی۔ اس کے علاوہ سرحد اور آسام دو ایسے صوبے تھے جہاں اس سے پہلے کانگرس حکومت کر چکی تھی۔ جناح نے پاکستان کے لیے جن صوبوں کا دعوا کیا تھا ان میں صرف پنجاب بالکل الگ تھا۔ اگر جناح کو پنجاب میں اقتدار حاصل ہو گیا ہوتا، تو وہ شاید ویول کی اسکیم کو قبول کر لیتے، اور ایسا ہونے پر بھی وہ کرپس کی مقامی متبادل کی پیشکش کی از سر نو وضاحت سے کہیں زیادہ کا مطالبہ کرتے۔ اب جناح کو کسی قدر معقولیت کے ساتھ ایک ایسے

پاکستان کی امید ہوگئی تھی جس میں مسلم اکثریت کے سارے صوبے شامل ہوں، اور وہ بھی تب کہ رائے شماری کے ذریعے ایسا کرنا ضروری ہوجائے۔

کانگرس رہنماؤں کے قید ہونے کی وجہ سے کانگرس کی سرگرمیاں بالکل بند ہوگئی تھیں جس سے بلاشبہ اس عرصہ کے دوران پورے ملک میں کانگرس پارٹی کا کام بری طرح متاثر ہوا تھا اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ ہندوستان کی سیاست کا آئندہ کالائحہ عمل بھی درہم برہم ہوگیا تھا۔ اس کے نتیجے میں لیگ کی بڑھتی ہوئی سیاسی اہمیت کے سلسلے میں جناح کا غیر حقیقی احساس یقیناً بڑھ گیا تھا۔ اس گمراہ کن 'کامیابی' کا ایک اور نتیجہ بھی سامنے آیا جس نے اس بات کو یقینی بنا دیا کہ ایک علاحدہ اور خود مختار 'مسلم قوم' کے مطالبے کو اب آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہرحال جب 1946 میں لیبر پارٹی کے کابینہ مشن کے ذریعے مذاکرات پھر سے شروع ہوئے تو، لیگ کے بڑھے چڑھے مطالبات کی حقیقت سامنے آگئی کیوں کہ ایک علاحدہ ملک کے لیے اس کے دعووں کو غیر منقسم ہندوستان میں مسلم اکثریت کے دو سب سے بڑے صوبوں، پنجاب اور بنگال کے محض مسلم اکثریت والے علاقوں میں ہی قابل عمل پایا گیا تھا۔ اس طرح ان دونوں صوبوں (پنجاب اور بنگال) کی عملی تقسیم، لیگ کے ایک مسلم پارٹی کی شناخت حاصل کرنے کا منطقی اور ناگزیر نتیجہ تھی۔ یہ خاص طور پر کرپس مشن کی ناکامی کے بعد 1940 کی دہائی کی غیر حقیقی سیاسی دنیا تھی۔

1942 میں ہندوستانی پارٹیوں کے ذریعے کرپس کی پیشکش کا مسترد کردیا جانا ایک غلطی تھی کیوں کہ بلاشبہ اس کی وجہ سے ملک کی تقسیم میں مدد ملی۔ یہ بات کہ کرپس مشن ہندوستان کی تحریک آزادی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے لیبر حکومت کی ایک پہل تھی اور واضح کہ اس کا مقصد ہندوستان کو متحد رکھنا بھی تھا، کنزرویٹو پارٹی (ہندوستانیوں نے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں) نے اس مشن کو ناکام کردیا جس کے نتیجے میں ہندوستان میں مرکز میں ایک قومی حکومت کی تشکیل ایک غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہوگئی، کانگرس صوبائی سیاست میں مقابلے سے باہر کردی گئی اور جناح کو کل ہند سطح پر مسلمانوں کا واحد ترجمان مان لیا گیا۔ اس سے لیگ کو آئینی عمل کے ذریعے، اس وقت کے مفروضہ پاکستان میں امکانی طور پر شامل ایک کے ماسوا دیگر تمام صوبوں کو اپنے ساتھ ملا لینے کا حوصلہ مل گیا تھا۔ کرپس کی پیش کش جنگ کے زمانے کی کوشش تھی جس کے ذریعے جیسا کہ بعد میں ویول نے بھی مانا، مرکزی حکومت کو کانگرس۔ لیگ تعاون کی حوصلہ افزائی کرنے والے ایک وسیلے کے استعمال کرکے اس رجحان کو روکا جاسکتا تھا۔ بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ جب لیبر پارٹی اقتدار میں آئی تو اقتدار کی منتقلی کی اصل اسکیم قابل عمل نہیں رہ گئی تھی۔ جس پہل کی داغ بیل سات سال قبل کرپس کے کنٹری ہاؤس میں نہرو کے ساتھ تبادلہ خیال میں ڈالی گئی تھی وہ مئی 1945 کے آتے آتے اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ ایٹلی ہندوستان کے مسائل کا ایک مختلف حل چاہتا تھا۔

1945 میں برطانیہ میں لیبر پارٹی الیکشن جیت گئی، کلیمنٹ ایٹلی کو وزیراعظم کا حلف دلایا گیا جس سے

ہندوستان میں جلد ہی کسی تصفیے کی امیدیں بڑھ گئیں۔ اس کے بعد اگست 1945 میں جاپان کے ہتھیار ڈال دینے سے ان امیدوں کو مزید تقویت ملی، مگر اس کے ساتھ رونما ہونے والے دوسرے واقعات اتنے حوصلہ افزا نہیں تھے۔ آنے والے چند ہفتے مواقع کو نظر انداز کر دینے کی مثال گئے اور اس طرح غلط فیصلوں کا بوجھ ایک بار پھر غیر منقسم ہندوستان کے بے چارے عوام کے کاندھوں پر ڈال دیا گیا۔

جناح نے برطانیہ میں ہونے والی اس سیاسی تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، لیکن انہوں نے لیگ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ بلا کر ایک قرارداد منظور کرائی جس کے ذریعے ہندوستان میں جلد سے جلد انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جناح کے نقطہ نگاہ سے، اب سب سے اہم بات یہ تھی کہ انتخابات کے ذریعے یہ ثابت کر دیا جائے کہ پورا مسلم فرقہ اب مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ ایسا کرنا اس لئے اہم تھا کہ صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلم نمائندگی کے لحاظ سے جناح کے دعووں سے میل نہیں کھاتی تھی اور لیگ کے مخالفین اسمبلی کی تقریباً ہر بحث میں ان کے اس اصرار کو چیلنج کرتے تھے کہ سارے مسلم فرقے کی بصرف وہی نمائندہ کرتے ہیں۔

شملہ کانفرنس کے بعد، حکومت اور کانگرے کے درمیان صلاح مشورے یا خود کانگرس کے اپنے ہی لیڈروں کے درمیان صلاح مشورے کی وجہ سے اگلے دو ماہ تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ کانگرس، صوبوں کی حکومتوں میں واپس آ جانا چاہتی تھی، اس کا مطالبہ کرنے سے جھجک رہی تھی، اس امید پر کہ شملہ کانفرنس کے بعد خود ویول ہی اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے، لیکن چوں کہ رسمی یا غیر رسمی طریقہ پر ویول کے ساتھ کوئی رابطہ قائم نہیں رکھا گیا تھا، اس لیے انہوں نے نہ تو اپنی سوچ کے بارے میں کانگرس کو کچھ بتایا اور نہ ہی کسی طرح کی پہل ہی کی۔ اس کے بعد اگست 1945 کے اواخر میں ویول برطانیہ کی نئی حکومت کے ساتھ صلاح مشورے کے لیے لندن گئے مگر ایک ماہ بعد، ستمبر میں واپس آ گئے۔ اس کے فوراً بعد ہی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا؛ تبھی یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ان انتخابات کے بعد خود حکومتی کے لیے اور آئین ساز اداروں کی تشکیل کے لیے قدم اٹھائے جائیں گے۔ صوبوں میں پھر سے حکومت سنبھالنے کے لیے کانگرس کے پاس اب کوئی امکان نہیں رہ گیا تھا؛ ہونے والے انتخابات کے ماحول میں تو ہرگز نہیں! اس طرح گنوا دیا گیا یہ ایک دوسرا موقعہ تھا۔ اگر شملہ کانفرنس کے فوراً بعد کانگرس کے صدر نے وائسرائے سے ملاقات کر لی ہوتی لکھ کر بتا دیا ہوتا کہ کانگرس اُن صوبوں کی حکومتوں میں لوٹنا چاہتی ہے جہاں وہ اس سے پہلے کا الیکشن جیتی تھی اور حکومت میں رہی تھی، تو ویول کے لیے انکار کرنا بہت مشکل ہوتا۔ بلکہ درحقیقت وائسرائے اور گورنر 12 کول ویل کے لیے یہ ایک لائق خیر مقدم درخواست ہوتی! بہرحال کانگرس لیڈر جو کہ شملہ کانفرنس کے بعد دل برداشتہ تھے، وقت ضائع کیے بغیر، احتجاج اور راستے پر واپس آ گئے؛ ہندوستان کے تبدیل شدہ حالات کا کچھ بھی لحاظ کئے بغیر! ویول نے، جو بیشتر بڑے کانگرسی لیڈروں کے اس طرز عمل سے کافی جزبز تھے، اس احتجاج کو تقریباً ان ایجی ٹیشنوں کو غداری قرار دیا 13 اس کے بعد صوبائی قانون ساز اداروں کو تحلیل کر دینے کا فیصلہ سامنے آیا جو اگست 1945 میں گورنروں کی کانفرنس میں کیا گیا تھا۔ یہ انتخابات جلد ہی کرائے گئے۔

1946 کے انتخابات

تقریباً اکتوبر 1945 سے لے کر مارچ 1946 کے آس پاس، کیبنٹ مشن کی آمد تک، ہند- برطانیہ سیاسی اقدامات کے سلسلے میں بہت کم پیش رفت ہوئی۔ ہندوستان کسی انتظار میں تھا، مگر ملک کی سیاسی برادری، خوابیدہ حالت میں نہیں تھی کیوں کہ انتخابات کے اعلان نے زبردست بحث ومباحثے اور غور وفکر کی فضا پیدا کردی تھی۔ اب مستقبل کا دارومدار، ایک خاص حد تک، ان انتخابات کے نتائج پر تھا۔ مسلم لیگ نے اعلان کردیا کہ وہ صرف ایک ہی نعرے، پاکستان، پر ہی الیکشن لڑے گی۔ جناح نے تمام مسلم ووٹروں سے ذاتی طور پر اپیل کی کہ وہ انفرادی امیدواروں کو نظرانداز کردیں اور انہیں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے ووٹ دیں نیز یہ بھی کو ان کے (مسلم لیگ) امیدواروں کے حق میں ووٹ پاکستان کی تشکیل کے حق میں ووٹ ہوگا۔

پہلی پولنگ مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے کرائی گئی۔ اس پولنگ کے نتائج کا اعلان دسمبر 1945 تک کردیا گیا۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے 90 فیصد ووٹ حاصل کر کے تمام مسلم نشستیں جیت گئی۔ کانگریس کو انتخابی کامیابی ہندو (عام) حلقوں میں حاصل ہوئی جہاں اس نے حمایت حاصل کرنے کی 62 میں سے 57 سیٹیں جیت لی تھیں۔ 'واحد نمائندہ ہونے پر جناح کے اصرار کو قائم رکھنے کے لیے مسلم جنگ مسلم لیگ فیصلہ کن طریقے پر جیت گئی تھی۔ اس کے بعد جناح کے نعرے پر، مسلمانوں نے 11 جنوری 1946 کو ملک بھر میں یوم فتح منایا۔

اس کے بعد صوبائی اسمبلیوں کے لئے انتخابات کرائے گئے۔ 14 مسلم لیگ اس مرتبہ بھی، سرحد کے علاوہ تمام صوبوں میں فتح مند رہی۔ ضمیمہ نمبر 12 میں جدول کی شکل میں دیئے گئے نتائج سے یہی پیغام ملتا ہے کہ مسلم ووٹروں پر مسلم لیگ کی گرفت اب ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہو چکی تھی۔ پنجاب میں مختلف پلیٹ فارموں سے جیتے 11 ممبران میں سے چار نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ مسلم لیگ نے ناقابل تردید انداز یہ انتخابی ثبوت پیش کردیا تھا اُسے اس مسلمانوں کی غالب اکثریت کی حمایت حاصل ہے جس کے بارے میں وہ ''بلاشرکت غیرے اپنا'' ہونے کا دعوا کرتی آرہی تھی؟ انتخابات کا عمل مکمل ہوجانے کے بعد پاکستان کے لیے سیاسی رسہ کشی زیادہ زوروشور اور تلخیوں کے ساتھ ایک بار پھر شروع ہوگئی۔

منطقی اور ناگزیر طور پر اگلا قدم وزارت سازی کا تھا۔ اس عمل کے سلسلے میں بھی کئی مشکلات پیدا ہوگئیں، ایک یہ کہ اقتدار میں حصے داری کا کیا طریقہ ہو، یہ ایسے امور تھے جنھیں آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

انتخابی نتائج اور ان کی عددی نوعیت کا ایک سنگین بلکہ بے رخی کا بھی تھا۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے محفوظ سیٹوں میں سے 90 فیصد سیٹیں جیتی تھیں مگر وہ اس کے بعد بھی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل نہیں کرپائی تھی؛ محفوظ کو نے

کے ممبران کی بنیاد پر اقتدار حاصل کر پانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا، یہ لیگ کے لیے پریشانی کی بات تھی، کیوں کہ وہ ایک بار پھر اپوزیشن پارٹی بن گئی۔ سندھ اور بنگال میں گورنر نے سب سے بڑی پارٹیوں کے لیڈروں کو حکومت سازی کی دعوت دی، اس زمرے میں شامل ہونے سے سبب مسلم لیگ کو ان دونوں صوبوں میں مدعو کیا گیا اور جلد ہی مخلوط حکومتوں کو دلا دیا گیا۔ پنجاب میں گورنر برترام گلانسی نے 'سب سے پہلے سب سے بڑی پارٹی'' کے اصول سے انحراف کیا، کسی کو بھی مدعو کرنے میں تاخیر سے کام لیا اور پھر سب سے بڑی پارٹی، یعنی مسلم لیگ کے لیڈر کو حکومت سازی کی دعوت دینے کے بجائے اپنا یہ شبہ ظاہر کیا کہ غیر مسلم پارٹیاں لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت میں شامل بھی ہوں گی یا نہیں؟ گورنر نے پہلے تو یونینسٹوں، اکالیوں اور کانگریسیوں پر مشتمل مخلوط حکومت کے قیام کی حوصلہ افزائی کی اور بعد میں اس کے لیے راستہ بھی ہموار کیا؛ کانگریس اور اکالیوں کے کل ممبران کی تعداد 84 تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد محض 12 تھی جس کی وجہ سے ان پر 'مسلم کاز'[15] سے غداری کا الزام آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ یہ صورت حال اس وقت تھی جب پنجاب اسمبلی کے کل ارکان کی تعداد 175 تھی۔

گورنر نے سب سے پہلے، ممدوٹ[16] کے نواب افتخار حسین خاں کو، جو مسلم لیگ کے رہنما تھے، مدعو نہ کر کے ایک بڑی حکمتی اور آئینی غلطی کی تھی، کیوں کہ مسلم لیگ سب سے بڑی پارٹی تھی۔ اب اس قیاس آرائی کا کوئی زیادہ فائدہ نہیں کہ اگر گلاسی نے ممدوٹ کو حکومت سازی کی دعوت دی ہوئی تو واقعات کا رخ کیا رہا ہوتا، کیوں کہ اقتدار، سے چپکے رہنا سیاست دانوں کی ایک ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ گلاسی کی اس غلط اقدام سے ان لوگوں نے شکوک وشبہات کو مزید تقویت ملی جو سمجھتے تھے کہ باقی ساری دنیا ان کے خلاف سازش کر رہی ہے۔ بحران مزید گہرا ہو گیا؛ بہت سے مفروضات، خاص طور پر اس بارے میں کہ ہندوستان کی اس ''غیر سرزمین'' میں انتخابی جمہوریت کی جڑیں جمتی جا رہی ہیں، اور یہ کہ اقلیتوں کے مفادات کا پورا خیال رکھا جا رہا ہے۔ پوری طرح غلط ثابت ہو گئے۔ اس صورت حال نے سے ماحول کی تلخی اور بڑھ گئی۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کے لیے لیگ کا دعوا اور جناح کے ہاتھ مزید مضبوط ہو گئے۔ ناکامی سے پیدا ہونے والے چڑچڑے پن نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور دونوں فرقوں نیز دونوں پارٹیوں کے درمیان خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔

اتر پردیش میں کانگریس اور مسلم لیگ (46-1945)

یو پی میں 1946 کے انتخابات کے بعد، اس کے باوجود کہ کانگریس کو شہری مسلمانوں کے ایک فیصد سے بھی کم ووٹ ملے تھے (دیہی علاقوں کے مسلمانوں کے زیادہ تر ووٹ اسے ہی ملے تھے)، کانگریس کے ضدی اور اور بے حس رویے میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ کانگریس کو مسلم حلقوں میں کراری شکست ہوئی تھی۔ پھر بھی یو پی کانگریس کی پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور یہ سب گڑھ مکتیشور جیسے بھاینک فسادات کو کے باوجود ہو رہا تھا۔ گڑھ مکتیشور فسادات کی اہمیت ان کے اصل وقوع سے زیادہ اس کے لیے چنے گئے وقت میں مضمر ہے۔ یہ فسادنوا کھالی اور بہار کے بڑے فسادات کے فوراً

بعد ہوا تھا۔ گاندھی سخت دباؤ میں تھے۔ انہوں نے ان فسادات کو کانگرس شبیہ کے لیے ایک بڑا نقصان بتایا تھا۔'' بہاری ہندوؤں کی غلط کاریاں قائداعظم جناح کی اس پھبتی کو صحیح ثابت کرسکتی ہیں کہ کانگرس اپنے اس دعوے کے باوجود کہ سکھ، مسلمان اور عیسائی بھی اس کے ساتھ ہیں، ایک ہندو تنظیم ہے۔'' گڑھ مکتیشور فساد کانگرس کے لیے اس لیے بھی اہمیت رکھتا تھا کہ اس کے دوران اور اس کے بعد کانگرس کے ممبران اسمبلی، مقامی کانگرسیوں بلکہ کانگرس حامی پریس کا عوامی طرز عمل سب کے سامنے آگیا تھا۔ کانگرس کے سرکاری ترجمان نیشنل ہیرالڈ نے یہ دلیل جواز پیش کرنے کی کوشش کی کہ نوا کھالی کے قتل عام نے ایک طرح سے گڑھ مکتیشور کے مسلمانوں کے خلاف تشدد کے لیے اشتعال کا کام کیا تھا۔

ہمیں ان دونوں فرقوں کے اس الگاؤ کے اس پہلو کا اور زیادہ گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہی وہ مرکزی نوعیت کا سوال ہے جو اس وقت، ملک کو درپیش تھا۔ جیسا کہ ایچ ایم سیراوی نے تبصرہ کیا ہے: 'جمہوریت محض اکثریت کی تائید سے حکومت کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس سے ایک ایسی حکومت مراد ہوتی ہے جسے عوام کا وسیع تر اعتماد حاصل ہو؛ ایسا کوئی بھی نظریہ، جس کی ساری بنیاد محض سروں کی گنتی پر ہو،17 نہ تو اکثریتی جبر کے خلاف کسی طرح کا تحفظ فراہم کرسکتا ہے اور نہ ہی حکومت میں اقلیتوں کے لیے کسی طرح کی جگہ، اہمیت اور حصہ فراہم کرسکتا ہے اور یہاں اقلیتوں سے محض مذہبی اقلیت ہی نہیں بلکہ سیاسی اقلیت بھی مراد ہے۔' اس لیے ہمیں اب دہلی کا رخ کرنا چاہئے جہاں مولانا آزاد نے گاندھی کے نام اپنے 6 اگست 1945 کے مکتوب میں اس پیچیدہ صورت حال کے سلسلے میں ایک ذاتی نوعیت کے حل کی پیشکش کی تھی۔

یہ مکتوب اور گاندھی کا جواب، دونوں ہی حکومت نے پکڑ لیے تھے جنہیں بعد میں ایوان جنکنس نے 25 اور 28 اگست 1945 کو وائسرائے کے سکریٹری ایبل کے پاس بھیج دیا تھا۔ چوں کہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اس خط کا مکمل طور پر مطالعہ کیا جائے، میں اس کے متن کو یہاں پیش کررہا ہوں جو- ٹرانسفر آف پاور جلد 14، صفحہ 57-155 پر موجود ہے۔

68

سرای جینکنس کا تار جناب ایبل کو ویول پیپرز پالیٹکل سیریز جولائی- ستمبر، 1945

ضروری

خفیہ

25 اگست 1945

1- نمبر S-1394، جینکنس کی طرف سے ایبل کے لیے۔ میں نے ہاتھ آنے والی اسکیم کی نقل ابھی ابھی دیکھی ہے... آزاد کا کہنا ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ تمام مسلم تنظیموں کو مکمل طور پر باہم منظم ہوجانا چاہئے اور آئندہ

کے آئین کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔اس کے بعد کانگرس کو یہ فیصلہ قبول کر لینا چاہئے اور ان مسلم تنظیموں کے ساتھ مل کر اس پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہئے ...

-2 ... مسلمان خوف زدہ ہیں، اور ان کے اس خوف کو ایک ایسی اسکیم وضع کر کے دور کیا جا سکتا ہے جس کے تحت وہ خود کو محفوظ سمجھ سکیں۔ ایک ہی پارٹی کی حکومت بنانے کی ہر کوشش ناکام ہو جائے گی۔ تقسیم بھی اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے گی، جو خود مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ آزاد، تقسیم کو ایک شکست خوردگی والی پالیسی سمجھتے ہیں اور اسے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے۔

-3 اس کے بعد میمورنڈم میں درج ذیل سرسری خاکہ دیا گیا ہے:

شروع ہوتا ہے (الف) ہندوستان کا آئندہ آئین ہر حال میں وفاقی ہونا چاہئے جس میں شامل اکائیاں مکمل طور پر خود مختار ہوں، جس میں کل ہندنوعیت کے امور کو ہی 'مرکزی' امور کی حیثیت حاصل ہو اور ان پر وفاق پر شامل تمام اکائیوں کا مکمل اتفاق رائے ہو

(ب) اکائیوں کو وفاق سے الگ ہو جانے کا اختیار حاصل ہو،

(ج) مرکز اور صوبوں میں مشترکہ حلقہ انتخاب ہو اور سیٹوں کا ریزرویشن اور ایسی تفریقی رائے دہی ہو جو رائے انہوں کے ذریعے فرقوں کی تعداد کی صحیح عکاسی کے لیے ضروری سمجھی جا سکتی ہو!

(د) مرکزی اسمبلی اور مرکزی ایگزیکٹیو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت تک برابری ہو جب تک فرقہ وارانہ شکوک وشبہات دور نہ ہو جائیں اور جماعتوں کی تشکیل معاشی اور سیاسی بنیادوں پر نہ ہو جائے۔

(ہ) ایسا کنونشن (دستور) ہونا چاہیے جس کے ذریعے ہندوستانی وفاق کا سربراہ باری باری سے ہندو اور مسلمان ہو! (ختم)

-4 ....

-5 میمورنڈم کا اختتام آزاد کے ہندو دوستوں کے نام اس اپیل سے ہوتا ہے کہ "ہندوستان کے مستقبل کے آئین میں ہندوؤں کی حیثیت کے معاملے کو پوری طرح سے مسلمانوں پر چھوڑ دیا جائے۔"

-6 ....

سرای جینکنس کا تار جناب ایبل کو ویول پیپرز پالیٹکل سیریز جولائی - ستمبر، 1945

28 اگست 1945

اہم

نجی

خفیہ

نمبر-1420S-جینکنس کی طرف سے ایبل کے لئے، میرا ٹیلی گرام نمبر، 1394S، مورخہ 25 اگست۔ گاندھی کی طرف سے آزاد کے نام خط مورخہ 16 اگست کا متن درج ذیل ہے۔

(شروع) آج آپ کا خط موصول ہونے پر میں نے درج ذیل تار بھیجا:

'میرے خیال میں آپ کا مراسلہ شائع نہیں کیا جانا چاہیے۔ اب تفصیل پیش ہے۔

میں آپ کے خط سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرتا کہ آپ میرے ہندوؤں کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ آپ کے دل میں جو بھی ہو، وہ آپ کی تحریر میں واضح نہیں ہے۔ مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جب دوبارہ ملیں گے، اگر آپ چاہیں گے تو، اس بارے میں بات کریں گے۔ آپ فرقہ وارانہ مسائل کے بارے میں جو بھی کہنا چاہتے ہیں وہ ورکنگ کمیٹی کے ساتھ صلاح مشورے کے بغیر نہیں کہنا چاہئے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ خاموشی اختیار کرنا ہی اچھا ہوگا۔ پارٹی آپ کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد اپنی رائے دے سکتی ہے۔ انہیں ایسا کرنے کا حق ہے۔ ایسا کرنا ان کی ذمے داری بھی ہے۔ میرا خیال آپ کے خیال سے میل نہیں کھاتا........ان سب باتوں پر گہرائی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں جلد بازی میں کوئی بھی قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا! (ختم)

(نقل ڈاک کے ذریعے پہنچ رہی ہے۔ یہ آزاد کے لیے زیادہ حوصلہ افزا بات نہیں ہے۔ سرجان کول ویل اسے دیکھ چکے ہیں 18)۔

مولانا آزاد نے پاکستان کو مسلم مفادات کا منافی قرار دیتے اور اس کے مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے یہ خط بڑے دکھ کے ساتھ لکھا تھا؛ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ 'پاکستان کو تسلیم کرنا غلط تھا، یہ شکست خوردگی کی علامت تھا' اور یہ کہ مسلمانوں کے خوف اور خدشات کو بھی دور کرنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ خدشات حقیقی نوعیت کے تھے۔ اسی لئے ہی مولانا نے ایک ایسے وفاق کی تجویز رکھی تھی ''جس میں مرکز کا اختیار صرف مرکزی نوعیت کے امور پر ہوگا، اکائیوں کو وفاق سے الگ ہو جانے کا حق حاصل ہوگا؛ مشترک حلقہ انتخاب ہوگا، تحت مرکزی اسمبلی اور مرکزی ایگزیکٹیو، 19 دونوں میں ہی سیٹوں کا ریزرویشن ہوگا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابری ہوگی۔'' جیسا کہ دستاویزات میں شامل ہے، گاندھی نے مولانا صاحب کو ٹیلی گرام بھیج کر ان خیالات کو عام نہ کرنے کے لیے کہا تھا، کم سے کم اس وقت تک تو ہرگز نہیں ''ہم جب تک کہ ان پر غور نہ کر لیں۔''

بعد میں ہمیں اس موضوع کی طرف آنے کا موقع ملے گا۔ لیکن واضح طور پر اب نئی پہل ضروری تھی، یہ پہل کیبنٹ مشن کی شکل میں کی گئی۔

کیبنٹ مشن

اس وقت کے سماجی اور سیاسی حالات کی وجہ سے بے عملی کا شکار ہونے سے بچنے نیز دونوں فرقوں کے درمیان پُل بنانے اور اس آخری مرحلے میں بھی کسی متفقہ تصفیے پر پہنچنے کے لئے، وزیر اعظم ایٹلی نے 19 فروری 1946 کو برطانیہ کے دارالعلوم میں، کیبنیٹ مشن کی تشکیل کا اعلان کیا۔ وزیر خارجہ برائے ہندوستانی امور لارڈ پیتھک لارنس کو اس مشن کا سربراہ، بورڈ آف ٹریڈ کے صدر سر اسٹیفورڈ کرپس اور فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی اے-وی الیکزنڈر کو رکن بنایا گیا تھا۔ یہ برطانیہ کے ذریعے ہندوستان بھیجا جانے والا اب تک کا سب سے اعلا سطحی گروپ تھا۔ یہ مشن ساڑھے تین ماہ ہندوستان میں رہا، اس کو گفت وشنید کے لئے کُھلی اختیارات دیے گئے تھے اور اسے تاج برطانیہ کی تائید بھی حاصل تھی!

اس مشن کو 'آزاد ہندوستان کے لیے ایک نیا آئین وضع کرنے' کے اصولوں اور طریقوں کے بارے میں لیڈروں کے درمیان اتفاق رائے پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔

24 مارچ 1946 کو یہ مشن نئی دہلی پہنچا۔ سر تیج بہادر سپرو کے بقول "... جہاں تک جناح کے اس مطالبے کا تعلق ہے کہ آئین سازی کے لئے دو ادارے ہونے چاہئے، میں اس کا سخت مخالف تھا۔ چناں چہ میں نے ان سے ایک واحد قانون ساز ادارے کی تشکیل کی درخواست کی۔" سر اسٹیفورڈ کرپس نے (مشن کے ایک رکن کے طور پر) یہ تجویز رکھی کہ کبھی کبھی بات رکھنے کے لئے کوئی فارمولا وضع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں صاف صاف اعتراف کیا کہ وہ جناح کو شرمندگی سے بچانا چاہتے تھے۔ اس کی تجویز تھی کہ قانون ساز ادارہ ایک ہی ہونا چاہئے جو دو حصوں میں تقسیم ہو جس میں سے ایک حصہ ہندوستان اور اسے ایک مرکز فراہم کرنے کے لئے اور دوسرا پاکستان اور اسے ایک مرکز فراہم کرنے کے لئے ہو اور یہ کہ دونوں حصوں کی ایک ساتھ میٹنگ ہو، اور دونوں حصوں کے لئے ایک اعلا مرکز (Super centre) فراہم کیا جائے تو دفاع، امور خارجہ اور دوسرے مشترکہ امور انجام دے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان دونوں مرکزوں میں ٹکراؤ ہو جانے کی صورت میں، کوئی ایسی طاقت نہیں ہوگی جو ان کے درمیان مصالحت کرا سکے، اور یہ کام تو نام نہاد اعلا مرکز اعلا کے ذریعے ہرگز نہیں کرایا جائے گا .... واضح طور پر کیبنیٹ مشن کا کام آسان نہیں تھا۔ اور یہ کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کرانا، وہ بھی ایسے وقت میں، جب سر تیج بہادر سپرو جیسے لبرل لیڈر بھی حقیقی نوعیت کے وفاقی نظام کے لئے رضامند ہونے والے نہیں تھے۔

لیگ کا اب یہ مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو بھی خود مختاری حاصل ہونی چاہئے۔ کیبنٹ مشن نے

بات چیت کے دوران جناح کو مطلع کیا کہ اقتدار صرف ایک ہی جماعت کو منتقل کیا جا سکتا ہے، اس لئے ہندوستان میں دو مرکزوں کا قیام آئینی قانون اور عمل کے تحت، ممکن عمل نہیں ہے۔ مشن نے جناح کی توجہ سلامتی کے اسباب کے تحت ایک ہی مرکز کی ضرورت کی طرف مبذول کرائی۔ 16 اپریل 1946 کو دوبارہ بات چیت کے دوران جناح نے مشن کے سامنے اعلان کیا کہ ہندوستان کا اتحاد محض ایک واہمہ ہے۔ اس سے پہلے وہ سر اسٹیفورڈ سے یہ کہہ چکے تھے کہ زندگی کے بارے میں مسلمانوں کے تصورات ہندوؤں سے مختلف ہیں، اس لئے تقسیم کے سوا مسئلہ کا کوئی دوسرا حل نہیں ہے۔

اس طرح کے صلاح مشورے کے دوران، جناح نے 10 اپریل 1946 کو مسلم ممبران اسمبلی کی میٹنگ بلائی اور ان سے 'آزاد مملکت پاکستان' کا مطالبہ کرنے کے لئے قرارداد منظور کرائی۔ اگرچہ کانگریس سہہ سطحی زمروں پر مبنی آل انڈیا یونین' پر راضی ہونے والی نہیں تھی لیکن اس نے (اب) یہ تسلیم کر لیا کہ مرکزی حکومت کی نوعیت وفاقی اور یہ کہ صوبائی اکائیوں کو اور زیادہ خود مختاری حاصل ہونی چاہیے۔ دوسری طرف مسلم لیگ مکمل طور پر علاحدہ، خود مختار مملکت پاکستان کے مطالبے پر قائم تھی اور اس اصول کو پیشگی طور پر تسلیم کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی اور اس کے قانون سازی کے لئے دو الگ الگ ادارے چاہتی تھی۔ باہم متصادم مقاصد کی یہی رکاوٹ تھی جسے کیبنٹ مشن کو کسی طرح کی لغزش کے بغیر ہی پار کرنا تھا۔ اس اس نے بارے میں آگاہی کرپس نے دی تھی کہ اپنی انتظامی اہلیت کے لئے اتنا مشہور نہیں تھا۔

جب کیبنٹ مشن سری نگر (جموں وکشمیر) کے دورے سے 24 اپریل کو دہلی لوٹا تب تک بھی کسی فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا جب کہ افواہیں یہ تھیں کہ مشن اعلان کر دے گا۔ چناں چہ گرمی موسم کے ساتھ ساتھ بے چینی اور بے صبری بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس بگڑتے ماحول میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو شملہ آنے کی دعوت دی گئی جہاں ایک کانفرنس ہونے والی تھی جس میں مشن کی رائے کو جانچ پرکھ کے لئے سامنے رکھا جانا تھا اور پھر اُسے ایک سمجھوتے کی شکل دی جانی تھی۔ اس میں کانگریس اور لیگ کی طرف سے چار چار نمائندوں کو شرکت کرنی تھی۔ شملہ میں کانگریس کی نمائندگی کرنے والوں میں مولانا آزاد اور بادشاہ خان بھی شامل تھے۔ انہیں جان بوجھ کر شامل کیا گیا تھا تا کہ اس بات پر زور دیا جا سکے کہ جناح ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کی بات نہیں سوچ سکتے نیز یہ اس بات کا بھی واضح اشارہ تھا کہ کانگریس اس معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرے گی۔

5 مئی 1946 کو کیبنٹ مشن نے شملہ کی دوسری کانفرنس میں ایک نئی اسکیم کے ذریعے سفارش کی کہ ہندوستان کے مجوزہ آئین ایک ایسا نظام ہونا چاہئے جسے کسی بہتر فقرے کی ناموجودگی میں گروپنگ (Groupings) کا نام دیا گیا تھا۔ دراصل یہ تجویز قانون کے ماہر اور بال کی کھال نکالنے والے، کرپس کے ذہن کی اپج تھی۔ تراش خراش کے بعد اس کے لوازمات سامنے آنے پر یہ ایک پر پیچ اسکیم ثابت ہوئی۔ گروپنگ (Groupings) کا یہ خیال 5 مئی 1946 کو تجویز کیے جانے کے وقت سے 6 دسمبر 1946 کو ایٹلی کی صدارت میں لندن کی آخری کانفرنس کے وقت

تک ایک رکاوٹ بنا رہا جو اس کے نا قابل عمل ہونے کا ثبوت تھا۔ اس کے بنیادی نکات درج ذیل تھے:

1- یہ کہ ایک کل ہند یونین ہوگی جس میں برطانوی ہندوستان اور ریاستیں، یعنی دونوں ہی شامل ہوں گے جو کہ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کو کے امور انجام دیں گی (اس میں 'کم سے کم' کی شرط منتقلیٔ اقتدار کی دستاویز کے عین مطابق ہے)۔

2- یہ کہ برطانوی ہندوستان کے صوبے تین گروپ میں تقسیم کئے جائیں گے، ان کا شمار تہجی ترتیب کے مطابق ہوگا، اور ان میں وہ صوبے شامل ہوں گے جن کا ذکر ہر گروپ کے مقابل کیا گیا ہے:

(گروپ اے)-مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی، اور اڑیسہ؛
(گروپ بی)-پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان؛
(گروپ سی)-بنگال اور آسام۔

3- گروپوں کی ساخت اس بات سے مشروط ہوگی کہ نیا آئین اختیار کیے جانے پر ہر صوبے کو فوراً ہی اپنا گروپ تبدیل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس کے بعد یہ اختیار دس برس گزر جانے کے بعد حاصل ہو سکے گا۔ ہر گروپ جن امور کو گروپ کے موضوع کے طور پر اختیار کرنا چاہے گا، ان امور کو طے کرے گی، اور یہ امور گروپ کے ارکان کے لیے قانونی ذمہ داری کی حیثیت حاصل کرلیں گے۔ باقی امور اور تمام بقیہ اختیارات متعلقہ صوبے کے پاس رہیں گے۔

4- ان تینوں (اے بی سی) گروپوں کے لئے اس کے بعد علاحدہ قانون ساز اسمبلیاں قائم کی جائیں گی، ہر گروپ کے قانون ساز اپنے گروپ کی آئین ساز اسمبلی میں اپنے چنے ہوئے نمائندے بھیجیں گے۔

5- گروپ آئین ساز اسمبلیوں کے ذریعے صوبوں اور گروپوں کے آئین کا وضع ہو جانے کے بعد ہی کوئی صوبہ اپنی صوبائی قانون ساز اسمبلی کے اکثریتی فیصلے کے ذریعہ اپنا گروپ تبدیل کر سکے گا۔

6- صوبوں اور گروپوں کے آئین کا وضع کر لینے کے بعد تینوں گروپ آئین ساز اسمبلیوں کو ہندوستانی ریاستوں کے 32 نمائندوں کے ساتھ مل کر کل ہند یونین کے دستور وضع کرنا تھا، جس میں بنیادی حقوق اور اقلیتوں سے متعلق دفعات جیسے قومی پہلو بھی شامل ہوتے اور جو کہ پورے ہندوستان پر جائیں گے۔

7- یہ بھی طے پایا تھا کہ یونین قانون ساز اسمبلی میں فیصلے موجود ممبران اور ووٹنگ کی دو تہائی اکثریت سے کئے جائیں گے۔

اس کانفرنس میں شرکاء کے ارادے اور مقاصد کھل کر سامنے آگئے۔ کانگرس کسی طرح کے سمجھوتے کے لئے یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ صرف جناح ہی سارے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور مگر جناح اپنی بات پر اڑے رہے۔ بہر حال وہ وفاقی یونین حکومت کے تصور کو قبول کرنے کے لئے راضی ہوگئے تھے۔ یہ ایک بڑی بات تھی کیوں کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح جناح ایک خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دست بردار نہ ہوتے ہوئے بھی، اس مطالبے کی شدت کو کم کر سکتے ہیں۔ بہر حال انہیں جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ کیبنٹ مشن نے ان کے اس فیصلے کی اہمیت کو قابل لحاظ طریقہ سے تسلیم نہیں کیا ہے...... جناح کو امید تھی کہ اس کے بدلے میں کانگرس 'گروپنگ' کی پالیسی سے کنارہ کش ہو جائے گی، مگر ایسا ہوا نہیں! اس طرح جناح نے کوئی درمیان کا راستہ نکالنے کے لئے کیبنٹ مشن پر تکیہ کیا۔ یہ شملہ کانفرنس کا وہ نازک مرحلہ تھا جب نہرو اور جناح کو بات چیت کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا کہ دونوں کسی تصفیے کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ دونوں لیڈر پھر ملے اور روبہ رو بات چیت ہوئی، مگر دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے۔ جناح ایک یونین حکومت کے لیے راضی ہوگئے ہوتے، مگر ایک واحد قانون ساز ادارے کے لئے نہیں، جیسا کہ کانگرس چاہتی تھی۔ دوسری طرف کانگرس اس بات پر رضامند ہونے کے لئے تیار نہیں تھی کہ ہر گروپ کے لئے علاحدہ ایگزیکیٹو اور اپنا قانون ساز ادارہ ہو جسے ایک گروپ کے طور پر جناح بہت اہم سمجھتے تھے۔

بہر حال اس کے علاوہ اس دوران تین مکتوب کا تبادلہ بھی ہوا جو ہماری توجہ کے طالب ہیں۔ پہلے اپنی اور اپنے رفقائے کار کی طرف سے پیتھک لارنس کے نام مولانا آزاد کا 6 مئی 1946 کا مراسلہ! اس مراسلے کے آخری پیراگراف میں، اس تمام باتوں کو مسترد کر دیا گیا تھا جو مولانا آزاد نے 2 اگست 1945 کو گاندھی کو لکھی تھیں اور جن کے بارے میں مولانا کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اسے شائع اور عام نہ کریں۔ پیتھک لارنس کے نام اپنے مراسلے میں مولانا نے اپنا سابقہ موقف بالکل پلٹ دیا،' اور یہ کہا کہ ہر فرقے اور گروپ کے خدشات اور شکوک وشبہات 'غیر حقیقی طریقہ کار کے ذریعے جو جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے منافی ہو' دور نہیں کئے جاسکتے۔ 20 اس طرح سیٹوں کو محفوظ کرنے اور مسلمانوں کے لئے برابری کی تجویز کو واضح طور پر مسترد کر دیا گیا۔ مولانا آزاد نے ایک بار پھر پیتھک لارنس کو، اس مرتبہ کانگرس کی طرف سے لکھتے ہوئے، اپنی پارٹی کے اعتراضات کو دوہرایا 'ہم ایگزیکیٹو اور اسمبلی، دونوں میں، غیر مساوی گروپوں کے درمیان جیسی برابری کی تجویز کے مکمل طور پر خلاف ہیں۔ یہ ایک غیر ایماندارانہ تجویز ہے جس سے مشکلات پیدا ہوں گی۔ اس طرح کے بندوبست میں ٹکراؤ اور آزادانہ نمو کی تباہی کے تخم موجود ہیں۔ اگر اس بارے میں یا اس جیسے دوسرے کسی معاملے میں مفاہمت نہیں ہوتی ہے تو ہم اس معاملے کو کسی ثالث کے حوالے کر دینے کے لیے تیار نہیں۔ 21 اس سے ایک روز قبل، 8 مئی 1946 کو گاندھی اسٹیفورڈ نام مراسلے کے ذریعے یہ معاملہ اٹھا چکے تھے اور برابری کے معاملے کو ان سخت الفاظ میں مسترد

کر چکے تھے: 'ہندو اکثریت والے چھے صوبوں اور مسلم اکثریت والے پانچ صوبوں کے مابین مشکلات نا قابل عبور ہیں۔ 9 کروڑ (مسلمانوں) کو 19 کروڑ ہندوؤں کے مساوی کس طرح رکھا جاسکتا ہے۔ یہ تو پاکستان سے بھی زیادہ برا مطالبہ ہے۔ اس کی جگہ پر یہ تجویز رکھی جارہی ہے کہ مرکزی اسمبلی کی تشکیل آبادی کی بنیاد پر کی جائے۔ اور اسی طرح ایگزیکٹیو کی بھی!'22

چناں چہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اور دوسری شملہ کانفرنس بھی کسی نتیجے کے بغیر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد 16 مئی 1946 کو کیبنٹ مشن نے ایک وہائٹ پیپر جاری کیا جسے اس نے 'ہندوستان کے آئین کی □ رفتار تشکیل کو یقینی بنانے کا بہترین بندوبست' قرار دیا۔23 کیبنٹ مشن اور وائسرائے، دونوں نے یہ سفارش کی کہ، ہندوستان کے آئندہ آئین کے لئے کچھ مخصوص اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ اس وہائٹ پیپر میں پاکستان کے بارے میں کہا گیا تھا: ہم حکومت برطانیہ سے یہ سفارش نہیں کرسکتے کہ اقتدار، جو اس وقت برطانیہ کے ہاتھ میں ہے، دو مکمل طور پر علاحدہ مقتدر اعلا کی حامل ریاستوں کے حوالے کیا جائے۔ وائسرائے اور وفد، دونوں کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے مجبور کردیا گیا ہے کہ نہ تو بڑی اور نہ چھوٹی مقتدر اعلا ریاست پاکستان فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی قابل قبول حل فراہم کرپائے گی۔24

کیبنٹ مشن کے 16 مئی 1946 کے بیان میں دو منصوبے بھی شامل تھے:۔ ان میں ایک طویل مدتی اور دوسرا قلیل مدتی تھا۔ مشن نے ان منصوبوں کے ذریعے پاکستان کے مطالبے کو مسترد کردیا تھا، اور ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے وفاق کو اسکیم پیش کی تھی اور مجوزہ ہندوستانی یونین کا آئین تیار کرنے کے لئے ایک قانون ساز اسمبلی کی بات کہی تھی۔ طویل مدتی منصوبے میں صوبوں کی تین گروپ بندیوں کی بات شامل تھی: ہندو اکثریت کے صوبے، مسلم اکثریت کے صوبے؛ اور مشرق اور شمال مشرق یعنی بنگال اور آسام پر مشتمل صوبے۔ ہر گروپ کی اپنی اسمبلی اور ہر صوبے کی یا صوبوں کے گروپ کی اپنی منتظمہ ہونی تھی۔ ان گروپوں اور صوبوں کو مجوزہ ہندوستانی یونین سے الگ ہونے کا اختیار حاصل ہوتا۔ قلیل مدتی منصوبے میں ایک عبوری حکومت کی تجویز رکھی گئی تھی جسے فوراً تشکیل دیا جانا تھا۔

مجوزہ آئین ساز اسمبلی کی حیثیت، اس تین سطحی گروپنگ کی نوعیت اور اس کے کاموں نیز عبوری حکومت میں نمائندگی کے سلسلے میں کانگرس اور لیگ کے درمیان اختلافات موجود تھے۔ کانگرس کے نزدیک، مجوزہ آئین ساز اسمبلی کو مقتدر اعلا ہونا چاہئے تھا جبکہ مسلم لیگ کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ تین سطحی بندوبست کے تحت یہ گروپنگ، لازمی قرار دیئے جانے کی صورت میں، کانگرس کے لئے قابل قبول نہیں تھی جب کہ مسلم لیگ کے لئے یہ ایک لازمی شرط تھی۔ کانگرس کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کے لئے برابری کی پیشگی شرط قبول نہیں تھی! جب کہ لیگ کا اس پر اصرار تھا۔

کیبنٹ مشن ہندوستان میں مارچ 1946 تک رہا۔ اس کا منصوبہ بتدریج تیار کیا گیا تھا۔ اب جناح کے سامنے صرف دو متبادل تھے، ایک یہ کہ وہ اپنے مسلم ذیلی وفاقوں کے لئے سارا پنجاب، سارا آسام اور سارا بنگال چاہتے ہیں، تو ایسی صورت میں ایک وفاقی مرکز کو قبول کرنا ہوگا، خواہ اس کی طاقت اور، اختیارات کتنے ہی محدود کیوں نہ ہوں! لیکن اگر اس کے

بجائے وہ ہندوستان کی تقسیم پر مصر رہتے ہیں اور ساتھ ہی ایک مقتدر اعلا، آزاد ملک کا مطالبہ کرتے ہیں تو انہیں ایک لنگڑے لولے پاکستان پر ہی قانع ہونا پڑے گا۔

16 مئی کے بیان کے اجراء سے پہلے اس پر کافی اہم نظر ثانی کی گئی تھی۔ سب سے اہم نظر ثانی وہ تھی جس کی ''گروپوں سے باہر آجانے کے حق'' پیراگراف 19 کے بارے میں بنگال کے گورنر سر فریڈک بروز نے پیش کی تھی۔ اس سے کانگرس کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ ترمیم آسام کے انتخاب کو پہلے ہی سے روک دینے کا موجب ہو سکتی ہے۔ فریڈک نے ویول کے نام اپنے 9 مئی کے مراسلے میں لکھا تھا:

'اگر چہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ گروپ کی تشکیل اور صوبائی آئین وضع کر لئے جانے کے فوراً بعد، اصل گروپ سے باہر آنے اور دوسرے گروپ میں شامل ہونے کے اختیار کا مقصد اس عمل کے دوران نسبتاً چھوٹے صوبوں کو تحفظ فراہم کرنا تھے۔ اس میں شک نہیں کہ الگ ہو جانے کے فوری اختیار کو حذف کرنے سے بنگال کے مسلمانوں کو مجموعی طور پر، ان تجاویز کے لئے راضی کرنے میں مدد ملے گی؛ اور جغرافیائی وجوہ سے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ آسام اپنے اس حق کا استعمال کبھی بھی کر سکے گا۔ اس لئے میں پیراگراف 19 کی آخری سطریں حذف کر دینا چاہوں گا''۔

بنگال کے گورنر بروز کے اشارے پر اس معاملے میں ردوبدل کیا گیا اور الگ ہو جانے کے حق کو نئے آئین کے تحت پہلے انتخابات کے بعد ہی قابل عمل بنایا گیا۔ آسام کو مشرقی گروپ میں غالب مسلم اکثریت کے ذریعے انتخابی عمل اور انتخابی حلقوں میں دھاندلی اور ہیرا پھیری کا خدشہ تھا۔ کیبنیٹ مشن کی جمعہ، 10 مئی 1946 کی میٹنگ میں بروز کی تجویز کو قبول کر لیا گیا تھا، حالاں کہ اس سلسلے میں آسام کی حکومت کے ساتھ صلاح مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ میٹنگ کے ریکارڈ سے صرف اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ پیراگراف 19 (vi) میں ترمیم کی گئی۔ اس بات سے اتفاق کیا گیا کہ کسی گروپ سے باہر آنے کے فیصلے نئے آئین کے تحت نئی اسمبلی کے ہی ذریعہ کیا جانا لازمی ہوگا اور یہ وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کوئی بھی صوبہ کسی دوسرے گروپ میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس معاملے کو گفت وشنید کے لئے چھوڑ دینا چاہئے'۔ اس تبدیلی نے 16 مئی کے بیان کے پیراگراف 19 کو کانگرس کے لئے ناقابل قبول بنا دیا اور بعد میں یہ ترمیم پارٹیوں کے لئے ایک بڑی نزاعی شکل اختیار کر گئی۔ 25

اس وقت کرپس کے عملے میں شامل ایک نوجوان لیبر ایم پی ڈ وڈرو ویات نے جناح کو'' اعصابی تناؤ کا شکار اکھڑ اکھڑا اور اپنے قابو سے باہر'' محسوس کیا۔ ویات کو ایسا لگا کہ جناح مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور اس کی آل انڈیا کونسل سے ملنے سے کترا رہے ہیں۔ تبادلہ خیال سے ویات نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جناح نے (16 مئی کے بیان میں شامل) اسکیم کے خاکے کو ناقابل عمل پایا۔ بہر حال یہ دکھانے کے لئے کہ وہ اسے آزمانے کی کوشش کریں گے، وہ اس بیان کو، پاکستان جانے والی راہ پر پہلے قدم کے طور پر قبول کر لینے کے لئے تیار تھے۔ انہوں نے 6 جون 1946 کو مسلم لیگ سے ٹھیک یہی کرایا۔

16 مئی کے بیان سے کافی پہلے، ویول نے جناح کو عبوری حکومت کے بارے میں باخبر کر دیا تھا۔ ان کے ذہن میں 12 رکنی کونسل کا خیال تھا...... 5 ممبر مسلم لیگ سے، 5 کانگرس سے، ایک درج فہرست ذات کے بہ شمول اور ایک سکھ اور ایک دوسرا۔ 26ے اس کے بعد سے، اسی گفت وشنید کا سلسلہ آگے بڑھا، وہ رجحان صاف نظر آنے لگا جس نے درحقیقت جناح کے موقف کو کم زور کر دیا؛ یعنی ان کے برابری کے فارمولے کی شدت تبدریج کم ہوتی گئی۔

یہی سلسلہ ہر مراسلے اور ہر میٹنگ میں جاری رہا؛ جو بالآخر مسلم لیگ کی طرف سے 16 مئی 1946 کے بیان کے مسترد کئے جانے پر ختم ہوا۔ لیگ نے اس بیان کو مسترد کر دینے کا اعلان 29 جولائی 1946 کی تباہ کن قرارداد میں کیا تھا، کیا کوئی بھی اس کے نتائج کو پہلے سے دیکھ سکتا تھا جو صرف پندرہ روز بعد ظاہر ہونے تھے۔ یہ نتائج 16 اگست 1946 کے کلکتہ میں 'یوم راست اقدام' کی شکل میں سامنے آئے۔

3 جون 1946 کو ویول نے کیبنیٹ مشن کے منصوبے کے سلسلے میں جناح سے دوبار ملاقات کی۔ یہاں ہم 10 بجے ویول اور کیبنیٹ کے وفد کے ساتھ جناح کی بات چیت کا ریکارڈ پیش کرتے ہیں:

'... جناح نے کہا تھا کہ اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو وہ ناموں کی فہرست 7 جون کو دے دیں گے۔ وائسرائے کو جو عام تاثر ملا تھا وہ یہ تھا کہ جناح اپنے لوگوں سے وفد کی تجاویز منوانے کی کوشش کریں گے... جناح کہہ چکے تھے کہ مرکز میں کسی بھی یونین حکومت میں برابری کے فقدان کا سوال ایک ایسا نکتہ ہے جسے قبول کر لینا مسلم لیگ کے لئے بہت مشکل ہوگا۔ وائسرائے نے فراہم کردہ متبادل تحفظات کی طرف اشارہ کیا تھا اور یہ اپیل کی تھی کہ مسلم لیگ ہندوستانی یونین میں برابری حاصل کرنے کی امید مشکل سے ہی کر سکتی ہے۔

'جناح نے دریافت کیا تھا کہ اگر کانگرس ان تجاویز کو مسترد کر دے اور مسلم لیگ انہیں قبول کر لے تو تب کیا ہوگا، اس پر وائسرائے نے کہا تھا کہ وہ اگرچہ کسی طرح کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ مگر ذاتی طور پر خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر مسلم لیگ انہیں تسلیم کر لیتی ہے تو اس سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا،... جناح نے یہ بھی پوچھا تھا کہ آیا ان حالات میں مسلم لیگ سے عبوری حکومت میں شامل ہونے کے لئے کہا جائے گا اور اسے آبادی کے تناسب سے قلمدان دیئے جائیں گے؟ وائسرائے نے کہا تھا کہ یہ کا خیال یہ ہے کہ وہ یہ ضمانت دے سکتے ہیں کہ اس میں مسلم لیگ کا حصہ ہوگا جس جناح نے پوچھا تھا کہ کیا یہ یقین دہانی انہیں تحریری شکل میں دی جا سکتی ہے کیوں کہیں سے انہیں ورکنگ کمیٹی میں مدد ملے گی۔ اس بات سے اتفاق کیا گیا تھا کہ وائسرائے کو جناح کے نام مراسلے کا مسودہ تیار کرنا چاہئے جس پر وفد دوپہر کے کھانے کے بعد غور کرے گا۔ 27ے

[ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر اسٹیفورڈ کرپس موجود نہیں تھا] جب ویول نے 3 جون 1946 کو دن میں چار بجے جناح سے دوسری بار ملاقات کی تو ان کا تبادلۂ خیال زیادہ تر 'یقین دہانیوں' پر ہی مرکوز رہا۔ اس سلسلے میں سرکاری دستاویزات میں جو کچھ ریکارڈ کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہے:

فیلڈ مارشل وسکاؤنٹ ویول بنام جناب اسبل

3 جون

وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری،

زیادہ بہتر ہوگا کہ ان سب کو ایک فائل میں رکھا جائے۔ میں نے دونوں چیزیں جناح کو دکھائیں۔ اور وہ مجھے مطمئن معلوم ہوئے!

ویول (دستخط)

انتہائی بہ صیغۂ راز

مسٹر جناح کو زبانی یقین دہانیاں کرائی گئیں۔ 3-6-1946

میں نے کابینہ کے وفد سے اس نکتے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا ہے جس کے بارے میں آپ نے آج صبح بات کی تھی۔

وفد آپ کو اس طرح کی تحریری یقین دہانی نہیں کرا سکتا کہ موجودہ گفت وشنید ٹوٹ جانے پر اس کا کیا اقدام ہوگا! لیکن میں وفد کی طرف سے آپ کو یہ ذاتی یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ ہم کسی کی بھی برابری کے معاملے میں کسی طرح کے امتیازی فیصلے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور یہ کہ ہم اپنے بیان میں شامل منصوبے کو، جہاں تک حالات اجازت دیں گے، آگے بڑھائیں گے، بشرطیکہ کوئی ایک بھی پارٹی اسے قبول کرلے، ہم امید کرتے ہیں کہ دونوں ہی پارٹیاں اسے قبول کرلیں گی۔ جیسا کہ میں جانتا ہوں، میں آپ پر بھروسا کر سکتا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس یقین دہانی کو عام نہ کریں، اگر ضروری ہو تو، اپنی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے یہ کہیں کہ آپ اس معاملے میں مطمئن ہیں۔

نمبر 440

مسلکہ نمبر 2

کیبنٹ وفد کا دفتر

وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

ہمارا ارادہ یہ ہے کہ اگر کوئی بھی پارٹی شامل ہونے اور اس پر کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے، تو جہاں تک بھی ممکن ہوگا ہم اس اسکیم پر قائم رہیں گے۔ اس وقت کے حقیقی حالات کے پیش نظر ہم تھوڑا بہت فرق کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارا

ارادہ یہ ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل کیا جائے۔

[اس نوٹ پر تاریخ اور دستخط نہیں ہے، مگر یہ ایس۔ کرپس کے ہاتھ کی لکھی تحریر معلوم ہوئی ہے]28

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ 4 جون 1946 کو ہوئی جس میں ایک ممبر اصفہانی نے ایک خدشے کا اظہار کیا جو کہ کافی حد تک معقول تھا، اور وہ تھا کہ اگر مسلم لیگ نے 16 مئی کے بیان کو قبول کر لیا اور کانگرس نے مسترد کر دیا تو کیا ہوگا۔ ایسی صورت میں لیگ پر کڑی نکتہ چینی ہوگی کہ اس نے ایک ایسی چیز کو قبول کر لیا جو پاکستان سے کم ہے، کیا انگریز لیگ کو 'نیچا دکھانا چاہتے ہیں'۔ یہی وجہ ہے کہ جناح نے اس سلسلے میں یقین دہانی تحریری شکل میں چاہی تھی جو انہیں وائسرائے کی طرف سے ابھی تک موصول نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال ویول کی ٹیم کو یہ خدشہ تھا کہ اگر اس طرح کی کوئی تحریر دی گئی تو کانگرس بھڑک جائے گی۔

اس کے بعد 6 جون 1946 کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کی میٹنگ ہوئی جس میں کیبنٹ مشن کے 16 مئی 1946 کے بیان پر غور کیا جانا تھا۔ تبادلۂ خیال کے بعد کمیٹی نے جناح کو وائسرائے سے بات چیت کرنے اور صدر کی حیثیت سے فیصلے لینے اور کارروائی کرنے کا اختیار جناح کو دے دیا۔ اس میٹنگ میں جناح نے اعلان کیا تھا کہ 'میں نے آپ کو کرپس کی تجویز مسترد کر دینے کا مشورہ دیا تھا، میں نے آپ کو آخری شملہ کانفرنس کے فارمولے کو مسترد کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر برطانیہ کے کیبنٹ مشن کی تجویز کو مسترد کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں آپ کو اسے قبول کر لینے کا مشورہ دیتا ہوں۔' چنانچہ لیگ کی کونسل نے وہی کیا جو جناح اس سے کرانا چاہتے تھے۔

کیبنٹ مشن کی تجاویز قبول کر لینے کے بعد، محض خود کو یقین دلانے کے لئے، جناح نے 8 جون 1946 کو ویول کو خط لکھ کر یقین دہانیوں کے لئے اپنے مطالبے پر اصرار کیا۔ معاملہ پھر 'برابری' کا ہی تھا۔ یہی جناح نے لکھا بھی تھا: '' کہ آپ کی سابقہ اجازت سے میں نے ورکنگ کمیٹی کو اس یقین دہانی سے مطلع کر دیا ہے، یہ ان اہم ترین بات تھی جو ان کے لئے کیبنٹ مشن کے بیان کی طرح ہی وزن رکھتی تھی، ان دونوں نے باہم مل کر ایک کل کی شکل اختیار کر لی ہے، چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے 6 جون 1946 کو حتمی منظوری دے دی۔ اور ہم آپ مزید اطلاع دیتے ہیں کہ مجھے منظوری سے پہلے کونسل کے سامنے اس یقین دہانی کا اعادہ کرنا پڑا تھا'

جناح عبوری حکومت کی تشکیل میں 'برابری' کے سوال پر مضبوطی سے قائم رہے، یعنی کہ پانچ ارکان کانگرس سے ہوں اور پانچ مسلم لیگ سے! ویول کا یہ خیال تھا کہ جناح آخرکار آسام اور بنگال کے وزرائے اعلا کی وجہ سے ڈھیلے پڑ جائیں گے، کیوں کہ تب ظاہر ہو گیا تھا کہ دونوں وزرائے اعلا سعداللہ اور ناظم الدین اقتدار میں برقرار رہنے کے لئے کانگرس کی خیر سگالی پر منحصر ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ لیاقت علی بھی اقتدار کے لئے بے چین تھے۔ چنانچہ ویول نے یہ محسوس کیا کہ جناح دباؤ کی وجہ سے شاید ناموں کی اپنی فہرست بھیج دیں گے۔ مگر ایسا کوئی خط نہیں آیا۔ اس کے بجائے جناح نے

ویول کو یہ اطلاع دی: 'میں سمجھتا ہوں کہ کانگرس ابھی تک اپنے فیصلے سے دست بردار نہیں ہوئی ہے، اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کانگرس فیصلہ نہیں کرتی تب تک اس بارے میں تبادلۂ خیال کرنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ عملے اور قلمدانوں میں تال میل قائم کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے۔..... 29۔ برابری کا معاملہ جس کے بارے میں وائسرائے کانگرس کے ساتھ گفت وشنید کررہا تھا، جل طلب ہی رہا۔ 15 جون 1946 کو ویول نے جناح کو مطلع کیا کہ جیسا کہ اس سے پہلے جناح کو تجویز کیا گیا تھا، عبوری حکومت کی ساخت کے سلسلے میں کسی سمجھوتے کے لئے کانگرس کے ساتھ ان کا تبادلۂ خیال ناکام ثابت ہوگیا ہے۔ چنانچہ کابینہ وفد اور وائسرائے نے، آئندہ کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں بیان جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ 30

یہ اقدام، 16 جون 1946 کے بیان میں کی گئی وضاحت کے مطابق، عبوری حکومت میں کام کرنے کے لئے 14 لوگوں کو مدعو کرنے کا تھا۔ اس طرح اصل تجویز میں طے کیے گئے 12 ارکان کے مقابلے ارکان کی تعداد 14 ہوگئی۔ اگر یہ تجویز مان لی گئی ہوتی، تب وائسرائے 26 جون 1946 کو یا اس کے آس پاس ہی نئی حکومت کے افتتاح کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ بہرحال ایسی صورت میں کہ دونوں سے کوئی بھی پارٹی شامل ہونے کے لئے تیار نہیں تھی، وائسرائے عبوری حکومت کی تشکیل کے عمل کو آگے بڑھانے کے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہا۔ 31

16 جون کے بیان میں ایک ایسی بنیاد پر عبوری حکومت کی تشکیل کی بات کی گئی تھی جو لازمی طور پر ایک ماہ قبل، 16 مئی 1946 کو جاری اصولوں سے متعلق بیان سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہو! مگر اس بیان میں کہیں بھی یہ وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ دنوں بڑی پارٹیوں کو، عبوری حکومت کی تشکیل سے پہلے لازمی طور پر اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ پھر آخر کس کی وجہ سے کابینہ وفد نے 25 جون کو جناح کے ساتھ اپنی میٹنگ میں (جس کے رکارڈ کا حوالہ دیا جاچکا ہے)، اسے موضوع بحث بنایا اور صرف مسلم لیگ کو ہی عبوری حکومت میں شامل کرنے سے انکار کردیا؟ ظاہر ہے، اس وجہ سے کہ انہوں نے ایسا کہا ہوتا تو، پہلے ہی سے شا کی اکثریت کا اشتعال اور بھی بڑھ گیا ہوتا؛ واضح رہے کہ ویول کے لئے یہ بات کھل کر کہنا بہت مشکل تھا۔

16 جون 1946 کو ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا؛ یہ مسئلہ عبوری حکومت میں شرکت کے لئے ویول کی طرف سے مدعو کیے گئے ایک ہندو کی جگہ پر کانگرس کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام کو شامل کرنے کا تھا۔ ویول نے اس سلسلے میں جناح کے ساتھ ایسی میٹنگ کا ذکر اس طرح کیا ہے: 'میں نے اپنی بات کا آغاز انہیں آج صبح آزاد اور نہرو کے ساتھ بات چیت کے بارے میں بتاتے ہوئے کیا۔ انہوں نے مہتاب کی جگہ پر بوس کو شامل کرنے کی بات کو کچھ کہے بغیر مان لیا۔ لیکن جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ کانگرس ایک کانگرسی ہندو کی جگہ ذاکر حسین کا نام تجویز کرسکتی ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ قطعی ناقابل قبول ہے، وہ تمام بات چیت کے دوران بار بار اس کا ذکر کرتے رہے اور ذاکر حسین کو غدار قرار دیتے رہے اور یہ کہتے

رہے کہ اگر وہ اسے قبول کر لیتے ہیں، تو کہیں اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے"۔ یہ معاملہ بھی اُس وقت جناح اور وفد کے درمیان ایک بڑی مسئلہ بن گیا تھا جب 25 جو 1946 کو ان کی فیصلہ کن میٹنگ ہوئی۔

جناح برابری کے معاملے کا اعادہ کرتے رہے۔ 19 جون 1946 کو انہوں نے ویول کے سامنے "پانچ مسلمان، پانچ ہندو، ایک سکھ اور ایک ہندوستانی عیسائی کا معاملہ پھر اٹھایا۔ جناح نے اپنے خط میں، انہیں دہلی میں کرائی گئی یقین دہانی کی دلائی اور کہا کے اسی کہ مطابق انہوں نے لیگ کی کونسل میں بیان دیا تھا۔ اُن کے لئے یہ سب سے اہم بات تھی جو کونسل کے لئے بہت معنی رکھتی تھی...... "تو پھر آخر کس وجہ سے اس کی بنیاد تبدیل کر کے۔ پانچ، کانگرس پانچ، مسلم لیگ اور تین، 'دوسرے' کر دی گئی تھی؟ کیا انہوں نے ویول کو اس بات سے باخبر نہیں کیا تھا کہ آخر اس طرح کی کوئی تبدیلی تجویز کی جاتی ہے تو جناح کو یہ معاملہ ایک بار پھر ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھنا ہوگا اور اس سلسلے سے دوبارہ کونسل کی میٹنگ بلانے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ وہ بھی، اور خود لیگ کی ورکنگ کمیٹی بھی اس بات سے حیران تھی کہ عبوری حکومت میں شامل ہونے کے لئے لیگ کے پانچ نمائندوں کو براہ راست طریقہ پر اور لیگ سے مشورہ کئے بغیر مدعو کیا گیا تھا۔ اور یہ کہ" کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان برابری کو ترک کر کے اُس کی جگہ اعلاذات ہندوؤں اور مسلم لیگ کے درمیان برابری کی بات کیوں کی جارہی ہے؟ اس پارٹی کو مزید پریشان کرنے کے لئے درج فہرست ذات کے نمائندے کے طور پر جناب لگ جیون رام کا نام کیوں تجویز کیا گیا ہے جب کہ وہ پہلے ہی سے کانگرس ہیں؟" جناح کے نزدیک اسی کے نتیجے میں عبوری حکومت میں مسلمانوں کا تناسب مجموعی حیثیت میں بھی اور کانگرس کے مقابلے میں ایک تنہا گروپ کے طور پر بُری طرح متاثر ہو جائے گا۔" تاہم اس مرحلے پر بھی جناح نے عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار نہیں کیا اور ویول کے نام اپنے 9 جون 1946 کے خط میں بھی انہوں نے قلمدانوں کی تقسیم کے سوال پر تبادلہ خیال کیا تھا۔ 33

بلاشبہ اب واقعات کا سلسلہ جناح کے قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں ویول نے مطلع کیا کہ" مجھے یقین ہے کہ آپ اس بات کو سراہیں گے کہ باہم متصادم مفادات رکھنے والی دو بڑی پارٹیوں کی منظوری حاصل کرنے کے لئے کرائی جانے والی ہر بات چیت ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس بنیاد پر ختم ہو جس بنیاد پر وہ شروع کی گئی تھی" اور جیسا کہ" آپ جانتے ہیں میں نے آپ کو ایسی کوئی ضمانت نہیں دی تھی کہ یہ گفت وشنید کی مخصوص بنیاد پر پہنچنے کے بعد ہی ختم ہوگی۔ 34 اس سے پہلے کے ایک سوال پر ویول نے جناح کو یہ کہ کر دلاسا دیا کہ، "اگر دونوں بڑی پارٹیوں میں سے کسی ایک نے بھی مخالفت کی تو عبوری حکومت بڑے فرقہ وارانہ معاملے کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔' ویول نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے یہ بات کانگرس کے صدر مولانا آزاد پر بھی واضح کر دی تھی جنہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ کانگرس اس نکتے کو سمجھتی ہے۔

اس کے بعد ویول کو کانگرس کے صدر کا خط موصول، پھر کانگرس ورکنگ کمیٹی نے قرارداد منظور کی۔ یہ دونوں باتیں 26 جون 1946 کی ہیں۔ ان دونوں کی وجہ سے معاملات اور بھی پیچیدہ ہو گئے، ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کا

کھیل اب تباہ کن شکل اختیار کر چکا تھا۔ ذیل میں کانگرس کے مراسلے اور ورکنگ کمیٹی کی قرارداد سے بعض اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔ یہ اقتباسات اصل متن میں پیش کئے جارہے ہیں کیوں کہ وضاحت یا اختصار کرنے سے ناقابلِ تصور نقصان ہوسکتا ہے۔

مولانا آزاد شام فیلڈ مارشل وس کاؤنٹ ویول

25 جون 1946

'ہم برابری (Parity) جیسی کوئی چیز قبول نہیں کرسکتے'، ایک عارضی بندوبست کے طور پر بھی نہیں، عبوری حکومت 15 ارکان پر ہی مشتمل ہونی چاہئے'۔

(عبوری قومی حکومت کی تشکیل سے متعلق) اس فہرست کا ایک غیر معمولی پہلو یہ تھا کہ کسی قوم پرست مسلم لیڈر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ ہم نے محسوس کیا یہ ایک سنگین بھول ہے۔ ہم ایک ایسے مسلمان کا نام تجویز کرنا چاہتے تھے جسے کانگرس کی فہرست میں شامل کسی اور نام کی جگہ رکھ دیا جائے! ہم نے سوچا کہ، ہمارے ذریعے اپنے ہی کسی آدمی کا نام تبدیل کیے جانے پر شاید کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ درحقیقت جب میں نے آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی تھی کہ مسلم لیگ کے ذریعہ نامزد کردہ لوگوں میں ایک ایسے شخص کا نام شامل کیا گیا ہے جو صوبہ سرحد کے حالیہ انتخابات میں ہار چکا ہے اور ہمارے خیال میں اس کا نام سیاسی وجوہ سے شامل کیا گیا ہے تو آپ نے مجھے یہ لکھا تھا: 'مجھے افسوس ہے کہ میں مسلم لیگ کے ذریعے پیش کئے گئے ناموں پر کانگرس کو اس سے زیادہ اعتراض کا حق نہیں دے سکتا جتنا کہ کسی دوسری پارٹی کو۔ سب کو اہلیت کی بنیاد پر ہی پرکھا جانا چاہیے۔'' مگر اس سے پہلے کہ ہم اپنی تجویز سامنے رکھتے، مجھے آپ کا 22 جون کا مراسلہ موصول ہوا جس سے ہم لوگ بہت زیادہ حیرت میں آ گئے۔ آپ نے بعض اخباری رپورٹوں کی بنیاد پر لکھا تھا۔ آپ نے اس مراسلے میں ہم سے کہا تھا کہ کیبنٹ مشن اور آپ عبوری حکومت میں کانگرس کے نمائندوں میں کانگرس کے ذریعہ کسی مسلم لیڈر کے انتخاب کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ ہمیں ایک بہت ہی غیر معمولی فیصلہ لگا تھا۔ یہ فیصلہ آپ کے اس بیان کے بالکل برعکس تھا جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ کانگرس اپنے وزراء کا انتخاب بھی آزادی سے نہیں کرسکتی۔

'اس طرح مسٹر جناح نے اقلیتوں میں درج فہرست ذاتوں کو بھی شامل کرلیا ہے' اور آپ شاید اس خیال سے متفق ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اس خیال کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور درج فہرست ذاتوں کو ہندو معاشرے کا اٹوٹ حصہ مانتے ہیں۔

'آپ نے سوال نمبر 5 کے جواب میں لکھا ہے: 'اگر دونوں میں سے کسی بھی بڑی پارٹی کی اکثریت مخالفت کرتی

ہے تو عبوری حکومت کسی بڑے فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ نہیں لے سکے گی۔

'آپ کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ نے یہ بات کانگرس کے صدر کے سامنے رکھ دی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ کانگرس اس بات کو مانتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اس بندوبست کو مرکزی قانون سازیہ میں ایک طویل مدتی بندوبست کے طور پر قبول کیا تھا اور اگر یہ ریاستی قانون ساز اسمبلی کے تئیں جواب دہ ہو تو اس کا اطلاق صوبوں پر بھی کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ اس کی تشکیل بڑے فرقوں کی آبادی کی بنیاد پر کی جائے۔ اس اصول کا اطلاق ایک بالکل بنیاد پر قائم ہونے والی عارضی حکومت پر نہیں کیا جاسکتا۔

میری کمیٹی اس وجہ سے بادل ناخواستہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ آپ کی 16 جون 1946 کی تجویز کردہ عارضی حکومت کی تشکیل میں آپ کی مدد نہیں کرسکتی۔

16 مئی 1946 کے بیان کے سلسلے میں جو آئین ساز ادارے کی تشکیل اور اس کے کاموں سے متعلق ہے، کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے 24 مئی 1946 کو ایک قرارداد منظور کی تھی۔ اس کے بعد بات چیت اور مراسلت بھی ہوئی جس میں ہم نے ان تجاویز کی خامیوں کے بارے میں وضاحت کی تھی۔ ہم نے بیان کی چند شقوں کے بارے میں اپنی تاویل بھی سامنے رکھی ہیں۔ ہم اپنے زاویہ نگاہ پر قائم رہتے ہوئے آپ کی تجاویز کو قبول کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے ارادے سے کے لئے تیار نہیں۔ بہرحال ہم یہ اضافہ کرنا چاہیں گے کہ آئین ساز اسمبلی کی کامیابی کا دارومدار ایک اطمنان بخش عبوری حکومت کی تشکیل ہوگا۔35

منسلکہ نمبر 603

کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد

25 جون 1946

'جس نوعیت کی آزادی کانگرس کا نصب العین ہے وہ ایک ایسے متحدہ جمہوری ہندوستانی وفاق کے قیام سے عبارت ہے، جن کا ایک مرکزی مقتدرہ ہوگا جسے اقوام عالم کا احترام حاصل ہوگا۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات اور ملک کے تمام مردوں اور عورتوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ تجاویز اور صوبوں کی گروپنگ کے نظام میں مرکزی مقتدرہ کے اختیارات کم کرنے کی بات کہی گئی جو اس کی کمزوری کا باعث بنتا ہے اور سرحد اور آسام جیسے صوبوں اور کچھ اقلیتوں خاص طور پر سکھوں کے لئے نامصنفانہ ہے۔ کمیٹی اسے منظور نہیں کرتی۔ 16 جون 1946 کے بیان میں موجودہ عبوری حکومت سے متعلق تجاویز میں کچھ ایسی خامیاں ہیں جو کہ کانگرس کے لئے بہت اہم امور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے کچھ خامیوں کی نشان دہی وائسرائے کے نام کانگرس کے صدر کے 25 جون کے مراسلے میں کی جا چکی ہے۔

عبوری حکومت کو اختیارات اور ذمے داری حاصل ہونی چاہیے، اور اسے قانونی طور پر نہیں، تو کم سے کم عملی طور پر ایک ایسی آزاد حکومت کے طور پر کام کرنا چاہئے تا کہ بالآخر مکمل آزادی تک پہنچا سکے۔ اس طرح کی حکومت کے اراکین خود کو اپنے آپ کو صرف عوام کو جواب دہ سمجھیں نہ کہ کسی غیر ملکی اقتدار کو! عبوری یا کسی دوسری حکومت کی تشکیل میں کانگرس کبھی بھی اپنے قومی کردار سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ اور مصنوعی قسم کی اور غیر منصفانہ برابری کو قبول نہیں کر سکتی، اور اس فرقہ وارانہ فساد پر مبنی گروپ کو ویٹو (حق تنسیخ) کا اختیار دینے پر بھی راضی نہیں ہو سکتی۔ کمیٹی 16 جون کے بیان میں شامل تجویز کے مطابق عبوری حکومت کی تشکیل کو قبول نہیں کر سکتی۔

تاہم کمیٹی نے طے کیا ہے کہ کانگرس کو مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو جانا چاہیے تا کہ آزاد، متحدہ اور جمہوری ہندوستان کی تشکیل ہو سکے۔

'جب کہ کمیٹی نے آئین ساز اسمبلی میں کانگرس کی شمولیت سے اتفاق کر لیا ہے، اس کے خیال میں یہ ضروری ہے کہ جلد از جلد ایک نمائندہ اور ذمہ دار عبوری حکومت کی تشکیل کی جائے' 36

اس کا نتیجہ 25 جون کو ہی کیبنٹ کے وفد اور ویول کے ساتھ جناح کی میٹنگ کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ میٹنگ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ میٹنگ کا آغاز کانگرس کے ذریعے 16 مئی کے بیان کے قبول کیے جانے کے سلسلے میں جناح کے سوال سے ہوا۔ تب سکریٹری آف اسٹیٹ نے جناح پر الزام لگایا کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل کے عمل میں رخنہ ڈال رہے ہیں۔ انہوں نے جناح کو ویول کے نام اپنے 19 جون کے مراسلے کو شائع کرنے کے لئے مورد الزام ٹھہرایا۔ 25 جون کی اس اہم میٹنگ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے بعد کیبنٹ مشن اور وائسرائے نے 26 جون کو یہ عوامی بیان جاری کیا کہ فی الحال عبوری حکومت کی تشکیل ملتوی کر دی گئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی وائسرائے اور کیبنٹ مشن نے جناح پر اپنا ارادہ واضح کر دیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے لئے انتخابات کا عمل جاری رکھیں گے حالاں کہ جناح نے ان انتخابات کو ملتوی کر دینے کی زوردار اپیل کی تھی۔ جناح کے لئے آئین سازی کا طویل مدتی منصوبہ اور عبوری حکومت کا قلیل مدتی منصوبہ، یعنی دونوں ہی ایک ہی کل کے اجزاء تھے۔ جناح کی رائے تھی کہ ایک حصے یعنی اسمبلی کے لئے انتخابات کے عمل کو جاری رکھنا اور دوسرے حصے یعنی عبوری حکومت کے عمل کو ملتوی کر دینا اچھی بات نہیں ہوگی۔ 37 وائسرے نے جناح کے اس مشورے کو بھی قبول نہیں کیا۔

کیبنٹ مشن کے اس تمام قصے میں اب وائسرائے کے ویول کا کردار صرف اتنا رہ گیا تھا کہ اس کے اڑے ہوئے لبرزوں کو جمع کرے۔ 16 جون کا بیان جاری کئے جانے سے بھی پہلے ہی ویول نے یہ تجویز رکھی تھی کہ یہ طے کر لینا چاہیے کہ دونوں میں سے کسی ایک پارٹی کے راضی نہ ہونے کی صورت میں اگلا قدم کیا ہوگا۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے پرائیویٹ سکریٹری جارج ایبل کے سامنے بھی اپنا خیال رکھا تھا۔ ویول نے بجا طور پر اس بحران کی پیش گوئی کر دی تھی جو

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے شامل نہ ہونے کی صورت میں، صرف کانگرس کی حکومت کو منظوری دینے سے پیدا ہوسکتا تھا۔ ویول کا اندازہ تھا کہ حکومت میں برابری ہی اصل معاملہ ہے جس پر لیگ اور کانگرس کے درمیان ٹکراؤ ہوگا مگر کرپس اور پیتھک لارنس اس معاملے میں کیا رخ اختیار کریں گے اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ ویول کے خیال میں یہ دونوں کانگرس سے اس بات کے پابند تھے کہ اس کے سلسلے میں کوئی سخت قدم اٹھانا ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ ویول نے اپنی ڈائری میں کانگرس کی طرف ان دونوں کے بھاری جھکاؤ کے لئے ان دونوں کو واضح الفاظ میں موردالزام قرار دیا ہے۔

25 جون کو، جناح سے فیصلہ کن ملاقات سے پہلے، کرپس نے ویول کو واضح اطلاع دی کہ کانگرس 16 مئی کے بیان کو قبول نہیں کر رہی ہے۔ مگر کرپس نے اب اس کے بالکل برعکس کیا۔ انہوں نے کانگرس سے اسے قبول کر لینے کی درخواست کی، اور کانگرس کو ایسا کرنے کے فوائد بھی بتائے۔ اسے پیتھک لارنس نے بھی خاموشی سے قبول کر کے اور اس طرح جناح کے تعلق سے ویول کے لئے ایک ناممکن صورت حال پیدا کردی۔ ویول نے کانگرس کی خاموش رضامندی کو غیر دیانت دارانہ قبولیت کا نام دیا جس سے اس کی معروضیت پر حرف آتا ہے۔

بہرحال ویول نے ہار نہیں مانی۔ 26 جون کو، جب انہوں نے کابینہ وفد کے ساتھ کانگرس لیڈروں سے ملاقات کی۔ کانگرس کے ذریعہ پیش کی گئی تاویل کو تسلیم نہ کرنے پر اپنا اصرار جاری رکھا۔ اس صبح ان کا احساس مایوسی اتنا بڑھ گیا تھا کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوجانے کے بارے میں بھی سوچ لیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ مان لینا ممکن نہیں تھا کہ کیبنٹ مشن کے بھی کچھ ممبروں نے ایمانداری سے اپنا رول ادا نہیں کیا تھا۔ 29 جون کو برطانیہ لوٹنے سے پہلے کرپس نے ویول سے ملاقات تک نہیں کی۔

مسلم لیگ کو اکیلے ہی حکومت سازی کی دعوت دینے سے کیبنٹ مشن کے انکار کے بعد، احمد آباد میں فرقہ وارانہ فسادات ایک بار پھر بھیانک شکل میں پھوٹ پڑے۔ بمبئی کے وزیر داخلہ مرارجی ڈیسائی کو، جو موقع واردات پر جانے سے پہلے صلاح مشورے کے لئے گاندھی کے پاس آئے تھے، گاندھی جی کا یہی مشورہ تھا کہ وہ فوج یا پولس کی مدد کی بجائے خدا کے امان میں آگ بجھانے کے لئے فوراً وہاں پہنچیں۔ اور اگر ضرورت پڑے تو وہ اس آگ میں خود کو فنا بھی کر دیں، جیسا کہ کانپور کے قوم پرست روزنامہ۔ پرتاپ کے ایڈیٹر گنیش شنکر ودیارتھی نے اس وقت کیا تھا جب وہ کان پور 1931 کے ہندو مسلم فسادات کے دوران امن قائم کرانے کے مشن پر تھے۔

کانگرس کے صدر منتخب کا انٹرویو

16 جون 1946 کے بیان کے بعد پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کے نتیجے میں، کسی سمجھوتے کے امکانات اور بھی دھندلے ہوگئے تھے۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد (25 جون)، اور عبوری حکومت کی تشکیل کے ملتوی کئے جانے کے پیچیدہ حالات میں، جواہر لال نہرو کی 10 جولائی کی پریس کانفرنس یقیناً اس وقت کے تقاضوں کے خلاف تھی۔ نہرو کو اس

بات کے لئے شک کا فائدہ نہیں دیا جاسکتا کہ انہیں پہلے سے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس طرح کے انٹرویو کے کیا نتائج مرتب ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس انٹرویو کے کچھ اقتباسات کو لفظ بہ لفظ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

پریس کو انٹرویو: بمبئی 10 جولائی 1976، دی ہندو، 11 جولائی 1946 سے ماخوذ:

جواہر لال نہرو نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''یہ صحیح ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر کے ہمیں پہلے ہی سے کسی مخصوص طریقہ کار پر، یعنی آئین ساز اسمبلی کے لئے امیدواروں کے انتخاب پر، راضی ہوگا۔ ہم وہاں جو بھی کریں گے، ہم اسے پوری آزادی سے اور مطلق طور پر خود ہی طے کریں گے۔ ہم نے کسی بھی معاملے میں کسی کے لئے بھی خود کو پابند نہیں بنایا ہے۔ قدرتی طور پر اگر کوئی اپنے آپ کو کسی کا پابند نہ بھی بنائے، تو بھی بعض حقائق کی کچھ ایسی پیچیدگیاں ہیں جو ہمیں یہ یا وہ بات ماننے کی پابند بنا دیتی ہیں۔

سب سے نمایاں امکان یہ ہے کہ گروپنگ کے لئے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے، کسی بھی طرح کی گروپ بندی ممکن نہیں ہوگی۔ بظاہر سیکشن 'اے' ہی گروپ بندی کے خلاف فیصلہ کرے گا۔ میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ اس بات کا ایک چوتھائی امکان ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ گروپ بندی کے خلاف فیصلہ کرے۔ ایسا ہونے سے گروپ 'بی' ختم ہو جائے گا۔ غالب امکان یہ ہے کہ آسام بھی اور بنگال کے ساتھ گروپ بندی کے خلاف چلا جائے گا۔ تاہم میں یہ نہیں کہنا چاہوں گا کہ ابتدائی فیصلہ کیا ہوگا کیوں کہ گروپ بندی متوازن نہیں ہے۔ ہر طرح کی یقین کے ساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آخر کسی طرح کی کوئی گروپ بندی نہیں ہوگی، کیوں کہ آسام کسی بھی حال میں اسے برداشت نہیں کرے گا۔ اسی طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی بھی طریقہ کیوں نہ اختیار کیا جائے گروپ بندی کی بیل سر نہیں چڑھے گی۔

سوال: صوبائی رقابتیں گروپ بندی کے خلاف کس طرح جائیں گی؟

نہرو: اول تو یہ کہ مسلم لیگ کے علاوہ، پورا ملک صوبوں کی گروپ بندی یا زمرہ بندی کے خلاف ہے۔ اس طرح مسلم لیگ اس سوال پر بالکل الگ پڑ گئی ہے۔ اقتصادی اور دیگر اسباب کے تحت صوبہ سرحد اور سندھ میں پنجاب کے ساتھ گروپ بنانے کے خلاف خاصے جذبات پائے جاتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سندھ کے مسلمان بھی پنجاب کے ساتھ زمرہ بند کئے جانے کے خلاف ہیں... یہ دونوں صوبے... (سندھ/ سرحد) یہ خطرہ محسوس کرتے ہیں کہ پنجاب انہیں نگل جائے گا۔

سوال: مرکز میں عبوری قومی حکومت کی تشکیل کب ہوگی؟

نہرو: اس وقت ہم لوگ آئین ساز اسمبلی کے لئے الیکشن میں مصروف ہیں۔

سوال: آپ بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ سے کیا توقع کرتے ہیں؟

نہرو: کانگرس جو کچھ بھی کرتی ہے، اس کا ارادہ نئی صورت حال پیدا کرنا ہوتا ہے۔ ہم دوسروں کی پیدا کردہ صورت حال کی پیروی نہیں کرتے۔ مجھے خوشی ہے کہ مسلم لیگ کو یہ احساس ہوگیا ہے کہ ہم نے ایک نئی صورت حال پیدا کردی ہے، ہم اس طرح کے دیگر حالات بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اگر مسلم لیگ نے یہ کیا یا وہ کیا، تو ہم کیا کریں گے۔ ہم پہلے یہ دیکھیں گے کہ حالات کیا ہیں۔ اور پھر اس کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے۔

اس فیصلہ کن موڑ پر کی جانے والی ان باتوں نے 16 مئی کی تجاویز اور انہیں سب کی طرف سے قبول کیے جانے سے حاصل ہونے والے فائدوں پر پانی پھیر دیا۔ جیسا کہ ہونا تھا، اس سے کانگرس کے اصل ارادوں کے بارے میں جناح کے شکوک وشبہات اور بڑھ گئے اور کانگرس کے ساتھ تعاون کی کسی بھی کوشش کے خلاف ان کا موقف مضبوط تر ہوگیا۔ جناح نے لیگ کے موقف میں تبدیلی کرائی تھی اور مجوزہ اسکیم کی حمایت کی تھی جس کے سبب ایک اقتدار اعلا کے حامل پاکستان کے بجائے ضمنی اختیارات کے حامل صوبوں کی وحدت قائم کرنے پر زور دیا جانے لگا تھا۔ دوسری طرف، نہرو کے بیانات کیبنٹ مشن منصوبے کے الفاظ اور اصل روح دونوں کے خلاف جاتے تھے۔ نہرو کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان سے غلطی ہوئی ہے یا پھر انہوں نے یہ سوچا کہ خاموش رہنے میں ہی فائدہ ہے۔ جو بھی ہو، اس بیان نے تصفیے کے امکانات کو بہت نقصان پہنچایا جس سے مشکلیں اور بڑھ گئیں۔ اس کے علاوہ، یہ نہرو کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ بات جو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے قبول کرلی ہے اسے یک طرفہ طور پر بدل دیں، اور ایسا کرنا، خاص طور پر اس وقت جب ایک یقینی مصالحت ہوتی نظر آرہی ہو، بے سود ہوتا اس سے کیوں کہ ایک اور بحران پیدا ہو جاتا۔

کانگرس صدر کی حیثیت سے سبک دوش ہونے والے مولانا آزاد کے مطابق نہرو کی پریس کانفرنس 'ان بد بختانہ واقعات میں سے ایک تھی جس نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا'38 وہ مزید کہتے ہیں کہ 'یہ کہنا درست نہیں تھا، جیسا نہرو نے کہا، کہ کانگرس کیبنٹ مشن منصوبے کو جیسا چاہے تبدیل کرنے کو آزاد تھی۔' مزید یہ کہ 'جناح نے کیبنٹ مشن منصوبے کو منظور کرلیا تھا کہ ان کے سامنے اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔' نہرو کے ردعمل کے جواب میں، جناح نے یہ بیان جاری کیا کہ برطانوی پارلیمنٹ اور حکومت برطانیہ یہ بات کسی بھی شک وشبہ کے بغیر واضح کرے اور اس تاثر کو دور کرے کہ کانگرس نے کیبنٹ مشن کے طویل مدتی منصوبے کو قبول کرلیا ہے جیسا کہ کیبنٹ مشن کے اراکین اور وائسرائے کی کمزور کوششوں کے ذریعے ساری دنیا پر ظاہر کیا جارہا ہے۔ جناح نے یہ بھی کہا کہ نہرو کا بیان اس بنیاد کو ہی مسترد کرتا ہے جس پر یہ اسکیم ٹکی ہوئی ہے۔ جناح نے یہ دھمکی بھی دی کہ جولائی 1946 میں لیگ ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے اجلاسوں میں اس تمام صورت حال پر دوبارہ غور کیا جائے گا39 اب اس بات کے کئی اشارے موجود تھے کہ کانگرس اور مسلم لیگ ٹکراؤ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ بلبھ بھائی پٹیل تک کا یہ کہنا تھا کہ نہرو کی باتیں ان کی جذباتی ناپختگی کا نتیجہ ہیں۔

عبوری حکومت تشکیل دینے کی کوششیں ناکام ہوجانے کے بعد، برابری اور کانگرس کی طرف سے حکومت میں

مسلمانوں کی نمائندگی کے سوالات باقی رہ گئے، رکاوٹوں کی شکل میں۔ نہرو نے 10 جولائی 1946 کے اپنے ایک انٹرویو میں واضح طور پر کہا تھا کہ کانگریس کو گروپنگ کا منصوبہ کو اس شکل میں منظور نہیں ہے جس طرح جناح اسے سمجھتے ہیں کے مسترد جس طرح 16 مئی کے بیان میں کہا گیا ہے۔ کانگرس کی طرف سے اسکیم کے مسترد اور لیگ کی جانب سے قبول کئے جانے کے بعد، وائسرائے اب صرف مسلم لیگ کے نامزد نمائندوں کے ساتھ عبوری حکومت تشکیل دینے (16 مئی تک) کا پابند نہیں تھے۔ ان حالات میں حکومت سازی کو ایک 'وقفے' کے لئے ملتوی کرنا تنازعے کا موضوع بن گیا جس نے اس وقت بڑی پریشانیاں پیدا کیں۔

تین ہفتے کے وقفے کے بعد، ویول نے جناح کو مطلع کیا کہ وہ حکام کی کارگزار حکومت کی جگہ 'جلد از جلد' ایک عبوری مخلوط حکومت تشکیل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح ذاتی اور خفیہ طور پر، کانگرس اور مسلم لیگ کے صدروں کے ساتھ اپنی بات چیت کے لئے ان کا تعاون مانگا۔ انہوں نے کہا کہ یہ عبوری حکومت 14 اراکین پر مشتمل ہوگی، جس میں درج فہرست ذات کے نمائندے سمیت 6 اراکین کانگرس نامزد کرے گی اور پانچ اراکین مسلم لیگ اور تین وائسرائے کی طرف سے نامزد کئے جائیں گے، ان میں سے ایک جگہ کسی سکھ کے لئے محفوظ رہے گی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ کانگرس یا مسلم لیگ کو دیگر جماعتوں کے نامزد لوگوں پر اعتراض کرنے کا اختیار نہیں ہوگا اور یہ کہ مسترد کرنے کا اختیار صرف وائسرائے کو ہوگا۔ عبوری حکومت میں 6:5:3 کے تناسب کو 'برابری' کے اصول کو ترک کرنے کے مترادف مانا گیا۔ یہ مسلم لیگ کے اس موقف کے بھی خلاف تھا کہ عبوری حکومت میں مسلم نمائندگی کا معاملہ صرف وہی طے کر سکتی ہے۔ حالاں کہ اس موقف کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس طرح جب 'برابری' کا اصول ترک کیا جا چکا تھا اور کانگرس 'گروپنگ' کو مسترد کر چکی تھی اور جناح کے پاس کوئی خصوصی اختیار نہیں رہ گیا تھا، وہ عبوری حکومت میں شرکت کے لئے وائسرائے کی پیش کش مشکل ہی سے قبول کر سکتے تھے۔ 40 چناں چہ مسلم لیگ کونسل نے کیبنٹ مشن منصوبے کو مسترد کرنے والی قرارداد منظور کر لی۔

ان منفی معاملات کے باوجود، واقعات کا دھارا رکا نہیں رہا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کی ہدایت پر، وائسرائے نے نہرو کو، مرکز میں ایک عبوری حکومت تشکیل دینے کی دعوت دی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ 24 اگست کو دہلی سے ایک اعلانیہ جاری کیا گیا جس میں ایک نئی ایگزیکیٹو کونسل مقرر کئے جانے کی اطلاع دی گئی تھی جسے 2 ستمبر 1946 کو عہدہ سنبھالنا تھا۔ 41 عبوری حکومت میں صرف کانگرس کی شمولیت سے مسلم جذبات میں زبردست ہلچل پیدا کر دی، حالاں کہ اس سے پہلے خود مسلم لیگ اس کا مطالبہ کر چکی تھی جسے منظور نہیں کیا گیا تھا۔ جناح نے وائسرائے کے اس اقدام کی شدید مذمت کی۔ جس دن کانگرس نے عہدہ سنبھالا، سارے ملک کے مسلمانوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں پر کالے جھنڈے لگائے۔ 42

پیتھک لارنس اور کرپس نے، 18 جولائی 1946 کو، برطانوی پارلیمنٹ میں پھر یقین دہانی کرائی کہ حکومت برطانیہ، کیبنٹ مشن کے 16 مئی کے منصوبے کی پابندی کرے گی۔ جناح نے اس پر یقین نہیں کیا اور انگریزوں کے چلے

جانے کے بعد اقلیتوں کی حیثیت کے بارے میں یقین دہانی طلب کی۔ انہوں نے سوال کیا: 'کیا کانگرس پھر اپنا راستہ بدل کر نہرو کے بیان والے موقف کو اختیار نہیں کرے گی؟' جناح نے 27 جولائی 1946 کو بمبئی میں ہونے والی مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں خاصی تلخی کا مظاہرہ کیا43 اور پاکستان کے مطالبے کو دہرایا۔ اسی اجلاس میں مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن منصوبے کو باضابطہ طور پر خارج کیا اور پاکستان حاصل کرنے کے لئے 'راست اقدام' کا طریقہ اختیار کرنے کا اعلان کیا۔44

یہ جناح، اور ملک کے مستقبل کے نقطہ نظر سے، ایک نہایت اہم تبدیلی تھی۔ ممکن ہے کہ جناح کے اب سے پہلے والے آئین پسندی کے موقف کے بعض پہلو محض ایک حکمت عملی پر مبنی رہے ہوں کیوں کہ عوامی احتجاج کی تمام سیاسی جگہ گاندھی اور کانگرس کے تصرف میں آ چکی تھی۔ جناح کی آئین پسندانہ سیاست کا زمانہ اب جا چکا تھا، جس سے ان کے اور لیگ کے لئے مرکزی اہمیت رکھنے والے امور سے متعلق کانگرس کے موقف میں مسلسل تبدیلی سے ان کی بیزاری ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ اور آزاد پاکستان کے مقصد کی جانب سست رفتار پیش قدمی سے پیدا ہونے والی بے چینی وہ عوامل تھے جن کے سبب یہ تبدیلی عمل میں آئی اور جناح کو 'راست اقدام' کا اعلان کرنے کی طرف لے گئی۔ جناح نے اس وقت کھل کر اس کا 'غیر آئینی' ہونا قبول کیا مگر یہ ماننے سے انکار کیا کہ یہ 'پرتشدد' ہے۔ اگرچہ 'راست اقدام قرارداد' کا رخ برطانوی راج کی طرف تھا مگر جناح کو بخوبی معلوم تھا کہ اس دھماکہ خیز جذباتی اشتعال والے زمانے میں اس کا نتیجہ زبردست تشدد اور شدید ہندو مخالف جذبات کا مظاہرہ ہی ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ ہوا بھی بالکل یہی۔ 16 اگست 1946 کے 'راست اقدام' کے دن صرف کلکتہ میں ہی تقریباً 6000 انسان ہلاک اور تقریباً 15000 زخمی ہوئے۔ ہر طرف اس کے فوری اور جوابی اثرات پیدا ہوئے۔ موت اب سارے ہندوستان میں دندناتی پھر رہی تھی۔ بہار، اڑیسہ، یوپی، بمبئی اور دیگر علاقوں میں بہت سے اتنے ہی سنگین واقعات پیش آئے۔

یوم راست اقدام-16 اگست 1946: کلکتہ فسادات

کلکتہ میں مار کاٹ کا سلسلہ، کسی نہ کسی شکل میں پورے سال، اگست 1946 سے آزادی حاصل ہونے تک جاری رہا۔ یہاں اس کے آثار جناح کی طرف سے 'راست اقدام' کے اعلان سے پہلے ہی پیدا ہو چلے تھے۔ حالات خراب ہونے کا سلسلہ نومبر 1945 کے آس پاس شروع ہوا۔ اگرچہ شروع میں معاملہ فرقہ وارانہ نوعیت کا بالکل نہیں تھا مگر پھر بھی اس کی وجہ سے بے چینی کی فضا پیدا ہوئی اور فرقہ وارانہ فساد کے لئے زمین تیار ہونے لگی۔ مثال کے طور پر، 21 نومبر 1945 کو کوئی پانچ سو طلبہ کا ایک جلوس 'آئی این اے ڈے' کے سلسلے میں نکالا گیا۔ یہ جلوس تقریباً ایک طے شدہ منصوبے کے تحت، (جان بوجھ کر اور دیدہ دلیری کے ساتھ) ایک ممنوعہ علاقے میں داخل ہو گیا جہاں پولس کے ساتھ اس کا ٹکراؤ ہوا اور ایک طالب علم ہلاک ہو گیا۔ اگلے دن تشدد پورے شہر میں پھیل گیا۔ ساتھ ہی ہڑتال بھی کر دی گئی جس سے یہ پر ہجوم شہر مکمل

افراتفری کا شکار ہوگیا۔ تاہم دیگر اس قسم کے معاملات کی طرح یہ معاملہ بھی رفع دفع ہوگیا۔

1946 کے اوائل میں اس شہر میں فرقہ ورانہ کشیدگی بڑھ گئی۔ 11 فروری 1946 کو، نومبر 1945 کی طرح، طلبہ نے پھر مظاہرہ کیا جو آئی این اے رہنماؤں پر چلائے جانے والے مقدمے کے خلاف تھا۔ مگر اب اس معاملے میں آئی این اے کے ایک مسلم افسر کا معاملہ بھی شامل ہوچکا تھا جس کا کورٹ مارشل کر دیا گیا تھا۔ مظاہرین، جو اس بار بیشتر مسلمان تھے، اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ اس افسر کو زیادہ سزا دی گئی جب کہ آئی این اے کے ہندو افسروں کو کم سزائیں دی گئیں۔ یہ احتجاج کھلے طور پر کسی کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ احتجاج کی حمایت میں سارے کلکتہ میں مسلمانوں کی دکانیں بند رہیں اور انہوں نے مسلم لیگ کے جھنڈوں کے ساتھ اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ اس مظاہرے نے بھی ␣ی سے عوامی تشدد کی شکل اختیار کرلی۔ جو نومبر 1945 کے مقابلے زیادہ دن تک جاری رہا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے ان فسادات کی اپنے اپنے انداز سے تعبیر کی۔ کانگرس والوں کے نزدیک غنڈوں اور غیر ذمے دار عناصر شہر پر چھا گئے تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے لئے یہ طاقت کا مظاہرہ تھا۔ الزام لگایا گیا کہ ایچ ایس سہروردی جو اس وقت بنگال مسلم لیگ کے ایک ممتاز رہنما اور جلد ہی وزیر اعلا ہونے والے تھے، نے پہلے ان مظاہروں کو اکسایا اور پھر انہیں ہوا دی۔

جب لیگ اپنی قرارداد منظور کر رہی تھی تو کلکتہ میں کچھ اور ہی سلسلے چل رہے تھے۔ جس دن (29 جولائی 1946) راست اقدام قرارداد منظور کی گئی، محض اتفاقاً ٹرانسپورٹ اور صنعتی مزدوروں اور سرکاری ملازموں کی یک روزہ ہڑتال کی وجہ سے شہر پوری طرح مفلوج ہوکر رہ گیا تھا۔ اس ہڑتال کے ساتھ ہی 21 جولائی سے جاری محکمہ ڈاک کے ملازمین کی ہڑتال بھی شامل ہوگئی۔ جیسے یہ تمام مظاہرے کافی نہ ہوں، امپیریل بینک ملازمین کی ہڑتال کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ ان تمام ہڑتالوں کے اثرات تہہ در تہہ جمع ہوگئے جس سے ان کے نتائج کی سنگینی اور بڑھ گئی، اور ایسے تمام عناصر اور طاقتوں نے جنہیں اتھل پتھل اور انتشار میں مزہ آتا ہے شہروں کو یرغمال بنالیا۔

ملک کے ان قابو سے باہر ہوتے چلے جانے والے حالات میں، دوسری طرف، برطانوی راج کے مرکز، دہلی میں، 19 اگست 1946 کو نہرو، عبوری حکومت بنانے کی وائسرائے کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے 15 اگست 1946 کو بمبئی میں جناح کے ساتھ عبوری حکومت اور عمومی ہندو۔ مسلم مسئلے پر بات چیت کے لئے جناح سے ملاقات کی۔ ایسا لگتا ہے کہ 'یوم راست اقدام' کا کہیں زیادہ اہم مسئلہ زیر غور نہیں آیا، نہ نہرو۔ جناح مراسلت میں اور نہ ان کی ملاقات کے دوران 45۔ اس وقت کئی الگ الگ واقعات ایک ساتھ جمع ہوکر اپنے نتائج کو سنگین کرنے میں لگے ہوئے تھے، جیسے کوئی بدی کی طاقت 16 اگست کے لئے ماحول تیار کرا رہی ہو۔ جب جناح 'یوم راست اقدام' کا اعلان کر رہے تھے تو دوسری طرف نہرو اپنی عبوری حکومت بنانے کی مصروفیات میں غرق تھے، وائسرائے مصالحت تک پہنچنے کی آس لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور گاندھی، سیوا گرام میں، اپنی داستانی زندگی کا 'آخری منظرنامہ' ترتیب دینے میں لگے ہوئے تھے۔ افسوس کہ

اب وہ اس کانگریس کی طرف سے زیادہ سے زیادہ الگ تھلگ اور نظر انداز کیے جا رہے تھے جسے انہوں نے نہایت صبر وضبط اور محنت سے، دہائی در دہائی، تعمیر کر کے گم نامی کے اندھیروں سے حکمرانی کی منزل تک پہنچایا تھا، اور ساتھ ہی قیادت کے تقریباً خلا میں سے ایک مضبوط قیادت (نہرو، پٹیل) بھی ابھار کر لائے تھے۔ وائسرائے، حکومت، حزب اختلاف یا پریس، کسی کو بھی، اپنے سروں پر منڈلانے والی الم ناکی کا اندازہ نہیں تھا، ایک عرصے جمع ہونے والی بے چینیوں کا دبا پڑا دہکتا ہوا پگھلا لاوا ان کی آنکھوں کے سامنے ظاہری امن وامان کی سطح کو توڑ کر پھٹ پڑنے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ وہ سب کے سب اس زمین کے سینے میں مچی ہوئی اس زبردست اتھل پتھل کی گڑگڑاہٹ سن رہے تھے مگر پوری طرح جڑ اور بے حس وحرکت ہو کر رہ گئے تھے، جیسے کسی نے انہیں عمل تنویم کے زیر اثر ناکارہ کر دیا ہو۔ خود یہی لوگ تھے جنہوں نے بدنظمی اور انتشار کے آتش فشانوں کے منہ کھولے تھے اور اب وہی ان کا منہ بند کرنے میں معذور نظر آ رہے تھے۔

صرف قتل عام ہی نہیں بلکہ اس کے سلسلے میں ہندوستانی رہنماؤں، وہ تمام لوگ جو اس وقت ملک میں 'جانشینی کی جنگ' لڑنے میں لگے ہوئے تھے، کا ردعمل بھی انتہائی ناقابل بیان حد تک الم ناک تھا، اور ناقابل معافی بھی۔ نہرو پٹیل آزاد اگرچہ عبوری حکومت کی تشکیل میں اتنے مصروف تھے کہ کلکتہ سے اٹھنے والی آوازیں ان تک پہنچ ہی نہیں پا رہی تھیں۔ پریس کی طرف سے پوچھے جانے پر (فسادات کی ابتدائی اطلاعات کے بارے میں) کہ کیا کلکتہ کی بدامنی ان کے منصوبوں پر اثر انداز ہوگی، نہرو نے جواب دیا، 'کلکتہ میں چند لوگوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے ہمارے پروگرام میں یقینی طور پر کوئی الٹ پلٹ نہیں ہوگی۔'46 جب کانگریس کو اس المیے کی خوف ناکی کا احساس ہوا تو وقت گنوائے بغیر اس کی ذمے داری پوری طرح بنگال کی لیگ وزارت کے سر ڈال دی گئی، ج سکا اس بار کافی جواز بھی تھا۔ اس کے بعد الزام تراشیوں کی ایک افسوس ناک، سفاکانہ اور بے معنی سلسلہ چل نکلا جس میں جب ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرا رہے تھے جب کہ اسی وقت کلکتہ کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں موت اور فرقہ وارانہ تشدد کا خوف چھایا ہوا تھا۔ اگست 1946 کے فساد کے بعد مارچ کے اواخر میں یہاں ایک اور بڑا فساد ہوا۔ اور پھر تو فسادات ایک معمول بنتے چلے گئے، جیسے کسی پرانے لاعلاج وبائی مرض نے اس بڑے شہر کو آ لیا ہو۔ یہ مرض جنگل کی آگ کی طرح ایک علاقے سے دوسرے علاقے، ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک □ی سے پھیلتا گیا، کہ ایک فساد دوسرے فساد کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا تھا۔

کیا ان نامبارک واقعات کا اندازہ پہلے سے نہیں کیا جا سکتا تھا؟ اب جب کہ کیبنٹ مشن برطانیہ واپس جانے کو تھا، مسلم لیگ محسوس کر رہی تھی کہ اسے مات ہو گئی ہے اور یہ بھی کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے۔ کیوں کہ پوری حکومت کی تشکیل کا معاملہ ملتوی ہو چکا تھا، جناح نے مطالبہ کیا کہ آئین اسمبلی کو بھی ملتوی کر دیا جائے، اور جب ان کا یہ مطالبہ بھی نہیں مانا گیا تو انہوں نے کیبنٹ مشن پر کھلی عہد واعتماد شکنی کا الزام لگایا اور اس کی طرف سے پیرا 8 کی تعبیر کو 'خیالی اور غلط' قرار دیا۔ یہ سب شاید قرین قیاس تھا مگر پھر بھی، جناح کی شکست اور خوردگی کے لیے کہیں بھی کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی۔ عام خیال یہی تھا کہ وہ اپنا بویا ہی کاٹ رہے ہیں۔ ایسے میں اکیلے گاندھی تھے جو ان کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: 'انہیں (کیبنٹ

مشن) ان (جناح) کے ساتھ اس قانونی انداز میں پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ ایک عظیم ہندوستانی اور ایک بڑی جماعت کے تسلیم شدہ رہنما ہیں۔'

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، لیگ کی گزارش ٹھکرا دیئے جانے کے جواب میں لیگ کونسل نے 29 جولائی کے اپنے اجلاس میں کیبنٹ مشن کے 16 مئی کے منصوبے کو پہلے دی گئی حمایت واپس لے لی۔ اور اس کے ساتھ ہی پاکستان حاصل کرنے اور 'آئندہ جدوجہد کے لئے، جب بھی ضروری ہو، مسلمانوں کو منظم کرنے، کے لئے 'راست اقدام' کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ 16 اگست کو 'یوم راست اقدام' قرار دیا گیا جسے سارے ملک میں یوم احتجاج کے طور پر منایا جانا تھا۔ 'راست اقدام' قرارداد کی منظوری کے فوراً بعد، جناح نے مسلم لیگ کونسل کے اختتامی اجلاس میں زبردست صدائے تحسین کے درمیان اعلان کیا، 'آج ہم آئینی طریقوں کو خیر باد کہہ رہے ہیں۔' مزید یہ کہ 'ہم نے ایک پستول بھی تیار کر لی ہے اور اسے چلانے کے لئے تیار بھی ہیں۔'

31 جولائی کو ایک پریس کانفرنس کے دوران جناح نے اس بات کا مفہوم اور واضح کرنے کے لئے کہا کہ انگریز اور کانگرس دونوں ہی اپنے اپنے انداز سے لیس ہیں، ایک کے پاس ہتھیار ہیں تو دوسرے کے پاس عوامی جدوجہد کی دھمکی ہے، ایسے میں مسلم لیگ نے محسوس کیا کہ خود اپنے طریقے وضع کرے اور پاکستان کے مطالبے پر زور دینے کی غرض سے جدوجہد کی تیاری کرے۔ انہوں نے مجوزہ 'راست اقدام' کی تفصیلات ظاہر کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ 'میں اس بارے میں ابھی کچھ کہنے کو تیار نہیں ہوں۔' اس سوال پر کہ کیا یہ پر تشدد، ہوگا یا بلا تشدد ان کا جواب تھا 'میں اخلاقیات پر بات کرنا نہیں چاہتا۔'

اس کے بعد، مسلم لیگ نے 29 جولائی کی اپنی قرارداد پر عمل کرنے کے لئے ایک 'مجلس اقدام' تشکیل دی۔ اس کے اجلاس اگرچہ بند کمروں میں ہوئے مگر اس کا منصوبہ عمل جو اس نے وضع کیا اور جسے بعد میں مسلم لیگ پریس نے ظاہر اور شائع کیا خاصا واضح تھا۔ مسلمانوں کو یاد دلایا گیا کہ یہ ماہ رمضان تھا جب عرب میں 313 مسلمانوں نے اسلام اور کفر کے درمیان پہلی کھلی جنگ لڑی اور جیتی تھی۔ 'راست اقدام' کے لئے ایک خصوصی دعا کے حامل ایک پرچے میں کہا گیا کہ دس کروڑ ہندوستانی مسلمان جو بد بختی سے ہندوؤں اور انگریزوں کے غلام بن گئے ہیں، اسی ماہ رمضان میں جہاد کریں گے۔' ایک اور پرچے میں تلوار ہاتھ میں لئے جناح کی تصویر کے ساتھ کہا گیا تھا: 'ہم مسلمانوں کے پاس تاج و تخت رہا ہے اور ہم نے حکمرانی کی ہے۔ اٹھو اور اپنی تلواریں سونت لو... اے کافر! تیری تباہی بہت دور نہیں اور قتل عام ہونے کو ہے۔'

اس وقت بنگال میں شہید سہروردی کی قیادت والی مسلم لیگ کی حکومت قائم تھی۔ لیگ اور کیبنٹ مشن کے درمیان علاحدگی کے بعد، سہروردی نے اعلان کیا تھا کہ اگر کانگرس مرکز میں برسر اقتدار لائی گئی تو بنگال بغاوت کا علم بلند کر دے گا۔ کوئی صوبائی مالیہ مرکز کو ادا نہیں کیا جائے گا اور بنگال اپنی آزاد حکومت قائم کر لے گا جس کا مرکزی حکومت سے

کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

'راست اقدام' کا منصوبہ 16، 17 اور 18 اگست کو کلکتہ میں اپنے انجام کو پہنچا۔ 15 اگست کی آدھی رات سے ، مسلمانوں کے مختلف ہتھیاروں سے لیس منظم غول شہر کی سڑکوں پر گشت کرنے لگے، رات کے سناٹے کو اپنے نعروں سے چیرتے ہوئے۔ 16 اگست کی صبح مطلع ابر آلود تھا مگر بارش شام تک تھمی رہی۔ شر پسند مسلمان 16 کی صبح سے ہی سرگرم ہو گئے تھے اور دوپہر تک شہر کے کئی حصوں میں زندگی کے تقریباً تمام معمولات ٹھپ پڑ چکے تھے۔ لاٹھیوں، بھالوں اور خنجروں سے لیس مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلوس کلکتہ میں ایک جلسہ عام میں شرکت کرنے کے لئے ہوڑہ سے روانہ ہوا۔ ایک آرمی سرجنٹ نے اسے ہوڑہ پل پر روک لیا۔ جلوس والوں کے ہتھیار لے لئے گئے۔ ان کے پاس سے اتنا ہلاکت خیز اسلحہ اور گولہ بارود برآمد ہوا کہ دو ٹرک بھر گئے۔

مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کہ شام تک حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور سارے شہر میں تقریباً مکمل افراتفری پھیل گئی، جب سہروردی کے زیر صدارت جلسہ عام کے بعد واپس ہونے والے بے پناہ اور بے قابو ہجوم نے ہڑتال میں حصہ نہ لینے والوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ان کی دکانیں لوٹ لی گئیں اور ان کا سامان سڑک پر پھینک دیا گیا، نجی کاریں اور ٹرامیں جلا دی گئیں، راہ گیروں پر حملے کئے گئے اور انہیں چاقو گھونپے گئے۔ تمام گاڑیوں کی آمد و رفت اور لازمی خدمات ٹھپ پڑ گئیں۔ سڑکوں پر صرف مسلم لیگ کی غنڈوں سے بھری لاریاں اور جیپیں نظر آتی تھیں جو پاکستان حامی نعرے لگاتے ہوئے لوگوں کو تشدد پر آمادہ کر رہے تھے۔

کلکتہ میں 16 اگست کو 'راست اقدام' منانے کی غرض سے شروع ہونے والا فرقہ وارانہ تشدد، عمل اور رد عمل کے سلسلوں سے گذرتا ہوا، کسی وبائی مرض کی نہایت □ رفتاری کے ساتھ کلکتہ سے مشرقی بنگال کے دیگر حصوں میں پھیلتا چلا گیا۔ نواکھالی اس کا پہلا شکار بنا اور پھر یہ سلسلہ بہار، اور وہاں سے پنجاب تک جا پہنچا۔ بد قسمتی سے مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے رہنماؤں نے ان فسادات کو یرقان زدہ سیاسی آنکھوں سے دیکھا جہاں کسی انسانی سروکار کا نام ونشان تک نہ تھا۔ صرف گاندھی تھے جو سب سے الگ نظر آئے۔

کم کرسٹن نے دی اسٹیٹس مین میں اس المیے کا پوری جزئیات کے ساتھ بیان کیا: 'ایک جنگی اسپتال میں بھرتی ہونے کے تجربے سے میرا نظام ہضم خاصا مضبوط ہو گیا ہے مگر کوئی جنگ کبھی ایسی نہیں دیکھی گئی۔' دی اسٹیٹس مین نے اپنے اداریے میں لکھا: 'یہ کوئی فساد نہیں ہے۔ اسے بیان کرنے کے لئے عہد وسطیٰ کی تاریخ میں پایا جانے والا کوئی لفظ چاہیے، عوامی برہمی، مگر 'برہمی' میں از خود ہونے کا مفہوم ہوتا ہے مگر اس برہمی کو باہر لانے میں غور وفکر اور تنظیم کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کے گروہ جو اپنی آٹھ فٹ لمبی لاٹھیوں سے لوگوں کو پیٹتے اور قتل کرتے پھر رہے تھے، انہوں نے یہ لاٹھیاں کہیں پڑی پائی ہوں گی یا اپنی جیبوں سے نکالی ہوں گی مگر اس پر یقین کرنا مشکل ہے۔ ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ ان گروہوں

کے لئے پٹرول اور گاڑیاں حاصل کرنا بالکل آسان تھا جب کہ کسی اور کو سڑکوں پر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ محض قیاس نہیں ہے کہ رعب پیدا کرنے کی غرض سے باہر کے لوگوں کو کلکتہ لایا گیا۔' اخبار کے اسی شمارے میں شائع شدہ خاص مضمون بہ عنوان 'حد درجہ شرم ناک' میں کہا گیا:

'ایک بہت بڑے صوبے کی راجدھانی میں اس خوف ناک فساد اور نقصان کا سلسلہ، جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کا بدترین فرقہ وارانہ فساد تھا، مسلم لیگ کے ایک سیاسی مظاہرے سے شروع ہوا... فساد سے پہلے کے اس کے طرز عمل سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اور صرف سیاسی مخالفین کی طرف سے نہیں، کہ وہ یہ سوچ کر کشمکش میں مبتلا تھی کہ فساد کرانا ٹھیک ہوگا یا نہیں... ملک کے سب سے بڑے شہر کو جس طرح لاشوں کا ڈھیر بنا دیا گیا ہے وہ نہایت شرم ناک ہے اور بنگال میں لیگ کی وزارت ہونے کے سبب خود لیگ کی کل ہند شبیہ ناگزیر طور پر بری طرح داغ دار ہوئی ہے۔'

کلکتہ سے واپسی کے بعد، جلد ہی، ویول نے 27 اگست 1946 کو گاندھی اور نہرو سے ملاقات کی اور کہا، 'میں ابھی ابھی کلکتہ ہو کر آیا ہوں اور وہاں جو کچھ دیکھا اس سے خوف زدہ ہوں۔'47 انہوں نے اس کے بعد اس خون خرابے کی بے پناہی کا ذکر کیا، یہ قبول کرتے ہوئے کہ 'بحیثیت ایک انگریز، انہیں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے اقدامات کے بارے میں رائے دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، حالاں کہ انہوں نے اس کی پوری طرح مذمت بھی کی مگر وہ ان جماعتوں کے نام پر کی گئی بہیمیوں پر افسردہ نظر آئے۔' انہوں نے مزید کہا کہ 'جب تک وہ ہندوستان کے وائسرائے ہیں، اس بات کو ضرور سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے کسی اور قتل عام کی روک تھام کے لئے ہر ممکن کوشش کریں... وہ اس سفاکی اور بہیمیت کو انگیز نہیں کر سکتے نہ تو ایک انگریز کے طور پر اور نہ ایک انسان کی طرح۔ وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے اگر انہوں نے دونوں فرقوں، ہندوؤں اور مسلمانوں، کو ایک ساتھ لانے اور اس بات پر آمادہ کرنے کے لئے شدید کوششیں نہ کیں کہ مل جل کر کام کرنا ہی آزادی حاصل کرنے کا واحد یقینی طریقہ ہے۔'48

اس ملاقات سے متعلق لیونارڈ موزلے کا بیان اور اس کا اصل متن ضمیمہ 7 میں پیش کیا گیا ہے۔ ویول نے بھی اپنی ڈائری میں اسے کہیں زیادہ شائستہ مگر محسوس کی جا سکنے والی تکلیف بھرے لفظوں میں اس ملاقات کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ پینڈل مون (وائسرائے جنرل کے مدیر) کی رائے اصل متن سے پہلے شامل کی گئی ہے:

'وی پی مینن کے مطابق کلکتہ سے واپسی کے بعد لارڈ ویول کے رویے اور پالیسی میں ایک قابل لحاظ تبدیلی نظر آئی۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اگر کانگرس اور لیگ کے درمیان جلد از جلد کوئی مفاہمت نہیں کرائی جاتی تو کلکتہ کی بدنظمی ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ نظام الدین نے انہیں آئین ساز اسمبلی میں شرکت کے تئیں لیگ کے رویے کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے بھی انہیں ضرب پہنچی تھی۔ اسی اسباب کے تحت انہوں نے نہرو اور گاندھی کو آئین ساز اسمبلی سے متعلق ایک ایسا بیان دینے پر آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کی (اگلے اندراج میں شامل) جس سے لیگ

مطمئن ہو سکے۔ ویول کی ڈائری کے اندراجات اس لائق ہیں کہ ان کا مکمل حوالہ پیش کیا جائے، کیوں کہ 'یوم راست اقدام' سے شروع ہونے والے زبردست خون خرابے کے سبب ہی ہندوستان کی تقسیم ہم سے نزدیک تر ہو گئی۔

27 اگست: 'میں نے طے کیا کہ کانگرس کو آئین ساز اسمبلی میں 'گروپنگ' سے متعلق ارادوں کی وضاحت کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا، کیوں کہ یہ واضح طور پر لیگ کی طرف سے حمایت میں ایک سب سے بڑی رکاوٹ ہے، لہذا میں نے گاندھی اور نہرو سے کہا کہ وہ شام کو آکر مجھ سے ملیں... یہ ملاقات بہت کامیاب نہیں رہی۔ بوڑھے آدمی (گاندھی) کا رویہ قانون پسندانہ اور بداندیشانہ تھا، اور نہرو لیگ کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے نزدیک ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کا پرامن امکان نئے آئین کے تحت اولین انتخابات تک صرف اسی وقت ہے جب کانگرس یہ واضح بیان جاری کرے کہ اسے صوبوں کے اپنے سیکشنوں میں رہنے کا موقف منظور ہے، جیسا کہ مشن چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ جب تک یہ مسئلہ طے نہیں ہو جاتا، وہ آئین ساز اسمبلی طلب کرنے کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتے۔ میں نے انہیں اس بیان کا مسودہ پیش کیا جو میں ان سے دلوانا چاہتا تھا۔ (یہ بیان تھا): '' کانگرس فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے حق میں 16 مئی کے بیان کے اس عندیے کو ماننے پر آمادہ ہے کہ جب تک نئے آئینی انتظامات روبہ عمل لانے جانے کے بعد نیا قانون ساز یہ 16 مئی کے بیان کے پیرا (VIII) 19 میں مذکورہ فیصلہ نہیں کرتی، اور پہلے عام انتخابات نہیں ہو جاتے، صوبے اس سیکشن یا گروپ، اگر وہ تشکیل پا جاتے ہیں، کے اپنے حصے کو متاثر کرنے والے اختیارات کا استعمال نہیں کریں گے۔'49

'گاندھی نے مشن کے بیان کا مفہوم بیان کرنے کے لئے ایک طویل قانونی بحث شروع کر دی۔ میں نے کہا کہ میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں، کوئی وکیل نہیں ہوں، اور میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ مشن کی کیا مراد ہے۔ اور یہ کہ یہ لازمی 'گروپنگ' ہی اصل معاملہ ہے۔

'بحث کچھ دیر تک چلتی رہی، پھر نہرو بہت گرم ہو گئے، گاندھی نے کہا کہ اگر خون خرابہ ہونا ہی ہے تو وہ عدم تشدد کے باوجود ہو گا۔ میں نے کہا کہ مجھے ان سے اس قسم کی بات سن کر بہت دھچکا لگا۔ آخر میں وہ فارمولا اپنے ساتھ لے گئے مگر مجھے یقین نہیں کہ ان کی طرف سے اسے قبول کئے جانے کا زیادہ امکان ہے۔'

28 اگست: صبح مجھے گاندھی کا ایک توہین آمیز اور منتقمانہ مکتوب ملا، جس کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اسے بذریعہ ٹیلی گراف برطانیہ ارسال کر دیا جائے، واضح طور پر 'خون خرابے' سے متعلق ان کی رائے زنی پر میری جھڑکی ٹھیک نشانے پر لگی تھی۔ اس سے گاندھی کے بارے میں ہمیشہ کے میرے اس خیال کی تصدیق ہوئی کہ ان کا عدم تشدد اختیار کرنا اور ان کا فقیرانہ طرز ان کی فطری صفات نہیں بلکہ محض انگریزوں کے خلاف سیاسی ہتھیار ہیں۔ یہ ایک طرح سے اعلان جنگ تھا اور میں نے سوچا کہ کہیں میری کیسر ٹیکر کونسل کی یہ آخری میٹنگ تو نہیں ہے۔ تاہم بعد میں مجھے نہرو کی طرف سے امن کانفرنس

اور اقوام متحدہ اسمبلی سے متعلق نامزدگیوں کے بارے میں ایک مکتوب موصول ہوا، جس سے لگا کہ کانگرس اب بھی حکومت میں آنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

گاندھی کا خط یوں ہے:

28 اگست، 1946

پیارے دوست!

میں یہ خط ایک دوست کی طرح اور گہرے غور و فکر کے بعد لکھ رہا ہوں۔ گزشتہ شام کئی بار آپ نے دہرایا کہ آپ ایک 'سیدھے سادے آدمی اور ایک سپاہی' ہیں اور یہ کہ آپ قانون نہیں جانتے۔ ہم بھی سیدھے سادے لوگ ہیں حالاں کہ ضروری نہیں سپاہی بھی ہوں مگر ہم میں سے کچھ لوگ قانون بھی جانتے ہیں۔ ہمارا مقصد ہے ایسے طریقے تلاش کرنا جن سے کلکتہ میں ہونے والے حالیہ خوف ناک واقعات کو دوبارہ ہونے سے روکا جا سکے۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہم یہ کام کتنی عمدگی سے کر سکتے ہیں۔

کل شام آپ کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ اپنے بادشاہ کے نمائندے کی حیثیت سے آپ محض ایک فوجی ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے، اور نہ قانون، اور وہ بھی خود اپنے وضع کردہ قانون کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ضروری ہو تو آپ کو اپنے اعتماد کے کسی قانون داں ذہن کی مدد لینی چاہیے۔ آپ نے دھمکی دی کہ اگر کانگرس نے فارمولے پر عمل نہ کیا، جسے آپ نے پنڈت نہرو اور میرے سامنے رکھا تھا، تو آپ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس نہیں بلائیں گے۔ اگر بات واقعی یہی ہے کہ آپ کو وہ اعلان نہیں کرنا چاہئے تھا جو 12 اگست کو آپ نے کیا۔ مگر یہ اعلان کرنے کے بعد آپ کو چاہیے کہ اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے مکمل اعتماد والی ایک اور وزارت تشکیل دیں۔ اگر برطانیہ کے ہتھیار داخلی امن و امان کے لئے ہیں تو پھر آپ کی عبوری حکومت محض ایک ڈھونگ بن کر رہ جائے گی۔ کانگرس برطانوی ہتھیار استعمال کر کے ہندوستان کے برسرِ پیکار عناصر پر اپنی مرضی تھوپنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کانگرس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بنگال میں بہیمیت کے حالیہ مظاہروں کی وجہ سے جھک جائے گی اور ایک ایسا راستہ اختیار کر لے گی جسے وہ غلط سمجھتی ہے۔ اس طرح جھکنے سے ایسے الم ناک واقعات کی حوصلہ افزائی ہوگی اور انہیں دہرائے جانے کا موقع ملے گا، دونوں طرف کے انتقامی جذبات شدید تر ہو جائیں گے، اور وہ جب بھی موقع ملے گا اور زیادہ بھیانک اور شرم ناک انداز سے ظاہر ہوں گے۔ اور یہ سب بنیادی طور پر ہندوستان میں ایک ایسی غیر ملکی اقتدار کی موجودگی برقرار رہنے کی وجہ سے ہوگا جسے اپنی طاقت اور ہتھیاروں پر ناز ہے۔

میں یہ سب ایک ہندو یا مسلم کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں یہ تحریر محض ایک ہندوستانی کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، کانگرس ہندو اور مسلم ذہن کو آپ یا کسی بھی انگریز کے مقابلے کہیں زیادہ سمجھتی ہے۔ لہذا یا تو آپ اس کانگرس حکومت پر پوری طرح اعتماد کریں جس کا آپ نے اعلان کیا ہے، ورنہ تو آپ کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنی

ہوگی، جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔

برائے کرم اس خط کو پوری طرح برطانیہ کی کابینہ کو ارسال کر دیجئے۔ .

آپ کا مخلص

ایم کے گاندھی

سونے سے پہلے مجھے نہرو کا مکتوب ملا، مگر چوں کہ یہ میری نیند خراب کر سکتا تھا، اس لئے میں نے اسے پڑھا ہی نہیں۔

29 اگست: نہرو کا مکتوب شاید اس سے بدتر تھا اور مجھے لگتا ہے کہ میں آئین ساز اسمبلی کے بارے میں کچھ بھی کہوں، کانگرس ہر حال میں حکومت میں آنا چاہتی ہے، میں نے اس کا جواب لکھا اور کہا کہ یہ قانونی تعبیرات کا نہیں، عملی سیاست کا معاملہ ہے۔ تبھی مجھے سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے اک گھبراہٹ والا تار ملا جس میں کہا گیا تھا کہ میں کانگرس سے جلد بازی میں کوئی بات نہ کروں۔'

پینڈرل مون نے اس پر اپنے اس ادارتی تبصرے کا اضافہ کیا ہے: 'نہرو نے اپنے مکتوب میں کہا تھا کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی ویول کی درخواست کے مطابق 'گروپنگ' کے بارے میں کوئی واضح بیان جاری کرنا نہیں چاہتی۔ انہوں نے کہا کہ کانگرس نے کیبنٹ مشن منصوبے کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے مگر اس کی تعبیر اسی طرح کی ہے کہ اس میں موجود تضادات دور ہو جائیں... اس کا کہنا ہے کہ صوبائی خود مختاری ایک بنیادی معاملہ ہے اور ہر صوبے کو اس کا اختیار ہے کہ وہ کوئی گروپ بنانا یا اس میں شامل ہونا چاہتا ہے یا نہیں'۔ تعبیر سے متعلق سوالات کو وفاقی عدالت کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔'

ویول کی یہ کوششیں بے نتیجہ رہیں۔ شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی اور کانگرس اور مسلم لیگ میں سے کسی کے لئے اپنے اعلان شدہ موقف کو تبدیل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اب وقت کا دھارا انسانوں کو بہائے لئے جا رہا تھا نہ کہ اس کا برعکس۔

8

بے نتیجہ مذاکرات

جناح کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں سنبھالنا مشکل ہوتا تھا لیکن ان دنوں مسلم لیگ میں کسی کی چلتی تھی تو وہ صرف جناح تھے۔ اس لئے کانگریس میں بہت کم اہمیت کے حامل قوم پرست مسلمانوں (یعنی آزاد اور غفار خاں) کے ساتھ بات چیت میں انہیں شامل کرنے کی جو کوشش کی جاتی تھی اس سے وہ چڑتے تھے، شاید ان کا چڑنا بجا بھی تھا کیوں کہ انہیں یہ گمان گزرتا تھا کہ اس طرح کے حیلے جان بوجھ کر انہیں کمتر کرنے کے لیے تراشے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کانگریس میں گاندھی، نہرو اور پٹیل کی تثلیث تھی۔ کابینہ مشن میں جناح ہمیشہ اکیلے ایک طرف ہوتے تھے اور ڈھیر سارے کانگریسی لیڈر دوسری طرف۔ کانگریس سے کوئی جواب حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ وائسرائے جرنل میں ایسی کئی مثالیں دی گئیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر کابینہ وفد ان کے ردعمل کا اندازہ کرنے میں عجلت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ گاندھی کانگریسیوں میں ایسے لیڈر تھے جن کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کب کیا کریں گے۔ وہ ویول کو بار بار اپنی ڈائری میں ان کی ناراضگی کے بارے میں نوٹ لینے کو کہتے تھے۔ یہ ہمیں اس کے لئے مجبور کرتا ہے کہ سوچیں، ایک واحد آئین ساز اسمبلی کی تشکیل میں، ایک عبوری حکومت کے قیام میں بھی گاندھی کے رول پر سوالیہ نشان قائم کردے۔

ویول نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

6 مئی 1946۔ وہ (گاندھی) شام 7.30 بجے آئے............ ان لوگوں (کابینہ وفد) کو جھٹکا لگا۔ گاندھی غفار خاں اور پٹیل دو حکومت بیزار لیڈروں کے ساتھ رہتے تھے۔ اور ان لوگوں کے نقطہ نظر کو پوری طرح اپنا لیا تھا............ یا تو ہم لوگ مکمل طور پر کانگریس کے نقطہ نظر کو اپنا لیں یا جناح کے نقطہ نظر کو، یہ نہیں ہوسکتا کہ ادھر بھی رہیں اور اُدھر بھی۔ ایسا نہیں

لگتا تھا کہ گاندھی کو خانہ جنگی کے اندیشے پر کسی طرح کا کوئی تردد ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ گاندھی نے پٹیل کے اس مفروضہ سے پوری طرح سے اتفاق کرلیا تھا کہ ہم اٹل رہیں گے تو مسلمان نہیں لڑیں گے۔ ڈائری میں اس کے تقریباً 15 دن کے بعد کا ایک اندراج یہ ہے:

19 مئی 1946۔ تب کرپس نے گاندھی کے ساتھ 7 گھنٹے تک چلنے والی بات چیت کا مختصر بیان کیا۔ اس کے بعد انہوں (کابینہ وفد) نے گاندھی کا ایک خط پیش کیا۔ یہ صوبوں کے گروپوں کو Wreck کرنے (یعنی توڑنے) کے لئے کانگریس کی پہلی کوشش تھی۔ وفد نے ہمارے (16 مئی کے) بیان پر ثابت قدم نہ رہ کر خود کو اس صورت حال میں ڈالا تھا؛ ان لوگوں نے گاندھی کے 7 گھنٹے تک بات کی تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ایک اہل مگر بے ایمان سیاست داں پورے منصوبے کو ختم کرنے کی بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک سازش کر گیا تھا۔

20 مئی 1946۔ اس کے فوراً بعد ان (لارڈ پیتھک لاورنس) کو گاندھی کا دوسرا خط تھمایا گیا انہوں نے اسے پڑھ کر سنایا۔ میں نے (کابینہ وفد میں شامل) ان تینوں افراد کو گاندھی کے اپنے اصل رنگ میں آجانے پر جتنا حیران ہوتے دیکھا، اتنا حیران کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کرپس اور سکریٹری آف اسٹیٹ اندر سے ہل گئے تھے جب کہ الیگزینڈر کا ردعمل جان بل کی طرح کا تھا یعنی انتہائی محب وطن اور تنگ نظری کا۔

اس کے بعد وائسرائے جرنل کے ایڈیٹر پنڈرل مون کے وضاحتی تبصرے شروع ہوجاتے ہیں "اپنے دوسرے مکتوب میں گاندھی نے ان دوسرے نکات پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی انہوں نے کرپس اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ بات چیت میں اٹھائے تھے اور جن کے بارے میں کرپس کا دعوی تھا کہ انہوں نے گاندھی کو مطمئن کر دیا تھا۔ لیکن اب یہ بات واضح ہوگئی کہ گاندھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ نے کہا کہ ان کے مکتوب میں جو بات کہی گئی ہے وہ ان کے ساتھ انٹرویو میں ہونے والی بات چیت کی درست نمائندگی نہیں کرتی۔ اور اب انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ کسی بھی شخص کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ گاندھی کو وفد کے دوسرے ممبروں سے الگ دیکھے اور نوٹ لینے سے گریز کر جائے۔ الیگزنڈر نے کہا کہ یہ بالکل واضح ہے کہ گاندھی بیان کی بنیاد پر معاملات کو حل ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے اور ان (گاندھی) کا مکتوب وفد کے موقف کی کھلی ہوئی غلط نمائندگی کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اس باب میں اس سے پہلے ذکر کیا ہے گاندھی نے 8 مئی 1946 کو سرائے فورڈ کرپس کے نام ایک خط میں گروپنگ اسکیم کو مسترد کرنے کا پرزور اظہار کیا ہے۔ وہ اس کے برعکس آبادی کی بنیاد پر ایک مرکزی قانون ساز ادارہ اور ایک ایگزیکیٹو کے قیام کے خواہش مند تھے۔

اندراجات جاری رہتے ہیں:

11 جون 1946 پیتھک لاورنس گاندھی سے ملنے کے طرف دار تھے۔ الیگزنڈر اس کے بالکل خلاف تھے۔

یہاں تک کہ انہوں نے یہ دھمکی دے ڈالی کہ اگر پیتھک لاورنس نے زیادہ اصرار کیا تو وہ سیدھے گھر چلے جائیں گے....اس دوران جارج ایبل یہ پیغام لے کر آئے کہ گاندھی سچ مچ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ مساوات کی کوئی ضرورت نہیں نہ اس کی کوئی اہمیت ہے کہ ممبران کا تعلق کانگریس سے ہے یا مسلم لیگ سے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو بہترین لوگ دستیاب ہوں وہی ممبر بنائیں جائیں۔

'حالات کی ستم ظریفی ہے کہ اس سیقبل 13 جون 1946 کو پٹیل نے کابینہ وفد اور وائسرائے کو اس کی اطلاع بھیجی کہ عبوری حکومت تشکیل کرنے کی تجویز کو مسترد کرنے کے لئے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے پانچ منٹ کا وقت بھی نہیں لیا۔ اس وقت 13 جون 1946 گاندھی نے جو خط وائسرائے کو بھیجا تھا اس میں خلاف توقع ایک بالکل دوسری بات کہی گئی جو یہ تھی کہ '' آپ کسی گھوڑے کو چنیں۔ اسے یا اسے۔ جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں آپ بیک وقت دو گھوڑوں پر سواری کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یا کانگریس کے پیش کردہ نام چنیں یا مسلم لیگ کے۔ بھگوان کے لئے کوئی بے میل ملغوبہ نہ بنائیں کیوں کہ ایسا کر کے آپ ایک خوف ناک دھاکہ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں'۔

19 جون 1946 سدھیر گھوش اور راج گوپال اچاری سے اس سلسلے میں جو اطلاع ملی وہ یہ تھی کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے گاندھی کے مشورے کے برعکس یہ فیصلہ کیا ہے کہ عبوری حکومت کے لئے کسی قوم پرست مسلمان کا نام پیش نہیں کیا جائے گا۔ اس سے تھوڑی امید بندھی ... بتایا گیا کہ ولبھ بھائی نے قوم پرست مسلمان کے سوال پر گاندھی کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت نہرو کشمیر گئے ہوئے تھے۔

20 جون 1946۔ ایسا لگتا ہے کہ حالات پھر الٹ پلٹ گئے۔ یہ گاندھی کی وجہ سے ہو...اس کے بعد ووڈ رو ویاٹ ایک پیغام لے کر آئے... انہوں نے کہا کہ گوپال اچاری نے انہیں بتایا ہے کہ گاندھی کی ایماء پر کانگریس اپنے کل کے فیصلے سے پھر گئی ہے اور چوں کہ انجینئر ایک افسر ہیں اس لئے انجینئر کا نام ہٹانے اور حکومت میں آزاد کا نام شامل کرنے پر اصرار کر رہی ہے۔ میں نے فوراً کہا کہ دونوں صورتیں قطعی ناقابل قبول ہیں اور آزاد کو سامنے لانے کے پیچھے واضح حکمت عملی یہ ہے کہ جناح کے انکار کو یقینی کر دیا جائے۔

(سر این۔ پی۔ انجینئر افسر نہیں تھے بلکہ اس وقت ایک سرکاری عہدے پر تھے اور وہ عہدہ تھا ہندوستانی آرمی کے ایڈوکیٹ جنرل کا)

کابینہ مشن منصوبہ ناکام ہو گیا کیوں کہ کانگریس اور لیگ دونوں نے 16 مئی کے بیان کی جو ایک دوسرے سے مختلف تشریحات کیں ان کی بنیاد پر دونوں میں ایسی پھوٹ پڑی جس کو سنبھالا نہیں جا سکتا تھا۔ وائس رائے جرنل میں بہت تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کے لئے گاندھی نہرو کو رضامند کرنے کی کوششوں کو ویول کتنی سنجیدگی سے کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ویول نے جو کرنا چاہا تھا وہ کرنے میں ناکام رہ جانے کی قیمت بھی چکائی۔

اس لئے مجھے یہاں اس بات کے لئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے کہ ویول نے کابینہ مشن کے لئے جو نوٹ لکھا تھا اس کے اقتباسات یہاں پیش کروں۔ ویول مصنف تھے اور اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تاریخ کا ان کا علم بہت نمایاں تھا۔ یہاں میں ان کے نوٹس کے جو حصے درج کروں گا ان سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ان کا اور کابینہ مشن کا مقصد کیا تھا۔

25 جون 1946 کو ویول نے جو کچھ لکھا اس کا ایک حصہ یہ ہے:

'کابینہ مشن کو یاد ہوا کہ میں نے یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ اگر کانگریس ہمارے 16 جولائی کے بیان کے اپنی تشریح کی حمایت میں قانونی فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کرے تو کیا ہوگا۔ میرا نکتہ یہ تھا کہ 'یہ بیان' کوئی قانونی دستاویز نہیں ہے اور اس کی تشریح کا انحصار ان لوگوں کی نیتوں پر ہے جنہوں نے یہ بیان تیار کیا۔ اس لئے میں نے سر اسٹافورڈ کرپس کو یہ مشورہ دیا کہ کابینہ مشن ہندوستان سے واپس ہونے سے پہلے ایک ایسا کاغذ تیار کر دے جس میں صاف صاف لکھا ہو کہ جن لوگوں نے یہ دستاویز تیار کی ان کی نیت اس سلسلے میں کیا تھی تا کہ عدالت میں یا کسی اور جگہ جب اس دستاویز کو چیلنج کیا جائے تو میں ہم لوگوں کی نیت کے بار میں بطور ثبوت اسے پیش کر سکوں۔

'سر اسٹافورڈ کرپس نے جو کاغذ تیار کیا ہے اسے میں نہیں سمجھ سکا لیکن اتنا ضرور میری سمجھ میں آیا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس دستاویز کو قانونی لحاظ سے چیلنج کیا جائے گا اور یہ کہ اس کی تشریح پر سوال اٹھائے جا سکتے ہیں؛ اور میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس دستاویز کی تشریح کے لیے آئین ساز اسمبلی ایک ٹریبیونل قائم کر لے۔ میں عام آدمی ہوں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور اسے قبول نہیں کر سکتا کہ ہماری واضح نیتوں کو کسی اور باڈی کے سامنے تشریح کے لئے پیش کیا جانا چاہیے۔

امن مذاکرات کا موسم خزاں

کلکتہ میں ہلاکتوں کے بعد انسانیت دشمنی کا سلسلہ مسلسل ردعمل کی صورت میں جاری رہا۔ آج جو نام ہماری اجتماعی یادداشت سے گم ہو رہے ہیں وہ بربریت اور انسان دشمنی کے مظاہروں کے لئے اس وقت بدنام ہو چکے تھے؛ نوا کھالی، بہار، گڑھ مکتیشور؛ ان مقامات پر فرقہ وارانہ تشدد کا سلسلہ بے روک ٹوک جاری رہا۔ ایک ایسے مرحلے میں جب بٹوارے کے المیہ کا سایہ لہرا رہا تھا اس وقت مصالحانہ موقف اختیار کرنے کی ایک اور کوشش کو سعی رایگاں سمجھا گیا۔ اس کے باوجود کانگریس اور لیگ میں سمجھوتے کا ایک فارمولہ وضع کرنے کے لئے گاندھی اور جناح کی ایک اور میٹنگ ہوئی۔ نہرو اور جناح پر یہ ذ□داری سونپی گئی کہ وہ تفصیلات کا خاکہ تیار کریں۔ بھوپال نواب صاحب کی دو ہفتہ کی کوشش کا کم از کم یہ نتیجہ نکلا تھا جس سے مئی 1938 کی یاد تازہ ہوگئی جب سبھاس بوس نے ایسی ہی ایک کوشش کی تھی اور اگست 1945 کی یاد بھی تازہ ہوئی جب مولانا آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے لیگ کے حق کو تسلیم کرنے کے قریب آگئے تھے۔ اب گاندھی کی باری نکتے کو تسلیم نہیں کیا اس وقت تک جناح نہرو سے ملنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ گاندھی نے اس نکتے کو مانا تو

5 اکتوبر 1946 کو جناح نہرو ملاقات ہوئی اور اس میٹنگ کی بنیاد سیاسی رپورتاژ کی زبان میں گاندھی جناح فارمولہ تھی جو درج ذیل ہے۔

'کانگریس اسے چیلنج نہیں کرتی بلکہ تسلیم کرتی ہے کہ اب مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت کی بہ اختیار نمائندہ ہے۔ اور اسی لئے جمہوری اصولوں کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کا صرف لیگ کو ہی کسی بھی اعتراض سے بالا حق حاصل ہے۔ لیکن کانگریس اس سے اتفاق نہیں کرسکتی کہ کانگریس کوئی ایسی پابندی عائد کی جائے یا روک لگائی جائے کہ وہ کانگریس کے ممبروں میں سے اپنے نمائندے کے طور پر ایسے کسی نمائندے کو پیش نہیں کرسکتی۔' 1

ان دونوں (نہرو اور جناح) کی ایک میٹنگ پھر 7 اکتوبر کو ہوئی اس کے ایک ہفتہ کے بعد یعنی 14 اکتوبر تک بات چیت ناکام ہوگئی۔ یہ کہانی بھی پرانی کہانی کی طرح تھی سمجھوتے کی بڑی تصویر غیر ضروری چیزوں کی دھند میں کھوگئی۔ خود نہرو نے اسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

1 گاندھی جی نے فارمولہ پیش کیا

2 لیگ شیڈولڈ کاسٹ اور اقلیتوں کی فی الحال نمائندگی کرنے والے ممبروں کے لئے ذ[illegible]دار نہیں ہوئی۔

3 اگر شیڈولڈ کاسٹ کے علاوہ اقلیتوں کی نمائندگی کرنے والے ممبروں میں سے کسی ممبر کی جگہ خالی ہوئی تو کیا کرنا ہوگا۔

4 جس چیز کو اہم فرقہ وارانہ امور کہتے ہیں، اس کے سلسلے میں کیا ضابطے اپنانے ہوں گے اور

5 باری باری نائب صدر کا عہدہ 2

نہرو اس فارمولے کو لکھنے کے لئے استعمال کئے گئے الفاظ سے خوش نہیں تھے۔ ان کے خیال میں یہ فارمولہ ضروری بھی نہیں تھا ویسے وہ اس سے حاصل ہونے والے مقصد پر بھی سوال قائم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حقیقی معنوں میں یہ معاملات ایسے نہیں تھے کہ ان پر قابو نہیں پایا جاسکتا ہو؛ اگر زیادہ بڑے مقصد کے لئے زیادہ وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا جاتا تو آسمان نہیں پھٹ پڑتا۔

جناح سمجھتے تھے کہ گاندھی کے ساتھ جس فارمولے پر اتفاق ہوا تھا اسے بدلا نہیں جاسکتا تھا کیوں کہ کسی سمجھوتے کی بنیاد وہی تھا۔ اس پر گاندھی نے دستخط کئے تھے اور جناح نے اسے قبول کیا تھا۔ 7 اکتوبر کو نہرو کو اپنے خط میں اسی کا اعادہ کرتے ہوئے جناح نے ایک خاص بات یہ کہی تھی کہ اگر لیگ عبوری حکومت میں شامل ہوئی تو کانگریس اپنے کوٹہ کے بقیہ

پانچ ممبروں میں اپنی پسند کے کسی مسلمان کو شامل نہیں کرے گی 3۔ اس منظور شدہ فارمولے کے مطابق کانگریس کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کانگریس کے ممبروں کے درمیان سے جن لوگوں کو نمائندگی کرنے کے لئے مناسب سمجھے انہیں اپنا نمائندہ چن سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جناح نے اپنے خط میں اس کا ذکر کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ نہرو نے اس فارمولہ پر اتفاق ہوجانے کے بعد اس میں کسی طرح کے ہیر پھیرے کی کوشش شروع کی؟ اس خط کے ساتھ جو ضمیمہ تھی کیا گیا تھا اس میں نہرو کے غور وفکر کے دیگر 8 نکات تھے: فارمولہ پر سے توجہ ہٹ رہی تھی یا اس کے سلسلے میں ایسی غلط فہمی پیدا ہور رہی تھی جس سے چھٹکارے کی صورت نہیں تھی۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ جس دن جناح نے نہرو کو خط لکھا اسی دن یعنی 7 اکتوبر کو ان کی پھر ملاقات ہوئی مگر اس میٹنگ سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نہرو اور کانگریس میں ان کی رفقاء کے لئے اب یہ اسکیم ہی بالکل غلط تھی۔ جناح کے ساتھ اپنی 5 اکتوبر کی میٹنگ کا حوالہ دیتے ہوئے نہرو نے کہا کہ انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ جناح کے ساتھ ان کی ملاقات کسی 'متفقہ فارمولہ' کا نتیجہ تھی۔ حسب توقع نہرو بھی یہ چاہتے تھے کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ کانگریس کو اپنے کوٹہ میں کسی مسلمان کو مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔ انہوں نے 8 اکتوبر کو جناح کے نام ایک خط لکھا اور اس میں ایک اور پیراگراف کو Allude کیا جو فارمولے میں موجود تھا لیکن جس کا جناح نے حوالہ بھی نہیں دیا تھا۔ 4 جناح نے اس خط کا فوری جواب دیا جس میں کہا کہ یہ پیراگراف متفقہ فارمولہ کا حصہ نہیں ہے۔ یہ صرف ریکارڈ کی چیز ہے۔ 5 کانگریس کے کوٹہ سے مسلمانوں کو نامزد کرنے کے اہم سوال پر انہوں نے تحریری طور پر کہا کہ 7 اکتوبر کی پچھلی میٹنگ میں ان کے اور نہرو کے درمیان اس پر غور ہوچکا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ یہ متفقہ فارملہ سے ایک اور سنگین انحراف ہے۔ 6 نہرو نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ جناح کے خط میں کئی جگہ غلط بیانی ہے۔

گاندھی نے جس فارمولے پر دستخط کئے تھے اسے نہرو اور کانگریس کی قیادت نے مسترد کردیا۔ جناح نہرو مذاکرات جب ناکام ہوگئے اور ان کی آپسی خط وکتابت منظر عام پر آگئی تو گاندھی نے اس پر کسی طرح کی رائے زنی سے گریز کیا۔ جب کہ وہی، جو کہ اب بوڑھے ہوچکے تھے، یہ بتاسکتے تھے کہ اصل الفاظ کیا تھے۔ انہیں ضرور یاد کرنا چاہئے تھا۔ موہن داس کرم چند گاندھی ہندوستان کی مٹی میں پیدا ہوئے تھے اور یہ مٹی ان کے جسم کے ایک ایک خلیہ میں موجود تھی؛ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہمارے سروں پر کسی زبردست المیہ کا سایہ لہرایا ہے؛ یہ کسی اور کو نظر نہیں آرہا تھا۔ اور ایسے میں اگر وہ خاموش رہے تو کسی کو حیرت نہیں۔ ایسا دیکھا جائے تو اس فارمولے پر دستخط کرکے گاندھی نے ہندوستان کو پارٹیشن سے بچانے کے لئے جناح کے ساتھ مل کر آخری کوشش کی تھی۔ وہ ناکام ہوئے اور اسی کے ساتھ ان کی زندگی اور ہماری تاریخ کا ایک عظیم باب بند ہوگیا۔ صرف ایک نوٹ رہ جاتا ہے جو ایک تال ترازو کی طرح ایک ہی تال پر بجتا رہتا ہے۔ اسے تباہ کرنے کی ایسی عجلت کیوں تھی۔ اور اگر نہرو نے ہمیں یقین دلادیا تھا کہ یہ بالکل واضح چیز ہے تو آج کیوں ہم تمام لوگ اس پر غور کررہے ہیں؟

اٹیلی-ویول-جناح-نہرو کانفرنس

جن معاملات میں کانگریس اور مسلم لیگ میں پھوٹ ڈالی تھی ان معاملات کو حل کرنے کا ایک اور موقعہ ہاتھ آیا۔ 6 دسمبر 1946 کو وزیر اعظم ایٹلی نے لندن میں ایک کانفرنس منعقد کی یہ وزیر اعظم برطانیہ اور ان کی کابینہ کی طرف سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی آخری کوشش تھی۔ اس ترغیب کی بنیادی طور پر دو اسباب تھے۔ دونوں اسباب عملی تھے اور ان کا بہر حال کوئی تعلق ہندوستان کو متحدہ رکھنے کی ضرورت سے نہیں تھا بلکہ ہندوستان سے برطانوی شہنشاہیت کی منظم (کم سے کم دکھاوے کے لئے ہی سہی) واپسی یقینی بنانے کے لئے تھے۔

پہلا سبب ایک ایسے وقت میں، جب برطانوی نقطۂ نگاہ سے، اقتدار کی منتقلی کی سخت ضرورت تھی، ہندوستان میں امن و قانون کی بہت تیزی سے بگڑی ہوئی صورت حال سے پیدا شدہ تشویش تھا۔ اس کے علاوہ ابھی بھی سرکاری سطح پر، قانونی سطح پر اور قانون ساز ادارے کی سطح پر یہ طے نہیں ہوا تھا کہ یہ اقتدار کس ایک اتھارٹی یا ایک سے زائد اتھارٹیوں کو منتقل کیا جائے گا۔ اسی سے دوسرا سبب بھی نکلتا ہے۔

گروپوں سے کسی ایک صوبے یا ایک سے زائد صوبے کے نکل آنے کی گنجائش کانگریس اور لیگ کے درمیان تنازعہ کا اصل موضوع بنی ہوئی تھی۔ اب کانگریس نے لیگ کے موقف کے برخلاف کابینہ مشن پلان کو تسلیم کر لیا تھا لیکن اس تشریح کی شرط کے ساتھ کہ کسی صوبے کو اگر اپنے گروپ میں شامل ہونے سے انکار کرنا ہے تو یہ انکار شروع میں ہی کر دینا ہوگا۔ کانگریس کی پیش کردہ اس تشریح نے لیگ کے مطابق اس منصوبے کو کالعدم کر دیا جس کا واحد مطلب یہ نکلتا تھا کہ پوری طویل مدتی اسکیم مسترد کر دی گئی۔ لیگ نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر مثال کے طور پر شمال مغربی صوبۂ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریسی حکومت گروپ اے میں شمولیت اختیار کرنے سے انکار کر دے اور آسام، جہاں کانگریس کی وزارت ہے گروپ سی میں شامل ہونے سے شروع سے ہی انکار کر کے رکھے تو مشن پلان میں لیگ کے لیے کیا ممکن دلکشی رہ جائے گی؟ لیگ کو اندیشہ تھا کہ اگر ان حالات میں وہ آئین ساز اسمبلی میں گئی تو (لیگ کے لیے) مناسب آئین وضع کرنے کے لیے کانگریس کی اکثریت پسندی کے خلاف اس کے پاس کوئی موقع نہیں رہے گا۔

کانگریس نے اس منصوبے کی جو تشریح کی تھی اس کا عملی اعتبار سے تقاضہ یہ تھا کہ پلان کے لکھنے والے اس کی نیت کے بارے میں پھر ایک بیان دیں۔ یہ بات 6 دسمبر 1946 کو لندن میں ایچ ایم جی کی حکومت کے اعلان کے صورت میں سامنے آئی۔ اگرچہ اس سوال پر مسلم لیگ کا موقف ثابت ہو گیا لیکن اسے ابھی تک معاہدے کی شکل نہیں دی گئی تھی۔ لندن کی میٹنگ میں صرف اسی کی کوشش مقصود تھی۔ اس میٹنگ کی صدارت وزیر اعظم ایٹلی نے کی جس میں سر پیتھک لاؤرنس، سر اسٹیفورڈ کرپس، نہرو، جناح، لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ نے شرکت کی۔ یہ بیان اور اس میٹنگ میں ہونے والا تبادلۂ خیالات اب ریکارڈ کا معاملہ ہے، یہاں صرف اس کے اقتباسات دیئے جا رہے ہیں کیوں کہ یہ چیزیں

ہندوستان کے مستقبل کو ایک متحد ملک کے طور پر صورت گر کرنے والے تھے۔ ہماری فکر مندیوں کے لئے اہمیت کے حامل دو میٹنگیں تھیں ایک 4 دسمبر کی اور ایک 6 دسمبر کی۔

لندن میں ہندوستانی کانفرنس

Paper I.C.L. (46) 2 L/P & j/10/111:ff 77-81

4 دسمبر 1946 کو صبح 10:30 بجے انڈیا آفس میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے کمرے میں منعقدہ میٹنگ کا ریکارڈ:

خفیہ 7

اس میٹنگ کے شرکاء: لارڈ پیتھک لارینس (صدارت) سر ایس کرپس، الیگزنڈر، فیلڈ مارشل وسکاؤنٹ ویول، پنڈت نہرو، مسٹر ٹرن بل، مسٹر ابیل (سکریٹریز)

وائسرائے نے کہا کہ عبوری حکومت کی کابینہ میٹنگوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ مسلمان ممبروں نے ان سے ملنے سے انکار کیا۔ وائسرائے نے اس طرف اشارہ کیا کہ پنڈت نہرو سے دوبار لیاقت علی خان سے ملاقات کے لئے کہا گیا اور دونوں بار وہ انکار کر گئے جس کے جواب میں نہرو نے کہا کہ مسٹر لیاقت علی خاں نے ان کی توہین کی تھی اس لیے انہیں لیاقت علی خاں سے ملنے کا کوئی سبب نظر نہیں آیا۔ عبوری حکومت کے پہلے ہی دن وائسرائے ہاؤس کے باہر مسلمانوں نے ان (نہرو) کی توہین کی تھی اس لیے انہیں لیاقت علی خاں سے ملنے کا کوی سبب نظ نہیں آیا۔ عبوری حکومت کے پہلے ہی دن وائسرائے ہاؤس کے باہر ملسمانوں نے ان (نہرو) کی توہین کی اور تقریباً انہیں زدوکوب کیا۔ عبوری حکومت دو گروپ کے طور پر کام نہیں کر سکی۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلم لیگ کو کم ووٹ ملتے اور وہ باہر ہو جاتے۔ لیکن سب کچھ کابینہ تک نہیں پہنچا۔ یہاں تک کہ حال ہی میں، انڈیا آفس کی مدد سے، مسلم لیگ کے دو نمائندے امریکہ گئے اور نیویارک ہیرالڈ فورم میں انہوں نے زبردست تقریریں کیں۔ وزیر بے قلمدان نے کہا کہ اس ملک میں جنگی اتحاد میں وزراء پارٹی گروپوں کے طور پر کام نہیں کرتے۔ سارا کام کابینہ کی باضابطہ ذیلی کمیٹیوں میں ہوتا ہے اس پر پنڈت نہرو نے کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ سے اپنا موقف ترک کرنے کو نہیں کہا بلکہ یہ محسوس کیا کہ اس تعطل سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

اس کے بعد گروپنگ کے پیچیدہ سوال پر تقریباً پوری طرح مرکوز تھوڑی سی بات چیت ہوئی۔ پنڈت نہرو نے یہ شکایت بھی کی کہ لیگ کے اخبارات حکومت کے خلاف غیر ذ□دارانہ گالیوں سے بھرے پڑے رہتے ہیں جب کہ لیگ بھی حکومت میں شامل ہے۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے اس کے بعد یہ سوال کیا کہ کیا، پنڈت نہرو کے خیالمیں، سہ درجاتی نظام کے ظہور میں آنے کی کسی طرح کی ضمانت دی جائے تو کام چل جائے گا۔ نہرو نے جواب میں کہا 16 مئی کے بیان سے

کانگریس کی خوشی نہیں... آزادی پر جو سب سے بڑا قدغن تھا وہ داخلی تھا۔ یعنی کافی لوگوں کی مدد سے اپنا کام آگے لے جانے کی اہلیت۔ سہ درجاتی نظام ایک ایسی چیز کے طور پر وضع کیا گیا جو اسی وقت ظہور میں آسکتا ہے جب متعلقہ صوبے اور عوام اس کا ظہور چاہیں۔ اگر وہ لوگ ایک گروپ بنانا چاہتے ہیں تو کانگریس ان کے فیصلے کو مکمل طور پر قبول کر لے گی۔ لیکن کانگریس یہ امید کرتی ہے کہ وہ دوسروں کو اس بات کا قائل کر سکے گی کہ گروپ نہ ہوں۔ اس کے بجائے وہ لوگ وفاقی عدالت کا فیصلہ قبول کر لیں۔ لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ اس سے بھی کچھ نہیں ہونے کا گو کہ اس پر مزید بے ترتیب بات چیت ہوئی۔

اس کے بعد اختتامی اجلاس ہوا جس کا ریکارڈ نہ صرف اہمیت اور افادیت کا حامل ہے بلکہ اس میں کافی معلومات بھی بھری ہوئی ہیں۔

6 دسمبر 1946 کو شام 4:00 بجے 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ میں منعقدہ میٹنگ کا ریکارڈ:

خفیہ

اس میٹنگ کے شرکاء: مسٹر ایٹلی (صدارت) لارڈ پیتھک لاورنس، سر ایس کرپس، مسٹر ایلیگزینڈر، فلڈ مارشل وسکاؤنٹ ویویل، مسٹر ٹرن بل (سکریٹری) ہز میجسٹی کی حکومت کا بیان:

پنڈت نہرو، مسٹر جناح، مسٹر لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ کے ساتھ ہز میجسٹی کی حکومت کی بات چیت آج شام یہاں اختتام پزیر ہوئی کیوں کہ پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کل صبح واپس ہندوستان جا رہے ہیں۔

بات چیت کا مقصد یہ تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں تمام پارٹیوں کی شرکت یقینی بنائی جائے اور ان سے تعاون حاصل کیا جائے۔ ایسی کوئی امید نہیں کی گئی تھی کہ اس میٹنگ میں کوئی حتمی معاہدہ ہو جائے گا کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستانی نمائندے کسی آخری فیصلے پر پہنچنے سے پہلے لازمی طور پر اپنے رفیقوں کے ساتھ صلاح و مشورہ کریں گے۔

جو بڑی دشواری کھڑی ہوئی اس کا تعلق 16 مئی کے کابینہ مشن کے بیان کے پیراگراف (V)19 اور (Viii) کی تشریح سے تھا۔ اس پیراگراف کا تعلق سیکشنوں میں میٹنگوں سے ہے:

پیراگراف (V)19 یہ سیکشن ہر سیکشن میں شامل صوبوں کے لئے صوبائی دستور طے کرنے کی کارروائی آگے بڑھائیں گے اور یہ فیصلہ بھی کریں گے کہ ان صوبوں کے لئے کیا کسی گروپ کا دستور قائم کیا جائے اور اگر ایسا ہو تو وہ گروپ کس صوبائی موضوع پر غور کرے۔ صوبوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ ذیلی دفعہ (viii) کی گنجائشوں کے مطابق کسی گروپ سے باہر نکل آئیں۔

پیراگراف (viii)19 'جیسے ہی نئے آئینی انتظامات زیر عمل آئیں گے کسی بھی صوبے کو یہ اختیار حاصل ہو

جائے گا کہ اسے جس گروپ میں رکھا گیا ہے وہ اس گروپ سے باہر آجائے ایسا کوئی فیصلہ نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخاب کے بعد صوبے کا قانون ساز ادارہ کرسکتا ہے'۔

کابینہ مشن اس پورے وفد میں اس خیال پر ثابت قدم رہا کہ سیکشنوں کا فیصلہ کسی سیکشن کی نمائندوں کے سادہ اکثریتی بورڈ سے کیا جاسکتا ہے بشرطے کہ کوئی معاہدہ اس کے برعکس نہ ہو۔ مسلم لیگ نے نظریہ کو تسلیم کرلیا لیکن کانگریس نے ایک مختلف نظریہ پیش کیا۔ ان لوگوں نے زور دے کر کہا کہ مکمل طور پر پڑھنے کے بعد بیان سے صحیح معنی یہ نکلتے ہیں کہ صوبوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گروپنگ کے بارے میں فیصلہ کریں اور اپنے اپنے آئین کے بارے میں بھی۔ ہز میجسٹی کی حکومت نے قانونی مشورہ حاصل کرلیا تھا جس میں اس کی توثیق کردی گئی تھی کہ 16 کے بیان کی مطلب یہ ہوا کہ کابینہ مشن نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کی نیت ہے۔ بیان کے اس حصے کو، جیسا کہ اس کی تشریح کی گئی ہے، لازمی طور پر 16 مئی کی اسکیم کا لازمی حصہ سمجھا جائے تاکہ ہندوستانی عوام ایک ایسا آئین وضع کرنے کے اہل بن سکیں جسے ہز میجسٹی کی حکومت پارلیمنٹ میں داخل کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس لئے آئین ساز اسمبلی میں اسے تمام پارٹیوں کی قبولیت ملنی چاہئے۔

تاہم یہ بات واضح ہے کہ 16 مئی کے بیان سے تشریح کے دوسرے سوالات کھڑے ہوسکتے ہیں اور ہز میجسٹی کی حکومت کو امید ہے کہ اگر مسلم لیگ کی کونسل آئین ساز اسمبلی میں شرکت کے لئے رضامند ہوسکے تو وہ لوگ بھی اتفاق کریں گے جیسا کہ کانگریس نے کیا یعنی کہ وفاقی عدالت سے درخواست کی جائے گی کہ دونوں فریقوں میں جو فریق بھی اس کے پاس تشریح کا کوئی معاملہ بھیجے وہ اس کا فیصلہ سنائے اور یہ دونوں فریق اس فیصلے کو منظور کریں گے تاکہ مرکزی آئین ساز اسمبلی میں اور سیکشنوں میں یعنی دونوں جگہ کے ضابطے کابینہ مشن کے منصوبے سے مطابقت کرجائیں۔

فوری طور پر جو تنازعہ زیر غور آرہا ہے اس بارے میں ہز میجسٹی کی حکومت کانگریس سے یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ کابینہ مشن کے نظریہ کو تسلیم کرلے تاکہ مسلم لیگ کو اپنے رویے پر از سر نو غور کرنے کا موقع ملے۔ کابینہ مشن کی نیت کی اس دوبارہ وضاحت کے باوجود اگر آئین ساز اسمبلی کی خواہش یہ ہو کہ اس بنیادی نکتے کو فیصلے کے لئے وفاقی عدالت کے حوالے کیا جائے تو اس طرح کی رائے طلبی کا کام بھی بالکل شروع میں کرلیا جائے تب یہ بات مناسب ہوگی کہ آئین ساز اسمبلی کے سیکشنوں کی میٹنگیں وفاقی عدالت کے فیصلے تک کے لئے ملتوی کردی جائیں۔

آئین ساز اسمبلی کی کامیابی کا کوئی امکان اس وقت تک نہیں تھا جب تک کہ ایک متفقہ ضابطے کی بنیاد پر اسے کامیاب بنانے کی کوشش نہ کی جاتی۔ کیا آئین ایک ایسی آئین ساز اسمبلی سے بنوایا جاسکتا تھا جس میں ہندوستانی آبادی کے ایک بڑے طبقے کی نمائندگی نہیں تھی ہز میجسٹی کی حکومت بلاشبہ اس کا تصور نہیں کرسکتی تھی یہ بیان پڑھا گیا تو مسٹر جناح نے سوال کیا کہ اگر وفاقی عدالت ہز میجسٹی حکومت کے موقف کے برعکس یا اس سے الگ اس دستاویز کی تشریح کرے تو کیا کیا جائے گا۔ وزیر بے قلمدان نے کہا کہ ہز میجسٹی گورنمنٹ کو اس موقف پر تب غور کرنا ہوگا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ مجھے اس بات

کی وضاحت کرنے دی جائے کہ وفاقی عدالت کا ہر فیصلہ مسلم لیگ نہیں مانے گی۔ جناح کو لگتا تھا کہ آئین ساز اسمبلی بھاری ہندو اکثریت کے ساتھ اس معاملے کو وفاقی عدالت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرے گی اور عدالت کی رولنگ کی پابندی کرے گی۔ اس لئے مسلم لیگ ایسی کسی رائے طلبی میں فریق نہیں بن سکتی کیوں کہ مسلم لیگ پابند نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مسلم لیگ کی طرف سے کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھے لیکن اپنی کونسل میں وہ موقف پر ضرور غور کرتے انہوں نے اس معاہدے کو محفوظ کرنے کی بہترین کوششوں کے لئے برطانوی حکومت کا شکریہ ادا کیا۔

پنڈت نہرو نے کہا کہ اس میں دو رائے نہیں کہ کانگریس کو اس بیان پر، جسے پڑھا گیا ہے، غور کرنے کے لئے وقت کی ضرورت پڑے گی، اور وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے جب کہ کچھ ایسی باتیں ہیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ بیان 16 مئی کے بیان میں ترمیم ہے اور اس سے آگے تک گیا ہے۔ کانگریس اس بیان کے بنیاد پر آگے بڑھی۔

ان کا خیال تھا کہ ہر بیان 16 مئی کے بیان میں ترمیم اور اس کے آمد کا معاملہ ہے۔ کانگریس ابھی تک اس بیان کی بنیاد پر عمل کر رہی تھی..... کابینہ مشن اور وائسرائے کے ان کے بیان پر نتیجہ نکلا کہ کانگریس نے شروع سے ہی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے ایک خاص بنیاد پر اس پر غور کیا ہے۔ اب ان کی توضیح سے یہ بیان اور ایک قدم آگے چلا گیا۔ اس سے کانگریس کے لئے بالکل نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اگر یہی بیان اصل بیان ہوتا تو ان کا ردعمل کیا ہوتا۔

نئے بیان میں پیراگراف (V)19 اور (VIII)19 کا حوالہ تو تھا لیکن 16 مئی کا بیان کا پیراگراف 15 کا ذکر نہیں تھا۔ ان تمام پیراگرافوں کو یکجا کرنے سے پیراگراف 19 کا مفہوم اس کے اصل مفہوم سے مختلف ہو جاتا ہے۔

وزیراعظم نے کہا کہ یہ بات ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی کہ کن بنیادوں پر وہ خیال آگے بڑھایا گیا۔ پیراگراف 15 کا تعلق ان بنیادی اصولوں سے تھا جن کو آئین میں شامل کرنا مقصود تھا۔ پیراگراف 19 میں آئین سے متعلق فیصلہ کرنے کے طریقے درج تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چیزیں بالکل مختلف اور الگ الگ ہیں ایک کے لیے جو اصول وضع کیے گئے تھے، ضروری نہیں تھے کہ وہ دوسرے کے لیے بھی ہوں۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ کانگریس کا خیال ہے کہ اگر ایک جگہ کیا جائے تو ان دونوں سیکشنوں کے معنی کچھ اور نکلیں گے۔ اس لیے ہز میجسٹی کی حکومت کے کسی بھی بیان پر کانگریس کو بہت ہوشیاری سے غور کرنا ہوگا۔ وزیراعظم نے خیال ظاہر کیا کہ موجودہ بیان صرف 16 مئی کے دستاویز کی تشریح سے تعلق رکھتا ہے۔ کانگریس نے خود بھی اس کی ایک تشریح پیش کی تھی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہز میجسٹی کی حکومت نے اس دستاویز کی تشریح کیوں کی۔ وہ بھی اس وقت جب کہ کانگریس کی طرف سے تشریح میں ایسا نہیں تھا۔ نہرو نے جواب میں جو کہ حکومت نے اس دستاویز کو قلم بند کیا ہے اس لیے اس کی توسیع کی بھی اہل ہے۔ جب کہ کانگریس اس کی اہل نہیں ہے پنڈت نہرو نے کہا کہ

انہیں اس کا اندازہ نہیں ہے کہ آئین ساز اسمبلی کا ردعمل کیا ہوگا۔ عام حالات میں اس طرح کی کوئی باڈی بیرونی دباؤ نہیں لیتی اور اس پر ردعمل نہیں کرتی۔ مصلحت اور مجبوری نے تعاون کو تباہ کر ڈالا۔ متعدد گروپوں اور صوبوں کے رویوں کا پرزور اظہار ہوا۔ مثال کے طور پر سکھوں کے نظریات بہت شدید تھے اور کانگریس تشریح کے اس سوال میں ذاتی طور پر شریک تھی۔ وہ مسٹر جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں کو اس کا تعین دلا سکتے تھے کہ کانگریس کی طرف تمام لوگ ایسی راہ نکالنے کے لیے بے چین ہیں جو دونوں فریقوں کے لیے عزت دارانہ ہو کیوں کہ وہ لوگ اپنی بقیہ زندگی تصادم اور ٹکراؤ میں برباد نہیں کرنا چاہتے وہ ایسا کوئی آئین وضع نہیں کر سکتے جسے ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے پر مسلط کر سکے ....اس میں کوئی حیرانی نہیں کہ انہیں دشواریوں کا سامنا کرنا ہے۔ انہوں نے ماضی یا مستقبل کو مایوسی سے نہیں دیکھا اور یہ سمجھا کہ خواہ مخواہ مایوسی کا نظریہ اپنایا جارہا ہے۔ اس عمل میں زیادہ بڑا خطرہ یہ تھا کہ ایک دشواری پر قابو پایا جاتا تو دوسری زیادہ بڑی دشواری سامنے آجاتی کسی حد تک یہ بات درست تھی کہ یہ ٹکراؤ ہندوستانی نقطہ ہائے نظر میں تھا لیکن انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ اگر ہندوستان کو کھلی چھوٹ نہیں ملی تو دوسری دشواریاں ابھر آئیں گی۔ ہندوستانیوں کو ہی فیصلے کرنے کا بوجھ بھی اٹھانا تھا اور اس فیصلے کے نتائج کا بار بھی۔

پنڈت نہرو نے اپنی گفتگو ملک سے پوچھنے کی مروت کے مظاہرے کے لیے ہز میجسٹی کی حکومت کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ مکمل کی۔

وزیر اعظم نے کہا کہ پنڈت نہرو نے جو بات کہی ہے اس پر وہ تین رائیں ظاہر کریں گے۔ پہلی رائے تو یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ 16 مئی کے بیان میں کوئی اضافہ کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ بیان کو آئین ساز اسمبلی پر باہری دنیاؤں کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ برطانوی حکومت شروع سے ان لوگوں کے موقف کے ساتھ رہی جو ہندوستانیوں کے درمیان ایک معاہدہ کرانے میں ہاتھ بٹانے کی کوشش میں تھے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ اس سے اتفاق نہیں کر سکے کہ آئین ساز اسمبلی پر کسی طرح کا جبر کیا جارہا ہے سوائے اس کے کہ اسمبلی ایک متفقہ فریم ورک کے اندر کام کرے لیکن ایک ایسا فریم ورک ہمیشہ لازمی ہے جس کے اندر رہ کر کوئی باڈی کام کرے۔ سردار بلدیو سنگھ نے کہا کہ نئے بیان سے سکھ فرقہ کی پوزیشن پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ اگر گروپ بی میں اکثریتی ووٹنگ ہوئی، صوبوں کی طرف سے ووٹنگ نہیں ہوئی تو چاروں سکھ نمائندے پہلے سے بھی کم بااثر پوزیشن میں آجائیں گے۔ اس کا سکھوں پر خراب ردعمل ہوگا جن کو بڑی مشکل سے عبوری حکومت میں شرکت پر اور کابینہ مشن کے بیان کو قبول کرنے پر رضامند کیا گیا ہے۔ انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اب وفاقی عدالت بھی وہی خیال اپنائے گی جو کہ ہز میجسٹی کی حکومت کا خیال ہے اور اسے میں یہ ہو سکتا ہے کہ سکھ ایسا قدم اٹھائیں جو نہ صرف ذاتی طور پر ان کے لیے بلکہ ان کے ساتھیوں کے لیے بھی کافی پریشان کن ثابت ہو۔ تاہم وہ اپنے لوگوں کو اس بات پر رضامند کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں کہ ایک بار آئین ساز اسمبلی کو آزمائیں۔

تجارتی بورڈ کے صدر نے کہا کہ اس بیان میں واقعی ایسا کچھ نہیں ہے جس سے جنرل نمبر 166 معاہدے میں کیے گئے بعض خصوصی انتظامات کو ممنوع قرار دیا جاسکے۔ انہوں نے یہ بات ہمیشہ سمجھی ہے کہ دیگر فریقے سکھ کے موقف کو فیاضی سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے کہا کہ وہ اپنے لیڈر مسٹر جناح کی کہی ہوئی ہر بات کی تائید کرتے ہیں۔ مسلم لیگ کے دل میں یہ خواہش ہمیشہ رہی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو امداد باہمی کے جذبے کے تحت حل کیا جائے۔ برطانوی وزرا نے جس ضبط اور مروت مظاہرہ کیا ہے اس کے لیے وہ ان کے شکر گزار ہیں اور یہ ان کی دلی خواہش ہے کہ ہندوستان پرامن طریقہ سے آزادی حاصل کر لے۔

سکریٹری آف اسٹیٹ نے کہا کہ انہیں امید ہے کہ ہندوستانی لیڈران اس بیان پر کھلے دل و دماغ سے غور کریں گے یہ بیان تیار کرتے وقت وہ جزوی نظریہ سامنے نہیں رکھا گیا بلکہ تمام فریقوں کی خیر خواہی کو مدنظر رکھا گیا اس بیان میں کابینہ مشن اب تک کی کہی ہوئی باتوں سے الگ کچھ نہیں ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ وزیر بے قلمدان نے اس ملک میں آنے کے لیے ہندوستانی نمائندوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس بیان میں، جسے یہاں پڑھا گیا ہے۔ ایسا کچھ نہیں جو کہ 16 مئی اور 25 مئی کے بیانات میں درج باتوں سے الگ ہو۔

تجارتی بورڈ کے صدر نے کہا کہ یہاں موجود تمام لوگوں نے تعاون کی جس خواہش کا اظہار کیا ہے اگر اسے کسی قسم کی حقیقی شکل میں تبدیل کیا جاسکا تو تمام دشواریوں پر قابو پالیا جائے گا۔

انہوں نے محسوس کیا کہ بنیادی طور پر ساری مشکل شہر کی وجہ سے ہے جو کہ ادھر کے برسوں میں پڑھا ہے۔ اگر مخالفانہ روش کو موافقانہ رویے میں تبدیل کیا جاسکے تو ان دشواریوں کو حل کیا جاسکتا ہے۔

ہز ایکسی لنسی وائسرائے نے کہا کہ جب سے انہوں نے موجودہ عہدہ سنبھالا ہے تب سے وہ تمام فریقوں کو متحد کرنے کی کوشش میں ہیں اور آخر آخر تک اپنی یہ کوشش مقدور بھر جاری رکھیں گے۔ انہیں اس کا پورا یقین ہے کہ موجودہ دشوار کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

کابینہ مشن پلان کو بچانے کے لئے آخری کوشش کے طور پر منعقد کی گئی یہ میٹنگ اتفاقی تکلفات کے بعد ختم کر دی کہ ہز میجسٹی کی حکومت کے 6 دسمبر 1946 کے بیان کی بنیاد قانونی مشورے پر تھی۔ یہ پلان کو بااختیار معنی سے سرفراز کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اس پر نہرو نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بیان 16 مئی کے بیان میں اضافہ کے مترادف ہے۔ اس میں جبر ہے اور یہ آئین ساز اسمبلی کو یہ بتانے کے مترادف ہے کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ اس لیے وہ ہز میجسٹی کے بیان کو قبول نہیں کر سکتے۔ ایٹلی نے اس کا جواب دیا مگر کوئی بات نہیں بنی اور نہرو آئین سازی کے عمل کو یک طرفہ طور پر آگے بڑھانے کے لیے واپس دہلی آگئے۔ اس کے ردعمل میں مسلم لیگ نے اسمبلی میں شرکت سے انکار کر دیا اور اپنے لیے ایک الگ آئین ساز

اسمبلی کا مطالبہ پیش کیا۔ اب کابینہ مشن پلان تقریباً مردہ ہو چکا تھا۔ جو چیز ناگزیر نہیں تھی افسوس کی بات ہے کہ ہو گئی۔ پاکستان ایک حقیقت بن گیا۔

پس نوشت کے طور پر نہیں بلکہ شاید وضاحت کے طور پر یا کانگریس میں دوسروں کا نظریات کو جگہ دینے کی غرض سے یا کانگریس کے سینئر لیڈروں کے انداز فکر پر روشنی ڈالنے کی نیت سے، اس کی ضرورت ہے کہ 15 دسمبر 1946 کو سر اسٹیفوٹ کریس کے نام سردار پٹیل کے خط کے کچھ حصہ بطور اقتباس پیش کیے جائیں۔

"......... آپ نے لیگ کے وفد کو وہاں (جنوری - دسمبر 1946) میں اس وقت طلب کیا جب یہ بات کسی حد تک سمجھ میں آنے لگی تھی کہ مثلاً تشدد ایسا کھیل ہے جسے دونوں فریق کھیل سکتے ہیں اور جھلاہٹ میں مبتلا ہونے پر مجبور کر دیا جائے تو ایک نرم مزاج ہندو بھی اس ظالمانہ ڈھنگ سے ردعمل کر سکتا ہے۔ جس ڈھنگ سے مذہبی جنونی مسلمان کر سکتا ہے۔ جس وقت سمجھوتے کا وقت قریب آنے لگا تھا اس وقت جناح کو دعوت نا ملا اور وہ مسلمانوں کو پھر ایک بار اس کا قائل کرنے میں کامیاب ہو سکے کہ انہوں نے ہنگا اور تشدد کے ذریعے زیادہ رعایتیں حاصل کی ہیں...... لیکن میں صرف اتنا کہوں گا کہ جب مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا دن مقرر کیا تھا اور کلکتہ میں مظاہرہ کے لیے 16/اگست کی تاریخ مقرر کی گئی تھی اس وقت ہی اگر سخت کارروائی کی گئی ہوتی یا یہاں کڑی کارروائی کرنے کی اجازت دی گئی ہوتی تو یہ سب جانی اتلاف، مالی نقصان اور خون آشام واقعات رونما ہی نہیں ہوتے۔ یہاں وائسرائے نے اس کے مخالف ردعمل اپنایا کلکتہ میں بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کے بعد سے ان کی ہر کارروائی کا رخ مسلم لیگ کی حوصلہ افزائی اور خوشامد کے لیے مہم پر دباؤ ڈالنے کی طرف ہے۔"

"آپ کی تشریح سے تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ بنگال کے مسلمان آسام کے آئین کا مسودہ بنا سکتے ہیں یہ حیرت انگیز ہے۔ آپ کو کیا ایسا لگتا ہے کہ اس طرح کی شیطانی تجویز کو آسام کے ہندو قبول کر لیں گے خاص کر بہت بڑے پیمانے پر جبری تبدیل مذہب، آتش زنی، لوٹ، آبروریزی اور جبری شادیوں کے غمگین تجربہ کے بعد؟ اس تشریح پر آپ کے اصرار سے جو بے چینی اور غصہ پیدا ہوا ہے اس کا آپ کو اندازہ ہی نہیں آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ آسام کو بنگال کا غلبہ قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے تو اس خواب غفلت سے آپ جس قدر جلد بیدار ہو جائیں، بہتر۔ ہم لوگ سکھوں کو مطمئن کرنے کے لیے کیا کریں گے جن کے بارے میں یہ باضابطہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان کے ساتھ ناانصافی کا سلوک ہوا؟ اگر وہ لوگ آسام کا آئین بنائیں اور وہ بھی اس ڈھنگ اس گروپ سے باہر نکلنے کا کوئی امکان نہ رہ جائے تو آپ کے بیان میں اس کا مداوہ کیا ہے۔"

"نہرو 7 دسمبر 1946 کو دہلی لوٹ آئے 9 دسمبر سے آئین ساز اسمبلی کا افتتاحی اجلاس منعقد ہونا طے تھا جس میں شرکت کے لیے وہ واپس آئے تھے اس اجلاس کا، یہ اجلاس ہی کیا پوری آئین ساز اسمبلی کا مسلم لیگ کی طرف سے

بائیکاٹ ہوا۔ دسمبر 1946 کے اختتام کے دنوں میں پٹیل نرم ہوئے اور بالآخر انہوں نے تسلیم کیا کہ کانگریس نے آئین پر اعتماد نہ کر کے اور سمجھوتے کا مشورہ قبول نہ کر کے غلطی کی۔''

9 دسمبر 1946 کو آئین ساز اسمبلی کی میٹنگ ہوئی مگر اس اجتماع کا پورا ماحول تقریباً مکمل غیر حقیقی رہا۔ یہ ایک عظیم اور تاریخی موقعہ تھا یہ میٹنگ ایک آزاد اور شاید ہندوستان کے آئین کا تعین کرنے کے لیے طلب کی گئی لیکن اس میٹنگ میں مستقبل کی تصویر دکھاتے ہوئے مسلم لیگ کی نمائندگی خالی کرسیوں سے ہوئی۔

مختصر اجلاس کے بعد اسمبلی کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ملتوی کر دی گئی۔ اس میٹنگ میں صرف آزادی کا اعلامیہ منظور کیا گیا۔ یہ قرارداد نہرو نے پیش کی تھی۔ اس پر ووٹنگ بھی نہیں کرائی گئی۔

لارڈ پیتھک لاورنس آئین ساز اسمبلی کی تشکیل پر نہرو کو مبارک بادی کا تار بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر اس اندیشے کے تحت انہوں نے اس خیال کو عملی جا□نہیں پہنایا کہ اس جذبے کے مظاہرے پر جناح کی طرف سے زبردست احتجاج ہوگا اور اس کے جواب میں نہرو مزید تقریریں کریں گے اور پہلے سے زیادہ ہنگا□ ہوگا۔ کیا کوئی نہرو سے یہ کہنے والا نہیں تھا کہ جناح اور چرچل کے بیانات کے جواب میں تقریر سے گریز کریں کیوں کہ وہ لوگ تو ہنگا□ اور شرانگیزی پر اترے ہی ہوئے ہیں اور ان کی باتوں پر سنجیدگی سے توجہ دے کر نہرو ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ اس لیے پیتھک لاورنس نے صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ سوال کیا۔ '' کانگریس کے لوگ گروپنگ سے کیوں پریشان ہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ وہ اس کے لیے فکر مند ہوئے بغیر کہ آسام کا کیا ہوگا'' یہ کام جلدی سے پورا نہیں کر سکتے۔ وہ چیزیں وقت گزرنے کے ساتھ ازخود اپنی جگہ آجائیں گی جس وقت بہت کچھ کرنا باقی ہو اس وقت ان چھوٹے چھوٹے معاملات پر وقت اور توانائی کا زیاں حماقت ہے۔

کیا اس مشاہدے میں کوئی جان ہے؟ ہم لوگ جزئیات میں مسلسل الجھ کر کسی اہم چیز کی طرف سے غافل ہو رہے تھے۔ ان الفاظ میں لکھی معمہ اور پرسکون انسان کے پرجوش جذبات کا اظہار اتنا نہیں تھا جتنا کہ ہندوستان کے کسی دوست کے فکر مندی کی آواز تھی یہ افسوس ہی سہی مگر سچ ہے کہ یہ الفاظ کتنے فعال اور موثر نہیں تھے اس وقت کے پیچیدہ چیلنجوں کو سلجھانے میں مددگار ہوتے کابینہ کے ایک اہم سینئر ممبر بیون نے بھی تقریباً اسے ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا مگر زیادہ پرزور لفظوں میں۔ '' یہ درست ہے کہ برطانوی نے ماضی میں ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت 10 پھلائی ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہم لوگوں نے ان جھگڑوں کا استحصال کیا لیکن یہ سب باتیں ماضی کی ہیں۔ اب بغیر حکومت آئی ہے۔ اس نے آپ کو سیلف گورنمنٹ کی پیشکش کی ہے اور آپ یہ سوراج بھی نہیں لے رہے ہیں۔ احمق نہ بنئے آگے بڑھئے اسے لیجیے۔ جناح کے ساتھ سمجھوتہ کیجیے۔ اس کے بعد بھی ہمارے پاس کرنے کو کافی کام باقی رہ جائے گا۔'' ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ نے کیا نہرو کے قیام لندن کے دوران ان سے یہ بات کہی تھی تو بیوی نے جواب دیا '' میری ان سے ملاقات کیسے ہو سکتی تھی؟ نہرو جس لمحے پہنچے تھے، اس لمحے سے انہیں واپس جانے کی عجلت تھی۔''

اس طرح 1946 ختم اور فیصلہ کن 1947 نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔

1947 میں کھیل کا تلخ خاتمہ

جب فیصلہ کن 1947 آیا، تو جس چیز نے دوسری کسی بھی چیز سے کہیں زیادہ ہندوستان کے سیاسی آسمانوں کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ دونوں فرقوں اور اہم سیاسی پارٹیوں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان شدید اور مسلسل بڑھتی ہوئی دشمنی تھی نہ کوئی جانتا تھا نہ قبل از وقت کہہ سکتا تھا کہ یہ سال کیا لے کر آئے گا یا یہ فیصلہ کن سال کیسے اختتام پذیر ہوگا۔ ہر کسی کے ذہن میں بے یقینی تھی، خدشات تھے اور مبہم پیش گوئیاں تھیں۔

31 جنوری 1947 کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کراچی میں ہوئی جس میں ایک قرارداد منظور کر کے انہیں ساز اسمبلی کے ترکیبی اجزا اور ضابطوں کی مذمت کی گئی...... اس میٹنگ میں حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ کابینہ مشن پلان کی باضابطہ ناکامی کا اعلان کرے کیوں کہ نہ صرف کانگریس نے اسے قبول نہیں کیا تھا بلکہ سکھوں نے بھی نہیں مانا تھا اور شیڈولڈ کاسٹ نے بھی نہیں۔ کانگریس نے اس کے ردعمل میں حکومت سے مسلم لیگ کے ممبروں کے استعفا کا مطالبہ کیا۔ اپنی بات پر زور دینے کے لے 15 فروری کو ایک پریس بیان میں سردار پٹیل نے وارننگ دی کہ اگر مسلم لیگ کے ممبروں نے استعفا نہیں دیا تو کانگریس کی طرف سے جوابی کارروائی ہوگی۔ سردار پٹیل نے مزید ہوشیار کیا کہ اگر ایسا ہوا تو اس کے نتیجے میں سنگین قسم کے فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے اور (یہاں تک کہ) خانہ جنگی بھی ہوسکتی ہے۔

تاہم یہاں ہمارا اور کئی دن پیچھے جانا ضروری ہے کیوں کہ تب ایک اور یادگار واقعہ رونما ہوا تھا۔ 4 فروری 1947 کو فیلڈ مارشل لارڈ ویول نے اپنی ڈائری میں ایک اندراج کیا ہے کہ" دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد ایک خصوصی قائد وزیراعظم کا ایک خط لے کر آیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ ایک مہینہ کے نوٹس کے ساتھ مجھے میرے عہدے سے برطرف کیا جاتا ہے۔ یہ کام زیادہ شائستگی سے نہیں کیا گیا تھا"۔ ویول نے وائسرائے کا عہدہ چھوڑنے کے بارے میں ایک ذاتی تحریر میں صرف اتنا ہی اندراج کیا ہے۔ یہ ایک بڑا فیصلہ ان لحاظ سے تھا کہ ان کے مستقبل پر اس کے شدید اثرات پڑنے تھے۔ ویول کا ردعمل ایک فوجی کا ہی تھا۔ بے حد مستقل مزاج، تقریباً درشت، پہلے قدم سے دوسرے قدم کا فاصلہ توڑے بغیر اچھے برے کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے والا (ایٹلی کے خط اور ویول کے جواب میں اس خط کے ملک کے لئے ضمیمہ VIII دیکھیے)

20 جنوری 1947۔ ایوان کے نمائندگان میں وزیراعظم نے ہندوستان کے آئینی مستقبل کے بارے میں برطانوی حکومت کا وائٹ پیپر پیش کیا۔ ایٹلی نے اس وائٹ پیپر کو ایوان میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ" ہز میجسٹی کی حکومت چاہتی تو یہی تھا کہ کابینہ مشن پلان کے مطابق ہندوستان کی تمام پارٹیوں سے منظور شدہ ایک آئین کے تحت ذ□دار بنائے گئے حکام کو اپنی ذ□داری سونپ دے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ فی الحال ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ ایسا کوئی آئین بن سکے گا اور اس طرح کے حکام ظہور میں آسکیں گے۔ بے یقینی کی موجودہ صورت حال خطرات سے پر ہے۔ اور اسے غیر مفید

مدت تک برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ ہز میجسٹی کی حکومت یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ جون 1948 تک اقتدار ذ□دار ہندوستانی ہاتھوں میں سونپنے کے لئے ضروری اقدامات کرنے کی نیت کر چکی ہے۔ اس دن انہوں نے لارڈ لاش ماؤن بیٹن کو لارڈ ویول کی جگہ ہندوستان کا اگلا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر کرنے کا بھی باضابطہ اعلان کیا۔

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں حزب اختلاف کے اراکین کی تقریروں میں اس بنیاد پر وزیر اعظم کے بیان پر تنقید کی گئی کہ جو تاریخ چنی گئی ہے وہ بہت قبل از وقت ہے۔ اس سے عجلت اور خوف کی بو آتی ہے۔ جیسا کہ تب ہاؤس آف لارڈس کے کیمپ بل جانسن نے لکھا تھا'' چوتھائی صدی سے بھی زیادہ ہندوستانی انتظامیہ کی تاریخ سے وابستہ متعدد مشہور ہستیوں نے اپنے سے خطاب کیا...... لارڈ ٹمپل وڈ نے یہ سخت اعلان کیا وقت کی حد کا تعین اعتماد شکنی ہے جس سے ہندوستان کا امن اور اس کی خوش حالی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ یہ ایک نمایاں مشاہدہ تھا۔ لارڈ ٹمپل وڈ جیسی شخصیت کا مشاہدہ تھا۔ ہاؤس آف لارڈس میں یہ بیان حکومت کے لئے ایک مہیب چیلنج تھا۔ انہوں نے جو تائید مانگی تھی وہ نہیں ملی اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کا'' متحدہ اور قومی طریقہ کار'' اپنانا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ جس وقت لارڈ لسٹوویل نے حکومت کی طرف سے پہلے دن کی بحث سمیٹی ''اس وقت تک اس قرارداد پر ووٹنگ اور حکومت کی شخصیت پہلوتہی'' کا امکان تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت لارڈ ہیلی فلکس کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان کے مسائل کا اپنی سمجھ کی مدد سے تقریر کی اور اس تقریر سے ہاؤس آف لارڈس عدم اتفاق کا اندراج کرنے سے بچ گیا۔ یہ ہندوستان کے امور میں لارڈ ہیلی فکس کی آخری بڑی فیصلہ کن ملاقات تھی۔ انہوں نے جماعتی وابستگی اور ڈسپلن کی حدوں سے بہت وقت باہر نکل کر اعلان کیا:'' میں جتنا کچھ جانتا ہوں اس کے بل پر میں یہ کہنے کو تیار نہیں ہوں کہ دوسرا کون سا قدم غلط یا صحیح ہوگا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہر لحاظ سے اس قدم کو غلط مانا جائے گا...... سچائی تو یہی ہے کہ ہندوستان کے لئے آج کوئی ایسا حل نہیں جو سنگین قسم کے اعتراضات سے بھرا ہوا نہ ہو، سنگین قسم کے خطرات سے پر نہ ہو۔ اور اس کے خلاف جتنا کچھ بھی کہا جائے، اس سب کے ساتھ میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں جب تک ایمانداری اور اعتماد کے ساتھ کوئی بہتر حل کی سفارش نہیں کر سکتا، تب تک میں اس کام کی مذمت کرنے کو بھی تیار نہیں جو کام ہز میجسٹی کی حکومت کر رہی ہے۔ اس لمحے میں اگر ہندوستان کو اس ایوان سے صرف ایک پیغام ملتا ہے، مذمت کا، تو مجھے اس پر افسوس ہے اور مجھے اس کی بنیاد پر مکمل طور سے یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ یہ ناکامی، مایوسی اور پیشین گوئی کے قدرتی احساسات ہیں''

ایلن کیمپ بل جانسن نے اس کے بعد لکھا ہے کہ کس طرح اسکے بعد'' لارڈ سیمویل نے مجھ سے کہہ کر ہاؤس آف لارڈس اتنی پر اثر تقریر انہوں نے اس سے قبل کبھی نہیں کی تھی۔ اس تقریر کا نتیجہ ہے کہ ان کے کھڑے ہونے سے پہلے کنزرویٹیو پارٹی کے ان کے بھی بیشتر رفقا نے حکومت کے خلاف ووٹ دینے کا مزاج بنا لیا تھا۔ ان کی تقریر کے دوران اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا اور ٹمپل وڈ سے ان کی اس اپیل کی حمایت میں آ گئے کہ ایوان کو اس قرارداد پر ووٹ دینے کے مرحلے کی ضرورت کے باوجود، اس مرحلے سے نہ گزاریں۔

اس بات پر جو بحث ہوئی اس کا رخ ہی پھرا ہوا تھا، رائے بدل چکی تھی۔ ٹمپل وڈ نے تنقید برقرار رکھنے کے باوجود اپنی قرارداد واپس لے لی۔

اس کے بعد 5 مارچ 1947 کو ایوان نمائندگان میں اس سوال پر بحث ہوئی۔ اس بحث کا بیان جن اندراجات میں ہے وہ تقریباً ماتمی نوعیت کے ہیں" ایوان نمائندگان میں دو دن کی بحث کا آغاز ظاہر ہے کہ ایک بڑا پارلیمانی واقعہ تھا۔ کرپس کی تقریروں میں ہمیشہ بڑی معقولیت ہوتی ہے لیکن اس موقع پر انہوں نے جو تقریر کی اس میں دبدبہ بھی کافی تھا اور زور بھی بہت تھا۔

"انہوں (کرپس) نے بڑے دکھ سے یہ بات کہی کہ 1948 کے بعد بھی ہندوستان میں ٹکے رہنا انتظامی اور فوجی اعتبار سے بعید از امکان ہے۔ انہوں نے وقت کی مقررہ حد پر اس کے سوا اور کئی زور نہیں دیا۔ لارڈ ویول کا کوئی حوالہ نہیں دیا یہ ویول کے حوالے سے گریز بے شک بہت افسوسناک تھا کیوں کہ اس گریز کے اس افواہ کو تصدیق کی تقویت بخشی کہ حکومت اور واپس آتے ہوئے وائسرائے کے درمیان شدید قسم کا اختلاف رائے تھا۔

کیمپ بل جانسن نے اپنے ریکارڈ میں لکھا ہے کہ" جمعرات 6 مارچ 1947 کو جب چرچل نے پھر سے بحث کا آغاز کیا تو ہم لوگ ان کی آتش بیانی سے محظوظ تھا۔ ان کی تقریر کا سبھوں کو انتظار تھا۔ ان تمام برسوں میں چرچل اپنی محبوب مخالفت، جس کو شاید بہتر لفظوں میں ہندوستان کے لئے گالیوں کی بوچھار کہہ سکتے ہیں پر بہت ثابت قدمی سے جمے رہے ہیں۔ ہمارے عہد کے تمام عوامی امور پر ان کی سارے اثرات شاید سب سے زیادہ غیر لچک دار اور سخت ترین رائے ہندوستان کے خلاف ہی رہی ہے۔

"انہوں نے 1942 کے کرپس مشن سے اپنی بات شروع کی اگرچہ اس وقت اس پیش کش کو قبول نہیں کیا تھا مگر ایوان کے دونوں فریق اب بھی اس کے پابند ہیں۔ انہوں نے موجودہ پلان کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ اپنے اصولوں کے" امکانات اور دیانت داری سے بری طرح بھٹک گیا ہے۔ اس بحث میں بالکل آخر میں ویول کا حوالہ آیا مگر وہ حوالہ خیر سگالانہ نہیں تھا۔ وائسرائے لارڈ ویول کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ میں لارڈ ویول کی وکالت کرنے نہیں آیا ہوں۔ جو تمام خطائیں اور غلطیاں حکومت سے ہوتی ہیں ان میں بے رغبت یا بارضا وہ شامل رہے ہیں لیکن چرچل نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے یہ ضرور کہا کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس مرحلے میں ویول کو کیوں کنارے لگا دیا گیا۔ میں چاہوں گا کہ لوٹ کر آنے کے بعد وہ ذاتی طور پر بیان دے کر بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔

نئے وائسرائے کے بارے میں چرچل نے شدید طنز کے ساتھ سوال کیا کہ" کیا وہ صورت حال کو بحال کرنے کی نئی کوشش کریں گے یا یہ صرف فرار کی کارروائی ہے جسے تکمیل تک پہنچانے کے لئے انہیں اور دیگر ممتاز افسروں کو بھیجا گیا ہے؟ "میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ پورے معاملہ کو دیکھ کر یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ ایک مانجھو لیا اور تباہی خیز کی پردہ پوشی کے لئے

حکومت شاندار جنگی شبیہوں کا استعمال کرنے کی کوشش میں ہے۔'' اس کے بعد چرچل نے پیش گوئی کی'' ہندوستان کو نہ صرف بٹوارے سے گزرنا ہوگا بلکہ بکھراؤ، اچانک ٹوٹ پھوٹ سے بھی گزرنا ہوگا اس نام نہاد سیاسی طبقہ کو ہندوستان کی حکومت سونپتے وقت ہم لوگ یہ حکومت ایسے بھس بھرے ہوئے پتلو کے ہاتھوں میں دے رہے ہیں جن کا چند برسوں کے بعد کچھ پتہ ہی نہیں چلے گا کہ کہاں گئے۔ اس حکومت نے اپنی تازہ ترین حرکت یعنی 15 مہینے کی حد کے تعین سے نئے وائسرائے کو مفلوج کردیا اور ایک ایسے ایجنڈے پر جو طے ہو چکا تھا، کام ہونے کے امکان کو تباہ کرڈالا۔ اور آخر میں انہوں نے تابوت میں کیل ٹھونکنے جیسا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا'' بہتوں نے برطانیہ کو اس کے دشمنوں سے بچایا ہے لیکن برطانیہ کو برطانیہ سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ لیکن ہم لوگ کم از کم اتنا تو کرہی سکتے ہیں کہ شرم کے دھبے اور کپکپی کا جو احساس ہم میں سے بہتوں کو ہے اس میں اپنی شرمناک رخصتی، قبل از وقت عاجلانہ فرار سے اضافہ نہ کریں۔ کم از کم رنج وغم کی ٹیس نہ بڑھائیں'' حیرت انگریز گونجنے والی، شاندار تقریر مگر افسوس کی بات ہے کہ یہ تقریر بری طرح غلط تھی۔

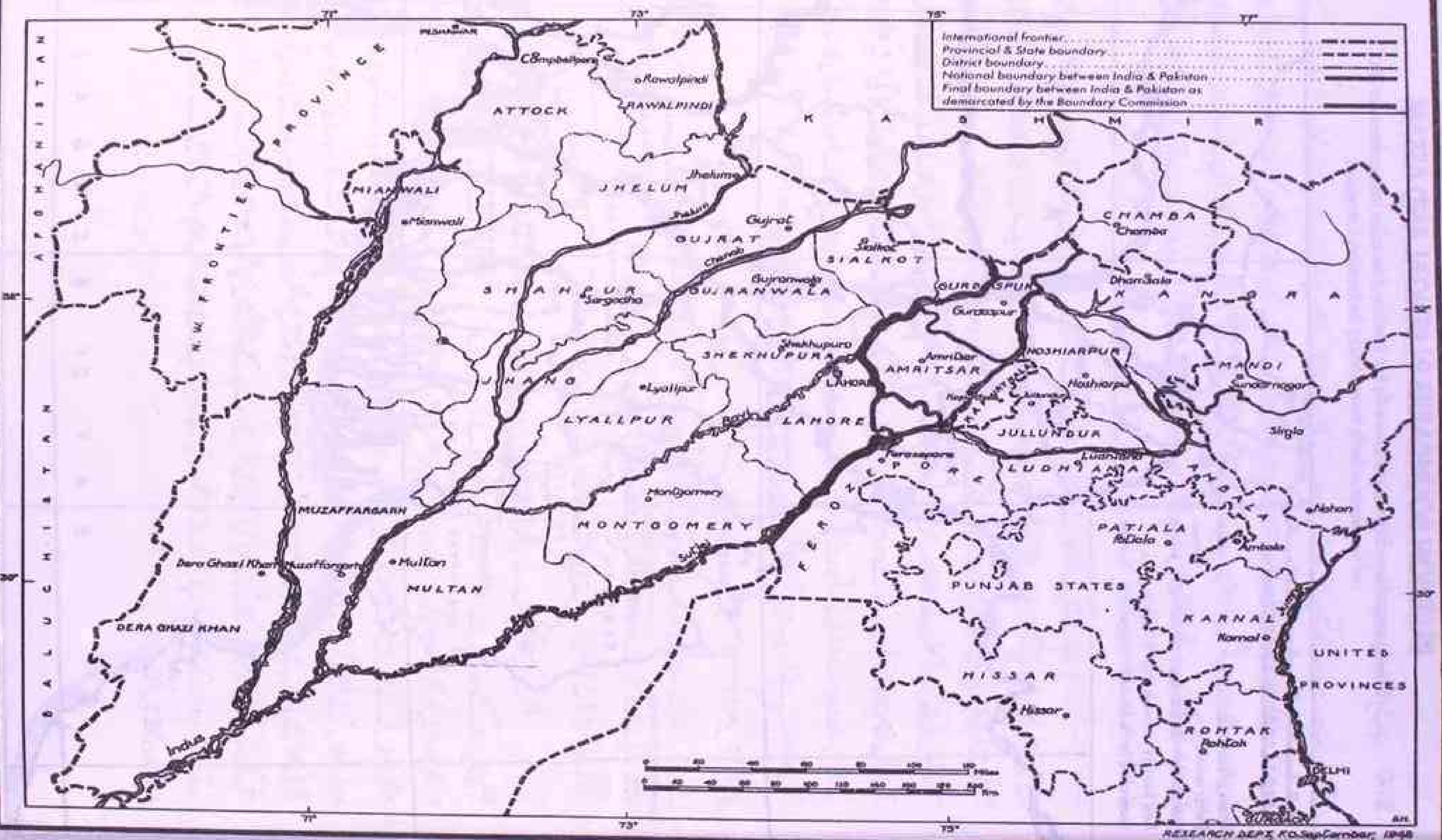
وزیراعظم ایٹلی کے فائل تک جواب اور قرارداد کے حق میں لیبر پارٹی کی کٹر اور غیر متزلزل تائید کی وجہ سے بھی یہ قراردادا ایوان نمائندگان میں منظور ہوئی۔ ہندوستان کی آزادی کا قانون 18 جولائی 1947 کو منظور کرلیا گیا۔

اس کے بعد واقعات کے رونما ہونے کا سلسلہ پہلے سے زیادہ تیز ہوگیا۔ یہ واقعات نتائج کے اظہار سے المناک ثابت ہوئے۔ ان کو روکا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ چوں کہ یہ واقعات انسانی غلطی کا نتیجہ ہے اس لیے ان کی رفتار میں کبھی ختم نہ ہونے والی تیزی تھی اور بالآخر تباہ کن اور ہلاکت خیز بٹوارا ہوا۔ صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ غیر منقسم ہندوستان کے کٹر حامی بھی اب پارٹیشن مانگنے لگے تھے۔ کیوں کہ وہ ادھر کے کچھ برسوں کے دوران رونما ہونے والی وارداتوں سے راحت چاہتے تھے۔ اس کے نتیجے میں بہت سے خواہ مخواہ کے مشورے بھی سامنے آئے اور غیر عملی وغیر حقیقت مندانہ اندازے بھی قائم کئے گئے۔ سردار پٹیل نے 4 مارچ 1947 کو کانجی دوار کا داس کے نام ایک خط میں اپنے خیالات کو لفظوں کی یہ زبان دی'' آپ جیسا دیکھ رہے ہیں میں اس طرح کا اندھیرا نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اگلے جون تک آئین یقیناً تیار ہوجائے گا اور اگر تب بھی لیگ نے پاکستان کی ضد نہیں چھوڑی تو صرف ایک ہی متبادل صورت سامنے رہ جائے گی بنگال اور پنجاب کی تقسیم۔ وہ لوگ سول وار کے بغیر نہ پورا پنجاب لے سکتے ہیں نہ پورا بنگال۔ مجھے نہیں لگتا کہ برطانوی حکومت تقسیم پر رضامند ہوجائے گی۔ آخر میں انہیں اس میں عقلمندی نظر آئے گی کہ اقتدار کی باگ ڈور میں سے زیادہ طاقتور پارٹی کے ہاتھ میں سونپیں۔ وہ اگر ایسا نہیں کریں تو بھی وہ اقلیت کو تقسیم حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں مدد نہیں کرسکیں گے پورا ہندوستان متحد رہے گا اور مرکز مضبوط صرف مشرقی بنگال اور پنجاب کے ایک حصہ کو چھوڑ کر۔ سندھ اور بلوچستان کو اس مرکز کے تحت مکمل داخلی اختیارات حاصل کریں گے اور وہ اتنے طاقتور ہوں گے کہ بقیہ حصے بھی بالآخر لوٹ آئیں گے۔

یہ ایک ایسا خط ہے جس سے انکشاف ہوتا ہے کہ مستقبل کے بارے میں پٹیل نے جو اندازے لگائے ان میں وہ

PARTITION BOUNDARIES IN THE PUNJAB

Showing notional boundaries as laid down in the First Schedule of the Indian Independence Act 1947, and boundaries as finally demarcated by the Boundary Commission.



PARTITION BOUNDARIES IN BENGAL AND ASSAM

Showing national boundaries as laid down in the First Schedule of the Indian Independence Act 1947, and boundaries as finally demarcated by the Boundary Commission.

Provincial boundary
District boundary
National boundary between India & Pakistan
Final boundary between India & Pakistan as demarcated by the Boundary Commission

DARJEELING
JALPAIGURI
COOCH BEHAR
Cooch Behar
Brahmaputra
Rangpur
Dinajpur
DINAJPUR
RANGPUR
ASSAM
Ganges
MALDA
English Bazar
BOGRA
Bogra
Sylhet
SYLHET
Mymensingh
MYMENSINGH
RAJSHAHI
Rampur Boalia
Jamuna
Berhampore
MURSHIDABAD
PABNA
Pabna
Suri
BIRBHUM
DACCA
Dacca
NADIA
Faridpur
Comilla
BURDWAN
Krishnagar
TIPPERA
Bankura
Burdwan
JESSORE
Jessore
FARIDPUR
BANKURA
NOAKHALI
Noakhali
CHITTAGONG HILL TRACTS
HOOGLY
Chandernagore
Khulna
Barisal
Howrah
HOWRAH
CALCUTTA
KHULNA
BAKARGANJ
Midnapore
MIDNAPORE
24-PARGANAS
Chittagong
MOUTHS OF THE GANGES
BAY OF BENGAL



حقیقت بہت سے دور تھے لیکن اس خط میں انہوں نے پہلی بار، ماخذ کے طور پر ہی سہی پنجاب اور بنگال کے بٹوارے کے شرط پر پارٹیشن کو قبول کیا ہے۔ یہ خط ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے کے ٹھیک تین ہفتے پہلے لکھا گیا تھا۔ اور پٹیل نے (جا ہے بعد میں غلط ہی ثابت ہوا) قبل از وقت یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ برطانیہ ملک کی تقسیم نہیں چاہے گا۔ اس کے چار دن کے بعد 8 مارچ 1947 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل کی پوری تائید وحمایت سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ

'......(پنجاب میں رونما ہونے والے) ان المناک واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ پنجاب میں تشدد اور جبر سے مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ جبر پر مبنی کوئی معاہدہ پائیدار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ایک ایسا راستہ نکالنا ضروری ہے جس میں مصلحت اور مجبوری کی حتہ الامکان کم سے کم ہو۔ اس کے لئے پنجاب کو دو صوبوں میں بانٹنے کی ضرورت درپیش آئے گی تا کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت والا حصہ اس حصہ سے الگ ہو جائے جس میں غلبہ غیر مسلموں کا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کا خیال ہے کہ یہ حل تمام متعلقہ فرقوں کے لئے سودمند ہوگا۔ اور ایک دوسرے سے ٹکراؤ، خوف اور شبہ میں کمی آئے گی۔ یہ کمیٹی پنجاب کے عوام سے دردمندانہ اپیل کرتی ہے کہ وہ قتل وغارت گری کا سلسلہ بند کریں اور اس المناک صورت حال کا سامنا کریں جس کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک ایسا حل تلاش کیا جائے جن میں کسی بڑے گروپ کا غلبہ نہ ہو اور اسی سے ٹکراؤ کے اسباب موثر طور پر ختم ہو جائیں گے۔

اس سے قبل نہرو نے تو پنجاب کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی سفارش بھی کر دی تھی۔ ایک مسلم اکثریت والا علاقہ، ایک سکھ اکثریت والا علاقہ اور ایک علاقہ ملی جلی آبادی والا۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ نہرو نے ہر تجویز سنجیدگی سے پیش کی تھی یا پھر جناح کی متبادل تجویزوں کو بے جان کرنے کی ایک عیارانہ سازش؟

جس دن کانگریس نے یہ قرارداد منظور کی وہ دن اچھا نہیں تھا کیوں کہ اس دن گاندھی زخموں پر مرہم رکھنے کے مشن پر بہار گئے ہوئے تھے۔ اور مولانا آزاد بیمار ہونے کی وجہ سے ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ سے غیر حاضر تھے۔ یہ بات پٹیل اور نہرو دونوں کو بخوبی معلوم تھی کہ یہ جو دو افراد غیر حاضر ہیں وہ حاضر ہوتے تو اس قرارداد کی مخالفت کرتے۔ اس قرارداد کے منظور ہونے کے تین ہفتے کے بعد گاندھی نے ایک خط لکھ کر نہرو سے اس قرارداد کی معقولیت کے بارے میں پوچھا۔ 15 اس دن انہوں نے پٹیل کو ایک خط لکھ کر قرارداد کی وضاحت کرنے کو بھی کہا۔ پہلے پٹیل نے جواب دیا: ''پنجاب سے متعلق قرارداد کے بارے میں آپ کو کچھ سمجھانا مشکل ہے۔ انتہائی شدید صلاح ومشورے اور بحث ومباحثہ کے بعد یہ قرارداد منظور کی گئی ہے۔ کوئی کام عجلت میں نہیں کیا گیا۔ پوری طرح سوچے سمجھے بغیر نہیں کیا گیا۔ یہ ہمیں اخبارات سے معلوم ہوا کہ آپ نے اس قرارداد کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن آپ کو بے شک اس کا پورا حق حاصل ہے کہ آپ جس بات کو درست سمجھتے ہیں کہیں''

ایک دن کے بعد نہرو کا بھی جواب آ گیا۔ اس میں اور زیادہ لنگ تھا۔ ''پنجاب کو تقسیم کرنے کی جو قرارداد آئی بس ہماری سابقہ بحثوں سے قدرتی طور پر ابھر کر آئی ہے۔''

اس قرارداد سے کانگریس پارٹی کے موقف اور حکمت عملی میں بنیادی تبدیلی آئی۔ ماؤنٹ بیٹن نے تب تک وائسرائے کے طور پر عہدہ سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے بغلیں بجاتے ہوئے یہ اندازہ قائم کر لیا کہ پٹیل نے پنجاب کی تقسیم کو قبول کر کے۔ ایک طرح سے ہندوستان کے پارٹیشن کے اصول کو بھی قبول کر لیا ہے۔ انہوں نے پٹیل کو فوراً بلوا بھیجا۔ تب تک جواہرلال نہرو کی طرف سے بھی پارٹیشن کی مخالفت نرم پڑ گئی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 20 مارچ 1947 کو ہندوستان آمد کے ایک مہینے کے اندر جواہرلال نہرو، جو کہ تب پارٹیشن کے پرزور مخالفین میں تھے، اس کے جوشیلے وکیل بن گئے۔ یہ قرارداد جناح کے دوقومی نظریے کی قبولیت کے مترادف ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے جغرافیہ، معاشرے اور سیاست کے ٹکڑے کرنے کی تخریبی بنیاد فراہم ہو گئی۔ یہ کانگریس کے ہارنے میں بھی ایک افسوسناک تبصرے کا موجب بنی کیوں کہ کانگریس وہ پارٹی تھی جس نے ابھی تیس سال سے کچھ زائد پہلے بنگال کی تقسیم کی بھی مخالفت کی تھی۔ اور اب وہی کانگریس ہندوستان کے پارٹیشن کی تجویز پیش کر رہی تھی۔ تاہم دوسری قرارداد ایں مسلم لیگ کو نئی پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے اور اس کا حل نکالنے کے لئے کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کی غرض سے اپنے نمائندوں کے نام بھیجنے کی دعوت دی [17]۔ یہ دوسری قرارداد پہلی قرارداد کی منظوری کے بعد کی فکر کا نتیجہ تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی کی بھی خواہش یہی ہو سکتی تھی کہ اس بہت بعد کے مرحلے میں جناح نے کانگریس کی دعوت قبول کر لی ہوتی مگر یہیں یہ ٹیڑھا سوال کھڑا ہوتا ہے کہ کس مقصد کے حصول کے لئے؟ اس کے علاوہ کابینہ مشن پلان کے گروپنگ فارمولا پر کانگریس کی دوہری باتوں سے تب تک جناح اس قدر بدظن ہو چکے تھے کہ انہوں نے صلاح مشورہ کے لئے کانگریس کی دعوت پر دھیان تک نہیں۔ تب 21 اپریل 1947 کو [18] اثرات اور اقتدار کی غیر مشروط طور پر ہندوستان سے فوری واپسی کی پالیسی میرے خیال میں تباہ کن ہو گی۔ یہ چیز ہمارے عوام کے حوصلہ اور روایتوں اور دنیا میں ہماری حیثیت کے لئے جبر و استبداد کی پالیسی سے زیادہ مہلک ثابت ہو گی۔ میں ایسی کسی پالیسی پر عمل کو اپنی رضامندی نہیں دے سکتا۔ یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ اگر ہم لوگ ہندوستانیوں کو ان کے اپنے آئین کے پرامن حل پر رضامند کرنے میں ناکام رہ جائیں تو کیا اس صورت میں ''جبر'' اور ''فرار'' کے درمیان کا کوئی راستہ رہ جاتا ہے [19]۔

درمیانی راستہ ان کا بریک ڈاؤن پلان تھا۔ وزیراعظم اور دیگر وزیروں کے ساتھ انگلینڈ میں غور وخوض کے لئے 2 دسمبر 1946 کو بھیجے گئے ایک نوٹ میں ویول نے حکومت کے سامنے موجود چار متبادل راستوں کی نشان دہی کی۔

(الف) جبر، جن کو خود انہوں نے امکان) سے بعید قرار دیا تھا۔

(ب) تازہ مذاکرات، جو کہ اب عملاً ممکن نہیں رہ گئے تھے۔

(ج) اکثریتی پارٹی ہونے کے ناطے کانگریس کے سامنے خود سپردگی'' میں نہیں سمجھتا کہ یہ عزت دارانہ یا عقلمندانہ پالیسی ہے اس سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ بدنامی پر ہوگا۔ اور نہرو نے بھلم کھلا اعلان کیا کہ 'جولوگ پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے ان کو پاکستان دیا جاتا ہے، لیکن اس شرط پر کہ وہ ہندوستان کے دیگر غیر رضامند حصوں کو ایسے کسی پاکستان میں شرکت کے لئے مجبور نہ کریں یہ ایک نا قابل فہم اور غیر حقیقت پسندانہ حکم امتناعی تھا۔ نہرو نے ایسا کیوں کیا؟ ظاہر ہے کہ ان کے 'گروپنگ' کے خوف نے انہیں اس کا اندازہ قائم کرنے کی تحریک دی ہوگی کہ اس تجویز میں دھوس سے کام لینے کا امکان موجود ہے تبھی تو انہوں نے اس کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد ہی سے ہندوستان کا بٹوارہ، جو کہ اب تک طے ہو چکا تھا، حقیقت کا روپ اختیار کرنے لگا صرف اس کی تفصیلات طے ہونی باقی رہ گئیں۔ یہ طے کرنا باقی رہ گیا کہ بٹوارہ کب ہوگا، کہاں ہوگا، کیسے ہوگا؟ بٹوارے کی لائن کہاں کھینچی جائے گی۔ یہ نہ کسی کو معلوم تھا، نہ کوئی بتا سکتا تھا۔ آئین ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے اس کے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد نے 28 اپریل 1947 کو کہا کہ'' ایوان کو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ اس کے کچھ صوبوں کی بھی تقسیم کے لئے تیار رہنا چاہیے''20

2 مئی 1947 کو لارڈ اسمے اور جارج ایبل ہندوستان کی آزادی کے لئے پہلا ماؤنٹ بیٹن پلان لے کر لندن روانہ ہوئے۔ اس منصوبہ کا مسودہ کیا تھا، اصل میں کابینہ مشن پلان کی بدلی ہوئی شکل تھی جس کا مقصد پارٹی لیڈروں کی رضامندی کے بغیر یک طرفہ طور پر اقتدار منتقل کرنا تھا اور مضبوط مرکزی حکومت کی بجائے ایک وفاق بنانا مقصود تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی طربیہ ڈرامے جیسا ہے: ہندوستان کی آزادی کو غیر ارادی طور پر سوانگ بنا دیا گیا۔ ابھی اسمے اور ایبل لندن ہی میں تھے کہ اصلاحات کمشنر اور وائسرائے کے صلاح کار وی۔ پی۔ مینن نے شملہ کے وائسرائے لاج میں پٹیل کے ساتھ اپنی ایک بات چیت فاش کر دی۔ یہ بات چیت کابینہ مشن پلان کے کارگر نہ ہونے سے متعلق تھی۔ انہوں نے بتایا کہ'' میں نے پٹیل سے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ آپ اس سچائی کا سامنا کریں کہ پاکستان کے دعوے پر جناح کو برطانوی باثر رائے عا□کی تائید حاصل ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان میں فوج کے بیشتر اعلیٰ افسران ان کی حمایت کر رہے ہیں۔21 مینن نے بعد میں وائسرائے کو بتایا کہ پٹیل نے مجھے اس کا یقین دلایا کہ اگر ریاستوں کے مقبوضات کی بنیاد پر فوراً ہی اقتدار منتقل کیا جا سکتا ہے تو وہ اپنے اثرات کا استعمال کر کے اسے یقینی بنائیں گے کہ کانگریس اس بات کو قبول کر لے۔ اس کے بعد مینن نے پٹیل کی موجودگی میں ایک منصوبہ کا خاکہ لکھوایا اور ایک خصوصی قاصد کے ذریعہ اسے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے پاس بھجوا دیا۔ اس میں انہوں نے صرف یہ نہیں لکھا کہ پٹیل نے اسے دیکھ لیا ہے اور منظور بھی کیا ہے۔ پٹیل کو اس کے بارے میں اس کے بعد کچھ نہیں معلوم ہو سکا مگر ماؤنٹ بیٹن نے مینن کی زبان سے جب یہ سنا تو وہ جھوم اٹھے۔22 10 مئی 1947 کو جب نہرو شملہ میں تھے، ماؤنٹ بیٹن کو ان کے ساتھ وی پی مینن کے پارٹیشن

پلان کے بارے میں تبادلہ خیالات کا موقع مل گیا۔ وائسرائے اس کی سادگی اور اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا کہ اس طرح کا سیدھا سادا انتظام ہو تو پھر اقتدار کی منتقلی کے لئے جون 1948 تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ برطانیہ میں کابینہ جیسے ہی اس پلان کو منظور کرلے اور اقتدار منتقل کردیا جاسکتا ہے۔ یہ واضح نہیں کہ نہرو نے سچ مچ اس سے اتفاق کرلیا تھا یا اتفاق کرتے نظر آتے ہیں۔

اس وقت اگلا منطقی قدم یہی ہوسکتا تھا کہ اس پلان کو اقتدار کی منتقلی کے تسلیم شدہ فارمولے کے طور پر قبول کرلیا جاتا تاہم یہ نہیں ہوا، ہو بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ ایک اور منصوبے کا بھی وجود تھا اور وہ منصوبہ برطانی کابینہ سے منظور کرانے کے لئے اسمے لندن لے گئے تھے۔ وائسرائے اس پر تعطل کے خاتمے اور اقتدار کی حتمی منتقلی کے لئے انحصار کررہے تھے۔ سوال یہ کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس وقت اس عارضی مینن پلان کو باضابطہ غور وخوض کے لئے نیم سرکاری بنیاد پر خاص طور سے کیوں پیش کیا؟ اس کے علاوہ نہرو کے ساتھ وائسرائے کی روداد میں کیوں درج کرایا؟ کہ کچھ بات تھی ایبل مجھے مارو الی اور اس کے بعد یہی ہوا بھی۔

ماؤنٹ بیٹن کا اپنا پلان، یعنی وہ پلان جسے لے کر اسمے گئے تھے 10 مئی 1947 کو لندن سے تار کی صورت میں واپس بھیج دیا تھا۔ کابینہ نے اس میں بعض چھوٹی چھوٹی ترمیمات کی تھیں۔ کسی اصول کو قطعی نہیں بدلا تھا۔ اسی شام رات کے کھانے کے بعد بات چیت کے دوران اچانک ترنگ میں آکر ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو وہ تار دکھادیا۔ نہرو کا غذات دیکھ کر برہم ہوگئے اور اس "نیم منظور شدہ" پلان کو ماننے سے صاف انکار کردیا اس کے بعد شملہ اور لندن کے درمیان مراسلت ڈرامائی انداز میں تیز ہوگئی۔ ایٹلی کو ماؤنٹ بیٹن نے ایک تار بھیجا جس میں لکھا کہ 'آپ نے جس منصوبے کا مسودہ منظور کیا ہے وہ مسترد کیا جاتا ہے۔' "نظر ثانی شدہ پلان پر جمے رہیے۔23 11 مئی 1947 کی شام 6 بجے تک مینن نے اپنے پلان کے مسودے کا آخری جملہ مکمل کرلیا تھا اور اسی شام ان کو یہ اطلاع بھی مل گئی کہ نہرو نے یہ منصوبہ منظور کرلیا ہے۔ ہندوستان کا اور دنیا کا بھی چہرہ بدل دینے والے اس پلان کے مسودے کی تیاری میں مینن کو چار گھنٹے لگے تھے۔ اس سے جو سوال اٹھتا ہے اس کو تسلیم کرنا بھی۔ کس قدر تکلیف دہ ہے۔ کیا ہندوستان کے قدیم اتحادات کو توڑنے میں اتنا ہی وقت لگا؟

18 مئی 1947 کو ماؤنٹ بیٹن اور مینن لندن روانہ ہوگئے۔ اسمے اور ایبل پہلے ہی سے لندن میں تھے۔ ان دونوں نے اس مینن پلان کی سخت اور طویل مخالفت کی۔ وہ اب بھی اپنے بی پلان کو ترجیح دے رہے تھے لیکن ایٹلی اور ان کی کابینہ نے مینن پلان کو منظوری دے دی۔ 24

گاندھی جناح ملاقات

آخری بار گاندھی اور جناح کی ملاقات 6 مئی 1947 کو نئی دہلی میں ہوئی۔ اس سے پہلے بھی اکثر وہ دونوں یہاں ملتے رہے تھے۔ یہ ملاقات عدم اتفاق پر ختم ہوئی۔ گاندھی کی منظوری سے جناح کے جاری کردہ ایک بیان میں کہا گیا تھا

کہ ''ہم لوگوں نے دو امور پر بات کی۔ ایک معاملہ انڈیا کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کرنے کا تھا۔ مسٹر گاندھی نے تقسیم کے اصول کو نہیں مانا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تقسیم ناگزیر نہیں ہے جب کہ میری رائے میں نہ صرف پاکستان ناگزیر ہے بلکہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا یہی واحد سیاسی حل ہے۔ جس دوسرے معاملہ پر ہم نے بات کی ہے وہ ایک خط کا معاملہ ہے، جس پر ہم دونوں نے دستخط کئے ہیں اور عوام سے امن برقرار رکھنے کی مشترکہ اپیل کی ہے اور ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم اپنے اپنے حلقوں میں مقدور بھر کوشش اس بات کی کریں کہ ہماری اپیل پر عمل ہو اور ہم لوگ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن کام کریں'۔ 25ے

پارٹیشن سے پہلے اس کے دوران اور اس کے بعد بھی پورے ملک میں جس بڑے پیمانے پر تشدد ہوتا رہا، وہ بالکل ختم نہیں ہوتا تو بھی اس میں کافی کمی آ سکتی تھی بشرطیکہ ایک حکمت عملی کے تحت قدم بہ قدم واپسی ہوتی۔ لیکن ایسا ہو سکتا تھا کیوں کہ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان آنے کے چند ہفتوں کے اندر اس سوال پر سنجیدہ مذاکرات شروع ہو گئے تھے کہ ہندوستان کا پارٹیشن کیسے کیا جائے۔ 3 جون 1947 تک مسلم لیگ، کانگریس اور اکالیوں سب نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ ہندوستان کے ٹکڑے کرنے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کو جن امکانات کا سامنا تھا ان کے بارے میں سر چمن لال سیتاواڑ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ''ہندوستان کی اس تقسیم سے ایسے لاتناہی لڑائیوں اور افراتفری کی بنیاد رکھ دی ہے، جو ان منصوبوں کو بھی جو کہ ابھی پیدا نہیں ہوئی ہیں۔ ناگفتہ بہ صعوبتوں کا سامنا کرنے پر مجبور کر دے گی 26ے تاہم سر چمن لال نے پارٹیشن کے لئے اصل الزام کابینہ مشن کے گروپنگ فارمولہ پر کانگریس کی دوہری بات پر عائد کیا۔

کابینہ مشن کا آخری کھیل بھی اب ختم ہو چکا تھا۔ مہرے بکھر چکے تھے۔ بساط بند کر دی گئی تھی۔ ایک متحدہ اور آزاد ہندوستان پر جو پردہ پڑا تھا اسے رسمی طور پر ہٹانا باقی رہ گیا تھا۔ ہندوستان سے رخصت ہوتے ہوئے فرنگیوں، ان کی منہدم ہوتی ہوئی شہنشاہیت کے مسائل زیادہ ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔ پارٹیشن ہندوستان کی ایسی داخلی تفصیل تھی جس کو جلد از جلد مکمل کر لینا تھا۔ برطانیہ کی واپسی کے مرحلے میں اب ساری توجہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ممکن ہوا تو منظم طور پر، ورنہ کسی بھی طرح جلد از جلد نکل جانے پر تھی۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ اقتدار پر قبضہ کرنے والوں میں مکمل افراتفری کے پھیلنے سے پہلے جلد از جلد وہ لوگ واپس چلے جائیں۔ ساری اہمیت اسی کی تھی۔ ماحول سراسیمگی کا تھا۔ جنگ میں شکست کے بعد جس طرح کسی منصوبے اور سربراہی کے بغیر پسپائی ہوتی ہے اسی طرح کی واپسی کا ماحول تھا۔ فکر اس کی تھی کہ آگے کا وظیفہ کتنا اور کیسے ملے گا، جنگ سے تباہ حال، برطانیہ میں کہاں رہیں گے، کیسے رہیں گے، ہندوستان میں، جو خود ہی ٹوٹ رہا تھا۔ اس وقت ماحول ایسا نہیں تھا کہ کوئی قیام کرے اس طرح دور افتادہ ولایت 27ے میں سبکدوشی کی زندگی تاریک اور سرد مہری سے دوچار تھی۔ خود وہ گھر تباہ تھا۔ کوہ نور 28ے تو اب بھی برطانوی بادشاہ کے تاج میں چمک رہا تھا مگر اس کی جگمگاہٹ ماند پڑ گئی تھی اور اس کی آب کی بے نقص خالص پن جاتا رہا تھا۔ پوری مملکت میں تاراج پھیل چکا تھا۔ ہندوستان سے برطانوی حکام کی واپسی کے ساتھ عہد خسروی کے اختتام کا اعلان ہوا۔

20ویں صدی نے یہ کام انجام دیا

پاکستان ابھی ظہور میں نہیں آیا تھا مگر محمد علی جناح قائداعظم بن چکے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے ایک کارکن سے انہوں نے سیاسی زندگی کا آغاز کیا اور اب نئی پاکستان کے درجے تک پہنچ گئے اور اس کے ساتھ ان کی زندگی کا سفر بھی آخری پڑاؤ پر تھا۔ جناح زندگی کے آخری جنکشن پر پہنچ گئے تھے۔ ہم لوگ اس کتاب کے آخری باب In Retrospect میں آخری پڑاؤ پر ان کے ساتھ سفر کریں گے مگر وقت کی اس تماشہ گاہ میں ہمیں ابھی اختتام دیکھنا ہے یعنی وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کا آخری چکہ ابھی گھومتا رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس کے بعد کے باب میں ابھی ہندوستان سے رخصت ہوتے ہوئے فوجی وائسرائے فیلڈ مارشل لارڈ ویول کو رخصت کرنے کا وقت ہے۔

لارڈ ویول کی برطرفی

پنڈرل مون نے ویول کی سوانح حیات میں 1973 میں لکھا ہے:

''ویول نے برطانوی حکومت سے واپسی کی ایک تاریخ مقرر کرنے اور منظم طریقے سے واپسی کے بروقت انتظامات کرنے کو کہا اور جب انہوں نے دیکھا کہ وہ لوگ اس کو ترجیح دے رہے ہیں کہ بہترین کی امید کریں اور یہ امید بر نہ آنے کی صورت میں راہ فرار اختیار کریں تو انہوں نے اپنے مشورہ پر زور دینے کے لئے اصرار شروع کر دیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی برطرفی کے اسباب میں یہ بھی شامل تھا۔ آخر میں برٹش حکومت ایک تاریخ طے کرنے پر رضامند ہوگئی اور اس جرأت مندانہ اور دلیرانہ قدم کا سہرا اپنے سر باندھا جس کی وکالت وہ کئی مہینوں سے کر رہے تھے مگر کوشش رائیگاں جارہی تھی۔

اس طرح پہیے کا گھومنا مکمل ہوگیا۔ ایٹلی اور ان کی کابینہ وہ اصل لوگ تھے جن کی وجہ سے شکست ہوئی۔ اس شرمناک ذلیل فرار کے خطاکار بھی وہی تھے جس کے لئے ایٹلی نے خواہ مخواہ ویول کو ذ□دارانہ قرار دیا۔ ویول نے تو اس فرار سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ کیوں کہ 30 مئی 1946 کو یہیں ویول نے ہز میجسٹی کی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ'' ہماری اتھارٹی بالآخر ہاتھ شرمناک فرار کا راستہ پکڑنا ہوگا یا پھر کانگریس سے برطرفی کا سامنا ہوگا کیوں کہ کانگریس میں نہ تو تدبیر ہے نہ فیاضی۔ اور (د) ہندوستان سے واپسی کا اعلان کیا جائے جیسے کہ بریک ڈاؤن پلان میں تجویز کیا گیا ہے۔ یہ پلان ضمیمہ X میں پورے کا پورا شامل ہے۔

لیکن تب تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ لیبر حکومت میں ویول کی تدریجیت کی منطق کی نہ تو سمجھ تھی، نہ اس پر عمل کرنے کا عزم تھا جب کہ بریک ڈاؤن پلان کی صورت میں ویول نے جو کچھ تجویز کیا تھا اس پر اگر عمل ہوتا تو فرنگیوں کے فرار میں جو مارکاٹ ہوئی اس میں بہت حد تک کمی ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے کسی وائسرائے کو اہانت آمیز طریقہ سے واپس بلانے کا جو جواز ایٹلی نے پیش کیا ہے، وہ قابل قبول نہیں۔ اس کے علاوہ لیبر حکومت بھی جلد از جلد ہندوستان سے نکل جانا چاہتی تھا

اور حالات کی ستم ظریفی کہیئے کہ بعد میں ماؤنٹ بیٹن نے وہی تجویز کیا جس کی چاہت حکومت کو تھی۔

ویول کے وائسرائے کے دور کے آخری کاموں میں ہز میجسٹی یعنی شاہ برطانیہ کو رپورٹ بھیجنا شامل تھا جو انہوں نے 24 فروری 1947 کو داخل کی۔ 21 مارچ 1947 کو انہوں نے آل انڈیا ریڈیو پر اپنا رخصتی کا پیغام بھی نشر کرایا۔ یہ دونوں ایسی تحریریں ہیں جن کو پورے کا پورا چھاپنا چاہیے کیوں کہ رپورٹ بطور وائسرائے ان کے معیار کا معروضی اور تجزیات میزان ہے اور نشریہ ایک ایسی زمین اس کے عوام اور اس کے فوجیوں کو دل گیر الوداعیہ ہے جن سبھوں کو انہوں نے بہت پیار دیا۔

ہز میجسٹی دی کنگ دی وائسرائے ہاؤس، نئی دہلی

24 فروری 1947: فائنل رپورٹ

''ہندوستان میں ہماری طاقت کا دارومدار ہمیشہ تعداد کے مقابلہ میں وہ وقار پر رہا۔ ہندوستان میں اگر آج حالت کہیں نامردی کے قریب ہورہی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ ہماری تعداد کم ہورہی ہے بلکہ یہ ہے کہ ہمارے وقار میں کمی آئی ہے۔ ہمارے وقار کو پہنچنے والے نقصان کا آغاز پہلی جنگ عظیم اور اس کے بعد کے برسوں سے ہوا۔ اس پچھلی جنگ میں سنگاپور اور برما کے ہمارے ہاتھ سے نکل جانے سے اور بھی زیادہ شدید جھٹکے لگے گو کہ ہم نے ان دونوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا مگر اس سے ہم صحیح معنوں میں دوبارہ نہیں جم سکے۔

سیاسی اعتبار سے 1942 میں کرپس مشن کے ساتھ ہندوستان میں اقتدار سے ہماری واپسی کا مرحلہ شروع ہوا جس کی تلافی کبھی ممکن نہیں ہے۔ 1942 کی بغاوت کو کچلنے کے لئے جبر کے استعمال سے یہ ثابت ہوا تھا کہ ہم اگر ان چیزوں کو استعمال میں آئیں تو ہمارا وقار اب بھی بلند اور طاقت اب بھی زیادہ ہے ملک اس کے باوجود ہمارے وقار اور طاقت کو اب بھی خطرہ لاحق ہے کیوں کہ واقعات سے ثابت ہوگیا کہ مظاہرین ہجوم کو مشتعل کرسکتے ہیں اور ملک کے ایک بڑے حصے پر منظم حکومت چلانا ناممکن بناسکتے ہیں۔ مجھے یہ بات بہت نمایاں لگتی ہے کہ آج بھی جب ہماری طاقت میں بہت کمی آئی ہے ہمارے وقار میں اتنا دم ہے کہ ہم واقعات اور اسباب پر مقدور بھر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے لارڈ ویول کے نشریے کا متن

2 مارچ

یہ ہندوستان کی عوام کے لئے ان کو الوداع کہنے کی غرض سے ایک چھوٹا سا ذاتی پیغام ہے۔ اللہ لفظ کے صحیح معنوں میں آپ کا حامی و ناصر رہے۔ یہ الفاظ میرے قلب کی گہرائیوں سے نکلے ہیں کیوں کہ ہندوستان کا مجھ پر بہت قرض ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے 13 سے زائد سال گزارے ہیں۔ میں بچہ تھا تو ڈھائی سال تک نیل گری کی پہاڑیوں میں

کھیلتا اور پرورش پاتا رہا۔ وہاں کی عمدہ آب و ہوا، اور دھوپ نے زندگی میں میرے جسم کو اچھا آغاز دیا۔ نوجوان کے طور پر میں نے شمالی ہندوستان میں 5 سال گزارے اور وہ میری زندگی کے بہترین سالوں میں شامل تھے۔ وہ برس سخت محنت یا شدید سوچ فکر سے کھیل کود میں صرف ہوئے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایک ایسے ملک میں جہاں ہمیشہ عمدہ قسم کے فوجی پیدا ہوئے ہیں، ہمارے یعنی فوجیوں کے پیشے کے عناصر یہی کھیل کود ہیں۔ ان برسوں کے دوران مجھے عام ہندوستانیوں کے علم سے قریب تر ہونے کا موقع ملا۔ میں نے کافی حد تک زبان سیکھی۔ کشمیر کی پہاڑیوں میں، وہاں کئی کئی ہفتہ میں کئی بار اپنے شکاریوں کے ساتھ اکیلا کھیل رہا ہوں۔ مقامی گاؤں والوں سے بات کرنے بھر اور ہندوستان کے ان فوجیوں سے، جن کے ساتھ میں کام کرتا ہوں بات چیت کرنے کی حد تک زبان سیکھی۔ سرگرم ملازمت میں مجھے پہلی بار جس دستے کی آزادانہ کمان دی وہ تین ہندوستانی فوجیوں پر مشتمل تھا۔ ایک وی سی او، 8 سکھ، 8 پنجابی مسلمان، 8 ڈوگرے، 8 پٹھان۔ سب کے سب گبرو مرد تھے۔ میں نے کئی ہفتہ کے مارچ کے لئے ایک ہندوستانی ماؤنٹین بیٹری کے ٹرانسپورٹ آفیسر کے طور پر بھی کام کیا۔ رائل انجینئرس میں میرا ایک دوست تھا جو مجھے کبھی کبھی اپنی مدراس سیپرس اور مائنرس کی کمپنی کے ساتھ باہر نکلنے کی اجازت دیتا تھا۔ اس لئے میں جب ہندوستان سے رخصت ہو رہا ہوں تو ہندوستانی فوجیوں اور ہندوستانی کسانوں کے بارے میں میرے پاس تھوڑی بہت واقفیت اور ڈھیر ساری محبت ہے۔

دونوں عظیم جنگوں کے دوران میں نے اپنی خوش نصیبی سے ہندوستانی فوجی کی جواں مردی کا نظارہ کیا اور اس سے فیض بھی اٹھایا۔ ہندوستان میں میری آخری خدمت طویل ترین رہی۔ دو برس کمانڈر ان چیف کے طور پر اور ساڑھے تین برس وائسرائے کے طور پر۔ یہ کڑی محنت اور بھاری ذ□داریوں کے دن رات تھے۔ میں نے پانچ سال جو ایک نوجوان کی حیثیت سے گزارے ہیں۔ اس کا اور ہندوستانی فوج کی ہنرمندی اور شجاعت کا قرض چکانے کے لئے ان برسوں کے دوران میں نے اگر کچھ کیا ہوگا تو مجھے اس سے خوشی ہوگی۔ ہندوستانی فوج نے میری ماتحتی میں کئی مہمات میں کام کیا ہے۔ کامیابی ہو یا ناکامی اچھا وقت ہو یا برا سچے فوجی کی طرح قدر اور ثابت قدمی سے میرا ساتھ دیا ہے۔ میں نے ان برسوں کے دوران جو غلطیاں کی ہیں ان سے بھی واقف ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ میں نے ہمیشہ ہندوستانی باشندوں کی فلاح کے لئے اور سوراج کی طرف ہندوستان کی پیش قدمی کے لئے کام کیا ہے۔

میں ایک فوجی ہوں۔ میرے پہلے رخصتی کے کلمات ہندوستان کے فوجیوں کے لئے ہونے چاہیے۔ محبت اور تشکر کے الفاظ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں ہندوستانی فوج کا استحکام شاید سب سے اہم عنصر ہو۔ اس نے دکھایا ہے کہ کس طرح ساتھ نبھانے کے جذبے اور پورے لگن کے ساتھ ایک مشترکہ خطرے کا مقابلہ کرنے میں تمام فرقہ ایک ہو جاتے ہیں۔ ان تمام برسوں میں، میں نے جن لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے وہ چاہے راجے رجواڑے ہوں یا وزرا یا افسران یا غیر افسران، ان تمام لوگوں کی مہربانی، دوستی اور تائید و حمایت کے لئے میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ مرکز میں اور صوبوں میں بھی فوجوں کے لئے تشکر اور حوصلہ افزائی کے لئے بھی کچھ خاص باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ تناؤ

کے دنوں میں انہیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سے میں واقف ہوں اور اس لئے میری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کس عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کس پامردی اور سخت محنت سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ ہندوستان کے بہت لگن سے کام کرنے والے کارکن ہیں۔

میرے جانشین کو آپ میں سے بہت سے لوگ ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ وہ اپنی نیک نامی کے حوالے سے جنگ کے ایک عظیم لیڈر اور ترقی کے پرزور حمایتی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ ہندوستان کے لئے ان کا خیر سگالی کا جذبہ دیکھیں گے اور ان کی توانائی کا بھی مظاہرہ دیکھ سکیں گے۔

آپ کے سامنے آنے والے برس خطرناک اور دشوار ہیں مگر آپ ان پر قابو پائیں گے۔ میں نے ہندوستان کے مستقبل پر ہمیشہ پوری شدت سے یقین کیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے لئے خوش نصیبی کی نیک تمنا کا اظہار کرتا ہوں۔ خدا حافظ اور یہ بھی کہ آپ کی دنیا اچھی رہے۔

9

آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن

برطانوی راج کا خاتمہ

23 مارچ 1947 - 15 اگست 1947

دوسری عالمی جنگ کے مشکل برسوں کے دوران وزیر اعظم چرچل کے خصوصی فوجی مشیر، معاون اور ساتھ ہی ان کے چیف آف دی امپیریل جنرل اسٹاف، فیلڈ مارشل لارڈ ایلن بروک نے، اپنی 'وار ڈائریز 45-1939' میں ان برسوں کے نمائندہ کرداروں کا بہت ہی دلچسپ اور کھرے اور واضح طریقے سے ذکر کیا ہے۔ ان کا لکھا ہوا ماؤنٹ بیٹن کے کردار اور شخصیت کا بیان حقیقی مشاہدے اور ذہانت پر مبنی ہے۔

انہوں نے لکھا ہے کہ "ملکہ وکٹوریہ کے پڑپوتے کی حیثیت سے ماؤنٹ بیٹن .... 1934 میں خود اپنے جہاز (جس کا نام 'ڈیرنگ' بہت موزوں تھا) کے کمانڈر مقرر ہوئے۔

جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے وہ جہاز 'کیلی' کے کپتان بنائے گئے۔ کمان کے 18 مہینوں کے دوران کئی بار انہوں نے اپنے جہاز کو تقریباً ڈبو دیا۔ ایک بار تو ایک جنگی بیڑے سے لگ بھگ ٹکرا بیٹھے، ایک بار ان پر مائن سے حملہ ہوا، دو بار تارپیڈو سے۔ آخر کار دشمن کے ہوائی جہاز نے انہیں ڈبو ہی دیا...... چیف آف کمبائنڈ آپریشنز (سی سی او) یا مشترکہ آپریشنز کے سربراہ کی حیثیت سے ان کے کام کا زمانہ ڈیپ (Dieppe) پر حملے کے اس بہت ہی نقصاندہ منصوبے میں الجھا ہوا تھا، جس کا کچھ قصور تو انہیں اپنے سر لینا ہی چاہئے..... پھر ان کا تقرر ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ (ایس ای اے سی)

میں ہوا۔ وہاں ان کے ماتحت کام کرنے والے تجربہ کار اور باصلاحیت جنرلوں کی ایک بڑی تعداد کی وجہ سے وہ آخر کامیابی کے حصہ دار بنے۔ ملایا ''بیٹن شلا'' کے سمندری حملے کی مخالفت میں، جو ان کے اس وقت تک کے کیریئر کا نقطۂ عروج ہوسکتا تھا۔ لیکن حملہ آور فوجیں کمر تک دلدل میں پھنس گئیں۔ خوش قسمتی سے ان کی شکست لڑائی کا خاتمہ ہونے سے ٹل گئی۔

انہوں نے مزید لکھا۔ '' ہندوستان کے آخری وائسرائے کے روپ میں ان کے کام کا زمانہ مکمل طور پر ڈرامائی تھا، منٹگمری کے بعد، سینئر بری زی کمانڈروں میں ماؤنٹ بیٹن ہی سب سے زیادہ ماہر تھے وہ بھی اس گر کے ساتھ کہ اپنی مقبولیت کو کس طرح لگاتار آگے بڑھایا جائے..... یہ بات، کیلی ان رچ وی سروڈ، نامی جہاز کے پکچرائزیشن میں صاف صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ اس میں نوئیل کووارڈ نے ماؤنٹ بیٹن کا کردار نبھایا تھا۔ اس فلم کی پہلی ریلیز پر ماؤنٹ بیٹن نے اسے بارہ مرتبہ دیکھا۔

ایلن بروک کی اسی ڈائری میں بیول کا ذکر '' بے حد، شاید کچھ زیادہ ہی عقل مند فوجی سربراہ کے روپ میں کیا گیا ہے: کم گوئی کے لحاظ سے بیول فوجی سربراہ ڈگلس ہیگ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے'' وڈرور یاٹ نے'' کنفیشن آف این آپٹمسٹ، (ایک رجائیت پسند کی ڈائری) میں اس وقت کا ذکر کیا ہے۔ جب ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے لئے روانہ ہونے کی تیاری میں تھے۔ وہ اس بات کے لئے پریشان لگ رہے تھے کہ دلی پہنچنے پر کیا پہنیں؟ ویاٹ لکھتے ہیں۔ '' وہ بھی تھوڑے بائیں بازو کے ہیں، ہیں کہ نہیں؟ ماؤنٹ بیٹن نے پوچھا، کیوں نہ میں دن کے عام لباس میں وہاں پہنچوں؟'' جب میں نے کہا کہ '' نہیں نہیں آپ آخری وائسرائے ہیں، آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو اپنی بہترین وردی، اپنے بھی لوازمات کے ساتھ پہننی چاہئے، نہیں تو وہ خود کی حقیر محسوس کریں گے، تو سب کی خوشی کے لئے انہوں نے ایسا ہی کیا۔

ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے اور اس پر نہرو کے ردعمل کو جینگر نے اس طرح بیان کیا ہے: ایسا کہا جاتا ہے کہ نہرو پر ماؤنٹ بیٹن کی بات چیت سے ایسا اثر ہوا کہ ان کے ہندوستان پہنچنے کے کچھ دنوں میں ہی نہرو نے ان سے پوچھا'' کہیں کسی معجزے سے آپ کو آزادانہ طور پر کام کرنے کے مکمل اختیارات تو نہیں مل گئے ہیں؟'' ماؤنٹ بیٹن کا جواب تھا' مان لو کہ مل گئے ہیں، اس سے فرق کیا پڑے گا۔' انہوں نے جواب دیا' اگر ایسا ہے تو پہلے جہاں سب ناکام ہوئے تھے، آپ کامیاب ہوجائیں گے۔'' ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو اس کے بارے میں جو بھی کہا ہو یا بالکل یا نہ کہا ہو، یہ بات بالکل واضح ہے کہ انہیں ایسے کوئی اختیارات نہیں ملے تھے جیسا کہ جینگر نے خود ہی لکھا ہے: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت سے مشورہ کیے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ (اس کے علاوہ اور کوئی مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا) لیکن یہ بالکل صاف ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو ایسی کوئی آزادی نہیں دی گئی تھی۔ اس کے برعکس انہوں نے نہ صرف سمجھوتے کے منصوبوں کے تمام ڈرانٹ پلان بھیجے، بلکہ جب بھی ضرورت پڑی، وہ وہ خود بھی لندن گئے۔

موقع پر موجود فرد کی حیثیت سے، ماؤنٹ بیٹن کو اپنی پہل پر کام کرنے کی آزادی ضروری دے دی گئی تھی۔ جو ویول کو ان کی تمام مدت کار میں نہیں ملی تھی۔ اس لئے سہل انداز میں کہا ہی جاسکتا ہے کہ ایٹلی سرکار نے ''ماؤنٹ بیٹن نے جو چاہا، انہیں دیا'' اور صرف اس لئے دیا کہ وہ برٹش راج کو جلد ہی ہندوستان سے باہر نکالنے کے لئے بے چین تھے ہندوستان کو ''خالی کرنا'' ان کی اس وقت کی اولین ترجیح تھی۔

ماؤنٹ بیٹن کے معترف اور سوانح نگار جیگلر نے بھی اس آخری وائسرائے کے ایک لفظی مرقع میں جو رنگ بھرے ہیں، وہ واقعی پڑھنے کے لائق ہیں۔'' ان کی غلطیوں کی کوئی حد نہیں کی، ان کا رد کھاوا چاہے بچوں جیسا ہو لیکن بھیانک روپ تھا، ان کےمقاصد بے شمار تھے سچ ان کے ہاتھوں میں آکر بڑی تیزی سے 'جو ہوا' اس سے 'جو ہونا چاہئے تھا' میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اپنی حصول یابیوں کو بڑھا چڑھا کر بتانے کے لئے انہوں نے حقائق سے منہ موڑ کر تاریخ کو دوبارہ لکھنے کی کوشش ہمیشہ کی..........''

لیکن یہ بے حد دکھ کی بات ہے کہ ہندوستان کے آخری وائسرائے نے اپنی حصول یابیوں کا حجم بڑھانے کے لئے سچائیوں سے کھلواڑ کا آغاز کیا، ہندوستان کے وائسرائے کے روپ میں ماؤنٹ بیٹن کی جو تصویر جیگلر نے پیش کی ہے۔ وہ بہت ہی تشویش انگیز ہے۔ کیوں کہ آخری وائسرائے کے روپ میں انہیں غیر منقسم ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کا مستقبل طے کرنے کا اختیار سونپا گیا تھا۔ اسی لئے اس حقیقت کو سمجھنے میں بہت دکھ ہوتا ہے کہ ان دنوں ہندوستان کا مستقبل ایک شخص کے ہاتھ میں تھا جو سچ اور غیر سچ کے فرق کو ہی نہیں سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی '' جہاں تک ممکن ہو سکے، کھلی ڈپلومیسی ان دنوں چلن بن گئی تھی۔ کچھ حد تک تو یہ چھل، کپٹ، منافقت، یہاں تک کہ جھانسہ بازی بھی ایسے کھلے پن کی حد سے خارج نہیں تھی جس کے بارے میں ان سے پہلے آنے والے کسی وائسرائے نے سوچا بھی ہو۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے کچھ صلاح کاروں کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کے طور طریقے کئی بار غیر اخلاقی حدود سے بھی دور چلے جاتے ہیں لیکن ان کے خیال میں ایسی وہاتھ کی صفائی، کا اپنا جواز تھا، وہ وقت کے مطابق تھی۔ صاف جھوٹ کو ٹالا جانا چاہے، لیکن حالات سے پیدا کردہ جھوٹ..........انہیں منظور تھا، ان کے نجی ڈپٹی سیکریٹری، ایان اسکاوٹ کو یاد ہے کہ کام کا ایک خاص طریقہ تجویز کرنے پر وائسرائے نے ان کے اور ایبل کے چہروں کے تاثرات بھانپ لیے تھے'' میں جانتا ہوں، کہ تم کیا سوچ رہے ہو ویول ایسا کبھی نہیں کرتے تھے لیکن میں ویول نہیں ہوں اور میں کروں گا۔''

لیکن ایک بار اگر ہم یہ سب مان لیں، تو مندرجہ بالا ایلن بروک سے جیگلر تک اقتباس اس بات کو صاف بتاتے ہیں کہ ایک وائسرائے کی حیثیت سے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی بڑائی کے لئے سچ کے سامنے جھوٹ کو ہی ترجیح دی تھی، تو پھر اقتدار کی منتقلی میں ان کا کردار پوری طرح مشکوک ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اور دوسروں نے کیا کہا۔ اس بارے میں ان کے کبھی بیان بھی مشکوک ہو جاتے ہیں اور یہ سب ایک آزاد اور الگ جانچ کے بغیر قبول نہیں کئے جاسکتے، جب ماؤنٹ بیٹن یا

ان کے دوسرے ساتھی جناح کے 'مصنوعی پن' کی مثالوں کے بارے میں لکھتے ہیں تو ان کے (ماؤنٹ بیٹن کے) اپنے 'بھیانک مصنوعی پن' کے مدنظر، میں ان کے خیالات کو قبول نہیں کر سکتا۔

ان کے (ماؤنٹ بیٹن) اپنے الفاظ'' میں لوگوں کو صحیح کام کرنے کے لئے راضی کرنے کی اپنی صلاحیت پر مجھے بہت بھروسہ ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں ایک سمجھانے بجھانے والا فرد ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ مجھ میں کسی بھی طرح کے حالات یا بات کو ایک بہت ہی مناسب روشنی میں مناسب طریقے سے پیش کرنے کا ہنر ہے۔'' اس طرح کی باتیں ہمیں حیرت سے خاموش کر دیتی ہیں۔ پھر ماؤنٹ بیٹن یاد کرتے ہیں۔'' جناح کے ارادوں کو ڈگمگانے کے لئے، جتنی بھی ترکیبیں ممکن تھیں، میں نے آزمالی ہیں جن کا بھی تصور میں کر سکتا تھا، ان ساری اپیلوں کا میں نے استعمال کیا...... لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی۔ جو انہیں پاکستان کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے پختہ عزم سے ذرا سا بھی ہٹا سکے۔ شاید صرف محمد علی جناح ہی ایسے شخص نکلے، جنہیں وہ چالاکی سے پھنسانے میں کامیاب نہیں ہو پائے، لیکن وہ ہندوستان کے مستقبل کے لئے ان کی انوکھی شخصیت اور اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے، انہوں نے لکھا: '' یہ بالکل واضح تھا کہ وہ ہی مناسب شخص تھے، ان کے پاس ہی ان تمام حالات کی چابی تھی .... '' پھر بھی اگر ہم ان خفیہ ملاقاتوں اور بات چیت کا اب جائزہ لیں تو ماؤنٹ بیٹن کی سمجھانے بجھانے کی وہ صلاحیت کہیں نظر تو آتی، جسے وہ اپنی ایک '' ممتاز اور فطری خوبی بتا کر بڑی خوشی کے ساتھ اپنی تعریف سے ہمیشہ مگن ہوتے تھے۔ اس صفت کو، خاص طور سے اتنی اہم شخصیت پر، آزمانے کی ان سے توقع تو کی ہی گئی ہوگی۔ اس اولین بات چیت کا تاثر، بعد کی تمام ملاقاتوں پر قائم رہا، ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو '' ایک سرد، گستاخ اور حقیر، شخص پایا، 5 حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ آخر ملکہ وکٹوریہ کے اس پڑپوتے کی موجودگی میں قائداعظم اور ہو بھی کیا سکتے تھے؟ کیا توقع وابستہ تھا جناح سے؟ اور یہ تو ماؤنٹ بیٹن کا غرور تھا کہ وہ کچھ اور بھی توقع رکھتے۔ 'ٹرانسفر آف پاور، میں مذکو ماؤنٹ بیٹن کی چرچل کے ساتھ ملاقات پر ہمارا دھیان کچھ الگ ہٹ کر جاتا ہے۔ یہ ملاقات 27 مئی 1947 کو ہوئی تھی۔ آغاز میں چرچل نے ماؤنٹ بیٹن سے پوچھا'' انتقال اقتدار اس سال ہونے کی صورت میں کیا انہیں نہرو سے '' ڈومینین اسٹیٹس'' منظور کرنے کا خط ملا ہے؟'' گفتگو کو یاد کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن لکھتے ہیں، میں نے بیٹن جواب دیا اور یہ بھی اضافہ کیا کہ میں نے ایک نقل وزیراعظم کو بھی بھیج دی ہے۔ میں نے واضح کیا کہ ویسی ہے تحریری یقین دہانی میں جناح سے نہیں لے پایا ہوں، اس پر چرچل نے تعجب کا اظہار کیا، انہوں نے کہا، ایسا کیسے؟ وہی تو ایک آدمی ہے، جسکا کام برطانوی سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتا، اس پر میں نے واضح کیا کہ جناح کے ردعمل سے .... کی کوئی مدلل پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی اور میں نے ان سے یہ ضرور کہا ہے کہ اگر وہ (جناح) 'ڈومینین اسٹیٹس' کے بارے میں نہیں سوچ پائے، تو میرے پاس آگے بڑھنے کے لئے ایک طے شدہ راستہ ضرور ہونا چاہئے میں نے ان سے کہا کہ میں جناح کو یہ تجویز پیش کرنے پر غور کر رہا ہوں کہ پھر اس معاملے میں ہندوستان کو 'ڈومینین اسٹیٹس' کی بنیاد پر

اقتدار منتقل کر دیتے ہیں اور پاکستان کے سامنے 'ڈومینین اسٹیٹس' بعد میں کبھی بھی منظور کرنے کا راستہ کھلا رہے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کنزرویٹو پارٹی ان شرطوں پر قانون پاس کرنے کے لیے کبھی بھی راضی نہیں ہوگی اور ہوسکتا ہے انہیں خود اس کی مخالفت کرنی پڑے۔ تب میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھے مشورہ دیں کہ جناح کے اڑ جانے کے حالات میں، میں کس طرح آگے بڑھوں۔''

ماؤنٹ بیٹن کے مطابق چرچل نے اس بات پر'' کافی دیر تک غور کیا اور آخر میں کہا، شروعات میں تو انہیں دھمکانا چاہئے، پھر بھی برطانوی افسر ہٹالو۔ انہیں بنا برطانوی افسروں کی فوج کے ذمہ داری دے دو اور یہ واضح کر دو کہ برطانوی مدد کے بغیر پاکستان چلانا کتنا مشکل ہے۔''

یہ بات ان 'دو مفروضوں' پر ایک گہرا سوالیہ نشان لگاتی ہے اور جیسے P.397..........

اول تو یہ کہ مہربان پسند سرکار، جس نے اپنے دل کی اچھائیوں اور آزادی کے تئیں اپنی محبت کی وجہ سے ہندوستان کو اقتدار منتقل کر دیا؛ دوسرے یہ کہ ہز میجسٹی کی حکومت کو ہندوستان سے ایک خاص تاریخ تک واپس چلے جانے کے اعلان کرنے پر زور دینے والے ایک ... تھے۔ لیکن جیسا ہم نے دیکھا ہے، جب سب کو یہ معلوم ہوگیا کہ ویول ہندوستان سے جارہے ہیں، تو آزاد نے ہندوستان میں ویول کی خدمات کی زبردست تعریف کرتے ہوئے ایٹلی کی سرکار میں جرأت کا فقدان ہونے پر لعنت بھیجتے ہوئے ایک بیان جاری کیا تھا کہ اس وجہ سے ہی ہندوستان نے تقسیم کی قیمت چکائی اور جس کے نتیجے میں کم از کم چھ لاکھ لوگ آپسی قتل عام کا شکار ہوگئے۔ ساتھ ہی لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ اپنے گھروں سے بے گھر ہو کر پریشانی اور بدانتظامی میں در بدر بھٹکنے پر مجبور ہوگئے۔

ویول اور ماؤنٹ بیٹن'' دراصل مزاج اور انداز سے بالکل جدا تھے۔ گویا وہ دونوں یکسر مختلف اقسام سے تعلق رکھتے ہوں...... '' ماؤنٹ بیٹن بہت آرائشی، قیمتی پسند، تڑک بھڑک والے انسان تھے، ویول پُرسکون، فکر پسند، داخلیت پسند اور شیریں سخن تھے۔ جس کی خود احتسابی سے ویول نے اپنی ڈائری میں اعتراف کیا ہے'' میں اپنی قابلیت کے بارے میں اتنا نہیں سمجھ پایا ہوں، جتنا مثلاً مونٹی (فیلڈ مارشل، منٹگمری: 31 دسمبر 1947) ویول فطری طور پر نرم خو، شائستہ اور غیر جانبدار تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کے بارے میں خود انہوں نے لکھا ہے:'' بے شک وہ اس کام کے لئے مجھ سے زیادہ لائق ہوں گے،'' ویول ایک مصنف تھے، سوانح نگار تھے، تاریخ نگار تھے، ان کی خوبیوں سے ماؤنٹ بیٹن کو آراستہ میں کیا جاسکتا، ویول نے اپنی ڈائری میں ان دونوں کے مابین بنیادی فرق کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا:

'' 7 دسمبر 1943 ایم بی (ماؤنٹ بیٹن) نے کھانا کھایا اور ہم نے 'کاسابلانکا' فلم دیکھی، یہ کچھ 'جذباتی' قسم کی کہانی تھی۔ ایسا لگا کہ دوسروں کو یہ پسند آئی، لیکن مجھے نہ تو وہ چھو پائی اور نہ ہی دلچسپ لگی۔ بعد میں میں نے یہ بات ایم بی سے بھی کہی۔ وہ فلموں کے بہت شوقین ہیں، وہ کچھ حیران ہوئے، زیادہ تر راتوں میں وہ ایک فلم ضرور دیکھتے ہیں، ان

کے مطابق فلم دیکھنا' ناول پڑھنے کے مقابلے آسان بھی ہے اور اس میں وقت بھی کم لگتا ہے' انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا، اس پر میں نے کہا۔ 'لیکن میں ناول بھی شاذ ہی کبھی پڑھتا ہوں۔ تو پھر آپ دل بہلانے کے لئے کیا پڑھتے ہیں؟ آپ کی تحریر سے تو ظاہر ہے کہ کبھی کبھی آپ ضرور مطالعہ کرتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں ناولوں کے مقابلے سوانح اور شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں۔ 'لیکن کیا آپ کو موسیقی ریز فلمیں پسند نہیں ہیں؟ مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا موسیقی کا شوق نہیں رکھتا۔' لیکن مسرت انگیز گیتوں اور رقص کے ساتھ فلموں کا لطف لینے کے لیے آپ کو موسیقی ریز ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ ابھی بھی جوانی سے بھرے ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ فلموں کو ناپسند کر کے میں نے ان پر ایک خشک طبیعت فرد کا تاثر مرتب کیا ہے۔

ویول آرٹ اور شاعری کی ریاضت میں لطف لیتے تھے: ان کے خیال میں یہ زندگی کی پکی بنیاد ہیں۔ ان کا کردار، شخصیت اور افعال و اعمال ایک درخت کی مانند تھے وہ جڑوں سے گہرے تھے اور اس کے لیے سب لوگ انہیں تعریف اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کی ایسی کوئی جڑیں نہیں تھیں وہ بڑی بڑی تقریبات میں حصہ لیتے تھے، اس کے باوجود اپنے آپ میں وہ ہی اپنی حقیقت و نام نہاد شہرت اور اپنے شاہی نسب میں ہی گڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہ تو بہت ہی مختصر العمر حصول یابیاں ہیں، ماؤنٹ بیٹن کے بارے میں کوئی بھی نہیں کہے گا جو ایٹلی نے ویول کے سہارے میں کہا تھا۔ 'یہ (آپ کا تار) ان اعلیٰ اصولوں کی روایتوں کا امین ہے، جن پر آپ ہمیشہ چلتے رہے ہیں...... ''ذمہ داری سنبھالنے کے فوراً بعد ماؤنٹ بیٹن نے نمائندہ ہندوستانی لیڈروں سے ملنا شروع کیا ان میں مہاتما گاندھی پہلے تھے، جنہوں نے ایک اپریل 1947 کو نئے وائسرائے کو ہندو مسلم فساد پیدا ہونے پر اپنے خیالات بتانے سے شروعات کی اور اگرچہ ''انہوں نے اس آغاز کے لئے انگریزوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا لیکن یہ ضرور کہا کہ ان کی 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی نے ہمیشہ کشیدگی برقرار رکھی اور یہ بھی کہ ان کے پرکھوں نے آج تک جو بھی بیج بویا ہے وہ اب '' پکی پکائی فصل بن کر کٹنے کے لائق ہو گیا ہے''۔ ماؤنٹ بیٹن لکھتے ہیں: انہوں نے میرے لیے اس بات پر زور دیا کہ کچھ بھی ہو، میں سچائی کو دیکھ کر، اس پر حوصلہ کے ساتھ کام کروں۔' اس ملاقات میں گاندھی نے جناح کو متحدہ ہندوستان وزیر اعظم بن کر حکومت بنانے والی تجویز پیش کی، ماؤنٹ بیٹن کے ڈرافٹ پلان میں اس کا ذکر ہے،'' آخر میں انہوں نے مجھے مختصر طور پر ایک حل بتایا، جو وہ چاہتے تھے کہ میں اپنالوں، جناح کو فوراً مسلم لیگ کے ممبروں کے ساتھ .... مرکزی حکومت بنانے کے لئے دعوت دوں، پھر یہ سرکام وائسرائے کے تحت اسی طرح کام کرے، جس سے لگے کہ ایک .... سرکار کرنا چاہتی ہے۔ .... میں اکثریت ہو ''مسائل کو قابل وکیلوں والے حصے

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس طرح کی تجویز سے ایک بارتو میں لڑکھڑا سا گیا۔ میں نے پوچھا، '' جناح ایسی تجویز پر کیا کہیں گے؟'' گاندھی کا جواب تھا کہ، اگر آپ انہیں بتائیں گے کہ اس تجویز کا مصنف میں ہوں تو ان کا جواب ہوگا۔ 'چالاک گاندھی' میں نے کہا'' اور میں سمجھتا ہوں کہ جناح ٹھیک ہوں گے۔'' اس پر انہوں نے بہت پرجوش

لہجے میں جواب دیا، نہیں نہیں میں اس تجویز کو لے کر بہت سنجیدہ ہوں۔'' پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے پوری رازداری کے ساتھ ان کی آئندہ ملاقاتوں کے دوران اس معاملے پر گفتگو کرنے کے لئے میں نے گاندھی جی کی رضامندی لے لی؛'' گاندھی جی سے ملاقات یہیں پر ختم نہیں ہوئی، وہ دوسرے دن 2 اپریل 1947 کو بھی جاری رہی اور پورے دو گھنٹے تک چلی، اس کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن نے لکھا کہ کس طرح انہوں نے'' گاندھی جی کا مذاق اڑایا کہ ان کی خواہش کے مطابق میں کانگریس کے ذریعے چلائی جانے والی مرکزی حکومت بنا کر اسے اقتدار کو سونپ دوں اور جناح کو ابتدائی تجویز پیش کرنا محض ایک چالاکی داؤ ہی ہے انہوں نے پوری ایمانداری سے مجھے پھر یقین دلایا کہ ابھی تک تو معاملہ یہی ہے کہ وہ (یعنی گاندھی) اپنی تمام خدمات، پہلے کانگریس میں اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرکے، جناح کو حکومت بنوانے اور پھر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گھوم کر ہندوستان کے عوام سے یہ فیصلہ قبول کروانے کے لئے کوشش کروں کہ یہ میرے اختیار میں لینے کی خودارادی تجویز رکھی ہے، انہوں نے مجھے اپنی ایمانداری کا قائل کروایا اور میں نے یہ بات ان سے کہہ بھی دی، وہ میرے ذریعے اس منصوبے پر مولانا آزاد اور نہرو سے گفتگو کرنے کے لئے بھی راضی ہو گئے۔'' اور بات جاری رہی جب تک'' آخر کار انہوں نے کہا کہ وہ ان دونوں کے علاوہ کر پلانی سے بھی اس پر بات کرنا چاہتے ہیں، لیکن خاص طور سے جہاں تک پریس کا سوال تھا، وہ اس بات پر متفق تھے کہ مکمل رازداری بہت ضروری ہے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس منصوبے کے حق میں ہونے کی بات پر کیا وہ مجھے .... کہہ سکتے ہیں۔ اس پر میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا کہ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ-'' میری اس میں دل چسپی ہے'' لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی حمایت کا وعدہ کرسکوں، مجھے کچھ دوسرے لیڈروں سے یہ یقین دہانی چاہئے کہ وہ اس عمل درآمد کے لائق سمجھتے ہیں۔''

ماؤنٹ بیٹن مزید لکھتے ہیں وائسرائے کے لئے اب اس شخص کے ساتھ ملاقات کرنے کا وقت آچکا تھا۔ وہ شخص جس کے پاس اس تمام صورتحال کی چابی تھی۔ جسے ماؤنٹ بیٹن نے اپنی یادداشت میں 'سرد' گستاخ اور 'حقیر' سمجھا تھا، یہ ملاقاتیں 5 اور 6 اپریل کو ہوئیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ماؤنٹ بیٹن بڑی محنت سے ہندوستان کے سیاسی حالات پر اس وقت کی سرگرم ہستیوں سے تازہ ترین آئیڈیے لینے میں لگے ہوئے تھے، اس پر وہ کافی وقت صرف کر رہے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے کاغذات میں اس ملاقات کا حوالہ بھی دیا ہے، جو کہ ایک بہت ہی سخت جائزے کے ساتھ شروع ہوئی، '' تھوڑی دیر تک کسی چائے پارٹی کے فراخ دل میزبان کی طرح پیش آنے کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ مجھے واضح طور پر یہ بتانے کے لئے آئے ہیں کہ وہ کیا قبول کرنے کو تیار ہیں'' اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہتے ہوئے پیشگی اعتراض کیا کہ میں اس وقت یہ نہیں جاننا چاہتا۔ اس پہلی ملاقات کا مقصد ایک دوسرے کو ٹھیک سے جاننا پہنچاننا ہی ہے۔ پھر آدھے گھنٹے تک بات چیت کی میری کوششوں کے جواب وہ بہت ہی اختصار کے ساتھ دیتے رہے، لیکن بات چیت شروع ہونے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ مذاق بھی کرنے لگے اور گزشتہ رات (6 اپریل جب وہ رات کے کھانے کے لئے آئے اور آدھی رات کے

بعد آدھ گھنٹے تک رکے رہے) ہماری گفتگو کے بعد صحیح معنی میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔

تمام موضوعات پر ہماری باتیں ہوئیں۔ میں نے انہیں واضح کیا کہ ہز میجسٹی کی سرکار کو میری سفارش کے ساتھ کئے جانے والے حل کے لئے، میں ابھی خود کو تیار نہیں کر پایا ہوں، ساتھ ہی یہ کہ موجودہ حالات میں میں پوری طرح غیر جانبدار ہوں، لیکن یہ بھی تفصیل سے بتایا کہ میری پالیسی متعلقہ لوگوں سے مل کر جلدی سے جلدی فیصلے کر لینے کی ہے جناح جلد بازی نہ کرنے کے خیال سے متفق ہوئے، انہوں نے یہ بھی مانا کہ جب پورا ملک ایک فوری فیصلے کا منتظر ہو تو وہ فیصلہ ضرور درست ہونا چاہیے، میں نے کہا' جیسا میں اس وقت دیکھ رہا ہوں، مسئلہ یہ نہیں ہے کہ، کیا کرنا ہے، بلکہ یہ ہے کہ مقررہ مدت میں اسے کیسے کرنا ہے'' (ان کے مقصد کی یہ انوکھی اور کچھ حد تک خبردار کن تعریف ہے کہ کام کئے جانے کی رفتار ہی سب کچھ ہے، نتائج اہم نہیں)

جناح نے دعوا کیا کہ ہندوستان کا 'سرجیکل آپریشن' ہی واحد حل ہے۔ ورنہ پورا ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ میں نے جواب میں یہی دوہرایا کہ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا کہ کسی بھی 'سرجیکل آپریشن' سے پہلے 'ایتھیٹک' (بے ہوشی) کو بہت ضروری ہے۔

'تنوع کی تفصیل' کے ساتھ یہ ذکر جاری رہتا ہے۔ اس کے سارے بیان کو یہاں پیش کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں حالاں کہ اس میں 'ستمبر 1944 میں گاندھی/ جناح کی خط و کتابت کے بارے میں ان کے نظریے سمیت، گاندھی کے ساتھ ان کی پہلے کی بات چیت کی بابت بھی جناح کے خیالات موجود ہیں ایک اہم پہلو پر جناح نے زور دیا کہ ''مسلمانوں کی طرف سے وہ واحد نمائندہ تھے'' مزید یہ بھی کہا کہ '' اگر انہوں نے کوئی فیصلہ کیا تو وہ ضرور لاگو کیا جائے گا۔ اگر مسلم لیگ نے اس فیصلے کی قبول کرنے سے انکار کیا تو وہ استعفیٰ دے دیں گے، نتیجتاً مسلم لیگ وہیں ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ بات کانگریس کے نمائندوں کے بارے میں سچ نہیں تھی۔ ان کی طرف سے بات کرنے کے لئے کوئی ایک ہی فرد ہوا ایسا نہیں تھا۔ گاندھی نے تو کھلے طور پر اعتراف کیا ہے کہ وہ کسی کی نمائندگی نہیں کرتے۔ انہوں نے صرف '' اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرنے کا'' یقین دلایا ہے، ان کا رسوخ تو بہت تھا۔ لیکن ذمہ داری کچھ نہیں۔ نہرو اور پٹیل کانگریس میں مختلف نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں سے کوئی بھی فرد مکمل پارٹی کی طرف سے کوئی واضح اور پختہ جواب نہیں دے سکتے تھے'' جناح نے عبوری سرکار کی تشکیل میں رکاوٹ ہونے پر'' کانگریس کے ذریعے کسی کانگریسی مسلمان کو شامل کرنے پر زور دینے کی صورت میں، مسلم لیگ کے شامل ہونے سے انکار کرنے کا بھی حوالہ دیں، جناح کو شبہہ یہ تھا کہ اس زور دینے کے پس پشت کانگریس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہے، یہ خیال فروغ پا جائے ان کی گاندھی جی کے 48 گھنٹوں تک جاری گفتگو کے بعد ایک فارمولہ ابھرا جس کے تحت کانگریس عام طور پر متفق ہوئی کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جناح کانگریس حکومت میں کانگریسی مسلمان کو نامزد

کرنے پر متفق ہو جائیں گے، گاندھی جی اس فارمولے پر راضی ہو گئے۔ لیکن کانگریس نے اسے خارج کر دیا اس کے بعد گاندھی جی نے بھی اپنی رضا مندی واپس لے لی اور بیان دیا کہ انہوں نے 'ہمالیہ کی طرح بڑی غلطی' ☆ کی تھی۔ اس پر جناح نے زور دے کر کہا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ " گاندھی کے لفظ ہی نہیں بلکہ ان کے دستخط بھی بے معنی ہیں۔"

جناح نے' کانگریسی رہنماؤں کے جذباتی رویے' کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ 'جب معاملہ انگریزوں سے نجات پانے کا ہوتا ہے تو ان کے پاس اس کی وجہ ہوتی ہے مگر (اب) ان کے پاس ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔' جناح نے کانگریسی رہنماؤں پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ مستقل اپنا محاذ بدلتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ چاہتے کہ انہیں، وہ تمام تر اختیارات پوری طرح حاصل ہو جائیں جو اس وقت ہندوستان میں موجود برطانوی راج کے ہاتھوں میں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں، ڈومینین حیثیت قبول کرنے کی حد تک بھی، مگر یہ قبول نہیں کر سکتے کہ ہندوستان کا کوئی حصہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔

یہاں سے آگے اب ہم 'ریڈکلف ایوارڈ' کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ کے اس زمانے کے اور تمام پہلوؤں مثلاً متحدہ ہندوستان کے آخری چند ماہ کے دوران ہونے والے بھیانک فسادات، لوگوں کے بڑے پیمانے پر گھروں سے اجڑنے اور مہاجرت کرنے کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تو پھر برصغیر کے ساتھ ہونے والی اس مہیب عہد شکنی اور بے وفائی، ہندوستان سے انگریزوں کی شرمناک بھگدڑ، لاکھوں انسانوں کی موت کی خوفناکی اور اس کے بعد فضا میں گونجنے والی آہ و زاری کی صداؤں کے منظر نامے کو دوبارہ زندہ کرنے کیا ضرورت ہے۔ ہم ریڈکلف ایوارڈ پر گفتگو اس لئے کریں گے کہ اس کے نتائج کے اثرات آج بھی ہمارے ساتھ ہیں اور آزاد ملکوں کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان کے گزشتہ ساٹھ برسوں کے سفر پر اپنا سایہ ڈالتے رہے ہیں۔ آخر ریڈکلف ایوارڈ ایک علاحدہ سرزمین دیئے جانے پر جناح کے اصرار اور کانگریس کی طرف سے اس کے لیے سر تسلیم خم کیے جانے کا نتیجہ ہی تو تھا۔

ریڈکلف کمیشن اور ایوارڈ

نئی سرحدوں کا تعین کرنے کی ذمے داری سر (بعد میں وسکاؤنٹ) سائرل جان ریڈکلف (1899-1977) کو سونپی گئی جو برطانیہ کا ایک ممتاز شہری تھا۔ مگر 'باؤنڈری ایوارڈ' کو نہایت غیر ذمہ دارانہ عجلت سے تیار کیا گیا اور ناقابل معافی تاخیر کے ساتھ 17 اگست 1947 کو اعلان کیا گیا جس سے اس کا مصنف حد درجہ متنازعہ فیہ شخصیت بن گیا۔

☆ یہاں جناح نے 'ہمالیائی بھاری بھول' کی اپنے طور پر تعبیر کی ہے۔ گاندھی کی بھاری بھول پیشکش کرنے میں نہیں بلکہ یہ فرض کر لینے میں تھی کہ کانگریس کے ان کے خاص دست راست، نہرو اور پٹیل ان کی حمایت کریں گے۔ مگر انہوں نے نہیں کیا۔

ریڈکلف اگر چہ 'چانسری بار' کا ایک غیر معمولی فرد تھا اور اس کی قانون دانی بے داغ کامیابی اور ذہانت سے روشن تھی، مگر صرف انگلینڈ تک - وہ ہندوستان کے لئے بالکل اجنبی تھا — عالمی جنگ کے دوران، 1941 میں، جب اسے وزارت اطلاعات میں ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا تو یہ اس کا 'نظم ونسق سنبھالنے کا پہلا تجربہ' تھا۔

'سرحد کمیشن' کے سربراہ کی حیثیت سے ریڈکلف کے تقرر پر کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا تو اس کی ایک وجہ برطانوی ہندوستانی انتظامیہ کی یہ تسلیم شدہ روایت تھی کہ ذمے داری والے اور پروقار عہدے کسی تنگ ذہنی ساخت والے ٹیکنوکریٹ کے بجائے کسی پُراعتماد عموم داں کو تفویض کئے جاتے تھے، حالاں کہ ایک پوری طرح اجنبی ملک میں سرحدوں کا تعین کسی غیر خصوصی مہارتوں کے حامل شخص کا کام نہیں تھا۔ ریڈکلف کے نام کی سفارش ماؤنٹ بیٹن کو لارڈ مسٹوویل نے کی تھی جو اسے 'حددرجہ دیانت داری، قانونی مہارت اور وسیع تجربے والا شخص' سمجھتے تھے جو بلاشبہ ریڈکلف تھا لیکن ہندوستان اس کے لیے پوری طرح ایک اجنبی ملک تھا وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آیا تھا، اتفاقاً بھی نہیں، اور اسے یہاں کے پیچیدہ سماجی معاملات، جغرافیے؟ زبانوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر اس عظیم اور زبردست تنوع کے حامل ملک دو نیم کر ڈالا۔

یہ تجویز کہ ریڈکلف دونوں کمیشنوں، ایک مشرقی ہندستان اور دوسرا مغربی ہندوستان کے لئے، کا سربراہ ہو، جناح کی تھی 10 ماؤنٹ بیٹن نے یہ تجویز فوراً قبول کرلی، اس اضافے کے ساتھ کہ دونوں کمیشن کا سربراہ ایک ہی ہوگا تو دونوں سرحدوں کی 'کمی بیشی' کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں آسانی ہوگی۔ 11۔ یہ ماؤنٹ بیٹن کا خاص طریقہ اور حیرت انگیز داد ودہش کا منظر تھا۔ کیا سرحد کمیشن کے سامنے کام کرنے کے نا قابل تبدیل اصول اور پیمانے تھے؛ وہ ایک مذاکراتی، سیاسی تنظیم تھی، اس لچک کے ساتھ کہ کمی بیشی کے درمیان مطابقت پیدا کرسکے۔ وہ ایک سیاسی تنظیم ہرگز نہیں تھی جسے بات چیت اور سمجھوتوں کے ذریعے لین دین کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے سرحدوں کا تعین کرنے کی ذمے داری سونپی گئی ہو۔ ماؤنٹ بیٹن کا رویہ اس معاملے میں ناقابل قبول طور پر چلتا کرنے والا تھا، کہ انہوں نے اس کمیشن کے بارے میں غلط تاثرات پیدا ہونے دئے۔ اس کے سبب ہی بعد میں کئی نہایت پیچیدہ اور ناقابل حل مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جو آج بھی چلے آرہے ہیں۔

اس کے علاوہ، تقسیم کا معاملہ کسی حالیہ یا سابقہ سیاسی معاہدے کے انتظامی نفاذ جیسا نہیں تھا۔ اس کی نوعیت ایسی بھی نہیں تھی جیسے برطانوی ہندوستان کے محض افواہ کی حد تک غیر جانب دار منتظموں نے ہندوستان کی تقسیم کا عمل غیر سیاسی اور لاتعلقی کے رویے کے ساتھ انجام دیا ہو۔ یہ سیاست اور نظم ونسق کے رشتے کی حددرجہ تعمیم کرنا ہوگا کیوں کہ یہ دونوں دائرے کبھی بھی ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں ہوسکتے، ہم اس کے بارے میں خواہ کچھ بھی فرض کرتے رہیں۔

جناح ایک ایسے کمیشن کے بھی حامی تھے جو اقوام متحدہ کی سفارش پر مقرر کیے گئے تین غیر جانب دار غیر

ہندوستانیوں پر مشتمل ہو۔ مگر سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند، ارل آف لسٹوویل نے اسے قبول نہیں کیا کہ انہیں اندیشہ ہوا کہ اس سے بین الاقوامی مداخلت ممکن ہو سکتی ہے اور یہ بھی کہ اقوام متحدہ کو بیچ میں ڈالنے سے بے صلاحیتی کا تاثر پیدا ہو سکتا تھا۔ کانگریس بھی جناح کی تجویز کے خلاف تھی۔ نہرو کو اندیشہ تھا کہ اقوام متحدہ سے رجوع ناقابل قبول تاخیر کا باعث ہو سکتا تھا (اس کی الٹی مثال یہ ہے کہ یہی نہرو تھے جنہوں نے ہندوستان کا وزیر اعظم ہونے کے بعد، نہایت جلد بازی، غلط فیصلے کے تحت اور ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر جموں و کشمیر کے معاملے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا)۔ انہوں (نہرو) نے اس کی جگہ یہ تجویز رکھی کہ 'ہر کمیشن ایک الگ سربراہ اور چار دیگر افراد پر مشتمل ہو جن میں سے دو لیگ اور دو کانگریس کی طرف سے نامزد کئے جائیں، کہ یہ افراد اعلا قانونی صلاحیت کے حامل ہوں اور اپنا سربراہ خود منتخب کریں۔' ماؤنٹ بیٹن نے پہلے جناح سے اتفاق کر لیا تھا اور لسٹوویل سے کہا تھا کہ وہ 'ذاتی طور پر اقوام متحدہ کے حوالے سے بہتر کسی اور تجویز کا تصور نہیں کر سکتے۔'12 مگر جیسے ہی نہرو نے اپنا اعتراض ظاہر کیا اس بات سے مکر گئے، جیسا وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ یہ بات ماؤنٹ بیٹن کی حکمت عملی کے لحاظ سے بھی موزوں تر تھی کیوں کہ اس سے کمیشن کو ایک ہندوستانی کردار حاصل ہو رہا تھا جب کہ فیصلے کا سارا اختیار ایک غیر ہندوستانی سربراہ کے پاس رہنا تھا جس کا تقرر پوری طرح وائسرائے کی صوابدید پر منحصر تھا۔

سرحد کمیشن کے اراکین کے سیاسی جماعتوں کے ذریعے نامزد کئے جانے سے، کمیشن کے فیصلوں پر سیاسی جماعتوں کے معاملات حاوی ہو گئے۔ کانگریس نے شروع میں ریڈ کلف کے تقرر کی مخالفت کی تھی مگر بعد میں اس نے اپنے اعتراض میں نرمی پیدا کی اور کمیشن کے اصول اور ہیئت دونوں کو قبول کر لیا۔ اس تناظر میں، سر اسیفورڈ کرپس کے نام کسی میجر شارٹ13 کے 3 اگست 1947 کا مکتوب خاصا دلچسپ ہے: اس نے لکھا تھا کہ 'نازک ترین معاملہ میں لوگوں کا یہ اٹل یقین ہے کہ ریڈ کلف وہی کریں گے جو ہز ایکس لینسی (ماؤنٹ بیٹن) چاہیں گے۔ اور واقعی لوگ یہی سوچ رہے ہیں۔ کوئی بھی ہندوستانی ایچ ای سے کچھ بھی کہے، میں، جو یہاں ہندوستانیوں کے ساتھ رہ رہا ہوں، پوری طرح جانتا ہوں کہ لوگوں کو کسی بھی طرح ان کے یقین اس سے بٹایا نہیں جا سکتا کہ اصل بات یہی ہے۔ ان باتوں سے 14 ثابت ہوتا ہے کہ یہ اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ ممکن ہے ماؤنٹ بیٹن نے کمیشن کے فیصلے پر کچھ خاص اثر نہ ڈالا ہو، مگر انہوں نے بلاشبہ اس کے بعض اہم پہلوؤں کو ضرور متاثر کیا۔

اب ماؤنٹ بیٹن کے نام نہرو کے 12 جون کے مکتوب پر غور کیجئے 15 پنجاب اور بنگال کے سرحد کمیشنوں کے دائرہ کار سے متعلق تجاویز پیش کرتے ہوئے نہرو کہتے ہیں: 'آپ دیکھیں گے کہ یہ بہت سادہ اور مختصر ہیں... بہتر ہے کہ یہ معاملہ سرحد کمیشن پر چھوڑ دیا جائے...... سرحد کمیشن خاص تیز رفتاری سے کیا جانا ہے [کیوں؟ میں اپنے آپ کو 'تیز رفتاری سے کیوں؟' کہنے سے روک نہیں پا رہا ہوں۔ مصنف]۔ نہرو آگے لکھتے ہیں کہ اگر ہم اس آخری فیصلے میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ [و تاخیر بہتر بہ تر ہے یا ٹالی جا سکنے والی قتل و غارت گری اور تکلیفیں۔ مصنف]۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اور جب دونوں ریاستیں وجود میں آ جائیں گی تو وہ اپنی سرحدوں کے بارے میں ترمیم و تبدیلی کے لئے باہم بات چیت کر لیں گی اور یہ ایک اطمینان

بخش مفاہمت کرلی جائے گی'۔

یہ ایک بالکل ناقابل عمل اور اسدہ لوجی پر مبنی تجویز تھی، تقریباً ناقابل یقین۔ ملک ناقابل عبور اختلافات اور ان مہیب مسائل کے سبب جس کے زخم اب تک ایک ناسور کی طرح رسی ہیں تقسیم ہونے والا تھا۔ ایسے میں باہمی طور پر ترمیمات اور تبدیلیاں کس طرح ممکن تھی؟ نہرو کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ یہ عمل خاصا طویل ہوگا جس کے دوران متاثرہ علاقوں کے لوگوں کی رائے بھی معلوم کی جائے گی۔ نہرو نے محسوس کیا کہ 'اگر یہ سارا کام سرحد کمیشن کو سونپ دیا گیا تو ان کا کام بہت بھاری اور طویل ہو جائے گا"۔ اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان امور کو جس حد تک بھی ممکن ہو صاف اور سادہ رکھا جائے'۔

پھر بھی، دو خاص علاقوں کا ذکر کیا گیا۔ 'سندھ کا ضلع تھرپارکر اور بہار کے ضلع پورنیا کے بعض علاقے ...... اگر بہار جیسے نئے صوبے کو چھیڑا گیا تو الجھاؤ پیدا ہوگا...... جو بھی ہو، ایسی کوئی بھی تقسیم ایک طرح کی رائے شماری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی اور تاخیر بھی ہوگی... جہاں تک تھرپارکر کا معاملہ ہے، یہ سندھ کا ایک ضلع ہے اور اسے ایک اکائی مانا جاسکتا ہے۔ [ایک عاجلانہ، غیر دانش مندانہ اور بے سوچے سمجھے کیا گیا فیصلہ تھا جس سے لاکھوں 'ہندو راجپوت' ہندوستان سے خارج ہو گئے۔ مصنف] ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سوال بھی اس مرحلے پر اور اس طرح نہیں اٹھایا جانا چاہئے۔ لہٰذا میں نے سرحد کمیشن کے دائرہ کار میں تھرپارکر (ایک زبردست اور علامتی غلطی)؛ پورنیا کا ذکر نہیں کیا ہے'۔

نہرو مایوس کن حد تک ناقابل عمل مفروضوں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرحد کمیشن کا کام ممکن حد تک کم سے کم مدت میں پورا کرلیا جائے گا تاکہ اقتدار کی منتقلی جلد ہو سکے۔ ان کی ترجیح، سرحد کا قابل عمل، تمام جھگڑوں سے پاک اور منصفانہ تعین نہیں بلکہ اقتدار کی جلد از جلد منتقلی تھی۔ انہوں نے قطعاً سوچے سمجھے بغیر یہاں تک کہہ دیا کہ ایک عارضی سرحد بھی چلے گی اور آگے چل کر 'دونوں فریقوں کے ذریعے ان میں باہمی رضامندی سے تبدیلیاں کرلی جائیں گی'۔ یہ رویہ دور اندیشی سے اس قدر مکمل طور پر عاری تھا کہ یقین نہیں آتا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو سے اتفاق کیا کہ وہ بھی عجلت میں تھے۔ لگتا ہے ان لوگوں کے لئے 'لوگ' واقعی اہم نہیں تھے، اہمیت رفتار اور 'اقتدار' کی تھی۔ نہرو نے سرحد کمیشن کے لئے ہدایت جاری کئے جانے کی تجویز رکھی کہ وہ 'مسلم اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں کا تعین کرنے کی بنیاد پر بنگال کے دو حصوں کی سرحدوں کی نشاندہی کردے'۔ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کی یہ تجویز بھی مان لی۔ ریڈکلف کو یہ بات باور کرادی گئی کہ سرحد کے تعین کے معاملے میں ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ وہ 'ایک ڈھیلے ڈھالے اور من مانے انداز سے کئے جانے والے کام' سے زیادہ کچھ ہو۔ چناں چہ اس کمیشن نے جو بھی کیا اس پر جلد بازی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کا اظہار نہرو نے بعد میں کیا یہ کہہ کر لیا کہ منصوبے کی شرائط کے تحت لوگوں کی خواہشات کا تعین جس انداز سے کیا گیا ہے وہ اطمینان بخش ہونے سے بہت دور ہے۔ اس کے باوجود، یہ آخری موقع تھا جب نہرو نے عوام کی خواہشات معلوم کرنے کے لئے کسی اور کوشش کی ضرورت کا ذکر تک کیا ہو۔ ذیل میں، اسی پس منظر سے متعلق ماؤنٹ بیٹن کے نام نہرو کے

ایک اور مکتوب کا ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے:

......5۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، سندھ کے ایک غالب ہندو راجپوت اکثریت والے علاقے کے سلسلے میں ایک معمولی سی تبدیلی ضروری ہے۔ 6 میں سمجھتا ہوں کہ سلہٹ اور بلوچستان سے متعلق فیصلے بنگال اور پنجاب سے متعلق بنیادی فیصلے کرنے کے بعد کئے جائیں گے۔ یہ جزوی طور پر بعد کے فیصلوں سے متاثر ہوں گے۔ 16

سندھ کے معاملے میں نہرو نے مئی 1947 میں اور اس کے بعد (مذکورہ بالا 12 جون کے مکتوب میں) جو کچھ کہا اس میں بڑا فرق ہے۔ سلہٹ سے متعلق بھی ان کی پالیسی واضح نہیں ہو سکی۔ یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ جلد بازی، غلط ترجیحات، ناکافی جغرافیائی معلومات اور اس وسیع و عریض ملک کے سماجی تنوع اور آمیزشوں اور حقائق کے مبادیات تک کی سمجھ نہ ہونے کا نتیجہ 'عجلت' میں کی جانے والی تقسیم کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہ سب اس انداز سے کیا گیا کہ ہمارے مسائل اور بڑھ گئے اور کسی بھی فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل بھی نہیں نکالا جاسکا۔ اگر 'فرقہ وارانہ مسئلہ' جو بنیادی مسئلہ تھا آج بھی برقرار ہے اور اس سے کہیں زیادہ بدتر صورت میں جیسا کہ وہ تقسیم کے پہلے تھا تو پھر یہ تقسیم آخر کس لئے؟ یہ محض سوال برائے سوال نہیں بلکہ اصل سوال ہے۔

اگرچہ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کو اپنے فیصلے کرنے کی آزادی دے رکھی تھی مگر حقیقت میں یہ فیصلے خود وائسرائے کے ہی تھے۔ مثلاً بنگال سرحد کمیشن کے اراکین کے درمیان سلہٹ سے متعلق ان کے دائرہ اختیار کے بارے میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا 17۔ کمیشن کے دو اراکین کا خیال تھا کہ اس صورت میں کہ ملحقہ اضلاع میں آسام کے وہ تمام حصے شامل جو بنگال کا حصہ ہیں، اگر وہ سہلٹ سے لگے ہوئے ہوتے نہ ہو، کمیشن کا تعین کرے اور پھر انہیں مشرقی بنگال کو منتقل کرے۔ دیگر دو کے خیال میں کمیشن کو آسام کے صرف ان اضلاع پر ہی غور کرنا چاہیئے تھا جو سلہٹ سے لگے ہوئے ہیں اور ان میں بھی ان اضلاع کے صرف ان مسلم اکثریتی علاقوں پر جنہیں سلہٹ کے مسلم علاقوں کے ساتھ مشرقی بنگال میں شامل کیا جانا ہے۔ ریڈ کلف نے اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن سے ان سوالات پر فیصلہ طلب کیا کہ 'اگر مجھے ان دونوں آراء کے درمیان انتخاب کرنا ہے تو مجھے کچھ پس و پیش کے ساتھ آخر الذکر رائے کو ماننا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات ہمارے دائرہ اختیارات میں استعمال کئے الفاظ کے حقیقی مفہوم اور 3 جون 1947 کے بیان کے پیراگراف 13 سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ میرا یہ خیال بھی ہے کہ یہ بات کسی حد تک خلاف واقعہ ہوگی کہ سلہٹ کو مشرقی بنگال میں شامل کئے جانے کے ساتھ ہی ان دیگر اضلاع کے بعض حصوں کو بھی مشرقی بنگال میں شامل کر دیا جائے جن کا سلہٹ سے متعلق فیصلے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو جغرافیائی طور پر اس سے لگے ہوئے نہیں ہیں۔ تاہم یہ ایک کھلا ہوا سوال ہے، اور یوں کہ کمیشن صرف یہی چاہتا ہے کہ جو فرائض بھی اسے سونپے گئے ہیں انہیں انجام دے، اس لئے یہ معلوم کرنا میرا فرض ہے کہ کیا اس سلسلے میں مجھے کچھ اور

ہدایات دی جاسکتی ہیں تاکہ سارا کام کسی تنازعے کے بغیر انجام پا جائے۔ مجھے نہیں لگتا کہ دائرہ اختیار اس طرح اضافہ کئے جانے پر کوئی اعتراض کیا جائے گا لیکن میں ممنون ہوں گا۔ اگر جو ہدایات بھی دی جانے والی ہیں وہ جلد از جلد دے دی جائیں، کیوں کہ سلہٹ سے متعلق کمیشن کی بات چیت 4 اگست، بروز پیر سے شروع ہونے والی ہے، اور مجھے 4 اگست بروز پیر سے پہلے پہلے اسے کسی نہ کسی فیصلے سے مطلع کرنا ہے۔'

بعد میں ریڈکلف کے پرائیویٹ سکریٹری کرسٹوفر بیومونٹ نے انکشاف کیا کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کو آمادہ کیا کہ پنجاب کی سرحد اور تحصیل فیروز پور کو ہندوستان کے حوالے کرنے کے فیصلے کو تبدیل کردیں۔ اگر اب اس معاملے پر بااختیار طریقے سے کوئی رائے دینا مشکل ہے کہ بہت وقت گزر چکا ہے مگر پھر بھی بیومونٹ کے اسی بیان سے کمیشن کے غیر جانب داری پر حرف ضرور آجاتا ہے۔18

کمیشن کے اختیارات اس کے اراکین کو منتقل نہیں کئے گئے تھے، اس لئے وائسرائے کو رپورٹ پیش کرنے کا اختیار صرف کمیشنوں کے سربراہوں کا تھا۔ اراکین کی یا ان کی طرف سے کوئی بھی رپورٹ ارسال نہیں کی جاسکتی تھی۔ جسٹس محمد منیر (سرحد کمیشن کے ایک رکن) نے اعتراض کیا کہ یہ ان کے تقرر کی شرائط کے خلاف ہے۔ لہٰذا سربراہ کی رپورٹ کو کمیشن کی رپورٹ تسلیم کئے جانے کے لئے 'آزادیٔ ہند بل' میں ایک ترمیم کی گئی۔ اس پر جسٹس منیر نے کہا کہ اس طرح تو کمیشن کے اراکین کی حیثیت کو گھٹا کر انہیں صرف 'متعلقہ جماعت کا ترجمان' بنا دیا گیا ہے۔ اس تحدید کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی رکن سربراہ کے فیصلے پر کوئی سوال نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کی جانچ کرسکتا تھا۔ کمیشن کے سربراہ کو سرحدوں کے تعین کے تمام تر اور بلا شرکت غیرے اختیارات حاصل ہونے سے وہ طرح طرح کے دباؤ کا شکار ہو گیا، اور یہ تمام امور ان لوگوں یعنی غیر منقسم ہندوستان کے لوگوں کے علم و اطلاع کے دائرے سے باہر تھے جن کی زندگی ہمیشہ کے لئے تبدیل ہو جانے والی تھی۔

'رفتار' پر اصرار بھی مختلف منتظموں کے مشوروں کے خلاف تھا۔ اس سلسلے میں واضح ترین آگاہی اس وقت پنجاب کے گورنر سر ایوان جینکنس کی طرف سے دی گئی کیوں کہ انہیں اس کے بدترین نتائج کا اندیشہ تھا۔ انہوں نے 11 جولائی 1947ء، 19 کو پیش کی گئی 'گورنر کی جائزہ رپورٹ' میں واضح اور غیر مبہم لفظوں میں انتباہ دیا کہ:

- ☆ اعلا سروسیز پوری طرح بکھر کر رہ گئی ہیں۔ انہیں فیصلہ کن ضرب تقسیم کی پالیسی نے پہنچائی جس کے تحت وہ پیشہ ور سول سرونٹس کے بجائے ماتحت سیاست کار بن کر رہ گئے ہیں۔ آئی سی ایس سے وابستہ ایک بھی غیر مسلم ہندوستانی مغربی پنجاب میں خدمات پیش کرنے کو تیار نہیں ہے، اور صرف ایک مسلم ہے جو شرقی پنجاب میں کام کرنے کو راضی ہے۔ نفرت اور شکوک و شبہات پوری طرح کھل کر سامنے آگئے ہیں۔
- ☆ تقسیم کا عمل واقعی بہت سست رفتاری سے ہو رہا ہے۔ تقسیم کمیٹی کے اجلاس کسی امن کانفرنس سے مشابہہ ہیں

جو کوئی نئی جنگ شروع ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ اب جو وقت دستیاب ہے اس میں تقسیم کے عمل کو خوش اسلوبی سے انجام دے پانا خاصا ناممکن ہے، اور اگر ہم 15 اگست تک کوئی خلفشار نہ ہونے دیں اور اس کے بعد نئی حکومتیں سنبھالے لیں گے تب بھی خوف ناک افراتفری پیدا ہو سکتی ہے۔ نظم ونسق کا معاملہ یہ ہے کہ بعض ایسے کام ہوتے ہیں جو محض چند دن یا ہفتوں میں مناسب انداز سے انجام نہیں دئے جا سکتے۔ اور ''فوری'' احکام (جنہیں سیاسی جماعتیں بادل نخواستہ ہی قبول کریں گی) انتظامی مسائل کے حل میں ذرا بھی مددگار نہیں ہوتے۔

☆ سرحد کمیشن کے سربراہ جولائی تک نہیں آئیں گے۔ ان کے رفقاء نے حکومت پنجاب کو ایک لولانی سوال نامہ دیا ہے جس کے جوابات جتنی بھی جلدی کی جائے جولائی سے پہلے تیار نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے بعد اگر تمام دستیاب معلومات کا مطالعہ کر کے اسے خصوصی نقشوں میں منتقل کیا جانا ہے اور اگر فریقوں کی رائے معلوم کی جاتی ہے (انہوں نے بڑے ممتاز وکیلوں کی خدمات حاصل کی ہیں) یہ کہنا مشکل ہے کہ کمیشن 15 اگست تک رپورٹ پیش کر سکے گا۔

☆ اگر کمیشن 15 اگست تک رپورٹ پیش نہیں کرتا تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ تنازعہ پیدا ہوگا کیوں کہ مسلمان اور سکھ رپورٹ سے مطمئن نہیں ہیں۔

☆ اگر کمیشن 15 اگست تک رپورٹ پیش نہیں کرتا تو تنازعہ پیدا ہوگا کیوں کہ سکھوں کو تصوراتی سرحد منظور نہیں ہے۔

☆ مختصراً آئندہ صورت حال حوصلہ افزا نہیں ہے، مگر ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے اور دیکھنا ہے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔'

یہ جائزہ شہری امور کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کی لاعلمی کی طرف تیکھا اشارہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ فوجی امور میں بھی، بحری فوج کو چھوڑ کر، ماؤنٹ بیٹن کی سمجھ محدود تھی۔ اول الذکر لاعلمی ان کے تمام غلط فیصلوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ پیغامات، جس کے چند حصے ہی یہاں ذکر کئے گئے ہیں، وائسرائے کے غلط فیصلوں کے خلاف دئے گئے واضح اور صاف مشوروں کی نمایاں مثالیں ہیں۔ مگر یہ تمام مشورے بھی بے سود رہے۔

پنجاب کے گورنر ایوان جینکنس کے مشوروں پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ تقسیم سے متعلق ماؤنٹ بیٹن کی تمام تر حکمت عملی کسی کو بھی ذرا ٹھہر کر غور کرنے کا کوئی موقع دیئے بغیر یہ کام جلد بازی میں انجام دینے کی تھی۔ کانگریس رہنماؤں کو، سرحدوں کے جلد تعین سے ہونے والے وقتی فائدوں کی بھرمار دینے والی امیدوں میں پھانس لیا گیا اور آنکھیں موند کر ساتھ ہو لئے۔ تقسیم کے منصوبے پر جس شدید عجلت کے ساتھ عمل کیا گیا اس کے بارے میں مولانا آزاد نے لکھا ہے، 'ایک ایسا فیصلہ کرنے کی ایسی جلدی کیا تھی جسے تقریباً سب لوگ غلط سمجھ رہے تھے؟ اگر ہندوستان کے مسئلے کا حل 15 اگست تک تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا تو پھر ایک غلط فیصلہ کر کے اس پر ماتم کیوں کیا گیا؟ میں نے بار بار کہا کہ درست حل تلاش کئے جانے

تک انتظار کرنا بہتر ہوگا۔ مگر اپنی سی بہترین کوشش کی مگر میرے دوستوں اور رفیقوں نے میری تائید نہیں کی۔ حقائق کی جانب سے آنکھیں بند کر لینے کے ان کے اس عجیب وغریب طرز عمل کی یہی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی آنکھوں پر غصے یا مایوسی کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ شاید 15 اگست کی تاریخ طے کر دئے جانے نے ان پر جادو کر دیا اور وہ عجیب عمل تنویم کے زیر اثر ماؤنٹ بیٹن کی ہر بات منظور کرتے چلے گئے... 20

ریڈکلف کا فیصلہ 12 اگست 1947 کو تیار ہوگیا تھا، جو 14 اگست کو پاکستان میں اقتدار کی منتقلی کے لحاظ سے بروقت تھا، مگر ماؤنٹ بیٹن نے اپنے اثرات کا استعمال کر کے ریڈکلف کو اپنا فیصلہ 13 اگست 1947 تک روکے رکھنے پر آمادہ کر لیا اور تب تک وہ کراچی کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ پاکستان 14 اگست کو وجود میں آگیا اور 15 اگست کو ہندوستان دونوں نوزائیدہ ملکوں کو نہیں معلوم تھا کہ ان کی سرحدیں کہاں ہیں، وہ خط انفصال کہاں ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ کرنا تھا۔ آخر کار 17 اگست کو فیصلہ شائع کیا۔ اور جیسا کہ اندیشہ (پیش گوئی) تھا، اس کے بھیانک تباہ کن نتائج سامنے آئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے کمانڈران چیف آچن لک تک کا گہرے تجربے پر مبنی انتظامی مشورے کو نظر انداز کر دیا کہ جس نے آگاہ کیا تھا کہ 'یہ بات پھیل جانے کے بعد کہ فیصلہ تیار ہے ہونے والی تاخیر سے وحشت ناک افواہوں کو راہ ملے گی جس کے بہت نقصاندہ نتائج سامنے آئیں گے' 21۔ یہ مشورہ بھی اکارت گیا۔ اقتدار کی منتقلی پوری طرح فرضی سرحدوں کی بنیاد پر عمل میں لائی گئی اور ریڈکلف لکیر جس جلد بازی میں کھینچی گئی تھی وہ پوری طرح المناک طور پر غلط ثابت ہوئی اور اپنے پیچھے غیر متعین سرحدوں کے ساتھ ساتھ بہت سی مستقل پریشانیاں بھی چھوٹ گئی۔

ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور جناح کے اس اجتماعی تقاضے کے پیش نظر کہ کمیشن اپنا کام 15 اگست سے پہلے مکمل کر لے، ریڈکلف نے اپنا فیصلہ 12 اگست کو پیش کرایا۔ پھر ماؤنٹ بیٹن نے، دوبارہ غور کرنے کے بعد، ریڈکلف اسے 15 اگست تک روکے رکھنے کو کہا۔ ریڈکلف اب تک تھک چکے تھے اور اپنے آپ کو پھنسا ہوا محسوس کر کے ہندوستان چھوڑ کر جانے کے چکر میں تھے 'صاف انکار' کر دیا۔ اس کے باوجود ماؤنٹ بیٹن نے فیصلے کو 16 اگست تک جاری نہیں ہونے دیا کیوں کہ اس دن انہیں ہندوستان اور پاکستان کے رہنماؤں کے ساتھ اس پر باضابطہ بات چیت کرنی تھی، حالاں کہ نہرو کے ساتھ وہ اس بارے میں غیر رسمی طور پر پہلے ہی بات کر چکے تھے۔ آخر یہ فیصلہ 16 اگست کو گزٹ میں شائع کیا گیا۔ اس کے اثرات دھیرے دھیرے اضلاع اور ان سے نیچے کی سطحوں تک، جہاں اصلاً ان کی اہمیت تھی، کب پہنچے اس کے بارے میں کچھ جان پانا ناممکن ہے۔ لیکن ہندوستان عملاً تو پہلے ہی تقسیم ہو چکا تھا۔ ایوارڈ کے اعلان سے کئی دن پہلے ہی سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد اپنے گھر بار چھوڑ کر جانے لگی تھی۔ اس عاجلانہ فیصلے نے نہ جانے کتنے ناقابل بیان جرائم اور لاعلاج خرابیوں کو جنم دیا۔ شاعروں نے اس المیے پر توجہ کیا: یہ کون بے رحم شخص ہے، جس نے اپنے جلتے ہوئے قلم سے میری مادر وطن کے سینے پر بے گناہوں کے خون کی گہری لکیر کھینچ دی 22۔

کانگریس اور تقسیم کا منصوبہ

آر سی مجمدار نے اپنی کتاب اسٹرگل فار فریڈم میں کہا ہے کہ 'پارٹی رہنماؤں کے ساتھ بات چیت کے دوران ماؤنٹ بیٹن کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ کیبنٹ مشن منصوبے کی بنیاد پر کسی متفقہ حل کا کوئی امکان نہیں ہے، اور یہ کہ ہندوستان کی فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم ناگزیر ہے۔ انہوں نے پٹیل اور نہرو دونوں کو اس کا یقین دلا دیا اور پھر دھیرے دھیرے تمام کانگریس رہنما اس کے حامی ہو گئے۔ آزاد، موزلے اور کئی دیگر لوگوں نے اس معاملے میں نہرو اور پٹیل کی مذمت کی ہے اور انہیں ہندوستان کی بدبختانہ تقسیم کا اصل ذمے دار قرار دیا ہے۔ مگر پٹیل یا نہرو کی مذمت کرنے یا یہ کہنے سے پہلے کہ وہ حیلہ باز ماؤنٹ بیٹن کی عیارانہ چال بازیوں، سے دھوکا کھا گئے یہ یاد کر لینا بھی مناسب ہوگا کہ کانگریس 1934، 1942، 1945 اور مارچ 1947 کو ایسی متفقہ قرارداد منظور کرتی رہی تھی جن میں راست یا بالواسطہ طور پر پاکستان کو تسلیم کیا گیا تھا۔ گاندھی اور نہرو تقسیم کے امکان کو قرین قیاس قرار دے چکے تھے۔

یہی وہ پس منظر تھا جس میں حکومت برطانیہ نے 3 جون 1947 کو 'ہندوستان کی تقسیم' کا اعلان کیا نہرو نے، اس اعلان سے متاثر ہو کر، اقتدار کی حتمی منتقلی کے لئے ایک تاریخ طے کرنے کے فیصلے کو دانش مندانہ اور جرأت مندانہ قرار دیا جس کے دوررس نتائج ہوں۔'' 23؎۔ اس طرح ہندوستان کی وحدت کو بچانے کے لئے ویول اور کیبنٹ مشن کی تمام زحمت طلب کوششیں، جن میں سلطنت برطانیہ کو بھی ایک کردار ادا کرنا تھا، بے سود محسوس کی جانے لگیں۔ پینڈرل مون نے طنزیہ انداز میں کہا ہے: 'پاکستان' کرم خوردہ ہی سہی، اب ایک حقیقت بن چکا تھا۔ اس جناح کو بس ذرا سی ہی تشفی ہوتی۔ انہیں اب بھی ایک پورے پیچھے صدیوں والے پاکستان کی طلب تھی۔ لیکن ایک اقتدار اعلا کی حامل، اگرچہ منقسم، مسلم ریاست پاکستان کو حاصل کر لینا جناح کی حیرت انگیز کامیابی تھی۔ یہ کسی ناگزیر تاریخی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک فرد واحد کے عزم وارادے کا نتیجہ تھا۔ یہ صرف جنا تھے جو فضل الحق، سر سکندر، حیات اور خضر پر قابو پا سکے تھے۔ ان کی طرف سے پاکستان کی مخالفت کے باوجود، جناح نے بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو اس کے مطالبے کی حمایت میں متحد کر لیا۔ ایسا کوئی اور مسلم رہنما نہیں تھا جو کامیابی حاصل کر پاتا تو دور اس کے لئے کوشش بھی کر سکتا۔ پاکستان وجود میں آنے جا رہا تھا تو تنہا جناح کی مستقل مزاجی کی وجہ سے۔'

دوسری طرف آئی سی ایس سے وابستگی رکھنے والے منگت رام نے اس سے مختلف جائزہ پیش کیا ہے: 'یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ ہندوستانیوں، بلا استثنا، جنگ کے بعد حکومت برطانیہ، اور کرپس، پیتھک لارنس، ایٹلی جیسے لوگوں کی ہندوستان کو متحد رکھنے کی سخت پر خلوص کوششوں کی ستائش کی اور آج بھی کرتے ہیں۔ وہ پاکستان کی تشکیل کرنے میں تاریخ کی بارودی سرنگوں کے شکار ہو گئے۔ جس کا ایک حصہ خود انہیں کے پیش رووں کا پیدا کردہ تھا۔ مسلمان اور دیسی ریاستوں، کے برطانوی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے دریا پر باندھے گئے بندوں کا کردار ادا کیا۔ لہٰذا مون کی یہ رائے تسلیم کرنا (پوری

طرح) مشکل ہے کہ جناح 'تاریخ کے عمل کو متاثر کرنے والے ایک فرد واحد کی نہایت نمایاں مثال ہے، کیوں کہ جناح نہ ہوتے تو پاکستان بھی نہ ہوتا'۔ میں اس رائے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ میرا اپنا قیاس کچھ اور ہے، اور یہ کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے لئے اکیلے جناح نہیں انگریزوں اور مسلم اور غیر مسلم ہندوستانی لیڈروں (ہندو اور دیگر) کا بھی کردار رہا ہے 24۔ مگر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس کا اصل ذمے دار کون ہے۔

ان واقعات کے بارے میں ایک نہایت بصیرت افروز مقالے میں جدل قانون داں سر جمن لال سیتل وار نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ پاکستان کی تشکیل 'باہمی میر سگالی اور افہام و تفہیم' کا نتیجہ نہیں تھا اور اُس کے تمام متعلقہ فریق ذمے دار ہیں'۔ انہوں نے کہا ہے کہ 'کیبنٹ مشن کے منصوبے کو ایک پارٹی (کانگریس) کے پس و پیش کے رویے نے ہلاک کر دیا، اور یہ کہ 'متحدہ ہندوستان... ان (کانگریس) کے آغوش میں آپڑا تھا مگر انہوں نے سیاسی سوج بوجھ نہ ہونے کے سبب اسے اٹھا کر پھینک دیا اور اپنی پہنچ سے دور کر ڈالا'۔

جی آر نندا نے اپنے مکالے نہرو مادی انڈین نیشنل کانگریس اینڈ دی پارٹیشن آف انڈیا 1935-47 میں ذکر کیا ہے کہ نہرو اور پٹیل ہندوستان کی تقسیم سے متفق ہو گئے کیوں کہ انہیں اقتدار کی حرص تھی۔ نہرو کے مطابق فوری مسئلہ حالات کو مزاج اور افراتفری کی طرف تیزی سے بڑھنے سے روکنا تھا۔ 'پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کی طرف سے تقسیم کی منظوری کوئی فوری ردعمل نہیں تھا جیسا کہ اس وقت نظر آتا تھا۔' یہ اس عمل کا انجام تھا جو آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد شروع ہوا تھا۔ گاندھی نے دو قومی نظریے اور ہندوستان کی 'چیر پھاڑ' کی مخالفت کی تھی مگر انہوں نے 1940 کے آس پاس لکھا تھا: 'مجھے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو باقی ہندوستان کی مرضی پر چلنے کے لئے مجبور کرنے کا کوئی عدم تشدد پر مبنی طریقہ نہیں آتا، باقی لوگوں کے پاس اکثریت کی کتنی ہی طاقت کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں بھی وہی حق خود ارادیت ملنا چاہیۓ جو باقی ہندوستان کو حاصل ہے۔ ہم ابھی ایک مشترکہ خاندان ہیں اور اس کا کوئی بھی فرق تقسیم کا دعوہ کر سکتا ہے'

دو سال بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کرپس کی تجاویز سے متعلق اپنی قرارداد میں یہی خیالات پیش کئے جب اس نے یہ اعلان کیا کہ 'وہ کسی بھی علاقائی اکائی کے لوگوں کو ان کی اعلان شدہ اور تسلیم شدہ مرضی کے خلاف ہندوستانی یونین میں رہنے پر مجبور کرنے کا کوئی خیال نہیں رکھتی'۔ لیگ کے پروپگنڈے اور حکومت کے ساتھ سیاسی راہ و رسم ہونے کے زیر اثر تقسیم کے بارے میں کانگریس کے موقف میں دھیرے دھیرے گرمی آتی گئی۔ 1944 میں، گاندھی نے جناح کے ساتھ بات چیت کے دوران نہ صرف تقسیم کے اصول کو تسلیم کیا بلکہ سرحدوں کی نشان دہی کے طریق کار پر بھی بات کی، 1946 میں کانگریس نے کافی مغز ماری کے بعد کیبنیٹ مشن کے منصوبے کو منظور کر لیا جو ایک ڈھیلے ڈھالے سہ سطحی ڈھانچے اور ایک ایسی مرکزی حکومت پر مبنی تھا جس کے، برصغیر کی وحدت کو برقرار رکھنے کے اختیارات یا وسائل کا حامل ہونے کا کوئی امکان

نہیں تھا۔

اس طرح کانگریس پارٹی نے ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد رکھی۔ اس وقت ان میں کوئی نہں ی تھا جو اٹھ کر کہتا کہ 'ہندوستان کی جغرافائی وحدت کی قیمت پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا جائے گا'۔

اے آئی سی سی اجلاس، 15-14 جون 1947

3 جون کے اعلان کے مطابق، ماؤنٹ بیٹن کے تقسیم کے منصوبے پر قرارداد منظور کرنے کے لئے، کل ہند کانگریس کمیٹی (اے آئی سی سی) کا ایک خصوصی اجلاس دہلی میں 14 اور 15 جون 1947 کو طلب کیا گیا۔ اس اجلاس میں مجوزہ تقسیم کے خلاف کئی آوازیں اٹھیں۔ ان میں سے ایک آواز سندھ کے چوتھ رام گڑوانی کی بھی تھی جنہوں نے قرارداد تو 'جناح کے زیر قیادت تشدد پر اتاروں مسلم لیگ کے بلیک میل کے ہتھ کنڈوں کے آگے مکمل خود سپردگی قرار دیتے ہوئے اس پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس قرارداد کے خلاف بولنے والے کانگریس رہنماؤں میں پرشوتم داس ٹنڈن بھی شامل تھے جو آخر تک پوری استقامت کے ساتھ اس کے خلاف رہے۔ انہوں نے شدت جذبات سے تھرتھراتی آواز اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ تمام مندوبین کو اپنی تکلیف میں شریک کرتے ہوئے کہا کہ 'یہ قرارداد □وری اور مایوسی کی آواز ہے۔ نہرو حکومت مسلم لیگ کی دہشت پیدا کرنے والے حربوں سے حواس باختہ ہوگئی ہے اور یہ کہ تقسیم کو تسلیم کرنا غداری اور خود سپردگی ہوگی۔ ہمیں متحدہ ہندوستان کے خواب اپنے پروان چڑھائے ہوئے نصب العین کو قربان کرنے کے بجائے برطانوی راج کے کچھ اور دن جاری رہنے کی تکلیف برداشت کرلینی چاہئے۔ ہمیں ملک کے اتحاد اور سے لڑنے کے تحفظ کے لئے ضرورت پڑے تو انگریزوں اور مسلم لیگ دونوں سے لڑنے کے کمر کس لینی چاہئے۔' ٹنڈن کی تقریر کا خیر مقدم کرنے والی تالیوں کی گڑگڑاہٹ کانگریس قیادت کے لئے خاصا انتباہ تھی۔ اس... اجلاس میں دیگر بولنے والوں میں لوہیا اور جے پرکاش نارائین نمایاں طور پر شامل تھے۔ لوہیا نے لفظوں میں، 'ہم دنوں (وہ خود اور جے پرکاش نارائین)، مہاتما گاندھی اور عبدالغفار خاں کو چھوڑ کر کسی اور نے تقسیم کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا'۔

لوہیا کے مطابق: مولانا آزاد اجلاس کے دونوں دن اس چھوٹے سے کمرے میں یہاں ہم سب بھرے ہوئے تھے، ایک کنارے کرسی پر بیٹھے رہے، لگاتار سگریٹیں پھونکتے ہوئے، اور بالکل خاموش، ایک لفظ بھی بولے بغیر۔ وہ شاید تکلیف میں تھے'۔ لوہیا مزید کہتے ہیں کہ 'لیکن ان کا یہ ظاہر کرنا کہ ایک ہیں جو تقسیم کے خلاف ہیں ان کی ناسمجھی تھی۔ اجلاس میں تو وہ لگاتار خاموش رہے مگر پھر بھی ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک منقسم ہندوستان کے وزیر بھی رہے۔' میں مانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ وہ تقسیم سے خوش نہیں تھے اور انہوں نے غیر رسمی ملاقاتوں کے دوران اپنے طریقے سے اس کی مخالفت بھی کی۔ مگر یہ ایسی مخالفت تھی جیسے اس چیز کے خدمت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھے۔ جس کی وہ مخالفت کررہے تھے۔ یہ مخالفت اور خدمت کی ایک عجیب وغریب آمیزش تھی، ایک ایسے ضمیر میں جو یا تو مندرجہ دانش مند تھا یا پھر بہت زیادہ لچک دار۔ مولانا

آزاد کے ضمیر کی تھاہ، لینا دلچسپ ہوسکتا ہے کیوں کہ مجھے اکثر دانش اور لچک داری کے یکجا رہ پانے پر شبہ ہوتا ہے'۔ صرف مولانا آزاد ہی نہیں تھے جنھوں نے لوہیا کے ایسے تبصروں کے زبانی کوڑے کھاتے۔ کئی اور بھی تھے جن کے ساتھ انہوں نے یہی سلوک روا رکھا۔ اس کے بعد وہ کانگریس صدر کے بارے میں تبصرے کرتے رہے۔

لوہیا کہتے ہیں کہ 'ان اجلاسوں میں آچاریہ کرپانی کی حالت بڑی قابل رحم نظر آئی۔ وہ اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ وہ اجلاس کے دوران مسند کے سہارے ادھ لیٹے ہوئے اونگھتے رہے۔ بحث کے دوران ایک موقع پر مہاتما گاندھی نے کانگریس صدر کے نڈھال نیٹھے ہونے کی طرف اشارہ کیا اور میں نے حد درجہ چڑھ کر انہیں بانہہ پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ اس پر انہیں خود میں کہا کہ ان کے سر میں شدید درد ہے۔ ان کا تقسیم کے خلاف ہونا پرخلوص رہا ہوگا کہ یہ ان کا ذاتی دکھ بھی تھا۔ آزادی کے لئے لڑنے والی اسی جماعت (کانگریس) پر، اس کے کرب و ابتلا کے اسی سخت ترین لمحے میں، ضعیفی اور نڈھال ہوئے گہر سائے پڑ رہے تھے'۔

لوہیا نے اپنے سوشلسٹ دوستوں تک کو نہیں بخشا۔ وہ اپنا تبصرہ جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: 'خان عبدالغفار خاں نے بس دو جملے بولے۔ انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ان کے رفقاء نے تقسیم کے اس منصوبے کو تسلیم کرلیا۔ انہوں کہا کہ اب ان کے دوست ایک ذرا سی مہربانی کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کیا شمال مغربی سرحدی صوبے میں مجوزہ رائے شماری کے تحت ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کے ساتھ ہی آزاد رہنے کا متبادل بھی شامل ہے یا نہیں؟۔ پھر انہوں نے پورے اجلاس کے دوران کسی بھی موقع پر کوئی اور بات نہیں کی کہ وہ بھی گہری تکلیف محسوس کر رہے ہوں گے'۔

لوہیا جے پرکاش نارائین کے حوالے سے کہتے ہیں کہ انہوں نے 'تقسیم کے خلاف کچھ مختصر مگر یقینی رائے زنی کی اور پھر پورے اجلاس کے دوران چپ رہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ ملک کی تقسیم کے بارے میں ورکنگ کمیٹی میں جو انداز بحث اختیار کیا جا رہا تھا کیا وہ اسی سے مایوس تھے؟ یا پھر انہوں نے ساری قیادت کے تقسیم کو قبول کر لینے کے معاملے میں متحدہ ہو جانے کے پیش نظر خاموش رہنا مناسب سمجھا؟ ان کے طرز عمل میں، شاید، بعض موقعوں پر صحت مندانہ ردعمل ظاہر کرتے مگر بیشتر اوقات موقع شناسی کا مظاہرہ کرنے کی آمیزش پائی جاتی ہے، جو بلاشبہ بڑی چڑھانے والی آمیزش ہے اور اسی لئے کبھی کبھی مجھے ان پر سخت غصہ بھی آیا'۔

دوسری طرف لوہیا خود احتسابی میں بھی اتنے ہی دھاردار نظر آتے ہیں: 'تقسیم کی میری مخالفت مسلسل اور پرآواز تھی مگر لگتا ہے اس میں مطلوبہ سنجیدگی نہیں تھی اور اب یاد آتا ہے کہ اس میں کچھ بے سرا پن بھی تھا۔ کچھ بھی ہو، میری مخالفت سے پہاڑ تو ہلتے نہیں تھے، بس یہ تھا کہ یہ بات آئندہ کے لئے درج ہو جاتی کہ ایک مجاہد آزادی نے بے اثر ہی اس کی صحت مندانہ مخالفت کی۔ پھر بھی، میرے جیسے کسی شخص کی جانب سے بھی، تقسیم کی سنجیدہ مخالفت نہ ہونا اس [illegible]وری اور توف کی

گہرائیوں کو ظاہر کرتا ہے جس میں ہم لوگ بشمول مجھ معمولی شخص کے گرے پڑے تھے۔ مجھے اپنی مخالفت کے بعض پہلوؤں کو ظاہر کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اسی اجلاس کی اہم بات مہاتما گاندھی کا اظہار خیال تھی'۔ اس کے بعد لوہیا اس عظیم شخص کے بظاہر الوداعی کلمات کی تفصیل پیش کرتے ہیں اس جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے جسے دراصل انہی نے پیدا کیا تھا، ایک شکل اور ملک گیر تنظیم دی تھی، اور آزادی کی جذبے سے سرشار کیا تھا۔ لوہیا یاد کرتے ہیں: 'میں خاص طور پر ان دونکات کی صرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو گاندھی نے اس اجلاس پیش کیے۔ انہوں نے ہلکے شکایتی لہجے میں جناب نہرو اور سردار پٹیل سے کہا کہ انہوں نے تقسیم کے منصوبے کے لئے ہامی بھرنے سے پہلے اس کے بارے میں انہیں مطلع نہیں کیا۔ اسی سے پہلے تو گاندھی جی اپنی یہ بات پوری کرتے جناب نہرو قدرے جذبات میں آ کر بیچ میں بول پرے کہ انہوں نے ان کو اس بارے میں پوری طرح باخبر کر رکھا تھا۔ جب مہاتما گاندھی نے یہ بات دہرائی کہ انہیں تقسیم کے منصوبے کی کوئی خبر نہیں تھی تو جناب نہرو نے اپنی بات میں تھوڑی ترمیم کی۔ انہوں نے کہا کہ نوا کھالی کا فاصلہ بہت تھا اور اگرچہ وہ اسی منصوبے تفصیلات بیان نہیں کر سکتے تھے مگر انہوں نے گاندھی جی کو اس کے بارے میں موٹے طور پر تحریری اطلاع دے دی تھی'۔

اس کے بعد لوہیا ان باتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: 'میں اس معاملے میں مہاتما گاندھی کی بات ہی مانوں گا۔ جناح نہرو کی نہیں، اور کون سے جو ایسا نہ کرے؟ یہاں جناب نہرو کو چھوٹا کر کہہ کر ایک طرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جناب نہرو اور سردار پٹیل کی جانب سے تقسیم کے منصوبے کو منظر کر لیے جانے سے پہلے مہاتما گاندھی کو اس کی اطلاع تھی یا نہیں۔ جناب نہرو یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کو خط لکھے تھے جن میں فرض اور غیر اہم معلومات فراہم کی گئی ہوں گی۔ اس تمام معاملے میں یقینی طور پر رازداری کا ایک پہلو بھی تھا۔ لگتا ہے جناب نہرو اور سردار پٹیل نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ اس معاملے کے طے ہو جانے سے پہلے اس کے بارے میں گاندھی جی کو بتانا مناسب نہیں ہوگا کیوں کہ وہ اس سے ڈر کر پیچھے ہٹ سکتے تھے۔

اب گاندھی نے نہرو اور پٹیل کی جانب رخ کر کے اپنی اگلی بات کہی۔ لوہیا کے لفظوں میں، 'وہ چاہتے تھے کہ کانگریس پارٹی اپنے رہنماؤں کے وعدوں کا احترام کرے۔ لہٰذا انہوں نے خواہش ظاہر کی کانگریس تقسیم کے اصولوں کو تسلیم کر لے۔ اور وہ اسے قبول کرنے کے بعد اس پر عمل درآمد سے متعلق اعلان کرے۔ اسے برطانوی حکومت اور وائسرائے سے کہنا چاہئے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی طرف تقسیم کو منظور کیے جانے کے بعد وہ اقتدار سے ہٹ جائیں۔ کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ ملک کی تقسیم کے عمل کی کسی تیسرے فریق کی مداخلت کے بغیر انجام دیں'۔

لوہیا کی نظر میں یہ 'حکمت عملی کی ایک زبردست ضرب تھی'۔ گاندھی کے مہاتما ہونے کے ساتھ ہی سیاسی حربوں کا ماہر ہونے کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن جہاں تک میرا علم ہے اس زبردست اور چالاکی بھری تجویز پر ابھی تک کچھ پوری توجہ نہیں دی گئی ہے۔

اس کے بعد لوہیا نے لکھا ہے کہ 'سرحدی گاندھی کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب اس تجویز کو بالکل نا قابل عمل قرار دے کر کہ اس پر کھل کر نکتہ چینی کرنے والے پہلے اور واحد شخص تھے، جس کے بعد کسی اور کو اس کی مخالفت کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ (اس لئے) ان کی اسی مخالفت پر غور ہی نہیں کیا گیا۔ میں نے خان صاحب سے زبردست جرح کی کہ اس تجویز کا نا قابل عمل ہونا ہی تو اس کا حسن ہے، اور یہ کہ اگر جناح اور کانگریس کے نمائندے انگریزوں کی مدد کے بغیر تقسیم کا عمل انجام دینے پر متفق نہیں ہو پانے تک بھی ہندوستانی خسارے میں نہیں رہے گا۔ لیکن ان 'دہائیوں پر کافی دھرنے والا کون تھا؟ تجویز آپنے آپ میں چالاکی بھری یقیناً تھی مگر اس بات کے پیش نظر کہ کانگریس کی قیادت اتحاد کی قیمت آزادی خریدنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں تھی۔

لوہیا اب کانگریس کی 'ترمورتی' کی طرف رخ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'نہرو اور پٹیل حضرات نے اس اجلاس میں گاندھی جی کے نہایت جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ ان دنوں سے میری کچھ تیکھی جھڑپیں بھی ہوئیں جن میں سے کچھ کا ذکر یہاں کرنا چاہوں گا۔ مجھے اس وقت جو بات سب سے حیرت انگیز نظر آئی اور اب بھی نظر آتی ہے اور اب میں اسے زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہوں یہ تھی کہ ان دونوں منتخب چیلوں نے اپنے پرومرشد کے تئیں حد درجہ سخت و شدید رخ اختیار کیا تھا۔ اس میں نفسیاتی مرض جیسا کوئی پہلو ضرور تھا۔ لگتا تھا کہ انہوں نے اپنے دل میں کچھ ٹھان رکھا تھا اور جب انہیں محسوس ہوا کہ گاندھی جی اس میں حائل ہو گئے تو وہ اول فول پر اتر آئے'۔

اے آئی سی سی کے اجلاس میں نہرو اور پٹیل کے ساتھ لوہیا کی جو تیکھی جھڑپیں ہوئی تھیں۔ ان کے حوالے سے پٹیل نے لوہیا سے کہا کہ وہ تقسیم کے بعد ہندوستان کی صورت حال سے متعلق ساری باتوں کو بھول جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وجناح سے 'ڈنڈے' کی زبان میں بات کریں گے۔ اس پر لوہیا کا جواب تھا کہ اب تک تو وہ سردار کی تلوار کی زبان سنتے چلے آرہے ہیں اور آئندہ ان کی 'ڈنڈے' کی زبان بھی سنی پڑے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ 'اگر آپ ہندوستان کی آزادی کی جنگ سپہ سالاروں کی طرح لڑتے ہیں تو ہم نے بھی سپاہیوں کی طرح لڑائی کی ہے'۔

ماؤنٹ بیٹن تجاویز سے متعلق قرارداد میں دو 'قومی نظریے' کا منفی ذکر کرنے کی رائے دی گئی۔ نہرو کی طرف تیار کردہ مسودے میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اسی لئے لوہیا نے اس میں ترمیم پیش کی۔ گاندھی نے اس کی حمایت کی۔ ترمیم میں واضح طور پر کہا گیا تھا: 'جغرافیے' پہاڑوں اور سمندروں نے ہندوستان کو ویسا بنایا ہے جیسا وہ ہے اور کوئی بھی انسانی طاقت اس کی شکل وصورت کو تبدیل نہیں کر سکتی اور نہ اس کی فیصلہکن تقدیر میں مزاحم ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کی جس شبیہ کو ہم اپنے دل و دماغ میں بسائے ہوئے ہیں وہ اور ہمیشہ وہی ہی رہے گی اور ہندوستان میں موجود دو قوموں کے جھوٹے نظریات سب کی طرف سے مسترد کر دیئے جائیں گے'۔

[ورکنگ کمیٹی نے یہ قرارداد اس ترمیم کے ساتھ منظور کر لی] مگر جب یہ لوہیا نے یہ ترمیم پیش اور گاندھی نے اس

کی حمایت کی تھی تو نہرو نے غصے میں کہا تھا کہ جناح کے خیالات ان لوگوں کے ذہنوں پر حاوی ہو گئے ہیں اور وہ ہر وقت ان سے اسی بحث میں الجھے رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا 'ان لوگوں کو آپس میں بھائی کہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے جو ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہیں؟' اس پر لوہیا نے کہا کہ 'امریکیوں نے خانہ جنگی کی جس میں تین سے چار سو ہزار یا اس سے بھی زیادہ لوگ ہلاک ہوئے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ آپس میں بھائی بھائی نہیں رہے۔' اس اہم نکتے پر گاندھی نے مداخلت کی ایک بار پھر بہت موثر انداز سے اور تقسیم کی قرارداد، کو اے آئی سی سی کے ذریعے منظور کرالیا۔ گاندھی کی دل گہرائیوں اور مایوسی کے رنگ میں بولے: 'اگر اے آئی سی سی اس مرحلے پر، ماؤنٹ بیٹن کے منصوبۂ تقسیم کو منظور کرنے کے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کو مسترد کر دیتی ہے تو دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچے گی؟ مسترد کئے جانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے رہنما تلاش کرنے ہوں گے جو ایک نئی ورکنگ کمیٹی تشکیل دیں اور حکومت چلانے کے بھی اہل ہوں۔ اس مرحلے پر امن و امان برقرار رکھنا نہایت لازمی ہے۔ کانگریس ہمیشہ پاکستان کی مخالف رہی ہے۔ پھر بھی، میں اب اسے قبول کئے جانے کی اپیل کرتا ہوں۔ کبھی کبھی حد درجہ ناگوار فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں۔'25

راجیندر پرساد نے تقسیم کو کیوں قبول کیا اسے اس اقتباس سے سمجھا جا سکتا ہے: 'یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ یہ ورکنگ کمیٹی اور خاص طور پر اس کے مرکزی کابینہ میں شامل اراکین تھے جنہوں نے تقسیم کے منصوبے کو تسلیم کیا تھا... (انہوں نے) ایسا اس لئے کیا کہ وہ اس وقت ملک میں موجود صورت حال سے بیزار ہو چلے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فسادات روز کا معمول ہو گئے انہیں روکنے سے عاجز ہے کیوں کہ مسلم لیگ نے وزیر جگہ جگہ اس میں رکاوٹ ڈالیں گے... اس طرح نظم و نسق چلا پانا ناممکن ہو گیا تھا۔ ہم نے سوچا کہ تقسیم کو منظور کر کے ہم کم از کم اس علاقے میں جو ہمارے پاس بچ رہا ہے اپنی مرضی کے مطابق حکومت چلا سکیں گے، ملک کے بیشتر حصوں میں امن و امان برقرار رکھ سکیں گے اور ایسا انتظام کر سکیں گے کہ بہترین خدمات انجام کر سکیں۔ لہٰذا ہمارے پاس تقسیم کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔'

نہرو نے تقسیم کے منصوبے کو کسی وجہ سے تسلیم کیا اس کی گواہی لیونارڈ موزلے کے اس بیان سے ملتی ہے:

> پنڈت نہرو نے مائیکل بریچر، جو ان کے سوانح نگار تھے، کو بتایا: (1956 میں، ہندوستان کی تقسیم کو قبول کرنے کے اسباب) 'میں سمجھتا ہوں کہ وجہ تھی حالات کا جبر اور یہ احساس کہ ہم موجودہ طریقے پر چلتے ہوئے اس تعطل یا مخمصے سے نجات نہیں پا سکیں گے، حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ پھر یہ احساس بھی کہ اگر ان حالات کے ساتھ ہندوستان کے لئے آزادی حاصل بھی کر لی تو یہ ایک بہت کمزور ہندوستان ہوگا؛ یہ ایک ایسا وفاقی ہندوستانی ہوتا جس میں وفاق میں شامل اکائیوں کے پاس کہیں زیادہ اختیارات ہوتے۔ اس طرح وسیع تر ہندوستان کو مستقل پریشانیوں اور بکھراؤ کی طاقتوں کا سامنا رہتا۔ اور یہ حقیقت بھی کہ ہمیں، مستقبل قریب میں آزادی حاصل کرنے کی

کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ لہٰذا ہم نے اسے قبول کرلیا اور کہا کہ چلو ہم ایک مضبوط ہندوستان کی تعمیر کریں۔ اور اگر دوسرے لوگ اس میں نہیں رہنا چاہتے تو ہم انہیں اس میں رہنے کے لئے کیسے اور کیوں مجبور کریں؟ تاہم، جیسا کہ آرسی مجمدار نے کہا ہے پنڈت نہرو نے 1960 میں موزلے کے بات چیت کے دوران سچائی کے زیادہ نزدیک تھے جب انہوں نے کہا کہ: 'سچ یہ ہے کہ ہم تھکے ہوئے لوگ تھے، اور ہماری عمریں بھی بڑھ رہی تھیں۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی رہا ہوگا جو دوبارہ جیل جانے کی صعوبتیں برداشت کرنے کی حالت میں ہو، اور اگر ہم متحدہ ہندوستان کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے جیسا کہ ہم چاہتے تھے تو ظاہر ہے تھے جیل ہمارا منتظر تھا۔ ہم دیکھ رہے کہ پنجاب جل رہا ہے اور لوگوں کے مارے جانے کے بارے میں سن رہے تھے۔ تقسیم کے منصوبے نے ایک راہ نجات دکھائی اور ہم اسی پر ہو لئے۔

نہرو نے مزید کہا: 'لیکن اگر گاندھی نے ہمیں روکا ہوتا تو ہم اپنی لڑائی جاری رکھتے اور انتظار کرتے۔ مگر ہم نے قبول کرلیا۔ ہمیں توقع تھی کہ تقسیم ایک عارضی مرحلہ ہوگی اور یہ پاکستان کو ہمارے پاس واپس آنا ہوگا۔ ہم میں کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ مارکاٹ اور کشمیر کا بحران تعلقات کو اس قدر کشیدگی اور تلخ کردیں گے۔' یہ بیانات ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں مگر ایک دوسرے کی تردید نہیں کرتے اور ان میں 'سچائی بھی بہت ہے۔'

نہرو کی طرح، گاندھی نے بھی آخر کار نہ صرف پاکستان کے امکان بلکہ اس کے ناگریز ہونے کا اعتراف کیا۔ انہوں نے 1942 میں ھریجن میں لکھا کہ اگر مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت ہندوستان کا بٹوارہ چاہتی ہے تو 'ان کے لئے تقسیم کی جانی چاہئے'، اور 1944 میں انہوں نے اس سلسلے میں جناح کے ساتھ بات چیت بھی کی تھی۔ مگر اس کے باوجود، جب آخری فیصلے کا لمحہ آپہنچا تو انہوں نے 3 مارچ 1947 کو ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ملاقات سے پہلے آزاد سے کہا: 'اگر کانگریس تقسیم کو قبول کرنا چاہتی ہے تو یہ میری لاش پر ہی ممکن ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میں ہندوستان کی تقسیم پر کبھی راضی نہیں ہوسکتا۔ اور نہ میں، اگر مجھ میں طاقت ہوتی، کانگریس کو اسے قبول کرنے دوں گا۔' آزاد کے مطابق، ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے بعد گاندھی میں زبردست تبدیلی آئی۔ اب گاندھی 'اس (تقسیم) کے خلاف اتنی شدت سے نہیں بولتے تھے اور ویسی دلیل دینے لگے تھے جو پہلے سردار پٹیل نے پیش کی تھی۔ میں نے دو گھنٹے سے زیادہ انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر انہیں متاثر نہ کرسکا۔'

راجیندر پرساد کے مطابق، 'مہاتما جی کو اندیشہ تھا کہ اسے (تقسیم کو) قبول کرنے کے نتائج تباہ کن ہوں گے... مگر جب انہوں نے محسوس کیا کہ نظم ونسق چلانے کے ذمے دار لوگوں نے پایا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا اور یہ کہ یا تو ملک کو تقسیم ہوگی یا لیگ کے ساتھ کھلی جنگ، تو انہوں نے چپ رہنے اور تقسیم کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔'

نہرو نے دوسرے دن اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ 'اس وقت اہم ترین کام ایک طاقت ور مرکزی حکومت قائم کر کے نراج اور افراتفری کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے حالات پر قابو پانا ہے۔' انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ کے آگے خود سپردگی کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کانگریس مسلسل اس بات کی حامی رہی تھی کہ کسی بھی اکائی کو ہندوستانی یونین بھی رہنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی ڈر گئی تھی اور اسی لئے اس نے ہتھیار ڈال دیئے، حالاں کہ یہ کہنا درست ہے وہ اس وقت ہر طرف چھائے ہوئے جنون سے حد درجہ پریشان تھے۔ تقسیم بے گناہ شہریوں کے قتل سے بہتر تھا۔ نہرو کے بعد سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنی پُر اثر تقریر میں 3 جون کے منصوبے کی پوری حمایت کی۔ وہ آزاد کے اس خیال سے مکمل طور پر غیر متفق تھے کہ کیبنٹ مشن منصوبہ بہتر تھا۔ انہوں نے کہا کہ 'گزشتہ 9 ماہ کے دوران عبوری حکومت کے تجربے کی روشنی میں کیبنٹ مشن منصوبے کو دیکھتے ہوئے، انہیں 16 مئی کے 'بیان' پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ اگر انہوں نے اسے قبول کر لیا ہوتا تو سارا ہندوستان اس کی راہ پر چل پڑتا۔ آج ان کے پاس 75 فیصد ہندوستان ہے جسے وہ اپنی صلاحیت کے مطابق ترقی دے کر طاقت ور بنا سکتے ہیں۔ لیگ باقی ملک کی ترقی کے لئے کام کر سکتی ہے۔'

آخر میں کانگریسی صدر آچاریہ کرپلانی نے اظہار خیال کیا:

ہندو اور مسلم فرقوں نے تشدد کی بدترین مظاہروں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے...میں نے ایک ایسا کنواں دیکھا ہے جس میں 107 عورتیں نے اپنی عزت بچانے کے لئے اپنے بچوں کے ساتھ کود گئیں۔ ایک اور جگہ، جو ایک عبادت گاہ تھی، 50 نوجوان عورتوں کو ان کے مردوں نے اسی وجہ سے مار ڈالا۔ میں نے ایک مکان میں ہڈیوں کے ڈھیر دیکھے ہیں جہاں 307 لوگوں کو، جن میں بیشتر عورتیں اور بچے تھے، حملہ آور بھیڑ نے جبراً لے جا کر بند کر دیا اور پھر زندہ جلا دیا۔ ان بھیانک تجربات نے بلاشبہ اس سوال پر میرے نقطۂ نظر کو متاثر کیا ہے۔ اراکین نے ہم پر الزام لگایا کہ ہم نے یہ فیصلہ ڈر کر کیا ہے۔ مجھے اس الزام کی سچائی کا اعتراف ہے مگر اس معنی میں نہیں جو اس کو دیئے گئے ہیں۔ خوف تلف ہونے والی زندگیوں یا بیواؤں یا یتیموں کی آہ و بکا اور چیخ و پکار یا مکانوں کے جلائے جانے کا نہیں ہے۔ خوف اس کا کہ اگر ہم یہی سب کرتے رہے، بدلہ لیتے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرتے ہوئے تو ہم دھیرے دھیرے اپنے آپ کو آدم خور اور اس سے بدتر بنا لیں گے ہر نئے فرقہ وارانہ تصادم میں، اس سے پہلے کے تشدد میں کی گئی بہیمانہ اور ذلیل حرکتیں ایک معمول بن جاتی ہیں۔'

مگر اس مرحلے پر بھی، کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ قدیم ملک کیوں تقسیم ہوا یا اس کی سرحدیں کہاں ہیں اور ان کا تعین کہاں کیا جائے گا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ ساری فضا لاکھوں لوگوں کی آہ و بکا سے گونج رہی تھی۔ یہ محض نقص کسی ایک کا تھا اور صرف صرف پنجاب اور بنگال کا۔ وہ جمی جمائی جغرافیائی اور اقتصادی ہیئتیں، قدیم ثقافتی وحدتیں جنہوں نے سیکڑوں برسوں کے دوران ایک مخصوص شناخت اور انوکھی انفرادیت حاصل کی تھی پارہ پارہ ہو چکی تھیں۔ ایک قدیم سرزمین اس کے لوگوں، اس کی تہذیب اور ثقافت کی تاریخی وحدت کو جان بوجھ کر ٹکڑے ٹکڑے جا رہا تھا۔

گورنر جنرل پاکستان

لیاقت علی خاں نے، 4 جون 1947 کو، ماؤنٹ بیٹن کے نام ایک مکتوب میں انہیں مطلع کیا کہ جناح نے اپنا ذہن بنالیا ہے، اور ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی کہ وہ 'محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کئے جانے کے لئے شاہ برطانیہ کو باضابطہ سفارش پیش کردیں۔' اس مکتوب میں یہ امید بھی ظاہر کی گئی تھی کہ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے گورنر جنرل رہیں گے۔

یہ سارا ماجرا مجموعی لحاظ سے بہت معنی خیز ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے اور کبھی ہونی ہی نہیں چاہئے تھے، اور کتنی نا قابل یقین کیوں نہ معلوم ہو مگر یہ سچ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن دونوں ملکوں کی پیدائش کے عمل کے دوران ہی، یہ یک وقت دونوں گورنر جنرل بننا چاہتے تھے۔ یہ بات از خود ظاہر ہے کہ کسی ڈومنین کا آئینی سربراہ اس ڈومنین کی وزارت کے مشوروں پر عمل کرتا ہے جس کے پاس اس کا منصب اور مہر ہوتی ہے۔ چوں کہ آزاد ڈومنین ریاستیں خود اپنی پالیسیوں اور پروگرام وضع کرتی ہیں، اس لئے ایک دوسرے سے ٹکرا بھی سکتی ہیں۔ اس صورت میں، کوئی بھی آئینی سربراہ، جو دوسری ڈومنین ریاست کا سربراہ بھی ہو، بلاشبہ سخت مخمصے میں مبتلا ہوسکتا ہے کیوں کہ دونوں حکومتیں اسے باہم متصادم مشورے بھی دے سکتی ہیں۔ اس بارے میں ماہرین قانون نے یہ رائے دی ہے: 'یہ توجیہ کہ جناح کی ایک 'سوپر گورنر جنرل' کی تجویز پر عمل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں کا گورنر جنرل مشترکہ ہو گمراہ کن ہے۔' اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن نے کرپس کے نام اپنے مکتوب میں کہا: 'مجھے ذاتی طور پر موصولہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ جناب جناح کے قریبی ساتھی اور مشیر کردہ موقف سے خوف زدہ ہیں اور یہ بات نا قابل یقین معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص کی سب کچھ حاصل کرنے کی شدید خواہش اتنی طاقت ور ہوجائے کہ اسے یہ منصب خود بہ خود حاصل ہوجانے سے کوئی آٹھ ماہ قبل ہی ''ہز ایکسلینسی'' بننے کے لئے اپنی آئندہ ڈومینین کو ہونے والے مادی فوائد کو اٹھا کر پھینک دینے پر مجبور کردے۔ جواہر لال نہرو کو اس کا پورا یقین ہے، مگر ولبھ بھائی پٹیل جناب جناح کے ارادوں کو اور زیادہ مفسدانہ قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ (جناح ہندوستان کی ڈومینین پر بری نظر رکھنے والی ایک فاشی آمریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اطمینان کا پہلا یہ ہے کہ جناح نے مجھ سے نہ صرف مشترکہ دفاعی کونسل کا سربراہ ہونے کے لئے اصرار کیا بلکہ مجھے یہ یقین بھی دلایا کہ مسلم لیگ پریس اس نئے انتظام کا استقبال کرے گا'۔

اس جانب دارانہ رائے سے حقائق کو الگ کر پانا تقریباً ناممکن ہے۔ اس معاملے میں جناح کی رائے کی کاٹ میں وی پی مینین کی رائے کا حوالہ دینا بھی آسان مگر بے سود ہوگا اور جہاں تک کچھ پالینے کی شدید خواہش کا تعلق ہے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مرض کو کون زیادہ مبتلا تھا، جناح یا خود ماؤنٹ بیٹن۔ اس کے بعد 'گورنر جنرل' کے معاملے پر لارڈ اسمے اور جناح کے درمیان 24 جولائی 1947 کو ہونے والی یہ بات چیت جسے ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف اسٹاف نے انہیں پہنچایا خاصی معنی خیز ہے: 26ے۔

پہلی بات یہ کہ جناب جناح نے بالکل عین وقت پر اعلان کیا کہ وہ خود پاکستان کا گورنر جنرل بننا چاہتے ہیں۔ اس سے وائسرائے کے لئے ایک انتہائی پریشان کن صورت حال پیدا ہوگئی اور اس کا یہ اثر بھی ہوا کہ انگلینڈ میں سیاسی رائے عامہ کے تمام حلقوں میں جناب جناح کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا۔ دوسرے یہ کہ وائسرائے نے جناب جناح سے بطور خاص کہا تھا کہ وہ اپنے پریس کو اس بات پر بغلیں بجانے سے باز رکھیں کہ کانگریس کا گورنر جنرل ایک یورپی ہونے والا ہے جب کہ پاکستان کا گورنر جنرل اس کے اپنے لوگوں میں سے ہوگا۔ جناب نے ایسا کرنے کا یقین دلایا تھا مگر اسے پورا نہیں کیا گیا۔ڈان نے عین وہی کیا جو ماؤنٹ بیٹن چاہتے تھے کہ وہ نہ کرے۔

'جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، انہوں (جناح) نے احتجاجاً کہا کہ وہ شروع سے ہی اس کے خلاف تھے ... انہیں شروع سے ہی اس کا یقین تھا۔ اور اب بھی ہے، کہ اس سے بات نہیں بنے گی۔ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہماری شکایت جناب جناح کے فیصلے پر اتنی نہیں ہے جتنی کہ اس بات پر کہ انہوں نے اس کا اظہار کرنے کے لئے عین وقت تک انتظار کیا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ سر ایرک میویل اوائل نے جون کے اوائل ہی میں جناب لیاقت علی خاں کہا تھا کہ وہ جناح کو جتنی جلد ممکن ہو پاکستان گورنر جنرل نامزد کرنے پر آمادہ کریں، اور یہ کہ اگر انہوں نے اس وقت یہ صاف صاف اور حتمی طور پر کہہ دیا ہوتا کہ وہ خود گورنر جنرل ہونا چاہتے ہیں تو اتنی زیادہ غلط فہمی اور پریشانی سے بچا جاسکتا تھا۔ جناب جناح بار بار یہی کہتے رہے کہ انہوں نے وائسرائے کو یہ سمجھنے کی ذرا بھی وجہ فراہم نہیں کی کہ وہ ایک مشترکہ گورنر جنرل کی بات سے متفق ہیں اور (لہٰذا) اس بحث کو جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'

اس کے بعد اس نے مسلم لیگ پریس کے سوال پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا اور مسلم پریس نے کانگریس پریس کی طرف سے جناح پر اس بات کے لئے حملہ کئے جانے سے پہلے تک خوشیاں نہیں منائیں کہ انہوں نے پہلے تو ایک مشترک گورنر جنرل کی تجویز مان لی مگر بعد میں اس سے مکر گئے۔ یہ ایک ناقابل برداشت اور غلط الزام تھا جس کا جواب دیا جانا ہی تھا۔ میں نے کہا کہ میں لندن گیا ہوا تھا اور میں متعلقہ مضامین نہیں دیکھے ہیں۔ لہٰذا میں اس بحث کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

'ہماری بات چیت کی تھوڑے پریشان کرنے والی نوعیت کے باوجود ہماری ملاقات کے دوران ماحول حد درجہ خوش گوار رہی۔'

'جب جناب جناح اٹھ کر جانے لگے تو وہ رکے، اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا اور بڑے خلوص سے کہا: 'میں آپ سے وائسرائے کو یہ یقین دلانے کے لئے التجا کرتا ہوں کہ میں ان کا اور آپ کا دوست ہوں۔ اب بھی اور ہمیشہ کے لئے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ وہ انہیں میرے بارے میں میرے الفاظ نہیں بلکہ کاموں کی بنیاد پر رائے قائم کرنی چاہئے'27۔

یہ اس زبردست اور تاریخی اہمیت نے حاصل سانح کے بیان نے چند حصے تھے جس نہ ماؤنٹ بیٹن کو اتنی گہرائی

سے پریشان کیا کہ انہوں نے اس وقت ہندوستان میں ہر طرف برپا ہونے والے لرزہ خیز واقعات کے درمیان، اپنے خاص اسٹاف افسر کو ان بے انتہا واقعات کی ایک دستاویزی روداد قلم بند کرنے کی ہدیت دی۔ جن میں 'برطانوی پرچم' کا معاملہ بھی شامل تھی۔ اب تقریباً ساٹھ سال گذر جانے کے بعد ان دستاویزات کو، جو ہندوستان اور پاکستان کے لئے ماؤنٹ بیٹن کے ترکے کا حصہ ہیں، دوبارہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سارے ملک کو بے پناہ الم ناک حالات نے مفلوج کر رکھا تھا اور ہر قصبے اور شہر سے موت کا ایک بھیانک جلوس گزر رہا تھا، لوگوں کو خوف زدہ کرتا ہوا، تو ایسے میں بھی ماؤنٹ بیٹن کا ذہن کن معمولی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

اس پسمنظر میں، محمد علی جناح آخرکار اس سرزمین سے رخصت ہوئے جس نے انہیں پروان چڑھایا تھا'... ہم نے 7 اگست کو نیول اے ڈی سی احسن، محترمہ فاطمہ اور قائد کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن کے سفید ڈکوٹا طیارے پر کراچی کے لئے اڑان بھری - چند مٹھی بھر لوگ ہی انہیں الوداع کہنے آئے تھے۔ ہیکٹر بولیتھو اپنی کتاب ان کوئینٹ آف جناح میں مزید کہتا ہے کہ 'جناح نے گھر چھوڑنے سے پہلے مجھے دستاویزات سے بھری ایک بینت کی ٹوکری دی جسے طیارے تک پہنچانا تھا۔ پرواز سے پہلے، وہ فوٹو کھنچوانے کے لئے باہر نکلے، مگر کچھ بولے نہیں۔ طیارہ روانہ ہوا تو انہوں نے صرف ایک جملہ ادا کیا: سرگوشی کے انداز میں انہوں نے کہا کہ 'سب ختم ہو گیا'۔ میرے نزدیک اس کا مفہوم تھا ہندوستان کی سرزمین پر چلنے والی جدو جہد کا خاتمہ'۔ ہمیشہ کی طرح اپنے بہترین لباس میں تھے، ایک سفید شیروانی اور جناح ٹوپی، سیاہ چشمہ، مس جناح آگے بیٹھی تھی اور میں قائد کے سامنے تھا۔ ان کے پاس اخبارات کا ایک بہت بڑا بنڈل تھا اور ساری پرواز کے دوران انہیں پڑھتے رہے۔ اسی دوران وہ صرف ایک بار بولے۔ انہوں نے مجھے چند اخبارات دیتے ہوئے کہا، '' کیا تم انہیں پڑھنا چاہو گے؟''

'چار گھنٹے کے سفر کے دوران، جو ان کی زندگی کے اہم ترین چند گھنٹے کہے جا سکتے ہیں، انہوں نے صرف اتنی سی بات کی... ہم شام تو کراچی پہنچے، اور جب ہم مدوی پور پر سے پرواز کر رہے تو جناح نے نیچے دیکھا اور انہیں ہزاروں لوگوں کو، جن میں بہت سی عورتیں بھی شامل تھیں، ریت پر انتظار، کرتے ہوئے دیکھا، ان کا استقبال کرنے کے لئے... اس پر بھی ان کے باؤ بھاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ کچھ نہ بولے۔ وہ سب سے پہلے طیارے سے برآمد ہوئے، مس جناح ان کے پیچھے تھیں۔ تمام بڑی مسلم شخصیات ان کی منتظر تھیں۔ انہوں نے ان میں سے چند لوگوں سے مصافحہ کیا اور پھر موٹر کار میں جا بیٹھے۔'

ہزاروں لوگ 'پاکستان زندہ باد' 'قائداعظم زندہ باد' کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس پر بھی انہوں نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے، اور ایک لفظ بھی بولے بغیر، پہلی بار، گورنمنٹ ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ دو تین دن بعد وہ 'ہاؤس' کے بائیں سے دائیں جانب کے مکان میں منتقل ہو گئے۔'

محمد علی جناح 7 اگست 1947 کو دہلی سے کراچی اور اپنے مفروضہ پاکستان کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہیں پھر کبھی ہندوستان واپس نہیں آنا تھا۔ اگلے دن، پٹیل نے دہلی میں آئین ساز اسمبلی میں کہا، 'ہندوستان کے جسم

سے زہر نکالا جا چکا ہے۔ اب ہم ایک اور نا قابل تقسیم ہیں۔ آپ سمندر یا ندیوں کے پانی کو نہیں بانٹ سکتے۔ جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے، ان کی جڑیں یہیں ہیں، ان کے مقدس مقامات اور ان کے مراکز بھی یہاں ہیں، میں نہیں جانتا کہ وہ پاکستان میں پر کیا کر سکیں گے۔ زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ انہیں پلٹنا ہوگا... '28

ہندوستان 'واپسی' کی یہ صدائیں جو اس وقت بار بار لگائی جا رہی تھیں پاکستان کے لئے ایک طرح کا چیلنج بن گئیں؟ پاکستان کا موجود، برقرار رہنا ہی اس وقت سب سے بڑا مقصد تھا، اور 'اب بھی وہیں ہونا' ہی اس کی 'کامیابی' کا پیمانہ بن گیا تھا۔ بعد میں، وزیر اعظم نہرو نے اپنے بھتیجے جی کے نہرو سے بات چیت کے دوران اسی ماحول کے حوالے سے حسرت آمیز لہجے میں کہا، 'دیکھتے ہیں کہ وہ کب تک الگ رہ پاتے ہیں'۔ پاکستان میں بھی ایسی باتوں کو چوکنے پن کے ساتھ سنا جا رہا تھا، اس لئے نہرو پٹیل جیسے ہندوستانی رہنماؤں کے ایسے بیانات کے باوجود، پاکستان کا محض برقرار رہنا 'ریاست کی حیثیت سے 'پاکستان کی' کامیابی' اہم اور بعض اوقات واحد پیمانہ بن گیا۔

تقسیم کے منظر نامے پر دوبارہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'برابری' کا اصول مسترد ہو چکا تھا جس کا بلاشبہ ایک جواز تھا۔ پھر بھی ایک ذرا معروضی غور و فکر ظاہر کر سکتا تھا کہ جب ہندوستان اور پاکستان علاحدہ ملک بن جائیں گے (جو بالآخر بنے) تو پھر دو اقتدار اعلائے حامل ملکوں کی حیثیت سے انہیں قوموں کی برادری میں مساوی مقام حاصل ہو جائے گا۔ مگر یہ بات نظری طور پر درست ہونے کے باوجود عملاً پوری طرح مستحکم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد یہ عدم مساوات بجائے خود ایک اختلافی معاملہ بن گئی۔ وی پی مینین کہتے ہیں: 'یہاں تک کہ قوم پرست مسلمانوں نے اپنے فرقے کے لئے جو تحفظات طلب کئے تھے وہ بھی ایسے تھے کہ وہ (مسلمان) ایک متحدہ قوم کی تشکیل نہ ہونے دیتے'؛29 کانگریس کی جانب سے ہندوستان میں 'برابری' کا اصول مسترد کر دیئے جانے کے بعد، یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اسے عملاً بھی مسترد کر دیا جائے گا۔ یہ بات تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان، کسی قانونی یا آئینی طور پر قابل نفاذ اصول کی طرح تو نہیں مگر ایک حقیقت کی اصول توسیع کے طور پر موجود رہی ہے۔

کانگریس کو تقسیم کو قبول کرنے کی طرف جانے والا ایک اور سبب بھی یہاں ذکر کیا جانا چاہئے۔ یہ کہا گیا تھا کہ عبوری حکومت ہم آہنگی کے ساتھ اور ایک کابینہ کی حیثیت سے کام نہیں کر سکی کیوں کہ نہرو نے، جو محض ایک عبوری حکومت کے سربراہ تھے، وزیر اعظم جیسا رویہ اختیار کر لیا۔ یہ صورت حال لیاقت علی خاں کے وزیر مالیات ہونے کی وجہ سے بدتر ہو گئی کیوں کہ انہوں نے منصوبوں کو جان بوجھ کر ناکام کیا۔ عبوری حکومت کے ہم آہنگی کے ساتھ کام نہ کر پانے کی سب سے بڑی وجہ نہرو کی خواہش تھی کہ انہیں 'ڈومینین کابینہ کا بالفعل وزیر اعظم مانا جائے'؛ ایک ایسا دعوا تھا جس کی مسلم لیگ نے سخت مخالفت کی اور ہز مجسٹیز گورنمنٹ نے جسے کبھی تسلیم نہیں کیا'۔

15 اگست 1947 30

تقسیم کے ناگزیر ہو جائے اور کانگریس اور مسلم لیگ کی طرف سے اسے تسلیم کر لئے جانے کے بعد کیا اس تباہ کن عجلت کا کیا جواز تھا جس کے ساتھ اقتدار کی منتقلی کی تاریخ جون 1948 سے پیچھے کر کے پہلے اکتوبر 1947 اور پھر 15 اگست 1947 کی گئی ماؤنٹ بیٹن نے 15 اگست 1947 کا انتخاب کیوں کیا؟ مجھے رخصت ہونے والے وائسرائے کا جواب سرسری اور توہین کن معلوم ہوتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن سے متعلق ایک کتاب 31 میں ان کے حوالے سے کہا گیا ہے: 'وہ تاریخ جس کا انتخاب میں کیا بس اچانک ہی آ گئی۔ اس کا انتخاب میں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کیا۔ میں نے یہ دکھانے کا تہیہ کر لیا تھا کہ سب کچھ صرف میری مرضی سے ہو رہا ھے۔ جب انہوں نے پوچھا کہ کیا ہم نے کوئی تاریخ مقرر کر لی ہے تو میں نے جان لیا کہ اب یہ کرنا ہی ہوگا۔ اس وقت میں نے اس کے بارے میں ٹھیک سے کچھ نہیں سوچا تھا، بس یہ خیال تھا کہ یہ اگست یا ستمبر ہونا چاہئے اور تبھی میں نے 15 اگست کو مقرر کر لیا۔ کیوں؟ کیوں کہ یہ جاپان کی خود سپردگی کے دوسرے سالانہ یوم کی تاریخ تھی۔' 32 یہ بات ماؤنٹ بیٹن کی بے حسی، لاپروائی کے ساتھ جھوٹ بولنے کی خوف ناک عادت اور ایک نہایت سنگین اور پہلے کبھی نہ ہونے والے المیے کی طرف ان کے گھٹیا رویے کا مظہر ہے۔

اس بیان کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ یہ کوئی بیس پچیس سال پہلے کے واقعات کے ٹھیک سے یاد نہ رہ جانے کا معاملہ نہیں ہے۔ '15 اگست 1947 کو، جب نئی دہلی میں یوم آزادی منایا جا رہا تھا'... لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے امریکہ کو، جاپان پر اتحادی طاقتوں کی فتح کی دوسرا یوم سالانہ منانے کے لئے، ایک نشریہ جاری کیا، (انہوں) نے کہا: دو سال پہلے آج کے ہی دن، میں پوٹس ڈیم کانفرنس سے لوٹا تھا اور 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ میں وزیر اعظم کے کمرے میں موجود تھا، جب جاپان کی خود سپردگی کی خبر موصول ہوئی۔ آج کی شام جب آپ سے مخاطب ہوں تو دہلی میں ایک ایسی تقریب یعنی ہندوستان کا یوم آزادی منا رہے ہیں جس کی اہمیت دینا مستقبل کے لئے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔'

یہ بات کہ 15 اگست 1947 کو جاپان کی خود سپردگی کا دوسرا یوم سالانہ تھا ماؤنٹ بیٹن کے لئے ذاتی اہمیت کی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا اس وقت کی ان کی ذمے داری سے قطعاً کوئی تعلق اور مطابقت نہیں تھی، اور ان کو ذمے داری سونپی گئی تھی کہ 'اقتدار کی منتقلی کم سے کم خون خرابے اور بہتری کے ساتھ انجام دی جائے'۔ ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کر لیا کہ ان کی طرف سے مقرر کی گئی تاریخ ان پر اس نکتہ چینی کا سبب بن رہی ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر خون خرابے اور خلفشار کے لئے وہی ذمے دار ہیں۔ ستمبر 1948 کو تیار کی گئی سرکاری سرکاری کے اختتامیے کے پیراگراف 17 میں، ماؤنٹ بیٹن نے 15 اگست کا انتخاب کرنے کے پانچ اسباب بیان کئے ہیں مگر ان میں سے کسی میں بھی جاپان کی خود سپردگی کے دوسرے یوم سالانہ کا کوئی ذکر نہیں ھے۔ 33 تو پھر ماؤنٹ بیٹن کی یہ حیلہ طرازی کیوں؟ اور یہیں یہ خوف ناک سوال پیدا ہوتا ہے: 'کیا ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ بددیانتی کی؟'

10

پاکستان کا جنم: قائد اعظم کا آخری سفر

وقت آ گیا ہے کہ ہم قائدِ اعظم کے ساتھ پاکستان چلیں۔ محمد علی جناح 7 اگست 1947 کو ہندوستان سے کراچی کے لیے آخری بار روانہ ہوئے۔ اور اس کے بعد کبھی واپس نہیں آئے حالاں کہ ان کی خواہش آخر تک بمبئی میں اپنے گھر لوٹنے کی رہی۔ جاتے وقت انہوں نے ہندوؤں سے ماضی کو بھلا دینے کی گزارش کی اور ہندوستان کے لیے کامیابی و کامرانی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اس وقت پاکستان میں عام خیال تھا کہ قائدِ اعظم اب اپنی زندگی کے سفر کے آخری مراحل میں ہیں، حالاں کہ پاکستان سے متعلق کئی سوال پہلے سے ہی اٹھائے جانے لگے تھے کہ 'کیا یہ وہی پاکستان ہے، جس کی ہم نے آرزو کی تھی۔ گورنر جنرل محمد علی جناح کے ملٹری سیکریٹری میجر جنرل شاہد حامد نے اس سوالات کا تجزیہ اپنے ڈیز از ٹرس ٹوائی لائٹ:-اے پرسنل ریکارڈ آف دی پارٹیشن آف انڈیا میں کیا ہے۔ 1

13 اگست 1947

'کراچی میں آج جشن جشن کا سماں ہے لیکن ان سیکڑوں نامہ نگاروں اور مہمانوں کے لیے جگہ بہت کم ہے جو ریاست پاکستان کو جنم لیتے ہوئے دیکھنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ کرنل مجید ملک، جی-ایچ-کیو، جو ہندوستان میں رابطہ عامہ کے ڈائرکٹر رہے، اب پاکستان کے چیف انفارمیشن آفیسر بنے ہیں۔ انہیں حد درجہ پریشان کیا جا رہا ہے۔ تمام اخباری نامہ نگار اس صورت حال 'ناممکن' سمجھ رہے ہیں۔ پاکستان میں ابھی کوئی حکومت نہیں ہے لیکن اسے راتوں

رات بنایا جارہا ہے۔کوئی سرکاری دفتر نہیں ہے، کوئی وزارت نہیں ہے اور نہ ہی دفتروں کے لیے کوئی فرنیچر ہے اور نہ ہی اسٹیشنری، اور جہاں تک ٹائپ رائٹر کا سوال ہے اسے تو ایک عیش ہی سمجھئے۔ وائسرائے کو پوری طرح یہ امید تھی کہ 13 اگست تک کراچی پوری طرح سے ملک کی پہلی راجدھانی کے طور پر تیار ہوجائے گی اور (ہز میجسٹی) بادشاہ کے نمائندے کا استقبال کرنے کی حالت میں ہوگی۔

'پہلی تقریب گورنر جنرل کی قیام گاہ پر دعوت کی تھی جہاں تقریباً پچاس مہمان مدعو تھے۔ ماحول میں کافی گرمی تھی۔ قائدِ اعظم نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ میں اب سوچتا ہوں کہ یہ واحد موقع تھا جب انہوں نے ہز مجیسٹی کے لئے ایک خوشی کا جام (ٹوسٹ) کا تجویز کیا۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے باقاعدہ کنگ کی طرف سے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور پھر وہ ایک لمبی تقریر میں الجھ کر رہ گئے جو ایسے موقعوں پر عام طور پر نہیں کی جاتی۔ دیگر باتوں کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لوگ اکثر حیرت کرتے ہیں کہ وہ اقتدار کی منتقلی کی تاریخ کو پیچھے کیوں لے آئے؟ پھر یہ کہتے ہوئے ایک مسکراہٹ کے ساتھ بچکانے انداز میں بولے کہ کسی بچے کو سائیکل چلانا سکھانا ہے تو اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے ایک پہاڑی کی چوٹی پر لے جاؤ سیٹ پر بٹھاؤ اور پہاڑی کے نیچے سائیکل کو دھکیل دو۔ جب تک وہ نیچے سپاٹ زمین پر پہنچے گا اسے سائیکل چلانا آچکا ہوگا۔

کھانے کے بعد جس کا سلسلہ تک چلا تھا، باہر باغیچہ میں ایک تقریب استقبالیہ کا اہتمام تھا۔ اس میں تقریباً ایک ہزار مہمان رہے ہوں گے۔ قائدِ اعظم پرسکون اور مطمئن نظر آرہے تھے۔ میں ان کے پاس جاکر بغیر چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرائے۔ جسمانی طور پر وہ بہت کمزور، بہت تھکے ہوئے اور اپنے آپ میں کھوئے سے نظر آرہے تھے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ شائد وہ چاہتے ہیں کہ استقبالیہ تقریب جلد از جلد سمیٹ لی جائے مگر ماؤنٹ بیٹن جانے کے موڈ میں بالکل نظر نہیں آرہے تھے اور مہمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی پوری کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

میں اس وقت قائدِ اعظم سے دور نہیں کھڑا تھا جب انہوں نے اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو بلایا اور ماؤنٹ بیٹن سے یہ گزارش کرنے کو کہا کہ اب انہیں اب رخصت ہونا چاہئے کہ وہ (جناح) ان سے عاجز آچکے ہیں۔ بے چارے اے۔ ڈی۔ سی۔ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اس لئے مشورہ لینے میرے پاس آگیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن سے ٹھیک وہی کہے جو قائدِ اعظم نے اس سے کہا ہے۔ اسے حوصلہ دینے کے ئے میں نے یہ بھی کہا کہ 'میں بھی ساتھ چلتا ہوں،' ہم ماؤنٹ بیٹن کے پاس گئے اور انہیں جناح کا پیغام دے دیا۔ وہ پہلے تو بھونچکے رہ گئے پھر سنبھلتے ہوئے بولے، 'سچ مچ مجھے یہ تو محسوس کرنا چاہئے تھا کہ کتنی دیر ہوگئی ہے اور مسٹر جناح تھک گئے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ قائدِ اعظم کے پاس گئے۔ ان سے معزرت کی اور رخصت ہوئے۔ یہ بھی کیسا دن تھا۔

14 اگست 1947

آج کی صبح ناخوش گوار رہی کیوں کہ آج ہی ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کے ساتھ ایک گھٹیا چال چلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے قائدِ اعظم کو یہ کہلوا دیا کہ دہلی میں خفیہ ذرایع سے پتہ چلا ہے کہ کراچی میں عوامی جشن کے دوران قائدِ اعظم کی گاڑی پر بم پھینکا جائیگا۔ اس لئے انہوں نے قائدِ اعظم کو سفر ملتوی کر دینے کی صلاح دی۔ جناح نے ایاس کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر ماونٹ بیٹن نے کہا کہ اچھا وہ ایک جند کار میں سفر کریں۔ جناح نے ماونٹ بیٹن کی بھی عمل کرنے سے انکار کر دیا۔

سارے راستے دیردست جوش و خروش اور خوشی کا ماحول تھا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک خواب حقیقت کا روپ لے رہا تھا۔ ایک نیا ملک بن رہا تھا۔ قائدِ اعظم کا نام ہر کسی کی زبان پر تھا، ساتھ ساتھ پروردگار کا شکر بھی ادا کیا جا رہا تھا۔ بعد میں ماونٹ بیٹن نے اپنے عملے سے کہا کہ جناح بہت تناؤ میں تھے اور ان کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔ میں جناح کو انہوں نے 'مضحکہ خیر توپ' قرار دیا۔

جناح پر کرسٹوفریشل کی فلم میں ایک خاص سین ہے۔ گورنر جزل جناح اور ماونٹ بیٹن جشن کے دوران ایک ہی کھلی گاڑی میں سوار تھے۔ واسرائے شاہی میں اپنے تمام تمغوں کے ساتھ نظر آ رہے تھے جبکہ تھکے ہوئے سے قائدِ اعظم اپنے بحریہ کی وردی لباس میں تھے۔ ماونٹ بیٹن مالک کی طرح لوگوں کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے، ان کا سلام قبول کر رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر جناح پچھلے کئی دنوں کی تھکن، بیماری، بے حد اس بھری گرمی اور چہچہاہٹ کے، باوجود اچانک تن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شاید یہ جتانے کے لئے کہ قائد اعظم وہ ہے، ماؤنٹ بیٹن نہیں۔

پاکستان بننے کے بعد صرف 13 ماہ میں ہی ازاد پاکستان کے پہلے گورنر جزل قائدِ اعظم محمد علی جناح کا انتقال ہوگیا۔ ان کی موت کے ساتھ ہی پاکستان کے قیام میں آنے کا پیاری متحرک بھی فوت ہوگیا۔ پیدائش کے فوراً بعد ہی ایک بچے کے مانند یہ ملک یتیم ہوگیا۔ یہ بہت بڑا دکھ اور نا قابلِ تلاش نقصان تھا جس سے پاکستان آج تک نکل نہیں پایا ہے۔ قائدِ اعظم کے آخری سفر کی منظر کشی ڈاکٹر الٰہی بخش نے جس طرح کی ہے وہ پڑھنے والے کو بے چین کر دیتی ہے اور یہ تحریر اتنی بھرپور ہے کہ اس میں سے کس حصے کو خذف دینا یا کم کر دینا ناانصافی ہوگی۔

جناح کے ذاتی معالج ڈاکٹر الٰہی بخش نے اپنی کتاب 'ود قاعد اعظم ڈیورنگ ہز لاسٹ ڈیز' میں دل و دماغ کو بے چین کر دینے والی تفصیل پیش کی ہے۔ وہ ان کے آخری سفر کو 'زیارت' سے شروع کرتے ہیں 2 جہاں جناح آرام کرنے اور اپنے موزی مرض سے جہاں تک ممکن بچنے کے لئے گئے تھے۔ دق کا مرض ان کے جسم میں پھیل چکا تھا ڈاکٹر الٰہی بخش لکھتے ہیں: 'یقین تھا کہ سارے انتظام ہو چکے ہیں۔ ایمبولینس کے ساتھ ایک نرس ہوائی اڈے پر ہماری منتظر ہوگی۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے تھے لیکن ایک بجے تک ہمارے روانہ ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ پیکنگ ایک بج کر بیس منٹ تک پوری ہوئی وار میں مس جناح کے کہنے پر قائداعظم کو مطلع کرنے گیا۔ جیسے ہی میں نے ان کے کمرے میں قدم رکھا، انہوں نے میری طرف دیکھا جس پر میں نے سلام کیا۔ انہوں نے میری طرف ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور مجھے ایک کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا جس پر میں بیٹھ گیا، پھر یہ گفتگو شروع ہوئی۔

''سر، کیا اب آپ کراچی جانا پسند کریں گے؟'

'مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'

'ہم ہوائی جہاز سے چلنے کے لئے تیار ہیں، کیا آپ چند ہی منٹوں میں نکلنا پسند کریں گے؟'

قائداعظم نے سر ہلایا اور ایک کمزور آواز میں کہا

''ٹھیک ہے۔''

میں نے راحت محسوس کی لیکن مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ ایسی کون سی بات تھی جس نے ان کے کراچی جانے کی پرانی ضد کو اتنی آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ کر دیا۔ ہم نے اپنی یہ تہیں بتایا تھا کہ ان کی حالت کتنی نازک ہے، تو پھر یہی ہو سکتا ہے انہوں نے مایوس ہو کر خود ہی اپنی جائے پیدائش کی طرف چلنے کا فیصلہ کر لیا ہو میں جا کر مس جناح کو بتایا کہ قائد اعظم فوراً روانہ ہونے کو راضی ہو گئے ہیں۔ کچھ ہی منٹوں میں ہم نے انہیں ای ایمبولینس میں منتقل کر دیا۔ مس جناح اور نرس پچھلی نشست پر بیٹھی تھیں جب کہ لفٹیننٹ مظہر کے ساتھ میں سامنے ڈرائیور کے بغل میں بیٹھا تھا۔

جیسے ہی ایمبولینس روانہ ہوئی میں نے محسوس کیا کہ ہم نے کتنا نازک قدم اٹھایا ہے۔ دماغ میں طرح طرح کے وسوسوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی میں پاک پروردگار سے دعا کرنے لگا کہ یا اللہ قائداعظم کا سفر آرام دہ ہو سکے۔ اس دعا سے مجھے سکون ملا۔ پھر بھی میں ان ضرورتوں کی طرف سے فکر مند تھا جو مجھے راستے میں پڑ سکتی تھیں۔ اب دور سے ہی ہمیں گورنر جنرل کا وائکنگ نظر آنے لگا جو سورج کی تیز روشنی میں چاندی کی چڑیا کے مانند چمک رہا تھا۔

دو بجے تک ہم ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ جب قائداعظم کو اسٹریچر پر لٹا کر ہوائی جہاز میں لے جایا جا رہا تھا وہاں موجود عملے نے انہیں سلام کیا۔ ہمیں بہت تعجب ہوا جب قائد نے فوراً ہی سلام کا جواب دیا۔

ستمبر کا مہینہ تھا اور بہت زیادہ لیس بھرا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے یعنی گرمی اور امس کے ان لمحوں میں ہوائی سفر وقت طلب تھا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش آگے لکھتے ہیں: جہاز میں بہت گرمی تھی۔ مس جناح، ڈاکٹر مستری اور نرس، سامنے والے کیبن میں تھے اور مسٹر امین اور لفٹیننٹ مظہر کے ساتھ میں اگلے کیبن میں بیٹھا تھا۔ جہاز اڑنے کے کچھ ہی منٹوں بعد، میں نے ڈاکٹر مستری کو کیبن سے باہر آتے دیکھا اور میرا دل ڈوبنے لگا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر میری فکر

دور کردی کہ مس انہیں جناح میا ہر بھیجا ہے اور ضرورت پڑنے پر بلا لیں گی۔ وہ میرے سامنے ہی یک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سات ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے تھے اور میں شیشے کی کھڑکی سے کوئٹہ کی پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی بیچ کا دروازہ کھلا اور مس جناح نے بتایا کہ ہوائی جہاز کے ہچکولوں کی وجہ سے نرس کی طبیعت خراب ہوگئی ہے اور قائداعظم ان کے ہاتھوں سے آکسیجن نہیں لے رہے ہیں۔ میں فوراً ہی کیبن میں گیا اور ان کی نبض دیکھی وہ ٹھیک تھی پھر میں نے سائنوسیس کے لئے ان کے ناخن دیکھے سب کچھ ٹھیک ملا اس طرح میں نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے بعد آکسیجن دینا شروع کی لیکن جب بھی میں ماسک کو ان کے منہ کے قریب لے جاتا وہ میرے ہاتھ کو ہٹا دیتے لیکن جب میں نے انہیں سمجھایا کہ اس وقت ان کی جو حالت ہے اس کے لئے یہ بہت ضروری ہے تو انہوں نے میری طرف دیکھا، مسکرائے اور مجھے ماسک لگانے کی اجازت دے دی۔ وہاں میرے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن دونوں کیبنوں کے درمیان سیڑھیوں پر دروازے کی طرف پیٹھ کر کے میں نے اپنے لئے جتنی بھی جگہ بنا سکتا تھا بنا لی اور بیٹھ گیا۔ قائد اعظم نے پانچ منٹ تک آکسیجن لی اور پھر ماسک ہٹانے کی کوشش کرنے لگے لیکن جب بھی میں ان کو منع کرتا وہ مسکراتے اور اسے درست کرنے دیتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں ان کی نبض دیکھتا اور ان کے ناخنوں کے رنگ کو اپنے ناخنوں کے رنگ سے ملاتا۔ وہ بے چین ہو جاتے اور کمبل ہٹانے کی کوشش کرتے لیکن مس جناح انہیں دوبارہ کمبل اوڑھا دیتیں۔ بیس منٹ تک اسی تکلیف دہ حالت میں بیٹھنے کے بعد مجھے کچھ دیر آرام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مس جناح نے بھی میری یہ حالت دیکھی اور مجھے آرام کرنے کو کہا اور خود ہی آکسیجن دینے لگیں۔ چوں کہ وہ کوئٹہ سے ہی ٹھیک طرح سے آکسیجن دینے کا کام کر رہی تھیں، اس لئے میں اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ اس وقت لفٹیننٹ مظہر کے علاوہ سبھی گہری نیند میں تھے اور خراٹے لے رہے تھے۔

مجھے وہاں سے ہٹے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ مس جناح پھر آئیں اور مجھ سے آکسیجن دینے کو کہنے لگیں کہ ان کے بھائی آکسیجن نہیں لے رہے تھے۔ میں فوراً ہی اندر گیا اور اگلے بیس منٹ تک انہیں آکسیجن دیتا رہا۔ اس وقت تک ہم پہاڑیوں کو پیچھے چھوڑ چکے تھے اور چار سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے تھے، اس لئے میں نے انہیں مزید آکسیجن دینا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے کیبن میں لوٹ آیا۔ سفر کا سب سے زیادہ مشکل اور خطرناک حصہ تو بیت چکا تھا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے سندھ کے سیلاب زدہ علاقوں کی طرف دیکھا اور اپنے نومولود ملک کے لئے دشمن کے مانند قدرتی آفات پر بھی غور کیا'۔ پھر مزید پریشانیاں بعد میں آئیں۔

کراچی میں

'ہم شام سوا چار بجے موری پور ہوائی اڈے پر اترے اور میرے دماغ سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ جیسے ہی میں جہاز سے باہر آیا میں نے گورنر جنرل کے ڈیفنس سکریٹری کرنل نولس کو ایمبولینس کے ساتھ کھڑے دیکھا، لیکن کوئی نرس

نہیں دکھائی دی۔ کراچی میں گرمی تھی لیکن اب پریشانی نہیں محسوس ہو رہی تھی کیوں کہ ہوا کافی تیز چل رہی تھی۔ ہم نے فوراً ہی قائداعظم کو ایمبولینس میں لٹا دیا۔ فاطمہ جناح اور کوئٹہ سے آئی نرس بھی ایمبولیسن میں سوار ہو گئیں۔ ڈیفنس سکریٹری، ڈاکٹر مستری وار میں گورنر جنرل کی کیڈی لاک میں پیچھے پیچھے چلے۔ سامان اور نوکر ہمارے پیچھے والے ٹرک میں تھے۔ ہم ہوائی اڈے سے 9 سے 10 میل فاصلے پر واقع گورنر جنرل کی رہائش گاہ کی طرف کافی کم رفتار سے جا رہے تھے۔ ہم بہ مشکل چار میل دور ہی گئے ہوں گے کہ ایمبولینس رک گئی۔ ''کیا ہوا؟'' اس کے رکنے پر میں حیرت زدہ وہ کر باہر نکلا۔ معلوم ہوا کہ ایمبولینس کا انجن خراب ہو گیا ہے لیکن ڈرائیور نے یقین کے ساتھ کہا کہ وہ جلد ہی اسے ٹھیک کر لے گا اور تقریباً بیس منٹ تک وہ انجن کے ساتھ لگا رہا مگر اسے ناکامی ہوئی اور وہ اسے ٹھیک نہیں کر سکا۔ تب میں جناح نے ڈیفینس سکریٹری کو دوسری ایمبولینس لانے کے لئے بھیجا اور ڈاکٹر مستری بھی ان کے ساتھ گئے۔ ایمبولینس کے اندر کی صورحال بڑی تکلیف دہ تھی۔ نرس اور ملازمین کے لگاتار پنکھا جھلنے کے باوجود قائداعظم کو بے حد پسینہ آ رہا تھا۔ پھر ہم نے انہیں بڑی کار میں لے جانے کی کوشش کی لیکن اسٹیچر اندر نہیں لایا جا سکتا تھا اور وہ اتنے کمزور تھے کہ انہیں سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر بٹھایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے کپڑے تب تک پسینے سے پوری طرح بھیگ چکے تھے اور تیز ہوا کے چلنے سے نہیں ہوا لگ جانے کا بھی خدشہ تھا۔ میں نے ان کی جانچ کی اور ان کی نبض کو کمزور اور بے ربط پا کر گھبرا گیا۔ پھر میں دوڑ کر ٹرک کے پاس گیا اور اس میں سے گرم چائے والا ایک تھرمس لے آیا۔ میں جناح نے انہیں فوراً ایک کپ چائے دی۔ یہ دن میں پہلا موقع تھا جب انہوں نے کھایا پیا تھی کیوں کہ ابھی تک انہوں نے پھل کے رس کے چند گھونٹ کے علاوہ ہر چیز سے اکار کر دیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ ایک اطمینان بخش بات ہے۔ اب تک ایمبولینس کے بند ہو جانے کے علاوہ ہر بات مریض کے حق میں جا رہی تھی اور مجھے خیال آ رہا تھا کہ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو گی کہ ہوائی سفر کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے ہی ختم۔ میں نے بڑھتی ہوئی بے قراری کے ساتھ پھر سے ان کی نبض دیکھی، چائے نے انہیں سنبھال لیا تھا اور خوش قسمتی سے نبض مضبوط اور ٹھیک سے چل رہی تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں بیچ بیچ میں میری نظر شہر کی طرف اٹھتی لیکن ایمبولینس کا کوئی نام و نشان نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ کئی بسیں اور ٹرک ادھر سے اُدھر گزرے لیکن ان میں کوئی بھی محفوظ طریقے سے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں وہاں خود کو پوری طرح بے بس اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔ ایک بہت لمبے اور تکلیف دہ انتظار کے بعد آخر کار ایک ایمبولینس پہنچی۔ ہم نے فوراً قائداعظم کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور رکا ہوا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ایمبولینس پر گورنر جنرل کا جھنڈا نہیں لہرا رہا تھا اس لئے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ قائداعظم کو کراچی کی گلیوں سے نازک حالت میں لے جایا جا رہا ہے۔''

یہ پاکستان کے گورنر جنرل کے ذاتی معالج کی گہرے دکھ کے ساتھ لکھی گئی تحریر ہے۔ جناح نوزائیدہ آزاد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے۔ اس وقت بہت زیادہ کمزور اور نازک حالت میں قائداعظم کی حیثیت سے، ہوائی جہاز سے پاکستان کی پہلی راجدھانی کو جا رہے تھے۔ ان کے لوٹنے پر ہوائی اڈے پر ان کا پژمردہ سا استقبال، اک عجیب سا

ماحول، ایمبولینس کا راستے ہی میں خراب ہو جانا جس میں پاکستان کے خالق قائد اعظم کا سڑک پر تقریباً تن وتنہا پڑے رہنا، بسوں، ٹرکوں کا آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک ان سے لاتعلق گزرتے رہنا۔ اس روداد میں کچھ ہے جو اندر تک ہلا دینے والا اور کرب ناک ہے۔

''موری پور پر اترنے کے تقریباً دو گھنٹے بعد چھ بج کر دس منٹ پر ہم اپنے مقام پر پہنچے۔ سفر ٹھیک سے مکمل ہو جانے پر میری راحت اور سکون کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کیوں کہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا تھا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کی یہ دو عظیم شخصیتیں، کاٹھیاواڑ کے دو عظیم سپوت '' انز آف کورٹ (Inns of Court) سے قانون کا علم حاصل کرنے والے، 19 ویں صدی کے برطانیہ کی تعلیم کی پیداوار، اپنے اپنے سیاسی یعنی ہندو اور مسلمانوں کے یہ رہنما۔ 1948 میں ایک دوسرے کے چند ماہ جماعتوں اور فرقوں۔ گاندھی نے 30 جنوری 1948 کو اس دار فانی سے کوچ تو جناح اسی سال 11 ستمبر کو مالک حقیقی سے جا ملے۔

ان دو عظیم ہندوستانی سپوتوں کے گزرنے کے بعد ہندوستان کے اس مخصوص سیاسی عہد کا بھی خاتمہ ہو گیا جو آزادی کی لڑائی کی عطا تھا۔ جناح کے انتقال کے بعد پاکستان کو استحکام دینے والا لنگر ہی جیسے ٹوٹ کر ڈوب گیا۔ جیسے ہندوستان میں اب دوسرا گاندھی آسانی سے نہیں آنے والا ویسے ہی پاکستان میں اب کوئی دوسرا جناح بہ آسانی پیدا نہیں ہوگا۔ ان دونوں کے گزر جانے کے ساتھ پورا برا عظیم ہند کچھ اور مفلس ہو گیا۔

اس وقت جاری ایک غیر معمولی سرکاری فرمان میں کہا گیا کہ '' حکومت پاکستان بہت دکھ کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ قائد اعظم کا دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے 11 ستمبر ہفتے کی رات 10 بج کر 25 منٹ پر انتقال ہو گیا۔ میت اتوار کو تین بجے گورنر جنرل کے مکان سے اٹھے گا۔ نماز جنازہ کراچی کے نمائش میدان میں ہوگی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نماز جنازہ پڑھائیں گے۔ قائد اعظم کو نمائش میدان میں مجوزہ جامع مسجد کے احاطے میں ہی سپرد خاک کیا جائے گا۔''

پاکستان میں جانشینی کا عمل پرسکون رہا۔ جناح کے مقام پر خواجہ ناظم الدین پاکستان کے گورنر جنرل بنائے گئے۔ دہلی میں سرکاری سوگ کا اعلان کیا گیا اور ساری سرکاری عمارتوں پر قومی پرچم آدھے جھکا دیے گئے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل سی۔ راج گوپال چاری نے جناح کے انتقال پر رنج کا اظہار کرتے ہوئے ایک سرکاری استقبالیہ تقریب کو ملتوی کر دی۔

13 ستمبر 1948 کو کئی اخبارات نے جناح کے انتقال پر اداریے لکھے۔ اس وقت کے دو مشہور انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز اور 'ٹائمز آف انڈیا' نے جناح کی شخصیت اور کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا اور طویل وفایئے شائع کیے۔ دوسری طرف لندن ٹائمز نے ان کی یاد میں کچھ زیادہ ہی جذباتی انداز اختیار کیا۔ اس نے لکھا محترم جناح قائد اعظم سے بھی کہیں بڑھ کر تھے۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے سب سے بڑے رہنما اور اس اسلامی قوم

سے بھی بڑھ کر تھے جس کی تخلیق خود انہوں نے کی تھی۔ وہ پاکستان کی تخلیق پر ہی نہیں اس کے یقین پر بھی قائم تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک مادر وطن مہیا کرانے کا کام انہیں سونپا گیا تھا جہاں اسلام اپنے نظم کو ایک جدید ملک کے روپ میں بڑھا سکیا ور دیگر ممالک کی بھیڑ میں اپنا ایک منفرد مقام بنائے۔ صرف چند ہی سیاست داں مسٹر جناح سے زیادہ پائیداری سے اپنی پالیسیوں کے مطابق ملک کو موڑ پائے مگر جناح تو اپنی زندگی میں ہی امر ہو گئے تھے۔"

13 ستمبر کو بیشتر اخبارات نے اپنے ادارتی صفحات پر جناح کے بارے میں، بیشتر اداریوں کے طور پر تعزیتی تبصرے شائع کئے۔ اس وقت کے دو ممتاز انگریزی روز ناموں، ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا نے جناح سیاسی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے طویل تعزیت نامے لکھے۔ اس سلسلے میں، لندن ٹائمز نے ان کی تحسین وستائش میں کہیں زیادہ بھرپور انداز اختیار کیا: 'جناب جناح اپنے پیروؤں کے لئے قائداعظم سے بھی کہیں بڑے تھے، ایک ریاست کے سربراہ؛ وہ اس اسلامی ملک کا خالق ہونے سے اپنے پیروؤں کے فکروعمل پر ان کی زبردست گرفت تھی اور انہیں ان کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ ان دشواریوں کے باوجود جو کبھی کبھی ان پر غالب بھی آگئی آگئی ہوں گی، اس امید کو روبہ عمل لانا ان کا مقدر تھا، جسے عظیم شاعر اقبال نے اپنی الہامی بصیرت کے ذریعے بیدار کیا تھا، ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا وطن تشکیل دے کر جہاں اسلام کی عظمت رفتہ ایک جدید ریاست کی صورت میں از سرِ نو نمو پاسکے، اور اسے قوموں کی برادری میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔ بہت کم مدبر رہے ہیں جو حالات کو اپنے نصب العین کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں جناب جناح سے زیادہ کامیاب رہے ہوں۔ وہ اپنی حیات میں ہی ایک داستان بن چکے تھے۔'

ہندوستان ٹائمز جو اس وقت دراصل (اور آج بھی) کانگریس کا ترجمان تھا، نے لکھا انہوں نے (جناح) پاکستان کو اس طرح انہیں بنایا جیسے گاندھی جی نے آزاد ہندوستان کو پیدا کیا۔ جناح میں اپنے لوگوں کے خیالات کو بدلنے، انہیں سخت آزمائشوں سے گزارنے، ان کے سامنے مشکل مقاصد رکھنے اور ان کے لئے ایک تنظیم اور قیادت تیار کرنے کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ ہی خواہش جو اس وقت کے حالات کا مقابلہ کر سکتی۔ وہ ایک حد درجہ ماہر سیاسی تدبیر ساز تھے جنہوں نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان نہیں بھول سکتا کہ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی ایک قوم پرست کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ حال کے برسوں میں مسٹر جناح حالات کا شکار ہو گئے اور وہ اتنے بڑے بھی نہیں تھے کہ تاریخ کی ترغیب گناہ کا مقابلہ کر پائے... کسی بھی ہندوستانی کا یہ سوچنا کہ جناح کے بعد ہندوستان اور پاکستان جلد ہی متحد ہو جائیں گے احمقانہ ہوگا۔'

دوسری طرف ٹائمز آف انڈیا نے جناح اور گاندھی کے درمیان تقابل کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھا: 'مہاتما گاندھی اور قائد درمیان روحانی پہلوؤں کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں تھا... تاریخ کی اہم شخصیتوں کے حیثیت سے دونوں میں نمایاں طور پر شدید فرق تھا برطانیہ میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران، دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ چلتی ضرور آئی... مگر جہاں ایک کا سروکار روحانی اقدار و تصورات سے رہا... تو دوسرا طبعاً ایک طاقت ور مگر بے لچک راج

کا حاصل ہونے کی وجہ سے بے رحمانہ قانون پسندی تک محدود رہا جو تکنیکی طور پر آئینی ہونے کے ساتھ مفاہمت بیزار بھی تھی... اور جس نے نتائج کے پروا کئے بغیر اپنا حصہ لے کر رہا۔

کیا جناح نپولین جیسی خام خیالیوں کے شکار تھے؟ انہوں نے چاہا ہو یا نہیں مگر ان کی مدت کے نتائج خود ان کی تخلیق، پاکستان کے لئے تباہی کا پیش خیمہ نہیں؛ وہ اپنے محور سے ہٹ گیا ہے؛

جناح کے انتقال کی خبر سن کر نہرو نے مانا کہ وہ اپنے خیالات سے ابھی بھی آزاد نہیں ہو پائے تھے۔ جناح کے انتقال کی خبر سن کر نہرو نے بھی ردعمل ظاہر کیا مگر افسوس کہ وہ اب بھی اپنے پرانے مربیانہ انداز کو چھوڑ نہیں پائے۔ انہوں نے کہا: 'جناح نے ہندوستان کی تاریخ کو ایک نیا رخ ضرور دیا مگر ایک غلط انداز سے، یہ سچ ہے، اور ایسی طاقتیں کے بند کھول دئے بڑے پیمانے پر بدی کا مظاہرہ کیا۔ ہم انہیں کس طرح پرکھیں؟ ان تمام برسوں کے دوران میں اکثر ان سے بہت ناراض رہا ہوں۔ لیکن میرے دل میں ان کے لئے کوئی کڑواہٹ نہیں ہے، جو کچھ ہوا اس کے لئے ایک گہرا دکھ ضرور ہے۔ باہر باہر پر تو وہ اپنی تلاش میں کامیاب رہے اور اپنا مقصد پا گئے لیکن کس قیمت پر اور جو ان کے اپنے نصب العین سے کتنا مختلف؟ انہوں نے اس سب کے بارے میں کیا سوچا ہوگا؟ کیا انہیں کسی اپنے کسی سابقہ عمل دکھ یا افسوس ہوا ہوگا؟ شاید نہیں کیوں کہ انہوں نے خود کو نفرت کی چادر میں لپیٹ رکھا تھا اور ہر وہ ہر شخص کو ساری برائیوں کا سر چشمہ تھے جس سے انہیں نفرت تھی۔ نفرت کسی بھی شخص کے لئے ایک بہت ناقص غذا ہے۔

11

بازدید

چاروں طرف آگ لگی تھی

اوراس کی قیمت انہوں نے چکائی

لیکن ان اپنی نفرتوں نے ہی

ان کی روح کوقتل کر دیا

فتح پانے سے پہلے ہی

(روڈیارڈ کپلنگ - دی آؤٹ لاز: 1914)

ہماری تحقیق کا سفراور یہ جاننے کی کوشش کہ ہندوستان کی تکلیف دہ تقسیم کیوں ہوئی، یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ سفر شروع ہوا تھا ساتویں صدی میں ہندوستان میں اسلام کی آمد سے اور پھر کئی صدیوں کے وقفے کے بعد 1857 کی جنگ آزادی تک جا پہنچا۔ اس کے ساتھ انیسویں صدی کے وسط میں ہماری آزادی انگریزوں کے پیروں تلے روندی گئی۔ ایک دوسرے ملک سے تجارت کی غرض سے آئے ان حکمرانوں نے ہماری تہذیب، قومی رنگ ڈھنگ اور زندگی کی قدروں کو بدل ڈالا اوراس کے ساتھ یہاں ان کی اپنی سیاست اور معیشت حاوی ہوگئی۔ اب ملک میں انہی کا سکہ چلنے لگا۔ انہی کے فیصلے ہونے لگے جو کہ احمقانہ بھی تھے۔ وہ ہندوستان کی جغرافیائی سرحدوں کو بھی اپنے انداز میں نئی شکل دینے لگے۔ ہماری تاریخ بھی اچھوتی نہیں رہی۔ اور ہمارے ہی ملک میں ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ یہ بھی انہی کے اختیار کی بات ہوگئی۔

بہت سے انگریزوں کو، جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں یا 1857 کے بعد برطانوی حکومت کے لیے کام کیا تھا، ہندوستانیوں کی زبان، رسم ورواج، ہمارے اعتقادات اور عقائد کے مختلف رنگوں، فطری مزاجوں اور عہد و پیمان کا کوئی علم

نہیں تھا۔ انگریز تو دور سے حکومت کرتے تھے۔ وہ کلکتہ، دہلی یا شملہ میں بیٹھے وہائٹ ہال سے پوچھتے اور ان کے جواب پر ہی ہندوستان کی اس وسیع و عریض سرزمین اور آبادی کو یعنی اس ہندوستان کو جو کہ، تقسیم کے باوجود رقبے اور آبادی کے لحاظ سے پوری یوروپی یونین سے بڑا ہے، جانوروں کے غول کی مانند ہانکتے رہے۔ جب تک ہم ہندوستانی تنہا ہی اپنی قسمت (بدقسمتی) کا فیصلہ کرتے رہے تب تک چاہے ہم لڑیں جھگڑیں، باہمی تعاون سے کام لیں یا بعض اوقات ایک دوسرے کو مار بھی دیں، وہ ہمارا اپنا معاملہ تھا، صرف ہمارا، صرف ان لوگوں کا جو یہیں کے تھے، خواہ وہ کسی بھی مذہب اور عقیدے کے ماننے والے ہوں۔ لیکن سامراج کے اعلانیہ کے بعد ایسا بالکل نہیں رہا۔ کیوں کہ تب ہندوستان غلام ہو چکا تھا۔ غلام کیسا بھونڈا لفظ ہے اور یہ غلامانہ ذہنیت رفتہ رفتہ ہماری روح میں داخل ہوگئی۔

یہ سارے واقعات 1857 سے 1947 تک یعنی ایک صدی سے کم وقت میں پیش آئے۔ اور بدقسمتی تو یہ ہے کہ 1947 کے بعد بھی اپنی تقدیر کا فیصلہ ہم خود نہیں کر سکتے۔ بیشتر یوروپی نظریات و خیالات، زبان، حکومت کے طور طریقے اور ذہنیت، یہ سب ہمیں برٹش ہندوستان کی باقیات کی شکل میں ملے اور ہم نے انہیں اپنا بھی لیا۔ انگریزوں نے ہندوستان تو چھوڑ دیا۔ لیکن وہ ہمارے درمیان کئی بڑی بڑی خلیجیں، خندقیں اور ایک مکمل انگریز نواز قیادت بھی چھوڑ گئے۔ اس قیادت نے خلیج نما مسافت کو اور وسیع کر دیا۔ جاتے جاتے انگریزوں نے ہماری آزاد سرزمین کو کاٹ دیا۔ جیسا کہ گاندھی جی ہمیشہ کہتے رہے۔ لیکن جب ہم آزاد ہندوستان کی شکل میں ابھرے تو جو کچھ بھی بچا بچایا تھا، ہم نے اسے اپنی ناعاقبت اندیشی سے تہس نہس کر ڈالا۔

گاندھی ان ناہمواریوں کو پہچانتے تھے۔ وہ ہندوستان ہی کی پیداوار تھے۔ گرچہ انہوں نے مغرب میں تعلیم پائی تھی۔ لیکن ان کا مزاج، ان کی جڑ میں، ان کی فطرت، اور ان کا رویہ ہندوستانی سمجھ پر مبنی تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کا ردعمل پوری طرح 'ہندوستانی' رہا۔ بدقسمتی سے جناح اور نہرو میں ایسا بالکل نہیں تھا۔ ان دونوں کے نظریات و خیالات پوری طرح مغربی تعلیم کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ اپنی تمام تر سیاسی زندگی میں انگریزی ذہنیت ہی پر قائم رہے۔ دونوں نے ہندوستان اور پاکستان کی شکل میں جانشین میک، قائم کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا۔ وہ ایک مرکزی مملکت کی شکل اور طریقہ کار میں پوری طرح یوروپی تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ وہ اپنے ساتھ نقلی جدیدیت کے مغربی کوڑا کرکٹ بھی اپنے ساتھ لے آئے ہوں۔

یہ قدم کئی لحاظ سے تباہ کن تھا۔ لیکن سب سے خطرناک اور اثر دار بھی جناح کا وہ اعلان تھا کہ 'مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔' برطانوی حکومت کے افسران کی حمایت والے اس جذبے کے تحت بالآخر پاکستان تو بن گیا، خواہ وہ دیمک زدہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن 1947 کے بعد کا ہندوستان ادھورا اور کٹا ہوا سا نظر آنے لگا۔ یہ درحقیقت آزادی کے بعد کا اہم نظریاتی اور انتظامی چیلنج تھا، جو آج بھی موجود ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کو آج تک اس سوال کا موثر انداز میں جواب نہیں مل سکا ہے اور

شاید اس نے، ڈرامے، اس جواب کو ڈھونڈا بھی نہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ مذہب کی بنیاد پر تقسیم کو منظوری دینا۔ بالخصوص اس بات کو مان لینا کہ 'مسلمان ایک الگ قوم ہیں' اور پھر تقسیم کے تمام الاکل اسی بنیاد پر رکھ دینا، اس سے یقینی طور پر خسارے کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ اور خسارہ ہوا بھی۔ اور اسی نے ہمارے سوچنے کی طاقت کو ختم کر دیا۔ پہلے تو یہ دعوا لگتا ہی نہیں کہ مسلمان الگ قوم ہیں، اور پھر کیا یہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ کیوں کہ اس دعوے کی پیاس تو کبھی بجھتی نہیں۔ یہ نظریہ 'اقلیت نوازی' کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور یہ لامتناہی طور پر ایک تباہ کن اقلیت نوازی کو ہی جنم دیتا رہے گا۔

یہ سب ہماری شکستہ آزادی کی باقیات ہیں۔ اور اسی لیے تقسیم سے ہمیں کوئی سکون نہیں ملا۔ نہ ہی اس تقسیم نے اپنے پیچھے کوئی مستقل امن قائم کیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تقسیم ایک مرکزی مسئلہ بن گئی۔ یہ وہ سرزمین ہے، جس کے بارے میں ہم نے تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان کو کاٹ دیا جائے۔ پھر سوال اٹھتا ہے۔ 'کیا ہم نے انسانوں کو کاٹنے کی بھی تائید کردی تھی۔' ہم نے اس برصغیر کی آنے والی نسلوں کو ورثے میں سونپا ہے؟ وہ مسلمان، جو ایسے مذہبی رشتوں سے محروم ہو کر ہندوستان میں رہ گئے، یا جو پاکستان نہیں جاسکے، یا خود نہیں گئے، وہ اب یہاں خود کو اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ دراصل پاکستان اور بنگلہ دیش میں بچے کھچے ہندوؤں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے، جو اب رفتہ رفتہ، خاموشی سے لیکن مسلسل وہاں سے نکالے جارہے ہیں۔

ہمارا دوسرا چیلنج، ہمارے پیچیدہ سماج کے تناظر میں خود کو ایک جمہوری ڈھانچے میں منظم کرنے کی ذمے داری کا تھا، ہم نے یہ ذمے داری اطمینان بخش انداز میں ادا نہیں کی۔ کم از کم ابھی تک تو ہم یہ کام نہیں کر پائے ہیں۔ اسی لیے ہم اکثر آسان راستوں کا سہارا لیتے ہیں۔ جو محض کچھ وقت کے لیے، وہ بھی خود کو مطمئن کرنے کے طور پر، کام آتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح حل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے اندر مقصد کے تئیں ایمانداری کا فقدان بھی ہے۔ اسی لیے ہم جو حل نکالتے ہیں اس میں ضروری طاقت نہیں ہوتی۔ نتیجے کے طور پر وہ کچھ دنوں کے بعد ہی غیر موثر ہو جاتا ہے۔ اور پھر مزید نقصان ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ تمام طریقے سماجی تقسیم کے مطالبے کو تسلیم کر کے انہیں تاریک کوٹھریوں میں مضبوطی سے بند کر کے مقفل کر دیتے ہیں۔ اس سے ہمارا سماج 'مستقل طور پر' منقسم ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے چیلنج بنیادی باتوں کو ایمانداری سے کہنے کا ہے۔ لیکن ہم اس سے کتراتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بہت ہی خوفناک سچائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہمارے ووٹوں کی ذہنیت سے چپکے ہوئے نظام حکومت کی سچائی پر بھی کئی سوال اٹھا دیتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمان ملک کے بیشتر حصوں کے حکمراں ہونے کی وجہ سے مطمئن تھے۔ جب حکومت چلی گئی تو انہوں نے خود کو انگریزوں کی رعایہ کے طور پر ڈھال لیا۔ آج ہندوستان میں نظریاتی طور پر، ہم سب برابر کے شہری ہیں اور یہ بات ہماری جمہوریت کی بنیاد کا پہلا پتھر ہے۔ لیکن کیا نظریے کو ہم حقیقت میں تبدیل کر پائے ہیں؟ اس آئین کو منظور کرتے

ہی ہم نے خصوصی اختیارات دینے شروع کر دیے، لیکن امتیازی انداز میں۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ ہندوستان کے مسلم شہری بھی اس میں حصہ مانگیں۔ اس مانگ کا جواب، زخمی کرنے والی آواز میں، ہمیشہ یہی رہا ہے: 'اب بھی خصوصی اختیارات؟ پاکستان کے بعد بھی، کیوں؟' اسی لیے تقسیم کی کبھی نہ ختم ہونے والی خیریت کا یہ سوال بار بار اٹھتا ہے۔ کیا ہم نے تحریک آزادی کے دوران اس قسم کے اٹھائے گئے سوالوں کا حل تلاش کیا؟ پہلے یا اب؟ تو پھر اب ہم اطمینان بخش انداز میں ان سوالوں کا سامنا کیسے کر سکتے ہیں؟ کیوں کہ تقسیم ملک نے تو ان سوالوں کو اور بھی مشکل اور خوفناک بنا دیا ہے۔ لیکن اس سے مسائل ختم تو نہیں ہوں گے۔ اس لیے ان کا سامنا تو کرنا ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ سامنا کیسے کیا جائے؟

اس تقسیم نے ولفرڈ کانسٹول اسمتھ کے اس عظیم قول کو، میرے خیال میں بدل دیا کہ 'اسلام کو اگر کہیں نظریاتی طور پر فروغ کا کوئی موقع ہوگا، تو وہ ہندوستان میں ہوگا۔' لیکن اس قول پر اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ 'کیا یہ اب بھی لاگو ہوتا ہے؟ ایسے میں جب کہ پاکستان بن چکا ہے۔' جناح کا کہنا تھا کہ '(غیر منقسم) ہندوستان میں صرف وہی مسلمان کے نمائندہ تھے۔' تو کیا ان کا یہ خود ساختہ حق پاکستان میں منتقل ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر بنگلہ دیش کا کیا؟ اور ہندوستانی مسلم شہریوں کا کیا؟ اس لیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ دراصل تعداد اور قیادت دونوں چیزوں کی کمی کی وجہ سے مسلمان ہمیشہ صرف فائدہ بخش، مگر روح کو نچوڑنے والے شارٹ کٹ کی پناہ لیتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں اس قسم کی 'چناوی نیلامی' اب ایک مسلسل صورت حال سی بن گئی ہے۔ اور جوں جوں موجودہ سیاسی بوالعجبی کا دائرہ بڑھتا ہے، مایوسی اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ اسے ایک دائرے تک تو سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ایسی ذہنیت آج کی اس خلیج کو مزید وسیع کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تقسیم کے جذبے کو خواہی نہ خواہی، زندہ رکھتی ہے۔ کئی صدی قبل سینیکا☆ نے مشورہ دیا تھا کہ 'جو شکستہ ہے، وہ (جلد ہی) گمراہ ہو جاتا ہے۔' ہمارے معاملے میں ہم یعنی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تاریخ کے حصے بخرے کیسے کر سکتے ہیں؟ کیوں کہ ہمارے لیے تاریخ صرف حقائق کا مجموعہ تو ہے نہیں۔ یہ تو وہ ہے کہ جیسے ہمیں کہنا، پھر یقین کرنا اور پھر اسے تسلیم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے تاریخ ہمارے تمام اجتماعی تجربات کا خزانہ ہے، وہ ہم لوگوں کے علم و عرفان کا خزانہ بھی ہے۔ لیکن ایسا صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم ان وسائل کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرنے لائق بنیں اور پھر فوری طور پر عقیدت، سوجھ بوجھ، ایمانداری اور صبر کے ساتھ ان وسائل کی تلاش کریں۔

اب پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں آزاد ملک ہیں۔ اور انہیں اپنے ملک کی پھلتی پھولتی معیشت، ایک آسان سماجی نظام اور اندرونی امن وامان کے قیام کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن یہ دونوں ممالک تقسیم کے بطن ہی سے تو پیدا ہوئے ہیں۔ 1947 کی تیسری سہ ماہی تک ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش ہم سب ایک تھے۔ اب ہم تین الگ الگ آزاد و جواب والی اکائیاں ہیں۔ لیکن کیا ہم سچ مچ اتنے الگ ہیں؟ میں یہ سوال کرنے سے خود کو روک نہیں پاتا۔ لیکن ایسی کشمکش کے بارے

☆ لوسیس اینائس سینیکا ایک رومن اسٹوئیک فلسفی، سیاست داں اور ڈرامہ نگار تھا، یہ نیرو بادشاہ کا معلم اور مشیر تھا۔

میں مائیکل ڈی مونٹین☆ ہمیں عقلمندی کے ساتھ ہوشیار کرتے ہیں، 'زیادہ سوال بونا دنیا کو غیر یقینی سے لبالب بھر دیتا ہے.....'
اس سونے کی ڈلی جیسی دانشمندی سے غیر متفق ہونا مشکل ہے۔ پھر بھی جب زیادہ تشریحیں سچائی کو منتشر کر دیں تو پھر سچ کو ہم کہاں تلاش کریں؟

گاندھی نے سچ کی تلاش میں ہی تقسیم ملک کو ایک عظیم المیہ کی طرح محسوس کیا تھا۔ اس بدقسمت سال میں انہوں نے نوا کھلی میں کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے لکھا تھا 'میں ناکام ہو کر نہیں مرنا چاہتا، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میں ناکام ہو سکتا ہوں۔'☆ تقسیم کے ایک سال کے اندر ہی جناح چل بسے۔ انہیں تو ایک دیک زدہ پاکستان سے ہی سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ اسے وہ 'ایک الگ قوم کی حیثیت سے' مسلمانوں کے لیے نظریات کی ایک روشن مثال نہیں بنا سکے۔ سچائی تو یہ ہے کہ وہ اسے ایک کارگزار اور ملک کی شکل میں بھی نہیں ڈھال سکے۔ نتیجتاً ان تقسیم زدہ ملکوں میں ہندوستان، پاکستان اور بعد میں بنگلہ دیش کے عوام کا ساتھ امن و امان نے چھوڑ دیا۔ کیا ایسا ہمیشہ کے لیے ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ایک طرح سے یہ اجتماعی تباہی ہو گی۔ کیا ہمارے پاس اس تباہی کو روکنے کے وسائل ہیں؟ اور کیا ہمارے اندر اس کا بوتا ہے؟ اور قوت ارادی ہے؟ اگر ان سوالوں کو مسلسل الٹا کر ہم اپنے 'سچ' کو تلاش کریں، تو شاید اپنے ماضی کی عظیم فروگذاشتوں کو فراموش کر سکیں اور کچھ عبرت حاصل کر سکیں۔

کیا 'مسلمان الگ قوم' ہیں؟

میں ایسا سوچتا ہوں کہ یہ اہم سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اگر 1906 کا شملہ نمائندہ وفد ہندوستان کے وائسرائے سے 102 سال قبل نہیں ملا ہوتا۔ آخر یہیں سے تو محمد علی جناح کے اس دعوے کا سفر کہ 'مسلمان ایک الگ قوم ہیں' شروع ہوا۔ جناح نے اس دعوے کو نظریاتی طور پر اور اپنی خواہش کے مطابق حقیقت میں بدلا۔ انہوں نے ایک ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس ملک کا اب الگ جواب لیکن کیا حقیقت میں وہ اتنا الگ ہے؟ کیا مسلمان اب واقعتاً ایک الگ قوم ہو گئے ہیں۔ کیا پاکستان کی پیدائش نتیجے کی شکل میں بھی جناح کے تصور کے مطابق ہے؟ کیا بنگلہ دیش کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس تصور کو خارج نہیں کر دیا گیا۔ یہ تشویشناک سوال ہے اور اگر اس سوال کو اور دھاردار بنا لیں تو سوال اٹھتا ہے کہ 'کیا جناح کی موت کے بعد اس نظریے کی قوت ختم نہیں ہو گئی؟' جناح کا تشکیل کردہ یہ راستہ اور نظریہ، جس کی بنیاد پر انہوں نے پاکستان کی تخلیق کی، کیا ان بنیادی باتوں سے ہم آہنگ ہے؟ کیا قیام پاکستان کے ساتھ ہی جناح کا سفر ختم ہو گیا؟ یا پھر اس خیال کا ماضی ہی ہمارے مستقبل کا نقیب بن گیا ہے؟

☆ مونٹین ایسیز آف ایکسپیرئنس، صفحات 995-994

☆ دی آکسفورڈ انڈیا گاندھی، گوپال کرشن گاندھی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2008 صفحہ-695

1940-47 کے اواخر میں جناح ہندوستان کے پورے مسلم فرقے کے 'ایک واضح، غیر متنازعہ اور حقیقی سیاسی قائد' بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز انگریزوں کی مخالفت اور ہندو مسلم اتحاد کے ابتدائی چیمپئن کی شکل میں کیا تھا۔ اس وقت وہ بلا جھجک اور مسلسل متحدہ ہندوستان کے پیروکار تھے۔ پھر جب انہوں نے ایک مسلم 'مملکت' کا مطالبہ کیا تو وہ ایک الگ وجود کی مانگ تھی۔ شروع میں یہ مانگ 'اندرون ہند' لیکن ایک الگ اقتدار کی شکل میں تھی۔ کچھ برسوں تک ان کے سیکریٹری اے – ایم – آر – اے – بیگ نے اپنی کتاب 'جناح' میں لکھا ہے، 'ان کے خیال 2 میں اس قسم کا اسلام بہت کم آیا، اور یہ پوچھنے پر کہ ایک مذہبی بنیاد پر ایک الگ ملک کیسے بن سکتا ہے، انہوں نے ہمیشہ امریکیوں (نے ثابت کیا ہے کہ قومیت حقیقی شکل میں مقصدیت پر محیط ہے) کی مثال دی۔ اگر مسلمانوں نے خود کو ایک الگ قوم کی شکل میں دیکھا تو صرف یہ کہ بس اور کچھ نہیں چاہیے، ہم تو ایک الگ قوم ہیں۔ یہ صرف قابل اور پیشہ ور وکیل کی دلیل نہیں تھی، یہ ان کے اعتقاد کا اظہار تھا۔ ان کے یقین کی پختگی تھی، جسے انہوں نے قومیت کی بنیاد بنا دیا۔ جناح کے لیے یہ ایک ناگزیر اور واحد فلسفیانہ اسٹیج تھا (کم از کم ایسا محسوس ہوتا ہے) ان کے لیے یہ ایک طرح سے ایک ضرور نظریاتی ٹوپی تھی۔ جسے پہن کر وہ اس خیال کو آگے بڑھا سکیں۔ جناح کی مخالفت ہندو یا ہندوتو سے نہیں تھی، وہ تو کانگریس تھی جسے وہ مسلم لیگ کی حریف مانتے تھے۔ اور لیگ کو وہ اپنے 'وجود' کی توسیع کی شکل میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے 'مسلمانوں کے تحفظ میں کانگریس حکومتوں کی نااہلی' ثابت کرنے کے لیے واقعتاً (1946 میں بنگال، بہار وغیرہ کے) ہندو مسلم فسادات کو ہوا دی اور لیگ میں بھرتی ہونے کے لیے مسلمانوں کو 'ہندو راج' کا خوف دکھایا۔ لیکن ان کے ساتھ مقصود مباحثوں کے دوران میں نے انہیں ہندو یا ہندوتو پر حملہ کرتے شاید ہی کبھی پایا۔ ان کی مخالفت جو بعد میں نفرت میں تبدیل ہوگئی، صرف کانگریس قیادت پر ہی مرکوز رہی۔' 1

جناح کے لیے مسلم فرقہ محض ایک الیکٹورل ادارہ بن گیا تھا۔ مسلم 'قوم' کے تئیں ان کی اپیل، ان کا سیاسی منچ اور مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین لڑائی، سب کچھ اصلاً سیاسی تھا۔ 'پاکستان ان کی سیاسی مانگ تھی، جس پر وہ اور مسلم لیگ حکومت کر سکیں۔ ان سب میں مذہب تو دوسرے درجے میں کام کرتا تھا۔ تنہا پاکستان نے ہی انہیں وہ سب کچھ دے دیا جو ان کی شخصیت اور کردار کا مطالبہ تھا۔ اگر جناح پاکستان حاصل کرنے کے یہ ناگزیر تھے، تو جناح کی تکمیل کے لیے پاکستان (بھی) ضروری تھا۔' 2

ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے فلپس تالبوٹ کا تجزیہ کچھ اس قسم کا تھا:

'جناح نے ایک بہترین حکمتِ عملی کے تحت مسلم اتحاد کو منظم کر کے جلد ہی اس کو فروغ دے دیا۔ مہارت، دماغی سودے بازی، زبردست ہوشیاری، گھبراہٹ سے دوری اور اپنے مخالفین کی طاقت اور کمزوری کی شعوری شناخت، انہوں نے ہر موقع کو مسلم لیگ کے لیے فائدے کے مواقع میں بدل دیا۔ سودے بازی کی ثالثی میں اپنی تمام قابلیت کے ساتھ وہ کانگریس اعلا کمان کی ٹکر کے ثابت ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ایک خوشامدی اژدہام سے کہا تھا، 'میں آئینی طور پر اپنی

پرانی عادتوں سے وابستہ، محض ایک منطقی شخص ہوں'۔ کوئی دوسرا اس سے بہتر انداز میں ان کا تجزیہ نہیں کرسکتا۔

'جناح ہی لیگ میں سب کچھ تھے۔ جس وقت میں یہ لکھ رہا ہوں، انگریزوں کا یہ اعلان کہ ہندوستان آئندہ سال تک آزاد ہو جائے گا، ایک ماہ گزر چکا ہے۔ ان ہفتوں میں کسی بھی اہم مسلم لیگی نے اس بیان پر عوامی طور پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ ہے جناح پر مسلم لیگ کا پوری طرح منحصر رہنا' پھر بھی ایک بہت بڑی خامی تو رہ ہی گئی، ان مسلمانوں کے لیے ایک المناک مشکل کی شکل میں، جو اس نوتشکیل شدہ پاکستان کا حصہ نہیں بنے۔ یا تو انہوں نے پاکستان کو منظور نہیں کیا، یا کر نہیں سکے، سوال یہ ہے کہ ایسے تمام مسلمانوں کے بارے میں کیا؟ اس وقت کی تاریخ اور مسلم معاملات کے ایک ہمدرد مبصر اے۔ جی۔ نورانی نے 'دی مسلمس آف انڈیا' میں تبصرہ کیا ہے کہ 'بنیادی طور پر تبدیل شدہ حالات میں مسلم لیگ کے کچھ اہم ممبران نے ہندوستان کے کئی آئین ساز اسمبلی میں علیحدہ الیکٹوریٹ کا مطالبہ کرکے، گویا مسلمانوں کے تئیں بداعتمادی کی آگ میں ایندھن ڈال دیا اور وہ آگ فوری طور پر اجلاس کے تمام حصوں میں پھیل گئی۔ یہ مسلم قیادت کی نااہلی اور گہرے غور و فکر کے فقدان کے ساتھ ہی ان کی نااہلی کا پیمانہ ہے۔'

نورانی کے مطابق غلطی محمد علی جناح کی تھی، جنہوں نے پاکستان اور اس کی تشکیل کے تئیں اپنی مکمل وابستگی کے سبب 'نئی اور ابھرتی ہوئی صورت حال کے بارے میں پورے مسلم فرقہ' کو تیار کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ ایک سرکردہ مسلم لیگی محمد رضا خان نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔'3

'جولائی 1947 کے اواخر کے آس پاس مرکزی قانون ساز اسمبلی کے مسلم ممبران جناح سے ملے، جو اس وقت تک اسمبلی میں مسلم لیگ گروپ کے قائد تھے۔ وہ ان کی آخری ملاقات تھی، کیوں کہ اس وقت وہ کراچی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کی الوداعی میٹنگ بھی تھی۔ کئی ممبران نے ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے تئیں تشویش ظاہر کی اور انہوں نے خود اپنے اور مسلم لیگ کے مستقبل کے بارے میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ اس وقت جناح نے کہا تھا کہ اب تک انہیں خوب تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ خود اپنی پالیسیاں اور پروگرام طے کرنے لگے ہیں۔ انہیں نئے نظام اور تبدیل شدہ حالات میں خود ہی معاملات طے کرنے ہوں گے۔ تاہم انہوں نے بہت ہی واضح لفظوں میں کہا کہ انہیں ہندوستان کے تئیں 'وفادار' رہنا چاہیے۔ کیوں کہ وہ 'گھوڑوں پر ایک ساتھ سواری نہیں کر سکتے۔'4

ہندوستان میں بچی ہوئی مسلم لیگ نے 15 دسمبر 1947 کو خود کو از سر نو سرگرم کرنے کے سلسلے میں ایک تجویز منظور کی۔ گاندھی نے انہیں ایسا کرنے اور اس کے بجائے کانگریس کو 5 اپنی حمایت دینے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ ایک دانشمندانہ مشورہ تھا، جس کا خیر مقدم سہروردی 6 نے بھی کیا تھا۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانوں کو قیادت فراہم کرنے میں ناکام رہے۔ حالاں کہ اس وقت جب کہ مسلمانوں کے حوصلے پست تھے، مسلم فرقہ کی قیادت کرنے کی ذمے داری انہی کی تھی۔

اس وقت آئین ساز اسمبلی میں 7 مسلم لیگ کے لیڈروں نے بغیر سوچے سمجھے نہ صرف سیٹوں کے ریزرویشن کا بلکہ اس کے ساتھ ایک علیحدہ الیکٹوریٹ کا مطالبہ کرڈالا تھا۔ اس پر سردار ولبھ بھائی پٹیل ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن اب جب تقسیم ملک کے زخم رس رہے تھے، ریزرویشن کا دعوا دوہرایا گیا تو سردار پٹیل نے غصے میں آکر پھٹکارا تھا، 'میں نہیں جانتا کہ ملک میں جو کچھ ہوا ہے، اس پر اتنے سب تجربات اور غور وفکر کے بعد اپنا رویہ بدلنے میں ان میں (مسلمانوں) کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ انہیں مسلم لیگ سے اس ترجیح کی تجویز رکھنے کا مینڈیٹ ملا ہے۔ مجھے افسوس ہے۔ آج یہ موقع مینڈیٹ پر کام کرنے کا نہیں، بلکہ اپنے ضمیر کی آواز پر ملک کے مفاد کے لیے کام کرنے کا ہے۔ کسی فرقہ کے لیے اپنے مفادات کو، جس ملک میں وہ رہ رہا ہو، اس کے مفادات سے الگ سمجھنا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر آج ہم سیٹوں کے ریزرویشن پر متفق ہو جائیں، تو میں ایک سیکولر اور جمہوری ملک میں، اس قدم سے خود کو، مسلم فرقہ کا سب سے بڑا دشمن سمجھوں گا۔ ....(وہ) جو اکثریت پر اعتماد نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ حکومت میں نہیں رہ کر سکتے........ یعنی حکومت میں آپ کا کوئی حصہ نہیں رہے گا۔ آپ خود کو باہر کر کے ہمیشہ اقلیت ہی رہیں گے۔ اس وقت آپ کا کیا فائدہ ہوگا۔؟'

کیا اس وجہ سے ہندوستان کے مسلم شہریوں کو مایوسی اور الیے کا احساس ہے؟ شاید ہاں! لیکن اس لیے بھی کہ ہم ان دہائیوں کی عظیم غلطیوں کا اعادہ کیے جا رہے ہیں۔ 'اقلیت ازم' کے سوال کو بھی پھر سے لیں۔ ایم جے اکبر نے ایک دانشمندانہ مضمون میں اس کے چیلنجوں کو سمجھاتے ہوئے ایک عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ وہ ایک غیر مطبوعہ کتاب 'دی مچ مائنارٹی' میں لکھتے ہیں: 'گذشتہ ہزاروں سال کی کہانی میں کب اور کس نکتے پر مسلمان اقلیت ہوگئے؟

سوال واضح طور پر دلچسپ ہے ہندوستانی برصغیر میں مسلمان کبھی بھی گنتی میں اکثریت تو رہے ہی نہیں ہیں۔'

وہ آگے لکھتے ہیں، 'کیا ہندوستانی مسلمانوں نے خود کو اس مغل دورِ حکومت میں اقلیت سمجھا، جو نامرد ہو جانے کے سو سال سے بھی زیادہ وقفے کے بعد، بالآخر 1857 کی جنگ کے ملبے میں دفن کر دیا گیا تھا؟ انگریز حکومت میں سب سے طاقتور مسلم ریاست حیدرآباد میں مسلمانوں کی آبادی صرف گیارہ فیصد تھی۔ جب کہ ہندو آبادی 48 فیصد تھی۔ کیا حیدرآباد کے مسلمانوں نے اس وقت تک خود کو اقلیت مانا، جب تک اس نظام الملک کے وارثوں نے، جو کہ ایک مغل گورنر تھا اور جس نے 1723 میں سامراج میں ایک آزاد ریاست قائم کر لی تھی؟ ان پر حکومت کی نہیں۔'

'اس لیے یہ 'اقلیت ذہنیت' صرف تعداد کا نتیجہ نہیں ہے، دراصل یہ ایک سیاست کا، حکمرانی کا اور چودھراہٹ کا ایک اظہار ہے، اس کی بھوک ہے۔ جب تک مسلمانوں نے خود کو ملک کے ساتھ وابستہ رکھا، وہ مطمئن رہے کہ ان کے اقتصادی فائدے، افسر شاہی، عدلیہ اور فوج میں ملازمتیں اور ان کی مذہبی آزادی محفوظ تھی۔ اس وقت تک مردم شماری کے اعداد وشمار بالکل غیر اہم تھے۔' اکبر آگے لکھتے ہیں، 'یہی وجہ تھی کہ ان صدیوں میں، نفسیاتی طور پر وہ اقلیت نہیں تھے۔ لیکن 1948 میں جیسے ہی نظام بے اقتدار ہوئے اور حیدرآباد نے... انڈین یونین میں... میں ضم کر لیا گیا، وہی مسلمان خود کو

اقلیت سمجھنے لگے۔' کیوں؟اس کا جواب ہمارے ان سوالوں کو طے کر دیتا ہے۔

اس میں سے، یہیں سے، ایک مصنوعی اور جھوٹا 'اقلیت علامتی گروپ' پیدا ہوا جس میں تقسیم کی خشک، بدبو پہلے سے ہی اکٹھا تھی اور پھر اسی نے متحدہ ہندوستان کی اس عظیم الشان اور وسیع عمارت کو منہدم کر دیا۔ اس وقت جناح نے زور دے کر کہا تھا، 'جواب (علاج) صرف الگ ہونے میں تھا۔' اور نہرو، پٹیل اور کانگریس کے دوسرے لوگ بالآخر اس سے متفق ہو گئے۔ پھر پاکستان بن گیا۔ لیکن اقلیت ازم تو سب پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ نفسیاتی مرض ہندوستان میں برقرار رہا ہے، ایک زہریلی بیل کی مانند یہاں جڑ پکڑ گیا ہے۔ اور اب تو یہ بیل واقعتاً اور پھیل گئی ہے۔ کیوں کہ اب ہمارے پاس سابقہ مثالیں اور نظیریں ہیں، جن پر چلنا ہمارے لیے آئینی انتظاموں سے بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ قدم پوری طرح خودکشی کے مترادف ہے۔ لیکن ہمیں ایسا لگتا نہیں، کیوں کہ ہم اب بھی اڑے ہوتے ہیں۔

پاکستان میں 'اقلیت ازم' نے مذہبی اور ملکی راستے ڈھونڈ لیے اور اس طرح بنگلہ دیش میں بھی۔ حالاں کہ غیر منقسم بنگال کے ہندوؤں نے بھی بنگال کی تقسیم کو منظوری دے دی تھی۔ تو ان تمام باتوں سے یعنی تقسیم کی تکلیف سے ہم نے کیا سبق سیکھا؟ اس سوال کا جواب میں اب تک تلاش نہیں کر سکا ہوں۔ کیوں کہ 1947 میں ہندوستان کو توڑنے کا یہ پورا معاملہ تاریخ کے ان شاذ و نادر رازوں میں سے ایک ہے۔ جن میں جواب نظر تو آتے ہیں لیکن ملتے نہیں۔ دراصل وہ باریکی سے دیکھنے پر معدوم ہو جاتے ہیں۔ زندگی ہو یا تاریخ یا سیاست، ان مہمل باتوں اور تناقصات کا کیسا بھی کوئی جواب نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہہ کر اطمینان کر لیتا ہوں کہ تناقصات اکثر و بیشتر تضادات کو دور کر دیتے ہیں۔

اسلام-ایک الگ حکمت کی بنیاد

آنجہانی، گری لال جین نے اپنے ایک انتہائی دانشمندانہ اور مدلل ریسرچ پیپر 'دی ہندو فنامنا' میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ جو اس طرح ہے: 'کچھ مسلم عالموں نے، مسلم مملکت سے ایک خاص طور پر اسلامی مملکت کے علیحدہ ہونے کی سوچ کے جواز پر سوال اٹھایا ہے۔ اسلامی مملکت ایک نظریاتی تجویز تھی، جو مسلم تاریخ میں کبھی لاگو نہیں ہو سکی۔ کیوں کہ کوئی بھی مسلم ملک کبھی بھی مذہب کے ذریعے نہیں چلایا گیا۔ یہ گزشتہ چودہ سو سالوں کی تاریخ کی ایک سچائی ہے۔ اگر پیچھے مڑ کر دیکھیں تو یاد آتا ہے کہ ایران میں 1979 میں امام خمینی کی قیادت میں آئے انقلاب کی کامیابی کے مدنظر قرآن اور حدیث پر مبنی ایک اسلامی ملک کے قیام کا امکان اور اس کی ناگزیریت، اس وقت تک عالمی بحث کا ایک بڑا موضوع بن گیا تھا۔' 8

مسلم دنیا میں اقتدار کی لڑائی اتنی ہی تشدد آمیز اور بے اصولی رہی ہے، جتنی کسی اور معاشرے میں۔ اور عام طور پر مسلم حکمراں اتنے ہی عشرت پسند اور خود غرض بھی رہے ہیں جتنے کہ دوسرے حکمراں لیکن یہ تمام حقائق مناسب نظریے سے ہی دیکھے جانے چاہئیں۔ اور یہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک ہم اس مرکزی سوال کو نہ سمجھ لیں کہ اسلامی معاشرہ کو مذہب کے ذریعے نہیں چلایا جاتا بلکہ معاشرے میں مذہب کو مرکزی حیثیت حاصل رہتی ہے۔ 9 جیسا کہ

گائی اسٹین نے 'اسلام اینڈ دی ڈیسٹنی' میں لکھا ہے۔ یہ فرق بہت اہم ہے اور یہی اصلی محور ہے۔ اور غیر معمولی بات ہے کہ اسلام پر لکھی گئی بیشتر تحریروں میں یہ خیال ناپید ہے۔

انسانی معاملات میں 'ملک' کی مرکزیت ایک جدید صورت حال ہے۔ روایتی معاشروں نے ملک کو ایک ناگزیر برائی سے زیادہ نہ سمجھا نہ ہی مانا۔ کیوں کہ بڑے سماج پرانی بنیادوں سے باندھے نہیں جا سکتے تھے۔ اس لیے 'ملک' کا خیال پیدا ہوا اور پنپا بھی۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ خود کو قانون کا پابند بنانے والے فرقے کی شکل میں ہندو سماج کبھی 'ملک' پر غلط طریقے سے منحصر نہیں رہا۔ ہندو سماج کی یہ ایک قوت رہی ہے اور اس قوت کے سہارے ہی انہوں نے طویل عرصے تک غیر ملکی حکومت کے باوجود، اپنی شناخت کو محفوظ رکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے بچائے رکھنے کا ایک نظر بھی کیا۔

مذہب مرکزیت اور مذہبی نظام کے فرق کے سوال پر واپس آنے کے لیے مذہبی مرکزیت کی تشریح کرنا شاید ضروری نہ ہو، لیکن موجودہ گمراہ کن صورت حال کی پیش نظر یہ ضروری ہے۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک طاقت و اقتدار کا سرچشمہ اللہ ہی ہے، جس کے باہر نہ تو کچھ ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اللہ ہی واحد سچائی ہے۔ اگر گائی اسٹین کی مثال پھر سے دی جائے تو اس قرآنی حکم ''لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ'' کی تشریح اس طرح ملتی ہے۔ 'صرف اللہ ہے اور تو ہی سب کچھ ہے۔' یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ان کے تمام قوانین قرآن اور پیغمبر کی سنت سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اور گزشتہ چودہ صدیوں سے وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ اسی نے مسلم فرقہ کو اتحاد دیا ہے۔ اس لیے اسلامی علمیت کا اصل جذبہ اصول قانون پر ہے علم دین پر نہیں۔

'اسلام میں اصل مدعا یہ نہیں ہے کہ ملک کو مذہب سے جدا کیا جا سکتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ سماج کو مذہب سے الگ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ دوسرے سوال کا جواب تو بہر حال منفی ہی ہوگا۔ اس طرح پہلے سوال کا جواب بھی اس طرح یعنی منفی ہی ہونا چاہیے۔ پہلا سوال۔ 'کیا ملک کو مذہب سے جدا کیا جا سکتا ہے۔' اور اس وقت دوسرا۔ 'کیا سماج کو (بھی) مذہب سے الگ کیا جا سکتا ہے۔' عالموں کے قدیم محاورے کو استعمال کرتے ہوئے۔ گھوڑے کے آگے گاڑی کو باندھنے جیسا ہوگا۔ جدید ذہن اسلام کو صرف اس لیے نہیں سمجھ سکتا کہ اسلامی سماج کی جڑیں مذہب اسلام میں ہیں، اس کے برعکس نہیں۔ اس بات کو بھی گہرائی سے نشان زد کرنے کی ضرورت ہے کہ 'اسلامی سماج پوری طرح اس عیسائی سماج سے الگ ہے' حضرت محمد کی طرح حضرت عیسیٰ نے اپنے لوگوں کو قانون نہیں دیا تھا۔ وہ تو عیسائیوں کو رومن قانون کی شکل میں وراثت میں ملا تھا۔ ایک عام توضیح میں 'عیسائیت' اپنے یونانی۔ رومی ماضی سے صرف مذہب کے معاملے کو چھوڑ کر اور کسی بھی معاملے میں الگ نہیں ہے۔ اسلامی قانون کی جڑیں اسلام سے قبل کی روایتوں میں نہیں تھیں۔ یہ تو قرآن اور پیغمبر کی سنت پر مبنی ہے۔ عیسائی سماج ایک نئی 'تشکیل' نہیں تھی۔ اس کے برعکس اسلام کا سماج ایک نئی 'تشکیل' نہیں تھی۔ اس کے برعکس اسلامی سماج ایک نئی تشکیل تھی۔ گرچہ اس تشکیل میں کافی کچھ پرانا حالہ بھی لگا ہوا ہے (سناتن خیالات، اعتقاد و عقیدہ جسے اب ہندوتو

بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی ایک یکساں ہم آہنگی ہے۔ لیکن وہ تو اتنا الگ مسئلہ ہے کہ میں اسے یہاں نہیں چھونا چاہتا۔)

جوں جوں اسلام اپنے ابتدائی ایام میں سخت عربی بیک گراونڈ سے باہر آیا اس سے حکمراں وراثت میں ملے باز نطینی اور ساسانوی سامراجوں کے طور طریقے کے آگے جھک گئے، یہ سب انہوں نے بہت ہی آسانی سے کیا تھا۔ عظیم الشان مسلم روایات، جن کی ہم تزین کرتے ہیں اور جن پر مسلمان بھی فخر کرتے ہیں، اسی ارتقاء کی پیداوار تھیں۔ اس عظیم اسلامی تہذیب کے ایک پہلو پر وہ توجہ نہیں دی گئی۔ جو میرے خیال سے دی جانی چاہئے تھی۔ وہ اس توجہ کی اہل تھی۔ اس نے فارسی زدہ۔ یقینیت پسند اور آرام طلب اعلا طبقہ اور عقیدے کے پابند اور عام مسلمانوں کے مابین ایک خلیج قائم کر دی۔ ایک ایسی خلیج جو اسلام کے ذریعے مساوات پر زور دینے کے باوجود نہیں بھر سکی۔ اگر محکمسکو اس طرح کا اقتدار مل جاتا، جیسا آج اس کے پاس سماج میں ہے۔ تو وہ بالخصوص اسلامی فلسفے کے ارسطو کے عقلیت پسندانہ نزیز کے تناظر میں اسلام میں ایسی دوری پیدا کرتا جو بہت خطرناک ثابت ہوئی ہوتی۔ اسلام سماج اپنی تاریخ سے کافی اوپر اس لیے زندہ رہا کہ اس کے لیے ملک تو حاشئے پر ہی رہا ہے۔

یہاں ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس تحقیقی سلسلے کو یہیں بند کرنا ہوگا۔ اور جو تجزیہ ہم پہلے کر رہے تھے اس کو جاری رکھنا ہوگا: افق سے افق تک اور اتحاد سے تقسیم تک ــــ

تقسیم اور ہندوستان

پہلے ہندوستان کی تقسیم دو ملکوں میں ہوئی۔ پھر پاکستان کے ٹوٹ جانے سے وہ تین (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش) ہو گئے۔ تقسیم ہند کے اصلی نقشہ ساز نہرو نے خود ہی، اپنے خیالات اور سرگرمیوں کے بارے میں جلد ہی سوال کرنے شروع کر تے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد محمد علی جناح تقریباً ناممکن صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے، اتنی جلدی دنیا چھوڑ گئے کہ اپنے فعل پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے۔ لیکن انہوں نے بھی اس تقسیم کی سنگینی کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سوال کہ 'ہوا کیا تھا' انہیں بھی ستانے لگا تھا۔ حالاں کہ بدقسمتی سے ہمارے پاس ان کا کوئی تحریری وصیت نامہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی تحریر ہے جو ان کے اندرونی خیال ہے کے بارے میں ہمیں سب کچھ بتا سکے۔ ان کے سنہ سینتالیس سے پہلے کے بیان اور گیارہ اگست 1947 کی وہ تقریر جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے، درحقیقت ان کے خیالات کے محض اشارہ یہ ہیں، کوئی تشریح نہیں۔ (اس باب کا پہلا حصہ دیکھیں)۔

یہ ایک غیر متنازع سچائی ہے کہ زمین کی اس تقسیم نے ہندوستان کی عوام کو بہت گہرے زخم دیے ہیں۔ 6 دسمبر 1992 کے بعد ہماری جمہوریت کے عنوان سے منعقدہ ایک سیمینار میں، جو کہ 6 مارچ 1993 کو منعقد ہوا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ 10 کے اس وقت کے وائس چانسلر بشیرالدین احمد نے یوں اظہار خیال کیا تھا: 'میں ایک بار پھر جسے میں پہلا اصول کہتا ہوں، اس کی طرف جا رہا ہوں، ویسے 'اس پہلے اصول' پر زور دینے سے ہمیشہ کوئی مدد نہیں ملتی لیکن پھر بھی میں مانتا ہوں

کہ اس سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہم کس سمت میں جانا چاہتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ایسا کیوں ہوا کہ ہمیں 6 دسمبر ملا؟ 11 اور میں نے یہ پہلے ہی کہا ہے اور مجھے خود ہی اسے دوہرانا پڑے گا، جسے کرنے کے لیے مجھ میں صرف اس لیے حوصلہ پیدا ہوا کیوں کہ یہاں بیٹھے بہت سارے وہ لوگ ہیں، جنہوں نے مجھے ایسا کہتے پہلے بھی سنا ہے۔ سب سوچتا ہوں کہ ہمیں 6 دسمبر کیوں ملا؟ اسکے اسباب سب سے ایک سبب یہ تھا کہ آزادی کی قومی تحریک کا ایک ختم نہ ہونے والا ایجنڈا ہے، میں سوچتا ہوں کہ اس میں سے 'ہندوستانی قومیت' کیا ہے، اس سوال کا جواب مناسب طریقے سے ابھی تک تلاش نہیں کیا گیا ہے۔

'میں واقعی اس پر نکتہ چینی کے لیے تیار ہوں، اور میں بہت تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن بنیادی طور پر جس طرح میں اسے دیکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس سمت میں ہندوستانی قومیت اب پروان چڑھ رہی ہے، وہ ایسی سمت ہے، جو ثقافتی طور پر ہندو ہے، اور میں بہت سے اسباب کی بنا پر سوچتا ہوں کہ اس سمت میں قومیت کا فروغ رخ سا گیا ہے۔ لازمی طور پر اس میں ایک قسم کا انجماد آ گیا ہے اور وہ ناگزیر طریقے سے تقسیم کی وجہ سے ہی آیا ہے۔ تقسیم کے ذریعے پیدا کی گئی سورتحال ایسی تھی کہ وہاں اس پر بحث کرنے یا اسے جاری رکھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ وہ تو جلتی ہوئی آگ پر پانی ڈالنے کا وقت تھا اور ہمارے معاملات کی قیادت ان دنوں پنڈت نہرو کر رہے تھے، جو کہ نظریاتی طور پر ایک جدید اور سیکولر ملک کے تئیں عہد بند تھے۔ اس میں کچھ بھی غلط نہیں ہے۔ میں خود اس سے متفق ہوں۔ میں خود ہندوستان کو ایک جدید اور سیکولر ملک بنتے دیکھنا چاہوں گا۔ اس کا خواہ کچھ بھی مطلب ہوا اور اس پر ہم معد میں بات کر سکتے ہیں۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ پنڈت جی کی موجودگی، ان کا زبردست اثر اور پھر بھی وہ وہ اس مسئلے کو نہیں حل کر سکے۔ انہوں نے تو اسے صرف ملتوی کر دیا۔ اور سب سوچتا ہوں کہ اس التوا میں اس طرح سے اکٹھا زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ اب یہ قابل ذکر سماجی تبدیلی آئی ہے۔ یہاں ایک وسیع درمیانہ طبقہ ابھر آیا ہے، جس کی گاؤوں سے شہروں تک رسائی ہو گئی ہے۔ اب ان باتوں کے بعد 'ہندوستانی قومیت' کیا ہے؟ یہ سوال تو اٹھنا ہی تھا۔ تقسیم بالآخر علیحدہ الیکٹوریٹ کے مطالبہ، کا ریکا براہ راست نتیجہ ہیں تو تھا اور اس نے اس تسلسل میں جناح کے معروف چودہ نکات کی مانند کئی اور مطالبات شامل کر لیے، جس کی وجہ سے آج مسلمانوں کے مسائل کا کوئی اظہار، مسلم شناخت کا اظہار یا اس کی تڑپ ہندوستان کو پھر تقسیم کی یاد دلاتی ہے اور تکلیف پہنچاتی ہے۔ مسلمانوں کی شکایتیں بڑھ گئیں ہیں کہ کم نہیں ہوئیں۔ لیکن افسوس یہ اختلاف اب خود ان کے ماضی میں جکڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا 'ناانصافی کے خلاف احتجاج' سے الگ کوئی اور فلسفہ مثبت تعاون دینے میں ناکام ہی رہتا ہے۔ اس لیے تمام پارٹیوں خطروں کو مبالغہ آمیز انداز میں بتانے، اندیشوں کا اظہار کرنے اور ووٹ ہتھیانے کے تمام ہتھکنڈے اپنائی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ خالص مشورہ دینے کے لیے آج کوئی نہیں ہے۔

ایک حساس اور غور فکر کرنے والے نہرو نے کافی اندرونی سوالات ہمارے لیے چھوڑے ہیں۔ انہوں نے کتاب 'ڈسکوری آف انڈیا' (بھارت کی کھوج) میں 1947 سے قبل تقسیم ملک سے کافی پہلے اس سوال اور تمام چیلنجوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اسے 1944 میں احمد نگر قلعہ کی جیل میں انہوں نے لکھا تھا۔ (جناح کے) قومی نظریہ کو مذہب کے ساتھ

پہنچانتے ہیں۔ یہ آج کوئی عام تجویز نہیں ہے۔ لیکن کیا ہندوستان کا ایک یا دو یا متعدد ملکوں کی طرح بتایا جانا مناسب ہوگا؟ یہ بات درحقیقت کوئی یعنی ہی نہیں رکھتی کیونکہ قومیت کا جدید خیال اب تقریباً ملک کے خیال سے دور جاچکا ہے۔

'دوسوں کی مانند ہندوستان میں ہم ماضی کے واقعات سے پیدا شدہ نعروں' گھسے پٹے جملوں اور اب غیر رہم ہو چکے نظریات کی مضبوط گرفت میں ہیں جن کا اصل کام مدلل خیال اور موجودہ حالات کے سلسلے میں غیر جانبدار کو روکنا ہے۔ گول مول باتوں اور غیر واضح آدرشوں کی بھی ایک ذہنیت ہے' جو جذباتی ردعمل کو ابھارتی ہے ...حال ہی کہ برسوں میں بھی ہندوستان کے مستقبل پر، خاص کر تقسیم یا ہندوستان کے اتحاد پر کافی کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے۔ پھر بھی چونکا دینے والی یہ سچائی باقی بچی رہتی ہے کہ وہ جو'پاکستان' یا تقسیم کی تجویز رکھتے ہیں، انہوں نے یہ نہیں سمجھایا کہ آخر ان کا مطلب کیا ہے اور تقسیم میں پوشیدہ سچائیوں پر غور کرنے سے مسلسل انکار کیا ہے۔ وہ تو حرف ایک جذباتی زمین پر ہی چل رہے ہیں...اس لیے' پاکستان' یا 'اکھنڈ بھارت' لڑتی ہیں اور یہ بات اچھال کر ایک دوسرے کی طرف پھینکی جاری ہے۔ یہ واضح ہے کہ اجتماعی جذبات اور ہوش مندی یا مدہوش کے جھٹکے معنی رکھتے ہیں، اور ان کی طرف توجہ دے جانی چاہیے۔ کم از کم یہ تو واضح ہے کہ حقائق اور سچائی ہمارے نظر انداز کرنے سے یا جذبات کی پرت کے نیچے ڈھک دیے جانے سے غائب ہو جاتے...'

'یہ بھی واضح ہے کہ ہندوستان کا مستقبل خواہ کچھ بھی ہو' اور اگر ایک مسلسل تقسیم ہوتی بھی ہے، تو ہندوستان کے الگ الگ حصوں کو سو مختلف معنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا'۔ اس سب کے بعد نہرو اس میں اضافہ کرتے ہیں' جیسا کہ ایک سرکردہ افسر نے کہا ہے:' وقت کی دلیل ملک کے سامنے الگ الگ انتہائی اصلاح پسندانہ متبادل کی تجویز رکھتی ہے:' آزادی اور یونین یا عدم یونین کے ساتھ انحصار'

یہ ایک افسوسناک تشویش ہے کہ' یونین کے ساتھ آزادی یا عدم یونین' جیسے خیالات کے باوجود آخر میں نہرو تقسیم کے حامی ہو گئے تھے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ 15 اگست 1947 کو ملک کی آزادی نے ان تمام تشویشوں کو ان کے دفاع سے نکال دیا ہو۔ بالآخر کچھ دنوں بعد ہی گاندھی جی کا قتل، تقسیم سے پیدا شدہ زبردست انسانی تکالیف، لوگوں کی آپسی مارکاٹ اور باز آبادکاری-واقعی صحیح معنوں میں بہت ہی غیر معمولی حالات تھے۔ ہلاک شدگان کی تعداد کا دوبارہ ذکر یا پھر پناہ گزینوں کی تکالیف درحقیقت انسانی مصائب کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کر ہی نہیں سکتے۔ اسٹینلی وولپارٹ نے' شیم فل فلائٹ' میں لکھا ہے کہ' آزادی' کے ان بھیانک ایام میں قتل کے تباہ کن واقعات اور بہت سے لوگوں کے گھروں سے اجڑنے کے دور سے ملک جیسے ہی گزرا، پنڈت نہرو نے ماونٹ بیٹن کے جاتے وقت ان سے کہا تھا:

'میرے لیے اور دراصل کس کے لیے بھی' گزشتہ سال میں ہم نے کیا کیا' اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہم اس کے بہت قریب ہیں اور واقعات سے بہت نزدیک سے وابستہ ہیں۔ ممکن ہے کہ ہم نے، آپ نے اور میں نے بہت غلطیاں کی ہوں۔ ایک یا دو نسل کے بعد کے مورخ یہ فیصلہ کرنے کے ہم نے کے اہل ہوں گے کہ ہم نے کہا صحیح کیا اور

کیا غلط۔ یقین کیجیے کہ ہم نے صحیح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس لیے ہمارے کئی گناہ اور ہماری غلطیاں بھی معاف ہو جائیں گی۔'12

پنڈت جواہر لعل نہرو کے اس سوال کے جواب میں کئی شبہات ہمیں گھیر تے ہیں اور ان سے پیدا شدہ جوابات ہمیشہ اتنے مہذب نہیں ہوتے جتنا کہ نہرو یا دوسروں نے اس وقت سمجھا تھا اور ممکن ہے کہ لوگ آج بھی سمجھتے ہوں۔

بھوپال کے مرحوم نواب صاحب کے ساتھ خط و کتابت میں نہرو نے 9 جولائی 1948 کو تقسیم ملک سے متعلق ان کے سوالوں کا جواب دیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ 'یہ ہماری بدقسمتی ہے، ہندوستان اور پاکستان کی بدقسمتی کہ بُرا پاگل پن جیت گیا... میں نے اپنی بالغ زندگی کا بڑا حصہ بعض اصولوں اور آدرشوں پر چلنے اور انہیں اپنانے میں گزارہ ہے....... مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ تیس سال سے زیادہ کی میں مسلسل کوششوں کے باوجود کامیابی نہیں ملی، تو اس سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے اور جو تکلیف پہنچی ہے کا آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں؟ میں جانتا ہوں کہ بہت سے معاملات میں الزام ہم پر ہی ہے۔ ملک تقسیم ہوا اور ہم سب نے اسے تسلیم کر لیا۔ کیونکہ ہم نے سوچا کہ اس طرح، یہ خواہ کتنا ہی دردناک ہو ہمیں کچھ شانتی مل سکتی ہے۔ لیکن شاید ہم نے غلط طریقے سے کام کیا تاہم اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن تقسیم کے نتائج اتنے بھیانک رہے ہیں کہ کوئی بھی شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتا ہے کہ اس معاملے کو کسی اور بھی طریقے سے حل کیا جا سکتا تھا یا کسی اور بات کو ترجیح دی جا سکتی تھی... تاریخ کا چراغ علم ہندو پاک کے معاملات کی صورتحال کے خلاف بغاوت کرتا ہے... شاید یہ جدوجہد ہندو پاک میں برسر اقتدار لوگوں کی حماقتوں اور چھوٹے پن کی وجہ سے ہے۔ (لیکن) آخر میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہند پاک ایک دوسرے کے قریب آئے گا... کسی قسم کی کوئی فیڈرل کڑی ہو سکتی ہے۔ امن و شانتی کا کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ (اس کے بعد اگر) متبادل ہے تو... جنگ۔'13

یقیناً یہ ایک مخلصانہ اور سرزہ انگیز خط ہے۔ اظہار تاسف، تشویش، اپنے کاموں کا ایماندارانہ جائزہ، اپنی ہی گرمیوں پر فیصلے کرنا، بحیثیت انسان نہرو کی طاقت اور نئے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کی عظیم ناکامی۔ اس میں دونوں چیزیں پنہاں ہیں۔

وہ تقسیم جس نے ہمارا سکھ چین چھین لیا

'ہم نے سوچا کہ ہمیں کچھ شانتی مل سکتی ہے۔' نہرو بھوپال کے نواب کو دل چھو لینے والے انداز میں لکھا تھا۔ ان کا یہ اندازہ جائز تھا کہ ہندو اور مسلمان، عقیدے کی بنیاد پر ہندوستان کی اس تقسیم کو منظور کر کے، ہمارے قومی اختلافات کا حل نکال کر ایک مستقل امن و امان والے دور کا آغاز کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور آگے چل کر 'شانتی' نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ ایسا کیوں ہو گیا؟ اور اس تقسیم نے کس طرح ہمیں لوٹ لیا؟ ہمیں مستقل امن و چین اور سکون کے ساتھ رہنے کے بجائے مسلسل کشیدگی، جنگ اور مستقل بدامنی وراثت میں ملی۔

جناح کا تقسیم ملک کا یہ سفر ہماری تحقیق کا مرکزی نکتہ اس لیے ہے کہ مسلمانوں کے 'الگ قدم' ہونے کا غلط خیال پیدا ہوا۔ جناح کے اس نظریہ میں کئی بنیادی خامیاں ہیں۔ جن میں اہم یہ ہے کہ اس طرح تو ہندوستانی ہونے، یہاں کی مٹی سے گڑھے جانے اور شناخت پانے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی حرارت میں تپ کر نکھرنے کی اصل بات کو ہی مسترد کر دینا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان بلاشبہ ایک الگ مذہب کے پیروکار ضرور ہیں، اور تھے بھی، لیکن بس اتنا ہی تو تھا۔ وہ باہری نہیں بنیادی طور پر اس سرزمین کے ہیں۔ وہ اسے خواہ کسی بھی انداز سے دیکھیں۔ جب تک وہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے حکمراں تھے، اس وقت تک تو مسلمان اپنی مرضی سے ہندوستانی ہی تھے۔ اور جب آخری مغل بادشاہ سے اقتدار چھین لیا گیا۔ تب سے غیر یقینی اور عدم تحفظ کے بیج ان کے دماغ میں پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد ایسے کئی واقعات ہوئے جو رفتہ رفتہ جناح کی علیحدگی کی وکالت کی حتمی شکل میں یکجا ہو گئے۔ اور پھر اس کا نتیجہ 1947 کی تقسیم کی شکل میں سامنے آیا۔

مونٹ فورڈ اصلاح 5 کا 'ریزرویشن' ایک ابتدائی نکتہ بن گیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو ایک علیحدہ انتخابی اور انتظامی حیثیت دی اور وہ ایک الگ سیاسی زمرے میں رکھے جانے لگے۔ پہلے ریزرویشن کے خصوصی فیصلہ، پھر ایک چوتھائی سے ایک تہائی اور پھر اقلیتی حقوق۔ اس کے ساتھ ہی جہاں وہ اکثریت میں ہوں وہاں ان کی حفاظت، اس کے بعد مساوات اور بالآخر تقسیم۔ یہ ایک مسلسل اور ہمیشہ بڑھنے والا مطالبہ بن گیا۔ گویا ایک ایسا بہاؤ جو مسلسل بڑھتا جا رہا ہو۔ البتہ اگر تقسیم کا دعوا کیا بھی جانا تھا، تو وہ کس لیے؟ تحفظ، فرقہ وارانہ انتظام، امن و امان۔ ان میں کوئی سا ایسا مطالبہ تھا جس نے تقسیم کے نعرے میں سب سے زیادہ توانائی بھر دی تھی؟ چوں کہ ان میں سے کوئی بھی نکتہ ہندوستان کی تقسیم کے لیے قابل قبول نہیں، تو پھر یہ تصور کہاں سے آیا کہ 'مسلمان ایک الگ قوم ہیں؟' ۔ پہلی بار سننے پر یہ نعرہ پوری طرح سے ناقابل فہم اور ناقابل قبول ہے۔ لیکن ناقابل قبول ہوتے ہوئے بھی، وقت کے ساتھ ساتھ اس خیال نے دھوکے سے ایک گونج حاصل کر لی۔ گویا کوئی بہت بڑا نظریہ پروان چڑھ رہا ہو۔ اس کے ساتھ بھی یہ مطلب بھی اس میں پوشیدہ سا ہو گیا کہ اس کی کوئی بھی مخالفت (اگر کی بھی گئی) تو وہ 'ناانصافی' کے مترادف ہو گی۔ اس کے ساتھ بالآخر کانگریس اور بوریا بستر سمیت ایسے انگریزوں نے ایک لمبے وقفے تک اور مسلسل یہ کوشش کی کہ ہندوستان کو تو بانٹنا ہی ہے۔ اس کے نتیجے میں بٹوارے کا کام محض تعداد کا تبادلہ رہ گیا۔ 'تم یہ رکھ لو، میں یہ لوں گا' اور اس طرح اس قوم سے ملک کو توڑ دیا گیا۔ یہ ایک ایسی تقسیم تھی، جو اپنے آپ میں، کسی مستقل قسم کی بات تو جانے دیجیے، کسی بھی قسم کی شانتی بھی نہیں لا سکی۔ پہلے اس نے ہندوستان کو تقسیم کیا اور پھر ہندو مسلم دشمنی پر ایک پختہ مہر لگا دی۔ پہلے جو ایک گھریلو ہندو مسلم جھگڑا تھا، وہ اب بین الاقوامی اور ہند پاک مناخرت اور جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ ہم نے اپنی گھریلو نااتفاقیوں کو آفاقی بنا دیا۔ ہندوستان کے ساتھ اشتعال انگیز چھیڑ چھاڑ پاکستان میں ایک پالیسی بنیاد بن گئیں۔ اور یہ بات شروع سے ہی اس کی ملکی پالیسی بن گئی۔ اگر وہ لوگ ایسا سلوک نہیں کرتے تو پاکستان اپنی تخلیق کا سبب ہی کھو دیتا۔

'مسلمان ایک الگ قوم ہیں' کی تجویز رکھنے میں محمد علی جناح بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے پاکستان کے ظہور کے بعد ہندوستان کے ساتھ مستقل امن، دوستی اور اتحاد کی بات کی تو یہ

واضح ہوگیا کہ وہ کتنی سنگین غلطی کر رہے تھے۔ جناح سے زیادہ توٹ مرحوم ضیاء الحق حقائق سے زیادہ قریب تھے۔ کیوں کہ جب ان سے پوچھا گیا (یہ ایک سنی ہوئی بات ہے اس کی سچائی پر سوال اٹھ سکتا ہے) کہ پاکستان نے ہندوستان کے تئیں اتنی زیادہ تیز پالیسی کیوں اپنا رکھی ہے، تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ 'ترکی یا مصر یا ایران، اگر وہ خود کو جارحانہ انداز میں مسلمان بتانا چھوڑ دیں تب بھی وہ وہی رہیں گے جو آج ہیں۔ یعنی ترکہ 'مصر اور ایران۔ لیکن اگر پاکستان جارحانہ انداز اپنا کر یہ وقت کٹر اسلامی نہیں رہتا ہے تو وہ پھر ہندوستان ہو جائے گا۔' یہ فکر 1947 سے لے کر آج تک پاکستان کے تمام رہنماؤں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔

پیدائش کے وقت سے ہی تاریخ کا سیاہ اور خیال سایہ پاکستان کو ستا تا رہا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ پاکستان کے نام نہاد 'دوست' ملک اکثر اس کے 'مالک' بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اب بھی نمبر یعنی تناؤ میں رہتا ہے۔ لیکن وجہ صرف یہی نہیں کہ اور بھی کئی ہیں۔ تقسیم علیحدگی، غیریت کے خیال پر مبنی پاکستان اور ہندوستان سے الگ ہوا ایک ملک اپنی اسلامی شناخت پر مسلسل زور دینے کے بجائے اور زیادہ کچھ نہیں کر پایا۔ اس لیے اس نے پہلے ایک اسلامی مملکت ہونے کی شناخت قائم کی۔ ایک الگ ملک، مسلمان یا اسلامی ملک کی شکل میں بننا، یہ نہ تو ترقی کا مظہر ہے اور نہ ہی ترقی یافتہ۔ اس بات نے دراصل پاکستان کو ایک جدید اور سرگرم ملک کی شکل میں بدلنے سے روک دیا ہے۔ اس لیے یہ اتنا تکلیف دہ ہے کہ پاکستان آج بھی ایک صحیح ملک کی شناخت سے دور ہے۔ اور اسلامی مملکت بن جانے کے بعد یہ تو فطری ہی تھا کہ پاکستان بالآخر ایک جہادی ملک بنے۔ جس کے بعد شاید یہ ناگزیر ہی ہوگیا کہ وہ دنیا میں دہشت گردی کا مرکز بن جائے اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہوا کہ دنیا پر قید بن کر لوٹنے والے بھی نام جیسے کے القاعدہ، اسامہ، طالبان وغیرہ پاکستان کو ہی اپنا گھر بنالیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ 1947 تقسیم سے پاکستان کا آغاز بہت سی انتظامی دشواریوں کے ساتھ ہوا تھا۔ آزادی کے بعد انگریزی حکومتوں سے الگ ہوئے ہندوستان کی تو ایک قدیم شناخت تھی۔ اس کے پاس برسرکار ایک ماہر انتظامی ڈھانچہ تھا اور ہندوستان کی سرزمین کی بے مثال وسعت، اس میں ملکی جذبہ، اس کا لچک دار رویہ، بار بار متعدد دھچکوں کو برداشت کرنے کی اس کی طاقت اور اس کی طویل تاریخ سب کچھ اس کے پاس تھا۔ پاکستان کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا۔ آزادی کے بعد وہ چیلنج جن کا اس نے سامنا کیا بہت مشکل تھے۔ ابتداء میں پاکستان محض ایک خیال تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک وسیع تر سیاسی رول حاصل کرنے کی شترنجی چال اور انتظامیہ اور سیاست میں مسلمانوں کے لیے اہم مقام حاصل کرنا تھا تاکہ مسلمانوں کا مستقبل 'ہندو کانگریس' کے غیر معتبر سیاسی ہاتھوں میں نہ چھوڑا جائے بلکہ وہ خود اپنی سیاسی اور سماجی تقدیر کارساز بن سکیں۔

اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا، خود جناح بھی نہیں، کہ پاکستان کی شکل وصورت کہاں اور کیسی ہوگی۔ اور نہ ہی

جناح نے کبھی پاکستان کے خاکے کی تشریح کی تھی۔ کیوں کہ وہاں تو ہمیشہ صرف اسلام کے نام پر دی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کا پاکستان کا خواب حقیقت میں بدلا تو اس کے لیے عملی طور پر کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ اس کے اعلان کے ساتھ ہی مسائل ترجیحات کا کوئی پیشگی اندازہ بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ کس کو معلوم بھی نہیں تھا کہ آخر پاکستان کی تصویر کیسی ہوگی۔ پھر بھی 14 اگست انتظار تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور نہ ہی جناح میں اس کی طاقت تھی کہ وہ اس کے التوا کی بات کہیں۔

'وہاں سے بھی کم وقت میں صوبوں کو بانٹنا، سول اور مسلح سروسز جو صلے کرنا اور املاک کی بھی تقسیم کرنی تھی۔ اس قسم کے نظام الاوقات نے پاکستان کے لیے بڑے مسائل پیدا کر دیے تھے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اس وقت تک حکومت پاکستان کو انتظامی، اقتصادی اور فوجی اداروں کے قیام کے لیے حامی وسائل بھی وراثت میں نہیں ملے تھے۔ 'کروڑوں پناہ گزینوں کی بے دخلی نے، باز آبادکاری کے اس وزن کے ساتھ ایک نو تشکیل شدہ وناق آموز شک پر اپنا بوجھ بھی لاد دیا۔' پاکستان ایک سابق سفارت کار کا یہ تبصرہ ان چیلنجوں میں سے ایک ہے، جو اس وقت پاکستان کے سامنے تھیں۔ ایک نو آموز پاکستان کے لیے ایسے مسائل سے نجات پانا، نفسیاتی تبدیلی کرنا اور اس کے ساتھ ہی (ہندستان کا سامنا کرو، کی پالیسی نہ تمام باتیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئیں۔

اس لیے میں کہتا اور مانتا بھی ہوں کہ اس وقت ہندوستان کو اسے کچھ اور دینے کی ضرورت تھی۔ اسے اپنی وسیع تر (روح کی بھی) دریا دلی کے ساتھ پاکستان کی سچائی کو، جو کہ اس کے اپنے جسم ہی سے تو الگ ہوا تھا، تسلیم کرنے کی ضرورت تھی میں یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ پکار اس وقت بھی بہت مشکل تھی اور آج بھی ہے۔ بیداد تقسیم کے صدمے نے پورے برصغیر کی حساسیت خاکستر کر دیا تھا۔ ایسی صورتحال میں دریا دلی یا اعلا ظرفی آسانی سے نہیں آسکتی تھیں۔ زمین کو کاٹنے کے اس طریقے۔ ایک پوری نسل (شاید ایک سے بھی زیادہ) کے دفاع کا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منتشر ہو جانے اور غیر انسانی طریقے سے کروڑوں انسانوں کے اجڑنے کی صورتحال نے ایک دوسرے کی ضرورت کو اور کسی قسم کی مروج کو بھی ایک غیر انسانی مطالبہ بنا دیا کم از کم شروع میں تو ایسا ہی تھا۔ پاکستان اپنی قومیت کا سفر نہ تو متبادلوں کی بہتات کے ساتھ شروع کرایا تھا، نہ ہی بھائیوں کے تنازع میں جائیداد کی تقسیم کی مانند اور ہی کسی رواداری کے معاہدے کی شکل میں جو تقسیم پہلے سے ہی اتنی تلخ تھی اس میں مزید گہری تلخی گھول دی گئی۔ ان حالات میں کیا ہندوستان کے اندر اور سوجھ بوجھ پیدا ہو سکتا ہی تھی؟ اب تو مجموعی طور پر یہ ایک علمی سوال ہی رہ جاتا ہے۔ لیکن پاکستان کے لیے جو ایک بردار چیلنج تھا، وہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا تھا، اور یہ چیلنج وہیں بگڑ گیا تھا۔ اور یہ خیال بھی تکلیف دہ ہے۔ 'قیام پاکستان کے بعد وہاں عملی نقطہ نظر سے کوئی صنعت نہیں رہی تھی۔ ان کی زرعی پیداکی فنڈی ہندوستان میں تھی۔ پاکستان میں دنیا کا تین چوتھائی جوٹ پیدا ہوتا تھا لیکن اس کے کارخانے سبھی ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ غیر مسلم صنعت کار طبقہ پاکستان کے مستقبل کے تعلق سے غیر یقینی میں مبتلا ہو کر اپنا سرمایہ لے کر دور چلا گیا تھا۔، پاکستان کو جو مالی جائیداد دی گئی تھی اس پر ریزرو بینک آف انڈیا کا قبضہ تھا اور جنوبی ماحول میں منزم انداز میں اس کا تبادلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔14

'پاکستان کا آئیڈیا، مسلمانوں کو ایک الگ قدم کی شکل میں ایک طرح سے وصیت کے طور پر ملا لیکن یہ وصیت واضح طور پر ہندوستانی تھی۔ پاکستان کے سرکردہ حمایت اور پاکستان کے سکون، سب ہندوستانی ہی تھے اور خود کو ثقافتی طور پر ویسے ہ پہنچانتے تھے۔ حالانکہ وہ 'ہندو ہندوستان' کی کسی بھی تجویز کے پوری طرح خلاف تھے اور خلاف رہے بھی۔ یہ ہند پاک رشتوں کی تکمیل، بالخصوص اس کی قومی شناخت کا ایک حساس اور مشکل پہلو تھا اور آج بھی ہے۔ آج کے پاکستان کی شناخت جزوی طور پر ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ جن سے پاکستان اپنی شناخت میں ایک 'ہندوستانیت' لیے ہوئے ہے۔ اسی طرح جیسے کہ آج بھی شمالی ہند کے حصوں کی بناوٹ پاکستان کی مانند ہے۔ پاسکتان ان تمام پہلوؤں کو خارج کرتا ہے اور ان سے جلا بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ پاکستان کی شناخت کی ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ حالاں کہ اسے اکثر نظر انداز ہی کیا گیا ہے، لیکن اسے پورطرح مسترد نہیں کا جاسکتا۔ کسی کے جغرافیہ کی حقیقت کیے چھوڑی جاسکتی ہے یا کیسے فراموش کی جاسکتی ہے۔ اور پھر عام تاریخی سچائی کو پوری طرح کیسے مٹایا جاسکتا ہے۔

پاکستان کے جو دوسرے نظریات میں، ان سب سے کچھ موثر رہے اور کچھ نہیں۔ پاکستان کی خواہش مغل شاہی خاندان، کا جدید چہرہ بننے کی رہی۔ لیکن ایسی خواہشیں موجودہ اور تاریخی، دونوں حقائق کو پوری طرح مشکوک بنا دیتی ہیں۔ مغل شمالی ہند کے ایک حصے پر مسلسل حکومت میں صرف اس لیے کامیاب رہے کہ انہوں نے اس وقت کی دیگر موثر طاقتوں جیسے راجپوتانہ کی راجپوت ریاستوں سے سیاسی معاہدے کرلیے تھے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے ساتھ ہوڑ میں پاکستان نے مغربی طاقتوں سے تعلقات قائم کیے جو بالآخر الٹے پڑ گئے۔ اور بدقسمتی سے پاکستان 'کرائے پر لیا ہوا ایک ملک' ہو گیا۔ پاکستان وسطی ایشیا کے ساتھ ایک شقافتی رشتہ (جو ہندوستان کا صوبوں سے رہا ہے) قائم نہیں کرسکا۔ اس کی کڑی سینٹرل ایشیا سے جڑتی ہی نہیں کیوں کہ اس کی جغرافیائی، سیاسی اور تہذیبی شناخت پوری طرح الگ ہے۔ دراصل پاکستان کے لیے اس کی خواہشیں اس کی سچائی سے بہت بڑی ہو گئیں۔

'ایک شکستہ آزادی'

ہم اسے خواہ کیسے بھی دیکھیں، حقیقت تو یہی ہے کہ ہندوستان کو آزادی ٹوٹی ہوئی اور شکستہ ملی۔ وہ متعدد اسباب سے ادھوری ہی رہی۔ ہندوستان اور پاکستان کو آزادی تو 1947 میں مل گئی۔ لیکن وہ دونوں ملکوں اور عوام کے لیے ایک قیامت صغریٰ بن کر تشدد اور تکلیف دہ تقسیم کے ساتھ آئی اور اس وجہ سے کروڑوں لوگ غیر انسانی طریقے سے اجڑ گئے۔ یہ کروڑوں لوگ جن میں سے بیشتر اپنے قدموں پر چل کر، ایک نئے اور اجنبی ملک میں 'مہاجر' بن کر پہنچے۔ لیکن ان کا جو کچھ پیچھے چھوٹا وہ گھر بار اور خاندان قبیلہ تو تھا ہی، ایک گہری تلخی اور دردناک صدمہ بھی تھا جو آج بھی ان ملکوں کی روحوں کو تڑپاتا رہتا ہے۔

جنہیں اس تقسیم سے دکھ پہنچا، ان میں گاندھی جی بھی تھے۔ جو اپنے آخری دنوں میں اپنے کردار کے برعکس

مایوس کن اظہار کرنے لگے تھے۔'میں ناکام ہوکر مرنا نہیں چاہتا۔لیکن میں ناکام ہوسکتا ہوں۔'15 اور گاندھی کے لیے انگریزوں سے حاصل یہ آزادی ایک چیخ بھری ناکامی سی تھی۔ کیوں کہ وہ اپنے مرکزی مقصد: آزاد غیر منقسم ہندوستان کے ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد سے محروم رہ گئے تھے۔ انہوں نے بار بار ایسے مایوس کن خیالات کا اظہار کیا'میری مخالفت کے باوجود تقسیم ہوئی۔ اس نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے۔ لیکن تقسیم کے طریقے نے مجھے اور بھی گہرا دکھ پہنچایا ہے۔'16

ہندوستان کے اتحاد کی مخالفت کرنے کی کئی اسباب تھے۔ تقسیم تو ہونی ہی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی ان دنوں میں زبردست تکان نے انگریزوں کو، نہرو کو، جناح کو، یہاں تک کہ پٹیل سمیت تمام لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ گاندھی جی نے تنہا ہی اس تقسیم کو'شکستگی' کا نام دیا۔صرف وہی تھے، جنہوں نے شروع سے ہی اس کی مخالفت جاری رکھی تھی۔ لیکن اب تو وہ اکیلے مجاہد بچے تھے۔شاید اس لیے اب انہوں نے بھی اب اپنے ہاتھ پیر سمیٹ لیے۔

ہم اس راستے پر متعدد بار چل چکے ہیں لیکن خود کو غدا کرنے سے روک نہیں پاتے اور رہ رہ کر خیال کرتا رہتا ہے کہ جناح اور گاندھی کا ذاتی ٹکراؤ چاہے جتنا بھی تیز رہا ہو، لیکن قائد اعظم اور نہرو کے، مابین یہ کہیں زیادہ تلخ تھا۔ دونوں کے اختلافات اتنے گہرے ہوگئے تھے کہ وہ اپنے آپ میں ملک کی تقسیم اور آزادی کی شکستگی کی وجہ بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی نہرو کی قیادت شوال کانگریس وہ سیاسی پارٹی بن گئی تھی جو تقسیم سے متفق ہوگئی تھی۔ لہٰذا اقتدار کی گدی پر بیٹھنے والی اس پارٹی کی حکومت اور اس وقت کی کانگریس پارٹی دونوں کروڑوں لوگوں کے خون خرابے کو روکنے میں ناکامی کے براہ راست ذمے دار ہیں۔ ایسے بڑے پیمانے پر برادرانہ قتل وخون ہوا کہ ہماری سرزمین سرخ ہوگئی تھی اور آج بھی ہندو مسلم تعلقات دشمنی کے سانچے میں قید ہیں۔ اس وقت کے دو فرقوں کے گھریلو اختلافات فوراً عالمی شکل اختیار کرکے بین الاقوامی ایشو میں تبدیل ہوگئے۔ ایک بین الفرقہ مسئلہ ہند پاک تنازع میں بدل گیا۔ یہ ایک ایسا سوال بن گیا جس میں اقوام متحدہ بھی شامل ہوگئی۔ یہ کتنی اور کیسی مجرمانہ ناعاقبت اندیشی ہے؟ یہی وجہ تھی کہ گاندھی آخر تک پہلے آزادی کی وکالت کرتے رہے اس کے بعد قیام پاکستان کی۔ جناح متفق نہیں ہوئے۔ لیکن سب سے بڑا افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں نہ تو نہرو گاندھی سے متفق ہوئے اور نہ ہی پٹیل۔

جناح ہندوستانی مسلمانوں کی اصل آواز کی شکل میں قطعی طور پر 1937 کے بعد سے ہندوستان کے اقتدار میں حصہ چاہنے لگے تھے، تقسیم نہیں۔ وہ آزاد ہندوستان میں فیصلہ ساز مشینری میں ایک اہم مقام چاہتے تھے۔ انہوں نے متعدد بار کہا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو'ہندوستان کے مسلمان الگ قوم کے تمام دعوے چھوڑ دیں گے۔' ہندوستانی مرکزی قانون سازیہ میں مسلمانوں کی پوری طرح قابل شناخت موجودگی ان کا اہم مطالبہ تھا۔ اس کے ساتھ مسلم لیگ کی مکمل حکمرانی والے صوبے ہوں تا کہ بقیہ ہندو اکثریتی صوبوں کے مقابلے میں وہ ایک مستقل طاقت بن سکیں۔ نہرو اس وقت 'کوئی کثیر ثقافتی اکثریت پسندی نہیں تھے۔ وہ اکثریت کی حکومت کے ساتھ ساتھ مساوی حقوق، سیکولر نظام حکومت اور یکساں شہریت، کے حامی تھے۔

انہوں نے ان دنوں عام سمجھ سے الگ ہٹ کر سوچا۔ نہرو یہ جانتے تھے کہ تقسیم اور ظہور پاکستان کے درمیان 'ایک جیسی اور یکساں شہریت' کو عمل میں لانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ کیا ہم تقسیم کو روک نہیں سکتے تھے؟ پھر اس کے ساتھ ہی بعض دوسرے سوال بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے 'وہ کون سا واحد سنگین واقعہ تھا' اگر واقعی ایسا کون سا واقعہ ہو سکتا تھا، جس کی وجہ سے ہندوستان کا اتحاد ناممکن ہو گیا؟ یا سب صرف برسوں تک جاری تحریک آزادی کی تکان تھی، جس نے ہم سب کو جھکا دیا اور ٹوٹنے پر مجبور کر دیا؟ کیا ایسا ہے کہ ہماری تقسیم کا مرکز و محور قیادت کی تکان میں پوشیدہ تھا؟ اگر ایسا ہے تو ذمے دار کون ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جنہیں آج اٹھایا جانا بہت سخت اور دردناک ضرور ہے، لیکن انہیں تو پوچھا جانا ہی ہے۔

اس نکتے پر الگ الگ موقف رہے ہیں، ایسا فطری بھی ہے، کیوں کہ یہاں مصنف کے پاس کوئی غیر متبادل اور مقصد آہنگ نظر تو ہے نہیں، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ سچائی یہ ہے کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی تو ہم جائزہ تو لیتے ہی ہیں۔ شاید اس وجہ سے ہمارے لیے آج تبصرہ کرنا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کھو چکے مواقع کے اندازے کا پلڑا بڑی آسانی سے دوسری طرف جھک جاتا ہے۔ اور جیسا کہ سیروائی نے لکھا ہے کہ 'ہندوستان سے الگ کیے گئے پاکستان سے پیدا شدہ جرمانے اور بوجھ کے بغیر۔'

اس نقطۂ نظر سے دیکھنے پر اور جتنا ممکن ہو، تعصبات سے ہٹ کر جانچ کرنے پر ایسا لگتا ہے کہ یہ عظیم المیہ ناگزیر نہیں تھا۔ پہلے پیش کی گئی کئی وجوہات کے ساتھ ساتھ، جناح کی یہ ناقابل فہم ضد، اڑیل رویہ، مسلمانوں کے لیے مسلسل بڑھتے مطالبات اور اس کے ساتھ ہی آزاد ہندوستان میں ان کے لیے اقتدار کے بڑے حصے، واضح طور پر یہ بڑے اسباب بن گئے۔ اور اگر تقسیم کو ہم سیاسی ٹکراؤ کے نتیجے کے طور پر دیکھیں تو واضح طور پر جناح اور نہرو اس کے اصل ملزم ہیں۔ وہ دونوں اس تصادم کے کے مرکز میں تھے اور بالآخر اس کو اس بڑے المیہ میں تبدیل کرنے والے بھی تھے۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جناح اور نہرو کے بیچ کے تکلیف دہ تصادم اور آپسی لڑائی کے لیے دونوں کے مزاج، شخصیت اور کردار نے واضح طور پر ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ لیکن یہ ٹکراؤ تصادم کا واحد سبب نہیں ہو سکتا۔ ایسا کہنا معاملے کو بہت آسان اور سادا بنانا ہوگا۔ پھر بھی تقسیم ہند کی جانب چلنے کا الزام کیا نہرو پر عائد کیا جانا چاہیے؟ حالاں کہ یہ دکھانے کے لیے اس کا حوالہ دیا جاتا ہے: کہ کئی بار ان کی لاعلمی، عدم مہارت، اکثر ناسمجھی تک پہنچنے والی بچکانہ عجلت، ضرور وجہ بنے۔ لیکن کیا انہیں کو ذمے دار اسباب مانا جا سکتا ہے۔؟ 17 ان تمام باتوں نے یقینی طور پر صورت حال کو تقسیم کی طرف دھکیلا۔ مگر یہ تو نہرو کی خود کو روکنے کی نااہلی تھی، اس کے ساتھ ہی وہ اپنا نقطۂ نظر ہمیشہ پریس کو بتایا کرتے تھے۔ جو ایک طرح سے ہمیشہ، ہر موقع پر، تنازعہ پیدا کر دیتا اور پرانی تمام حصولیابیوں کو مٹا دیتا تھا۔ آزادی سے قبل، وقتاً فوقتاً اور بار بار یہی ہوا۔ اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ تقسیم کے بعد بھی متعدد نازک مواقع پر ہوا ہے۔

1943 کے نصف اول میں پنڈت نہرو نے اپنی احمد نگر جیل ڈائری میں جناح کے بارے میں واضح طور پر اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔'جناح... مہذب دفاع کے مکمل فقدان کا واضح مظاہرہ کرتے ہیں۔ اپنی تمام تر چالاکی اور قابلیت کے ساتھ وہ مجھ پر لاعلمی اور ناسمجھی کا اور دنیا کے مسائل کو سمجھنے میں نااہلی کا اثر چھوڑتے ہیں۔ میں بہت آسانی کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ صرف جناح کو دور رکھنے اور ان کے متکبر دفاع کو ہندوستان کی ترقی میں مسلسل مداخلت کرنے کی اجازت نہ دینے کی خاطر، پاکستان یا ایسی ہی کسی اور چیز کی تشکیل کہیں بہتر ہے۔'[18] ایسے خیالات کے ساتھ تقسیم کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟

سوال پھر اٹھتا ہے کہ تقسیم ہند کا مرکزی نکتہ کہاں پر ہے؟ کیا یہ 45-1942 کی ہندوستان چھوڑو تحریک میں ہے؟ یا اس کی ناکامی میں؟ جس نے کانگریسی لیڈروں کا حوصلہ اتنا پست کر دیا تھا کہ اس وقت ان میں ہندوستان کو متحد رکھنے کی لڑائی جاری رکھنے کی نہ تو کوئی خواہش بچی تھی اور نہ ہی ضروری جسمانی طاقت دہائیوں قبل 1920 کے آغاز میں ہوم رول لیگ کے دنوں میں سیاسی اور طور پر گاندھی سے الگ ہوتے ہوئے ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ایک تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا 'عدم تعاون تحریک کی کامیابی کانگریس کو ایک تاریک گلی میں لے جائے گی...... جہاں سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہوگا...'[19] یہ دوررس مگر تلخ اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ جب جب گاندھی نے اپنی عدم تعاون کی تحریک روکی، تو کانگریس اعلا کمان کو سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کرنا چاہیے۔ سب کے سب جائز سوال کا جواب دینے میں ٹال مٹول سے کام لیتے تھے۔ اب ہم کیا کریں، یہ گاندھی جی کے پروگرام اس تحریک کی باہر بھی چلتے تھے اور اس وقت وہ چاہے جتنے بھی خبطی نظر آتے رہے ہوں، یا آج بھی لگتے ہوں، مگر ان کی ہر بات کا کوئی مقصد ہوتا تھا۔ ایک متعین سمت ہوتی تھی۔ لیکن کانگریس پارٹی تو صرف پیچھے ہی چلتی تھی۔ اگر کبھی کوئی علیحدہ کارروائی یا پروگرام شروع کرنے کی کوشش کی بھی تو وہ اپنی وسعت میں کافی محدود ہی رہی اور کچھ دنوں کے لیے ہی رہی۔ شاید بار بار کی جیل یاترا نے کانگریسیوں میں، جن میں بیشتر ہندو تھے، شہادت کا ایک مستقل جذبہ بھر دیا تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے ہی مان لیا تھا کہ جیل جانا ہی اپنے آپ میں ایک تپسیا اور اختیار ہے جسے ایک قابل تعریف کام کی شکل میں یقینی طور پر خدائی قبولیت حاصل ہوگی۔ لیکن جیل میں بار بار رہنے سے کانگریسی لیڈران، اس بات کو محسوس کیے بغیر حقیقتاً ایک طرح سے اپنی ذمے داری ٹال رہے تھے۔ 45-1942 کے درمیان کانگریسی قیادت کی جیل کی زندگی کے ٹھہراؤ کے مقابلے میں جناح نے اپنی قیادت کو اور مضبوط کیا۔ اور ایسا وقت ہوا جب جناح کے حامی اتنے زیادہ نہیں تھے۔ لیکن 'مسلم حمایت' کے دائرے میں انہوں نے جلد ہی لیگ کو مسلمانوں کا 'واحد نمائندہ' بنا دیا۔ اور وہ خود اس کے واحد مالک اور مسلمانوں کی واحد آواز بن گئے۔ جناح نے شمال مغربی سرحدی صوبہ جیسے کانگریس کے گڑھ میں بھی اپنا اثر و رسوخ بڑھایا اور اس کے برعکس تو کبھی نہیں ہو سکا، ایک بار بھی نہیں، اس لیے ہم یہاں پوچھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر ایسا کیوں نہیں ہوا؟ کانگریس کسی مسلم اکثریتی صوبہ میں کیوں نہیں جیتتی؟ ان تمام صوبوں نے ہندوستان سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا اور کانگریس کے ساتھ کبھی بھی سیاسی وفاداری نہیں دکھائی۔ کیوں؟ کیا اس لیے کہ کانگریس کا کردار واضح طور پر ہندو تھا اور ہندو ہی رہے گا، اس کے برعکس کچھ ہونا پوری طرح غیر عملی اور غیر فطری ہوگا۔

1935 کا انڈین گورنمنٹ ایکٹ ایک برطانوی قانون تھا اور ہم نے شاید اس کا مطلب جانے بغیر اس کا خیر مقدم کیا، وہ بھی اس وقت جب ماہرین قانون کی ایک پوری فوج تحریک آزادی میں شامل تھی۔ ویسے دیکھیں تو ہم وہی بنیادی ڈھانچہ بطور قانون اب بھی جھیل رہے ہیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ برطانوی ہونے کی وجہ سے انہوں نے فطری طور پر اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ اس میں جنگ اور امن جیسے اہم مسئلوں پر مداخلت اور فیصلوں کے لیے بھی انتظام کیا گیا تھا۔ یہ تو ایسے مسائل تھے جو ہندوستان کے دیش بھکتوں کے خیال میں ہندوستان کے لیے ہی محفوظ ہونے چاہئے تھے۔ دراصل کوئی بھی غیر فطری قدم ہندو اور مسلمان کے درمیان کی خلیج کو پُر نہیں کر سکا اور نہ ہی پُر کر سکتا ہے۔ لیکن تب تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اتحاد کو قائم رکھنا اس وقت تک ناممکن ہوگا۔ جب تک ہم ایک وسیع تر وفاقی نظام کو قبول نہیں کر لیتے۔ لیکن ان دنوں نہرو کے 'مرکزی رویے اور پالیسیوں' کے لیے تو ایک آسیب کی طرح تھا۔ کیا یہ ایک چونکا دینے والی حقیقت نہیں ہے کہ 'مرکزیت' کے حامی یہی نہرو 'ڈسکوری آف انڈیا' کے مصنف سے کتنے الگ ہو گئے، اتنے الگ کہ انہوں نے کہا تھا کہ 'آزادی کے ساتھ وفاق یا عدم وفاق سے ساتھ انحصار'۔ خیالات میں تبدیلی غیر فطری تو نہیں، لیکن ایسے خیالات کے بدلنے پر، جن سے ملک کا مستقبل متاثر ہو، سوالات ضرور اٹھتے ہیں۔

'نوآبادی کا درج اور غیر مرکزی، اتحاد مگر وفاقی ہندوستان سے اتفاق نہ کرنا، جو کہ بالکل ہماری دسترس میں تھا، ایک بہت بڑی غلطی اور بانٹنے والا فیصلہ تھا۔ اس ناکامی کی جڑیں کافی گہرائی تک جاتی ہیں۔ 20۔1926 کے بیل فور اعلانیہ اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک، اس معاملے پر گاندھی اور نہرو میں مفاہمت سے ایک پریشان کن سوال پیدا ہوتا ہے: 'اب یہ بین اور رونا پیٹنا کیوں؟' جب تک ہم ان عظیم غلطیوں کی شناخت نہیں کریں گے ان غلط اقدامات کی وجہ سے اپنی غلطیوں کا اعادہ جاری رکھیں گے، اور ان کے دلدل میں پھنستے اور جھگڑتے ہی رہی گے، یہی تو وہ غلط اقدامات ہیں جن کی وجہ سے آج ہم اس تکلیف دہ صورتحال میں پہنچے ہیں۔

1946 کا کیبنٹ مشن ایک اور موقع تھا تقسیم کے المیے کو ٹالنے کا۔ اس مشن نے جو آئین پیش کیا، وہ ہندوستان کا اتحاد قائم رکھ سکتا تھا۔ ہاں ایک شرط پر یعنی وفاقی ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ تین گروپ بنا کر۔ یہ اس قسم کا آئین تھا جس کے لیے 1934 کی مشترکہ عرضداشت نے فطری طور پر زمین تیار کی تھی۔ اس آخری کوشش کے تئیں بھی کانگریس کا رویہ حیرت انگیز طور پر حوصلہ شکن ہی رہا۔ لہٰذا بالآخر یہ مشن بھی ناکام ہوگا۔ بالآخر جو راستہ بچا وہ توڑنے کا اور بانٹنے کا تھا۔ اور ہندوستان جو کبھی ایک تھا اس کو کاٹ کر، اس کا ایک حصہ مسلمانوں کے لیے الگ کر دیا گیا۔ مگر متحدہ ہندوستان کو فرقہ وارانہ بنیاد پر کاٹنے کے بعد بھی جو ہندوستان بچا اسے ہندو نہیں کہا گیا۔ ہندوستان کو آخر میں بے تو جہی سے آپریشن کرنے والے اوزاروں سے بے دردی سے کاٹا گیا۔ اور جناح چاہتے بھی تو یہی تھے کہ ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور پٹیل بھی ان کے نقش قدم پر چلیں۔ اور بالآخر شروع میں نہ چاہتے ہوئے بھی، انہوں نے تقسیم کو اپنی رضامندی دے دی۔ جب کئی سالوں بعد لیونارڈ موزلے نے نہرو سے پوچھا کہ 'آپ نے اس بات کو کیوں نہیں مان لیا!' تو انہوں نے دوٹوک مگر بے حد دکھ کے ساتھ جواب

دیا تھا' تب تک ہم بہت تھکے ہوئے لوگ تھے اور کافی عرصے تک جیل میں رہ چکے تھے... '☆

دوسری طرف جناح اپنے دونوں مقاصد کی حصولیابی پر اڑے رہے۔ انہوں نے انگریزی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلسل کام کیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں کے لیے خصوصی درجہ اور خصوصی اختیارات کا مطالبہ بھی برابر جاری رکھا۔ انہوں نے ان دونوں مقاصد کے لیے مسلسل اور انتھک جدوجہد بھی کی جناح نے محسوس کیا کہ انگریزوں سے کسی بھی قسم کی آزادی کی امید اس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک ہندو اور مسلمان ایک نہ ہو جائیں۔ اور ایسے اتحاد کے لیے ان کا خیال تھا کہ ان کے بڑے ساتھی، ہندوؤں کو ہی اور زیادہ روادار ہونا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں کو 'مسلم اقلیت کو یہ ضروری یقین' دلانا چاہیے کہ وہ اپنی ہی حکومت میں محفوظ رہیں گے۔ جناح نے کمزور حالات میں بھی سودے بازی کرنے کے فن میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ یا تو وہ یہ سب سیکھ گئے تھے یا تجربے نے انہیں سکھا دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلسل 'نہیں' کہنے کی بے رحمانہ اور سامنے والے کو تھکا دینے والی طاقت، بہت زیادہ مطالبات کے اعادہ کے بغیر بھی، ان کے سامنے واحد حل کی شکل میں پاکستان کو لا کھڑا کردے گی۔ آخر میں یہی ہوا۔ مگر ساتھ ہی ان کے مطالبات بڑھتے ہی گئے اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ ایک ایسا سائن بورڈ نہیں دکھائی دینے لگا جس پر' آگے سڑک نہیں ہے' تحریر تھا۔ اس کے بعد جناح نے الگ ملک پاکستان کا مطالبہ رکھ دیا۔ اب اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ کیوں کہ اس وقت تک ان کو یہ مسلم ہو چکا تھا کہ ان کا جسم اب ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ انہیں عجلت کرنی ہے کیوں کہ وقت نہیں بچا ہے۔

دوسری طرف انگریز بھی عجلت میں تھے۔ وہ ہندوستان سے جلد نکل جانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ اس وقت تک وہ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے اور ان سے پیدا شدہ دیگر دشواریوں سے تھک چکے تھے۔ یہ دشواریاں دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ میں پیدا ہو چلی تھیں۔ مزید برآں ہندوستانیوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والے چھوٹے چھوٹے تنازعات بھی تھے۔ اب تو وہ ہندوستان سے 'بھاگ' جانا چاہتے تھے۔ انگریزوں کی اس اچانک واپسی کے اور بھی متعدد اسباب تھے۔ فلسطین کا مینڈیٹ بھی اس وقت تک ختم ہو چکا تھا۔ یوروپ کی اصل سرزمین پر جنگ کے خاتمے کے بعد یوروپ کے اجڑے ہوئے یہودی پناہ گزینوں کی آمد کے سلسلے میں دباؤ پڑنے لگا تھا۔ فلسطین میں بھی یہودی زیرزمین فوجیں انگریزی افواج پر

☆ 'ہم لوگ تھک چکے تھے اور لمبے عرصے تک جیل میں بھی رہ چکے تھے۔ ہم میں سے کچھ ہی لوگ پھر جیل جانے پر راضی تھے۔ اگر ہم اپنے خوابوں کے لیے ایک متحدہ ہندوستان کے لیے اڑ جاتے تو ہمیں پھر جیل بھیج دیا جاتا۔ پنجاب میں گولیاں چل رہی تھیں اور قتل وخون کی باتیں سنائی پڑ رہی تھیں۔ تقسیم کی اسکیم میں ہمیں ایک حل نظر آیا اور ہم نے اسے تسلیم کرلیا...... ہمارا یہ خیال تھا کہ تقسیم غیر مستقل ہوگی، کیوں کہ پاکستان مجبوراً پھر ہمارے پاس واپس آجائے گا۔'

متحد ہو کر حملے کر رہی تھیں۔ 22 جولائی 1946 کو ارگن 21 نے یروشلم میں انگریزی فوج کے ہیڈ کوارٹر کنگ ڈیوڈ ہوٹل کو اڑا دیا تھا۔ جس میں 92 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس وقت تک اقوام متحدہ نے بھی 15 مئی 1947 کو فلسطین کے سلسلے میں ایک یو این خصوصی کمیٹی بنا دی تھی۔ اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ اقوام متحدہ کی تائید سے فلسطین کی تقسیم کے لئے ایک منصوبہ جلد ہی آنے والا ہے۔ اب انگریزوں پر مشرق وسطی سے بھی دباؤ پڑنے لگا تھا۔ یہ حالات ایک وقت میں عظیم عالمی قوت رہنے والے اقتدار کے لیے غیر معمولی اور تکلیف دہ تھے۔

تاہم سوال اٹھتا ہے کہ آخر کانگریس کو اتنی زیادہ عجلت کیوں تھی۔ کیا اس وقت اس کی پوری قیادت بری طرح تھک چکی تھی؟ یا اس لیے کہ اس وقت تک کانگریس نے عبوری حکومت میں اقتدار کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ اب یہ محسوس کیا جانے لگا کہ وہ اتنی آسانی سے اس 'اقتدار' کو چھوڑنے کو تیار بھی نہیں تھے۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ بالآخر ہندوستان کی تقسیم ہو گئی۔ نہرو نے موزلے کے سامنے تسلیم کیا تھا لیکن اداس کر دینے والی یہ بات تو کئی سال بعد ہوئی تھی۔ تاہم یہ بات گلے سے نہیں اترتی کہ وہ تھک گئے تھے اس لیے انہوں نے تقسیم ہند کو منظور کر لیا تھا۔

کانگریس نے اپنی طاقت اور اثرات کا اندازہ ہمیشہ بڑھا چڑھا کر لگایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جناح کو صرف مسلم لیگ کے ہی نہیں بلکہ بیشتر مسلمانوں کے قائد کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں آخر تک جھجکتی رہی۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس کی قیادت نے سچائی اور اصلیت کو کبھی بھی پوری طرح نہ تو پہچانا نہ ہی منظور کیا۔ 15 اگست 1947 سے دو ہفتے قبل ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور پٹیل دونوں سے پوچھا تھا کہ: ''ایک پندھواڑے کے اندر ہی ہندوستان کی پوری حکومت اور ذمے داری آپ کے پاس ہوگی۔ کیا آپ لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ اس وقت آپ کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا؟'' 22 اس پر دونوں لیڈروں نے جواب دیا تھا کہ ہمیں معلوم ہے اور یہ بھی کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ لیکن کیا حقیقت میں ایسا تھا'' لگتا نہیں۔

کانگریس قیادت پر کوئی سمجھوتہ نہ کرنے کی مسلسل الزام تراشی، جناح کی کامیاب سودے بازی کی ترکیبوں میں سے ایک تھا۔ حالاں کہ صحیح معنوں میں خود ان پر الزام عائد ہونا چاہیے۔ لیکن کانگریس بھی جیسے غلطی کرنے پر بضد تھی۔ جب بھی اس کے لیڈروں کو محسوس ہوتا ہے کہ انگریز ان کی (کانگریس کی) باتیں ماننے کو تیار ہیں تو وہ جناح کو نظر انداز کرنے لگتے۔ جب انگریز کانگریس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے تو پھر جناح کو بھی لیگ کی اصل حریف پارٹی سے بات کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ برٹش ہندوستان کی ان دونوں جماعتوں میں غیر حقیقت پسندانہ یکسانیت، دراصل انگریزی حکومت کی تھوپی ہوئی تھی اور اس کی یہ واضح چال تھی۔ اس سے اس کے مفادات کی تکمیل ہوتی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا فائدہ جناح کو بھی پہنچتا تھا۔ اسی وجہ سے جناح ان چالوں کی مخالفت کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے۔ حیرت انگیز تو کانگریس کی خاموشی تھی، کیا اس جماعت نے اپنی خاموش اجازت دے دی تھی؟ یہ بھی واضح ہے کہ کانگریس ایک کیمیا زیادہ

بڑا سیاسی ادارہ تھا اور اس کے پاس کھونے کے لیے بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔

کانگریس بھی اس خطرناک اور غلط موقف میں اٹکی رہی کہ " ہندو مسلم مسائل کا حل صرف کانگریس اور جناح کی مسلم لیگ نہیں نکال سکتے۔ اس کے لئے ایک بیرونی فیصلہ ساز کی ضرورت ہے اور وہ ہیں انگریز۔" یہ بات گاندھی کے خیالات سے یکسر برعکس تھی۔ اس صورتحال نے کانگریس اور لیگ کے نظریات کو بانٹ دیا اور ان کے طور طریقے بھی الگ کردیے۔ اس کا براہ راست فائدہ انگریزوں کو پہنچا۔ کیوں کہ اس ذہنیت نے ہندوستان کو کاٹنے کا ایک اور خاص ہتھیار ان کو تھما دیا۔ وہ تھا ملک کو تقسیم کرنے کا اختیار اور اس سلسلے میں ان کا ایک فیصلہ کن رول۔ واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آخر میں جناح کو پاکستان دے دیا گیا۔ جناح نے جتنا جیتا نہیں، کانگریس کے لیڈروں نہرو اور پٹیل نے، اس سے زیادہ ان کو دے دیا۔ اور اس معاملے میں انگریزوں نے ہمیشہ ایک مددگار ردائی کا رول ادا کیا۔

کانگریس کے کردار کا یہ تجزیہ بلاشبہ متنازعہ ہوگا۔ یہ بات واضح ہے۔ لیکن اگر ہم ایمانداری سے دیکھیں تو ہماری نظر حالات پر اور زیادہ مرکوز ہوگی اور کافی تیز بھی ہوگی۔

14 اور 15 اگست یہ دو ایسی تاریخیں ہیں جو انگریزی حکومت کے باضابطہ اختتام کا اشاریہ بن چکی ہے، ایک علامتی نشان بن چکی ہے اور یہ تاریخیں متحدہ ہندوستان کے فاتحہ کا بھی مظہر ہیں۔ یہ ہمیں مطلع کرتی ہیں کہ اس قدیم تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی اکائی ہندوستان کو ہم نے بیرونی طاقتوں سے مل کر کب توڑ دیا۔ وہی اکائی جس نے کئی نشیب و فراز دیکھے تھے اور جس نے کئی صدیوں تک حملے بھی جھیلے تھے، اب وہ توڑ دی گئی۔

یہ وہ خیال ہے جو مجھے اچانک حیرت زدہ انداز میں راستے ہی میں روک دیتا ہے۔ اور میں خیالات سے عاری ہو کر ان ایام کے 'بیشتر' لیڈروں کے غیر اہم نظریات میں اٹک جاتا ہوں۔ خواہ وہ کسی بھی سیاسی نظریے کے لئے رہے ہوں۔ کسی بھی مذہب، فرقہ کے ہوں یا کسی بھی طریقہ عبادت کے ماننے والے ہوں، ہندو ہوں یا مسلمان، یہ پوری بحث ان کے معاملات کا بیانیہ ہے، چھوٹے چھوٹے تنازعات اور اختلافات سے لبریز ہے اور ان ایام رفتہ کے بارے میں دوبارہ غور کرنا بہت ہی تکلیف دہ ہے۔

نہرو نے کہا تھا " نوآبادی کے درجے کا خیال ہی میرا دم گھونٹ دیتا ہے۔" 23 پھر بھی اگست 1947 میں کیا وہی نہیں ہوا؟ اور اب تو اضافی طور پر ایک منقسم ہندوستان ملا۔ تو پھر درمیان کی مخالفتیں کتنی غیر اہم نظر آتی ہیں۔ انسانی تکالیف کی زیادتی، جو ہندوستان کے جسم کے ٹکڑے ہونے سے ہمارے سماج، ہمارے عوام اور ان کے قدیم اتحاد پر تھوپ دی گئی۔ وہ اتحاد جو ہمیں کئی صدیوں تک ساتھ رہنے سے حاصل ہوا تھا۔ خواہ اس اتحاد میں تعاون، اختلاف رائے، اور وقتاً فوقتاً لڑائی بھی رہی ہو، کئی بیرونی خیالات کی ضرب سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ہم نے باتوں، نظریوں اور اصولوں کو الٹا دیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی آزادی بھی شاید دوسرے درجے کی ہوگئی۔ 'صرف میرا نقطہ نظر ہی سب سے اوپر ہے۔ اس وقت یہی جذبہ سب

پر حاوی تھا۔ ایک متحدہ اور آزاد ہندوستان کا مقصد اس بے بنیاد خیال 'مسلمان ایک الگ قوم ہیں' کے تابع ہو گیا۔ اور بالآخر قائداعظم نے دیمک زدہ، ہونے کے باوجود اپنے خوابوں کا پاکستان حاصل کر ہی لیا۔ لیکن کیا یہ وہی پاکستان تھا جو واقعتاً انہوں نے چاہا تھا؟ یا یہ محض نظریاتی طور پر اگلی زمین تک کا سفر تھا؟ اگر روح میں نہیں تو کم از کم نام ہی میں سہی، دیکھئے کہ پنجاب پاکستان اور ہندوستان میں دونوں جگہ 'پنجاب' ہی ہے۔ اسی طرح بنگال بھی ہے۔ تو پھر ایسا کیوں ہوا؟ اب تو دونوں ممالک الگ ہیں پھر بھی ذرا ان دو قدیم صوبوں کو کسی اور نام سے بلانے کی کوشش تو کریں؟

قطعی طور پر ایک دوسرا زیادہ تکلیف دہ سوال جو اٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ جناح کا علاحدگی کا سفر کیا کسی جغرافیائی نقشے میں، یوں ہی ایسے ہی کھینچ دیا گیا تھا یا ان لکیروں کو کسی قسم کے عقیدے کی سرحدی لکیروں میں بدلنے کی کوشش تھی۔ وہ بھی ایسے ملک میں، ایسی سرزمین پر، جہاں پوری زندگی کا انحصار عقیدے اور اعتقاد پر ہی رہتا ہو اور اس کی طاقت پر ہی لوگ چلتے ہوں، خواہ وہ کسی بھی اعتقادی رنگ اور خیالات کے ہوں، خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن یکسانیت کی بہتات سے یکجا ہیں۔ کیوں کہ اس یکسانیت کے استحکام کو وقت بھی پیس کر خاک میں نہیں ملا پایا۔ پھر یہ تلاش اتنی خود غرضانہ کیسے ہو گئی۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ یہ تو اختتام نہیں اس سے آگے بھی کچھ ہو گا۔ ورنہ کروڑوں انسان نفرت کے شکار کیوں بنیں۔ وہ بھی اتنے خوفناک شعلے پیدا کر کے کہ 1947 کی آگ اب بھی بجھی نہیں ہے۔ کیوں کروڑوں ہندو، مسلمان اور سکھ اپنی جڑوں سے اکھاڑ دیے گئے۔ پھر ایک اور تکلیف دہ سوال اٹھتا ہے۔ کیا مرحوم قائداعظم کا سفر اب مکمل ہو گیا؟ یا یہ ابھی شروع ہوا ہے؟ کیا علاحدگی پسندی ختم ہو گئی ہے، یا یہ لامتناہی ہو گئی ہے اور ایک طرح سے بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اور یکسانیت کی وہ تلاش، جس نے اس وقت ہمیں بانٹ دیا تھا، کیا وہ تقسیم اب حتمی طور پر مکمل ہو چکی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ اب تو پاکستان ایک الگ ملک ہے۔ ایک خودمختار، آزاد اور ہندوستان کی مانند ملک ہے۔ کیا اب وہ جس کی تشریح نو کی جا چکی ہے۔ اسے آج کے تناظر میں، ایک نئی نویلی اور تازہ نفرت کے ساتھ۔ نئی شکل میں اس کا اعادہ جاری رکھے گا۔

ان پہلوؤں سے الگ ہٹ کر خودساختہ منطقی شخص محمد علی جناح کا خیال ایک ایسے شخص کا خیال ہے، جس نے اپنی زندگی دلائل کی بنیاد پر ہی گزاری تھی۔ دیکھئے یہ اقتباس:

14 نومبر 1946 کو نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں ابھی تک پیدا نہ ہونے والے پاکستان کو فرقہ وارانہ صورتحال اور رشتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو جناح نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا تھا 'ایک دوسرے ملک کا اقتدار آئے گا تو یہ کشیدگی تھم جائے گی۔ یہ اقلیت، اس وقت اقلیت کی حیثیت سے آباد ہو جائیں گے وہ محسوس کریں گے کہ اقلیت صرف اقلیتوں کی مانند ہی رہ سکتے ہیں نہ کہ کسی موثر انداز میں۔'' (یہاں ایک بڑا المیہ ہے کہ اقلیت، اقلیتوں کی مانند ہی ایسی صورت میں غیر منقسم ہندستان میں مختلف مطالبات، خصوصی درجہ اور مساوات وغیرہ کی مثالوں کے بارے میں کیا کہیں گے''۔

جناح نے مزید کہا ’ایک بار وہ جان لیں گے کہ انہیں اقلیتوں کی مانند رہنا ہے، ایسی صورت میں، میں سوچتا ہوں کہ آپ کو ہندوستان اور پاکستان میں واقعی ایک مستحکم حکومت ملے گی۔ ایسے میں پھر کوئی قومی جھگڑا کیوں ہوگا؟ حالات اب سکڑ کر ایک چھوٹی زمین پر آگئے ہیں۔ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کا تحفظ بہتر سے بہتر انداز میں کیسے کیا جاسکتا ہے؟

’جب تک آپ یہ نہ کہیں کہ ہم پوری طرح جانوروں کی سطح تک گر گئے ہیں، میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ پاکستان میں مسلمان اقلیت (اکثریت؟) اقلیتوں سے کہیں زیادہ اعلاظرفی کے ساتھ پیش نہ آسکیں۔‘

جناح نے اُمہ کو دھماکہ خیز ہوا کہہ کر اس وقت مسترد کر دیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ، دوسرے خواہ جو بھی کریں، میں سوچتا ہوں کہ پاکستان اور ہندوستان- یہ دونوں ملک پیار و محبت اور باہمی مفادات کے سبب اس برصغیر میں دوست رہیں گے۔

’دقتوں کے دوران وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور دوسرے ممالک کو ’دور ہی رہنے‘ کو کہیں گے۔ اس وقت ہمارے پاس امریکہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ’مونرو ڈاکٹرن‘ ہوگا۔‘

انہوں نے کہا کہ ’جب میں پاکستان کا مطالبہ کرتا ہوں‘ تو مجھ پر یقین کیجئے کہ میں مسلمانوں کے لیے نہیں لڑ رہا ہوں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لیے آزادی کا مطلب پاکستان اور ہندوستان ہی ہوتا ہے۔‘24

میں ان اقتباسات کو پڑھ کر سوچتا ہوں کہ بعد میں ان اعلا خیالات کو کیا ہو گیا؟ اتنی ساری امیدوں کا کیا ہوا تھا؟ کیا یہ کسی قسم کی پیشگی مشق تھا، جس نے گاندھی کو فکرمند انداز میں یہ لکھنے پر تیار کیا: ’جناح نے اعلان کیا کہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ ’اگر ممکن ہوا تو، مسلمانوں سے بھی بہتر انداز میں پیش آیا جائے گا۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ حقوق نہیں ملیں گے۔ اگر مسلم اکثریتی صوبے جو پاکستان جیسے ہی ہیں، انگریزی حکومت سے پوری طرح آزاد ہو جاتے ہیں اور جناح کے آدرشوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں، تو پورا ہندوستان ایسے کسی بھی نظام کا خیر مقدم کرے گا۔ خواہ اسے کسی بھی نام سے پکارا جائے اور پورا ہندوستان پاکستان ہو جائے گا۔‘25

ایسے حالات میں دوسروں کے نقطۂ نظر کو اور زیادہ جگہ دینے کے لیے، کچھ مزید سمجھداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ خیالوں اور عارضی ’وعدوں‘ کی سرحدوں کی منظوری کو تسلیم کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ سب درحقیقت ہندوستان کی ’ہندوستانیت‘ کے ذریعے وقت کے بہاؤ میں بہہ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس وقت ہندوستان نے گھٹنے ٹیک دیے تھے، دراصل وقت نے ہمیں خاموش کر دیا تھا۔

جہاں تک ’جسونت‘ کی بات ہے تو اسے ہم نے قبول کیا۔ لیکن یہاں ’ریزرویشن‘ کی بات پیدا کر دی گئی۔ کیوں کہ مسلمان یا کسی اور کے لیے مثبت عمل کے ایک ذریعے کی شکل میں، یا سماجی ہم آہنگی کے فقدان سے متاثر لوگوں کو

سہارا دے کر انہیں ترقی دینے کی غرض سے ہم نے اس نئے نظام میں، کچھ نئے اور مستقل طبقہ کی ایک نئی پہچان بنائی۔ اس کے ساتھ ہی نئے خصوصی اختیارات کے قلعے بھی کھڑے کر دیے۔ کیا یہی ہمارا ہدف تھا، جو ہم نے یا عظیم قائد اعظم نے، یا گاندھی جی اور نہرو اور کانگریس نے واقعی مانگا تھا۔ اسی طرح علیحدگی کے جارحانہ علاقوں میں بھٹکتے رہنا، کیا یہی ہمارا مطالبہ تھا۔ بالآخر یہ وہی جناح تھے، جنہوں نے 14 نومبر 1946 کو ایک پریس کانفرنس میں 'امریکہ سے زیادہ مضبوط ہند پاک 'مونرو ڈاکٹرن' کی بات کہی تھی۔ کیا وہ محض لفاظیاں تھیں؟

اس وجہ سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کیا جناح واقعی، ایک طویل عرصے سے جو آواز اٹھا رہے تھے کہ مسلم ایک الگ قوم ہیں، اس کی منزل تک پہنچ گئے یا نہیں؟ میں اس وقت جس مقام پر کھڑا ہوں، وہاں سے اس نئی صدی میں نئے دور کے لامحدود امکانات کے موڑ پر اور اس خطرناک خطے سے آگے جانے سے جھجکتا ہوں۔ پاکستان کو (اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی) اس کا جواب دینا ہے: کیا جناح کا یہ خیال، جس کی حمایت نہیں کی جاسکتی، کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، کوئی جغرافیائی منزل نہیں تھا، وہ دراصل نہ تو ہوسکتا تھا اور نہ ہی ہے۔ یہ تو تشریحی خیال کی زیادہ تلاش تھی اور وہ بھی اپنے آپ میں مختلف پہلوؤں سے زبردست غلطی تھی۔

اسی وجہ سے جناح کو زمین (گرچہ دیمک زدہ) ہی، لیکن وہ قیام مملکت میں پوری طرح ناکام رہے۔ اور فیصلہ کن انداز میں ایک ملک، تو بنا ہی نہیں سکے۔ انہوں نے اور دوسروں نے (ماؤنٹ بیٹن، نہرو) بھی تراش خراش کی سرجری کے طریقے سے ہندوستان کی سرزمین کو کاٹنے میں اور لوگوں کو بانٹنے میں پوری مدد کی۔ لیکن وہ بھی ایک ملک کا قیام نہیں کر سکے۔

اس کے باوجود ہندوستان سے الگ ہوکر، خود مختار ملک کی حیثیت سے، ایک نئے ملک کی حیثیت سے ابھرنے کے ساٹھ سال بعد، پاکستان میں آج، 'پاکستانی پن' کا احساس بڑھا ہے جو صرف ہندوستان سے الگ ہونے تک ہی محدود نہیں ہے۔ واضح طور پر ہندوستان سے الگ ملک ہونے کی ایک بیداری اس میں ضرور پیدا ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے ساتھ اس سے متعلق کئی دشواریاں اسے ستاتی ہیں۔ ہندوستان کے تئیں پاکستان کی نفرت ضرور کچھ کم ہوئی ہے، اور اب وہ اپنے تئیں کچھ اور خود اعتمادی سے لبریز ہوا ہے۔ گویا پاکستان دونوں ملکوں کو یکسانیت اور اتحاد کے بندھن میں باندھنے والی سوچ کو تسلیم کرنے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ تیار ہوا ہے۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کا ملک بنانے کے اس سفر کا اختتام نہیں ہوا ہے۔ پاکستان اسلامی کٹر داد کے راستے پر اور آگے بڑھا اور بڑھتا ہی گیا۔ اس نے ایک اسلامی ملک بنانا طے کیا آزادی کے فوراً بعد اور قائد اعظم کے جانے کے بعد۔ اور وہ بھی اسلام کی بنیاد پر الگ ہوجانے کے بعد۔ اس ملک نے اس وقت قانون کے بنیادی فلسفے کی شکل میں 'شہریت' کو اپنا لیا۔ اس سے عدالتوں میں انصاف کی تشریح کے ذمے داری مسجدوں کے ملاؤں اور مولویوں کے ہاتھوں

میں، منتقل ہوگئی۔ جو اس ملک کے قانون کے تحت ہونا ہی تھا۔ المناک صورت حال یہ ہے کہ اس کے بعد پاکستان نے دہشت گردی کو ملکی پالیسی کے ہتھیار کی شکل میں منتخب کرلیا۔ جس کا استعمال وہ پڑوسی ملک ہندوستان کے خلاف حملوں کے لیے کرنے لگا۔ لیکن اب یہ واضح ہے کہ دہشت گردی کی یہ نفرت بھری آگ، بے لگام ہوگئی ہے اور اسے خود ہی جلانے لگی ہے۔ اب پاکستان دنیا بھر میں دہشت گردی کا ایک مرکز بن گیا ہے۔ اور بہت افسوس کی بات ہے کہ یہی 'طالبنائزیشن' اب پاکستان کو بھی توڑنے میں لگ گیا ہے۔ یہ ساری باتیں تو جناح کے خواب کا حصہ نہیں تھیں۔ پاکستان اپنا راستہ بھٹک گیا ہے جس کی وجہ سے اسے اور اس کے پڑوس کو بھی اتنی تکلیف ہو رہی ہے۔

پروفیسر روز الینڈر وہن لان نے ایک خیال ظاہر کیا ہے کہ 1947 میں تقسیم کے بعد پاکستان انگریزی راج کے ایام سے وراثت میں ملی کمزوریوں کی وجہ سے یہ سب بھگت رہا ہے۔ تقریباً ایک صدی تک یعنی 1860 سے 1947 تک پنجاب انگریزی حکومت کی حفاظتی فوج کا صوبہ رہا۔ اس کے کسان اور زمین دار انگریزی حکومت سے زمین اور بہت کچھ رعایتیں اور عنایتیں حاصل کرتے رہے۔ کانگریس اور سماج وادی جماعتوں کے ذریعے، ملک کے الگ الگ حصوں میں چلائی جا رہی تحریکوں کا پنجاب کے ان زمین داروں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس لیے آزادی کے بعد بھی پاکستان میں فوج ہی سب سے طاقت ور ادارہ بن گئی۔ اگر پاکستان کے وسیع سماج کی بات کریں تو صاف ہے کہ نہ صرف پنجاب میں بلکہ پورے پاکستان میں یہی زمین دار طبقہ مضبوط تھا، اس کا دبدبہ تھا۔ پاکستان میں آزادی کے بعد کی تمام حکومتوں نے اس کو اپنی پالیسی میں شامل کرلیا جس کا فائدہ اعلا افسران آج بھی اٹھاتے ہیں۔

اور آخر یہ بھی تو ایک المیہ ہے کہ مغرب کے ذریعے، اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک اسٹریٹجک سرحدی چوکی کی شکل میں قائمکیا گیا یہ ملک، الگ ہونے کے ساٹھ سال کے اندر، خوف ناک انداز میں غیر منظم اور خطرناک ملک کے روپ میں اسی مغرب کے تحفظ کے لیے سب سے اہم چیلنج بن گیا۔ یہ تبدیلی صرف 'اسلامی دہشت گردی' جیسے کسی ایک سبب کا نتیجہ نہیں ہے۔ حالاں کہ اس کا زیادہ ذکر کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ صورت حال بہت ساری یکجا ہوگئی باتوں کا نتیجہ ہے۔ پاکستانی شہریوں کے دل و دماغ میں ایک گہرا غصہ اور اشتعال یہ بھی ہے کہ 1947 کے بعد مغرب کے ذریعے اور ان کے خیال میں اکثر ہندوستان کے ذریعے بھی، ان کے ساتھ مسلسل ناانصافی کی گئی ہے۔ اور یہی بات ہے جس نے پاکستان کو، مغربی مفادات کی سرحدی چوکی نہیں بلکہ مغربی مفادات کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنا دیا ہے۔

برما سے لے کر افغانستان تک ہندوستانی برصغیر ہمیشہ ہی، مال برداری اور آمد و رفت کے لیے ایک فطری 'مشترکہ بازار' رہا ہے۔ تقسیم نے اس برصغیر کا صرف جغرافیائی اور جذباتی پوسٹ مارٹم ہی نہیں کیا بلکہ بدقسمتی سے اس نے غیر فطری طور پر اور پوری طرح، بازار، تجارت اور لوگوں کی آزادانہ آمد و رفت کے ایک قدیم مشترکہ بازار کو بھی توڑ دیا۔ اس تقسیم نے ہندوستانیوں کو ان کے اپنے ہی برصغیر میں 'پناہ گزیں' بنا دیا۔ اور اس خطے میں اشیاء کی آمد و رفت کو ایک نیا نام 'اسمگلنگ'

مل گیا۔ اس سے واضح طور پر ہندوستان کو سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ اسے اپنی زمین اور اپنے لوگ کھونے پڑے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا سیاسی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی اتحاد بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ ویسے اگر ہم دیکھیں تو قائداعظم کو نہ تو ان باتوں سے کچھ لینا دینا تھا اور نہ ہی اس سے کہ ہندوستان نے کیا کھویا۔

جہاں تک برطانیہ کی بات ہے تو دوسری جنگ عظیم کے بعد والے ملک کی حیثیت سے، اس نے 'اپنی بادشاہت کے تاج میں لگے ہیرے' یعنی ہندوستان کو خیر باد کہہ دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے انتہائی عقل مندی سے اور صحیح وقت پر دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے تھکی ہاری سرزمین اور عوام کو۔ اس طرح بچالیا۔ اس کے سامنے متبادل تھا 'سامراجیت یا برطانیہ'۔ کسے چنا جائے۔ لیکن دراصل یہاں اس کے پاس کوئی متبادل تھا ہی نہیں۔ صاف ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے مفادات کا تبادلہ کر لیا۔ اور اس عمل میں (عملاً اور قصداً) اس برصغیر سے 'امن وشانتی' کو پوری طرح ملک بدر کر دیا۔ اس گمشدہ امن وشانتی کی واپسی ابھی باقی ہے۔ کیوں کہ ایڈمنسٹریشن کو بھی پوری طرح نافذ ہونا ہوگا۔ نظام حکومت کے ان دونوں زمروں یعنی امن وقانون اور ایڈمنسٹریشن کو بھی پوری طرح نافذ ہونا ہوگا۔ نظام حکومت کے ان دونوں زمروں یعنی امن وقانون اور ایڈمنسٹریشن، کا بھی آج بھی ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں خیر مقدم نہیں ہے۔ کیا یہی انگریزوں کی آخری تجارت تھی؟ کیا سترہویں صدی کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا تاجرانہ جذبہ ایک بار پھر ابھر کر منظر عام پر آ گیا تھا؟ اس نے ہندوستان سے ایک بار پھر برطانوی غلطیوں کی قیمت چکائی۔ یہ بات سوچتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے کہ ہم اس سودے کے لیے بھی راضی ہو گئے۔ اور غلط طریقے سے اسے 'اقتدار کی پرامن منتقلی' کا لقب بھی دے دیا۔ ہندوستان اس منتقلی کی قیمت آج بھی چکا رہا ہے۔ قطعی طور پر یہ بات تو جناح کے چنندہ مقاصد میں تھی ہی نہیں۔ کیوں کہ ان کا سر پاکستان کا 'قائداعظم' بننے کے لیے تھا۔ دراصل یہ سب کچھ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک انگریزوں کی بات ہے تو، اے۔اے۔گل مذاق اڑاتے ہوئے (وی اینگری آئی لینڈ ہنٹنگ وی انگلش) میں کہتے ہیں " سامراجیت کے نقصان نے انگلینڈ کا دل توڑ دیا۔ لیکن وہ کسی کو بتا نہیں سکا۔" اس وقت انگریزوں کو یہی احساس ہوا" جس کا ہر کوئی چھوڑ دیے جانے پر تجربہ کرتا ہے۔ خود اعتمادی کے ایک ادھیڑ عمر کے بگڑے عشق کی لڑکھڑاہٹ، لیکن یہاں پر اپنی یادیں اکثر ایسے لوگوں کے بچاؤ میں آ جاتی ہیں۔"

پاکستان اور اس کے شہریوں نے بلاشبہ اس ملک کے آزاد وجود کی چھ دہائیوں کو تکلیف کے ساتھ ہی برداشت کیا ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام پر دو حصوں میں منقسم ہو جانا۔ ان چھ دہائیوں میں چار فوجی آمریت، اس کے علاوہ ایسی شہری حکومتیں جو ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکیں۔ ان تمام باتوں نے پاکستانی شہریوں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے ہیں۔ اور پھر ہندوستان سے جنگیں ہوئیں۔ جن کے دوران ہر کسی نے ملک کے وسائل کا استحصال کیا۔ ملکی اور صوبائی تقسیم، انتہا پسندی اور تشدد کی مختلف اقسام نے اس ملک کو برباد کر دیا ہے۔ اس کے باوجود پاکستان بڑی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پاکستان نے کئی بڑی بڑی رکاوٹیں بھی عبور کی ہیں۔ لیکن مرحوم قائداعظم کا خواب اور موجودہ

سچائیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ جو اس ملک کے لئے ایک دردناک داستان ہے۔ کیوں کہ پاکستانی عوام کی قابلیت کو ملک کے موجودہ حالات پر کہیں زیادہ اولیت حاصل ہے۔

اب گفتگو کے لئے کوئی بھی نکتہ بچا نہیں ہے۔ تمام نکتوں پر تو بات کر لی گئی۔ تقسیم کا کوئی بڑا مسئلہ حل کرنے کے لئے نہیں بچا سوائے ایک سوال کے، خواہ اسے نااہلی کہیں یا کچھ اور بالآخر اس تقسیم سے کیا حاصل ہوا؟ کروڑوں افراد کے مستقل دکھ دشواریوں اور پریشانیوں کے سوا، اور یہ پریشانیاں مسلسل جاری ہیں۔ جب ہم محمد علی جناح کے 'ہندو مسلم اتحاد کے سفیر'، سے 'پاکستان کے قائد اعظم' تک کے جرأت مندانہ سفر کے بارے میں تحریر ختم کرتے ہیں تو ہمیں اس سچائی پر غور کرنا پڑتا ہے کہ آخر کار یہ سارا تاریخی بیانیہ اس عہد کی سیاست کی ہی تو تفصیل ہے۔ محمد علی جناح کی یہ سیاسی سوانح حیات بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ باوجود اس کے، کیا یہ تجزیہ بیکار کی ایک مشق ہی ہوگا۔ کیوں کہ بہر حال اس لرزہ خیز تقسیم سے کس نے کیا پایا؟ حالاں کہ جناح اپنی ہی کوششوں سے حاصل کردہ نئے ملک پاکستان کی روشنی میں گئے۔ تاہم وہ تو نامکمل ہی تھا۔ کیوں کہ خود پاکستان میں بھی، جو کہ اس خیال کا بانی یہ کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، اور اس کے نتیجے میں متشکل ہونے والا ایک ملک ہے، اس نظریے کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ تو پھر مسلمان ایک الگ قوم تو نہیں ہوئے۔

ماضی قریب کے تجربات اور خونیں تقسیم کی اذیت موجودہ ہند پاک رشتوں کو اور بھی خراب کر رہے ہیں۔ ہماری عقلمندی میں اب ایسی کھسیاہٹ آگئی ہے کہ روزمرہ کی باتیں بھی بد اعتمادی کا سرچشمہ بن گئی ہیں۔ صاف ہے کہ اب کوئی، جنوب ایشیائی مونروڈاکٹرن نہیں ہے جس کے بارے میں جناح نے شاہی انداز میں گفتگو کی تھی۔ اس کے برعکس اب ہمارے پاس صرف غصے سے کھولتے جذبات اور اختلافات ہیں اور انہیں بھی بد اعتمادی کے ایک مستقل غبار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اسی لیے میں سوچتا ہوں کہ اس طرح ٹوٹ کر الگ ہو جانے اور بعد میں جنگیں کرنے کے بجائے، اگر اختلافات مٹائے جاتے اور آخر میں ایک خود مختار پاکستان پیدا ہوا ہوتا تو کیسا رہتا؟ کیا اس وقت ہمارے خطے کی گمشدہ امن وشانتی واپس آجاتی؟ اس سوال کے جواب میں میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا۔ اور کون پہنچ سکتا ہے؟ کیوں کہ کئی دیگر باتوں کے علاوہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش ایک مرکزی دشواری کا سامنا کرتے ہیں۔ ہمارا ماضی دراصل 'ماضی' میں کبھی گیا ہی نہیں ہے۔ وہ تو مستقل طور پر ہمارا 'حال' بنا ہوا ہے اور ہمیں یادوں کے قید خانے سے باہر نکلنے سے ہمیشہ روکتا رہتا ہے۔ ہمیں اس کا جواب ڈھونڈنا ہوگا، کیوں کہ اس کا جواب ہمارے علاوہ اور کون ڈھونڈ سکتا ہے؟ اور تلاش بھی کون کرے گا؟ تکلیف تو ہماری ہے اور ہمیں ہی اس کا علاج بھی ڈھونڈنا ہوگا۔

ہندوستان کی تقسیم اس پورے برصغیر کے لئے بیسویں صدی کا سب سے فیصلہ کن واقعہ ہے۔ اس کا درد اب بھی موجود ہے۔ ٹیس اب بھی اٹھتی ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ جیسے سوالات روزانہ ستاتے ہیں۔ ہم نے تقسیم کو

پس پشت نہیں چھوڑا ہے۔ ہم اسے مسلسل جی رہے ہیں۔ کیوں کہ ہم نے ان برسوں کی عظیم غلطیوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش اب بھی کر رہے ہیں۔ کیا اس لیے تا کہ ہمیں کبھی بھی اس کا اعادہ نہ کرنا پڑے اور شاید اس لیے بھی کہ ان غلطیوں کو یاد کر کے ممکن ہے کہ ہم اپنی تکلیف کچھ کم کر سکیں۔

یہ جناح کا بیانیہ ہے۔ ایک شخص اور اس کی جرأت مندانہ کوششوں کا اور اس کے ساتھ دوسروں کی کوششوں کا بھی۔ وہ اور میں نے ان تمام تفصیلات کی آمیزش سے ایک سوانح حیات لکھی ہے۔ لیکن جانتا تو صرف اللہ ہی ہے۔"[26]

حوالہ جات

تعارف اور باب 1

-1 *Postmodern Gandhi and Other Essays: Gandhi in the World and at Home;* Lloyd I. Rudolph, Susanne Hoeber Rudolph; p.272; The University of Chicago Press; co-published with Oxford University Press, India; 2006.

-2 *India's Partition: Process/ Strategy and Mobilization;* Mushirul Hasan. 'Introduction', in Mushirul Hsan (ed.); Introduction, p.10, n. 36, OUP, Delhi; 1993.

-3 *Postmodern Gandhi and Other Essays: Gandhi in the World and at Home;* Lloyd I. Rudolph, Susanne Hoeber Rudolph; p.64; The University of Chicago Press, co-published with Oxford University Press, India; 2006.

-4 عربی لفظ، جس سے مراد ابن خلدون کی منصوبہ بند تاریخ عالم، کتاب العبر، 1377، کا وہ مقدمہ ہے جس میں 'آفاقی تاریخ' کے بارے میں اولین مسلم نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

The Muqaddinah, An Introduction to History

-5 Excerpted from The Introduction to *The Muqaddimah, An Introduction to History;* Ibn Khaldun translated from the Arabic by

Franz Resenthal, abridged and edited by N.j. Dawood; Bollingen Series; Princeton University Press

6- شروع میں اقبال اور جناح دونوں نے واحد ہندوستانی قومیت کی وکالت کی... لیکن دھیرے دھیرے ان کا موقف 'ہم' سے 'وہ' میں تبدیل ہوتا گیا۔ اقبال کے ہاں یہ تبدیلی جناح سے پہلے آئی........ایک علاحدہ قوم کی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کا تصور ایک ایسا مقصد بن گیا جس کے لئے جدوجہد کی جا سکتی تھی۔ اقبال کے تصور قومیت (مسلم قومیت) کی اساس دراصل ان کے اس تصور پر قائم تھی کہ مسلمان ہونے کا کیا مفہوم ہے ... اسلامی قدروں پر مبنی انسانی اتحاد ہی ان کا 'نصب العین' تھا ... چنانچہ یہ تصور نہ صرف جغرافیائی حدود سے آزاد تھا بلکہ آفاقی بھی تھا ... اس کے برعکس مغربی تصور، جغرافائی حدود کا پابند تھا (اور جس نے مذہبی افکار و خیالات کو یکسر خارج کر دیا تھا) ... اقبال نے نہ صرف اس تصور کو مسترد کیا بلکہ مذہب 'آمیز' ہندوستانی قومیت کے تصور کو بھی خارج کر دیا ... لیکن چوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی نہ کوئی مسکن تو ہونا ہی تھا، اسی لئے اقبال یہ مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کو برطانوی ہندوستان کے اُن خطوں پر تصرف حاصل ہونا چاہئے جہاں وہ اکثریت میں ہیں؛ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں، ایک مسلم ریاست کے بارے میں اپنی تجاویز پر اور زیادہ مصر اور پختہ ہو گئے تھے۔

7- *Indo-Muslim Traditions*, 1200-1750: *Towards the framework of Study;* Richard M. Eaton. Text of the Annual South Asia Lecture delivered at School of Oriental and African Studies, London, on 22 November 2001. South Asia Research, 22 1; p.2. Sage Publications; 2002,

8- مسلم اقتدار نہ تو کسی وسط ایشیائی سرزمین سے جاری ہونے والا کوئی نو آبادیاتی اقتدار تھا اور نہ ہی یہ ہندوستان میں رچ بس جانے والی کسی فاتح سیاسی شخصیت کا قومی اقتدار تھا ... ہرات کے شمال میں واقع غور کے مشرقی ایرانی سرداروں کی قیادت میں، ترک غلاموں اور افغانوں کی فوجوں نے 1192 اور 1206 کے درمیان دریائے سندھ اور گنگا کے میدانوں پر اپنا تسلط قائم کیا ...1221 تک، افغانستان میں غوری اقتدار کا چراغ گل ہو گیا اور چنگیز خاں کی قیادت میں منگولوں نے ہندوستان میں موجود ان کی (غوریوں) فوج سے رشتہ منقطع کر لیا.....

دہلی سلطنت، ایک ترک غلام، التتمش (36-1211) کے ہاتھوں قائم ہوئی، حالاں کہ (تیرہویں صدی کے اواخر میں) اس کے سر پر منگول حملوں کا خطرہ متواتر منڈلاتا رہا۔

چودہویں صدی کے اواخر میں، ترک امیر تیمور (1370-1405) نے حکومت دہلی کو برطرف کرتے ہوئے، دہلی سلطنت کو گجرات، مالوہ اور جونپور کی تین علاقائی سلطنتوں میں تقسیم کر دیا۔

9- منگولوں کی دسترس سے دور، دہلی میں، 1260 میں، اپنے عہد کے ممتاز ترین مورخ، منہاج سراج جرجانی نے یہ تلخ حقیقت بیان کی تھی کہ 'ملعون' چنگیز خاں نے وسط ایشیا، ایران اور عراق کے اسلامی مراکز کو پامال کر ڈالا اور یہ کہ ان علاقوں سے دینِ محمدی کا اقتدار رخصت ہو گیا اور اب وہاں لادینیت کا دور دورہ تھا'...... جرجانی مزید لکھتا ہے، 'لیکن اللہ کے فضل سے ہندوستان کی سلطنت اور...... التتمشی سلسلۂ شاہی کا تحفظ اہالیانِ اسلام کی توجہ کا مرکز اور دین داروں کا محور بن گیا۔ :Indo-Muslim Traditions, 1200-1750 *Towards the Framework of Study*؛ رچرڈ ایم- ایٹن، 22 نومبر 2001 کو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، لندن میں دیے جانے والے سالانہ جنوبی ایشیا لیکچر کا متن- ساؤتھ ایشیا ریسرچ، 22، 1: ص 3۔ سیج پبلی کیشنز: 2002 میں بھی مذکور ہے۔

10- اس سرزمین پر یورپ کے لوگوں کی آمد سے قبل، لفظ 'انڈیا' موجود نہ تھا۔ میں نے ہند اور ہندوستان ہی تحریر کیا ہے اور 'انڈیا' کا استعمال انگریزوں کی آمد کے بعد کے زمانے کے لیے کیا ہے۔

11- Imagined Communities: *Reflections on the Origins and Spread of Nationalism*، بینیڈکٹ اینڈرسن کی یہ کتاب قوموں اور قوم پرستی کے تصور پر ایک معیاری کتاب کا درجہ رکھتی ہے اور 'متصورہ قوموں' کے تصور کی وضاحت کرتی ہے...... اینڈرسن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قومیں 'خیالی' ہوتی ہیں کیوں کہ 'انتہائی چھوٹی سی قوم کے لوگ بھی اپنی قوم کے بیشتر لوگوں سے نہ کبھی نہ کبھی واقف ہو سکتے نہیں نہ ہوں گے، نہ ملے ہوں گے، نہ اُن کے بارے میں انہوں نے کچھ سنا ہوگا، پھر بھی اُن میں سے ہر ایک کے ذہن میں ایک خیالی اتحاد کا تصور کارفرما رہتا ہے'... گیلنر نے ایک تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ 'قوم پرستی قوموں میں خود شعوری کے تئیں بے داری نہیں ہے: یہ قوموں کو خیالی طور پر ایجاد کر لیتی ہے جب کہ اُن کا وجود ہی نہیں ہوتا' گیلنر... 'یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ قوم پرستی 'تخیل سازی' اور 'تخلیق' کے بجائے حیلہ سازی، 'تصنع' اور جھوٹ کے بہروپ اختیار کرتی ہے'... قوم کو محدود تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ بڑی سے بڑی قوم بھی جو مثلاً ایک ارب لوگوں پر مشتمل ہو، محدود اگرچہ لچک دار سرحدیں رکھتی ہے جس کے باہر دوسری قومیں موجود ہوئی ہیں...... کوئی بھی قوم اپنے آپ کو ساری نوعِ انسانی کا ہم معنی نہیں سمجھتی...... بڑے سے بڑا انجات پسند قوم پرست بھی کسی ایسے دن کا خواب نہیں دیکھ سکتا جب نوعِ انسانی کے تمام اراکین اس کی قوم میں شامل ہو جائیں گے، کچھ اس طرح جیسے بعض عیسائی ایک زمانے میں سوچتے تھے کہ ساری دنیا عیسائی ہو جائے گی۔ اُسے (قوم کو) اقتدارِ اعلا کا حامل تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ تصور ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوا تھا جب 'روشن خیالی' اور 'انقلاب' خداداد، مراتب پر مبنی خاندانی حکومتوں کو مٹا دینے کے درپے تھے۔ انسانی تاریخ کے اس مرحلے میں پختہ خیالی حاصل کرنے کے بعد جب کسی عالم گیر مذہب کے کٹر سے کٹر پیروکار بھی مذاہب کی جیتی جاگتی کثرت،

ہر عقیدے کے وجودی دعووں اور علاقوں کے یکساں ہونے کی حقیقت سے ناقابل فرار طور پر دوچار ہیں، قومیں اپنے آزاد ہونے کی آرزو کر رہی ہیں اور اگر وہ خدائی اقتدار کے ماتحت ہیں تو اس سے بھی گلوخلاصی چاہتی ہیں۔ اس آزادی کا پیمانہ اور پرچم اقتدار اعلا کی حامل ریاست ہے۔

آخری بات یہ کہ قوم کو ایک 'برادری' تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ، ہر قوم میں موجود نابرابری اور استحصال سے قطع نظر، قوم ہمیشہ کو ایک گہری اور پھیلی ہوئی اخوت تصور کی گئی ہے۔ آخر کار یہی اخوت ہے جو، گزشتہ دو صدیوں کے دوران، لاکھوں لوگوں کو دوسروں کو مارنے سے زیادہ محدود تصوراتی ہیولوں کے لیے جان دینے پر آمادہ کرتی رہی ہے۔ یہ موتیں ہمیں قوم پرستی کی پیش کردہ مرکزی مسئلے کے روبرو کرتی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے حالیہ تاریخ (بہ مشکل دو صدیوں) کے دوران پیدا ہونے والے یہ سکڑے سمٹے ہوئے تصورات اس بڑے پیمانے پر دی جانے والی قربانیوں کا سبب کیسے بنے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب قوم پرستی کی ثقافتی جڑوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

12- ایضاً

13- جرمن ماہر سیاسی اقتصادیات اور ماہر سماجیات میکس ویبر (1864-1920) کو جدید سماجیات اور اجتماعی نظم و نسق کے مطالعات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے عصری جرمن سیاست پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ وہ 'ورسیلز کے معاہدے' سے متعلق جرمن مذاکرت کاروں میں شامل تھا اور ویمار آئین وضع کرنے والے کمیشن کا رکن بھی تھا۔ اس کی مشہور ترین تصنیف ہے۔

The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism□

14- میکس ویبر نے خصوصیت کے ساتھ اور الگ سے اسلام پر تحقیق نہیں کی۔ اسلام سے متعلق اس کے تبصرے 'پروٹیسٹنٹ ایتھک' کے اس کے مشہور تجزیے کا حصہ تھے۔ ویبر کے مطابق، اسلام میں عقلی قانون موجود نہیں رہا۔ اس کی نگاہ میں اسلام کو فطری طور پر ارتقاء سے محروم کرنے والے عوامل میں سے ایک عامل اسے آگے بڑھانے والا 'عسکری گروہ' تھا۔ اس کے نتیجے میں، اسلام کا مذہبی پیغام اس 'عسکری گروہ' کی ضروریات سے مطابقت رکھنے والی اقدار میں تبدیل ہوگیا۔

15- یہاں سے آگے ہم ترسیل اور تفہیم کی آسانی کے لئے صرف لفظ 'انڈیا' کا استعمال کریں گے، حالاں کہ اسے ہند، ہندوستان اور بھارت وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔

16- *Indo-Muslim Traditions, 1200-1750: Towards the Framework of Study;* Richard M. Eaton. Text of the Annual South Asia Lecture delivered at the School of Oriental and African Studies, London, on 22 November 2001; South Asia Research, 22, 1; p.10; Sage Publications;

2002.

-17 اشراف ایک اصطلاح ہے جو ہندوستان میں آنے والے عجمی-عرب-ترک تارکین وطن کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ سید اور شیخ وغیرہ اس کے ذیلی حلقے ہیں۔ غیر اشراف مسلمانوں میں تین قسم کے لوگ شامل ہیں: اعلا ہندو ذاتوں کے مسلمان ہونے والے لوگ، خاص طور پر راجپوت، جو شیخ ذات میں جذب نہ ہوئے ہوں، دست کار مثلاً جولاہے اور سب سے نچلے طبقے کے نومسلم یعنی اچھوت۔

-18 دیہی علاقوں کے مسلم کسان اور دست کار۔

-19 *The Ulama of Farangi Maball and Isalmic Culture in South Asia;* p.35; Francis Robinson; Permanent Black; Delhi; 2001.

-20 *The Aftermath of Revolt: India 1857-1870; Thomas* R. Metcalf; p.298; Princeton; 1965.

-21 *Memoirs of My Indian Career;* Sir George Campbell; p.243-4; Vol. 1; London; 1983.

-22 Report dated 20 December 1858 to the Sudder Board of Revenue. Proc. No. 31, N-WP, Rev. Procs., 14-30 April 1859, India Office Library Range 221, Vol. 24.

-23 پندرہویں صدی کے اواخر اہل یورپ کی دراندازی سے مالابار کے موپلاؤں اور مقتدر اعلا ذات ہندوؤں کے درمیان سماجی اور اقتصادی اثرات کے لئے مقابلہ آرائی شروع ہوگئی۔ انگریزوں کی فتح اور اس کے نتیجے میں زرعی تعلقات کا توازن بگڑنے کے خلاف ردعمل کے طور پر، موپلاؤں نے زمین کے مالک اعلا ذات ہندوؤں پر لگاتار حملے شروع کئے۔ ان حملوں کا نقطۂ عروج 22-1921 کی وہ بغاوت تھی جس کے ذریعے موپلاؤں نے اسلامی تعلیمات پر شدت سے عمل کرتے ہوئے ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی۔

-24 Ref, No. 362 of Papers on Miscellaneous Subjects, Canning Papers.

-25 ہاڈسن، میجر ولیم 1845 میں ہندوستانی فوج میں شامل ہوا، پہلی سکھ جنگ میں شریک ہوا اور بعد میں پنجاب میں ایک سِول عہدے پر رہا۔ 1857 کے دوران، وہ محکمہ سراغ رسانی کا سربراہ ہوگیا اور اس نے ایک غیر مستقل گھوڑ سوار رجمنٹ کی کمان بڑے حوصلے کے ساتھ سنبھالی۔ اس رجمنٹ کو بعد میں 'ہاڈسنز ہارس' کا نام دیا گیا۔ اس نے دہلی اور لکھنؤ کے محاصروں میں حصہ لیا... اس نے مغل شہنشاہ کو گرفتار کیا، نوعمر شہزادوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا، اور اس کے چند ماہ بعد شہر میں ایک محل پر چھاپہ مارتے ہوئے مارا گیا۔

-26 *Eighteen Fifty-Seven;* S.N. Sen; p. 116; Delhi; 1957.

-27 *The Muslims of British India;* Peter Hardy; pp.71-2; Cambridge University Press, 1972.

28- ایضاً، p.73 ,

29- *The Muslims of British India;* Peter Hardy; p.78; Cambridge University Press, London; 1972.

30- صدر امین: اس زمانے کی برطانوی نظم ونسق کے تحت، وہ اعلاترین عہدہ جس کی کوئی ہندوستانی آرزو کرسکتا تھا، منتظمہ کے زمرے میں ڈپٹی کلکٹر اور عدلیہ کے زمرے میں صدر امین کا ہوتا تھا۔

31- سرسید احمد خاں 1817 میں طبقہ اشراف کے ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے لوگ معزز تو تھے مگر ممتاز نہیں تھے اور دہلی کے مغل دربار سے وابستہ تھے۔۔۔ان کے نانا لارڈ ویلز کے زمانے میں سفارت خانہ ایران میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی خدمت میں رہے تھے۔۔۔سرسید 1883 میں اپنے والد کی وفات کے بعد، ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتی سروس میں داخل ہوئے اور 1857 کی بغاوت شروع ہونے تک وہ ترقی کر کے صدر امین یا سب جج کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ 1857 کا سال سرسید کی زندگی اور افکار کے لئے زبردست اہمیت کا حامل تھا۔۔۔انہوں نے بذات خود ضلع مجبور کو انگریزوں کے لئے بچائے رکھنے کی کوشش کی۔۔۔اس وقت ان کی تمام تر تحریریں مسلمانوں کو یہ باور کرانے پر مرکوز تھیں کہ مغربی افکار اسلام مخالف نہیں ہیں۔

32- *The Muslims of British India;* Peter Hardy, p.79; Cambridge University Press; London; 1972.

33- حدیث، رسول اللہ کے اقوال اور اعمال پر مشتمل ہوتی ہے۔ احادیث کے مجموعوں کو تمام فقہی مسالک، سنت کے مصدقہ کا ایک صوفہ ذریعہ سمجھتے ہیں۔

34- نقش بندی سلسلہ، اسلام کے چار اہم صوفی سلاسل میں شامل ہے۔ 1380 میں قائم ہونے والے اس سلسلے کو بعض لوگ 'اعتدال پسند' سلسلہ کہتے ہیں جس میں خاموش 'ذکر' اور 'صحبت' پر زور دیا جاتا ہے۔ نقش بندی فارسی زبان کا لفظ ہے جو اس کے بانی بہاالدین نقش بندی بخاری کے نام سے لیا گیا ہے۔

35- عالم اور فاروقی چشتی سلسلے سے وابستہ شیخ احمد سرہندی 971 ہجری میں پنجاب کے سرہند علاقے میں پیدا ہوئے اور 1079 ہجری میں وفات پائی۔۔۔شیخ احمد سرہندی (1564-1624) اپنا شجرہ خلیفہ عمر سے منسوب کرتے تھے۔ شیخ احمد سرہندی حافظ اور اعلا پائے کے عالم تھے جنہوں نے منطق، فلسفہ اور دینیات کا درس ملا کمال کشمیری سیالکوٹی سے اور حدیث کا درس شیخ یعقوب سیفی سے لیا تھا۔ اکبر کے نظریہ 'صلح کل' کے خلاف احتجاج کرنے کے بعد انہیں مجدد الف ثانی کہا جانے لگا۔

شاہ ولی اللہ (1703-62) عالم دین تھے جنہوں نے نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ متحدہ طور پر پانی ۔۔۔ کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کا مقابلہ کریں۔ مسلمانوں کے اوج واقبال کی بحالی کے لئے ان کی حکمت عمل میں، ابن خلدون کے اس خیال کی بازگشت سنی جاسکتی ہے کہ تجدید واحیاء صرف اصل اسلام کی قدیم

روح کی جانب پلٹنے سے ہی ممکن ہے۔ جہاں تک ان کا اپنا معاملہ تھا، انہوں نے اسے شریعت کی حکمرانی سے بدل دیا۔ انہوں نے اجتہاد پر زور دیا اور کہا کہ انفرادی فکر و تدبر ہر عہد کی توانائی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ انہوں نے عقل و تدبر کا استعمال نہ کرنے والے فقیہوں پر نکتہ چینی بھی کی۔ انہوں قرآن کے مطالبے کو عام کرنے کے لئے اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ ان کا مدرسہ درس حدیث کے لئے مشہور تھا۔ ان کے دروشماء میں شاہ عبدالعزیز (جنہوں نے 1803 میں انگریزوں کے خلاف مشہور فتوادیا)، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور سید احمد بریلوی شامل تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ دادو میاں اور ٹیٹو میر بھی اسی خانوادے سے متاثر تھے۔

سید احمد بریلوی ہندوستانی اسلام کی تاریخ کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ وہ 18 ویں صدی میں ایسائی تحریک کے بانی شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ اس لحاظ سے وہ ہندوستان کے اسلامی ماحول کے پیدا وار تھے، لیکن اگر چہ شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور اسلام کو ہندو اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے جہاد کا اعلان نہیں کیا۔ جہاد کا سلسلہ سید احمد بریلوی نے شروع کیا۔ یہی وجہ ہے ان کے پیروؤں کو وہابی کہا جاتا ہے۔ شروع میں جہاد کا سلسلہ سکھوں تک محدود تھا۔ بعض مسلم مصنفین کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کی اجازت دے رکھی تھی مگر سکھوں نے ایسا نہیں کیا ... لیکن دوسرے اسکالر اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سید احمد بریلوی نے جہاد کو صرف سکھوں کے خلاف اس لیے محدود رکھا کہ ان کے نزدیک وہ دونوں میں سے کمزور تر تھے اور ان کا مقابلہ بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔ یہ دوسرا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے، حالاں کہ سید احمد سکھوں کے خلاف کامیاب نہ ہوسکے، جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا زیادہ تر وقت پٹھانوں کی شورش دبانے میں صرف ہورہا تھا۔ انگریزوں نے لوگوں اور مال واسباب کے اپنے علاقے سے ہوکر گزرنے اور پٹنہ میں وہابی مرکز کے قیام سے چشم پوشی کی۔ 1849 میں پنجاب اور شمال مغربی سرحدی علاقے پر وہابیوں کے قبضے بعد بھی جہاد جاری رہا ... وہابیوں نے 1857 کی بغاوت اور دارالعلوم دیو بند کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔

36- سید احمد بریلوی (وفات 1831) نے 'احیاء اور صلاح' کی جارحانہ تحریک کے ذریعے اسلام کے فروغ کی کوشش۔ وہ اسلام کو ہندو اثرات سے پاک کرنا، بزدگان دین کے شفاعت کی قوتوں کا حامل ہونے کے عقیدے کا خاتمہ اور ایک مثالی مسلم معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جہاں مسلمان اسلامی قوانین کے مطابق زندگی گزاریں۔ وہ 1831 میں جہاد کے دوران ہی فوت ہوئے۔ اس کے بعد بھی ان کے حامیوں نے انیسویں صدی کے اواخر کے دوران ملک کے کئی حصوں میں اپنی تحریک جاری رکھی۔

37- EN 29

38- *An Islamic Responce to Imperialism - Political & Religious of Syed*

Jamal ad-Din 'al-Afghani'; Nikki R. Keddie, pp. 55-6; University of California Press; 1968.

39- ایضاً ص56

40- *Maqalat-i-jamaliyeh;* pp.75-87; cited in ibid,-p.56.

41- ایضاً ص 57

42- ایضاً

43- انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران مشرقی بنگال میں فرائضی تحریک (57-1830) شروع کی گئی جس کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے۔ یہ تحریک انگریزوں کی زرعی پالیسی اور زمین داروں کے معاملات کے خلاف ردعمل اور دبے کچلے مسلمانوں کی حامی تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں پر غیر اسلامی رسوم ترک کرنے اور مذہبی فرائض پر عمل کرنے کے لیے زور دیا۔ اس لیے اسے فرائضی تحریک کہا گیا۔

44- دادو میاں حاجی شریعت اللہ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے فرائضی تحریک کو مقبولیت اور مضبوطی دی۔ باقر گنج، ڈھاکہ، فرید پور اور پنبیا اضلاع کے مسلم کاشت کاروں اور دست کاروں پر ان کے گہرے اثرات تھے۔ انہوں نے اپنے خلیفہ مقرر کیے جو انہیں تمام معاملات سے باخبر رکھتے تھے۔ دادو میاں نے درگا پوجا کی تقریبات کے دوران درگا کی مورتیوں کو سجانے کے لیے زمیں داروں کی طرف سے مسلم کسانوں پر لگائے جانے والے ٹیکسوں کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے اپنے حامیوں کو حکومت کے زیر انتظام اراضیوں پر آباد ہونے کو کہا۔ 1857 کی بغاوت کے دوران انہیں ضلع فرید پور کے کاشت کاروں کو برطانوی حکومت کے خلاف منظم کرنے کے لیے گرفتار کرلیا گیا۔ 1860 میں ان کی وفات ہوئی۔

میر ناصر علی عرف ٹیٹو میر بھی ایک اور اہم شخصیت ہیں جو بنگال کے مسلمانوں کی تکلیفوں اور مصائب سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ حج سے واپسی پر انہوں نے اپنے آپ کو ملک کی مذمت کے لیے وقف کر دیا اور کلکتہ کے نزدیک نرکل بریا گاؤں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ بہت سے ظلم زدہ مسلم کاشت کار، ہندو زمین دار کرشن دیوراج کے خلاف جدوجہد میں ٹیٹو میر کے ساتھ ہوگئے۔ ٹیٹو میر نے کرشن دیو کو شکست دے کر ایک عبوری حکومت قائم کرلی۔ انگریزوں نے سو انگریز فوجیوں اور 300 سپاہیوں کی ایک مختصر ٹکڑی نرکل بریا روانہ کی۔ ٹیٹو میر 1831 میں برطانوی فوج سے لڑتے ہوئے فوت ہوئے۔

لیکن ٹیٹو میر کی موت ان کے پیروؤں کو بے حوصلہ نہ کرسکی اور ان کی مثال آنے والے برسوں میں ان کے لئے باعث تحریک بنی رہی۔

The Muslims of British India, Peter Hardy, p.58 Cambridge University Press, London, 1972

46- ایضاً ص 59

47- شاہ ولی اللہ دہلوی (62-1703) ایک اہم مصلح دین تھے جنہوں نے مسلم اقتدار کی بحالی کے لئے کوشش کی۔

48- انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں بریلوی مکتب فکر قائم کیا۔ یہ اصلاحی حلقہ بعض قدیم مذہبی طریقوں کے احیاء کا حامی اور دیوبندی مکتب فکر اور اس کی نظریات کا مخالف تھا۔

49- *The Muslims of British India;* Peter Hardy; p.l; Cambridge University Press, 1972]

50- *Struggle for Empire;* Bhartiya Vidya Bhavan, pp.54, 82, India Antiquary XIX, p.219 Epigraphica Indica IV,119.

51- ترائین کی پہلی جنگ 91-1090 میں محمد غوری اور اجمیر اور دہلی کے حکمراں پرتھوری راج چوہان کے درمیان ہوئی۔ محمد غوری کو شکست ہوئی، وہ شدید زخمی ہوا اور غزنی لوٹ گیا۔

ترائین کی دوسری جنگ: محمد غوری حوصلہ نہیں ہارا اور اسی نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے جلد ہی ایک طاقت ور فوج منظم کر لی۔ کافی تیاریوں کے بعد 1192 میں اس نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اس جگہ (تھانیسر کے نزدیک ترائین) پھر جنگ ہوئی جس میں محمد غوری نے راجپوتوں کو بھاری شکست دی۔ پرتھوی راج چوہان گرفتار کیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔

52- جزیہ اسلامی ریاست کا ایک نظم تھا جس کے تحت غیر مسلم شہریوں کو اپنے تحفظ کے لئے ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا۔ انہیں مسلمانوں کی طرح زکات اور دیگر ٹیکس نہیں دینے پڑتے تھے۔ جزیہ آخری بار مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی حکومت کے دوران عائد کیا گیا جو یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ایک اسلامی ریاست قائم کی جاسکتی ہے، خواہ اس میں مسلم آبادی اقلیت ہی میں کیوں نہ ہو۔

53- ججمانی نظام ہندوستان کی دیہی برادریوں میں مختلف ذاتوں کے خاندانوں کے درمیان باہمی سماجی اور اقتصادی تعلقات پر مبنی تھا جس کے تحت کوئی ایک خاندان دوسرے کے لئے کوئی خاص خدمت انجام دیتا تھا مثلاً مذہبی رسوم کی ادائگی، بال کاٹنا یا زرعی مزدوری۔ یہ تعلقات ایک نسل سے دوسری نسل تک جاری رہتے ہیں۔

54- ہنٹر، ولیم لسن (1900-1840)، انڈین سول سروس کارکن، بڑا ماہر عددیات اور موئف اور برطانوی راج کا تاریخ نگار۔ ہنٹر 1862 میں انڈین سول سروس میں داخل ہوا اور بنگال پریزیڈینسی میں خدمات انجام دینے کے لئے منتخب کیا۔ وہ نومبر 1867 میں بنگال پہنچا اور بیر بھوم کا اسسٹنٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر مقرر کیا گیا۔ جولائی 1869 میں اس کی خدمات حکومت ہند کو منتقل کر دی گئیں اور اسے 'گزیٹیر آف انڈیا' کا موئف مقرر کر دیا گیا۔ فروری 1871 سے وہ محکمہ داخلہ میں حکومت ہند کا کارگزار انڈر سکریٹری رہا۔ دریں اثناء اس کے لئے ڈائرکٹر جنرل، عددیات برائے حکومت ہند کا عہدہ قائم کیا گیا جسے اس نے ستمبر 1871 میں سنبھالا۔ 1875 سے

1881 تک اس نے ہر سال کا تقریباً آدھے سے زیادہ عرصہ برطانیہ میں گزارا جس کا مقصد، *Stastical Account of Bengal and imperial Gazetheer of India* کی تالیف کرنا تھا۔

55- *Kavi Vachan Sudha* [Benaras], 8 August 1873, UPNNR, 1873.

57- سراج گنج کی تحریک: لفٹننٹ گورنر اور مرکزی حکومت کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو جانے کے نتیجے میں سر بمپ فلڈ فلر کو مستعفی ہونا پڑا۔ متعلقہ حقائق اس طرح تھے: انسپکٹر آف اسکولز کی رپورٹ مورخہ 2 جنوری 1906 پر عمل کرتے ہوئے لفٹننٹ گورنر نے 10 فروری کو رجسٹرار، کلکتہ یونیورسٹی کو ایک مکتوب ارسال کیا جس میں سفارش کی گئی تھی کہ ضلع پبنا میں سراج گنج علاقے کے بنواری لال اور وکٹوریہ ہائی اسکولوں کا یونیورسٹی سے الحاق، طلبہ اور اساتذہ کی باغیانہ سرگرمیوں کی سزا کے طور پر ختم کر دیا جائے۔ اسکول حکام کی جانب سے کوئی کارروائی نہ کئے جانے سے جب ان سرگرمیوں میں ملوث لوگوں کو پکڑنے اور سزا دینے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، اور لفٹننٹ گورنر کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ حکومت بنگال کے کاگزار چیف سکریٹری جناب آر ڈبلو کارلائل کی جانب سے مجسٹریٹوں اور کلکٹروں کو ارسال کردہ سرکولر (10 اکتوبر 1905) پر عمل کرے جس میں انہیں ہدایت دی گئی تھی کہ اگر طلبہ کسی بھی سیاسی احتجاج، بائکاٹ اور اسی طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لیں، تو وہ متعلقہ اسکولوں یا کالجوں کے سربراہوں کو مطلع کریں کہ اگر وہ اپنے اداروں کے طلبہ کو ان سرگرمیوں سے باز نہ رکھ سکے تو ان کی سرکاری امداد اور، وظیفوں کے لئے مقابلے میں حصہ لینے اور وظیفہ پانے والوں کو داخلہ دینے کی سہولت ختم کر دی جائے گی، اور یونیورسٹی سے کہا جائے گا کہ وہ ان اداروں کا الحاق ختم کر دے۔

58- *History of Indian National Movement*, Sir Verney Lovett, a naval officer.

59- ایضاً

60- مولانا محمد علی (1878-1931) جن کا تخلص جوہر تھا خلافت تحریک کے رہنما تھے۔ شوکت علی ان کے بھائی تھے۔ وہ ایک زبردست قلم کار اور خطیب تھے۔ انگریزی اور ہندوستانی اخباروں کے لئے انگریزی اور اردو زبانوں میں لکھتے تھے۔ انہوں نے 1911 میں اپنا اردو ہفت روزہ ہمدرد اور انگریزی ہفت روزہ کا مریڈ جاری کیا۔

محمد علی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو، جو پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تھا، فروغ دینے کے لئے بڑی کوششیں کیں۔ وہ 1920 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام میں شریک رہے جسے بعد میں دہلی منتقل کر دیا گیا۔ انہوں نے 1906 میں ڈھاکہ میں منعقد آل انڈیا مسلم لیگ کے بنیاد ساز اجلاس میں حصہ لیا تھا۔ وہ 1918 میں اس کے صدر بھی رہے۔ انہوں نے 1928 تک مسلم لیگ میں سرگرم کردار ادا کیا۔

61- حکیم اجمل خاں (1863-1927) ایک ممتاز مجاہد آزادی، مشہور معالج اور ماہر تعلیم تھے۔ انہوں نے دہلی میں

جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی۔ وہ واحد شخص ہیں جو انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے صدر منتخب کئے گئے۔ وہ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔

62- ہندی یا ہندوستانی کی مفرس شکل۔ یہ نام اردو کے معلی سے سے لیا گیا۔ رہی کے اطراف رہنے والے بیرونی فوجیوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ مقامی زبان کا استعمال کریں۔ اس کے لئے علاالدین خلجی نے ایک کتاب تیار کرائی جس میں ہندی الفاظ کے فارسی اور عربی متبادلات دیئے گئے تھے۔

خالق باری عنوان کی یہ کتاب بیرونی مسلم فوجیوں میں تقسیم کرائی گئی۔ ان فوجیوں کے لئے مقامی زبان بول پانا مشکل تھا، اس لئے جب کبھی بھی وہ اسے بولنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ فارسی، عربی اور ہندی کا آمیزہ ہوتا تھا۔ کوئی پانچ سو برس تک اردو محض ایک بولی رہی اور بہت بعد میں تحریر کی زبان بنی-عربی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو نے اپنے آپ کو ہندی سے الگ کرلیا جس کا رسم الخط دیوناگری تھا۔

مغل سلطنت کے زوال کے بعد تک اردو کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں جگہ نہیں ملی تھی۔ انیسویں صدی میں اردو نے فارسی کی جگہ حاصل کی اور پھر بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہوا۔ انگریزوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد اردو سارے شمالی ہند میں عدالت کی زبان تھی۔

63- نواب وقار الملک 1841 میں مرادآباد، اتر پردیش میں پیدا ہوئے، سرسید اور محسن الملک نے مسلمانوں کی تعلیمی تحریک چلائی اور وقار الملک نے اس میں سیاسی پہلو شامل کیا۔ وہ سرسید اور محسن الملک کے سیاسی خیالات سے متفق تھے۔ وہ مسلمانوں کے لئے ایک علاحدہ سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور انہوں نے اس کے لئے مسلسل کوششیں کیں۔

جب 1906 میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو وہ اس کے جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے۔ تقسیم بنگال کے کالعدم کئے جانے سے انگریزوں کی طرف سے مایوسی پیدا ہوئی تو انہوں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اپنا مشہور مضمون 'مسلمانوں کا آئندہ لائحہ عمل' شائع کیا جس میں انگریز مخالف جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ 27 جنوری 1917 کو ان کی وفات ہوئی۔ 64 سر گلبرٹ جان مرے کائنن مونڈ ابلیٹ، چوتھا ارل آف منٹو؛ کناڈا کا گورنر جنرل رہنے کے بعد وہ 1905 میں ہندوستان کے وائسرائے بنایا گیا اور اس حیثیت سے اس نے کئی اصلاحات کیں۔ 1910 میں وہ سبک دوش ہو کر برطانیہ واپس چلا گیا۔

بلیک برن جان مورلے، وسکاؤنٹ (1923-1838) سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند تھا۔ بعد میں انڈیا آفس سے ان کی وابستگی ہندوستان کے نظام حکمرانی کی تشکیل نو سے متعلق اس کی کوششوں کے لئے یاد رکھی جائے گی۔

65- گورنر کا ایک موروثی لقب

66- مورلے کے نام منٹو کے مکتوب مورخہ 8اگست 1906 کے ساتھ منسلک، مورلے پیپرز، انڈیا آفس لائبریری، ای یو آر ڈی 573، نمبر 9۔

67- *The Muslims of British India;* peter Hardy; p.154; Cabmbridge University Press, 1972, London.

68- ایضاً ص155

69- The text of the Simla Deputation's Address and of Minto's Reply is given in full in *Indian Muslims, A Political History;* Ram Gopa; pp.329-238; London, 1959.

70- The Muslims of British India; peter Hardy; p.155; Cabmbridge University Press, 1982,

71- ایضاً

72- 'مسلمان مجموعی طور پر کانگرس کے خلاف ہیں'، بدرالدین طیف جی کا مکتوب ایلن آکٹاویوہیوم کے نام

بدرالدین طیب جی نے دسمبر1887میں کانگریں کے مدراس اجلاس کی صدارت کی۔ بعض ممتاز مسلمانوں نے جن میں سرسید سر فہرست تھے، اسے پسند نہیں کیا اور ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ھوا۔ اور سر سید اور ان کے علاوہ کئی اور مسلمانوں نے طیب جی سے کئی بار مراسلت کی۔ طیب جی نے شروع میں اپنے اس اقدام کا دفاع کیا اور یہاں تک کہا کہ انھوں نے اپنے خطبے میں ھندستان کو ایک قوم قرار نہیں دیا۔ انھوں‌نے سرسید کے نام اپنے مکتوب میں یہ بھی کہا کہ کانگرس نے یہ مان لیا ھے کہ ا□ر مسلم فرقہ کسی معاملے کے خلاف ھو□ا تو وہ اسے زیر بحث نہیں لائے □ی لیکن سر سید اور دیگر مسلمان اس سے بھی مطمئن نہیں ھوئے۔ ان کی مخالفت بہت شدید تھی اور طیب جی کو پیچھے ھٹنا پڑا۔ اس وقت کے کانگرس کے سکریٹری اسے اوھیوم کے نام اپنے اس مکتوب میں طیب جی نے تجویز پیش کی کہ الہ آباد اجلاس کے بعد، کانگرس اپنی سر□رمیاں پانچ سال کے لئے ملتوی کردے، کیوں کہ ان کی وجہ سے ھندوئوں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست مخاصمت پیدا ھو□ئی ھے، اور ا□ر پانچ سال بعد بھی یہ سلسلہ برقرار رھتا ھے تو کانگرس کو فتح کردیا جائے۔ ظاھر ھے کہ ھیوم نے اس تجویز پر عمل نہیں کیا اور طیب جی نے اس کے بعد کسی کانگرس اجلاس میں شرکت نہیں کی۔

محترم بہوم صاحب!

مجھے 20 تاریخ کا آپ کا مکتوب جبل پور سے آنے والے لفافے کے ساتھ موصول ہوا۔ جواب میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ میں اب جو کچھ کہنے جا رہا ہوں وہ ایک بہت اہم معاملہ ہے اور اگر چہ اس کے بارے میں بہت دن سے غور کرتا رہا ہوں مگر میں نے سوچا کہ اس کے بارے میں اپنے خیالات سے آپ کو مطلع کرنے سے پہلے کچھ وقت لینا بہتر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ میں یہ بات کانگرس کے گہرے دوست کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں جو اس کی کامیابی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی مختلف تحریکوں پر آپ کی نظر رہی ہے، مگر پھر بھی، شاید آپ ان کے جذبات و محسوسات سے اس قدر واقف نہ ہو جیسا میں ہوں۔ اس کے علاوہ، میں اس دوران مختلف فرقوں کے سوچنے سمجھنے والے ان لوگوں سے بھی اس معاملے پر بات کرتا رہا ہوں جو کانگرس کے حق میں ہیں۔ لہٰذا میں یہاں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں اسے نہ صرف میرے بلکہ بمبئی کے دیگر ممتاز مسلمانوں، مثلاً مہتا، تیلنگ وغیرہ کے خیالات کی بھی ترجمانی سمجھا جانا چاہئے۔ ہم سب کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کے نمایاں طور پر مخالفانہ رویے کے پیش نظر، جو روز بہ روز زیادہ پُر آواز اور زیادہ واضح ہوتا جا رہا ہے، وقت آ گیا ہے کہ کانگرس کے دوست، بہی خواہ اور حامی اپنے موقف پر نظر ثانی کریں اور اس بات پر غور کریں کہ کیا موجودہ حالات کے تحت ہمارے لئے کانگرس کا اجلاس ہر سال منعقد کرنا ٹھیک ہوگا یا نہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس احتجاج سے ہر سال جو کشیدگی اور تلخی پیدا ہو رہی ہے وہ اس سے حاصل ہونے فوائد پر بھاری پڑ رہی ہے۔ اگر ہندستان کے تمام فرقے اتفاق کر لیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ کانگریں ایک بہت اچھی چیز ہے اور ہندوستان کے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچانے کی اہل ہے۔ کانگرس کا بنیادی مقصد مختلف فرقوں اور صوبوں کو متحد کرنا اور اس طرح ہم آہنگی کو بڑھاوا دینا تھا۔ مگر اب حال یہ ہے کہ نہ صرف مسلمان، ہندوؤں سے اس طرح الگ ہو گئے ہیں جیسے پہلے کبھی نہیں تھے بلکہ خود مسلمان بھی دو دھڑوں میں بٹ گئے ہیں جن کے درمیان خلیج روز بہ روز چوڑی ہوتی جا رہی ہے۔ نظام اور ریاست کے تمام خاص لوگ مثلاً سالار جنگ، منیر الملک، فتح نواز جنگ اور سب سے بڑھ کر حسین بلگرامی سید احمد، امیر علی اور عبد الطیف جیسے معروف لوگوں کے زیر قیادت مخالفین جیسے میں شامل ہو گئے ہیں۔ میں یہاں اپنی اس بات کے پیش نظر فرض کئے لیتا ہوں کہ یہ تمام افراد غلطی پر ہیں اور ہم حق پر۔ مگر پھر بھی یہ حقیقت برقرار رہتی ہے اور ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہمیں اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کی ایک غالب اکثریت اس تحریک کے خلاف ہے۔ اس مخالفت کے پیش نظر یہ کہنا بے معنی ہے کہ ذہین اور تعلیم یافتہ مسلمان کانگرس کے حامی ہیں۔ لہٰذا اگر مسلم فرقہ بحیثیت مجموعی کانگرس کے خلاف ہے، عام اس سے کہ یہ صحیح ہے یا غلط تو اسی کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تحریک ایک عام نیشنل کانگرس نہیں رہ جاتی۔ اگر ایسا ہے تو یہ ایک بڑی حد تک فائدہ پہنچانے کی اپنی صلاحیت سے محروم ہو جائے گی۔ اسے بعض افراد کی طاقت اور عزم کے ذریعے بلاشبہ جاری رکھا

جاسکتا ہے، مگر یہ وہی تنظیم نہیں رہ جائے گی جس میں مسلمان شامل ہوتے تھے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی تلخی کو دیکھ رہا ہوں اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ مسلم رہنماؤں کے درمیان اختلاف رائے سے ایسی کشیدگی اور تلخی پیدا ہو رہی ہے، جس کے بہت برے نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ مسلم معاشرے کی مخصوص حالت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم تمام سیاسی امور میں مل جل کر کام کریں مگر یہ تلخی اس میں مانع ہے اور مجھے لگتا ہے کہ بمبئی تک میں ہم اس طرح کام نہیں کر پا رہے ہیں جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ ان حالات میں، اچھے اور برے پہلوؤں کو تولتے ہوئے، حتی المقدور حد درجہ غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وقت آ گیا ہے کہ کانگرس کا اجلاس سال بہ سال کرنے کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ میں چاہوں گا کہ الہ آباد کانگرس کو زبردست ممکنہ کامیابی حاصل ہو۔ میں چاہوں گا کہ اس میں مسلمانوں کی ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ نمائندگی ہو اور پھر میں چاہوں گا کہ کانگرس کو کم از کم پانچ سال کے لئے ملتوی رکھا جائے۔ اس سے موقع ملے گا کہ ہم اس ساری صورت حال پر از سر نو غور کریں اور اگر ضروری ہو تو پورے وقار کے ساتھ سبک دوش ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی، اس سے ہمیں اپنے پروگرام کو روبہ عمل لانے کا کافی وقت مل جائے گا جو پہلے ہی بہت پھیل چکا ہے۔ اگر پانچ سال کے بعد ہمارے امکانات بہتر نظر آئیں تو ہم کانگرس کی تجدید کر سکتے ہیں، اس احساس کے ساتھ کہ ہم نے ہندوستان کی ترقی اور مختلف نسلوں کو متحد کرنے کے لئے اپنی تمام تر کوششیں انجام دیں۔ نورانی، اے جی بدرالدین طیب جی، نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن (حکومت ہند)، 1969، ص 8-186

73- دیکھئے نوٹ نمبر 60، محمد علی جوہر سے متعلق

74- *Genesis of Pakistan,* V.V. Nagarkar, p.153, Allied Publishers, 1975.

75- *Living India,* Savel Zimand, pp.142-43, Books for Libraries Press, Freeport, New York.

76- *The Muslims of British India,* Peter Hardy, p.153, Cambridge University Press, 1972.

77- ایضاً ص 156-7

78- *Servant of India,* Martin Gilbert, p.51, London, 1966.

79- Harcourt Butler Papers, EUR F 116/65

80- ایضاً

81- *The Muslims of British India,* Peter Hardy, p.159, Cambridge University Press, 1972.

82- *Servant of India,* Martin Gilbert, p.189.

83- ایضاً

84- Harcourt Butler to Minto, 22 July 1909, enclosure to letter of 25 July 1909 from Minto to Morley, Morley Papers, India Office Library, EUR D 573/21

85- ایضاً

86- *The Muslims of British India,* Peter Hardy, p.163, Cambridge University Press, London.

87- ایضاً

88- *Pathway to Pakistan,* pp.137-8, Lahore, 1961.

90- *The Muslims of British India,* Peter Hardy, p.166, Cambridge University Press, 1972.

باب2

1- دیوان-اعلاسرکاری عہدہ

2- خوجہ مخصوص معنی میں ایک ہندوستانی برادری کا نام ہے جو نظاری اسماعیلیوں اوران کی بعض سنی اور اثنا عشری شیعہ شاخوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

یہ نام عمومی مفہوم میں ہندوستانی نظاریوں کے لیے مخصوص ہے جن میں ملتان میں آباد شمسی اور شمالی گجرات کی مومنہ برادریاں بھی شامل ہیں۔ بیشتر نظاری سندھ کے اطراف پائے جاتے ہیں۔

خوجے 17ویں صدی سے ہندوستان اور مشرقی افریقہ کے درمیان تجارت میں سرگرم رہے مگر 18ویں صدی کے بعد ہی بڑی تعداد میں مشرقی افریقہ میں سکونت اختیار کر سکے۔ 1840 میں آغا خاں حسن علی شاہ کے ہندوستان آنے سے امام کے حقوق کے بارے میں خوجہ فرقے کے اندرونی جھگڑے بڑھ گئے۔ 1866 میں فرقے سے خارج کردہ اراکین کی طرف سے آغا خاں کے خلاف دائر مقدمہ کے فیصلے نے امام کے حقوق و اختیارات طے کردیے۔ اس کے نتیجے میں ناراض اراکین فرقے سے الگ ہوگئے۔ یہ سنی خوجے تھے۔ 1877 اور 1901 میں اور لوگوں نے بھی علاحدگی اختیار کی اورانہوں نے بمبئی اور مشرقی افریقہ میں اثنا عشری خوجہ برادری تشکیل دی۔

3- بوہرے اسماعیلی شیعہ اسلام کا ذیلی فرقہ ہیں جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ سیدنا محمد برہان الدین ان کے روحانی پیشوا ہیں۔ بوہروں کا عقیدہ ہے کہ اکیسویں امام طیب ابی القاسم، جن کی براہ راست نسبت رسول اللہ کی بیٹی

حضرت فاطمہ سے ہے، غائب ہو گئے اور اس طرح داعی مطلق کا منصب قائم ہوا۔ داعی مطلق امام کا خلیفہ ہوتا ہے جسے دواؤں بوہرہ فرقے کے تمام دینی و دینوی امور پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ داوی بوہروں کا عقیدہ ہے کہ داعی مطلق امام غائب کی نیابت کرتا ہے۔

-4 عقیقہ رسول اللہ کے زمانے میں عربوں کی ایک رسم تھی جس میں کسی جانور کی قربانی کی جاتی تھی اور اس کا خون بچے کے سر پر ڈالا جاتا تھا اور پھر اس کے بال مونڈے جاتے تھے۔ عربوں کا عقیدہ تھا کہ اس سے بچہ بلاؤں اور مصائب سے محفوظ رہتا ہے۔

-5 سندھ کے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے والے خان بہادر حسن علی آفندی کا قائم کردہ اسکول۔

-6 ہندوستانی میں اس کا مطلب ہے علاقہ۔

-7 دادا بھائی نو روجی، آر پی ماہی۔

-8 'مائی برادر'، فاطمہ جناح، مولفہ شریف المجاہد، کے اقتباسات۔

-9 اسلنگٹن کمیشن کے سامنے جناح کی شہادت، منٹس آف ایوی ڈینز، آئی او آر، جلد 22، کالم 7294

-10 سول سوٹ نمبر 11 آف 1896، ضلع عدالت، کراچی

-11 *Mohammad Ali Jinnah - An Ambassador of Unity, His Speeches and Writings* 1912-17

سروجنی نائڈو کے تحریر کردہ سوانحی خاکے اور راجہ محمود آباد کے پیش لفظ کے ساتھ، ص 4، گنیش اینڈ کمپنی، مدراس، 1918

-12 *Recollections and Reflections,* Chimanlal Setalvad, p.61; Padma Publications, Bombay, 1946.

-13 *Roses in December,* M.C. Chagla, p.41, Bhartiya Vidya Bhavan, Mumbai.

-14 *The Oxford India Gandhi, Essential Writings,* compiled and ekited by Gopal drishna Gandhi, p.690, Oxford.

-15 لوہنا ہندوستان کی ایک ہندو تجارت پیشہ برادری اور ایک نسلی گروپ کا نام ہے۔ یہ بنیادی طور پر گجرات اور بمبئی کے اطراف علاقوں میں آباد ہیں۔ لوہنا لوگ پنجاب کی شرتیہ ذات کی ایک شاخ تھے جو کوئی 800 سال پہلے سندھ اور گجرات منتقل ہو گئے۔ منتظموں اور حکمرانوں کی حیثیت سے شرتیہ لوہناؤں کو تحفظ کی ذمے داری سونپی گئی۔ بعد میں اقتصادی اور سیاسی حالات کے تحت انہوں نے تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ بعض لوہنا لوگ اسلام بھی لے آئے جنہیں یمن کہا گیا۔

لوہنا لوگ آج بھی افغانستان اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ افغانستان میں انہوں نے اپنی مذہبی پہچان

آج بھی برقرار رکھی ہے اور انہیں لوکھترا کہا جاتا ہے۔ سندھ میں ہندو پہچان کے ساتھ رہنے والے لوہنا لوگ سندھی لوہنا کہلاتے ہیں۔ اسلام لے آنے والے لوہنا لوگ میمن کہلاتے شیعہ ہوجانے والے لوہنا لوگوں کو خوجہ کہا جاتا ہے، جن میں سے بہت سے لوگوں کا ہندو نام اب بھی برقرار ہے۔ اس برادری کے نمایاں ترین شخص محمد علی جناح تھے جن کی والد کا پورا نام تھا جینا بھائی ٹھکر۔

بیسویں صدی کے اوائل میں گجرات کے بہت سے ہندو لوہنا لوگ مشرقی افریقہ کی برطانوی کالونیوں میں جا بسے اور ان کی اولادیں برطانیہ میں آباد ہوگئیں۔ مشرقی افریقہ کے لوہنا لوگ صنعت میں بہت آگے تھے جن میں سے مدھوانی اور مہتا خاندان ممتاز صنعت کاروں میں شامل ہیں۔

16- خواجہ یا خوجہ (بیشتر مسلمان) لوگ زیادہ تر جنوبی ایشیا میں آباد تھے مگر کئی صدیوں کے دوران ترک وطن کے سبب اب وہ دنیا کے کئی حصوں میں پھیل گئے ہیں۔ پاکستان میں خوجہ لوگ سندھ اور خاص طور پر شہر کراچی میں کثیر تعداد میں ہیں۔ ہندوستان میں ان کی آبادیاں گجرات، مہاراشٹر، راجستھان اور شہر حیدرآباد میں پائی جاتی ہیں۔

17- *Unity and Variety in Muslim Civilization*, ed. G.E. von Grunebaum, p.8, Chicago, 1955.

18- *Mohammad Ali Jinnah - An Ambassador of Unity, His Speeches and Writings*, 1917.

19- اسلنگٹن، سرجان پوئنڈر ڈکسن پوئنڈر (1866-1936)، نیوزی لینڈ، 17 ویں گورنر۔ اس نے جنگ بوئر میں لارڈ میتھوئن کے اے ڈی سی کی خدمات انجام دیں۔ اسے ہندوستان میں پبلک سروسیز سے متعلق وائل کمیشن (14-1912) کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ ہاؤس آف لارڈس میں وہ انڈسکریٹری آف اسٹیٹ برائے نوآبادیات (15-1914) اور برائے ہند (18-1915) رہا اور 18-1917 تک انڈیا آفس کی مکمل ذمے داریاں سنبھالیں۔

20- اسلنگٹن کمیشن کے سامنے شہادت، منٹس آف ایوی ڈینس، انڈیا آفس ریکارڈس، جلد 22

21- انجمن اسلام ہندوستان کی ایک ممتاز تعلیمی وسماجی تنظیم ہے جسے بدرالدین طیب جی کی قیادت میں روشن خیال مسلمانوں کے ایک گروپ نے 1874 میں قائم کیا تھا۔ گزشتہ برسوں کے دوران اس نے تعلیم اور سماجی خدمت کے میدان میں بہت نیک نامی حاصل کی ہے۔

ایجوکیشن ٹرسٹ بنیادی طور پر سیکولرزم اور قومی اتحاد کے لیے کام کرتا ہے۔ تعلیم اور انسانی خدمات کے شعبوں میں اس کے تقریباً سو ادارے سرگرم ہیں۔ تقریباً ایک لاکھ طلبہ کی موجودگی میں انجمن اسلام متصور یونیورسٹی کا درجہ پانے کی مستحق ہوگئی ہے۔ یہ مہاراشٹر کا واحد ادارہ ہے جسے تعلیم اور سماجی خدمات کے لیے 'اسٹیٹ ایوارڈ

2000، پیش کیا گیا۔

-22 Bombay Gazette, 30 June 1903.

-23 Bombay Gazette, 30 July 1904.

-24 *Sir Pherozeshah Mehta:* A Political Biography, H.P. Mody, pp.252-3, Volume I, Bombay 1921.

-25 *Collected Works of Jinnah, pp.33-5,* Volume I, Edited by Sharifuddin Pirzada.

-26 *The Englishman,* 3 July 1908; Cited in Syed Sharifuddin Pirzada, Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah as a lawyer in Prof A.H. Rani edited quaid-i-Azam and Pakistan, p.83, Islamabad, 1979.

-27 1916 سے پہلے اور بعد کے برسوں میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس عموماً ایک میں شہر اور تقریباً ایک ہی وقت کیے جاتے تھے تاکہ مندوبین دونوں اجلاسوں میں شریک ہوسکیں۔

-28 *Mohammad Ali Jinnah and the System of Imperial Control in India 1909-1930: A Case Study in Political Leadership and Constitutional Innovation,* David Page in *M.A. Jinnah, Views and Reviews,* ed. M.R. Kazimi, Oxford University Press, Karachi, 2005.

-29 ایضاً

-30 وقف علی الاولاد: فلاحی مقاصد کے لیے وقف کی جانے والی جائداد

-31 انڈین نیشنل کانگریس کے 22ویں اجلاس کی رپورٹ

-32 وائسرائے وہ شاہی حاکم ہوتا تھا جو برطانوی فرماں روا کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان پر حکمرانی کرتا تھا۔

-33 *The collected works of Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah,* Volume I, Syed Sharifuddin Pirzada, p.1, East and West Publishing Company, Karachi, 1984, Gujarati, Bombay, 7 October 1906.

-34 ایضاً

-35 *The Memoirs of Aga Khan, His Highness the Aga Khan,* pp.124-5, Simon & Schuster, New York, 1954.

-36 *Quaid-i-Azam Jinnah-His Personality and Politics,* S.M. Burke and Salim-al-Din-Quraishi, p.96, OUP, Karachi, 1997.

-37 ایضاً

38- ایضاً

39- ایضاً

40- *Quaid-i-Azam Jinnah-His Personality and Politics,* S.M. Burke and Salim-al-Din-Quraishi, p.91, OUP, Karachi, 1997.

41- ایضاً

42- گوکھلے کا ابتدائی تعلیم سے متعلق بل (1912)۔ گوکھلے نے جو امپیریل قانون ساز کونسل میں بمبئی پریزی ڈینس کی نمائندگی کرنے والے غیر سرکاری رکن تھے، ہندوستان میں مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم سے متعلق ایک قرارداد پیش کی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ تعلیم کو لازمی صرف ان علاقوں میں قرار دیا جائے جہاں اسکول جانے والی عمر کے 33 فیصد لڑکے پہلے ہی اسکول جا رہے ہوں۔ یہ قرارداد اس بنیاد پر خارج کر دی گئی کہ اس کے لیے عوامی مطالبہ نہیں کیا جا رہا ہے اور یہ کہ اس مقصد سے کوئی اور ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا۔ گوکھلے نے بل پیش کرتے ہوئے کہا 'اس وقت یہ بات ہر جگہ تسلیم کی جاتی ہے کہ عام تعلیم کا ایک خاص حصہ لازمی کر دیا جائے جو آئندہ نسل کے لیے سماج کا فرض ہے اور تمام مہذب دنیا کی ہر ریاست اس فرض سے عہدہ برآ ہو رہی ہے۔' انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے لاکھوں بچوں کی صلاح وفلاح 'تعلیم کے انسان ساز اثرات' کی منتظر ہے۔ انہوں نے زور دیا کہ 'بحیثیت ایک قوم ہمارا پورا مستقبل اس سے جڑا ہوا ہے۔' آزادی کے بعد اس بل کے بنیادی نکات آئینی قانون کا حصہ بن گئے۔

اسپیشل میرج ایکٹ یہ ایکٹ 1877: میں منظور کیا گیا۔

43- Report of the 26th Indian National Congress; cited in *Jinnah Years 1892-1920,* Riaz Ahmad, p.92-3.

44- *The Indian Year Book 1914,* ed. Stanley Reed, p.476, Bombay 1915.

45- Meston Papers, IOL, MSS.Eur.F.136/6.

46- The *Comrade,* 13 September 1913.

47- *Bombay Chronicle,* 8 September 1913.

48- *Bombay Chronicle,* 22 September 1913.

49- *Mohammad Ali Jinnah-An Ambassador of Unity, His Speeches and Writings 1912-1917,* with a Biographical Appreciation by Sarojini Naidu, p.11.

50- علی برادران، محمد علی اور شوکت علی، ہندوستان کے ممتاز ترین اسلامی رہنما تھے۔ محمد علی، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے طالب علم رہے۔ 1907 میں انہوں نے کالج کے ٹرسٹیوں کے کام کاج کو جمہوری بنانے کے لیے

اصلاحات کی ایک اسکیم وضع کی اور کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کیے جانے کی تحریک میں حصہ لیا (1910)۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان کی حیثیت سے وہ بلقان میں یورپی طاقتوں کی توسیع پسندی پر مضطرب تھے۔ یونیورسٹی کے معاملے میں ویٹو کے بعد محمد علی نے ترکی کے بارے میں سیاسی سرگرمی شروع کی اور علماء کے ساتھ اشتراک قائم کیا۔ انہوں نے راج کی مخالفت اور کانگریس کے ساتھ تعاون کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

51- *Quaid-i-Azam Jinnah-His Personality and Politics,* S.M. Burke and Salim-ul-Din-Quraishi, p.95, OUP, Karachi, 1997.

52- *Jinnah-the Formative Years: 1892-1920,* Riaz Ahmad pp.120-1, National Institute of Cultural and Historical Research, Islamabad, 1988.

53- *Quaid-i-Azam Jinnah: His Personality and Politics,* S.M. Burke and Salim-ul-din Quraishi, pp.123-26, Karachi, Oxford University Press, 1997.

54- لیگ اور کانگریس دونوں نے ستمبر 1920 کے پہلے ہفتے کے دوران اپنے خصوصی اجلاس کلکتہ میں کیے۔

55- ایضاً ص 30-170

56- ایضاً

57- *All Through the Gandhian Era,* A.S. Iyengar, pp.29-30, Hind Kitab Limited, 1950.

58- قاسم مٹھا بمبئی کے ایک مسلم رہنما اور بمبئی کی سیاست میں جناح کے حریف تھے۔

59- لکھنؤ معاہدہ (1916): جب آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آئی تو وہ ایک اعتدال پسند اور چھوٹی سی تنظیم تھی جس کا مقصد تاج برطانیہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنا تھا۔ تاہم برطانوی حکومت کے، تقسیم بنگال ختم کرنے کے فیصلے، کے سبب مسلم قیادت نے اپنا موقف تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1913 میں مسلم رہنماؤں کا ایک نیا حلقہ مسلم لیگ میں شامل ہوا جس کا مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان خلیج کو پاٹنا تھا۔ ان میں نمایاں ترین نام محمد علی جناح کا تھا جو پہلے ہی سے انڈین نیشنل کانگریس کے رکن تھے۔ مسلم لیگ نے اب اپنے اہم مقصد میں تبدیلی کی اور برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے کانگریس کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کیا۔ لارڈ چیمس فورڈ نے پہلی عالمی جنگ کے بعد اصلاحات کے لیے ہندوستانی سیاست کاروں سے تجاویز طلب کیں جس نے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا۔

جناح کی سخت کوششوں کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگریس نے دسمبر 1915 میں اپنا سالانہ اجلاس بمبئی میں کیا۔ دونوں جماعتوں کے ممتاز رہنما دونوں جماعتوں کی تاریخ میں پہلی بار ایک جگہ جمع ہوئے۔ دونوں پلیٹ فارموں سے کی گئی تقریروں کا لہجہ اور موضوع یکساں تھا۔ اس کے چند ماہ کے اندر، امپیریل قانون ساز کونسل کے 19

منتخب مسلم اور ہندو اراکین نے اکتوبر 1916 میں اصلاحات کے سلسلے میں وائسرائے کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔ ان تجاویز کو انگریزوں نے قابل توجہ نہیں سمجھا مگر کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے نومبر 1916 میں کلکتہ میں منعقد، میٹنگ کے دوران ان تجاویز پر غور کیا اور انہیں بعض ترامیم کے ساتھ منظوری دے دی۔ اس میٹنگ میں قانون ساز اداروں کی ہیئت اور دونوں فرقوں کی نمائندگی کی تعداد کے بارے میں ایک معاہدہ ہوا۔ 29 اور 30 دسمبر 1916 کو لکھنؤ میں بالترتیب کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاسوں کے دوران اس معاہدے کی توثیق کی گئی۔ سروجنی نائڈو نے جناح کو، جو اس لکھنؤ معاہدے کے خاص معمار تھے، 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کا لقب دیا۔

اس معاہدے کے اہم نکات تھے:

1- ہندوستان میں خود اپنی حکومت ہوگی۔

2- مسلمانوں کو مرکزی حکومت میں ایک تہائی نمائندگی دی جانی چاہیے۔

3- تمام فرقوں کے لیے علاحدہ حلقہ انتخاب ہونے چاہئیں جب تک کوئی فرقہ مشترکہ حلقہ انتخاب کا مطالبہ نہ کرے

4- 'ویٹج' (خصوصی اہمیت) کا نظام اختیار کیا جانا چاہیے۔

5- مرکزی قانون ساز کونسل کے اراکین کی تعداد بڑھا کر 150 کی جانی چاہیے۔

6- صوبائی سطح پر، قانون ساز کونسلوں کے پانچ میں سے چار حصہ اراکین منتخب اور پانچ میں سے ایک حصہ اراکین نامزد ہونے چاہئیں۔

7- بڑے صوبوں کی قانون ساز کونسلوں میں اراکین کی تعداد 125 سے کم نہیں ہونی چاہیے اور چھوٹے صوبوں کی کونسلوں میں 50 سے 75 تک ہونی چاہیے۔

8- نامزد اراکین کو چھوڑ کر باقی تمام اراکین بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر براہ راست منتخب کیے جائیں۔

9- کسی فرقے سے متعلق کوئی بل منظور نہیں کیا جانا چاہیے اگر قانون ساز کونسل میں اس فرقے کے تین چوتھائی اراکین اس کے خلاف ہوں۔

10- قانون ساز کونسل کی مدت پانچ سال ہونی چاہیے۔

11- قانون ساز کونسل کے اراکین کو اپنے صدر کا انتخاب خود کرنا چاہیے۔

12- امپیریل قانون ساز کونسل کے آدھے اراکین ہندوستانی ہونے چاہئیں۔

13- انڈین کونسل کو کالعدم کر دیا جائے

14- سکریٹری آف اسٹیٹ برائے امور ہند کی تنخواہ برطانوی حکومت کی طرف سے ادا کی جانی چاہیے، ہندوستان فنڈ سے نہیں۔

15- دو انڈر سکریٹریوں میں سے ایک ہندوستانی ہونا چاہیے۔

16- منتظمہ کو عدلیہ سے علاحدہ کیا جانا چاہیے۔

اگر چہ یہ ہندو۔مسلم اتحاد آٹھ برس سے زیادہ نہیں چل سکا اور خلافت تحریک کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونے کے سبب ختم ہوگیا مگر پھر بھی یہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کانگریس نے مسلم لیگ کو خطے کے مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ کانگریس نے علاحدہ حلقہ انتخاب کو منظور کر کے دراصل مسلمانوں کے ایک علاحدہ قوم ہونے کو تسلیم کیا۔ اس طرح یہ دوقومی نظریے کو بھی قبول کرنا تھا۔

60- اس ایس مونٹیگو 13-1917 تک سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند جب کہ لارڈ چیمس فورڈ21-1916 تک وائسرائے رہے۔ ان کے زمانے میں ہی 1919 کی اصلاحات جاری کی گئیں۔ مونٹیگو اپنے عہدے کی مدت کے دوران ہندستان آئے اور ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ اس وقت کے سیاسی حالات پر بات چیت کی۔ وہ جناح سے بھی ملے جن کے بارے میں انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔ جناح نے بھی اپنے لندن قیام کے دوران مونٹیگو کے ساتھ ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر بات چیت کی تھی۔

61- Indian Legislative Council Debates, 1918, 1919, p.133, 7 September 1918.

62- M.K. Gandhi at the Gurjar Sabha reception, Bombay, 14 January 1915, *Collected Works of Mahatma Gandhi,* XIII, NO.8, p.9 Publications Division, Ministry of Information, Delhi, 1964.

63- *Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah, The Formative Years, 1892-1920,* Riaz Ahmad, p.122, National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad, 1988.

64- *Quaid-e-Azam Jinnah: The Formative Years,* Riaz Ahmad, p.120-2, National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad, 1988.

65- ان تینوں میں گوکھلے سب سے کم عمر تھے۔ ہندوستان کے 'گرینڈ اولڈ مین' دادا بھائی نوروجی نے اپنی زندگی کے بیشتر دن، انگلینڈ میں گزارے اور ہندوستان میں خودحکومتی کے بارے میں رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ فیروز شاہ مہتا ایک قوم پرست تھے جو1890 میں کانگریس کے صدر رہے۔ نوروجی اور مہتا، گوکھلے کے لئے لائق تقلید ہیرو تھے۔ یہ تینوں کسی نہ کسی وقت جناح سے بھی وابستہ رہے۔ جناح نے اپنی سیاسی زندگی نوروجی کے پرائیویٹ سکریٹری کے طور پر شروع کی تھی۔ مہتا نے بھی ان کی قانون اور سیاسی زندگی میں کوئی کم مدد نہیں کی۔ جناح کو ان کی سیاسی زندگی کے اوائل میں مسلم گوکھلے کہا جاتا تھا۔

66- اگست 1917 کو ایم کے گاندھی لندن گئے جہاں انہوں نے حکومت برطانیہ کی خارجہ پالیسی کو سراہا، ہندستانیوں سے 'شاہانہ انداز سے سوچنے' کی گزارش کی اور ایک مختصر عرصے تک ہندوستانی رجمنٹ کے لئے بھرتی ایجنٹ کی خدمات انجام دیں۔

67- *Bombay Chronicle,* 1 January 1916, pp.147-8, *Jinnah the Formative Years,* Riaz Ahmad, National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad, 1988.

68- گوکھلے اسکیم: کہا جاتا ہے کہ گوپال کرشن گوکھلے (1915-1866) نے اپنی موت سے دو دن پہلے پینسل سے ایک تحریک لکھی تھی جس کی تین نقلیں بنائی گئیں جو لارڈ ویلنگڈن، فیروز شاہ مہتا اور آغا خاں کو ارسال کی گئیں۔ یہ تحریر 1917 میں بعد از مرگ سامنے آئی جب اسے آغا خاں نے لندن میں اور شری نواس شاستری نے ہندوستان میں مونٹیگو اعلامیے کے وقت شائع کیا۔ اسے 'گوکھلے کی سیاسی وصیت اور منشور' بھی کہا جاتا ہے جس میں برطانوی حکومت سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ انتظامی اصلاحات سے متعلق سفارشات کا رضا کارانہ اور فوری طور پر اعلان کرے۔ اگر برطانوی حکومت ہندوستان میں صوبائی خودمختاری دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا تو گورنروں کی ایگزیکیٹیو کونسلوں میں ہندوستانیوں کا تقرر کیا جائے گا۔ اس تحریر کی بعض تجاویز تھیں:

☆ قانون ساز کونسل کے اراکین کی تعداد 75 سے 100 کے درمیان ہو جن میں پانچ میں سے چار حصہ اراکین منتخب ہوں۔

☆ اراکین مختلف حلقوں کے ذریعے منتخب کیے جائیں اور بعض فرقوں کے لئے نشستیں مخصوص کی جائیں۔

☆ مسلمانوں کے لئے علاحدہ حلقہ انتخاب ہو۔

☆ اراکین کو نظم و نسق کے بارے میں اظہار رائے کا اختیار حاصل ہو۔ بجٹ، قانون ساز اسمبلی کی منظوری کے بغیر منظور نہ کیا جائے۔ تاہم گورنر کو ویٹو کا اختیار حاصل رہے۔

'گوکھلے تحریر' کی اہمیت اس میں ہے کہ انہوں نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل پیش کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے علاحدہ حلقہ انتخاب کو قبول کیا جو بعد میں مورلے۔ منٹو اصلاحات کے تحت جاری کئے گئے۔

69- *Quaid-i-Azam Jinnah: the Formative Years,* Riaz Ahmad, p.148, National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad, 1988.

70- سر جارج لائڈ کا مکتوب مونٹیگو کے نام، 13 اگست 1920، مونٹیگو پیپرز۔

71- ولایت: غیر ملک کے لئے استعمال کیا جانے والا اردو لفظ۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں اس سے 'برطانیہ عظمیٰ' مراد لیا جاتا تھا مگر اب ظاہر ہے کہ اس کے مفاہم وسیع تر ہو گئے ہیں۔

72- اس زمانے کے اعلا انڈین سول سروینٹ سر جیمس میسٹن۔

73- مونٹگو کا مکتوب چیمس فورڈ کے نام، 11 جنوری 1917، جلد 18، نمبر 14، ص 19-16 چیمس فورڈ پیپرز

74- احمد آباد کی ہڑتال ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ گاندھی نے کھیڈا ستیا گرہ شروع کر دی۔ ضلع کھیڈا میں قحط سالی جیسے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ فصل نہ ہونے کے پیش نظر کھیڈا کے کاشت کار چاہتے تھے کہ اس سال کا لگان نہ لیا جائے۔ گاندھی نے موہن لال پنڈیا اور شنکر لال پاریکھ جیسے لوگوں کے ساتھ اس مطالبے کی منظوری کے لئے ستیا گرہ شروع کیا جس سے گجرات کے کاشت کاروں میں بیداری پیدا ہوئی۔ اس ستیا گرہ کے دوران ہی گاندھی نے ولبھ بھائی پٹیل کو دریافت کیا۔ اس کے بعد ستیا گرہ کے طریقے نے گجرات میں جڑیں جما لیں۔

75- لارڈ ویلنگڈن کا مکتوب ایڈون مونٹگو کے نام، بمبئی، 30 اپریل 1918، ص 51-50، مونٹگو پیپرز، ایم ایس ایس یورپ ڈی 523/18

76- لائڈ کا مکتوب مونٹگو کے نام، 12 جون 1919 مونٹگو پیپرز، ایم ایس ایس یورپ ڈی 523/25

77- جناح کا مکتوب چیمس فورڈ کے نام، 28 مارچ 1919۔

78- جناح کا مکتوب چیمس فورڈ کے نام، 28 مارچ 1919

79- کیا جناح، غالباً بلاشعوری طور پر، کوئی ایسا پلیٹ فارم اور کردار تلاش کر رہے تھے جو کانگرس کے حریفانہ تعصبات سے بہت دور ہو، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ برطانیہ میں انہیں مسلمان ہونے سے زیادہ ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر تسلیم کیا جائے گا؟ مزید یہ کہ کیا وہ اس طرح ہندو۔مسلم اتحاد سے متعلق اپنے دائرۂ عمل کو برقرار رکھنا چاہتے تھے؟ مگر اب ان سوالوں کا جواب یقین کے ساتھ کون دے سکتا ہے۔

80- سر ولیم ویڈر برن، آئی سی ایس، اپنی سبک دوشی کے وقت حکومت بمبئی کا چیف سکریٹری تھا۔ 1898 میں اس نے بمبئی میں ہونے والے کانگرس کے چوتھے اجلاس کی صدارت کی۔ اس کے بعد 1893 میں ایک لبرل رکن کے طور پر برطانوی پارلیمنٹ میں داخل ہوا۔ ایک لبرل کی طرح ویڈر برن خود حکومتی کے اصول اور برطانوی دولت مشترکہ میں ہندوستان کی شرکت پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا ایک اہم کارنامہ ہندوستان میں اصلاحات کی تحریک سے اس کی وابستگی تھا جس کے لئے وہ حیات کوششیں کرتا رہا۔ اس لحاظ سے مونٹگو اصلاحات کو بھی اس کی زندگی کا ایک سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔
گوکھلے 1889 میں کانگرس کے رکن بنے اور 1895 میں تلک کے ساتھ اس کے جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے۔ 1905 میں انہوں نے 'سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی' قائم کی جس کا مقصد لوگوں کو ملک کی خدمت کے لئے تیار کرنا اور آئینی طریقوں سے ہندوستان کے مفادات کو فروغ دینا تھا۔
گوکھلے صف اول کے مصلح تھے جنہوں نے ذات پات کے نظام اور چھوا چھوت کی مذمت کی اور عورتوں کی

آزادی اور تعلیم کے لئے کام کیا۔ وہ سیاسی اصلاحات کی غرض سے حکومت کے ساتھ تعاون کرنے والے ہندوستانیوں کے لئے اور زیادہ خودمختاری چاہتے تھے۔

باب 3

1 انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل کے بعد یہ یقینی احساس پایا جاتا تھا کہ مسلمان اس میں شامل نہیں ہوں گے۔ برطانوی پالیسیوں کے نتیجے میں آنے والی تبدیلیوں نے مسلمانوں کو اپنے فرقے کے بارے میں زیادہ باشعور اور حساس کر دیا تھا۔ 1880 کی دہائی کے اواخر اور 1890 کی دہائی کے اوائل کے دوران، خود بدرالدین طیب جی جیسے شخص نے، جو کانگرس کے صدر رہ چکے تھے، تجویز پیش کی تھی کہ کانگرس کی وجہ سے پیدا ہونے والے فرقہ وارانہ جذبات کے پیش نظر اسے ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد بنگال کی تقسیم کے خلاف تحریک اور اس کی ہندو علامتوں نے مسلمانوں کے فرقہ جاتی شعور کو مضبوط تر کیا۔ اس تحریک کو بڑی حد تک ایک ہندو تحریک سمجھا گیا۔ لکھنؤ معاہدے کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے درمیان پین اسلامی جذبات ابھرے اور اس سے بھی ان کے فرقہ جاتی شعور کو تقویت ملی۔

-2 پرتگالیوں نے بار بار کیرل کی مالوں کی تجارت پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوششیں کیں جو ایک طویل عرصے سے مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ لگاتار ہونے والی ان مداخلتوں کو ہی موپلاؤوں کی طرف سے تشدد کا ایک سلسلہ جاری ہونے کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے جس سے اعلا ذات کے برسر اقتدار ہندوؤں کے ساتھ ان کے تعلقات بگڑتے چلے گئے۔ انیسویں صدی آتے آتے یورپی درانداری شروع ہونے کے بعد موپلاؤوں، ملایا راجاؤں اور نایر طبقۂ خواص کے درمیان علاقائی اور اقتصادی مفادات کے سبب مقابلہ آرائی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے خونیں تصادم ہونے لگے۔

انگریزوں کی فتح سے طاقت کا توازن موپلا مزاعوں کے بجائے ہندوز میں داروں کے حق میں ہو گیا۔ موپلا لوگ ہندوؤں کے اقتصادی تسلط کے خلاف لگاتار حملے کرنے لگے جو مذہبی جوش کے ساتھ شہادت حاصل کرنے کی غرض سے کئے جاتے تھے۔ 22-1921 کی بغاوت ان حملوں کا نقطۂ عروج تھی۔

-3 *The Reconstruction of India,* Edwards Thomson, p.141, London, 1930.

-4 خلافت واقعی کوئی ہندوستانی معاملہ نہیں تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے کسی ہندوستانی مقصد کے مقابلے اسے کہیں زیادہ حمایت دی۔ گاندھی نے اسے ایک فطری امر کی طرح قبول کیا۔ 12 اکتوبر 1921 کو

شائع ہونے والے ایک بیان میں انہوں نے کہا، 'بہادر (علی) برادران اپنے ملک سے شدید محبت کرتے ہیں مگر وہ پہلے مسلمان ہیں اور بعد میں کچھ اور، ہر مذہبی ذہن رکھنے والے کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔' لہٰذا خلافت تحریک میں ہندوستانی مسلمانوں کی اس قدر شدید جذباتی شرکت ان کے اندر ہندوستانی قوم پرستی کے جذبات پیدا نہیں کر سکی جس سے ہندوستان کے اتحاد کو تقویت ملتی۔ اس کے بجائے اس نے مسلم قوم پرستی کے جذبوں کو ہوا دی جو بڑھتے بڑھتے ایک دن پاکستان کے مطالبے کا محرک بن گئے۔

-5 Bande Mataram 9 September, 13 October 1921. Cited in *Hindu-Muslim Relations in British India,* G.R. Thursby. Leiden E.J. Brill, p.133, 1975.

-6 گروکا باغ امرتسر سے بیس کلومیٹر فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں کئی گرودواروں کو پرامن مزاحمت کے لئے آزاد کرانے کے بعد سکھوں کی، تکلیفیں برداشت کرنے اور مزاحمت کی صلاحیتوں کی مزید آزمائش سے گزرنا پڑا۔ سندرداس نام کے ایک مہنت نے باہمی مذاکرات کے بعد اپنے گرودوارے کو شرو□ کمیٹی کے حوالے کر دیا، سکھ مذہب اختیار کیا اور اپنی کئی داشتاؤں سے قطع تعلق کر لیا، ایک کے سوا جس کے ساتھ ان نے باضابطہ شادی کر لی۔ مگر بعد میں وہ معاہدے کے ایک حصے سے مکر گیا اور کہنے لگا کہ اگرچہ اس نے گرودوارہ شر□ کمیٹی کے حوالے کر دیا مگر اس سے ملحق ایک قطعہ اراضی جسے گروکا باغ کہتے تھے اب بھی اس کی ملکیت ہے۔ اس نے اس زمین پر لنگر کی غرض سے سکھوں کے پیڑ کاٹنے پر اعتراض کیا۔ پولس نے، جو اس کی مدد پر تلی بیٹھی تھی، 9 اگست 1922 کو، پانچ سکھوں کو غیر قانونی مداخلت کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاریاں سندرداس کی شکایت پر نہیں بلکہ پولس کو موصولہ ایک خفیہ رپورٹ کی بناء پر کی گئی تھیں۔ اگلے دن گرفتار سکھوں پر عجلت میں مقدمہ چلایا گیا اور چھے ماہ کی قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

حکومت کی اس کارروائی کے باوجود سکھوں نے لنگر کی ضرورت پوری کرنے کے لئے گروکا باغ میں موجود پیڑ کاٹنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ گرفتاری اور سزا کو بے اثر دیکھ کر، پولس نے اصلاح پسندوں کو دہشت زدہ کرنے کا ایک نیا طریقہ آزمایا۔ گروکا باغ میں لکڑی کاٹنے والوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ اتنا پیٹا گیا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر انہیں ان کے بالوں سے گھسیٹا گیا اور حقارت کے ساتھ اس وقت چھوڑا گیا جب پولس کو لگا کہ انہیں کافی سبق مل گیا ہے۔ مگر سکھوں نے یہ سب کچھ فقیرانہ صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور روز بہ روز زیادہ سے زیادہ لوگ اپنے آپ کو پٹائی کے لئے پیش کرنے لگے۔ 31 اگست سے ایسے لوگوں کی تعداد 100 تک پہنچی۔ ہر روز 100 رضا کاروں کا ایک جتھا اکال تخت سے قسمت کے لکھے کو چپ چاپ برداشت کرنے کا عہد کرنے روانہ ہوتا، پولس انہیں راستے میں روکتی اور انہیں پیتل جڑی بھاری لاٹھیوں اور رائفل بٹوں سے زدوکوب کرتی۔ یہ سلسلہ جاری رہتا جب تک کہ جتھے کا آخری شخص بھی زمین پر دراز نہ ہو جاتا۔ سکھوں نے ضبط

نفس اورعزم وارادے کا عجیب وغریب مظاہرہ کیا اور یہ تمام جسمانی اذیت مکمل لاتعلقی کے جذبے کے ساتھ برداشت کی۔ ایک شخص بھی اس مار پیٹ سے نہ ذرا پیچھے ہٹا اور نہ ہاتھ اٹھایا۔

7- Quoted in H.N. Mitra ed. *Indian Annual Register 1923*, p.943-4, 1923, Calcutta.

8- یہ ہندوؤں کے ہنومان اکھاڑوں کا مسلم متبادل تھے جہاں مسلم نوجوانوں کو جسمانی دوستی کی تربیت دی جاتی تھی۔ تنظیمی مراکز کے لحاظ سے ان کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ جاتی اتحاد پیدا کرنا تھا۔

9- 'سنگھٹن' کا مقصد فرقہ جاتی وسائل کو یکجا کر کے طاقت حاصل کرنا تھا۔ یہ لفظ ان ہندوؤں کے لئے ایک نعرۂ اتحاد تھا جو محسوس کرتے تھے کہ وہ تنظیمی سرگرمی اور شدت پسندی کے معاملے میں مسلمانوں سے پیچھے ہیں۔

10- محرم اسلامی کلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔ یہ مقدس سمجھے جانے والے چار مہینوں میں شامل ہے جس کی دسویں تاریخ یعنی یوم عاشور کو روزہ بھی رکھا جاتا ہے۔

11- عیدالاضحیٰ یا عرف عام میں بقرعید اسلامی ماہ ذی الحج کی دسویں تاریخ کو منائی جاتی ہے۔ یہ حج کے مناسک کا ایک حصہ ہے۔ اس دن جانوروں کی قربانی دی ہے۔

12- *The History and Culture of the Indian People Struggle for Freedom*, R.C. Majumdar, p.43, Bhartiya Vidya Bhawan, Bombay.

13- رسول اللہ کی وفات (632) کے بعد مسلمانوں کے دینی و دنیوی سربراہ کو خلیفہ کہا گیا۔ پہلے خلیفہ ابوبکر ہوئے۔ شروع کے چار خلفاء ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کو 'خلفائے راشدین' کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ منصب موروثی ہوگیا۔ 1924 میں قوم پرستوں نے خلافت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ خلافت کے حق سے متعلق اختلافات سنی اور شیعہ اسلام کی تقسیم کا بنیادی سبب ہیں۔ خلافت اسلامی تاریخ کے دوران مسلمانوں کی طاقت اور اتحاد کی اہم علامت رہی ہے۔ اس کے خاتمے کے بعد کئی پین اسلامی عناصر نے اسے بحال کرنے کی کوششیں کیں۔

14- سیوریز کا معاہدہ پہلی عالمی جنگ کے بعد 10 اگست 1920 کو اینٹینٹ اور ایسوسی ایٹڈ طاقتوں اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان انجام پایا جس پر پیرس کے نزدیک سیوریس کے مقام پر دستخط کیے گئے۔ ترکی کی جنگ آزادی نے سابق اتحادیوں کو اس معاہدے کی توثیق سے پہلے ہی دوبارہ مذاکرات کرنے پڑے اور ایک نئے معاہدے، معاہدہ لاؤزاں پر 1923 میں دستخط کیے گئے اور اس کی توثیق بھی کی گئی۔

15- *Indian Constitutional Documents*, Volume 1, p.7, *Pilgrimage to Freedom*, K.M. Munshi, Bhartiya Vidya Bhawan.

16- ہوم رول تحریک اور لیگ۔ ہوم رول تحریک و لیگ کی شروعات لفظ سوراج کو برطانوی راج کے حکام کی طرف سے 'باغیانہ اور خطرناک' کا مفہوم دے دیے جانے کے خلاف ایک محتاط ردعمل کے طور پر ہوئی۔ اس لیے ناگریز

طور پر سوراج کا ذرا بھی نام لینے والی تمام سرگرمیوں کو پوری قوت سے دبا دیا گیا۔ اس حوصلہ شکنی کے خلاف ردعمل کے طور پر بال گنگا دھر تلک اور اینی بیسنٹ نے قومی تحریک میں سوراج کے بجائے 'ہوم رول' کے عنوان سے قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ دسمبر 1915 میں، تلک نے اپنے رفقاء سے بات چیت کی اور 28 اپریل 1916 کو 'انڈین ہوم رول لیگ' قائم کی گئی جس کا مرکز پونا (اب پنے) کو بنایا گیا۔ اس کا بنیادی نصب العین وہی رہا یعنی تمام آئینی طریقے اختیار کرتے ہوئے برطانوی سلطنت نے اندر رہ کہ 'ہوم رول' یا خود حکومتی کا حصول اور کے لیے ملک میں رائے عامہ کو باخبر اور منظم کرنا' اسی طرح، اینی بیسنٹ نے 15 ستمبر 1916 کو 'ہوم رول لیگ' بھی قائم کی جس کا مرکز مدراس (اب چینئی) کے نزدیک اڈیار کو بنایا گیا۔ 1916 میں اس خیال کو مزید فروغ دینے کے لیے، تلک نے سارے ملک کا دورہ کیا اور 'ہوم رول' کے پرچم تلے متحد ہونے کی اپیل کی۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں زور دے کر کہا کہ 'ہوم رول' ہندوستان کے تمام سیاسی مسائل کا حل ہے، اور یہ کہ 'آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے'۔ اور اسی لیے ہندوستان کے باہر کے ایک چھوٹے سے ملک کے مٹھی بھر لوگوں کو اس ملک پر من مانے طریقے سے اور بظاہر لامتناہی عرصے تک حکومت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اینی بیسنٹ نے بھی ملک کا دورہ کیا اور اس مقصد کے لیے زبردست جوش وخروش پیدا کیا، کامن ویلتھ اور نیو انڈیا میں شائع ہونے والے ان کے مضامین نے قارئین کی ایک بڑی تعداد کی توجہ حاصل کی جس پر سی۔ وائی۔ چنتا [illegible] نے یہ تبصرہ کیا، 'اینی بیسنٹ نے اپنی تقریر اور تحریر سے ملک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اس طرح جیسا کوئی اور شاید ہی کر سکے......' اینی بیسنٹ نے خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی عورتوں پر توجہ دی جنہوں نے 'نسوانی فطرت کی بے اندازہ بہادری، قوت برداشت اور بے غرض ایثار' کا مظاہرہ کیا'۔

ہوم رول تحریک کے پیروؤں نے آئینی طریقے اختیار کیے۔ وہ تشدد اور 'انقلابی احتجاج' کے خلاف تھے۔ وہ برطانوی حکومت کو بر[illegible]ن کرنا نہیں چاہتے تھے جو پہلی عالمی جنگ میں پوری طرح الجھی ہوئی تھی۔ ہوم رول لیگ والے حکومت سے ساتھ تعاون کے لیے تیار تھے تاکہ وہ جنگ کے چیلنجوں کا سامنے بہتر انداز سے کر سکے۔

جون 1917 میں، اینی بیسنٹ کو ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے قید کر لیا گیا۔ اس واقعے نے جناح کو بامبے ہوم رول لیگ میں شامل ہونے پر آمادہ کیا، محض ایک رکن نہیں بلکہ اس کے صدر کی حیثیت سے..... عجیب بات ہے کہ فرقہ وارانہ خوش گواری (لکھنؤ معاہدہ) کے ان دنوں میں بھی، ہندوستان کے بیشتر سیاسی رہنما ایسے سماجی رویے اور طرز عمل اختیار کر رہے تھے جن سے مسلمانوں میں یہ شکوک وشبہات اور سوال سر ابھارنے لگے کہ ہندو قیادت کے اصل ارادے آخر ہیں کیا؟ گاندھی اور تلک بھی ان شکوک وشبہات سے محفوظ نہیں رہ سکے، کہ وہ بھی لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے مذہبی جذبات کو مخاطب کرنے کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کے بارے میں

نہیں سوچ سکے۔ اس کی ایک مثال گئوکشی کے مسئلے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عرصے سے جاری تنازعے پر گاندھی کی یہ رائے پیش ہے جو کلکتہ کے اخبار اسٹیٹس مین میں شائع ہوئی: 'غلط یا صحیح، گائے کی پوجا ہندو فطرت میں جاگزیں ہے...... ہمیں اس سچائی کا سامنا کرنا چاہیے۔ یہ فرض نہیں کیا جانا چاہیے کہ ہندو اہل یورپ کے لیے ہونے والی گئوکشی کے بارے میں کچھ محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ آج انگریز حکومت کے پیدا کردہ خوف کے تلے دبا پڑا ہے۔ مگر ہندوستان کے پوری طول وعرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جو اس ملک کو ایک دن گئوکشی سے پاک کرانے کی آرزو نہ کرتا ہو...... مگر ہندوستان کے بنیادی مزاج کے خلاف جیسا کہ میں اسے سمجھتا ہوں، وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کو تلوار کی نوک پر بھی گئوکشی سے باز رکھنے کے لیے مجبور کرنے سے نہیں چوکے گا'۔ یہ اس زبان اور طریقے کے بالکل برعکس ہے جو ان دنوں جناح استعمال کررہے تھے۔ جناح نے 'مذہب' کو سیاست سے بے دخل کیا۔ دوسری طرف گاندھی اپنے سیاسی معتقدات، محاورے، بیانات اور وابستگیوں میں پوری ڈھٹائی کے ساتھ ہندو تھے۔

جناح اگرچہ تلک کے طرز سیاست سے کبھی بھی متفق نہیں رہے مگر پھر بھی انہوں نے ہمیشہ بلا تزلزل ان کا دفاع کیا، پہلے 1918 میں عدالت میں اور پھر 1916 کے دوران مرکزی قانون ساز اسمبلی میں، جب تلک منڈلے جیل میں سال کی قید کاٹ کر واپس آئے تھے۔ جناح نے تلک اور گوکھلے کے درمیان مصالحت کرانے کی بھی شدید کوششیں کیں۔ تلک کے ساتھ جناح کے بڑھتے ہوئے تعلقات کی وجہ سے گاندھی جناح سے دور ہونے لگے۔ آئندہ سطور میں انہی تین عظیم ہندوستانی کرداروں سے متعلق واقعات مختصراً بیان کیے جائیں گے۔

1917 کا سال 'لیگ' کی روداد میں ایک 'پُراز واقعات سال تھا۔ تلک اور اینی بیسنٹ دونوں کی ہوم رول لیگ باہم اشتراک کے ساتھ کام کررہی تھیں۔ دونوں کے درمیان اپنی اپنی سرگرمی کے دائروں کے بارے میں بھی خاموش اتفاق پایا جاتا تھا۔ تلک کی سرگرمیاں بمبئی پریزیڈینسی اور وسطی صوبوں تک محدود تھیں جب کہ باقی سارا ہندوستان اینی بیسنٹ کا میدان عمل تھا۔ چنانچہ ہوم رول کے لیے عوامی مطالبے میں بہت شدت آگئی۔

مارچ 1918 میں، ہوم رول لیگ نے برطانیہ کے عوام کو ہندوستان کی 'اصل' صورت حال سے واقف کرانے کے لیے تلک کی قیادت میں ایک وفد انگلینڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم اس سے پہلے کہ یہ وفد انگلینڈ پہنچتا، وفد کے اراکین کے پاسپورٹ منسوخ کردیے گئے اور ان لوگوں کو مجبوراً کیپ ٹاؤن، جنوبی افریقہ میں اترنا پڑا۔ 8 اپریل 1918 کو بمبئی میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا جس کی صدارت جناح نے کی۔

24 اپریل 1918 کو، جناح اینی بیسنٹ اور تلک نے جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرے کے بارے میں ایک مشترکہ منشور پر دستخط کیے۔ پھر دہلی میں 'وار کانفرنس' ہوئی، جس میں لارڈ چیمس فورڈ نے بیشتر ممتاز ہندوستانی رہنماؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے، گاندھی اور بہت سے راجاؤں، زمین داروں و تاجروں کو شرکت کی دعوت

دی۔ گاندھی کو یہ دعوت نامہ اس وقت ملا جب وہ کھیڑا، گجرات میں لگان کی ادائگی کے خلاف مہم میں مصروف تھے، مگر پھر بھی انہوں نے یہ دعوت قبول کر لی اور کانفرنس میں شریک ہوئے، حالاں کہ تلک، اینی بیسنٹ اور علی برادران کو اس میں نہیں بلایا گیا تھا۔ گاندھی نے 30 اپریل 1918 کو 'وار کانفرنس' سے خطاب کیا، اور جنگ کی کوششوں میں انگریزوں کو حمایت پیش کی۔ جناح نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی لیکن جب انہوں نے اجلاس کے دوران آئینی اصلاحات سے متعلق ایک قرارداد پیش کرنے کی کوشش کی تو صدر نے کچھ کہے سنے بغیر انہیں روک دیا، اور گاندھی نے اس معاملے میں جناح کی مدد پر آنے کے لیے ذرا بھی جنبش نہ کی۔

لندن اجلاس کے بعد، 10 جون 1918 کو، بمبئی میں ایک صوبائی 'وار کانفرنس' کی گئی جس میں تلک اور گاندھی دونوں شریک ہوئے اور لارڈ ویلنگڈن نے صدارت کی۔ اس کانفرنس نے جنگ کی کوششوں کے بارے میں گاندھی اور تلک کے اختلافات کو کم کرنے کے بجائے اور نمایا کر دیا۔ تلک اس کانفرنس میں شرکت اور اس کی حمایت کرنا نہیں چاہتے تھے جب تک کہ انگریز حکومت ہندوستان کی سیاسی آزادی کے بارے میں کوئی یقین دہانی نہ کرائے۔ لہٰذا جب وہ کانفرنس میں بولنے کھڑے ہوئے تو لارڈ ویلنگڈن نے بار بار انہیں ٹوکا، اور جب ان کی کوششیں پوری طرح ناکام ہو گئیں تو وہ کانفرنس سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ گاندھی نے ایسا نہیں کیا، اور خاموش تماشائی بنے رہنے کو ترجیح دی۔ جناح بھی قرارداد میں بعض ترمیمات پیش کرنے کو اٹھے مگر ہمیشہ کی طرح انہیں اس سے روک دیا گیا جس پر آخر کار انہوں نے کہا: 'میں اس پوری قرارداد کی حمایت نہیں کر سکتا...... میں ایک ترمیم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہاں کوئی ترمیم پیش کرنے نہیں دی جائے گی۔ یہ کیا طریقہ ہے جس کے بارے میں کبھی سنا نہیں گیا...... اور میں اسے نہیں مانوں گا۔' اندولال یاگ نک نے، جو مہادیو ڈیسائی کے پیش رو تھے، اپنی کتاب گاندھی ایز آئی نوھم (گاندھی میری نظر میں) میں تلک اور گاندھی کے درمیاں اختلافات کا واضح اشارہ دیا ہے: 'جناب تلک کے طریقے انہیں ایک بالکل دوسری راہ پر کھینچ لے گئے۔ جب انہوں نے سیاسی اختیارات، حکومت سے لوگوں کو منتقل کیے جانے کے بنیادی سوالات پر توجہ دی تو انہیں (برطانوی) حکام کے ساتھ اس سلسلے میں ذاتی یا سفارتی بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی یا اس کا موقع نہیں ملا۔ دوسری طرف، (یہ) حکام (ہمیشہ) جناب گاندھی سے ملاقات، اگر ممکن ہو، اور انہیں کسی بھی معاملے میں (وہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو) مطمئن کرنے کو مشتاق رہے مگر وہ جناب تلک کو اتنا ناپسند کرتے تھے کہ ان سے ملاقات کرنا مناسب نہ جانا کیوں کہ وہ ہندوستان میں بیرونی اقتدار کے خلاف (ہندوستان کے) احتجاج کی جیتی جاگی علامت بن گئے تھے۔

جب تلک اور اینی بیسنٹ اپنی اپنی ہوم رول لیگ پر حاوی تھے تو دوسری طرف گاندھی کے اثرات بھی مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کے کارکن اب رہنمائی کے لئے گاندھی کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ آخر کار محترمہ

بیسنٹ کی لیگ گاندھی کے اثرات کی تاب نہ لاسکی اور اس کا نام بدل کر 'سوراج لیگ' کر دیا گیا اور عدم تعاون تحریک میں ضم ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد جناح، اکتوبر 1920 میں ہوم رول لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ ڈاکٹر اینی بیسنٹ پہلے ہی اسے چھوڑ چکی تھیں کیوں کہ، ان کے بقول، ان کی جگہ گاندھی کے لیگ کا صدر منتخب کیے جانے کے بعد یہ 'حد درجہ مذہب میں الجھ کر رہ گئی ہے۔' ڈاکٹر بیسنٹ کی قیادت اور جناح کی بطور رکن شمولیت کے ساتھ، اس کا نعرہ تھا 'برطانوی راج کے اندر رہتے ہوئے خود حکومتی'، جب کہ گاندھی نے 'پورن سوراج'، یعنی برطانیہ کے ساتھ تمام رشتوں سے مکمل آزادی کو اس کا لقب لعین بنا دیا۔ اس کے خلاف جناح کا ردعمل ویسا ہی تھا جیسا ہونا چاہیے تھا، کہ ان کے اندر کا وکیل انہیں آئینی طریقوں اور ذمے دار حکومت کے اصول سے وابستہ رہنے کو کہہ رہا تھا۔ جب انہوں نے احتجاج کیا کہ متعلقہ اجلاس لیگ کا آئین بدلنے کا مجاز نہیں ہے تو اجلاس کے صدر کا جواب تھا کہ 'کوئی بھی رکن ... رکنیت ترک کرنے کے لیے آزاد ہے'، اگر وہ 'تبدیل شدہ آئین' کی پابندی نہیں کر سکتا۔ اس پر جناح نے 19 اور اراکین کے ساتھ، لیگ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

گاندھی نے اب دوسرے معاملات پر توجہ مرکوز کی۔ تلک کی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان ان سے خوش نہیں تھے۔ مگر گاندھی کو اپنے 'اصلاح شدہ ہندو مذہب' کے ہمارے امید تھی کہ وہ ان کا تعاون حاصل کر سکیں گے۔ 1918 کے اوائل میں، انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ رابطے کا پروگرام شروع کیا، اور اس معاملے میں حکومت کے ساتھ مراسلت کا آغاز کیا۔ اس کے نتیجے میں ہی، انہوں نے آگے چل کر خلافت تحریک کی حمایت کی جو ان کے نزدیک لازمی طور پر 'انگریز مخالف تحریک' نہیں تھی۔ جناح کے ساتھ ان کے اختلافات اب اتنے زیادہ اور ایسی بنیادی نوعیت کے تھے کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گاندھی احتجاج کی ایسی راہ پر چل پڑے تھے جو جناح کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ خلافت کے مذہبی پہلو، جو بالکل متضاد طور پر گاندھی جیسے پکے ہندو تک کے لیے قابل قبول تھے، جناح کے لیے قطعاً ناقابل قبول تھے، جو اس وقت اپنی سیاست کو اسلام کی کسی محدود تعبیر کے تابع محسوس نہیں کرتے تھے۔

17- Indian Constitutional Documents, Volume 1, *Pilgrimage to Freedom,* K.M. Munshi, Bhartiya Vidya Bhawan.

18- ای این 4

19- Indian Constitutional Documents, Volume I, *Pilgrimage to Freedom,* K.M. Munshi, p.22, Bhartiya Vidya Bhawan.

20- *Transfer of Power,* Vol. VI, p.617.

21- کانگرس نے قانون ساز اداروں کے معاملے میں حکومت سے تعاون نہیں کیا۔ لہٰذا جب کانگرس نے 1920 کے کونسل انتخابات میں حصہ نہیں لیا تو جناح، عدم تعاون کے حامی نہ ہونے کے باوجود، کھل کر کانگرس اور خلافتیوں

کی مخالفت نہ کر سکے۔ اس طرح وہ 1920 کے انتخابات میں شریک نہیں ہو پائے۔

22- جلیاں والا باغ کا سانحہ اور اس کے بعد حکومت پنجاب کے استبدادی اقدامات۔

23- سوراجی: تحریک آزادی کے دوران یہ حلقہ ہوم رول لیگ کے اعتدال پسندں کے مقابلے میں انتہا پسندی کی نمائندگی کرتا تھا۔ شدت پسندی کی تحریک شروع ہونے کے ساتھ ہی انگلینڈ اور برطانوی اداروں کا جادو اترنے لگا اور برطانوی اثرات کے بجائے بنیادی طور پر ملکی وسائل اور یورپ کے بغاوت سے متعلق ادب سے پیدا ہونے والے اثرات حاوی ہونے لگے۔ برطانیہ کی آئینی تاریخ کے مطالعے نے اعتدال پسندوں میں ڈومینین حیثیت کے لئے پسندیدگی اور یقین پیدا ہو گیا تھا مگر آسٹریا کے لوگوں کو اٹلی سے نکال دئے جانے کے واقعے اور اس طرح کے دیگر معاملات سے انتہا پسندوں کو مکمل آزادی کا ایک نیا تصور بلکہ آدرش حاصل ہوا۔ اعتدال پسندوں کا مقصد انگریزوں کی سر پرستی کے تحت خود حکومتی حاصل کرنا تھا مگر انتہا پسندوں یا شدت پسندوں نے مکمل خود مختاری اور تمام بیرونی اقتدار کے خاتمے کا اپنا نصب العین قرار دیا۔

بال گنگا دھر تلک (1856-1920) اور دیگر انتہا پسند، جو راست اقدام اور مزاحمت کا طریقہ اختیار کرنا چاہتے تھے، خود اپنے بقول اعتدال پسندوں کی 'سیاسی دریوزہ گری' کے سخت مخالف تھے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی تقسیم مخالف تحریک کے دوران تلک نے لکھا تھا: 'سوراج یا خود حکومتی کا مطالبہ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ آدھی ادھوری اصلاح سے کام نہیں چلے گا۔ انتظامیہ ملک کے لئے تباہ کن ہے۔ اسے اپنا رویہ بدلنا ہو گا یا ختم ہونا پڑے گا'۔ ان کے مطابق سوراج ہر ہندوستانی کا پیدائشی حق تھا۔

ایک اور انتہا پسند رہنما بپن پال (1858-1932) کا کہنا تھا کہ سوراج صرف سیاسی نہیں بلکہ بنیادی طور پر ایک اخلاقی تصور ہے۔ 'ہماری زبان میں اس کے لئے نامحکومی کا لفظ اس کا نہیں ہے جو انگریزی لفظ آزادی کا ہم معنی ہو گا بلکہ خود ماتحتی ہے جو ایک مثبت تصور ہے۔ خود ماتحتی کا مطلب ہے فرد اور اجتماع کے درمیان مکمل ہم شکلی'۔

اروند گھوش (1872-1950) نے بھی، تلک کی طرح، سوراج کے نصب العین کے بارے میں اظہار خیال کیا: 'ہم نئے مکتب فکر کے لوگ اپنا نصب العین مطلق سوراج سے ایک انچ بھی کم نہیں کر سکتے، یعنی اپنی خود حکومتی جیسی برطانیہ میں موجود ہے۔ ہم اپنے اوپر اپنی تہذیب سے کم تر تہذیب تھوپے جانے، بیرونی تہذیب کے برتر ہونے کی پائیدار بنیاد پر اپنے ورثے سے بے دخل کیے جانے کی، غیر ملکیوں کی کوششوں کو مسترد کرتے ہیں۔

لاجپت رائے (1865-1928)، بال گنگا دھر اور بپن پال کی سوراجی تکڑی تو 'لال-بال-پال' کہا جاتا تھا۔ لاجپت رائے کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو خود اپنی طاقت پر بھروسا کرنا چاہئے اور انگریزوں کی طرف مدد کے لئے نہیں دیکھنا چاہئے۔

سوراجیوں کا کہنا تھا کہ برطانوی اقتدار چاہے جتنا بھی بہتر یا نرم ہو جائے، خود اقتداری کی طرح کبھی نہیں ہو

سکتا۔ ان کا رویہ آئیر لینڈ کی تنظیم سن فین کے رہنما آرتھر گریفتھ جیسا تھا جس کا کہنا تھا: 'وہ لوگ جو برطانوی بد حکومتی ختم کرنے کی باتیں کرتے ہیں ہمیں وہ غلام نظر آتے ہیں۔ برطانوی بدحکومتی کے نہیں بلکہ آئر لینڈ میں برطانوی حکومت کے خلاف میں، وہ اچھی ہو یا بری۔'

24- بنگال معاہدہ: 1923 کے بنگال معاہدے نے مسلمانوں کے لیے سرکاری اور مقامی ملازمتوں میں ریزرویشن کو منظوری دی۔ اس معاہدے میں، جو مسلمانوں کے لیے نرم رخ رکھتا تھا، کہا گیا تھا کہ فرقہ پرستی، شکایات سے پیدا ہوتی ہے اور اگر ہندوستان کے لوگ ان شکایات کو رفع کر دیں تو فرقہ پرستی ختم ہو جائے گی۔ اس معاہدے سے سی آر داس کو بنگال میں مسلم حمایت حاصل ہوئی۔ اس کی شرائط کے بارے میں کوئی کچھ بھی سوچے مگر یہ ایک تعمیری قدم تھا۔

25- 1926 کا بدترین واقعہ مئی اور جولائی 1926 میں کلکتہ میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات تھے۔ جھگڑا آریہ سماج کے ایک جلوس کے دوران مسجد کے سامنے باجا بجائے جانے سے شروع ہوا۔ اس کے بعد ہونے والے تشدد میں دونوں طرف بہت سے لوگ مارے گئے۔ آخر کار جب دونوں فریق تھک گئے تو پھر امن ہو گیا۔ اس کی وجہ سے سارے ملک میں کشیدگی پھیل گئی مگر دوسری جگہوں پر کوئی ناخوش گوار واقعہ نہیں ہوا۔ قانون سازیہ کے انتخابات نومبر 1926 میں ہونے طے تھے، جنہیں اب ہندو مسلم فسادات کے سائے میں ہونا تھا۔

26- مالوا، پنجاب اور ہریانہ کے بعض حصوں پر مشتمل علاقہ ہے جو دریائے ستلج اور جمنا کے درمیان واقع ہے۔ ماجھا علاقہ دریائے بیاس کے دائیں کنارے سے شمال مغرب کی سمت واگھا گاؤں تک پھیلا ہوا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی سرحد ہے۔ پنجابی زبان میں ماجھا کا مفہوم ہے مرکزی علاقہ۔ یہ علاقہ دو اضلاع امرتسر اور گرداس پور کا احاطہ کرتا ہے۔

27- پنجاب کی صوبائی حکومت پر مسلمان حاوی تھے۔ ریاستی ایکٹ مسلم کاشت کاروں کے حق میں تھا۔ مسلم کاشت کاروں کی تعداد ہندوؤں سے کہیں زیادہ تھی جو بنیادی طور پر قصبوں اور شہروں میں رہتے تھے۔ یہ ایکٹ مغربی پنجاب کے چھوٹے کسانوں اور زرعی مزدوروں کے مقابلے بڑے زمین داروں کے حق میں بھی تھا۔ اس اقتصادی نابرابری کا اظہار ہندوؤں کی فرقہ وارانہ بے چینی کے ذریعے ہوتا تھا جو اس ایکٹ کو اپنے خلاف امتیازات کا باعث سمجھتے تھے۔

28- آریہ سماج، ایک اصلاحی تحریک اور مذہبی و سماجی تنظیم تھی، جو 1875 میں بمبئی میں قائم کی گئی تھی۔ لفظ 'آریہ' کا مفہوم ہے اقدار کا حامل شخص، جو دانش مند اور مخیر ہو اور جو فکر و عمل میں اچھا ہو۔

29- کوہاٹ فسادات: 1924 میں این ڈبلیو ایف پی کے کوہاٹ علاقے میں ایک بڑا ہندو مخالف فساد ہوا۔ تین دن (9-11 ستمبر) میں تقریباً 155 ہندو اور سکھ ہلاک ہوئے۔ وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کو اپنی جان بچا کر

بھاگنا پڑا۔گاندھی نے اکتوبر 1924 میں ہندو۔مسلم اتحاد کے لیے اکیس دن کا برت رکھا۔فساد کا سبب کوہاٹ کے جیون داس کے 9 تحریر کردہ کتابچے رنگیلا رسول میں رسول اللہ کا ذکر 'برے' لفظوں میں کیا جانا تھا۔

30- 1926 کے انتخابات فرقہ وارانہ مخاصمت کے ماحول میں ہوئے تھے۔اس میں سب سے زیادہ نقصان جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کو پہنچا۔سابقہ مرکزی اسمبلی میں، جناح نے کانگریس اور حکومت کے درمیان توازن قائم کر رکھا تھا۔نئی مرکزی اسمبلی (1926) میں وہ ایک ایسے رہنما بن گئے جس کا کوئی مقتدی نہ ہو۔مرکزی اسمبلی میں اہم کردار ادا کرنے کی حالت میں رہنے کے لیے،ضروری تھا کہ وہ نئے حامی تلاش کریں۔انہوں نے مسلم حلقے کی قیادت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

31- دسمبر 1923 کے انتخابات کے بعد سے،حکومت بنگال مسلسل الزام لگا رہی تھی کہ انقلابی اور سوراج پارٹی ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔لارڈ لٹن، لارڈ ریڈنگ کو بار بار بنگال میں انقلابی تشدد کے خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔1923 میں، حکومت بنگال نے انقلابی خطرے کا سامنے کرنے کے لیے غیر معمولی اختیارات طلب کیے مگر حکومت ہند نے انکار کر دیا،مگر بعد میں وائسرائے کونسل کو محسوس ہوا کہ صورت حال تبدیل ہو گئی ہے اور آخر کار اکتوبر 1924 میں آرڈی نینس کو منظوری دے دی گئی۔

32- فضل حسین پنجاب یونینسٹ پارٹی کے قائد تھے جو پنجاب کے پہلے وزیر اعلا بھی ہوئے۔یونینسٹ پارٹی، مسلم، ہندو اور سکھ زمین داروں کا ایک سیاسی اتحاد تھی۔سر فضل حسین کے دست راست سر چھوٹو رام ایک بڑے ہندو (جاٹ) زمین دار تھے۔اس حکمراں پارٹی کے تیسری اہم شخصیت سر سندر سنگھ مجیٹھیا کی تھی جو سکھ زمین داروں کے قائد تھے۔

33- مددی من کمیٹی: مددی من کمیٹی رپورٹ جسے سرکاری طور پر اصلاحات تحقیقاتی کمیٹی رپورٹ کہا جاتا ہے حکومت ہند ایکٹ 1919 کی پیداوار تھی۔اس کمیٹی نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تو امپیریل کونسل میں، قراردادیں پیش کی گئیں، خاص طور پر سوراجیوں کی جانب سے، کہ ہندوستان کو مکمل، خود حکومتی پر مبنی ڈومنین حیثیت دینے کے لیے آئین میں ترمیم کی جائے۔ان مطالبات پر غور کے لیے، برطانوی حکومت نے سر الیگزینڈر مددی من کی سربراہی میں ایک کمیٹی تشکیل دی۔اس نو رکنی کمیٹی کا دائرہ اختیار تھا: مرکزی حکومت اور گورنروں کے صوبوں کی حکومتوں کے تعلق سے حکومت ہند ایکٹ اور اس کے ضابطوں پر عمل آوری یا اس میں موجود خامیوں سے پیدا ہونے والی مشکلات کی تحقیقات کرنا، ایکٹ کی ساخت، پالیسی اور مقصد سے ہم آہنگ رہتے ہوئے، یا ایکٹ میں ایسی ترمیمات کے ذریعے جو کسی طرح کی انتظامی خامیوں کو درست کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوں، ان مشکلات یا خامیوں کے ازالے کے امکان اور مناسب ہونے کا پتہ لگانا۔کمیٹی نے خاصی عجلت سے کام لیتے ہوئے اپنا کام اگست اور دسمبر 1924 کے درمیان پورا کر لیا اور ستمبر 1925 میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔اس

کے ضمیموں میں کمیٹی کے سامنے شہادت دینے والے رہنماؤں اور افراد کی ایک فہرست، حکومت ہند ایکٹ کے تحت قانونی اور آئینی پیش رفت امکانات کا میمورنڈم اور بجوئے چند مہتاب نامی ایک رکن کا ایک لمبا نوٹ شامل تھا۔

-34 ہیلے، ایک انڈین سول سرونٹ تھا جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارا۔ وہ دہلی کا کمشنر، پنجاب اور اتر پردیش کا گورنر اور وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل میں ہوم ممبر رہا۔ اسے لارڈ اروِن کا بہت مقرب سمجھا جاتا تھا۔

-35 سی این 29

-36 *Lala Rajput Rai, His Writings and Speeches*, ed. V.C. Joshi, Volume ii, pp.175-78 and 210-14, Delhi 1966.

-37 سی ڈبلیو سی، جلد 26، 1920 ص 34-232

-38 India Quarterly Register, 1925, vol. i, p.73.

-39 Indian Legislative Assembly Debates, Volume 6, Part ii, pp.940-41, 8 September 1925.

-40 Halifax papers, 3: Irwin to Birkenhead, 24 March 1927.

-41 *Indian Quarterly Register*, 1927, vol. i. pp.36-7.

-42 Government of India, Home Political, 6/1927: Note by Maddiman, 24 May 1927.

-43 ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا کانگریس اور مسلم لیگ کے مسلمانوں میں بڑا احترام تھا۔ وہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے اہم ترین ستونوں میں تھے جس نے قومی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ 1934 تک جیسے جیسے سیاست زیادہ سے زیادہ دو خیموں میں بٹتی چلی گئی، اس پارٹی سے وابستہ لوگوں کے اثرات کم ہوتے گئے۔ اب جناح نے دہلی کے نرم خیال مسلم رہنماؤں کو مسلم لیگ کے اپنے دھڑے کی جانب مائل کرنے کی کوششیں تیز تر کر دی تھیں۔

-44 مدراس میں کانگریس کے سالانہ اجلاس (1927) میں آزادی سے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی۔

-45 AICC Papers, G60: Ansari to Jawaharlal Nehru, 29 March 1928

-46 آل پارٹیز کانفرنس 1928، رپورٹ، ص 23

-47 شعیب قریشی اور سر علی امام مسلمانوں کے نمائندے تھے؛ ایم آر جیکر اور ایم ایس انے ہندو مہا سبھا کے، سردار منگل سنگھ سکھوں کے اور جی آر پردھان غیر برہمن ذاتوں کے نمائندے تھے؛ لبرل رہنما سر تیج بہادر سپرو؛ ٹریڈ یونین لیڈر این ایم جوشی؛ بنگال کے سبھاش چندر بوس۔ ان میں سے جیکر نے کوئی حصہ نہیں لیا اور سر علی امام، این ایم جوشی، جی آر پردھان اور سبھاش بوس نے کی شرکت محدود رہی۔

-48 A Bunch of Old Letters, p60-61; Moti Lal to Gandhi, 11 July 1928
'تمام اراکین اپنے گھر چلے گئے اور جواہر لال اور میں رپورٹ تیار کرنے کے لیے بچ گئے اور اب ہم لوگ اس کام میں پوری طرح لگے ہوئے ہیں'۔

-49 مولانا شوکت علی: اسلام پر گہرا عقیدہ رکھتے تھے اور تحریک آزادی کے ساتھ ان کی مکمل وابستگی تھی۔ رام پور میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ وہ مولانا محمد علی کے اخباروں ہمدرد اور کامریڈ میں معاونت کرتے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے سیاسی رویوں کو حددرجہ متاثر کیا۔

-50 متحدہ صوبہ جات کے مسلم زمین دار اور سیاست کار تھے بعد میں ان کے گھرانے نے 1937 کے صوبائی انتخابات میں کانگریس کا ساتھ دیا۔

-51 (1) یہ کہ مرکزی قانون سازیہ کے دونوں ایوانوں میں منتخب اراکین کی ایک تہائی تعداد 'مسلمانوں کی' ہونی چاہیے'۔

(2) یہ کہ پنجاب اور بنگال میں، بالغ رائے دہندگی کا نظام قائم نہ ہونے کی صورت میں، مسلمانوں کو آبادی کی بنیاد پر دس سال کے لیے انہیں نشستوں کا ریزرویشن دیا جائے جس پر اس مدت کے بعد نظر ثانی کی جائے، مگر اس صورت میں انہیں (مسلمانوں کو) زائد نشستوں پر الیکشن لڑنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

(3) باقی بچے ہوئے اختیارات مرکزی قانون سازیہ کو نہیں بلکہ صوبوں کو حاصل ہونے چاہئیں، اس کے علاوہ مجوزہ آئین کی دفعات اور شیڈولوں کے بارے میں تفصیلی سفارشات بھی کی جانی چاہئیں۔

(4) یہ کہ آئین میں کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کی جانی چاہیے جب تک کہ اس ترمیم یا تبدیلی کو پہلے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں، الگ الگ، موجود اراکین کی پانچ میں سے چار حصہ تعداد اور پھر دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں موجود اراکین کی پانچ میں سے چار حصہ تعداد منظور نہ کرے۔

(5) فرقہ وارانہ نمائندگی کو فوراً عمل میں لایا جائے اور

(6) پنجاب میں فرقہ وارانہ نمائندگی سے متعلق معاہدے کو نہرو رپورٹ میں مکمل طور پر شامل کیا جائے۔

-52 آل پارٹیز نیشنل کنونشن کی کارروائی، ص 77-76، انصاری پیپرز، 'نہرو رپورٹ میں ترمیمات' کے عنوان سے پنسل سے لکھا گیا ایک نوٹ جس میں سب کمیٹی کے مختلف حلقوں کے ردعمل درج کیے گئے۔

-53 آل پارٹیز نیشنل کنونشن کی کارروائی، ص 82-78

-54 ایضاً، ص 92-86

-55 ایضاً

-56 ایضاً، ص 93

-57 مارچ 1929 میں جناح نے اپنے مشہور 14 نکات مرتب کیے جو اس طرح تھے:

(1) آئندہ آئین کی نوعیت وفاقی ہوگی جس میں باقی بچے اختیارات صوبوں کو دیے جائیں گے۔
(2) تمام صوبوں کو یکساں خود مختاری دی جائے گی۔
(3) ملک کے تمام قانون ساز ادارے اور دیگر منتخب ادارے ہر صوبے میں اقلیتوں کی کافی اور موثر نمائندگی کے مقررہ اصول کی بنیاد پر تشکیل دیے جائیں گے اور کسی بھی صوبے میں موجود اکثریت کو کم کر کے اقلیت یا برابری کی سطح تک نہیں لایا جائے گا۔
(4) مرکزی قانون سازیہ میں، مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہیں ہوگی۔
(5) فرقہ وارانہ گروہوں کی نمائندگی علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعے جاری رہے گی، جیسا کہ اب ہے، اور ہر فرقے کو کسی بھی وقت مشترکہ حلقہ انتخاب کے حق میں اپنے علاحدہ حلقہ انتخاب سے دست بردار ہونے کی آزادی حاصل ہوگی۔
(7) تمام فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی یعنی عقیدے، عبادت، تبلیغ واشاعت، تنظیم اور تعلیم کی آزادی کی ضمانت دی جائے گی۔
(8) کوئی بھی بل یا قرارداد یا اس کا کوئی بھی حصہ، کسی بھی قانون ساز ادارے یا کسی اور منتخب ادارے میں، منظور نہیں کیا جائے گا اگر اس ادارے میں کسی فرقے کے اراکین کی تین چوتھائی تعداد اس بل، قرارداد یا اس کے کسی حصے کی اس بنیاد پر مخالفت کرے کہ اس سے اس خاص فرقے کے مفادات کو نقصان پہنچے گا، یا پھر متبادل کے طور پر، ایسا کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے گا جو ان معاملات سے نمٹنے کے لیے قابل عمل پایا جائے۔
(9) سندھ کو بامبے پریزیڈینسی سے علاحدہ کر دیا جائے گا۔
(10) شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں بھی دیگر صوبوں جیسی اصلاحات جاری کی جائیں گی۔
(11) آئین میں ایسے انتظامات کیے جائیں جن کے تحت مسلمانوں کو، دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ، ریاست کی اور مقامی خود مختار اداروں کی تمام ملازمتوں میں مناسب حصہ دیا جا سکے اور اس سلسلے میں کارکردگی کے تقاضوں کا خیال رکھا جائے۔
(12) آئین میں مسلمانوں کی ثقافت اور تعلیم، زبان، مذہب، عائلی قوانین اور مسلم رفاہی اداروں کے تحفظ اور فروغ، اور ریاست اور مقامی اداروں کی طرف سے فراہم کردہ امداد میں ان کو جائز حصہ دینے کے لیے مناسب تحفظات فراہم کیے جائیں۔
(13) کوئی بھی کابینہ، مرکزی یا صوبائی، تشکیل نہیں دی جائے گی جب تک اس میں کم از کم ایک تہائی مسلم وزیر شامل نہ ہوں۔
(14) مرکزی قانون سازیہ، آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی جب تک اس کے لیے ہندوستانی وفاق میں

شامل ریاستوں کی رائے نہ لی جائے۔
آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے 'قائد' کے ان کے تمام چودہ نکات کو منظور کرلیا۔ ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ حکومت ہند کے آئندہ آئین کا کوئی بھی منصوبہ مسلمانوں کو قبول نہیں ہوگا جب تک اس میں قائد، کے چودہ نکات میں کیے گئے مطالبات شامل نہ ہوں۔

Prelude to Partition-The Indian Muslims and the Imperial System of Control 1920-32, David Page, pp.131-2, Oxford University Press, Delhi, 1982.

باب 4

1- 'امن کے خاتمے کے لیے امن' یہ وہ فقرہ ہے جسے ڈیوڈ فرومیکن نے اپنی کتاب

The Fallof Ottoman Empire and the Creation of the Modern Middle East

کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ کتاب آؤل بکس۔ ہینری ہولٹ اینڈ کمپنی، ایل ایل سی، نیویارک نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب نیویارک ٹائمز کی سب سے کثیرالاشاعت کتابوں میں شامل ہے۔

2 Wells, *Ambassador of Hindu Muslim Unity*, pp.165-6.

3 William Manchester, *Winston Spencer Churchill: The Last Lion* Vol.I: *Visions of Glory, 1874-1932*, A Delta Book/Dell Publishing. 1983 pp. 845-6.

4 دیکھیے فٹ نوٹ نمبر 23، باب 3

5 'جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب کیا ہے۔' گاندھی

6 A chapter from the book - *Postmodern Gandhi and Other Essays, Gandhi in the World and at Home* by Lloyd and Susanne Hoeber Rudolph, The University of Chicago Press, 2006.

7 دہلی تجاویز: اس بات کے پیش نظر کہ علاحدہ حلقہ انتخاب ہندو۔مسلم تعلقات کی بہتری کے لیے خاص رکاوٹ ہیں، جناح نے تجویز پیش کی کہ اگر ہندو بعض تحفظات دینے پر رضامند ہو جائیں تو مسلمان اس مطالبے کو چھوڑ دیں گے۔ اس کے نتیجے میں، 1927 میں دہلی میں مسلمانوں کے ایک جلسے میں بعض تجاویز منظور کی گئیں جنہیں 'دہلی۔مسلم تجاویز' کہا جاتا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل تحفظات تجویز کیے گئے تھے۔

(1) سندھ کو ایک علاحدہ صوبہ بنایا جائے۔
(2) شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں دیگر صوبوں جیسی ہی اصلاحات جاری کی جائیں۔
(3) جب تک مذکورہ تجاویز پر عمل نہیں کیا جاتا تب تک مسلمان علاحدہ حلقہ انتخاب کے ذریعے اپنی نمائندگی کے حق کو کبھی بھی ترک نہیں کریں گے۔ اگر یہ دو تجاویز مسلمانوں کے مکمل اطمینان کے مطابق عمل میں لے آئی جائیں اور مندرجہ ذیل تجاویز کو قبول کر لیا جائے تو مسلمان، بہ رضا و رغبت، مشترکہ حلقہ انتخاب کے حق میں علاحدہ حلقہ انتخاب سے دست بردار ہو جائیں گے، اس طرح کہ مختلف فرقوں کی آبادی کے لحاظ سے نشستوں کا ریزرویشن کر دیا جائے۔
(4) سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندو اقلیتوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نشستوں کا وہی ریزرویشن دیا جائے گا جو ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔
(5) مرکزی قانون سازیہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہیں ہوگی۔
(6) مذہبی آزادی سے متعلق انتظامات کے علاوہ، آئین میں یہ ضمانت بھی دی جانی چاہیے کہ فرقہ وارانہ امور سے متعلق کوئی بھی بل یا قرارداد زیر غور نہیں لائی جائے گی نہ اسے منظور کیا جائے گا اگر کسی خاص فرقے کی تین چوتھائی اراکین اس کے مخالف ہوں۔
ان تجاویز کو مکمل طور پر قبول یا مسترد کیا جانا تھا۔ ان تجاویز کا مفہوم یہ تھا کہ مسلمان نشستوں کے ریزرویشن کے بدلے علاحدہ حلقہ انتخاب سے دست بردار ہونے کو راضی ہیں۔ بدقسمتی سے، کانگریس نے پہلے ان تجاویز کو منظور کیا مگر بعد میں مسترد کر دیا۔

-8 *Postmodern Gandhi and Other Essays, Gandhi in the World and at Home* by Lloyd and Susanne Hoeber Rudolph, The University of Chicago Press, p.67, 2006.

-9 کیلنڈر رومن کیلنڈر کا حصہ تھے، یونانی کیلنڈر کا نہیں۔ لہٰذا 'یونانی کیلنڈر' ایک ایسی تاریخ کو کہتے ہیں جو کبھی واقع نہیں ہوگی۔

-10 نہرو کا گاندھی کے نام مکتوب مورخہ 11 جنوری 1928 میں۔

-11 مسلم قانون سازوں کی کانفرنس کا خیال سب سے پہلے آغا خاں نے دسمبر 1927 میں پیش کیا تھا مگر اس پر سرگرمی کے ساتھ غور، نہرو رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہی شروع ہوا۔ اس مرحلے پر، مرکزی اسمبلی میں جناح کے رفقا مثلاً سر محمد یعقوب اور جناب فضل رحمت اللہ نے اس خیال کو انجام تک پہنچایا۔
(*Prelude to Partition*, David Page, OUP, 1982, Delhi, p.193)

-12 جناح کے چودہ نکات: دیکھئے حوالہ 57، باب 3

13- دیکھیے موتی لال نہرو پیپرز، نہرو بنام گاندھی، 14 اگست 1929

14- مدی من کمیٹی؛ دیکھیے حوالہ 33، باب 3

15- پارلیمانی جمہوریت کے ویسٹ منسٹر نظام کے تحت سلیکٹ کمیٹی پارلیمنٹ کے چند اراکین پر مشتمل ہوتی ہے جو بعض مخصوص امور پر غور کرتی ہے۔

16- جناح کے ساتھ 31 اکتوبر 1927 کی ملاقات کے بارے میں ارون کا نوٹ، ہیلی فیکس کلیکشن، انڈیا آفس لائبریری (ایچ سی، آئی او ایل)، ایم ایس ایس، یورپ سی 152/29

17- ارون کو جناح کا مکتوب، 31 اکتوبر 1927، ایچ سی، آ او ایل، ایم ایس ایس، یورپ، سی 152/21

18- دی ٹائمز، لندن، 10 نومبر 1927

19- دی مانچسٹر گارڈین، 15 نومبر 1927

20- دی ٹائمز آف انڈیا، 15 نومبر 1927 جناح ارون کریسپانڈنس میں بھی حوالہ، مولفہ وحید احمد، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور، 1969، ص 6-5

21- دی ٹائمز آف انڈیا، 28 نومبر 1927، جناح ارون کریسپانڈنس میں بھی حوالہ، مولفہ وحید احمد، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور، 1969، ص 6

22- سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، 4 جنوری، 1928

23- ارون بنام برکن ہیڈ، 15 مارچ 1928، ایچ سی- آئی او ایل، ایم ایس ایس، یورپ، سی 152/29

24- ارون بنام آرچ بشپ آف کینٹربری، 29 نومبر 1928

25- اگست 1917 کے اعلان میں 'ہندوستان میں ذمے دار حکومت کے مرحلہ وار قیام کی غرض سے خود حکمرانی کے اداروں کے بتدریج فروغ، کی بات کی گئی تھی۔' یہی بات ایکٹ کے 'ابتدائیے' میں بھی کہی گئی تھی اور 'رایل وارنٹ آف انسٹرکشنز' میں بھی، جس میں یہ اضافہ بھی شامل تھا کہ 'اس طرح ہندوستان دیگر ڈومنیوں کے درمیان اپنا مقام پانے کا اہل ہو جائے گا۔' یہ بات ایک خاص اہمیت کی حامل ہے؛ ہم جانتے ہیں کہ یہ بات جان بوجھ کر کہی گئی تھی۔ کانگریس اور لیگ نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد ہندوستان میں خود-حکومتی کے قیام کے بارے میں اپنا ارادہ ظاہر کرے جس کے بعد ہی کابینہ نے یہ بات کہی۔ ایکٹ میں ایجاز بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا کہ ہندوستان میں منتظمہ، برطانوی پارلیمنٹ کو نہیں بلکہ ہندوستانی قانون سازیہ کو جواب دہ ہوگی۔ اگر آپ 'مکمل ڈومنین خود-حکومتی' کے الفاظ کا تجزیہ کریں تو پائیں گے کہ ان کا مفہوم کافی وسیع ہے جس میں کہا جا رہا ہے کہ نہ صرف منتظمہ، قانون سازیہ کو جواب دہ ہوگی بلکہ قانون سازیہ کو بھی مکمل اختیارات حاصل ہوں گے جو جدید ڈومنین کا خاصہ ہے۔' میں کہتا ہوں کہ یہاں اصل بات کچھ اور

ہے، کیوں کہ ذمے دار حکومت کے لیے ضروری نہیں کہ وہ محدود اختیارات کی حامل قانون سازیہ سے عدم مطابقت ہی رکھتی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ مکمل ڈومینین خود حکومتی، ذمے دار حکومت کا لازمی نتیجہ ہو نہیں، بلکہ یہ ذمے دار حکومت کا ناگزیر اور تاریخی نتیجہ ہوسکتی ہے، مگر اس کا اگلا اور آخری قدم۔' (سر میلکم ہیلے، حکومت ہند کے ہوم ممبر تھے کے خیالات، ہندوستان کو مکمل خود حکمراں ڈومینین حیثیت دینے کے بارے میں، 8 فروری 1924- گائڈ اینڈ اپادوری، ص 220)

26- قانون ساز اسمبلی کے مباحث، 5 فروری 1924، ص 768

27- لارڈ اروِن کے نام مکتوب، جناح اروِن کریسپانڈس، مولفہ وحید احمد، ص 41

28- نواب چھتاری: احمد سعید خاں (پ 1888)؛ وزیر صنعت، یوپی، 25-1923، ہوم ممبر، یوپی 33-1926؛ زمین دار پارٹی اور مسلم لیگ کے رہنما

29- *The Memoirs of Aga Khan* by His Highness the Aga Khan, Simon & Schuster, New York, 1954.

30- نواب بھوپال، سر حمید اللہ خاں (1960-1894)، چانسلر آف چیمبر آف پرنسز، 32-1931 اور 1944-47۔

31- *The Memoirs of Aga Khan* by His Highness the Aga Khan, p.231, Simon & Schuster, New York, 1954

32- ایضاً، ص 34-233

33- *Jinnah of Pakistan*, Stanley Wolpert, p.120

34- Jinnah of Pakistan, Stanley Wolpert, p.120 -مگر اصل محولہ اقتباس سر میلکم ہیلے کی سوانح حیات سے اخذ کیا جائے گا۔

35- ایضاً

36- Quoted in Joachim Alva, *Men and Supermen of Hindustan*, Bombay, 1943, p.226.

37- سول اینڈ ملٹری گزٹ، 3 مارچ 1936

38- *Prelude to Partition - The Indian Muslims and the Imperial System of Control, 1920 - 1932;* David Page, p.229, Oxford University Press, Delhi 1982.

39- رام راج یا رام راجیہ: گاندھی کا کہنا تھا 'رام راج سے میری مراد ہندو راج نہیں ہے......رام راج سے میری مراد ہے خدائی حکومت'......رام راج وہ ہے جہاں مقامی وسائل اور فیصلہ سازی مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں

ہو، ریاست لوگوں کی رائے کا احترام کرے، شفافیت کو یقینی بنائے، تحفظ اور بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے معقول ٹیکس لگائے، لوگوں کے درمیان رابطہ پیدا کرے مگر مداخلت یا استحصال نہ کرے۔

40- GI Home Political.33/x/1931;AICC Circular No. 12, 10 March 1931.

41- ایک روپے کا چوتھائی کہ ایک روپیہ اس وقت 16 آنے کا ہوتا تھا۔

42- فضل حسین پیپرز: فضل حسین کا مکتوب سر محمد اقبال کو، یکم مئی 1931

43- *The Memoirs of Aga Khan* by His Highness the Aga Khan, p.235, Simon & Schuster, New York, 1954.

44- ہندوستان کی تحریک آزادی میں سر ریمزے میکڈانلڈ (1927-1886) کے کردار کا تجزیہ ابھی کیا جانا ہے۔ وہ 1924 میں اور پھر 35-1929 کے دوران برطانیہ کے وزیراعظم اور 14-1911 کے دوران لیبر پارٹی کے سربراہ رہے۔ ہندوستان میں، ان کی سیاسی زندگی کے ابتدائی زمانے میں، ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ انہیں 1911 میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرنے کی دعوت دی گئی مگر اپنی اہلیہ کے انتقال کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکے۔ وہ بنگال کی تقسیم کی مذمت کرنے والوں میں سب سے نمایاں تھے۔ بعد میں انہوں نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ، قانون سازیہ کو انتظامی ذمے داری دینے کے بنیادی اہمیت کے حامل اصول کو تسلیم کرنے کو تیار ہے، بعض تحفظات کے ساتھ، خاص طور پر دفاع، امور خارجہ، امن وامان کی برقراری اور مالیاتی استحکام کی ضمانت کے دائروں میں۔ لیکن علاحدہ حلقہ انتخاب جاری کرنے کی ذمے داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔ گاندھی جی نے، میکڈانلڈ کی طرف سے دبے کچلے طبقوں کو پیش کردہ 'فرقہ وارانہ بخشش' کے تحت علاحدہ حلقہ انتخاب کو منظوری دیے جانے کے خلاف مرن برت رکھا۔ میکڈانلڈ نے اس بات پر افسوس کیا کہ 'ایک متحدہ ہندوستان، نصب العین اور تقدیر کی وحدت کا شعور رکھنے والے ہندوستان کی امید فضول ترین خواب معلوم ہوتی ہے۔' انہوں نے سائمن کمیشن کے تقرر میں قابل لحاظ حصہ لیا۔ ایسے ہی اقدامات تھے جن کے پیش نظر اسٹینلے بالڈون نے انہیں 'کنزرویٹزم' کا اصول اختیار کرنے پر مبارک باد دی۔ ونسٹن چرچل نے ان سے طنزاً 'دنیا کو سرمایہ دارانہ نظام کے لئے محفوظ تر نہیں تو زیادہ باشعور بنانے سے متعلق کنزرویٹو پالیسی پر عمل کرنے کے حکومت کے خود عائد کردہ مقصد میں اپنا خوش گوار تعاون پیش کرنے' کا وعدہ کیا۔ لائڈ جارج نے میکڈانلڈ کو 'آخری کنزرویٹو' قرار دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی یقین تھا کہ میکڈانلڈ کے زیر قیادت برطانیہ کی لیبر حکومت ہندوستان کی قومی تحریک کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

45- *Mahatma Gandhi: Congress and its Leadership*, Bakshi, p.143, published in 1990, Anmol Publications Private Ltd

46- Lord Willingdon in India by Victor Trench, 1934, p.212.

47- گاندھی نے یہ اصول قائم کر دیا تھا کہ ان کے آشرم (ایک ایسی اجتماعی اقامت گاہ سے متعلق گاندھی کا تصور جہاں مذہبی مزاج کے لوگ قیام کر سکیں؛ ایسی کوئی بھی ہندو طرز کی اجتماعی اقامت گاہ جہاں سادھو سنت قیام کریں اور تہذیب وثقافت کو فروغ دیں) میں تمام روزمرہ کے کام آشرم والے خود کریں گے جس میں غلاظت صاف کرنا بھی شامل تھا، 'بھنگیوں' کے تئیں احترام کا مظاہرہ کرنے کے لیے، جنہیں بعد میں انہوں نے 'ہریجن' کہنا شروع کر دیا۔

48- *The Collected Works of Mahatma Gandhi*, Delhi: Publications Division, Ministry of Education and Broadcasting, Government of India

49- *India from Curzon to Nehru,* Durga Das, p.159, 1970.

50- جواہر لال نہرو کا مکتوب گاندھی کو، 11 ستمبر 1931، جواہر لال نہرو، سلیکٹیڈ ورکس، جلد 5، ص 32-31، 1972-74

51- ایضاً

52- جواہر لال نہرو کا مکتوب گاندھی کو، 4 اکتوبر 1931، جواہر لال نہرو سلیکٹیڈ ورکس، جلد 5، ص 137، 1972-74

53- جواہر لال کا مکتوب گاندھی کو، 27 ستمبر 1931، جواہر لال نہرو، سلیکٹیڈ ورکس، جلد 5، ص 46، 1972-74

54- ایان ویلز، ص 229

55- فضل حسین کا مکتوب جناح کو، پیپرز، جلد 17-16

باب 5

1- *Pathway to Pakistan;* Choudhary Khaliquzzaman, p.141.

2- ایضاً

3- Quote from Sir Mohammad Yusuf, *Star of India,* 20 June 1936. Also cited in Liaquat Ali Khan and *The Freedom Movement* by Mohammad Raza Kazmi, p.111, Pakistan Study Centre, University of Karachi, 1997.

4- Quaid-e-Azam Papers, Volume 1122, 167-168; */star of India,* Calcutta, 11 August, 1936.

5- *Star of India,* Calcutta, 29 May 1936, p.3.

6- اے۔ کے۔ فضل الحق (1873-1962) جنہیں شیر بنگال کہا جاتا تھا لیگ کے سیاسی رہنما کی حیثیت سے

تقریباً نصف صدی تک تحریک پاکستان سے متعلق تمام سیاسی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی ترقی کے لیے بیش قیمت خدمات انجام دیں۔

وہ 26 اکتوبر 1973 کو پیدا ہوئے اور ابتدائی مذہبی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ انہوں نے معروف عالموں سے قرآن پاک، عربی اور فارسی کا درس لیا۔ وہ پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے طبیعیات، کیمیات اور ریاضی میں امتیاز کے ساتھ اور ایم اے بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔

1900 میں انہوں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے داخلہ لیا۔ اپنے آبائی قصبے بری سال میں وکالت کرتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ بنگال کے مسلمانوں کی پسماندگی کا بنیادی سبب تعلم نہ ہونا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی ترقی ان کی زندگی کا نصب العین بن گئی۔ دھیرے دھیرے وہ ایک نوجوان سیاسی رہنما کے طور پر ابھرنے لگے۔ فضل الحق اس کمیٹی کے چار اراکین میں شامل تھے جس نے 1906 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا آئین وضع کیا۔ 1912 میں، انہوں نے غریب اور مستحق مسلمانوں کی مدد کے لیے سینٹرل نیشنل محمڈن ایجوکیشنل ایسوسی ایشن قائم کی۔ 1914 میں، وہ بنگال کے مسلمانوں کے قائد بن گئے۔ انہوں نے اپنے صوبے کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھنؤ معاہدے میں حصہ لیا۔ 1920 میں بنگال کے وزیر تعلیم مقرر کیے گئے اور مسلمانوں کے تعلیمی فروغ کے لیے پوری لگن سے کام کیا۔ 20-1919 میں عدم تعاون تحریک کے دوران انہوں نے مسلم طلبہ کو یہ دانش مندانہ مشورہ دیا کہ وہ یکسو ہو کر پڑھائی کریں اور اس مرحلے میں سیاست میں نہ پڑیں۔ فضل الحق بنیادی طور پر عوام کے آدمی تھے۔ وکیل کی حیثیت سے، انہوں نے تقسیم سے، پہلے فساد کے معاملوں میں ماخوذ ہزاروں مسلمانوں کا دفاع کیا۔ انہوں نے بنگال کے کاشت کاروں کے مفادات کا بھی بہت خیال رکھا۔ وہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے جہاں انہوں نے ملک کے انتظامی معاملات میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیے جانے کی وکالت کی۔ 1937 میں، وہ بنگال کے وزیر اعلا منتخب کیے گئے۔ 23 مارچ 1940 کو منعقد مسلم لیگ کے اجلاس میں، جس کی صدارت قائداعظم نے کی تھی، فضل الحق نے تاریخی قرارداد پاکستان پیش کی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق اظہار خیال کیا۔

فضل الحق تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل کا عہدہ قبول کیا۔ انہوں نے 80 سال کی عمر میں پورے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ 1962 میں ان کی صحت گرنی شروع ہوئی اور تقریباً آدھی صدی تک برصغیر کے سیاسی اسٹیج پر اہمیت کے ساتھ موجود رہنے کے بعد 22 اپریل 1962 کو ان کی وفات ہوگئی۔

-7 خواجہ ناظم الدین (1964-1894) 19 جولائی 1894 کو ڈھاکہ میں پیدا ہوئے اور ایم اے او کالج، علی گڑھ اور ٹرینٹی ہال، کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ وہ 1922 سے 1929 تک ڈھاکہ میونسپلٹی کے چیرمین رہے۔

1929 میں صوبائی وزیر تعلیم ہونے کے بعد انہوں نے 'بنگال ابتدائی تعلیم بل'، 1930 پیش کیا جس کو ہندو اراکین کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ 1934 تک وزیر تعلیم رہے اور اس کے بعد ایگزیکٹیو کونسلر بن گئے۔ ان کے اس عہدے کی مدت میں بنگال کے کاشت کاروں کی حالت سدھارنے کے لیے دو اہم بل منظور کیے گئے، جس سے ظاہر ہوتا وہ ایک پائیدار معقولیت پسند ذہن کے حامل تھا۔ 1937 میں، انہیں وزیر داخلہ مقرر کیا گیا۔ وہ 39-1937 کے دوران وہ مخلوط حکومت کی کابینہ کے ایک سرگرم رکن رہے۔ فضل الحق کے مستعفی ہونے کے بعد، خواجہ ناظم الدین، جو 1941 سے 1943 تک حزب اختلاف کے قائد رہے تھے، 24 اپریل 1943 کو وزیر اعلا بنائے گئے۔ اگست 1947 کو انہیں مشرقی بنگال کی مسلم لیگ پارٹی کا قائد منتخب کیا گیا۔

11 ستمبر 1948 کو محمد علی جناح کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کیا گیا۔ لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد انہیں وزیر اعظم بننے کو کہا گیا کہ اس منصب کا اہل کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ ملک غلام محمد کو ان کی جگہ گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔

8- فضل الحق کے زیر قیادت 'کرشک پرجا پارٹی' 1930 کی دہائی میں بنگال کی سیاست پر حاوی رہی۔

9- *Pathway to Pakistan;* Chaudhary Khaliquzzaman, p.153.

10- ایضاً، ص 157

11- ایضاً، ص 161

12- *Nehru, The Indian National Conngress and the Partition of India, 1935-47,* B.R> Nanda, George Allen and Unwin Ltd, London p.157, 1970.

13- Aspects of the Development of Muslim League Policy, 1937-47 by Z.H. Zaidi, George Allen and Unwin Ltd, London p.245, 1970.

14- منشی، حوالہ سابق، ص 46، بھارتیہ ودیا بھون، بمبئی، 1967

15- *Jawaharlal Nehru: A Biography,* S. Gopal, Volume I, 1989-1947, Bombay 1976.

16- ایضاً، ص 228-29

17- مسلم مذہبی طبقہ

18- آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: مسلمانوں کے عائلی قوانین کے تحفظ اور مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلی کیشن ایکٹ، 1937 کا نفاذ جاری رکھنے پر زور دینے سے متعلق تنظیم

19- مومن کانفرنس کا قیام 1911 میں بنگال میں ہوا۔ اس کا مقصد بنکروں کے روایتی ہنر کو نئی زندگی دینا اور غریب

بنکروں میں عزت نفس، مذہبی اعمال کی سخت پابندی اور اقتصادی آزادی کو فروغ دیتا تھا۔

20- اس خیالات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ہندو نیشنلزم اینڈ دی لینگوئیج آف پالیٹکس ان لیٹ کلوئیل انڈیا از ولیم گاؤلڈ، کیمبرج، 2005

21- صدارتی خطبہ، 27 دسمبر 1936

22- Jawaharlal Nehru, Eighteen months in India (Allahabad, 1938), p.153.

23- Pages 54-55, 'The Share of the Constitution' - (Speech), 6 March, 1937, Selected Works of Jawaharlal Nehru.

24- کانگریس قانون سازوں کے کل ہند [illegible]شن میں صدارتی خطبہ، ص 63، 19 مارچ 1937، سلیکٹیڈ ورکس آف جواہرلال نہرو، جلد 8

25- 'The Share of the Constitution' (Speech), 6 March, 1937, Volume 8, p.55, selected works of Jawaharlal Nehru.

26- *Transfer of Power in India,* V.P. Menon, Orient Longman, p.56; 1997.

27- *India Wins Freedom,* Maulana Abul Kalam Azad, Orient Longman, p.171, 1998.

28- *The Shade of Swords: Jihad and the Conflict Between Islam & Christianity,* M.J. Akbar, Routledge, p.183; 2003.

29- Encyclopedia of Political Parties, O.P. Rathan, Anmol Publication Pvt. Ltd, p.674.

30- اگرچہ صوبوں کو پارلیمانی طرز کی ذمے دار حکومت حاصل ہوئی تھی مگر ان کے گورنروں کو اقلیتوں کے تحفظ اور حکومت کے ناکام ہونے کی صورت میں اس کا انتظام سنبھالنے کے خصوصی اختیارات دیے جانے تھے۔ اسے بعض اوقات 1935 ایکٹ کے متعلقہ سیکشن کے حوالے سے 'سیکشن 93 اختیارات' بھی کہا جاتا ہے۔

31- *The Viceroy at Bay - Lord Linglithgow in India - 1936-1943,* John Glendoven, p.75; Collins, 1971

32- ایضاً

33- ایضاً، ص 77

34- ایضاً

35- ایضاً

36- ایضاً، ص 78

37- ایضاً

-38 ایضاً

-39 ایضاً،ص87

-40 ایضاً،ص119

-41 ایضاً

-42 *Pathway to Pakistan,* Chaudhary Khaliquzamman, p.182.

-43 ایضاً

-44 *Pathway to Pakistan,* Chaudhary Khaliquzamman, p.191.

-45 May 14, 1938, Page 5, Bose/Subhash Correspondence; Congress Leaders Correspondence with Qaid-e-Azam, edited by S. Qaim Hussain Jafri; Aziz Publishers, Lohore, Pakistan.

-46 ایضاً

-47 ایضاً،ص6

-48 بال گنگادھر کھیر صوبہ بمبئی کے پہلے وزیر اعلا تھے۔ اپنی نیک طبیعت اور خوش مزاجی کے سبب انہوں نے گاندھی جی سے لے کر نیچے تک کے بے شمار کانگریسیوں کا احترام حاصل کیا۔ کھیر کی سیاسی زندگی 1922 میں شروع ہوئی۔ وہ سوراجیہ پارٹی کے بمبئی شاخ کے سکریٹری بھی رہے۔ انہوں نے سول نافرمانی اور ہندوستان چھوڑو تحریکات کے دوران قید و بند کے مصائب بھی کافی جھیلے جو تمام مجاہدین آزادی کے لیے ایک معمول تھا۔ ان کا انتقال 8 مارچ 1957 کو ہوا۔

-49 *Pathway to Pakistan,* Chaudhary Khaliquzamman, p.201, 1938.

-50 ہندی میں اس کا مفہوم حکمراں، ریاستی مقتدوہ یا حکومت ہے۔

-51 اردو میں اس سے مراد ایک چھوٹی بستی ہے۔

-52 مسلمانوں کی شکایات کا پتہ لگانے کے لیے مسلم لیگ نے پیرپور کے راجہ سید محمد مہدی کی قیادت میں 'پیرپور رپورٹ' تیار کی۔ کانگریس کے زیر اقتدار صوبوں میں مسلمانوں کی شکایات سے متعلق دیگر رپورٹوں میں، اے کے فضل الحق کی 'کانگریس کے اقتدار میں مسلمانوں کے مصائب' اور 'شریف رپورٹ' بھی شامل تھیں۔

-53 اخباری بیان، اسٹار آف انڈیا، 7 جولائی 1937: 'جناح نے کانگریس عوامی رابطہ مہم کی مذمت کی۔ مسلمان ٹوڈی نہیں: کانگریس کے بہت سے لوگ عوام کے سامنے اپنا پروگرام رکھنے کے بجائے مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام پر حملے کررہے ہیں ... کہ وہ تمام لوگ جو مسلم لیگ کے ساتھ ہیں سیاسی غلامی کے حامی اور انگریزوں کے حلیف ہیں ... کیا کانگریس مسلمانوں سے عوامی رابطہ اسی طرح قائم کرنا چاہتی ہے؟ میری رائے میں،

مسلمانوں کے ساتھ عوامی رابطے کی کانگریس کی اس پالیسی کے نتائج بہت سنگین ہوں گے۔'

54- *Nehru and the Partition of India 1935-47*, George Allen and Unwin Ltd, London, p.163, 1970.

55- 4 September 1939; *The Viceroy at Bay, Lord Linlithgow in India, 1936-1943;* John Glendevon; p.137, Collins 1971.

56- ایضاً، ص138

57- انڈیا ایکٹ 1935 کے تحت، برطانوی ہندوستان اور رجواڑوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفاقی حکومت قائم کی جانی تھی جس میں رجواڑوں کے نمائندے ان کے حکمرانوں کے ذریعے نامزد کیے جانے تھے۔ مرکزی قانون سازیہ کے دو ایوان ہونے تھے، ایک قانون ساز اسمبلی اور ایک ریاستوں کی کونسل اور دو سطحی نظام حکمرانی صوبوں میں ختم کر کے مرکز میں جاری کیا جانا تھا۔ وفاق روبہ عمل نہیں لایا جاسکتا تھا جب تک کہ ریاستوں کی کونسل میں شمولیت کے حق دار رجواڑوں کی آدھی تعداد اس سے الحاق نہ کرلے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ میں، کنزرویٹیو اراکین کی طرف سے، بل کے، وفاق سے متعلق حصے کی سخت مخالفت کی گئی۔ ہندوستان میں، ایکٹ کے صوبائی حصے کو عموماً منظور اور نافذ کردیا گیا۔ کئی کوششوں کے باوجود انڈیا ایکٹ کا، وفاق سے متعلق حصہ، کبھی بھی روبہ عمل نہیں لایا جاسکا۔

58- *Viceroy at Bay;* p.151.

59- ٹرانسفر آف پاور، وی پی مینن، ص90-59، مینن نے اس بیان کی تاریخ تو نہیں دی ہے مگر لگتا ہے کہ یہ بیان 5 اکتوبر 1939 لنلتھگو کے ساتھ جناح کی ملاقات کے کچھ دن بعد دیا گیا ہوگا۔

60- لنلتھگو پیپرز: یورپ ایف 125/15، برابورن کا مکتوب زیٹ لینڈ کو، 19 اگست 1938۔ آئی او ایل۔ سر سکندر حیات نے بھی برابورن کو یقین دلایا تھا کہ انگریزوں کی طرف سے 'اچھا سلوک کیا جائے' تو مسلمان 'ہر مصیبت میں انگریزوں کا ساتھ دیں گے۔'

61- John L. Dundas, The Memoirs of Lawrence, Second Marquess of Zetland.

62- ایضاً

63- Ahmad, speeches and Writings of Mr. Jinnah, ii, p.245; Lahore, 1947, 6th Edition 1964.

64- *Transfer of Power*, V.P. Menon, p.437.

65- *Amrita Bazar Patrika*, July 4, 1940, "Method of Non-Violence - Mahatma Gandhi's appeal to every Briton."

66- انڈیا آفس ریکارڈس، پالیٹیکل ڈپارٹمنٹ کلکشنز - ایل/ پی اینڈ جے/ 8/505- 5 اکتوبر 1939 لنلتھگو اور جناح کی ملاقات سے متعلق ایک اندراج

67- Linlithgow & India, Gowher Rizvi, Royal Historical Society, London, 1978 India Office Records Political Department Collections L/P & J/8/506; pp.113-14, 4 November 1939; IOR

68- آئی اے آر، 1939، ii، 411

69- Linlithgow Papers - Eur.F.125/18/303, Telegram from Zetland to Linlithgow, 18 November 1939, also Gawhar Rizvi.

70- Linlithgow Paper's Eur.F.125/18/511, Telegram from Linlithgow to Zetland, 28 November 1939 IOL.

71- ھندوستان ٹائمز، دہلی، 3 دسمبر 1939

72- Linlithgow and India, A study of British Policy and the Political Impasse in India, 1936-1954, p.115, Royal Hitorical Society Studies in History Series, No. 13, Gowhar Rizvi, Royal Historical Society, London, 1978

73- Linlithgow Papers Eur.F.125/19/6, Telegram from Linlithgow to Zetland, 16 January 1940, IOL.

74- لاہور قرارداد (1940): 22 مارچ سے 24 مارچ تک منٹو پارک، لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنا سالانہ اجلاس کیا جو تاریخی ثابت ہوا۔

اجلاس کے پہلے دن، قائداعظم محمد علی جناح نے گزشتہ ماہ کے واقعات بیان کیے۔ انہوں نے اپنی فی البدیہہ تقریر میں مسلم مسئلے کا اپنا حل پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کا مسئلہ بین فرقہ جاتی نہیں بلکہ واضح طور پر بین الاقوامی نوعیت کا ہے اور اسے اسی طرح لیا جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات اتنے گہرے اور شدید ہیں کہ ایک مرکزی حکومت کے ماتحت ان کا یکجا رہنا سنگین خطرات کا حامل ہے۔ ان کا تعلق دو الگ اور باہم ممتاز قوموں سے ہے اور اسی لیے واحد چارۂ کار یہی ہے کہ دونوں کی اپنی اپنی الگ ریاستیں ہوں۔

قائداعظم کے الفاظ میں: 'ہندو اور مسلمان دو الگ مذاہب، فکری نظاموں، سماجی رسوم ورواج اور ادبی روایات سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ نہ آپس میں شادیاں کرتے ہیں نہ کھاتے پیتے ہیں۔ وہ واقعی دو الگ تہذیبوں سے وابستہ ہیں جو باہم متصادم خیالات وتصورات پر مبنی ہیں۔ زندگی کے بارے میں اور زندگی گزارنے سے متعلق

ان کے تصورات بھی مختلف ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مسلمان تاریخ کے مختلف ذرائع سے تحریک حاصل کرتے ہیں۔ ان کی رزمیہ داستانیں الگ، ان کی مثالی شخصیات الگ اور ان کے تاریخی واقعات الگ ہیں۔ اکثر و بیشتر ایک کی مثالی شخصیت دوسرے کے لیے دشمن ہوتی ہے، اور اسی طرح، ان کی فتحیں اور شکستیں بھی ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ ان دو قوموں کو، جن میں سے ایک عددی لحاظ سے اقلیت اور دوسری اکثریت ہے، زبردستی جوڑ کر ایک واحد ریاست کے تحت لایا جائے گا، تو ان کے درمیان بے چینی اور کشیدگی بڑھتی جائے گی اور آخر ایک دن وہ لباس ہی تار تار ہو جائے گا جو ایسی کسی ریاست کی حکومت کے لیے تیار کیا جائے گا۔'

انہوں نے مزید کہا: 'مسلمان، قوم کی کسی بھی تعریف کے لحاظ سے ایک قوم ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگ اپنی روحانی، تہذیبی، اقتصادی، سماجی، اور سیاسی زندگی کو آخری حد تک اس انداز سے ترقی دیں جو ہمارے نزدیک کامل ترین اور ہماری اقدار سے ہم آہنگ اور ہمارے لوگوں کے بنیادی مزاج کے مطابق ہو۔'

قائد کے مذکورہ بالا خیالات کی بنیاد پر، اس وقت کے وزیر اعلا، بنگال اے کے فضل الحق نے وہ تاریخ ساز قرارداد پیش کی جسے اب لاہور قرارداد یا قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے۔

اس قرارداد میں اعلان کیا گیا: 'کوئی بھی ایسا آئینی منصوبہ قابل عمل یا مسلمانوں کو قبول نہیں ہوگا جب تک جغرافیائی لحاظ سے متصل اکائیوں کو علاقوں کے طور پر نشان زد نہ کیا جائے اور ایسی علاقائی ردوبدل کے ساتھ انہیں تشکیل نہ دیا جائے جو ضروری ہو۔ ان علاقوں کو، جن میں مسلمان عددی لحاظ سے اکثریت میں ہیں، مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی خطے، ملا کر ایسی آزاد ریاستیں تشکیل دی جائیں جن میں انہیں تشکیل دینے والی اکائیاں خودمختار اور اقتدار اعلا کی حامل ہوں۔'

قرارداد میں مزید کہا گیا: 'یہ کہ آئین میں، اکائیوں اور علاقوں کی اقلیتوں کو، ان کے مشورے سے، مناسب، موثر اور لازمی تحفظات خصوصی طور پر فراہم کیے جائیں جن سے ان کے مذہبی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ مسلمان جہاں جہاں اقلیت میں ہیں ان کی سلامتی اور حفاظت کے لیے بھی انتظامات کیے جانے چاہئیں۔

قرارداد نے متحدہ ہندوستان کے تصور کو مسترد کیا اور سفارش کی کہ شمال مغرب میں پنجاب، این ڈبلیو ایف پی، سندھ اور بلوچستان اور شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل ایک آزاد مسلم ریاست تشکیل دی جائے۔

پنجاب کے مولانا ظفر علی خان، این ڈبلیو ایف پی کے سردار اورنگ زیب، سندھ کے سر عبداللہ ہارون اور بلوچستان کے قاضی عیسا اور دیگر کئی لوگوں نے قرارداد کی تائید کی۔

یہ قرارداد 24 مارچ کو منظور کی گئی۔ اس میں صرف اصولی نکات پیش کیے گئے تھے اور باقی تفصیلات آئندہ پر چھوڑ

دی گئی تھیں۔ اسے 1941 میں مسلم لیگ کے آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس قرارداد کی بنیاد پر مسلم لیگ نے 1946 میں دو ریاستوں کے بجائے، مسلمانوں کے لیے ایک ریاست کے حق میں فیصلہ کیا۔

قرارداد پاکستان منظور کیے جانے کے بعد، ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین تبدیل ہوگیا۔ اب وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر چلنے کے بجائے ایک ایسی راہ پر چل پڑے جس کی منزل ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ وطن تھی۔

75- *Manchester Guargian*, 2 April, 1940.

76- *Pathway to Pakistan*, See Ch. Khaliquzzuman, pp.255-6.

77- صدارتی خطبہ، آل انڈیا مسلم لیگ، دہلی اجلاس، 24 اپریل 1943

باب 6

1- *The Partition of India, Politics and perspectives 1935-1947* ed. by C.H. Philips & Mary Doreen Wainrigth. p. 388; George Allen and Unwin Lrd, London.

2- سی آر ایٹلی کی ایزاٹ ہیپنڈ: آر-جی-کو پلینڈ- ڈائری 42-1941 نہرو کے ساتھ انڈیا کنسیلی ایشن گروپ سب کمیٹی میٹنگ، 14 جولائی 1938؛ آئرین ہیریسن-اگا تھا ہیریسن: این امپریشن آف ہرسٹر (1956)؛ انڈیا کنسیلی ایشن گروپ سے متعلق ایک عمومی تذکرہ۔

3- نہرو کے ساتھ انڈیا کنسیلی ایشن گروپ سب کمیٹی کی ملاقات کے بارے میں اندراجات، 14 جولائی 1938، فرینڈس ہاؤس، لندن۔ نہرو نے انڈیا کنسیلی ایشن گروپ سے بات چیت کی، جو گاندھی کی ایما پر برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے درمیان باہمی مفاہمت، کو فروغ دینے کے لیے 1931 میں تشکیل دیا گیا تھا۔ یہ بڑی حد تک 'کوئیکرز' پر مشتمل تھا۔ کرپس کی سوتیلی ماں ایک کوئیکر تھیں۔ نہرو نے ستمبر 1938 میں فرینڈس ہاؤس میں اس بات پر اصرار کیا کہ 'پہلی بات جسے تسلیم کیا جانا چاہیے یہ ہے کہ اپنا آئین خود تیار کرنے کے ہندوستان کے حق کو مان لیا جائے' (انڈیا کنسیلی ایشن گروپ اندراجات-3 ستمبر 1938)

4- کرپس کا مکتوب سر فنڈ لیٹر اسٹیوارٹ کو، 24 نومبر 1939، ایل/پی/او/252/16/، اور انکلوزر

5- *Churchill, Cripps and India, 1939-45*, p.9-10; R.J. Moore, Clarendon Press Oxford, 1979.

6- ایضاً ص 11

7- کرپس اور جیوفرے ولسن کی سی ڈبلیو ڈی ڈائری، 40-1939 جو جناب مارس شاک کی تحویل میں تھی، لائسسٹر یونیورسٹی، 11 دسمبر 1939 - لیاقت علی خاں کے تجویز کردہ تین حل 1940 کی دہائی کے دوران ہندوستانی مسئلے سے متعلق انگریزوں کے تین اہم جوابوں سے مطابقت رکھتے تھے، جو اس طرح تھے: کرپس کا 'لوکل آپشن' (1942)، کیبنٹ مشن کی تین سطحی اسکیم (1946) اور ماؤنٹ بیٹن کا پارٹیشن پلان (1947)

8- کرپس اور جیوفرے ولسن کی ڈائری، جناب مارس شاپ کی تحویل میں، لائسسٹر یونیورسٹی - 15 دسمبر 1939: چرچل، کرپس اینڈ انڈیا، 45-1939، آر۔ جے مور میں بھی حوالہ

9- Churchill, Cripps and India, 1939-45, R.J. Moore; p.13, Clarendon Press, Oxford, 1979.

10- Cabinet Conclusion. 59(39)8, 25 October, 1939.

11- *Churchill Cripps and India 1939-45* R.J. Moore; p.13; Clarendon Press, Oxford. 1979.

12- ایضاً، ص 128

13- ایضاً

14- لنلتھگو کا مکتوب زیٹ لینڈ کو، 13 فروری 1940، زیٹ لینڈ کلیکشن، انڈیا آفس لائبریری، لندن

15- سائمن کا مکتوب چیمبرلین کو، 13 فروری 1940، پرائم منسٹرز آفس فائلز، پبلک ریکارڈ آفس، لندن-1/414

16- ایضاً

17- ایضاً

18- چرچل کا مکتوب چیمبرلین کو، 20 فروری 1940، پرائم منسٹرز آفس فائلز، پبلک ریکارڈ آفس، لندن

19- کرپس کا مکتوب نہرو کو، 18 مارچ 1940، جواہر لال نہرو کلیکشن، نہرو میموریل لائبریری، نئی دہلی

20- انڈیا کنسیلی ایشن گروپ، اندراجات، 24 مئی 1940؛ کرپس کا مکتوب اگاتھا ہیریسن کو، 20 مئی 1940، انڈیا کنسیلی ایشن گروپ باکس 47 (کرپس)۔

21- 16 جولائی 1940 کا کیبل - پرائیویٹ آفیسر پیپرز، انڈیا آفس لائبریری، لندن؛ چرچل، کرپس اینڈ انڈیا، 45-1939، آر جے مور، ص 35، کلیرنڈن پریس، آکسفرڈ، 1979 میں بھی حوالہ

22- وار کیبنٹ، 30 جولائی 1940، ڈبلیو پی (40) 295، بشمول چرچل کا مکتوب لنلتھگو کو، 28 جولائی 1940 (کیبل) حوالۂ سابق - چرچل، کرپس اینڈ انڈیا 45-1939، آر جے مور، ص 36، کلیرنڈن پریس، آکسفرڈ، 1939 میں بھی حوالہ

23- 8 اگست 1940 کی حکومت برطانیہ کی پیش کش، گوائر اینڈ اپادورئی، دستاویزات، ii، 505-504

-24 'ہاؤس آف کامنز' میں لیوپولڈ ایمری کی تقریر، یکم اگست 1942

-25 گائی وی عینٹ کا مکتوب سکریٹری آف اسٹیٹ کو، کارڈل ہل، 4 نومبر 1941، امریکہ کے خارجہ تعلقات، ڈپلومیٹک پیپرز، 1941، iii، 181-182

-26 اس وقت کے امریکی سفیر برائے برطانیہ

-27 ایضاً

-28 *Churchill, Cripps and India, 1939-1945*, R.J. Moore, p.42, Claredon Press, Oxford, 1979.

-29 ایضاً

-30 سسٹر سرجارج ارنسٹ (1982-1881) تائث، کلونیل ایڈمنسٹریٹر؛ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل میں فائنانس ممبر 34-1928

-31 *Ten Years of Freedom*, Kanji Dwarkadas, p.62, Bombay, Popular Prakashan, 1968.

-32 ایضاً، ص63

-33 ایضاً

-34 ایضاً

-35 ایضاً

-36 ایضاً

-37 ایضاً، ص64

-38 ایضاً، ص64

-39 ایضاً، ص65

-40 ایضاً، ص95-194

-41 ایضاً، ص67

-42 ایضاً

-43 Dacca University and the Pakistan movement by Mahmud Hussain appeared in 'The Partition of India, Policies and Perspectives 1935-1947', ed. by C.H. Philips & Mary Doreen Wainwright, p.371, George Allen and Unwin Ltd, London, 1970.

-44 *Ten Years of Freedom*, Kanji Dwarkadas, p.69, Bombay, Popular

Prakashan, 1968.

45- ویول کے بارے میں پیارے لال کا تبصرہ، ص 276

46- *Law and Other Things:* Motilal C. Setalvad.

باب 7

1- *Wavell-The Viceroy's Journal,* Edited by Sir Penderel Moon; Oxford University Press, 1973.

2- ایضاً

3- *Churchill, Cripps and India, 1939-1945,* R.J. Moore, p.140, Clarendon Press Oxford, 1979.

4- *Wavell: The Viceroy's Journal,* 7 and 8 October 1943, pp.22-23

5- ویول کا مکتوب چرچل کو، اکتوبر 1944، ٹرانسفر آف پاور، جلد 5

6- ویول کا مکتوب ایمری کو، یکم دسمبر 1944، ٹی او پی، جلد 5، 260

7- *Wavell: The Viceroy's Journal,* pp.110-111-112

8- ایضاً

9- ایضاً، ص 16-115

10- ایضاً

11- ایمری کا مکتوب فیلڈ مارشل وسکاؤنٹ ویول کو، 12 جولائی 1945، ٹرانسفر آف پاور، جلد 5، 39-1236

12- ڈیوڈ جان کولویل، فرسٹ بیرن کلائڈس میور پی سی جی سی آئی ای (13 فروری 1864) بمبئی کا گورنر مقرر کیا گیا اور 1947 تک اسی منصب پر رہا۔ وہ 1945، 1946 اور 1947 میں قائم مقام وائسرائے اور گورنر جنرل آف انڈیا بھی رہا۔ ہندوستان سے واپسی پر اسے ترقی دے کر کلائڈس میور بیرن آف بریڈوڈ، کاؤنٹی آف لانارک شائر بنادیا گیا۔ لارڈ کلائڈس میور نے 1950 سے 1954 تک بی بی سی کے گورنر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

13- *Wavell-The Viceroy's Journal,* Edited by Penderel Moon; Oxford University Press, 1973.

14- انتخابی عمل 10 دسمبر 1945 کو نامزدگیوں سے شروع ہوا اور 20 اپریل 1946 تک بھی مکمل نہیں ہو پایا۔

15- پنجاب: ایوان کے اراکین کی تعداد 175: اس تعداد کا ذریعہ پوسٹ وار اپ سرج آف فریڈم

موومنٹ اینڈ 1946 پراونشیل الکشنز ان انڈیا، شوکواجیما،ص268،اپریل1992

16- ممدوت کے نواب افتخار حسین خاں (69-1906) سرشاہنواز خاں کے بیٹے تھے۔وہ1942 میں اپنے والد کی وفات کے بعد سیاست میں داخل ہوئے اور والد کی جگہ مسلم لیگ کے صوبائی صدر اور فیروز پور سنٹرل سے اسمبلی کے رکن بنے۔

وہ46-1945 کے انتخاب سے پہلے اور بعد میں خضر کے مخالف رہے اور 1947 میں خضر کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے اپنی پارٹی کی کامیاب مہم کو انجام تک پہنچایا۔آزادی کے بعد48-1947 میں وہ مغربی پنجاب کے وزیر اعلا رہے،مگر جلد ہی اپنے رفقاء سے اختلافات کے سبب الگ ہوگئے اور 1950 میں مسلم لیگ کو چھوڑ کر جناح مسلم لیگ قائم کی۔

17- *Partition of India: Legend and Reality,* H.M. Seervai, Oxford University Press; Karachi, 2005.

18- *The Transfer of Power 1942-7,* pp.155-57, Vol-VI, the Post-war Phase: I August 1945 - 22 March 1946 (68 Sir E.Jenkins to Mr. Abell Telegram, Wavell Papers, Political Series July-Sep 1945, pp.65-7) Printed in England for Her Majesty's Stationery office, first published 1976.

19- *Transfer of Power,* pp.155-57, 172, Vol.VI.

20- ایضاً،ص34-433،جلد7

21- ایضاً،ص79-476

22- ایضاً،ص466

23- *Ten Years of Freedom,* Kanji Dwarkadas, p.179, Bombay, Popular Prakashan, 1968.

24- ایضاً

25- *Indian National Movement,* Madhu Limaye, p.308.

26- جناح – ویول کریسپانڈنس،47-1943،مولفہ شیر محمد گریوال،ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، یونیورسٹی آف پنجاب،لاہور،1986

27- *Transfer of Power,* pp.784-785, Vol.VII.

28- ایضاً،ص86-785

29- جون12،1946،کیواے پی،فائل نمبر14،ص1،ٹی او پی،جلد7،ص885

30- کیو اے پی، فائل نمبر 14، ص 5، ٹی او پی، جلد 7، ص 945

31- پیراگراف 8، ویول کے مطابق، 16 جون 1946 کے بیان میں جلد بازی میں شامل کیا گیا تھا۔ بعد میں جب کیبنٹ وفد نے عبوری حکومت کی تشکیل سے پہلے وقت مانگا تو جناح نے اس سلسلے میں وائسرائے پر اعتماد شکنی کا الزام لگایا۔

32- ٹی او پی، جلد 7، نمبر 562، ص 971

33- کیو اے پی، فائل نمبر 14، ص 17-14؛ ٹی او پی، جلد 7، ص 77-974

34- کیو اے پی، فائل نمبر 14، ص 34-33؛ ٹی او پی، جلد 7، ص 99-988

35- *Transfer of Power*, pp.1032-36; Vol.VII

36- ایضاً، ص 38-1036

37- کیو اے پی، فائل نمبر 14، ص 58؛ ٹی او پی، جلد 7، ص 1077

38- *Ten Years of Freedom*, Kanji Dwarkadas, p.182, Bombay, Popular Prakashan, 1968.

39- اے پی آئی کو جناح کا انٹرویو، حیدرآباد (دکن)، 13 جولائی 1946

40- کیو اے پی، فائل نمبر 20، ص 9,10,11؛ ٹی او پی، جلد 8، ص 99-98

41- انڈین اینوال رجسٹر، 1946، جلد 2، ص 228

42- اسٹیفنز، حوالہ سابق، ص 107

43- کونسل کا اجلاس 29-27 جولائی 1946 کو ہوا۔

44- آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی 29 جولائی 1946 کی قرارداد کا متن

45- *The Nation's Voice - Speeches, Statements, Interviews of Jinnah*, Ed. by Waheed Ahmad pp.209-214.

46- نہرو کا حوالہ، دی اسٹیٹس مین، 18 اگست 1946، ص 1

47- Last Days of the Raj by Leonard Moseley.

48- ایضاً

49- *Wavell - The Viceroy's Journal;* Edited by Penderel Moon, p.341, Oxford University Press, London, 1973.

باب8

-1 Annotated speeches, statements, interviews and messages of Jinnah, pp.321-22, Volume V, edited by Wahid Ahmad, Quaid-i-Azam Academy, 2001.

-2 ایضاً،ص319

-3 ایضاً،ص323

-4 ایضاً،ص324

-5 ایضاً،ص326

-6 ایضاً،ص329

-7 *100 Best Letters, 1847-1947*, edited by H.D. Sharma, pp.396-99, Rupa & co.

-8 پٹیل نے کانجی دوارکاداس سے 31 دسمبر 1946 کو احمد آباد میں ملاقات کے دوران اس کا اعتراف کیا۔ الہ ٹین ائیرز آف فریڈم، کانجی دوارکاداس، ص201، بمبئی، پاپولر پرکاشن، 1968

-9 ایضاً،ص197

-10 ایضاً،ص199

-11 ایضاً

-12 ایضاً،ص205

-13 ایضاً،ص8-207

-14 ایضاً،ص10-209

-15 ایضاً،ص216

-16 کلکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی۔ ص25-124، مارچ25-20، 1947

-17 *Ten Years of Freedom*, Kanji Dwarkadas, p.210, Bombay, Popular Prakashan, 1968.

-18 ایضاً،ص211

-19 ایضاً،ص211

-20 *Last Days of the Raj* by Leonard Moseley.

-21 ایضاً،

-22 ایضاً

-23 ٹرانسفر آف پاور، ص771، جلد10
دونوں کے درمیان اختلافات مختصراً یوں تھے:

(1) نہرو کے خیالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے، تحریروں کا عمومی تبادلہ، جس میں کہا گیا تھا کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کیبنیٹ مشن پلان کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ کہ کوئی بھی نئی آئین ساز اسمبلی اختلاف رائے کے حامل لوگوں کا گروپ ہوگی۔

(2) اس تجویز کا ہٹایا جانا کہ فیصلے قانون ساز اسمبلیوں کے اراکین کے ذریعے کیبنیٹ مشن پلان میں مجوزہ بنیاد پر کئے جائیں۔

(3) وابستگی موجودہ آئین ساز اسمبلی کے ساتھ یا نئی اور الگ آئین ساز اسمبلی کے ساتھ۔ آزاد رہنے کا اختیار ختم کر دیا گیا۔

-24 *Ten Years of Freedom*, Kanji Dwarkadas, p.211-12, Popular Prakashan, Bombay, 1968.

-25 ایضاً، ص213

-26 ولایت: انگریزی کے 'فارین لینڈ' کا تقریباً اردو متبادل کو۔ 27. کوہ نور ہیرا: (وزن: 108,93 کیرٹ: تراش: گول چمکدار)۔ اس ہیرے کی مصدقہ تاریخ 14ویں صدی سے شروع ہوتی ہے جب کہا جاتا ہے کہ یہ راجہ مالوا کے پاس تھا۔ بعد میں یہ بابر کے ہاتھوں میں پڑ گیا جس نے 1526 میں مغل سلطنت قائم کی۔ اگلی دو صدیوں کے دوران یہ ہیرا مغل شہنشاہوں کے خزانے کی سب سے قیمتی چیز بن کر رہا۔ 1739 میں، نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور مغلوں کی تمام دولت اس کے ہاتھ لگ گئی۔ نادر شاہ نے اس ہیرے کو دیکھا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا 'کوہ نور'۔

-28 یہ ہیرا مستقل ایران کے بادشاہوں کے پاس رہا، حالاں کہ اسے ہتھیانے کی کوششیں جاری رہیں۔ بعد میں ایران کا ایک باشاہ اسے لے کر فرار ہو گیا اور سکھ دربار میں پناہ لی، شیر پنجاب رنجیت سنگھ نے یہ ہیرا اس سے حاصل کیا اور اسے آرائش کے طور پر اختیار کیا۔ بعد میں اسے لاہور کے خزانے میں رکھ دیا گیا۔ سکھوں کے ساتھ جنگ کے بعد، اسیٹ انڈیا کمپنی نے، 1949 میں اسے تاوان جنگ کے طور پر حاصل کیا اور کمپنی کے 250ویں جشن کے موقعے پر ملکہ وکٹوریا کو پیش کیا۔

-29 *Transfer of Power*, pp.734-35, Vol.VII

-30 ٹرانسفر آف پاور، ص6-805، جلد11، 'میعاد کا تعین'، مولفہ پنیڈریل مون، انگلینڈ میں ہر مجسٹیز اسٹیشنری آفس کے ذریعے طباعت، پہلی اشاعت، 1980
سر فرانسس ایوان ٹکر، کے سی آئی ای سی بی او بی ای ایک برطانوی ہندوستان فوجی افسر تھا۔ 4 جولائی 1894 کو

پیدا ہوا اور برائٹن کالج میں تعلیم پائی جس کا وہ بعد میں گورنر بنا۔ ٹکر کو دوسری عالمی جنگ کی 'ویسٹرن ڈیزرٹ' اور اطالوی مہمات کے دوران ہندوستانی چوتھے انفنٹری ڈویژن کی کمان سنبھالنے کے لئے شہرت ملی۔ یہ کمان اس نے 30 دسمبر 1941 سے 4 فروری 1944 تک سنبھالی جب اسے سیلون آرمی کمان سونپی گئی۔ 14 جولائی 1945 کو اسے برما میں ہندوستانی پانچویں کور کی کمان سونپی گئی جو اس کے پاس اس کے تحت جنگ کے خاتمے تک رہی۔ وہ اپریل 1948 میں لفٹننٹ جنرل کے عہدے سے سبک دوش ہوا اور 1967 میں انتقال کیا۔ برائٹن کالج کے گرجا گھر میں اس کے نام کا ایک یادگاری کتبہ ہے جس کے اوپر اس کی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ اس اسکول کے کھیل کے میدان میں گورکھا بریگیڈ کو پسپائی ہوئی تھی۔

فوج میں ٹکر کی عرفیت 'گرتی' تھی۔ اسے فوجی تاریخ سے متعلق اس کی کئی تصانیف کے لئے جانا جاتا ہے۔ یہ تصنیفات ہیں: دی پیٹرن آف وار، وائل میموری سروز اور دی بلو اسکارف۔

باب 9

-1 'War Diaries' by Field Marshal Lord Alanbrooke, p.xiv, first Published in Great Britain 2001.

-2 *Confession of An Optimist,* Woodrow Wyatt, p.162, Collins London, 1985.

-3 *Partition of India, Legend and Reality,* H.M. Seervai's Oxford, 2005.

-4 ایضاً،

-5 *Jinnah, the Founder of Pakistan,* compiled and edited by Saleem Qureshi, p.15-16, Oxford, fourth impression, 2003.

-6 جلد 10، ص 945

-7 *Transfer of Power,* Vol-X, 22 March-30 May 1947, Prited in England, first published in 1981.

-8 سیراوی، ص 97 حوالہ سابق

-9 The Role of Lord Mountbatten by H.V. Hodson published in *The Partition of India Policies and Perspective 1935-1947,* ed. by C.H. Philips & Mary Doreen Wainwright, p.121, George Allen and Unwin Ltd, London, 1970.

10- جناح اور ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات، 23 جون 1947 کا ریکارڈ؛ ٹی او پی، جلد 11، نمبر 311، ص 580
11- ہندوستانی کابینہ کا خصوصی اجلاس، 26 جون 1947؛ ٹی او پی، جلد 11، نمبر 354، ص 650
12- ماؤنٹ بیٹن کا مکتوب لسٹوویل کو، 9 جون 1947، ٹی او پی، جلد 11، نمبر 120، ص 226
13- ووڈرو ویات کے ساتھ سر اسٹیفورڈ کرپس کے ذاتی عملے میں شامل برطانوی لیبر ایم پی، میجر شارٹ کو، سکھ امور کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔
14- ٹی او پی، جلد 12، نمبر 326 ص 492
15- ایضاً، ص 292، جلد 11
16- ایضاً، جلد 10، نمبر 456، 16 مئی 1947، ص 843
17- ٹی او پی، جلد 12، نمبر 318، سر سی ریڈکلف کا پیغام سر جارج ایبل کے نام، ص 483
18- 1989 میں کرسٹوفر بیومانٹ کا بیان، ضمیمہ 5، انصار حسین خان، دی ڈسکوری آف انڈیا، اے نیو سب کانٹی ننٹ، لندن، سنگم، 1995۔
19- ٹی او پی، جلد 12، نمبر 81 کا انکلوزر، ص 117۔
20- *India Wins Freedom,* Maulana Abul Kalam Azad, p.226, New Delhi, Orient Longman 1959, 1988.
21- آچن لیک کا نوٹ، 15 اگست 1947، ٹی او پی، جلد 12، نمبر 486، ص 734
22- عائشہ جلال کے ذریعے سردار جعفری کی نظم 'خون کی لکیر' کے انگریزی ترجمے سے ماخوذ
23- The British Conquest and Dominion of India, Part II (1858-1947) b Sir Penderel Moon, p.1167, India Research Press, New Delhi, First Indian Edition 1999.
24- ایضاً، ص 95-1194
25- Unsung RSS heroes of Partition days - II, extracted from piece by V. Sundaram, retired IAS officer on the site http://www.newstodaynet.com/2006sud/06jul/1807 ss1.html.
26- ماؤنٹ بیٹن پیپرز، وائسرائے کا انٹرویو نمبر 168، 24 جولائی 1947، 5:15 بجے شام۔
27- *Transfer of Power,* pp.322-25, Vol-XII, 8th July-15th August 1947, Printed in England, edited by penderel Moon, 1983.
28- *Partition of India, Legend and Reality,* H.M. Seervai, p.135, Oxford, 2005.

-29 ایضاً،ص137
-30 ایضاً،ص139
-31 *Partition of India: Legend and Reality*, H.M. Seervai, p.139, Oxford.
-32 ایضاً
-33 ایضاً،ص138-39

باب10

-1 *Disatrous Twilights - A personal record of the Partition of India*, Maj. Gen. Shahid Hammid, pp.228-29 Bamsley: Leo Copper, 1986.
-2 10 ستمبر 1948

باب11

-1 *Jinnah*, M.R.A. Baig, p.19, Khuda Baksh Oriental Library, Patna.
-2 *An American Witness to India's Partition*, Philips Talbot, pp.240-41, Sage Publications, 2007.
-3 *The Muslims of India*, p.3, A.G. Norani
-4 *What Price Freedom*, pp.321-22, Mohammad Raza Khan, Chennai, 1969, Quoted in A.G. Noorani, *Muslims of India*
-5 *The Muslims of India*, A.G. Noorani; Introduction, p-7; also in Chapter I of the same book - Document 7.
-6 ایضاً، باب اے، دستاویز8
-7 ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے مباحث، 26 مئی 1949، اقلیتوں سے متعلق رپورٹ وغیرہ، ص 350، کتاب نمبر3
-8 1978-79 میں ایران کا اسلامی انقلاب جس کے دوران اسلامی بنیاد پسندوں اور ان کے حامیوں نے ایران کے حکمراں رضا شاہ پہلوی کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ جلاوطن مذہبی رہنما آیۃ اللہ خمینی کی قیادت انقلابیوں نے شاہ کی سیکولر (غیر مذہبی) شہنشاہی کا خاتمہ کرتے اسلامی جمہوریہ ایران قائم کیا۔ نئے جمہوریہ نے مغربی

اثرات کو مسترد کیا اور شیعہ اسلامی تعلیمات کو اپنا رہنما بنایا۔

-9 (تھیوسینزک) دین مرکوز: (صفت)، خدا مرکوز؛ (تھیوکریسی) دینی نظام حکومت: (رسم) وہ نظام حکومت جس میں مذہبی طبقہ خدا کے نام پر حکومت کرتا ہے۔ دی تھیوکریسی: موسیٰ کے زمانے سے 'سال' کے بادشاہ بننے تک اسرائیل کی دولت مشترکہ۔

-10 بشیر الدین احمد 96-1992 کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے وائس چانسلر تھے۔ انہیں کنشا ریشم آف ایجوکیشنل کمیونیکیشن کا رکن بھی نامزد کیا گیا تھا۔

-11 بابری مسجد ہندوستان کے پہلے مغل شہنشاہ بابر نے ایودھیا میں 16 ویں صدی میں تعمیر کرائی تھی۔ 1940 کی دہائی سے پہلے تک اس مسجد کو 'مسجد جنم استھان' کہا جاتا تھا۔ یہ مسجد 'رام کوٹ' کی پہاڑی پر واقع ہے (اسے بھی جنم استھان کہا جاتا ہے)۔ مانا جاتا ہے کہ بابر کے سپہ سالار میر باقی نے اس مسجد کی جگہ پر پہلے سے قائم ایک ہندو مندر کو توڑا تھا جو ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق رام چندر جی کے مقام پیدائش پر بطور یادگار بنایا گیا تھا اور جو وشنو کے اوتار اور ایودھیا کے حکمراں تھے۔ بابری مسجد 6 دسمبر 1992 کو ایک فساد کے دوران تباہ کردی گئی۔

-12 *Partition of India: Legend and Reality*, H.M. Seervai, Oxford, p.159.

-13 نہرو کا مکتوب نواب بھوپال کو، 9 جولائی 1948، ایچ ایم سیراوی، آکسفرڈ، ص 159

-14 As mentined on Page 11 of the book *Pakistan: Between Mosque and Military*, Hussain Haqqani, 2005, Carnegie Endowment for International Peace.

-15 *The Oxford India Gandhi, Essential Writings*, Compiled and edited by Gopalkrishna Gandhi, p.615, Oxford.

-16 ایضاً، ص 644

-17 Cited by Sunil Khilnani in his essay on 'Nehru's Judgement' - Richard Bourke and Raymond Guess (editors): Political Judgement: Essays in honour of John Dunn (Cambridge: Cambridge University Press, 2008.

-18 ایضاً

-19 *Ten Years of Freedom*, Kanji Dwarkadas, p.219, Bombay, Popular Prakashan, 1968.

-20 1926 کا بالفور اعلامیہ جو برطانیہ کے لارڈ آرتھر بالفور، ارل آف بالفور سے منسوب ہے۔ یہ اس رپورٹ کا نام ہے جو 1926 میں، لندن میں منعقد سلطنت برطانیہ کے لیڈروں کی امپیریل کانفرنس کے نتیجے میں تیار کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ 'یونائٹڈ کنگ ڈم اور ڈومینین ریاستیں'... سلطنت برطانیہ کے ماتحت خود مختار

جمعیتیں ہیں، مساوی حیثیت کی حامل، جو اپنے امور داخلہ یا امور خارجہ کے کسی بھی پہلو کے لحاظ سے ایک دوسرے کی محکوم نہیں ہیں، حالاں کہ وہ تاج برطانیہ کے ساتھ مشترک وابستگی کے رشتے میں یکجا ہیں اور برطانوی دولت مشترکہ سے آزادانہ تعلق رکھتی ہیں'

-21 برطانوی ہندوستان کے صوبوں کو مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کیا گیا تھا:
گروپ 'اے'۔ مدراس، بمبئی، متحدہ صوبہ جات، بہار، وسطی صوبے اور اڑیسہ
گروپ 'بی'۔ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان
گروپ 'سی'۔ بنگال اور آسام

-22 ارگن زوائی لیوی (نیشنل ملٹری آرگنائزیشن)، جسے اِٹزیل گروپ بھی کہا جاتا ہے یروشلم میں قائم کیا گیا تھا۔ اور ہم تہومی کی سربراہی میں اس نے برطانوی اقتدار کے خلاف مسلح بغاوت اور فلسطینی عربوں کے خلاف جنگ کی وکالت کی۔ بیناچم بیگن اسرائیلی دہشت گرد ارگن کا قائد بنا جو فلسطین میں انگریزوں کے خلاف مہم چلا رہی تھی۔ ارگن کے تحت ہی کنگ ڈیوڈ ہوٹل اور روم میں برطانیہ کے سفارت خانے پر بم پھینکے گئے تھے۔

-23 *Ten Years of Freedom;* Kanji Dwarkadas; p.220, Bombay, Popular Prakashan; 1968.

-24 *The Road Not Taken: The Modernist Roots of Partition, of Postmodern Gandhi and Other Essays: Gandhi in the World and at Home,* Lloyd I. Rudolph and Susanne Hoeber Rudolph, Chapter 2, New Delhi, Oxford University Press, 2006.

-25 Ref: Extract from *Dawn* of 15 November 1946; pp.74-75 of *Transfer of Power,* Volume IX - The fixing of a time limit; 4 November to 22 March 1947, Printed England for Her Majesty's Stationery Office in 1980.

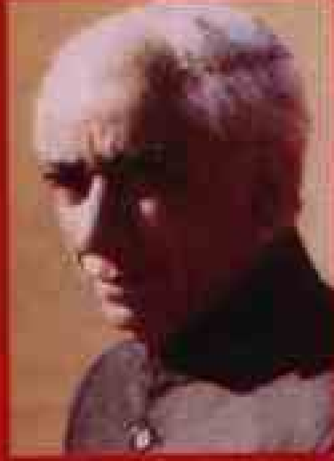
-26 *The Oxford India Gandhi, Essential Writings,* Compiled and edited by Gopalkrishna Gandhi, p.621, Oxford

-27 Essay titled 'The Cabinet Mission and its Aftermath' by A.G. Noorani published in "The Partition of India" Policies and Perspective s 1935-1947, ed. by C.H. Philips and Mary Doreen Wainwright, p.105, George Allen and Unwin Ltd, London, 1970.

-28 حوالہ دیکھیے باب 5

-29 *The City of Brass,* Rudyard Kipling; 1901.

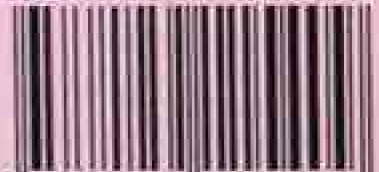
سوالات ہیں جو گزشتہ تقریباً چھے دہائیوں کے دوران ہم سب پر ایک آسیب کی طرح طاری ہیں۔ جَس وَنت کا یقین ہے کہ جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کی واپسی کے لئے یہ معلوم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ امن ہمیں چھوڑ کر گیا ہی کیوں تھا۔ یہی وہ کم سے کم مگر لازمی کوشش ہے جس کے بغیر ہم کبھی بھی روٹھے ہوئے امن کو منا کر واپس نہیں لا سکیں گے۔



جَس وَنت سنگھ ملک کی اجتماعی زندگی اور سفارت کاری کی دنیا کی محترم شخصیات میں شامل ہیں۔ وہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں، لوک سبھا، کے رکن ہیں۔ وہ 2009 کے عام انتخابات میں دارجیلنگ سے منتخب ہوئے تھے۔ ان کی متنوع دلچسپیوں میں شطرنج، گولف، پولو اور راجستھان کی قدیم زبان 'ڈنگل' کو فروغ دینا شامل ہے۔

روپا اینڈ کو

ISBN 978-81-291-1540-9



Rs. 495

www.rupapublications.com



'جناح ہندو-مسلم اتحاد کے سفیر ہیں'

— گوپال کرشن گوکھلے

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض : 03447227224

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

Imagitor